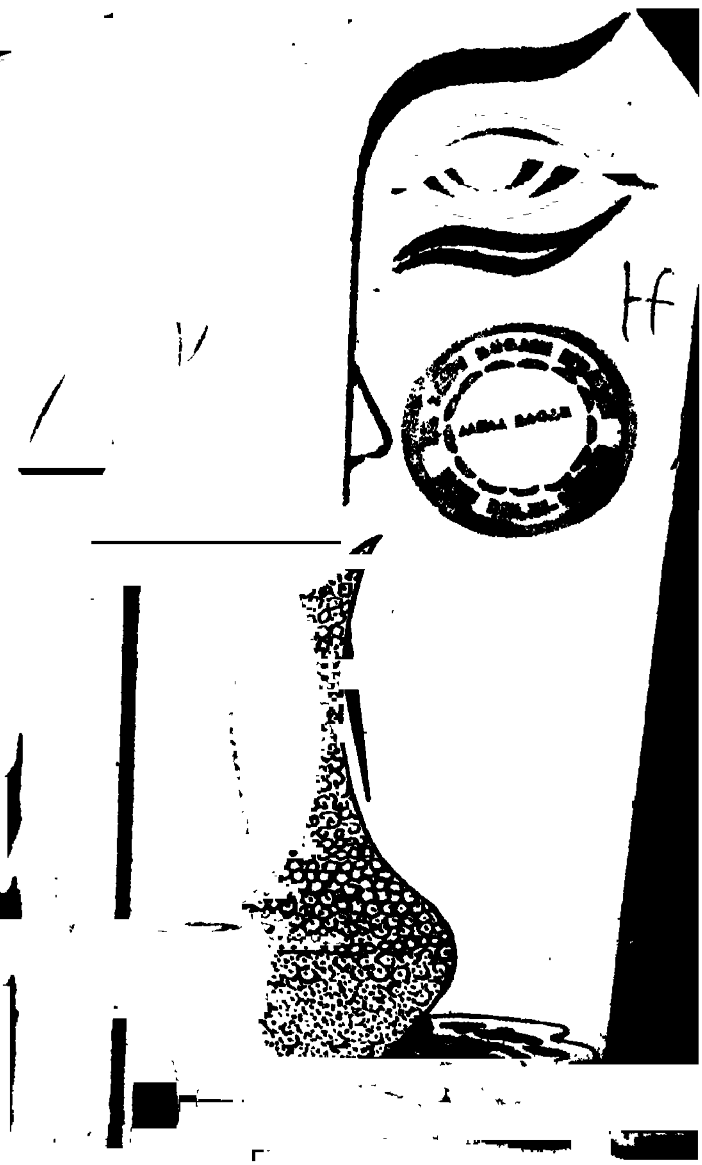




مرکبہ مکتوب الیہ

لندن ۲۸/نومبر ۱۹۸۳ء

محترم جناب سرور صاحب۔ آداب

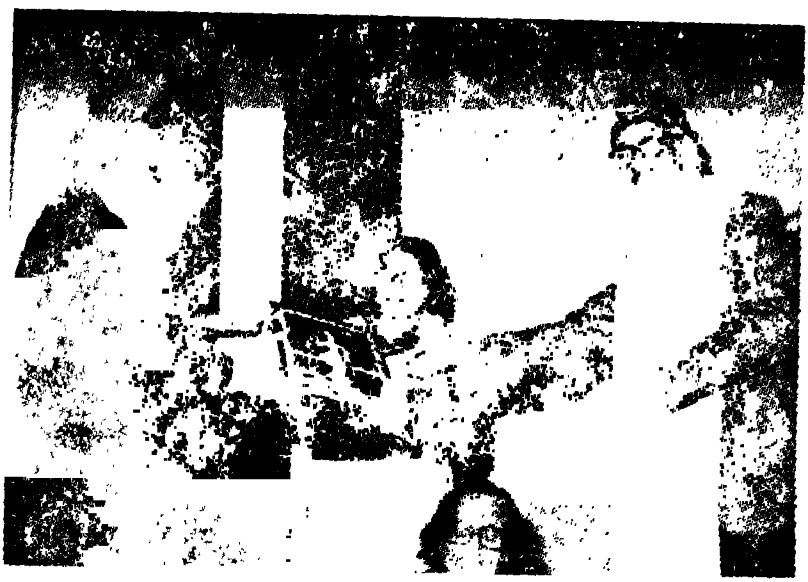
ماہ جولائی کے شمارہ شانِ ہند میں صفحہ (۸) کالم [illegible]
کے آخری پیراگراف میں لکھا تھا۔
کہ جو شخص ناجائز روپیہ اور ناجائز [illegible]
ہو وہ کوٹھی، کار اور پریس کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟
ناجائز روپیہ کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہونگا۔ ہاں
ناجائز اولاد کے متعلق انسانیت کا احساس ضرور جاگا [illegible]
ہے۔

میرا خیال ہے طوائف زادہ اور ناجائز اولاد [illegible]
چیز ہے۔ اس موضوع پر [illegible] اپنے سفرنامہ [illegible]
میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں۔ مختصراً عرض ہے کہ [illegible]
میں ناجائز اولاد کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔
ان کے سوسائٹی میں اچھا مقام [illegible]
شریف زادے کا ہے۔
ناجائز اولاد یا طوائف زادے [illegible]
شخصیتوں میں سے ہیں۔ مثلاً مغربی ممالک کی [illegible]
آبادی کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی [illegible] ہیں۔
یہاں کے معاشرے میں کسی کو اس [illegible]
ہے کہ آپ کون ہیں؟ یا کیسے پیدا ہوئے؟
دلچسپی اس میں ہے کہ آپ معاشرے کے [illegible]
ہیں اور کیا کیا کام انجام دیئے؟ آپ کیا [illegible]
جس سے معاشرے نے کچھ اچھائیاں یا نیکیاں حاصل
کیں۔ یا قوم و ملک کو کیا فائدہ پہنچایا؟
اب سوال یہ ہے۔ جائز اولادوں نے جو ناجائز کام
کیے اور ناجائز اولادوں نے جو جائز کام کیے [illegible]
کیا کہیں گے؟
ان کے کام اور عمل کو آپ [illegible] جائز یا ناجائز کہیں۔
[illegible] سے جائز کام
اور عمل [illegible] کے
کو نقصان پہنچائے۔ ناجائز اولادوں سے تو آپ اچھے
اور نیک عمل کی توقع ہی نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ پہلے ہی
حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر یہ اکثر کام
[illegible]

مثلاً [illegible] شخصیتوں میں سے [illegible]
[illegible]
[illegible] کیا کام [illegible]
[illegible]
MR. CYRIL SMITH [illegible]
MR. [illegible]
ABRAHAM LINCOLN
[illegible]
MR. [illegible]
WILLIE BRANDT
[illegible]
By [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



اپ راشٹرپتی عالیجناب محمد ہدایت اللہ ہندوستان کے مشہور و مقبول شاعر حضرت ساحر ہوشیارپوری کی تصنیف "سحرِ حرف" کا اجرا فرماتے ہوئے "ایوانِ غالب" میں منعقدہ تقریب میں۔ ماہرِ غالبیات جناب مالک رام اور سرپرستِ ادب کنور مہندر سنگھ بیدی اپ راشٹرپتی جی کے ساتھ۔



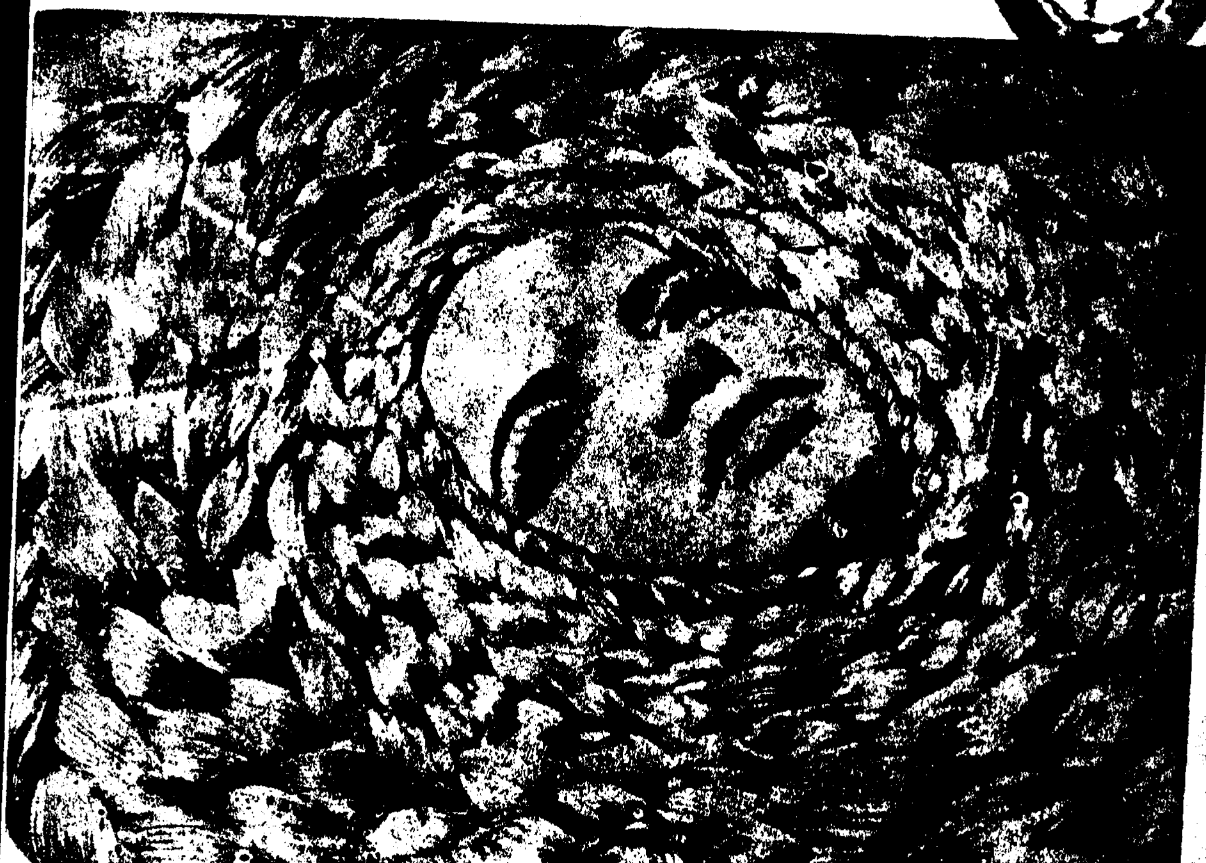
ساہتیہ منچ جالندھر کی طرف سے ۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء کو جناب وی۔ پی بھگت، انکم ٹیکس کمشنر جالندھر حضرت ساحر ہوشیارپوری کو غزل ایوارڈ پیش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر شرمیتی کے کیر کنوینر ساہتیہ منچ اور ڈاکٹر بشیر بدر بھی تشریف فرما ہیں۔

DECEMBER 1983

Phone : 275602

THE SHAMA-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





جناب ایس ایل سہگل ایگزیکٹو ڈائریکٹر مہاویر سپننگ ملز لمیٹڈ ہوشیار پور ۲۷ر نومبر ۱۹۸۲ء کو جناب ساحر ہوشیار پوری کو غزل ایوارڈ پیش کر رہے ہیں۔ زبیر رضوی صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر اے۔ آئی۔ آر رام پور۔ فیروز اختر، پاکستانی شاعری مہر گیرا اور قیس جالندھری بھی تشریف فرما ہیں۔




غلط قسم کے
لوگوں کے
ہتھے
نہ چڑھیئے...
ریل ٹکٹیں
دلالوں سے ہوشیار!
پبلک ریلیشنز،

فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲/۴۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۳۷۰

و پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
ن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(فیاضؔ گوالیاری)

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی
جشنِ جمہوریت ایڈیشن

یڈیٹر
سرور تونسوی

زرِ سالانہ -/۲۴ روپے
اس شمارہ کی قیمت تین روپے

د نمبر ۴۴ | جنوری ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۱

چھبیس ۲۶ جنوری

پیغامِ دلنواز ہے چھبیس جنوری
صد وجہِ فخر و ناز ہے چھبیس جنوری

تکمیلِ جذبِ شوق" کی کہانی تھی جب قسم
اُس "عہد" کی غمّاز ہے چھبیس جنوری

جس دن کھلے تھے اپنی تمنّاؤں کے کنول
وہ یومِ خوش طراز ہے چھبیس جنوری

ایک شامِ غم کی ہے یہ حقیقت میں انتہا
ایک صبحِ دل نواز ہے چھبیس جنوری

باپو کا خواب اور جواہر کا فکرِ نو
آزادی کی آواز ہے چھبیس جنوری

ایک دورِ نو بہار کی تمہیدِ شادکام
فصلِ چمن کا راز ہے چھبیس جنوری

تعمیر اپنے خوابوں کے جس سے ہوئے محل
اُس فکر کی پرواز ہے چھبیس جنوری

دُنیا میں سربلند ہوا جس سے ہند کا
وہ شانِ امتیاز ہے چھبیس جنوری

جمہوریت کے باب کے اوراقِ بے بہا
تاریخ کا اعجاز ہے چھبیس جنوری

اقدارِ زندگی کو ملی جس سے روشنی
اُس دور کا آغاز ہے چھبیس جنوری

جس نے کہ انقلاب کو بخشی نئی جلا
وہ عظمتوں کا راز ہے چھبیس جنوری

ہر ایک دل کی ہے یہ تمنّاؤں کا بیاں
جمہور کی آواز ہے چھبیس جنوری

عزم و عمل کا درس ہے دُنیا کے واسطے
عہدِ طلب کا راز ہے چھبیس جنوری

گاتے ہیں جس کی دُھن پہ زمانے نے اپنے گیت
وہ دل نشین ساز ہے چھبیس جنوری

جس سے ملے حقوق فرائض کے ساتھ ساتھ
دستور کا وہ راز ہے چھبیس جنوری

ذوقِ طلب کو جس سے ملی منزلِ عروج
وہ فکر کی پرواز ہے چھبیس جنوری

خاکہ ہے یہ ایک عدل و مساوات کا عاصی
آئینِ دلنواز ہے چھبیس جنوری

پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق

مرزا امیر علی جون پوری تو بجائے کتب فروشی کے آج کل اکبر حیدری کے خلاف پمفلٹ شائع کر رہے ہیں اور دوسرے دہلی کے کتب فروش جنہوں نے کشمیر کی اس لوٹ میں فائدہ اٹھایا تھا یہ پتہ نہیں ہے کہ کتب کا آرڈر دینے والوں کے خلاف کشمیر کے وزیر اعلیٰ کے ہاں شکایت پہنچ چکی ہے اور بہت جلد اس سلسلے میں انکوائری ہونے والی ہے ۔

چونکہ سیمانت پبلشرز کے مالک سوز صاحب کا کاروبار کشمیر میں ٹھپ پڑ گیا تھا اس لئے انہوں نے کھلر صاحب کی کتاب چھاپ کر ان کے کندھے پر بندوق رکھ کر کتب فروشی کی نئی راہیں نکالنی شروع کر دیں ۔

چونکہ کھلر صاحب کے اختیار میں ہے کہ حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کی طرف سے وہ متعدد لائبریریوں کے لئے کسی بھی مصنف کی تصنیف خاصی تعداد میں خرید سکتے ہیں چنانچہ ہم کھلر صاحب سے ہی دریافت کرتے ہیں کہ انہوں نے سیمانت پبلشرز کے ہاں سے شائع ہونے والی کتنی کتابیں آج تک سرکاری لائبریریوں کے لئے خریدی ہیں کیوں کہ وہ اپنی کتاب تو خرید نہیں سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی کتاب کی اشاعت کے احسان کے بدلے میں سیمانت پبلشرز کے مالک کو ہر طریق سے فائدہ پہنچایا چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اتر پردیش کی حکومت کے زیر کنٹرول لائبریریوں کے انچارج حضرات کی کانفرنس ہوئی تو جناب مہروترا صاحب آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی (لائبریز) یوپی نے سارے ہندوستان کا نمائندہ پبلشر کے طور پر سیمانت پبلشرز کے مالک سوز صاحب کو اس کانفرنس میں مدعو کیا تاکہ تمام لائبریرین صاحبان سے ان کا بالمشافہ تعارف ہو سکے اور یہ لائبریرین حضرات مہروترا صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سوز صاحب سے کتابیں خریدیں ۔ مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے سربراہ خواجہ عبد الغفور صاحب نے مہاراشٹرا اور دہلی وغیرہ کے بڑے بڑے اردو پبلشرز اور کتب فروشوں کو بالائے طاق رکھ کر سوز صاحب کو اردو اکاڈمی لائبریری کے لئے کتب کا آرڈر دیا ۔ کیا کھلر صاحب انکار کر سکتے ہیں کہ سوز صاحب کو خواجہ عبد الغفور سے متعارف کرانے والے وہ نہیں تھے ، یا مہروترا صاحب بتا سکتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں ان کی نظر انتخاب سوز صاحب پر ہی کیسے گئی جبکہ لکھنؤ میں ہی دانش محل ایسے اور جنوں ادارے ایسے ہیں کہ جن سے ملک بھر کے دکاندار اور لائبریرین کتابیں طلب کرتے ہیں ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کھلر صاحب انگریزی کے ایک ادیب ضرور ہیں انہوں نے سردار بھگت سنگھ پر بھی کتاب لکھی ہے ، غرضیکہ انگریزی کے اوسط درجے کے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے مگر اردو میں نہ تو ان کا کوئی مقام ہے نہ تھا ۔ اردو لکھ پڑھ لینا کوئی ادیب ہونے کی ضمانت نہیں ہے ۔ ہر پنجابی جو پاکستان سے یہاں آیا ہے وہ اردو لکھ پڑھ سکتا ہے اور کھلر صاحب کی تصنیف "اردو کا آخری نقاد" پر یوسف ناظم صاحب کا تبصرہ "گوشہ چینی" عرف کاف کاف کاف (کے ۔ کے ۔ کھلر) کی کتاب کی کہانی عنوان سے شانِ ہند کی اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے جس کے پڑھنے سے آپ کو علم ہو سکے گا کہ کھلر صاحب نے کس کس ادیب کی چوری کر کے یہ کتاب ترتیب دی ہے ۔ یوسف ناظم کا یہ تبصرہ پڑھنے کے بعد صاف پتہ چلتا ہے کہ کھلر صاحب کے خوشامدی حواریوں نے انہیں بدنام کرنے کے لئے اس کتاب کی اشاعت کی ترغیب دی اور اس کی آڑ میں یار لوگ ان سے فائدہ اٹھا گئے اور بدنامی ان کے سر آئی ۔

ہم اس سلسلے میں بہت جلد وزارت تعلیم کی سربراہ محترمہ شیلا کول سے ملاقات کر رہے ہیں تاکہ ان پر روشن کر سکیں کہ حکومت کو بدنام کرنے میں سرکاری افسران کس طرح ملوث ہیں اور عوام جب اس قسم کی غیر قانونی اور جانبداری کی کارروائیاں دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں حکومت وقت کے خلاف کیوں کر نفرت پیدا ہوتی ہے ۔

وزیر اعلیٰ کشمیر توجہ فرمائیں

حال ہی میں آپ کی حکومت نے بدعنوانی کے خلاف اقدامات اور وزیر داخلہ سمیت ممبران قانون سازیہ کو اپنے

اشاؤں کے گوشوارے داخل کرنے کا پابند بنانے کا اختیار
حاصل کرنے کے لئے جو آرڈیننس جاری کیا ہے اس کے لئے آپ
کی حکومت مبارک باد کی مستحق ہے کیونکہ عوام کو یہ یقین
ہو چلا ہے کہ اب رشوت دئے بغیر کوئی بھی سرکاری کام نہیں
کرایا جا سکتا اور تو اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ڈاک خانوں
میں اوسط درجے کے ادارے اپنے ہاں کی رجسٹرڈ وی پی اور
پارسل بک کرانے کے لئے دس پیسے فی آرٹیکل رشوت دینے
پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ بڑے بڑے ادارے تو سپیشل
جرنل حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی محکمہ میں معمولی سے
معمولی کام کے لئے بھی عوام یہ یقین کئے ہوئے ہیں کہ بغیر رشوت
اس کا کام ہو ہی نہیں سکتا لہذا اب یہ انتہائی ضروری ہو گیا
ہے کہ ہمیں رشوت اور بددیانتی کے خلاف جنگی پیمانے پر
کاروائی کرنی ہوگی تاکہ عوام کو یہ احساس ہو سکے کہ حکومت
رشوت ستانی کے خلاف قدم اٹھا چکی ہے۔ اس سلسلے میں
مودبانہ گزارش ہے کہ کشمیر میں جن اداروں کے اختیار میں لائبریریوں
کے لئے کتابیں خریدنا ہے ان کی بھی تحقیقات کرائی جائے کہ
ان اداروں کے سربراہوں نے چالیس فیصد کمیشن پر کتابیں
خرید کر بظاہر تو یہ دکھایا ہے کہ سرکاری روپیہ بچایا گیا ہے
مگر دراصل ایسی ردی اور بے کار کتابیں خریدی گئی ہیں جو
کباڑی بازار میں دو دو آنے میں مل جاتی ہیں کیونکہ یہ ناممکنات
میں سے ہے کہ بہترین اور مفید کتابیں چالیس فیصد کمیشن پر
دستیاب ہو سکیں۔ دار المصنفین۔ ندوۃ المصنفین۔ رام نرائن
لال اگروال۔ تیج کمار۔ دیگر کئی مستند اداروں کی مطبوعات
چالیس فیصد پر دستیاب ہونا ناممکن ہے جس کی وجہ سے
لائبریریوں میں بہترین کتابیں خریدی ہی نہیں جاتی ہیں بلکہ
کوڑا کرکٹ گندے جنسی ناول اور جاسوسی ناول اور
ایسی نام نہاد ادبی کتابیں جو بازار میں فروخت ہی نہیں ہوتی
ہیں خریدی جا رہی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ چالیس فیصد
کمیشن پر کتابیں خریدنے والے افسران اور لائبریرین اپنا
"حق محنت" الگ سے وصول کرتے ہیں لہذا جہاں آپ
کچھ مخصوص لوگوں کی بدعنوانی کے خلاف مہم چلانے لگے ہیں
وہاں علم اور ادب کے سلسلے میں بدعنوانی کرنے والے بددیانت
ملازمین سرکار کی بھی حدود اربعہ ناپنے کے احکامات جاری
فرمائیے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ آپ تک اس بدعنوانی کی اطلاع
پہنچ چکی ہے۔ شان ہند آپ کو یاد دہانی کے طور پہ یہ سطور
شائع کر رہا ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ بدستِ طفلاں

نیشنل بک ٹرسٹ میں مبینہ بدعنوانی کے بارے میں
راجیہ سبھا میں لوک دل ممبر جناب رامیشور سنگھ نے ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۲ء
کو یہ مطالبہ کیا تھا کہ نیشنل بک ٹرسٹ میں وسیع پیمانے پر
مبینہ بدانتظامی اور بدعنوانی کی پارلیمانی جانچ کرائی جائے۔
اس معاملے کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے ممبر موصوف نے کہا کہ
ٹرسٹ نے بچوں کے لئے دو لاکھ کتابیں شائع کی ہیں جن
میں سے ایک بھی فروخت نہیں کی گئی۔ ان کتابوں کو گوداموں
کے اندر دیمک چاٹ رہی ہے۔ مسٹر سنگھ نے الزام لگایا کہ
بعض عہدے داروں نے ان کتابوں کی طباعت میں لاکھوں روپے
بنا لئے ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ۔ ترقی اردو بورڈ، ساہتیہ اکاڈمی
اور پبلی کیشنز ڈویژن چار ادارے ہیں جو سرکاری طور پر کتابیں
شائع کرتے ہیں کسی کتاب کا شائع کرنا نہایت آسان ہے
مگر کتاب کا فروخت کرنا کافی مشکل کام ہے، یہ چاروں ادارے
بھی کتابیں شائع کرنے میں ایک دوڑ لگائے ہوئے ہیں۔
کیونکہ اس طرح جناب رامیشور سنگھ کے فرمان کے مطابق بعض
عہدے داروں کے وارے نیارے ہوتے ہیں اور ترجمہ، پروف
ریڈنگ، کتاب کے مسودہ۔ کتابت۔ طباعت۔ جلد بندی۔
کئی مراحل ایسے ہیں جن میں بعض عہدیداروں کے ذاتی مفاد
کے علاوہ ان کے دوست احباب بھی بہتی گنگا میں غوطہ
لگا لیتے ہیں۔ ان چاروں اداروں کے سیل ڈپو کے اراکین
سمجھتے ہیں کہ وہ سرکاری ملازم ہیں کتابیں فروخت ہوں
یا نہ اُن کی بلا سے اُنہیں تو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ
مل ہی جائے گی۔ اس لئے ان سرکاری اداروں میں کتابوں کی

نکاسی کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو ترقی بورڈ والوں نے کچھ دنوں تک کتابوں کی نکاسی پہ دھیان دیا بلکہ ایک خصوصی مہم چلائی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اُردو ترقی بورڈ کی کتابوں کی سیل ان چاروں اداروں میں سر فہرست تھی مگر جب سے مسعود صاحب یہاں سے گئے ہیں اس ادارہ کا حال بھی محض سرکار سے تنخواہیں وصول کرنا رہ گیا ہے۔ موجودہ ڈائریکٹر صاحب نے اب یہ تجویز عمل میں لانی شروع کی ہے کہ کم از کم پانچ صد روپیہ کی خریداری کتب پر لوکل ڈیلیوری کی جائے۔ پبلیکیشنز ڈویژن نے تو کتابوں کی خریداری پر دکانداروں کے لئے ایسی پابندی لگا رکھی ہے کہ جیسے اگر دوکاندار پبلیکیشنز ڈویژن کی کتابیں فروخت نہ کریں گے تو شاید بھوکے مر جائیں گے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دوکانداروں کے ہاں جب پبلیکیشنز کی کتابوں کا آرڈر آتا ہے تو خریدار کو لکھ دیا جاتا ہے کہ کتاب دستیاب ہی نہیں ساہتیہ اکاڈمی والے بھی یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کی بلا سے کتابیں فروخت ہوں یا نہ انہیں تو تنخواہ ملے گی ہی۔

نیشنل بک ٹرسٹ والے پہلے اُردو کتب کی ایک ہزار روپیہ کی خریداری پر چالیس فیصد کمیشن دیتے تھے اب یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ کم از کم تیس فیصدی بچوں کی کتابیں ساتھ خریدی جائیں تو ایک ہزار کی خریداری پر چالیس فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ اب اس کا کیا علاج کہ بچوں کی اُردو کتابیں خریدے کون اور جب خریداری ہی نہیں تو دوکاندار بیچے کہاں۔ لہذا بچوں کی کتابوں کی جبری فروختگی کے باعث دوسری کتابیں بھی فروخت نہیں ہوتی ہیں۔ دفتر شان ہند کے ساتھ بھی یہی معاہدہ تھا مگر اب یہ معاہدہ اس لئے ختم ہو گیا ہے کہ ہم تیس فیصد بچوں کی کتابیں نہیں خرید سکتے۔ جب اسکولوں میں بچوں کو اُردو پڑھائی ہی نہیں جاتی تو بچے ان کتابوں کو کیسے پڑھیں گے۔

ضرورت ہے کہ وزارت تعلیم اپنے ان چاروں اداروں کو کاروباری نقطۂ نظر سے چلائے نہ کہ سرکاری رعب داب رکھ کر کھاؤ کو عمل میں لایا جائے۔ تاکہ کتابیں زیادہ سے زیادہ فروخت ہو سکیں

باقی رہا بدعنوانی اور بددیانتی کا معاملہ تو اس سلسلے میں کچھ لکھنا فضول ہے کیوں کہ ہم نے اپنے ملک میں ایسا چلن قبول کر لیا ہے کہ اگر نعوذ باللہ، اللہ میاں بھی ہندوستانی شہریت اختیار کر لیں تو وہ بھی رشوت دئے بغیر اپنی خدائی نہ چلا سکیں۔

امید ہے کہ محترمہ شیلا کول صاحبہ مرکزی وزیر تعلیم اس سلسلہ میں کوئی مثبت قدم اٹھائیں گی۔

راجستھان اُردو اکاڈمی کے سابق سکریٹری کی وکالت

آنجہانی اختر جے پوری کی ایک نظم کے بارے میں جب "شان ہند" میں چیلنج کیا گیا کہ وہ چوری کی ہے اور اس کے خالق پاکستان کے مشہور شاعر شفقت کاظمی (مرحوم) ہیں تو جے پور سے ایڈیٹر شانِ ہند کو دھمکی آمیز اور گالیوں سے بھرے متعدد خطوط موصول ہوتے تھے۔ یار لوگوں نے یہاں تک چیلنج کیا تھا کہ سرور تونسوی جے پور میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اور جب "شان ہند" کا انکشاف سو فیصد صحیح ثابت ہوا تو سوائے جناب منظور احمد ادیب کے کسی نے بھی اظہار ندامت نہ کیا۔

اب جب کہ راجستھان اُردو اکاڈمی کے سابق سکریٹری صاحب سے متعلق یہ لکھا گیا کہ ان کے ہاں اکاڈمی کے ٹیلی فون کا ناجائز استعمال کیا گیا، اور اکاڈمی کے کئی ہزار روپے غلط طور پر ضائع کر دئے گئے تو بجائے اس کے کہ سابق سکریٹری کی اس بددیانتی کا نوٹس لیا جاتا کچھ سرپھرے ایڈیٹر شان ہند کو خطوط بھجوا رہے ہیں کہ ایڈیٹر شان ہند اور راجستھان اُردو اکاڈمی کے چیرمین کے دیرینہ دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے شان ہند میں چیرمین صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اکاڈمی کے سابق سکریٹری کے خلاف لکھا گیا۔ اور کچھ مسکین صورت حضرات یہ فرما رہے ہیں کہ چونکہ راجستھان اُردو اکاڈمی نے دفتر شان ہند سے اپنی لائبریری کے لئے کچھ کتابیں خریدی ہیں اس لئے شان ہند صاحب سکریٹری کے خلاف لکھ کر بدلہ لے رہا ہے کہ سابق سکریٹری نے دفتر شان ہند سے کتابیں کیوں نہیں خریدی تھیں۔

جب کوئی عقل کا اندھا بکواس محض کرنے پر ہی تُل جائے

تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ راجستھان میں اُردو اکاڈمی کے انعقاد کے لئے جس قدر کوشش ایڈیٹر شانِ ہند کی ہے کسی دوسرے کی ہے ہی نہیں اس کی شہادت جناب بھیرون سنگھ شیخاوت دے سکتے ہیں جب کہ وہ راجستھان کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور انہوں نے ہی اُردو اکاڈمی قائم کی تھی۔ خطوط لکھنے والوں کو یہ علم ہی نہیں کہ ایڈیٹر شانِ ہند نے راجستھان اُردو اکاڈمی قائم کرانے کے سلسلہ میں کس قدر جے پور کے چکر لگائے اور آدھی آدھی رات تک وزیرِ اعلیٰ کی رہائش گاہ پر اس سلسلے میں گفتگو کرنے کے لئے رکنا پڑا۔ دفترِ شانِ ہند کی طرف سے سابق سکریٹری صاحب سے کبھی بھولے سے بھی یہ درخواست نہیں کی گئی تھی کہ وہ دفتر شانِ ہند سے لائبریری کے لئے کتابیں خریدیں۔ اور اگر اب کچھ کتابیں دفتر شانِ ہند سے خریدی گئی ہیں تو یہ کتابیں وہ ہیں جو جے پور کے کسی کتب فروش کے ہاں نہیں تھیں، اور اکاڈمی نے اپنی شرائط پر یہ کتابیں خریدیں کاروباری لحاظ سے دفتر شانِ ہند کا بھی کتب فروشی میں اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی دوسرے کتب فروش کا۔

رہا یہ کہ ایڈیٹر شانِ ہند اور چیرمین اکاڈمی کے تعلقات دوستانہ ہیں تو اس سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی مائی کا لعل چیرمین راجستھان اُردو اکاڈمی یا سکریٹری صاحب اکاڈمی کے فرائضِ منصبی میں کوتاہی یا بددیانتی یا کسی ناجائز رعایت کے بارے میں ٹھوس ثبوت پیش کرے تو پھر دیکھئے کہ شانِ ہند کا ایڈیٹر کس انداز میں حقِ دوستی ادا کرتا ہے۔

ہم ایسے خطوط لکھنے والوں سے صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے خطوط لکھتے وقت اس کا بھی خیال رکھا کریں کہ وہ کسی شریف کی اولاد ہیں۔

سحرِ حرف

اُردو کے مشہور اور مُلک گیر بلکہ برصغیر ہند و پاک میں شہرت رکھنے والے شاعر جناب ساحر ہوشیارپوری کے تیسرے مجموعۂ کلام "سحرِ حرف" کی رسمِ اجرا پچھلے دنوں نائب صدر جمہوریہ ہند عالیجناب محمد ہدایت اللہ صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ادا ہوئی۔ اس مبارک موقع پر صاحب موصوف نے ساحر صاحب کو ایک اونی شال ہدیۃً عطا فرمایا اور اپنے مقالہ میں نائب صدرِ ہند نے اُردو شاعری پر سیر حاصل تبصرہ فرماتے ہوئے کلامِ ساحر کا بہت ہی اچھے انداز میں تجزیہ بھی فرمایا خیر مقدمی تقریر جناب مالک رام صاحب نے فرمائی اور ساحر کی شخصیت پر جناب ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) جناب نکر تونسوی اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے تفصیلی روشنی ڈالی۔ جناب این کے پی۔ سالوے مرکزی وزیر ریاست برائے اطلاعات و نشریات بھی اس تقریب میں تشریف فرما تھے۔

ساہتیہ منچ جالندھر اور مہا بیر کلچرل فورم ہوشیار پور کی طرف سے بھی جناب ساحر ہوشیارپوری کو غزل ایوارڈ دے کر ان کی عزت افزائی کی گئی۔

مندرجہ بالا تینوں تقریبات سے متعلقہ تصاویر شانِ ہند کی زیرِ نظر اشاعت میں شائع کی جارہی ہیں۔

اُردو کا عرشی زادہ طریقۂ تعلیم

اُردو کے عرشی زادہ طریقۂ تعلیم پر قومی زبان میں جناب محمد فیروز دہلوی کا مضمون پڑھنے کے بعد عرشی زادہ صاحب سے اس سلسلہ میں بالمشافہ مفصل تبادلۂ خیال کیا گیا اور یہ تسلیم کرنا ہی پڑا کہ اس طریقہ سے یقینی طور پر مسلمان بچہ اُردو لکھنا پڑھنا چند دنوں میں سیکھ سکتا ہے کیوں کہ کسی بھی مسلمان گھر میں بچوں کو قرآن ضروری پڑھایا جاتا ہے اور جو بچہ یا جوان قرآن پڑھ سکتا ہے وہ عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کی رُو سے اُردو میں از خود لکھنا پڑھنا سیکھ سکتا ہے۔ عام طور پر اُردو ناخواندہ مسلمان قرآن پڑھتے ہیں حالاں کہ وہ عربی زبان نہیں جانتے مگر اس طریقہ سے وہ سب اُردو سے آشنا ہوسکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع شروع میں اس طریقۂ تعلیم سے اُردو کی مشق کرنے والوں کی املا درست نہیں ہوگی (اور ویسے بھی ہمارے ہاں اُردو کے پی۔ ایچ ڈی تک اُردو املا کی غلطیاں کرتے ہیں)

تاہم اس طریقۂ تعلیم سے کم از کم مسلمانوں میں اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس وقت اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خواہ اسے صرف مسلمان ہی پڑھیں مگر پڑھیں تو سہی۔ لہٰذا ہر اُردو دان جو واقعی اُردو کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کرے اور مسلمان کے ہر گھر میں اس طریقۂ تعلیم سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے اسکیم چلائی جانی چاہئے۔

عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کے بارے میں متعدد خطوط قومی زبان خصوصاً (لکھنؤ ایڈیشن) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں کراچی کی ایک محترمہ کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ یہ طریقۂ تعلیم پاکستان میں بھی مقبول ہو سکتا ہے، ہم عرشی زادہ صاحب سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے اس طریقۂ تعلیم کے بارے میں ایک پمفلٹ لکھیں جس میں اس پر مفصل روشنی ڈالی جائے اور اس پمفلٹ کو اُردو کی بقا و حیات کے ضامن ادارے کثیر تعداد میں شائع کرائیں۔ اور اس کتابچہ کو ہر مسلمان گھرانے تک پہنچایا جائے تاکہ اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے۔ ہر اُردو اخبار اور رسالے کا یہ فرض ہے کہ عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کو پھیلانے میں حتی المقدور کوشش کرے اور عرشی زادہ صاحب کو ہر ممکن تعاون دے۔ کیوں کہ اُردو رسائل و جرائد کی اپنی بقا و حیات کے لئے بھی یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ملک میں اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس سلسلہ میں شانِ ہند کے اوراق حاضر ہیں۔

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

کل راجستھان اردو کنونشن جے پور کی تقریبات کے سلسلے میں ۳۰ مارچ ۱۹۵۶ء کو ایک طرحی مشاعرہ کنونشن کے پنڈال (مسلم مسافر خانہ) میں ہوا۔ طرح مصرع تھا ع

ہم کو جینا ہی نہیں تیرے کرم احسان ہو کر

ایک بزرگ اسٹیج کے عین سامنے تشریف فرما تھے جو ہر اچھے شعر پر نہایت باسلیقہ اور سلجھی ہوئی داد دے رہے تھے۔ نشتر راشادی فرمانے لگے سرور صاحب یہ شخص جس انداز سے داد دے رہا ہے وہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ یہ صاحب جوانی میں بلا کے عاشق رہے ہوں گے۔ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے دل کی کیفیت کے آئینہ دار ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھے شعر کا اثر کس قدر قبول کرتے ہیں۔ دیکھا تو ایک نوعمر صاحبزادے احمد الدین اثر جے پوری مائیک پر تشریف لائے اور مطلع کے بعد یہ شعر پڑھا ؎

دور رہتے ہیں تو رہتے ہیں تصور سے بھی دور
پاس رہتے ہیں تو رہتے ہیں رگ جاں ہو کر

ایک عجیب و غریب آہ کے ساتھ جو والہانہ داد اس بزرگ نے دی تو سامعین اور اسٹیج پر بیٹھے معززین اور شعرائے کرام ان بزرگ کی آہ و واہ کے مجذوبانہ انداز پر محو حیرت تھے ان حضرت کی اس والہانہ اور مجذوبانہ داد کا یہ اثر ہوا کہ ہر سامع نے داد دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور احمد الدین اثر کا یہ شعر حاصل مشاعرہ ہو کر رہ گیا۔

میں نے ان بزرگ سے مخاطب ہو کر کہا کیوں جناب یہ اثر صاحب آپ کے شاگرد ہیں جو آپ انہیں اس قدر زیادہ داد دے رہے ہیں۔ اس پر یہ بزرگ تلملاتے ہوئے فرمانے لگے، اجی لعنت بھیجیے استادی شاگردی پر میں تو داد شعر پر دے رہا ہوں میری بلا سے شعر کہنے والا کوئی بھی ہو میرے قریب جناب ساغر اجمیری تشریف فرما تھے میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ بزرگ کون ہیں تو ساغر صاحب فرمانے لگے ارے آپ انہیں نہیں جانتے یہ ہیں استاد صولت ٹونکی۔

مشاعرے کے بعد ساغر صاحب نے میرا تعارف تب صولت ٹونکی سے کرایا اور پھر زندگی کی آخری گھڑی تک انہوں نے مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھا۔

احمد آباد ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں جانا ہوا۔ ٹونک سے استاد صولت صاحب اور عیش ٹونکی بھی مدعو تھے۔ احمد آباد دیکھنے کے لئے ہم سب قیام گاہ سے نکلے تو کچھ ہی فاصلے پر اسکول سے آرہی ایک انتہائی خوبصورت طالبہ ایک سانڈ کے ڈر سے دبکی کھڑی تھی اور سانڈ قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور لڑکی خوف سے سہمی پیچھے ہٹتی جا رہی تھی اور سانڈ اپنے سر کو جھکائے حملہ آور ہونے ہی کو تھا کہ صولت صاحب نے بسم اللہ کہتے ہوئے سانڈ کے دونوں سینگ پکڑ لئے اور عیش ٹونکی گھبراہٹ میں زور زور سے صولت صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں چھوڑ دیجئے سانڈ کے سینگ مگر دھان پان سے صولت صاحب میں نہ معلوم کہاں اتنی طاقت آگئی تھی کہ سانڈ ساکت و جامد ہو کر رہ گیا اور لڑکی تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ صولت صاحب نے سانڈ کے سینگ چھوڑے تو سانڈ سے ایک طرف چلا گیا اور صولت صاحب اپنی چھڑی سنبھالتے ہوئے لڑکی کے پیچھے پیچھے چل دئے اور ہم دونوں صولت

پیچھے پیچھے چلے گئے۔ دیکھا کہ لڑکی ایک زینہ سے مکان کی دوسری منزل پر چلی گئی اور صولت صاحب بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چلے گئے۔ ہم دونوں بھی حیران و پریشان صولت صاحب کی پیروی کرتے ہوئے اوپر چلے گئے تو دیکھا کہ لڑکی کی والدہ صولت صاحب سے پوچھ رہی تھی بابا آپ کون ہیں اتنے میں لڑکی اپنی ماں سے کہنے لگی ممی اس بابا نے مجھے ایک سانڈ کے حملے سے بچایا ورنہ سانڈ مجھے مار ہی ڈالتا۔ لڑکی کی ماں نے صولت صاحب کا شکریہ ادا کیا تو فرمانے لگے: بائی مجھے آپ کی بچی اچھی لگی اور میں اس کی سراسیمگی اور خوف سے کانپنا نہ دیکھ سکا اور اس کی خوبصورتی ہی مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ میں اور عیش ٹونکی صولت صاحب کے اس فرمان پر نہ صرف حیران ہوئے بلکہ ہمیں یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ یہ خاتون کہیں صولت صاحب کو بُرا بھلا نہ کہیں مگر اس نیک خاتون نے بڑے احترام کے ساتھ صولت صاحب کو کرسی پر بٹھایا اور ہمیں بھی بیٹھنے کے لئے کہا اور پُر تکلف چائے پلائی اور وہ لڑکی اس عرصہ میں صولت صاحب ہی کے پاس میٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب ہم اس مکان سے نیچے آئے تو میں نے صولت صاحب سے کہا میاں اگر لڑکی کی ماں آپ کے فرمان پر بُرا مناتی اور ہم سب کی بے عزتی کرتی تو اچھا ہوتا۔ قہقہہ لگاتے ہوئے صولت صاحب فرمانے لگے: "بیٹا جس خدا نے سرکش سانڈ کو ساکت و جامد کر دیا وہ نیک خاتون کو بُرا بھلا کیسے کہنے دیتا۔"

لیجئے حضرت احسان دانش مرحوم کی ایک غزل بھی سن لیجئے جو وہ لاہور کے بازاروں اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر ترنم سے پڑھ کر کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔ یہ غزل ان کی شاعری کے ابتدائی دور کی ہے۔

راز افشا خلق پر میرا اگر ہو جائے گا
دیکھ لینا جو سُنے گا پتھر ہو جائے گا
بڑھ گیا ہے بد قرینوں سے ترا بیحد رسوخ
شہر میں بدنام تو رشکِ قمر ہو جائے گا

باندھ کر جرّاح یوں بولا نمک کی کنکریں
خشک دو دن میں ترا زخمِ جگر ہو جائے گا
او ستمگر ایک ہی دو وار کافی ہیں مجھے
دیکھ دامن خون کے چھینٹوں سے تر ہو جائے گا
وصل کی شب دی اگر اللہ اکبر کی صدا
حسرتوں کا خون اے مرغِ سحر ہو جائے گا
کیا کرے گی ماتمِ فرہاد شیریں کوہ پہ
خشک دو دن میں گلو تے نوحہ گر ہو جائے گا
کیا کہے گا سامنے اس کے تو میرا حالِ زار
دیکھ کر غش مجھکو طاری نامہ بر ہو جائے گا
کب سنو گے اے شہا احسان پر بیتی ہوئی
مدعا پورا یہ کب خیر البشر ہو جائے گا

بعض اوقات شعراء کا کلام دلچسپ صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے جیسے ڈاکٹر ساغر اعظمی کا ایک قطعہ ہے جسے انہوں نے مشاعرہ دیوبند میں ۱۹۸۰ء میں پڑھا ارشاد ہوا ہے

وہ جس کے ساتھ بہت دُور مجھ کو جانا تھا
سُلوک اس کا مرے ساتھ تاجرانہ تھا
بس ایک تیرا مجھے انتظار تھا ورنہ...
کسی درخت کا سایہ تو اک بہانہ تھا

اب اسی مضمون کو گل خلیقی جے پوری کے قطعہ میں دیکھئے جو انہوں نے مشاعرہ جاوٗ پورہ جے پور میں ۱۹۷۹ء میں پڑھا، فرماتے ہیں ؎

وہ جس کے ساتھ مرا ربطِ مخلصانہ تھا
سُلوک اُن کا مرے حق میں تاجرانہ تھا
مجھے تو اصل میں تیری تلاش تھی ورنہ
جنونِ دشت نوردی تو اک بہانہ تھا

ایسے کہاں ہیں لوگ؟

فکر تونسوی

میں ایک مرتبہ ہوشیار پور گیا تھا، جو مجھے پسند نہیں آیا شہر کیا تھا۔ ایک بے رُخ پھیلا ہوا اُدبرکھا بڑ درخت۔ جس میں نہ ٹہنیاں تھیں نہ پھل اور نہ پھول ـــ یوں لگا کوئی ظالم جھکڑ آیا ہوگا، ٹہنیاں، پھول اور پھل نگل گیا، درخت چھوڑ گیا۔

دہلی آیا۔ تو ایک روشن طبع نوجوان سے ملاقات ہوئی مارکس اور اینگلز سے کم پر بات ہی نہیں کرتا تھا میں نے پوچھا "پیارے! کون سی مٹی کی پیداوار ہو؟"

وہ بولا "ہوشیار پور سے آیا ہوں"

ٹریجڈی یہ ہوئی کہ رفتہ رفتہ کئی حضرات میرے قریب آئے۔ ایک آئی۔ اے۔ ایس؛ ایک ایم۔ اے پاس اُبیلا شاعر، ایک ذہین ترین، یہ بھی شاعر، سبھی دروغ بیانی سے محروم، کیوں کہ سبھوں نے حلف اُٹھا کر مجھے پریشان کر دیا کہ ہم بھی ہوشیار پور کی تخلیق ہیں۔

اور پھر ایک محفل میں جب میں ایک شعر پہ پھڑک اٹھا کہ ؎

حوصلہ انسان بننے کا نہ تھا
آدمی اشر سے ڈرتے رہے

پوچھا "یہ ظالم شاعر کون ہے یارو؟"

اور ظالم شاعر نے خود ہی بڑے آداب اور تواضع سے ارشاد فرمایا "ناچیز کو ساحرؔ ہوشیار پوری کہتے ہیں"

ہوشیار پور؟ وہی اُدبرکھا بڑ درخت! مگر جو بھی اس درخت سے اُگتا ہے خوشبو، حسن، لطافت اور ذہانت کا گلدستہ۔ جھک مار کر مجھے اپنی پہلی تھیوری بدلنا پڑی۔ لگتا ہے، اس درخت کی ٹہنیاں، سرسبزی، پھول اور پھل، باہر نہیں بلکہ زمین کے اندر اُگتے ہیں۔ روشنیٔ طبع میں یہ شہر انڈر گراؤنڈ ہے۔

اور پھر ساحرؔ ہوشیار پوری کے ساتھ دو چار ملاقاتوں کے بعد میرے ساتھ المیہ نمبر ۲ یہ ہوا کہ ہوشیار پور شہر کو زرخیز تسلیم کرنا پڑا۔

اور پھر المیوں کی تعداد بڑھتی گئی کہ ساحرؔ اچھا شاعر ہی نہیں ہے، اچھا انسان بھی ہے (حالاں کہ ایک ساتھ دونوں اچھائیوں پر اعتبار کم ہی آتا ہے) اور یہ کہ ساحرؔ باغی اور روایت شکن ہے۔ مال اور متاع سے بھرپور زندگی پر لات مار کر حسن پرستی کا شعار اپنا لیا۔ اس جرم میں بھوکا مر سکتا تھا، مر نہیں پایا۔ کیوں کہ جرأت رندانہ اس کی شعری سوچ میں تھی ـــ میں طوائفوں کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ طوائفیں اس کی غزلیں گاتی تھیں، خود بھی سر دُھنتی تھیں دوسروں کے سر بھی دُھناتی تھیں۔

میں یہ تو ساحرؔ سے ملاقات سے پہلے بھی جانتا تھا کہ وہ چھوٹی بحر میں غزل لکھتا ہے اور بڑی بات کہہ جاتا ہے وہ اس طرح کا نعرہ بند مولوی نہیں ہے جو بڑے بڑے الفاظ میں چھوٹی چھوٹی باتیں کہتے ہیں اور پھر جیسے سر غرور بلند کر کے سامعین کی طرف اس نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہیں "بس یوں ثابت ہوا کہ میں عالم و فاضل ہوں!"

لیکن ساحرؔ کی تقدیر میں ایسی نگاہ نہیں ہے۔

کیوں کہ وہ بڑے معصوم لہجے میں شعر سناتا ہے، تو خود شعر کی معصومیت ہی اسے علم و فضل کے مرتبہ تک لے جاتی ہے ـــ اردو میں شاید دو تین شاعر ہی ایسے ہوں گے (اور وہ بھی شاید نہیں ہوں گے) جو مسلسل چھوٹی بحر میں غزل لکھتے ہوں اور بڑی بات کہہ سکتے ہوں۔ یہ مرتبہ بلند تو ہے، ممکن ہے کسی اور کو ملنا ہو، مگر ساحرؔ کو مل گیا۔ ہم اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔

ساحر کی ایک رُوح ہے جو شعر میں بند ہے، ساحر کا ایک جسم بھی ہے، ایک زمانہ تھا، جسم پر تابندگی برستی تھی، میں اس کی رُوح پر فدا تھا، جسم دوسروں کے لیئے وقف کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ جس محفل میں تابندہ اور مودّب ساحر ہوشیار پوری ہوتا۔ میری اُس سے بے تکلفانہ صحبت کم رہتی۔ بے تکلفی میں گالی گلوچ اور آیا وہاں تک شامل ہوتی ہے۔ البتہ یہ اطلاعات اکثر ملتی رہتی ہیں کہ ساحر حدِ آداب سے کبھی آگے نہیں بڑھا، البتہ ایک شاعر جو نشہ ہے میں مبتلا تھا اس نے ایک مرتبہ ساحر کے ساتھ بے تکلفانہ برتری کا مظاہرہ کیا تو ساحر نے اس کے رُخسار پر تکلفاً زنانے کا طمانچہ جڑ دیا تھا، یہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔

لیکن میرا نصیب، ساحر کی بے تکلف صحبت سے محروم رہا شاید اسی لیئے میں زمانے کے تھپیڑے سے بھی محروم رہا، سُنا ہے اس کے اکثر و بیشتر اہلِ محفل محروم رہے کیوں کہ ساحر یا تو اُن کا احترام کرتا اور یا وہ ساحر کا احترام کرتے۔

میرے معاملے میں دو طرفہ احترام قائم رہا۔ آج بھی جبکہ اس کی شاعری نوکیلی ٹیسوں کی منزل سے گزر رہی ہے وہ اور ہم دو طرفہ احترام سے نجات نہیں پا سکے۔ چہرے کی تابندگی اپنا حسین کھیل ختم کرکے لوٹ گئی، لیکن اپنے ساتھ نہ اس کا بے ساختہ قہقہہ لیجا سکی اور نہ اس کی مودّب روح کی تابندگی —— آج بھی جب وہ محفل میں کوئی شعر سُناتا ہے تو میری جان کھینچ لیتا ہے۔

ساحر نے زندگی کو ہمیشہ سنجیدگی اور مسرت سے جھیلا انتہائی تلخ واقعات بھی اس کے صبر اور ذہانت کا دامن تار تار نہ کر سکے۔ مجھے وہ زمانہ کبھی نہیں بھولتا جب بڑے بڑے شاعرانہ اجتماع میں ساحر ہوشیار پوری کو بڑے بڑے شاعروں کی صف اور صحبت میں شمار کیا جاتا تھا۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھ پوری اور جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری جو ہر شاعرے کو یوں آسانی سے لُوٹ لیتے جیسے یہ اُن کی آبائی جائداد ہو لیکن میں نے خود دیکھا کہ ساحر ہوشیار پوری کا چھوٹا مصرع کبھی اپنی بڑی بات کے زور سے مشاعرہ آسانی سے لوٹ لیتا تھا بلکہ جوش اور فراق کے مقابلے پر زیادہ آسانی سے لوٹ لیتا تھا۔

گذشتہ دنوں ایک ملاقات میں اچانک اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا تم اللہ کو مانتے ہو؟"

میں خاموش رہا۔

وہ بولا "مگر میں جانتا ہوں کہ تم اللہ کو نہیں مانتے۔"

میں خاموش رہا۔

کہنے لگا "دیکھو، تمہارے اندر جو لٹریچر ہے، وہ خُدا کی دین ہے کیا تم مانتے ہو"

میں خاموش رہا۔

بولا "اچھا خیر! اللہ کو مانا کرو، اس سے تسکینِ قلب ہوتی ہے"

میں خاموش رہا۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ ایک تیرتھ یاترا پہ چلا گیا ہے جب لوٹا تو مزارِ غالب پر ملاقات ہو گئی اُس نے انکشاف کیا کہ میں نے مے نوشی سے توبہ کر لی ہے۔

میں نے کہا "توبہ؟ مگر بغل میں وہسکی کی یہ بوتل کیوں ہے!"

وہ ہنس کر بولا "ارے یہ تو مزارِ غالب کی چادر پر چھڑکاؤ کرنے کے لیئے لایا ہوں"

میں نے طنزاً کہا "ساحر! توبہ کے بعد مزارِ غالب چھڑکاؤ؟ یہ کیا، مذاق ہے؟ کیا یہ تیرتھ یاترا کرتے کرتے سوجا"

اُس نے میری کمر میں عاشقانہ اسٹائل میں اپنی نحیف باہیں ڈال دیں اور کہا "سُنو، تیرتھ یاترا پر ایک شعر ہو گیا تھا تم اللہ کو نہیں مانتے، مگر پھر بھی سُنو، کہ میں مزارِ غالب پر وہسکی کا چھڑکاؤ کرنے کیوں آیا ہوں، سُنو ؎

سانس لینے کو اگر کہتے ہیں جینا ساحر
سانس لینے کے بھی انداز بدلتے رہیئے

تذکرہ شعرائے اُجین

محمد خالد عابدی
آل انڈیا ریڈیو اندور

عطا الٰہی صدیقی گوالیاری

آپ گوالیار میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت بھی گوالیار میں ہوئی۔ گوالیار میں پروفیسر نارائن پرشاد ورما مہر جانشین داغ اور مضطر خیرآبادی وغیرہ کا زمانہ تھا بڑے پیمانے پر مشاعرے ہوتے تھے ان مشاعروں میں حسرت موہانی جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، فانی بدایونی، مانی جائسی اور دیگر شعراء تشریف لاتے تھے ان مشاہیر شعرا کی خدمت میں حاضری اور مشاعروں اور نشستوں میں آپ کو بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوتی تھی، چنانچہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی شعر و ادب کا ذوق و شوق پیدا ہوا۔

سلطان صدیقی نے آپ کے تعارف میں مجھے لکھا ہے کہ

"ریاست گوالیار کے سپرنٹنڈنٹ کسٹم اور اکسائز کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر اُجین میں ۱۹۵۲ء میں میونسپل کارپوریشن میں "اکٹرائے ڈپارٹمنٹ" قائم کرنے کے لئے "سپرنٹنڈنٹ" مقرر ہوئے۔ اُجین آکر آپ کا جذبۂ شاعری بیدار ہوا اور باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اس زمانہ میں اُجین میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر گوری پرشاد کچلو ادب نواز اور شاعر تھے ان کی سرپرستی میں کارتک میلہ اور نمائش میں آل انڈیا مشاعروں کا آغاز ہوا، بالعموم مشاعروں کی نظامت آپ ہی کرتے تھے ۲۶ جنوری جشنِ جمہوریت، پندرہ اگست جشنِ آزادی پر بھی میونسپل کی جانب سے مشاعرے کئے جاتے تھے۔"

عطا صدیقی گوالیاری نے کسی سے اصلاح نہیں لی ہے بلکہ کثرتِ مطالعہ، غور و خوض اور ذاتی تنقید و اصلاح سے اپنے کلام کو درست کرتے ہیں۔ آپ فطری شاعر ہیں تقریباً سب ہی اصناف پر قلم اٹھا چکے ہیں سلطان احمد صدیقی نے ان کی خدمات اور شاعری کے بارے میں مجھے ان سطور کے ذریعے مطلع کیا کہ

ہندوستان کے مختلف رسایل میں ۱۹۵۳ء سے آپ کا کلام شائع ہو رہا ہے آپ کا مجموعۂ کلام "دودل" کے نام سے ترتیب دیا جا چکا ہے۔ عنقریب اشاعت متوقع ہے آپ نے اُجین میں رہ کر شعر و ادب کی خدمت کی ہے، نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں آپ کی سفارش سے اُجین کی "بزمِ ادب" "بزم اہلِ ادب" اور انجمن ترقی اُردو شاخ اُجین کو گوری پرساد کچلو نے سالانہ امداد دینا منظور فرمایا تھا جو ہنوز جاری ہے، حضرت عطا صدیقی روایت سے ہٹ کر ترقی پسند، جرأت، ندرت، زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے شعر کہتے ہیں، آپ کی شریکِ حیات کلثوم کی مرگِ ناگہانی نے آپ کی شاعری میں درد و غم کا رنگ بھر کر کلام کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے جس کا اعتراف عطا صاحب نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔

نمونۂ کلام

قہقہہ زیست کے ہر غم پہ لگایا جائے
خود کو اتنا بھی نہ سنجیدہ بنایا جائے

اپنے ماضی پہ بہت ناز ہے اب تک اس کو
وقت کو حال کا آئینہ دکھایا جائے

دیکھے صورت جو کوئی تو اسے آجائے ترس
غم کے معیار کو اتنا نہ گرایا جائے

ہم کبھی بھی تعصب میں نہیں گردشِ دوراں
تو جتنا بگاڑے گا سنور جائیں گے ہم لوگ

پھولوں کی طرح جمع ہیں اس کنج میں آج ہم
کل خوشبو کی مانند بکھر جائیں گے ہم لوگ

ہر روز غمِ زیست کے جھگڑوں سے نپٹ کے
رو لیتے ہیں شب کو تری یادوں سے لپٹ کے
یہ زندگی کوئی تو مسرت نہیں دیتی
کیوں رہ گئی وہ دور کے خانوں ہی میں بٹ کے

ترتیب دے سکے نہ عقاؔ زیست کی کتاب
ہر باب میں خوشی کی نہیں تشنگی لگے
ضد ہے میری طبع کو نام و نمود سے
کس منہ سے یہ عقاؔ کہوں فن کار ہیں بڑا
یہ انقلاب کہ جب لوٹ کر وطن آئے
خود اپنا گھر بھی نہیں آج اپنا گھر نہ لگا
مل سکا تنہائی میں مجھ کو نہ اک لمحہ سکوں
میں اکیلا اور تری یادوں کے بیتے سائے بہت

محمد یعقوب ناچیزؔ اندوری

آپ کا اصل نام شیخ محمد یعقوب ابن شیخ کلن ہے۔ ہوچھاؤنی میں ۱۹۱۱ء میں آپ کی ولادت ہوئی، بقول سلطان احمد صدیقی "آپ نے اپنے ابتدائی کلام پر منظر صاحب سے اصلاح لی۔ آپ اندور میونسپل کارپوریشن میں "داروغہ" تھے۔ جب چھوٹے لال دوبے ریونیو افسر اندور سے اُجین منتقل ہوئے تو شیخ محمد یعقوب بھی ان کے ہمراہ ۱۹۵۱ء میں میونسپل اُجین میں ملازم ہو گئے۔ اُجین میں آپ نے حضرت گویا قریشی اُجینی سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔ آپ نے سب ہی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کی ہے لیکن غزلیات زیادہ کہی ہیں"

آپ کے کلام میں قدیم رنگ ہے نیز سلاست، سادگی اور روانی پائی جاتی ہے ۱۹۷۶ء میں مختصر علالت کے بعد تقریباً چھپن۶۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ آپ کے صاحبزادہ

محمد یٰسین نے آپ کا منتشر کلام یکجا کر لیا ہے اور غالباً وہ اس کی ترتیب بھی دے رہے ہیں۔

نمونۂ کلام

کوئے قاتل میں بار بار چلے ؛ خلد میں آج جاں نثار چلے
دشت میں جھوم اٹھے دیوانے ؛ کر گریباں کو تار تار چلے
باتیں اغیار سے ہوں مِل جُل کر ؛ تم سے بازی کو تو ہم ہار چلے
کیوں نہ ہو مجھ کو بھی مسرت اب ؛ ہو کے اس گل سے ہم کنار چلے

عدو ہیں بزم میں لیکن یہ خاکسار نہیں
کسی سے کیا کہیں جب دل پہ اختیار نہیں
خزاں کے دَور نے تاراج کر دیا گلشن
بہار آئی گلوں پر ذرا نکھار نہیں
خدا کے واسطے صورت دکھا دے اپنی
المیہ رو برو میرے وہ پردہ دار نہیں
ترے ہی فضل و کرم میں ہمیشہ نازاں ہوں
گناہ گار ہوں مولا میں بے شمار نہیں
خود اپنے مولا سے ہر وقت گڑگڑاتا ناچیزؔ
رہ چکے چپکے مگر دیکھو زار زار نہیں

محمد عبدالرشید اُجینی

آپ ۱۹۱۰ء میں اجین میں پیدا ہوئے اُردو، عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے کا ذوق پیدا ہوا۔ شاعری ورثے میں پائی ہے آپ کے والد ماجد بھی موزوں طبع تھے اور خالو نصیر علی نزشؔ تو اپنے زمانہ کے اچھے شعراء میں شمار کئے جاتے تھے ——

سلطان احمد صدیقی نے آپ کا تعارف، ادبی خدمات اور شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

"پہلی غزل حضرت اُستاد عظیم صاحب کو دکھائی، بعدہ اپنے خالو نصیر علی نزشؔ شاگرد سید کرامت علی بشرؔ سے اصلاح لی۔ کچھ عرصے کے بعد نصیر علی نزشؔ نے آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے سید کرامت علی تبوؔ کے سامنے پیش کر حلقۂ تلامذہ میں شامل کرا دیا۔ (باقی آئندہ)

گوشۂ حسینی عرف کاف، کاف، کاف کی کتاب کی کہانی

از:- یوسف ناظم

آج سے کوئی آٹھ سال پہلے یعنی اپریل ۷۴ء ۱۹ میں ماہنامہ "آج کل" دہلی نے ایک طنز و مزاح نمبر شائع کیا۔ ایڈیٹر تھے مہدی عباس حسینی لکھنؤ کے رہنے والے عام طور رقیق القلب اور ہمدرد لوگ ہوا کرتے ہیں کیوں کہ یہی مشیتِ ایزدی ہے۔ انہوں نے ازراہِ ہمدردی میرا بھی ایک مضمون اس خاص نمبر میں شائع کر دیا۔ عنوان تھا "آئینے میں" اور خاص طور پر ادیبوں کو خفا کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ مضمون میری کتاب فقط میں بھی شامل ہے اور یہ اس لئے شامل ہے کہ میں اسے ہمیشہ اپنا ہی مضمون سمجھتا رہا۔ خوش فہمی کا کوئی علاج نہیں۔ اس مضمون کے کچھ جملے یوں ہیں۔ لیکن ٹھہر جائیے۔ یہ جملے کچھ دیر بعد پیش کروں گا۔

میں اب تک خوش تھا اور مطمئن تھا کہ اب اتنے سال گزر گئے ہیں تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ میں نے یہ جملے کہاں سے لئے ہیں لیکن اب کے کے کھلر کی کشف و کرامات اور کیفیت و کمیت سے لبریز کتاب الکتب "اردو کا آخری نقاد" چھپ کر کہکشاں کی طرح سامنے آئی تو اپنی کم مائیگی پر کفِ افسوس ملنے کو جی چاہا اور صفحہ ۲۲۴ پر نظر پڑی تو دل دہل گیا۔

فاضل مصنف کے کے کھلر نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان بھی اردو کا آخری نقاد ہے اردو کے نقادوں کے بارے میں اپنی رائے دی ہے، یہی رائے اس خاکسار نے ادیبوں کے بارے میں پیش کی ہے یہی کوئی ۸ سال پہلے۔ دونوں مضامین ایک ساتھ پڑھیے تو صورت حال کچھ ایسی نظر آئی۔

ادیب کے بارے میں
(یوسف ناظم)

اچھا ادیب وہ ہوتا ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے دودھ خود پی لے اور پانی اپنے پڑھنے والے کی خدمت میں پیش کر دے

ادیبوں کے پاؤں میں سنیچر ہوتا ہے [illegible] میں [illegible] از ادبی

کھلی چھٹی۔

پہلے زمانے میں ادیب سُنا پیدائشی ہوا کرتے تھے۔ اب ہر گھر میں صرف آدمی پیدا ہوتے ہیں البتہ آگے چل کر ان میں سے کچھ ادیب ہو جاتے ہیں۔ اپنے اپنے کرتوت ہیں۔

اچھا ادیب اسے مانا گیا ہے جو قلم توڑ دے لیکن اس ادیب کے ساتھ مشکل ہوتی ہے کہ وہ ایک قلم توڑ کر چپ نہیں بیٹھ پاتا دوسرے قلم سے لکھنا شروع کر دیتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ وہی پہلے والا قلم بہتر تھا، لیکن جو قلم ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا سمجھدار لوگ اسی دوسرے قلم سے نکلی ہوئی تحریر کو صبر و شکر کے ساتھ سہہ لیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ کم سے کم یہ قلم نہ ٹوٹے۔

ادیبوں کے لکھنے سے جب بھی فرصت ملتی ہے وہ اور زیادہ لکھتے ہیں وہ اس میں اس شخص کی طرح ہوتے ہیں جو لیٹے لیٹے تھک جاتا ہے تو آرام کرنے لگتا ہے۔

نقاد کے بارے میں
(کے کے کھلر)

اچھا نقاد وہ ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے دودھ خود پی جائے اور پانی اپنے پڑھنے والے کی خدمت میں پیش کرے۔

نقاد کے قلم میں مشکل ہوتا ہے اور سر میں تلوار یعنی کھلی چھٹی۔

نقاد اب پیدائشی نہیں ہوتے، اپنی کرتوتوں سے بنتے ہیں۔

اردو کا نقاد آج دل دانت اور سر توڑ رہا ہے لیکن اس کا قلم ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں۔

وہ بیٹھتے زیادہ اور لکھتے کم ہیں دراصل وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہیں۔

ڈھائی سو صفحات کی یہ کتاب جو بہت ہی خوبصورت چھپی ہے قیمت جس کی ساٹھ روپے ہے اور مصنف جس کے مرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیم و ثقافت کے ڈپٹی سکریٹری ہیں ہاتھوں ہاتھ

لی جائے گی اور پڑھی بھی جائے گی اس لئے اس خوف سے کہ کوئی قاری میری چوری کو طشت از بام نہ کر دے کیوں نہ میں اس سے پہلے خود ہی اپنے جرم کا اقرار کر لوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ۸ سال بعد مجھے ان چند جملوں کے لئے شرمندہ اور جواب دہ ہونا پڑے گا ہو سکتا ہے کہ یہ توارد ہو لیکن نثر میں چوں کہ توارد اور وہ بھی لفظاً بہ لفظ توارد کا رواج نہیں ہے اس لئے میں اسے سرقہ ہی مانتا ہوں یہ سرقہ اور صرف سرقہ ہے اور سرقہ کے سوا کچھ نہیں اس میں شک نہیں کہ کے کے نے اپنا مضمون بعد میں لکھا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے سرقے میں پہل تو مجھ سے ہوئی۔ کیا اچھا ہو کہ اردو کے سبھی نثر نگار اس کتاب کو پڑھ کر کھلے دل سے اپنی " فردِ جرم " خود ہی مرتب کریں دوسروں کے کہنے پر شرمسار ہونے سے تو یہی بہتر ہے۔

یہ بات تو یوں ہی نکل آئی ورنہ اصل میں اس کتاب کے کچھ رموز و نکات پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس میں فاضل مصنف کی تعلیم اور ان کا مطالعہ ہر جگہ عکس ریز ہے۔ فاضل مصنف نے احتیاط کی ہے کہ علمیت سے اس کتاب کو بوجھل نہ بنایا جائے تاہم علمیت کے طلبگار قاریوں کے لئے اقتباسات دے دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی ہے کہ فاضل مصنف اپنے دوستوں کے قول کے مطابق انگریزی میں ہٹ ہیں اور کتاب کے سرورق کی تحریر کے مطابق انہیں اردو سے والہانہ محبت ہے اور خود مصنف نے اپنے بارے میں لکھا ہے " انگریزی میری مجبوری ہے اردو میری کمزوری نہیں "۔

میں بہرحال اس بات کا قائل ہوں کہ مجبوری کی بنا پر لکھی ہوئی انگریزی انگریزی ہی ہوتی ہے البتہ اردو کی بات الگ ہے۔

اس کتاب کی دوسری قابلِ قدر بات یہ ہے کہ

انکشافات

اس میں ان حقائق پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو اب تک اردو جاننے والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

ان میں سے چیدہ چیدہ انکشافات ہیں۔

۱۔ دونوں جوش، یعنی جوش ملیح آبادی اور جوش ملسیانی پہلے حسرت کے پیرو تھے لیکن بعد میں اصغر گونڈوی کا رنگ اختیار کیا ص۲۴۔ افسوس اس کا ہے کہ یہ کتاب ذرا دیر سے چھپی اور جوش ملیح آبادی اپنے بارے میں اس تقابل اور تحقیق سے واقف ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے (یوں بھی اگر جوش ملیح آبادی یہ جملہ پڑھ لیتے تو زیادہ دن جی نہیں سکتے تھے)۔

۲۔ بیدی کے بارے میں لکھتے ہیں " لیکن ان کی تازہ تصنیف ' ایک چادر میلی سی ' غلط بیانیوں اور جذبات سے مملو ہے " ص۲۰

۳۔ ہندوستان میں فنا نظامی، مخمور سعیدی اور حسن نعیم کے کلام میں فیض کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے ص۴۲ (حیرت ہے کہ یہ صاف سنائی دینے والی صدائے بازگشت خود ان شاعروں کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ تینوں شاعروں کی شاعری ہی نہیں، سماعت بھی ایک سی معلوم ہوتی ہے)

۴۔ اردو کی پہلی غزل چندر بھان برہمن نے لکھی ص۴۴

۵۔ اردو مشاعرے کا آغاز امیر خسرو نے کیا تھا ص۴۷ (دن میں تارے میں یہ بات لکھنے سے رہ گئی)

۶۔ " نقاد گھاس کاٹ رہے ہیں " ص۵۵ (ظاہر ہے مصنف ان میں شریک نہیں ہے)

۷۔ عطر کا بہت شوق تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اوپر کا جسم دھوتا تھا ص۹۶ (اوپر کے جسم کی تخصیص ضروری تھی اس وضاحت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بیسن خوامخواہ ضائع نہیں کیا جاتا تھا)

۸۔ اگر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے ہمارا تعارف لڑکیوں کے ہوسٹل سے کرایا تو منٹو ہمیں قحبہ خانے میں گھسیٹ لے گیا۔ کرشن چندر نے کچھ زیادہ انسانیت کا مظاہرہ کیا تو سردار جعفری نے ایک مسلسل کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ تضادوں نے ان اثرات کو شعر و شاعری میں منتقل کر دیا " ص۱۷ (آپ مجھ سے زیادہ ذہین ہیں اس عبارت کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے، میری بات جانے دیجئے۔ بہرحال کبھی فرصت ملے تو مطلب مجھے بھی سمجھا دیجئے گا)

۹۔ " اردو محض ایک زبان ہی نہیں ایک کلچر بھی ہے جس نے اپنی ترقیوں کا راستہ چھاونیوں سے شروع کیا تھا، دربار میں رسائی حاصل کی اور پھر عوام کی گود میں پہنچ گئی اور آج اقبال کی اس صدا کی بازگشت ثابت ہوئی جو انہوں نے چالیس سال پہلے لگائی تھی

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر " ص۱۷

(اقبال کا شعر یہاں کتنا چسپاں ہوتا ہے۔ اقبال کے اشعار کی خوبی یہی ہے کہ ان کا کوئی بھی شعر کہیں بھی رکھ دیجئے چسپاں ہو جاتا ہے اب اس شعر کو یہاں سے ہٹایا نہیں جاسکتا ویسے صدا نگار شاعر کا کام تھا یہ ہمیں معلوم نہیں تھا)

لطائف زیر نظر کتب کی تیسری قابلِ قدر اور اہم بات یہ ہے کہ اس میں محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اور مولانا حالی کی یادگار غالب کے لطیفوں کے علاوہ اور بھی بیسیوں لطیفے اور قصے شامل ہیں ان لطیفوں اور قصوں میں فاضل مصنف کے شگفتہ اندازِ بیان نے ایک ایسا رنگ پیدا ہو گیا ہے جسے دھنک سے تشبیہ دی جاسکتی ہے بعض وقت تو ۱۰۰ دفعہ کا سنا ہوا لطیفہ بھی بالکل تازہ معلوم ہوتا ہے (احتراز اور انبساط کا معقول انتظام ہے) یہ لطیفے اس کتاب کی جان ہیں اور نتیجہ خیز اور عبرت انگیز قصوں کہانیوں سے اس تنقیدی اور تحقیقی کتاب کے وقار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے مجھے خاص طور پر وہ لطیفہ بہت پسند آیا جس میں میر تقی میر نے کہا تھا کہ دلی میں ڈھائی شاعر رہتے ہیں اور پھر پونے تین شاعروں پر معاملہ طے ہوا تھا۔ یہ لطیفہ آپ نے کبھی پہلے کبھی نہیں سنا ہوگا، اس ایک لطیفے کی قیمت ہی اگر ۶۰ روپے طے کی جائے تو کتاب مفت میں پڑتی ہے۔ دوسرے نمبر پر داغ کا وہ لطیفہ ہے جو "سانس" کی تذکیر و تانیث کی بحث سے متعلق ہے۔ ان لطیفوں کی تلاش و جستجو کافی عرق ریزی کا کام ہے جس کی داد نہ دینا خود اپنے آپ سے شرمندہ ہونا ہے۔

حوالے کوئی بھی تحقیقی کتاب اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اس میں حوالے، نثر اور نظم کے نمونے اور اقتباسات نہ دیئے جائیں، یہ کتاب اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس میں نمونوں اور رایوں کی کمی نہیں۔ کالرج، ٹی ایس ایلیٹ اور ایسے بیسیوں انشوروں کے حوالوں کے علاوہ اردو کے جن تذکرہ نگاروں، ادیبوں اور نقادوں کی رائیں (پسند اور ناپسند) کتاب میں درج کی گئی ہیں ان کی تعداد ۳۰ سے زیادہ ہی ہے جن میں ابوالکلام آزاد سے لے کر باقر مہدی اور وارث علوی تک کے حوالے ہیں۔ اس سے فاضل مصنف کے وسیع المشرب ہونے کا ثبوت ملتا ہے (مطالعے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہی ہے) تقابلی مطالعے کے معاملے میں فاضل مصنف کی نظر بہت گہری ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "مخدوم، منٹو، مجاز اور مولانا کے لائق کا ادیب تھا" (م سے شروع ہونے والے دوسرے نام اگر چھوٹ گئے ہیں تو اس کی وجہ جگہ کا فقدان ہے مطالعہ کا فقدان نہیں)

اردو ادب میں اضافہ "اردو کا آخری نقاد" اس لحاظ سے سر آنکھوں پر رکھی جانے کے لائق کتاب ہے کہ اس میں ایک نئی تنقیدی زبان ملتی ہے اس سے پہلے جتنی بھی تنقیدی کتابیں لکھی گئیں وہ مواد کے حساب سے کم مایہ تو تھیں ہی ان میں وہ زبان بھی نہیں پائی جاتی جو تنقید جیسے اور موثر فن کے لئے ضروری ہے، تنقید کی زبان کو بہت طاقتور ہونا چاہئے نہ ہتھوڑے کی طرح) اس کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے آگے چل کر وہی تنقید کی زبان ٹھہرے گی جو نمونے ملاحظہ ہوں۔

"ظ انصاری اردو کے آخری نہیں، اردو کے پہلے لٹھ مار نقاد ہیں" ص ۱۸۲

"غالب کے خطوط کی بین السطور اس بات کی غماز ہے کہ وہ ایک موقع پرست انسان تھے برسوں وہ مغلی دربار میں مقام حاصل کرنے کے لئے خوشامد کرتے رہے" ص ۲۱

"بیدی حاملہ عورتوں کے درد، مزدور عورتوں، نیک اور بد عورتوں کی تصویر کھینچ سکتا ہے" ص ۲

"انگریزی کی جوٹھن پر پلے ہوئے اردو کے نقاد" ص ۱۰

(ایک جگہ جیسے باز نقاد اور دوسری جگہ سنگار رمد کہ نقاد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے)

"نقادی بخار۔ آج یہ بخار ضرورت سے زیادہ لوگوں کو چڑھا ہوا ہے۔ ہر شخص نقاد ہے......

آج کی تنقید کچھ پروفیسروں اور عہدہ داروں کے ہاتھ

میں ہے...... جدید اُردو تنقید کچھ استادوں اور نیم استادوں کی گرفت میں ہے۔"

"بیدی کا اُسترا کُند ہے۔" اگر منٹو نے سوسائٹی کی چولی نہیں اتاری تو اسے کپڑے بھی نہیں پہنائے۔

فاضل مصنف نے اُردو کو کچھ نئے الفاظ بھی دئیے ہیں "سرخا" ترقی پسندیئے، احیائی وغیرہ اور ان الفاظ کو جس ڈھنگ سے استعمال کیا ہے وہ کافی شگفتہ ہے۔

اس کتاب میں ایک اہم مضمون یگانہ چنگیزی سے متعلق ہے اور اس مضمون کی اشاعت کے لئے قارئین کو عموماً اور خواجہ مشفق کو خصوصاً ممنون ہونا چاہئیے۔

"تخلیقی ادب" کراچی کے دوسرے شمارے میں یگانہ چنگیزی سے متعلق جو مضامین شامل ہیں اور جس حصہ کتاب کو گوشہ یگانہ چنگیزی کی شکل دی گئی ہے وہ گوشہ ہندوستان میں رہنے والے اُردو کے قارئین کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہ جاتا اگر فاضل مصنف "خدا بنے تھے یگانہ" کے عنوان کا مضمون اس کتاب میں شامل نہ کرتے۔

(گوشہ چینی کی روایت تو اُردو میں تھی گوشہ چینی اب شروع ہوئی ہے اسے بھی اضافہ میں سمجھنا چاہئیے)

"بیدی کے حجام"، یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہئیے اس مضمون میں جہاں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں وہیں ایک خرابی بھی ہے۔ اس مضمون کا کوئی بھی جملہ یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا تاہم ایک جملہ تو سن ہی لیجئے۔

"میں سمجھتا ہوں جس شخص نے کبھی شیو نہ بنائی ہو وہ شیو کے پیچھے نہیں سمجھ سکتا"

اور رہا وہ مضمون جس کا عنوان اُردو کا آخری نقاد ہے وہ رمز و کنایات کی عمدہ مثال ہے۔ دونوں مضمون اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ کتاب کا مصنف ذہنی طور پر کس بلند سطح پر سے لکھتے ہیں۔

"اُردو میں کچھ ایسے نقاد بھی ہیں جن کی تنقید قہقہہ خیز ہے...... بہت بوڑھے تو نہیں لیکن ان کی تنقید اور کھانسی دونوں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ ایک یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر دوسری یونیورسٹی چلے جاتے ہیں اور جب شعبہ اُردو اُلو ہی کی طرح کھانسنے لگتا ہے تو تیسری یونیورسٹی چلے جاتے ہیں خدائی خدمتگار کی طرح۔

مجھے جب بھی ملتے ہیں گلے لگا لیتے ہیں اور نام پوچھتے ہیں حافظے سے کام نہیں لیتے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ حافظے نے ان سے کبھی کام نہیں لیا۔ ایک دفعہ جے خف پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اتنا عجیب اور لمبا قہقہہ لگایا کہ سارے کا سارا قہقہہ کھانسی میں تبدیل ہو گیا...... سیمینار ہال کھانسیوں سے گونج اٹھا، سفید بلغم میں لپٹی ہوئی تنقیدی کھانسی کالی ہو گئی۔ قہقہہ نے رنگ بدلا، کالا قہقہہ جے خف پر ایسی زبردست تنقید تو سوویت یونین میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا کھانسی اور قہقہہ دل کے دورے میں تبدیل ہو گئے اور نقاد اس تنقیدی رقص پر یہ جا وہ جا۔ ایمبولنس آنے سے پہلے ہی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

کمزور دل کا کوئی ادیب ہوتا تو موت کے اس منظر سے سہم کر رہ جاتا زیادہ سے زیادہ اسے ایک المیئے کی صورت میں پیش کرتا لیکن ک ک ک نے اپنے زورِ قلم سے ثابت کر دیا کہ وہ بین السطور کے نقاد ہیں، آنی جانی چیزوں کے مبصر نہیں۔ نقاد کو اتنا ہی سخن فہم ہونا چاہئیے کسی کی میت نقاد کو طرفدار نہیں بنا سکتی۔

اس کتاب میں شامل دو مضامین (بیدی کے حجام اور اُردو کا آخری نقاد) پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مصنف کا تعلق محکمۂ تعلیم و ثقافت سے ضرور ہے لیکن صرف شعبۂ تعلیم سے۔ ثقافت کے شعبے سے انہیں دُور رکھا گیا ——

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے محکمہ میں کام کا بار (یا انبار) کم ہے، یہ ایک نیک شگون ہے دوسرے دفتروں میں بھی ایسا ہی انتظام ہونا چاہئیے تاکہ ادیب اور نقاد بننے کی صلاحیتیں رکھنے والے قابل افراد، دفتر کی غیر ضروری اور بے نتیجہ مصروفیتوں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر نہ جائیں (جوہر قابل کی حفاظت اور کفالت عوام کی نہیں حکومت کی ذمہ داری ہے اور یہ بھی کھولی ہاتھ کہنے کی بات ہے)

آفسیٹ پر چھپی ہوئی یہ خوبصورت دیدہ زیب و دلفریب

نئی شاعری

ڈاکٹر ستیہ پرکاش شرما شگفتہ
کوروکشیتر

نئی شاعری پر بحث کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اصل میں شاعری کیا ہے؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے پہلے ہمیں کسی کلام کی ظاہری اور باطنی کیفیت کو پرکھنا ہوگا اور پھر دونوں صورتوں کے پرمعنی باہمی ارتباط کو تلاش کرنا ہوگا۔

جذبات۔ احساسات۔ نظریات۔ تاثرات۔ مشاہدات۔ واقعات اور واردات کا اظہار بذریعہ تقریر بھی ہو سکتا ہے اور بذریعۂ تحریر بھی، اور دونوں صورتوں میں اشارات۔ کنایات۔ تشبیہات اور استعارات سے کام لیا جا سکتا ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ نثر اور نظم لہٰذا اوّلیں ضرورت یہ پڑی کہ نثر اور نظم کے فرق کو جانچا جائے۔

نثر اور نظم میں یہی فرق ہے کہ نظم بحور اور اوزان کی قید میں ہوتی ہے جب کہ نثر اس سے آزاد۔ دونوں انواع کی زبان اور طریقۂ ادائیگی میں بھی فرق ہے۔

اس مقام پر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ شعر بذاتِ خود بحر اور وزن کا تعین کرتا ہے یا بحر اور وزن کا تعین کرنے کے بعد تخلیق کیا جاتا ہے؟۔

ہماری شاعری میں بہت سے اسلوب تو ایسے ہیں جہاں بحر اور وزن کا تعین پہلے سے موجود ہوتا ہے مثلاً طرحی کلام۔ مستزاد۔ تضمین اور رُباعی وغیرہ۔ یعنی شاعر ان سے باہر جا ہی نہیں سکتا لیکن جہاں موضوعِ شعر پہلے سے موجود نہیں ہوتا ہے وہاں کسی وزن اور کسی بحر کی پابندی نہیں ہوتی ایسا کلام کسی بھی بحر اور کسی بھی وزن میں ہو سکتا ہے۔

وزن سے ہماری مراد وہ بات نہیں جن سے شعر تولا جاتا ہے۔ جو کلام ان باٹ پر پورا اُترتا ہے اس کلام کو موزوں کہتے ہیں اور جو پورا نہیں اترتا اس کو ناموزوں کہتے ہیں۔ وزن کا کام یہ ہے کہ ہم آہنگ اور ہم مزاج الفاظ کو ایک لڑی میں پرو کر ایک ایسی صورت سامنے لائے جو موسیقیت کے معیار پر بھی پوری اترے عروض نے اس ضرورت کے پیشِ نظر کچھ صوتی اکائیاں مقرر کیں۔ ان صوتی اکائیوں سے ارکان مرتب کئے اور ارکان نے بحور کی تشکیل کی۔ اوزان میں وسعت لانے کے لئے زحافات۔ احکامات، صادر کئے اور ایک مشینی نظام قائم کیا۔

اس حقیقت سے کوئی غیر عروضی شاعر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ عروض کی بنیاد محض اٹکل پچو نہیں بلکہ ایک خاص، باقاعدہ نظام کے تحت ہے جو قواعد مرتب کئے گئے اور جن کی پابندی ایک شاعر کے لئے لازم قرار دی گئی وہ اس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ کلام میں کسی قسم کی بے راہ روی نہ آئے، عروض نے جس زحاف کو، جس بحر یا رکن سے جس مقام کے لئے مخصوص کیا ہے، اس کا استعمال اسی کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ عروض نئے آہنگ اور نئے تنوع کے حق میں نہیں بلکہ اس لئے کہ ان احکامات کی خلاف ورزی عروض کے اس مشینی نظام میں خلل پیدا کرتی ہے جو ایک لفظ کے آہنگ کو دوسرے لفظ کے آہنگ کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔

جن لوگوں کا عروضی شعور پختہ نہیں اور جو ان احکامات کی افادیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں انہوں نے عروض کو جابد کہہ کر فن سے بغاوت شروع کر دی اور

ہر قسم کے فتاوے مثلاً شعر میں باقاعدہ وزن کا ہونا ضروری نہیں شعر کا گایا جانا بھی ضروری نہیں، شعر کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک مصرع دوسرے مصرع کے برابر ہی ہو، وغیرہ وغیرہ، صادر کرنے شروع کر دیئے اور جس کا جس طرف منہ اٹھا اس نے وہی راستہ اختیار کر لیا۔ انہیں لوگوں نے اس قسم کی ترتیب کو جس کا ایک مصرع "فعولن فعولن فعل"، دوسرا مصرع "فعولن۔ فعولن، فعولن فعولن" تیسرا مصرع "فعولن، فعولن۔ مع۔ فعولن"، (جو کوئی وزن نہیں ہے) اور چوتھا مصرع "فعولن فعل فعولن"، (جو کوئی وزن نہیں ہے) اپنے یہاں رکھنا شروع کر دیا۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہ رہا کہ کون سا رکن کس مقام پر رکھنا جائز ہے اور کس مقام پر نہیں۔ جب ان لوگوں سے اس بے راہ روی کا جواز چاہا گیا تو سیدھا جواب یہ ملا کہ خلیل کا عروض "الفاظ کے آہنگ" کو جامد کرتا ہے اور نئی راہیں نکالنے میں سدِ راہ بنا ہوا ہے (حالانکہ یہ لوگ بھی انہیں ارکان کا سہارا لیتے ہیں جو عروض نے قائم کئے ہیں) انہوں نے الفاظ کے بہاؤ کو اپنی موزونیت کا پیمانہ ٹھہرایا اور اپنے اس قانون کے تحت عروض پر پنے تلے مصاریع بھی یہ کہہ کر کہ فلاں مصرع کچھ چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ فلاں مصرع کچھ بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ فلاں مصرع پڑھنے میں زیادہ زور صرف ہوتا ہے۔ فلاں مصرع پڑھنے میں کم زور صرف ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، ناموزوں قرار دے دیا۔ جواب طلب کرنے پر اور دلیل چاہنے پر ان کا کوئی معقول اور تشفی بخش جواب نہ تھا۔ معقول اور مدلل جواب ہمیشہ علم کی روشنی میں ہوا کرتا ہے ان بے چاروں سے بس درکِ بدیہی کا م ا یعنی عروض تو ہوتا ہی نہیں محض الٹی تیر ہوتا ہے۔ یہ ہوائی تیر اگر نشانہ پر بیٹھ بھی جائے انہیں خود یقین نہیں ہوتا۔ لہذا جواب بھی دیں تو کیا دیں۔ ایسے دشمنانِ عروض سے یہ امید رکھنا کہ کبھی تندرست اصولوں کے خالق ہو سکیں گے، سراسر بے کار ہے، ان لوگوں کے نزدیک عروض کی کوئی اہمیت نہیں، اسی لئے ان کی تخلیقات کا کوئی عروضی معیار نہیں۔ ان کا ایک مصرع بہت سے رکن پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے جب کہ دوسرے مصرع کے

ارکان کی تعداد کہیں تک بھی پہنچ سکتی ہے، اور ان ارکان کا از روئے عروض صحیح ہونا بھی ضروری نہیں۔ کسی مقام کا کوئی رکن کہیں بھی فٹ ہو جائے، مختصر یہ کہ عروض کے معاملہ میں ان دشمنانِ عروض کا کوئی مذہب نہیں۔

جیسا کہ ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے، عروض ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ نئی اختراعات نہ ہوں، لیکن یہ ضرور چاہتا ہے کہ جو بھی اسلوب اختیار کیا جائے وہ منظم ڈھنگ سے ہو اور کسی کلام کو ناپنے کا اسی کی طرح ٹھوس اور مدلل قاعدہ سامنے آئے تا کہ موزوں کو موزوں اور ناموزوں کو ناموزوں کہا جا سکے۔

عروض یقیناً اس قاعدے کا استعمال کرے گا جو ٹھوس دلائل پر مبنی ہو گا۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ اگر فلاں رکن اس طرح رکھ دیا جائے یا فلاں مصرع یوں کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ یہ اسلوب جس کی بنیاد کھوکھلی اور ناپائدار ہے یقیناً قطعی طور پر غیر حقیقی، بے ڈول اور مہمل ہے۔ وزن کے معاملہ میں اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو چاہئے کہ وہ اپنی بحور کے ارکان قائم کریں اور ان میں آنے والی ہر رعایت کا ذکر کریں تا کہ ایک نئی راہ نکلے اور اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔

عروض میں دخل رکھنے والے یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ان کی زبانوں کا اپنا مزاج ہے اور ان کا عروض انہیں کی زبانوں کے مطابق ہے، کسی زبان سے کوئی اسلوب مستعار لینا ہرگز برا نہیں مگر صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسے اپنے مزاج میں ڈھالا جائے اور یہ قدم باقاعدہ نظام کے تحت اٹھایا جائے۔ غیر ملکوں نے ہمارے اسلوب کو صرف اس لئے نہیں اپنایا کہ ہمارا اسلوب ان کے مزاج سے مختلف تھا۔ یہ طریقہ کار تو صرف انہیں لوگوں کا ہے کہ جب اپنے فن میں کمال حاصل کرنا مشکل نظر آیا تو دوسری طرف بہہ گئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ پہلے اپنے اسلوب میں کمال حاصل کیا جائے پھر دوسری زبانوں کے اسلوب سے ان کا مقابلہ کیا جائے اور اگر کوئی صورت ان کے ہاں

نظر آئے اور ہمارے مزاج میں ڈھل سکتی ہو تو ضرور اختیار کیا جائے یہ طریقۂ کار کہ بحرِ رجز کو بحرِ رمل سے ملا دیا جائے اور وہ بھی بغیر کسی ٹھوس دلیل کے، خلیل کے عُروض کو ہرگز برداشت نہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ عروض صرف چند رواں دواں اوزان تک ہی محدود نہیں، ہر بحر کا دامن انتہائی وسیع ہے اور ہزاروں ایسے صنفی اوزان تراشے جا سکتے ہیں جن پر آج تک کسی نے بھی طبع آزمائی نہیں کی، لیکن اس سے پہلے عروض کے مزاج کو سمجھنا ہوگا اور اسی میں کمال حاصل کرنا ہوگا

خاتم العروض اور میرے استادالاستاد حضرت علامہ عشق آبادی آنجہانی نے رباعی کو ۲۴ اوزان سے نکال کر ۳۶ اوزان پر مشتمل کر دیا لیکن یوں ہی اٹکل پچو نہیں بلکہ ٹھوس دلائل اور خلیل اور محقق طوسی کے ترتیب کردہ قوانین کی روشنی میں۔ دو دائرے "مستعدہ" اور "مجتبدہ" قائم کئے جن سے بارہ بحور کا اخراج کیا۔ استاذی قبلہ زار ابناوی مدظلہ نے بھی ایک دائرہ وضع کیا اور ۶ بحریں حاصل کیں۔ رُباعی کے اوزان میں مزید ۱۸ اوزان کا اضافہ کیا (جن پر کسی آئندہ اشاعت میں بھرپور روشنی ڈالی جائے گی) مگر عروض کے مزاج اور اس کے قوانین کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

خلیل کے عروض سے انحراف کرنے والے اور اس کی افادیت سے انکار کرنے والے ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں اور دیکھیں کہ عروض کے میدان میں ان کا مبلغِ علم کس منزل میں ہے۔

"سالِ نو"

مارے مہنگائی کے کرگس کا حال ابتر ہو گیا
شدّتِ افلاس سے سب جسم لاغر ہو گیا
جانے کس کس چیز کا امسال اونچا ریٹ ہو
سالِ نو کا روزِ اول ہی سیچر ہو گیا
(کرگس سہسوانی)

(صلا کا بقیہ)

مہربانی کر کے آپ چلے جائیے مجھے بھیا کے علاوہ سبھی مردوں سے نفرت ہے اور اب تو میں ویسے بھی آپ کے قابل نہیں رہی ہوں، تمہارے ہی بھائی کسی مرد نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے اب میں اپنی زندگی ایسے ہی گزار دوں گی کسی پر بوجھ کیوں بنوں ایک دن تم میری اس سے بھی بُری حالت کر کے پھینک دوگے خدا کے لئے یہاں سے چلے جائیے رملہ نے بڑی زور سے چیختے ہوئے کہا۔

لیکن شاذ بڑے ہی صبر و ضبط سے اس کی جلی کٹی باتیں سُننے کے بعد بڑے ہی نرم لہجے میں بولا محترمہ آپ اپنی جگہ پر ٹھیک کہہ رہی ہیں واقعی آپ نے بہت بڑا دھوکا کھایا اور آپ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہوا کہ اس سے مردوں کے سر شرم سے جُھک جانے چاہئیں لیکن آپ سب کو ایک ہی نظر سے نہ دیکھیں آپ کب تک اس دُنیا میں جدوجہد کر سکیں گی رازی کب تک آپ کو سہارا دے گا آپ شادی کریں گی تو رازی بھی شادی کر سکے گا کیوں کہ اُس کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد معلوم نہیں وہ آپ پر توجہ دے سکے گا یا نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی آپ کو بوجھ سمجھے کیا آپ یہ نہیں چاہتی ہیں کہ رازی کا گھر آباد ہو میرا ایک دوست آنکھوں کا اسپیشلسٹ ہے میں بھرپور کوشش کروں گا کہ آپ کی آنکھوں کی روشنی واپس مل جائے خدا سے نااُمید ہونا گناہ ہے بس ایک بار آپ ہاں کر دیں۔

رملہ نے کہا آپ فکر نہ کریں بھیا کی شادی میں کروں گی، ان کا گھر میں آباد کروں گی میری قسمت میں جو لکھا تھا پورا ہوا آگے جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں بھلا ایک نابینا لڑکی کو کون زندگی بھر سہارا دے گا دو چار دن بعد تم بھی ایک بوجھ سمجھ کر پھینک جاؤ گے میں خود اپنے آپ کو ایک بوجھ محسوس کرتی ہوں۔ جگ جگ جئیں میرے بھیا، جنہوں نے مجھے بے پناہ پیار دیا ہے ان کی شادی ہوگی ضرور ہوگی۔ میری وجہ سے میرے بھیا کی شادی نہ ہو یہ کہاں کا انصاف ہے۔ رملہ کی ان جاندار حقیقتوں کو سُننے کے بعد شاذ نے پھر بڑی نرمی سے کہا۔ رملہ دیکھو میری مانو ایک بار مجھے آزما کر دیکھو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی تمہیں بار نہیں سمجھوں گا اگر خدانخواستہ تمہاری بینائی واپس نہ آئی تو میں تمہاری لاٹھی بنوں گا۔ اپنی آنکھوں سے میں تمہیں ان حسین نظاروں

۱۵ ۳۹ م

شاہد رتلامی

بزمِ صادق رتلام کا مُشاعرہ

بزمِ صادق رتلام کا وجود حال ہی میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ اور اس فعال ادارے کو عوام سے رُوشناس کرانے کے لئے ریلوے انسٹی ٹیوٹ رتلام میں ایک مشاعرے کا انعقاد آج ۲۹ جنوری ۱۹۸۴ء کو ہو رہا ہے۔ اتفاق کہئے یا بزمِ صادق کے دُشمنوں کی نظرِ بد کا کرشمہ کہ آج رتلام پہنچنے والی تمام ریل گاڑیاں لیٹ ہو گئی ہیں۔ اندور اور دھار سے شعرائے کرام کی آمد رات کے دس بجے ہو سکی۔ یہاں تک کہ پروفیسر عزیز اندوری اور مقصود نشتری صاحب رات کے بارہ بجے تشریف لائے۔ دوحد کے شعراء کو جس گاڑی سے آنا تھا وہ اتنی لیٹ تھی کہ اُن شعراء حضرات نے مجبوراً اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ مُبادا مشاعرہ ختم ہونے کے بعد وہ رتلام پہنچیں۔

چوں کہ مُشاعرہ شروع ہونے کا اعلان نو بجے شب کا تھا لہٰذا سامعین جوق در جوق مشاعرہ گاہ میں تشریف لائے تھے رات کے ساڑھے دس بجے تک سٹیج کو شعرائے کرام سے خالی دیکھ کر ایک ایک دو دو کر کے واپس جانے شروع ہو گئے ہیں جناب فیض رتلامی بار بار اعلان فرما رہے ہیں کہ شعرائے کرام قیام گاہ سرودے لاج میں تشریف لا چکے ہیں بس کھانا کھانے کے بعد فوراً تشریف لا رہے ہیں۔ ادھر حضرت صادق اندوری ایسے صوم و صلوٰۃ کے پابند شعراء قضا شدہ نمازیں پڑھنے کے لئے مسجد میں تشریف لے گئے ہیں اور منتظمین سراسیمہ حالت میں شعرائے کرام کو قیام گاہ سے مشاعرہ گاہ لے جانے کے لئے کوشاں ہیں۔ پونے گیارہ بجے شعرائے کرام سٹیج پر نمودار ہوئے تو تب تک تین چوتھائی سامعین گھروں کو لوٹ چکے تھے بس وہی سامعین حضرات تشریف فرما ہیں جنہیں واقعی سخن فہمی اور سخن شناسی سے لگاؤ ہے۔ خلافِ معمول آج رتلام بھی برفیلی ہوا کی زد میں ہے کیوں کہ رتلام کے چاروں طرف دُور دُور تک بارش ہوئی ہے اور اولے بھی برسے ہیں۔ اس غضب کی سردی کی زیادتی نے بھی اکثر سامعین کے حوصلے پست کر دئے تھے اور انہوں نے گھروں کو واپس جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

فوری طور پر فیض صاحب رتلامی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اعلان فرمایا ہے کہ اس مشاعرہ کی صدارت حضرت صادق اندوری فرما رہے ہیں اور مہمانانِ خصوصی میں سے جناب سردار تونسوی ایڈیٹر شانِ ہند مشاعرہ کی نظامت کے فرائض سنبھالیں گے اور جناب دیوندر آہوجہ صاحب ڈویژنل ریلوے منیجر ویسٹرن ریلوے جناب کے کے سنگھ مینک اکبرآبادی سینیئر ڈی۔ سی۔ ایس ریلوے ویسٹرن ریلوے کے شعری مجموعہ "جذبۂ عشق" کی رسمِ اجراء ادا فرمائیں گے۔ صاحبِ صدر۔ مہمانانِ خصوصی اور مینک اکبرآبادی و دیگر تمام شعرائے کرام کی گل پوشی کے بعد آہوجہ صاحب نے تالیوں کے درمیان مائیک پر مختصر سی تقریر کے بعد "جذبۂ عشق" کی رسمِ اجرا ادا کی تو سامعین نے پُرزور تالیوں سے مینک صاحب کو مبارک باد پیش کی۔ جناب کے کے سنگھ مینک اکبرآبادی ہندی کے مشہور شاعر ہیں ان کی نظمیں اکثر و بیشتر ہندی کے رسائل و جرائد میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کرتی ہیں۔ صاحب موصوف اردو لکھنا پڑھنا قطعاً نہیں جانتے مگر اس قدر رواں دواں فصیح اُردو بولتے ہیں کہ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا کہ آپ اُردو سے نابلد ہیں۔ طُرفہ تو یہ ہے کہ آپ غزلیں اور نظمیں بھی فصیح اُردو میں موزوں فرماتے ہیں لہٰذا ان کے اُردو کلام کا مجموعہ "جذبۂ عشق" ہندی رسم الخط میں شائع ہوا ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ "جذبۂ عشق" اُردو کے اچھے اچھے شعری مجموعوں میں قابلِ ذکر مقام رکھتا ہے

وہ ہندی داں حضرات جو اُردو شاعری کا ذوق رکھتے ہیں مگر اُردو پڑھ نہیں سکتے اُن کے لئے "جذبۂ عشق"، واقعی بہترین مجموعۂ غزلیات ہے چوں کہ مینک صاحب کو موسیقی سے بھی خاصی دلچسپی ہے لہذا انہوں نے اپنی غزلیات اُنہی بحروں میں کہی ہیں جو مترنم گائی جا سکتی ہیں (یہ مجموعہ دفتر شانِ ہند سے صرف پانچ روپیہ اصل لاگت میں دستیاب ہے)۔

سرور تونسوی صاحب فرما رہے ہیں کہ میں کئی سالوں کے بعد آج مشاعرے میں آیا ہوں لہذا آج کے مدعو شعرائے کرام سے اکثر و بیشتر حضرات میرے لئے قطعاً نئے اور ناواقف ہیں اس لئے اناؤنسمنٹ بہتر انداز سے نہ ہو سکے گی کیوں کہ میں یہ تخصیص ہی نہ کر سکوں گا کہ کس شاعر کو پہلے اور کس شاعر کو بعد میں پڑھانا ہے اور کون سا شاعر مقامی ہے اور کون سا غیر مقامی۔ اور نہ ہی میں اکثر شعرائے کرام کے کلام اور مقام سے واقف ہوں اس لئے مناسب تعارف کرانا مشکل ہو جائے گا۔

جناب بسمل نقش بندی صاحب نے سرور صاحب سے گزارش کی ہے کہ آپ مشاعرہ شروع کرا دیجئے ہم جلد از جلد کوئی متبادل انتظام کر رہے ہیں۔ لہذا سرور صاحب نے سب سے پہلے مشاعرہ کے ایک منتظم جناب فیض رتلامی سے کلام سُنانے کی فرمائش کی ہے۔ فیض صاحب تمام صورتِ حال سے واقف ہیں لہذا انہوں نے رواں دواں تین چار اشعار سُنا کر مائیک چھوڑ دیا ہے اور سرور صاحب نے جناب موہن ملک سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ موہن ملک کلام سُنا کر اپنی جگہ پر چلے گئے تو سرور صاحب نے اُن کا ایک شعر ؎

شہر کا شہر ہی بہرا نظر آتا ہے مجھے
کوئی سُنتا ہی نہیں کس کو صدا دی جائے

دُہراتے ہوئے فرمایا کہ موہن ملک جی رتلام تو زندہ دلوں کا شہر ہے اور آپ شہر کے شہر کو بہرا کہہ رہے ہیں۔ کاش آج پاپا جی (ملہوترا صاحب) زندہ ہوتے تو شاید موہن ملک ایسا نہ کہتے کیوں کہ وہ موہن ملک کے ہر صدا کو یقیناً سُنتے۔

اب مسعود پردیسی جاورہ مائیک پر تشریف لائے ہیں انہوں نے بھی کچھ مایوسی سے بھرے ہوئے اشعار سُنائے تو سرور صاحب نے مسعود صاحب کا یہ شعر ؎

نگری میں اندھیرا ہو محلّات تو روشن ہیں
کب دیں گے سبق آخر ہم دیش کے بالی کو

اس شعر پر سرور صاحب نے فرمایا کہ دیش کے بالی سے اگر آپ کی مُراد گاندھی جی، نہرو جی یا اندرا گاندھی سے ہے تو انہیں آپ یا کوئی کیا سبق دے گا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اس قسم کے اشعار نہ سُناتے۔ اور اس کے فوراً بعد جناب رتلامی سے کلام سُنانے کی استدعا کی گئی ہے مگر انہوں نے اپنے دونوں پیش رؤوں سے بھی زیادہ مایوسانہ بلکہ احمقانہ اشعار سُنائے جس پر سرور صاحب نے اُن کا درج ذیل شعر خفگی کے انداز میں پڑھا ؎

زرد رُو چہرے ہیں انسانوں کے آزادی کے بعد
جیسے ہو جاتا ہے بے رونق مکاں شادی کے بعد

اور فرمایا کہ برتر صاحب کیا یہ آزادی کی نعمت کم ہے کہ آپ اس قسم کے اشعار بے خوفی سے جشنِ جمہوریت کے موقع پر پڑھ رہے ہیں اگر انگریز کا زمانہ ہوتا تو آپ اس قسم کے اشعار سُنانے پر سرکاری مہمان ہوتے —— اور سرور صاحب نے کسی قدر برہمی کے ساتھ نظامت کے فرائض ادا کرنے سے معذوری کرتے ہوئے نظامت بسمل نقش بندی صاحب کے حوالے کر دی ہے اور بسمل صاحب نے فرمایا کہ میں پروفیسر شاہد میر صاحب سے التجا کروں گا کہ مشاعرہ کی نظامت وہ سنبھالیں اور شاہد میر صاحب نے مائیک سنبھالتے ہی راقم الحروف کو اشعار سُنانے کی دعوت دی ہے اور میں نے صرف دو اشعار سُنا کر مائیک چھوڑ دیا ہے۔ سرور صاحب کہنے لگے کہ کچھ اور سُنائیے مگر میں نے شعرائے کرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معافی چاہی ہے کیوں کہ ۲۵ سے زائد شعرائے کرام موجود ہیں اور ½ ۱۱ بجے وقت ہو چکا اب شاہد میر صاحب نے نظیر بزمی صاحب رتلامی

سے مائیک پر آنے کے لئے کہا ہے اور نظیر صاحب فرما رہے ہیں

وطن سے غربت و افلاس دور کب ہوگا ؎
میں پوچھتا ہوں اس وطن کے سربراہوں سے

سرور صاحب فرما رہے ہیں شاہد میر صاحب یہ رتلام کے شعرائے کرام اس قدر مایوس کیوں ہیں کہ ۲۶ جنوری کے مبارک موقع پر بھی اس قدر مایوسی بھرے اشعار پڑھ رہے ہیں اتنے میں سُنا تو نظیر صاحب مقطع پہ آگئے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

وہ سامنے سے نظیر اس طرح گزرتے ہیں
کہ جیسے اجنبی گزرے ہے شاہراہوں سے

اس شعر پر انہیں مناسب داد ملی ہے اور شاہد میر صاحب فرما رہے ہیں کہ اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے جاورہ کے مزاحیہ شاعر جناب تابش لکھنوی سے مزاحیہ کلام سُنئے تابش صاحب فرغل پہنے مائیک پر تشریف لائے ہیں ؎

حسنِ ارزاں کی ٹھنڈی سڑکوں پر
چین سے کوئی مرد سوتا ہے
جب سے کھائی ہے عشق کی سردی
ہڈی ہڈی میں درد ہوتا ہے

کیا یہ مزاح ہے یا ...... محض۔ جن حضرات کو طنز و مزاح کے لفظی اور لغوی معنی بھی معلوم نہیں وہ دعویٰ کرتے ہیں مزاحیہ شاعری کا۔ حالانکہ شاعری کی تمام اصناف میں مزاحیہ شاعری مشکل صنف ہے۔

اب شاہد میر صاحب فرما رہے ہیں کہ اب میں جس شاعر کو تکلیف دے رہا ہوں یہ پیدا ہوئے بانس واڑہ میں ملازمت کوٹہ میں ہے اور ان کی شاعری کا سلسلہ ٹونک سے جڑا ہوا ہے۔ لیجئے مقبول احمد مقبول سے کلام سنئے ؎

کبھی یوں بھی سوئے صنم دیکھتے ہیں
کہ پتھر میں شانِ کرم دیکھتے ہیں

مقبول صاحب فرما رہے ہیں اب ایک مطلع زبان میں عرض ہے، شاہد میر صاحب فرمانے لگے اب تک بے زبانی کے مطلع سُنا رہے تھے۔ مقبول صاحب فرما رہے ہیں ؎

کوئی شوخ باچشمِ نم دیکھتے ہیں ، تو ہم اپنا آنکھوں میں غم دیکھتے ہیں

مناسب داد کے بعد ارشاد ہوا ہے ؎

خدا جانے کیا ہوگا اب سازِ دل میں
قیامت کے ہم زیر و بم دیکھتے ہیں
کسی کی نگاہوں میں مقبول ہو کر
کرم بھی بہ شکلِ ستم دیکھتے ہیں

مقبول صاحب تالیوں کی آواز میں اپنی جگہ گئے تو شاہد میر صاحب نے صابر صاحب اندوری سے استدعا کی ہے کہ کلام عنایت فرمائیں صابر صاحب نے پہاڑی میں غزل سُنانی شروع کی ہے اور مرحوم صبا افغانی کی یاد تازہ کردی ہے۔ مطلع اور مقطع سماعت فرمائیے

دیکھ کیسے عالم میں تجھ پہ مرنے والے ہیں
تار تار دامن ہے دست و پا میں چھالے ہیں
دیکھ کر انہیں کیسے ہوش میں رہے صابر
زلف ہے گھٹا جیسی آنکھ مے کے پیالے ہیں

صابر صاحب خاصی داد پانے کے بعد مائیک سے ہٹے تو شاہد میر صاحب کہنے لگے کہ صابر صاحب کی غزل روایتی تھی وگرنہ غزل میں اور کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ شاہد میر نے اسی زمین میں ایک شعر سُنایا ہے ؎

اجاڑ ہستی کے لوگ بھی نرالے ہیں
جسم پر ہے تاریکی روح میں اُجالے ہیں

لیجئے اب راجستھان کے مشہور مترنم شاعر محشر افغانی مائیک پر لحنِ داؤدی سے غزل سُنا رہے ہیں ؎

نفرت کو محبت کی تلقین سمجھ بیٹھے
تضحیک کو ہم اپنی تحسین سمجھ بیٹھے
میں درد کی شدت سے کچھ بول نہیں پایا
وہ میری خموشی کو تسکین سمجھ بیٹھے
میں نے تو انہیں جھک کر آداب کہا لیکن
اس طرزِ ادب کو وہ توہین سمجھ بیٹھے
چھیڑا تھا ابھی میں نے کچھ ذکرِ جفا لیکن
وہ میری گزارش کو تلقین سمجھ بیٹھے
کانچ اور جواہر میں کیا فرق دکھائے گا
[illegible] شرارے کو شاہین سمجھ بیٹھے

[illegible] و ادبا نے بعد [illegible] سے [illegible] بلتے
[illegible] تو دیکھا کر بارہ بجے جناب [illegible] عزیز
[illegible] تشریف لائے ہیں [illegible]
[illegible] حضرات کو [illegible] کی ہے اور شاہد میر صاحب
[illegible] کرتے ہوئے شکیب جمالی کا حسب ذیل شعر ؎

[illegible] تو شعلوں سے بھری ہے تمام رُوح
[illegible] تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

سُنا کر اسحاق اثر اندوری کا نام نامی پکارا ہے۔ سُنئے

اسحاق اثر صاحب فرما رہے ہیں ؎

حالات کینوا اس میں کیا رنگ بھر گئے
صورت سوال بن گئی سارے ہنر گئے

حرف و صدا کے جسم سے باہر نکل کے ہم
خوشبو بنے تو سارے جہاں میں بکھر گئے

[illegible] بڑے جوش و خروش سے پڑھتے ہیں اور
[illegible] بڑے اچھے دلپذیر انداز میں پڑھتے ہیں، سنئے ؎

پیوند اب اُمید کے رکھیں کہاں یہ لوگ
بوسیدہ پیرہن بھی بدن سے اُتر گئے

پرچم سبھی نے کر لیا تقسیم دوستو
نیزوں تلک بتاؤ کہ کتنوں کے سر گئے

اسحاق اثر صاحب نے خوب خوب داد پائی ہے اور شاہد میر صاحب بڑے اچھے انداز میں "جذبۂ عشق" کے خالق جناب [illegible] مینگ کو کلام سُنانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ جناب مینگ "جذبۂ عشق" سے غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

غم ضروری سبھی زندگی کے لئے
غم کی دولت نہیں ہر کسی کے لئے

اپنی آنکھوں میں سورج چھپائے ہوئے
ہم بھٹکتے رہے روشنی کے لئے

[illegible] کام آ سکے
[illegible] زندگی کے لئے

[illegible] دو [illegible] کے شعلوں
دل جلا [illegible] روشنی کے لئے

اے مینگ اب ترے سجدے ہوں گے قبول
سر جھکا یار کی بندگی کے لئے

سُنا آپ نے ایک ہندی شاعر کا کلام۔ اگر ہندی والے مینگ جی کی سی۔ وی میں ایسی ہی عام فہم اور سادہ زبان میں لکھنا پسند فرمائیں تو ہندی اردو میں کیا فرق رہ جائے گا۔

مینگ صاحب کو حد سے زیادہ داد دی گئی ہے اور اُن سے ایک غزل اور سُنانے کی سامعین اور شعراء نے پُرزور گزارش کی ہے چنانچہ مینگ صاحب نے "جذبۂ عشق" ہی سے ایک دوسری غزل سُنا کر حسب سابق داد پائی ہے اب جناب اظہار شادانی (دھار) مائک پر تشریف لائے ہیں۔ ان کا ایک ہی شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

انسان بنو شیطان کے اطوار بدل دو
ہر نقش قدم مشعل عالم ہو تمہارا

لیجئے شاہد میر بڑے اچھے الفاظ میں جاورہ کے سحر افغانی کو کلام سنانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ شاہد میر صاحب فرما رہے ہیں کہ جاورہ کی سرزمین موسیقی کے اچھے ماہر پیدا کر چکی ہے، جیسے کہ عبدالحلیم جعفر خاں ستار وادن وغیرہ۔

سحر افغانی کے ترنم میں بھی جاورہ کی روایتی موسیقی کے سُروں کا اثر ہے، سماعت فرمائیے سحر افغانی اپنی آواز کا جادو جگا رہے ہیں ؎

کرشمے کیا دکھاتا ہے یہ حسن فتنہ گر دیکھو
زمانہ سیم و زر کا ہے کمال سیم و زر دیکھو

وہی ویرانی و وحشت کے ساماں ہیں جدھر دیکھو
نہ دیکھا ہو اگر صحرا تو آؤ میرا گھر دیکھو

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور اسی داد کے شور میں غزل کے باقی اشعار صاف سُنائی نہ دے سکے ہاں ترنم کانوں میں رس گھول رہا ہے جسے میں آپ تک لفظوں کے ذریعہ منتقل کرنے سے قاصر ہوں۔ داد و ستائش کے تھپیڑوں میں سحر صاحب مائک سے الگ ہوئے تو جناب [illegible]

ری مائیک پر تشریف لائے ہیں، یہ تحت میں کلام
ا رہے ہیں، سماعت فرمائیے ؎

بللہ اتنی تلخ ہدایت مجھے نہ دو
ترکِ تعلقات کی دعوت مجھے نہ دو
یہ میں نے کب کہا کہ عزت مجھے نہ دو
لیکن جو عارضی ہو وہ شہرت مجھے نہ دو

آواز آئی ہے کہ حضرت "عزت دینے" پر دھیان
یجیے۔ واقعی عزت دینا اور عزت لینا ایسی ترکیب لفظی
ے جو اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتی۔ غنی کور صاحب
یک شعر اور سن لیجئے ؎

گمراہ میں ہوا ہوں فقط آپ کے طفیل
اب دوستو کچھ اور ہدایت مجھے نہ دو

اعلان ہوا ہے کہ "عکسِ خیال" کے خالق جناب
ود نشتری اندوری مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔
یے محمود نشتری غزل شروع کر رہے ہیں ؎

ر کسی کو ظلم کا پیکر نہ دیکھئے
شیشہ اگر ہے پاس تو پتھر نہ دیکھئے
یہ اب ہمارے آپ کے پیغامبر نہیں
اڑتے ہوئے سفید کبوتر نہ دیکھئے
ن کو پناہ مل نہ سکے آسمان پر
ن آنسوؤں کو آپ بہا کر نہ دیکھئے
اندھے کنوئیں کو آپ سمجھئے نہ کائنات
کس نے کہا کہ جھانک کے باہر نہ دیکھئے

ود نشتری اندوری مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ
شریف لے آئے تو شاہد میر صاحب نے مضطر صدیقی
ؒ کا ایک شعر سناتے ہوئے انہیں کلام عنایت کرنے
رخواست کی ہے۔ مضطر صدیقی بھی ترقی پسند تحریک
دیے ہیں۔ چند قطعات کے بعد ایک نظم "تجدید جنوں"
سنائی ہے اور پھر غزل کے اشعار مرحمت فرما رہے ہیں ؎

مرا دیوانہ پن فرزانگی سے کم نہیں ہوتا
تبسم دیتا ہوں پہروں لب او دامن نم نہیں ہوتا
ترنم سینے پر زمانہ ناز کرتا ہے
مگر ہر ایک کی قسمت میں ترنم نہیں ہوتا

قطعات کے بعد غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کسی کو جب بھی کوئی سرخ رو آواز دیتا ہے
یہ لگتا ہے مجھے میرا لہو آواز دیتا ہے
حسین شبنم کے قطروں سے اگر آنکھیں بھگوتا ہوں
تو شعلے کا مزاجِ تند خو آواز دیتا ہے
اسے شاید نئی تاریخ کا آغاز کرنا ہو..
مورخ آج مجھ کو کو بکو آواز دیتا ہے
میں جب بھی میکدے کی راہ سے ہو کر گزرتا ہوں
صراحی آہ بھرتی ہے سبو آواز دیتا ہے
مہک گندم کے خوشوں کی بسی ہے ذہن میں میرے
بلا سے اک جہانِ رنگ و بو آواز دیتا ہے
مری دیوانگی اظہار کے قابل نہیں ہوتی
حریم ناز سے جس وقت تو آواز دیتا ہے
عروجِ دار سے یا نغمہ ہائے لالہ و گل سے
بہر صورت شہیدوں کا لہو آواز دیتا ہے
خلوصِ دل سے مضطر آج پھر صحرا نوردوں کو
چمن کی خاک کا جوشِ نمو آواز دیتا ہے

مضطر صاحب غزل پر بہت ہی اچھی داد پانے کے بعد
سنجیدگی سے اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں اور شاہد میر
کسی پاکستانی شاعر کا حسب ذیل شعر سناتے ہوئے نور شادانی
اندوری کو کلام سنانے کے لئے بلا رہے ہیں ؎

گھر کے آنگن میں اگا سبزا مجھے کائی لگے
اب کے تو جاتی ہوئی آنکھوں کی بینائی لگے

لیجئے نور شادانی صاحب کے چار مصرعے آپ بھی سن لیجئے ؎

کسی کا درد کوئی غم کسی کے پاس نہیں
ہمارے شہر میں اب کوئی بھی اداس نہیں
تمہارے ہاتھ کے پتھر کی لاج رہ جاتی
میں کیا کروں کوئی آئینہ میرے پاس نہیں

نور شادانی کے بعد اندور ہی کے انور صادقی صاحب مائیک پر

تشریف لائے ہیں ان کے بھی تین اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

صیاد نے وہ ساری شاخیں تراش دیں
جن کا قفس کی سمت ذرا بھی جھکاؤ تھا

دستِ ستم نے کاٹ دیا اُس درخت کو
سائے میں جس کے امن و اماں کا پڑاؤ تھا

محلوں سے سنگ باریاں ہوتی تھیں جب کبھی
بوسیدہ چھپروں سے بھی کتنا بچاؤ تھا

انور صادقی بھی مناسب داد پاتے ہوئے مائیک سے ہٹے تو سرور تونسوی صاحب نے جناب شاہد میر صاحب کو کلام بلاغت نظام عطا فرمانے کے لئے مناسب الفاظ میں دعوت دی۔ شاہد میر صاحب نے دو غزلیں تحت میں اور ایک ترنم سے سنائی اور خوب خوب داد پائی ہے، آپ بھی اُن کے کچھ اشعار سُن لیجئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

لہرا چکے تھے امن کا پرچم ہزار بار
پکڑے گئے جو ہاتھ لہو میں سنے ہوئے

سُلگتے ان مکانوں کا دھواں کچھ اور کہتا ہے
مگر نامہ نگاروں کا بیاں کچھ اور کہتا ہے

سفر سے روکتے ہیں مصلحت اندیش ساحل پر
ہوا کے رُخ پہ اُڑتا بادباں کچھ اور کہتا ہے

تین اشعار ترنم سے سُنائی جانے والی غزل کے بھی سُن لیجئے ؎

خوف سے اب یُوں نہ اپنے گھر کا دروازہ لگا
تیز ہیں کتنی ہوائیں اس کا اندازہ لگا

یہ اندھیری رات بے نام و نشاں کر جائیگی
اپنے چہرے پر سُنہری دھوپ کا غازہ لگا

اِن اندھیروں میں بھی کوئی ہم نوا مل جائے گا
رات کے تنہا مسافر کوئی آوازہ لگا

شاہد میر صاحب نے غزلیں سُنانے اور خوب سے خوب تر داد پانے کے بعد اعلان فرمایا کہ اب پروفیسر عزیز اندوری جو کہ دو تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں کلام عنایت کریں گے۔ اناؤنسر صاحب نے عزیز صاحب کا ہی حسب ذیل شعر سُنا کر اُنہیں خوش آمدید کہا۔ ؎

بڑا ہی سخت تھا یہ کام کر گیا کیسے
یہ اپنے جسم کے اندر اُتر گیا کیسے

سُنیے، عزیز اندوری صاحب ایک آزاد نظم ارشاد فرما رہے ہیں ؎

آہ بنجر زمین میں نے
یُوں ہی کچھ بیج بو دئے تھے کبھی
آج جب فصل اُگنے والی ہے
کتنے حق دار ہو گئے ہیں کھڑے
اور اک میں کہ اپنے کندھوں پر
اپنے عزم و عمل کا تیشہ لئے
جا رہا ہوں نئی زمیں کی طرف

آزاد نظم کے بعد عزیز صاحب نے ایک غزل مرحمت فرمائی ہے صرف مطلع ہی سماعت فرمائیے ؎

ساحل نے ناخدا نے سمندر نے موج نے
جس کا بھی بس چلا ہے سفینے ڈبو دئے

عزیز اندوری صاحب نہایت ہی مناسب داد پانے کے بعد مائیک سے ہٹے تو شاہد میر صاحب نے مقصود نشتر اندوری سے کلام سُنانے کے لئے التماس کیا ہے، ان کے بھی دو اشعار سُن لیجئے ؎

اہلِ دل خاک کو اکسیر بنا دیتے ہیں
یوں ہمیں صاحبِ توقیر بنا دیتے ہیں

دامنِ زیست میں بھر دیتے ہیں رنگِ افلاس
کشمکش وقت کی تصویر بنا دیتے ہیں

اب کوئی صاحب تیور اشرفی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ میرا یہ مقام نہ تھا مجھے پہلے پڑھوا چاہئے تھا۔ اس پر شاہد میر کہنے لگے، دلاور فگار فرماتے ہیں کہ مجھے کہیں بھی کشادہ مقام کا کیا ہے۔ اس پر قہقہہ لگا ہے اور تیور اشرفی نے یوں مزاح اور طنز و ظرافت کا مُنہ چڑایا ہے ؎

دَر پہ تیرے یہ کیسی جھنکار ملے ہے
ہر کاٹ کا اُتو ہمیں بل دار ملے ہے

پہلو سے نشتک جلتے ہیں اس وقت پر
جب یار نظر باز پلک مار ملے -

ڈٹ جاؤ وہیں تشنہ لبو کھاٹ بچھا کر
جس موڑ کی تلے شربتِ دیدار ملے ہے
ٹھکرا دیا گیا ہو جو درِ یار سے تیورؔ
ہر در سے اُسے دو سو پھٹکار ملے ہے

اگر یہ شاعری مزاحیہ ہے تو پھر مزاح کا مُنہ چڑانا کسے
ا جائے گا۔ کاش کہ تیورؔ اشرفی ایسے حضرات مزاح، طنز
ر ظرافت ایسی شئے لطیف کے اہل ہونے پر مزاحیہ اور
زیہ شاعری کی طرف راغب ہوتے۔

لیجیے اس مشاعرہ کے رُوحِ رواں حضرت بسملؔ نقشبندی
ہ شاہدؔ میر صاحب کلامِ بلاغت مرحمت فرمانے کی درخواست
ر رہے ہیں، سنیئے بسمل صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

یہ مری مشقِ تصوّر کا ہے اعجاز کہ اب
تو کہیں بھی ہو مجھے پیشِ نظر لگتا ہے

ا دہے کہ اس شعر کا حق ہے۔ بسملؔ صاحب کا ترنّم اور
ہی ماحول کو مدہوش بنا رہا ہے فرماتے ہیں ؎

یہ کہاں لائی مجھے تیری محبت اے دوست
سارا ماحول مرے زیرِ اثر لگتا ہے
کھل نہ جائے کہیں رشتوں کی تجارت کا بھرم
رسم و راہ اور بڑھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

ا دپھر سامعین کے باذوق اور سخن فہم ہونے کا ثبوت
ے رہی ہے۔ دیکھئے بسمل صاحب کس طرح تڑپا پانے پر
تر آئے ہیں ؎

یہ بلندی کہیں پستی کی علامت تو نہیں
آسمانوں سے اب انسان کا سر لگتا ہے

بسملؔ صاحب سے مسلسل تین غزلیں سُنی گئی ہیں۔
سامعین کی طرف سے ابھی ایک غزل مزید سُنانے کا پُرزور
مطالبہ ہو رہا ہے مگر اناؤنسر صاحب اور خود بسمل صاحب
ا سامعین سے گزارش کی ہے کہ دوسرے دَور میں ایک نہیں
دو غزلیں سُن لیجیے گا۔ اور شاہدؔ میر صاحب نے نادمؔ بلخامی
احب کے نام کا اعلان کر دیا ہے، نادم صاحب مائیک پر
تشریف لے آئے ہیں اور سامعین بسملؔ صاحب کے لیے بدستور
تقاضا کر رہے ہیں لہٰذا نادم صاحب نے خفگی کے عالم میں
دو اشعار رواں دواں پڑھنے کے بعد مشاعرہ گاہ سے واک
آوٹ کر دیا ہے، بسملؔ صاحب اور مینک صاحب انہیں واپس
لانے کے لیے باہر گئے ہیں مگر نادم صاحب واپس تشریف
نہیں لائے لہٰذا مجبوراً بسمل نقشبندی صاحب کو پھر کلام
سُنانے کے لیے بُلایا گیا ہے۔ بسمل صاحب نے پھر دو غزلیں
سُنائی ہیں اور ان کے بعد جناب خطیبؔ صاحب کو کلام سنانے
کی تکلیف دی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ افراتفری میں ان کا
کلام نوٹ نہ ہو سکا۔ خطیبؔ صاحب کے بعد صاحبِ صدر
قبلہ صادقؔ اندوری صاحب سے شاہد میر صاحب نے مؤدبانہ
گزارش کی ہے کہ کلام فصاحت التیام عطا فرمائیں
چوں کہ راقم الحروف مشاعرہ کے منتظمین میں سے ایک خادم
ہے لہٰذا جو شعراء فوری طور پر واپس جانا چاہتے ہیں
اُن کے نذرانے وغیرہ کی ادائیگی میں منہمک ہو جانے کے باعث
قبلہ صادقؔ صاحب کی غزل نوٹ نہ کر سکا۔ ہاں ملحق کمرہ
میں سے سامعین اور شعرائے کرام جو داد قبلہ صادقؔ صاحب کو
دے رہے تھے اُس کا شور سُنائی دے رہا تھا۔

پونے تین بجے مشاعرے کا پہلا دَور ختم ہوا اور دوسرے
دَور میں سامعین کی فرمائش پر کچھ شعرائے کرام نے کلام
سُنا کر داد لوٹی۔ مگر میں تو دوسرے دَور میں شعرائے کرام
کے کلام سُننے سے قاصر رہا۔ ●●

روشنی کا دیوتا

مس زرّین فاروقی
(رُدولی)

شاذ کو اپنے دوست رازی کے یہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہوگئے تھے لیکن شاذ اب تک رازی کی چھوٹی بہن رملہ کو نہ دیکھ سکا تھا۔ رملہ کی سنہری آواز جب کبھی شاذ کے کانوں سے ٹکراتی وہ سب کچھ بھول جاتا اس نے بارہا چاہا کہ رازی سے پوچھے کہ آخر رملہ کیوں اس کے سامنے نہیں آتی جب کہ ان کے یہاں کوئی پردہ نہیں کرتا، لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش رہ جاتا کہ کسی کی نوجوان بہن کے متعلق کچھ پوچھنا خلافِ تہذیب ہے۔ ہاں رملہ کی آواز سن کر اس کی تعریف ضرور کرتا تھا۔ جس کے جواب میں رازی کی ایک ٹھنڈی سانس اور گہری خاموشی ہوتی۔

ایک دن شاذ نے سنا کہ رملہ میر تقی میر کی غزل بڑی درد بھرے انداز میں پڑھ رہی تھی۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے ؎ ساری مستی شراب کی سی ہے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا درد اس نے اپنی آواز میں سمیٹ لیا ہے۔ آخر شاذ سے نہ رہا گیا اور اس نے کہہ ہی دیا۔ "یار کیا رملہ خود بھی اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی کہ اس کی آواز ہے میرا دل چاہتا ہے کہ اسے دیکھوں" رازی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا، شاذ وہ اپنے بھائیوں کے علاوہ کسی دوسرے مرد کو اپنے کمرے میں برداشت نہیں کرسکتی ہے تمہیں نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیسا ظلم ہوا ہے، کاش کہ میرے پاس اتنا پیسہ ہوتا اور میں اپنی بہن کو ان ظالموں کی مرضی کے مطابق جہیز دے کر اسے زندگی کی خوشیاں دے سکتا۔ جہیز دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ جہیز میں نے بڑا معمولی سا دیا تھا ٹی۔وی۔ اور فرج نہیں تھا جس کے نتیجے میں وہ آج بیان ہے کیسا ظلم اس کے ساتھ نہیں ہوا، اس کی زندگی میں ان ظالموں نے اندھیرے بھر دیئے۔ کاش میں ان بیچ اور کمینے ظالموں سے اپنی بہن کے ساتھ کی گئی ناانصافی کا بدلہ لے سکوں" یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگا، شاذ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، مگر شاذ نے فیصلہ کن انداز میں کہا "رازی اگر رملہ کو طلاق ہوگئی ہو تو میں اسے اپنانے کو تیار ہوں بولو تم مجھے اس قابل سمجھتے ہو" رازی نے کہا تم نے رملہ کو دیکھے بغیر یہ فیصلہ کر لیا ہے ہوسکتا ہے کہ تم اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔ شاذ نے کہا "مردوں کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے ہاں تم مجھے اس قابل سمجھو نہیں شاذ نہیں وہ خود تمہارے قابل نہیں ہے۔" مجھے تم رملہ سے ایک بار مل تو لینے دو بس ایک بار" شاذ نے بڑے اعتماد سے کہا، ہوسکتا ہے کہ وہ راضی ہوجائے۔

رازی نے رملہ کو بڑی مشکل سے شاذ سے ملنے کے لئے راضی کیا۔ ناز رملہ کے کمرے میں گیا تو رملہ نے پوچھا کون؟ شاذ نے کہا میں رازی کا دوست شاذ ہوں۔ شاذ نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔ آپ کی آواز تو اتنی میٹھی ہے کہ جیسے سارے جہاں کا مٹھاس خدا نے شاید آپ کی آواز میں بھر دیا ہے اور خدا کے فضل سے صورت بھی بڑی پیاری ہے جیسا کہ میں نے سوچا تھا ویسا ہی پایا، شاذ نے بغیر کسی تمہید کے رملہ سے صاف الفاظ میں کہدیا کہ آپ کے تمام حالات مجھے معلوم ہوچکے ہیں اگر آپ مجھے اپنے قابل سمجھیں تو میں آپ کا ہاتھ ہمیشہ کے لئے تھامنے کو تیار ہوں، سبھی مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے ہیں رملہ صاحبہ دُنیا بہت بڑی ہے اس میں طرح طرح کے لوگ جنم لے چکے ہیں اور لیں گے آپ سبھی کو ایک نظر سے نہ دیکھئے۔

رملہ نے اپنا سیاہ چشمہ اُتار دیا اُس کی دونوں آنکھیں بے نور تھیں، رملہ نے کہا شاذ صاحب مجھے اب مردوں سے نفرت ہے آپ سے پہلے کسی ایک مرد نے اس سے بھی بڑھ کر عہد و پیمان کئے تھے لیکن میں جہیز سے اس کا گھر نہ سجا سکی جس کی سزا میں اس نے میری دونوں آنکھوں کی روشنی لے لی جن آنکھوں کی تعریف کرتے ہوئے وہ تھکتا نہیں تھا انہی آنکھوں کو اس نے بے نور کر

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

گیتوں کا شاعر — سوہن راہی

ڈاکٹر ہارون ایوب
شعبۂ اردو
پنجاب یونیورسٹی

سوہن راہی
ایک ہندوستانی نام
لیکن آپ لندن کے شہری ہیں
اردو شعر و ادب کے دلدادہ ہیں
لندن کی اردو محفلوں کے روح رواں بھی ہیں
اور لندن میں رہ کر جن لوگوں نے اردو کے نام کو روشن کیا ہے ان میں آپ کا نام خاصہ نمایاں ہے
جہاں آپ خود شاعر ہیں
وہاں ادب نواز بھی ہیں۔ یعنی لندن میں جب بھی کوئی ہندوستانی یا پاکستانی اردو شاعر یا ادیب کی آمد کی خبر پاتے ہیں تو فوراً اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اس کے اعزاز میں ادبی نشستیں منعقد کرتے ہیں۔

اس طرح سوہن راہی صاحب کو بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ آپ نے بیک وقت ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں سے استفادہ اٹھایا اور اپنی شاعری کو نیا رُخ دیا — حالانکہ آپ روایتی شاعری سے انحراف نہیں کرتے ہیں پھر بھی خیالات و جذبات میں ایسا آہنگ ہے جو نئے انداز کی غمازی کرتا ہے۔

آپ نے غزلیں، نظمیں، رُباعیات اور قطعات سب ہی کچھ کہے ہیں لیکن نئے ماحول میں نئے انداز سے اپنی راہ الگ بنا لی ہے۔ آپ کی زبان بہت سادہ اور سلیس ہے جو کچھ کہتے ہیں وہ دل پر اثر کرتا ہے اور قاری پر ایک کیفیت سی طاری ہو جاتی ہے۔

رات کے پُرسکون لمحوں میں — جب تیری یاد ساتھ ہوتی ہے
جانے کس وقت دن نکلتا ہے — جانے کس وقت رات ہوتی ہے

راہی کی منزل بھی سب سے الگ — اپنے ہم سفر بھی نرالے

رو رو کر جینا مشکل ہے درد بھری دنیا میں
برسوں کی قربانی دے کر ہوتا ہے احساس

آپ کے کلام کا یہ نکھرا اور صاف ستھرا انداز آپ کی اپنی ہی کاوش اور لگن کا نتیجہ ہے — روایتی شاعری سے ہٹ کر آپ نے لاتعداد گیت بھی لکھے ہیں، آپ کے گیتوں کا ایک مجموعہ "گھونگھٹ کے پٹ" منظر عام پر آچکا ہے۔

یہ ایک ایسی صنف ہے جسے سب سے پرانی صنف کہا جا سکتا ہے لیکن اردو ادب میں اس کی روایت اس لئے بھی پرانی نہیں ہے کیونکہ یہ زبان بھی نئی ہے، عام طور پر اردو کے شعراء حضرات نے گیتوں کی طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی۔

پچھلے چند سالوں میں فلمی دُنیا میں کچھ گیتوں کی مانگ رہی ہے تو اس بنا پر کچھ گیت لکھے گئے ہیں۔ لیکن سوہن راہی صاحب وہ واحد شاعر ہیں جو گیت بھی لکھتے ہیں آپ کے گیت بہت اعلیٰ معیار کے ہیں اور ان میں خالص ہندوستانی رنگ کی جھلک ملتی ہے۔

آپ کے گیتوں کی زبان آسان اور عام فہم ہے جگہ جگہ ہندی اور پنجابی کے الفاظ اس برجستگی سے استعمال کیا گیا ہے کہ بے ساختہ منھ سے واہ نکل پڑتی ہے —

نسوانی جذبات کی ترجمانی میں تو آپ نے کمال ہی کر دیا ہے۔ شاید کوئی عورت بھی ان گیتوں کو لکھتی تو یہ بات اور یہ انداز نہ ہو پاتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساتھ ہی ساتھ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لے کر آپ نے گیتوں کو تازگی بخشی ہے۔ علاقائی زبانوں کے الفاظ نے جہاں ان گیتوں کو ہندوستانیت بخشی ہے وہاں مقامی رنگ بھی

نہیں نصیب ہوگیا ہے اور ان گیتوں کو پڑھتے وقت قطعی احساس نہیں ہوتا کہ یہ لندن میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں آپ کا لب و لہجہ عوامی ہے اور انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور زندگی کی مختلف کیفیات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

گوری کا من دیپ
پیپ میں پیار کی جوتی
جوں ساگر میں سیپ
سیپ میں دمکے موتی
— — — —

ندیا بہتی جائے رے
دھیرے دھیرے ہولے ہولے
ساگر میں مل جائے
اس ندیا کے تن لہرائے
اندھیارا اجیارا
سانجھ سویرے اس میں جھلمل
جھلمل جیون دھارے
اس دھارا کی کروٹ کروٹ
مدھر مدھر یہ گائے ندیا بہتی جائے

آپ کے گیت بامقصد ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہیں۔ مثلاً موسم کی جھلکیاں، پھولوں کا ذکر، پیا سے ملنے کی بات یا اس کی باہوں میں جھول جانے کی بات وصل و جدائی کے جذبات، کانٹوں کی چبھن، اپنوں کی محبت کا احساس وغیرہ وغیرہ موضوعات کو سوہن راہی صاحب نے اس خوبصورتی سے اپنے گیتوں میں سمویا ہے کہ موسیقیت ان میں جھلکنے لگتی ہے اور بے ساختہ انہیں گنگنانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

آپ کے گیتوں پر پنجاب کا اثر زیادہ نمایاں ہے کیونکہ آپ بذاتِ خود پنجابی ہیں، پنجاب کے ماحول میں پرورش پائی ہے یہاں شادی بیاہ کے موقع اور دوسری رسم و رواج کے درمیان جو گیت گائے جاتے ہیں ان کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں آپ کے گیتوں میں نظر آتی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ، رنگ رلیاں، بے تکلف مذاق اور عشقیہ جذبات کا غلبہ ان گیتوں میں ایسا رنگ بھر دیتا ہے جسے فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔

سوہن راہی صاحب لندن کی ادبی دنیا کے نمائندہ شاعر ہیں، آپ کی شاعری احساسات اور جذبات کی شاعری ہے جو پڑھنے اور سننے والوں پر یکساں اثر کرتی ہے اور اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

آپ نے ابتداء میں مرحوم پریم وار برٹنی سے اصلاح لی، بعد میں ماہر القادری صاحب نے آپ کے گیتوں پر نظرِ ثانی فرمائی اور چند گیت پڑھ کر ہی کہہ دیا کہ آپ کو کسی اصلاح کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی آپ اکثر اپنے گیت کہیں بھی شائع کرانے یا سنانے سے پہلے ماہر القادری صاحب کو دکھا لیا کرتے تھے۔

الغرض آپ وہ واحد شاعر ہیں جنہیں ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کے درمیان بیٹھنے اٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور آپ نے ان کی صحبتوں سے بہت فیض بھی اٹھایا ہے۔

آپ کے نزدیک انسانیت سب سے بڑا مذہب ہے اور زبان کسی کی میراث نہیں۔ اس لئے آپ نے اردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کو خواہ وہ پاکستان کے ہوں یا ہندوستان کے یا بنگلہ دیش کے، سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے لندن میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی ہے اور وہاں آپ اردو کی ترقی کے لئے بڑا کام کر رہے ہیں۔ آپ کو اردو سے والہانہ عشق ہے ہر ادیب و شاعر کی مدد کرنا آپ کا اپنا دینی فرض ہے جب کوئی ادیب یا شاعر لندن جاتا ہے تو اعزاز میں [illegible] منعقد کرتے ہیں۔

سوہن راہی غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ برابر گیت بھی کہہ رہے ہیں ابھی آپ عمر کے [illegible] نہیں ہیں جہاں محسوس ہو کہ شاید آدمی [illegible]

شکر ہے کہ آپ کا قلم ابھی ابھی تھکا نہیں ہے، جذبات میں وہی جولانی ہے، اس لئے آپ برابر لکھ رہے ہیں۔ ہمیں آپ سے خوش آئند امیدیں وابستہ ہیں کیوں کہ آپ کے اشعار میں نغمہ او بار وزان کے ساتھ ساتھ جذبات کی ہر بھی ہر تاری کہ دل کو گدگدا دیتی ہے۔ یہی سوہن راہی صاحب کا فن ہے جن میں وہ بہت کامیاب ہیں۔

اشکوں اور آہوں کے قصے درد بھرے کچھ دل کے گیت
زخموں کے آنگن سے کیا کیا آج اُٹھا کر لائے ہیں

سوہن راہی صاحب آج کے دَور کے ممتاز شاعر ہیں آپ کا شمار ہندن کے چوٹی کے شعراء میں ہوتا ہے، آپ کے اشعار میں انسانی وجود کا کرب اور دَورِ حاضر کی قدروں کا احساس شدت کے ساتھ ملتا ہے، جس نے آپ کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں کر دیا ہے، یہی سبب ہے کہ آپ دوسروں سے قدرے منفرد نظر آتے ہیں۔ ●●

آشاؤں کی چنچل دھرتی

—— سوہن راہی ۔ سور بیٹن (برٹن) ——

(۱) آشاؤں کی چنچل دھرتی
جن کے جھرنے جھر جھر گائیں
جس پر جیون [illegible] چھینٹے
جس پر آنسو بن لہرائیں

(۲) جس دھرتی کی خوشبو [illegible] میں
رنگ برنگی مہکی دھول
پورب، پچھم، اُتّر، دکھن
نیل گگن، پاتال میں بکھرے

(۳) اس دھرتی کی گھنی چھاؤں میں
کرنوں کا بنجارہ سورج
[illegible] سویرے ڈھونڈے
اپنے [illegible] سویرے کھونے
[illegible]، سر دیپک کے
[illegible] چنگ [illegible]
نت بولوں کی جھڑی لگائیں

(۴) کبھی کبھی میری دھرتی کے
پیلے، نیلے، لال، سنہرے
جھلمل جھلمل، سندر درپن
چھن چھن، چھن، چھن
ٹوٹتے جائیں
کبھی کبھی یہ میری دھرتی
چاہت کی پتھریلی دھرتی
میری ہی یہ جانی دھرتی
ساری رات جگائے مجھ کو
ساری رات رُلائے مجھ کو

(۵) کبھی کبھی یہ میری دھرتی
وہاں وہاں پہنچائے مجھ کو
جہاں جہاں پر
بھوک پیاس کا
چکر نہ لے جائے مجھ کو

(۶) دھوپ چھاؤں کتنے سائے ناچیں
چاندی بوتی کرنیں گائیں
پیت نگر کے اُجلے دھارے
کالے چاند کا مُکھ دھو جائیں
سانسوں کے میٹھے بولوں پر
یادوں کی پریاں لہرائیں
اپنے اپنے رُوپ سنواریں
دُور ستارے [illegible] کی ریکھائیں
گوری [illegible] کا سیلا
سپنوں کے تانے بن جائیں
رنگوں کے گچھوں میں ڈھل کر
مٹی کے دیپک مسکائیں۔۔

(۷) اس مٹی کے دیپ نگر میں
خوشبوؤں کی ما دھا [illegible]
شام رنگ ساون لہرائے
اس ساون میں جھوٹے جھولیں
[illegible] میں کوئل کوکے
میرے من کے بھید بھید میں
آن جانے گیتوں کو پھونکے

جمہوریت

توسیف... [illegible]
بلال اسعد کیرانوی

آج کی دنیا میں جس کا نام ہے جمہوریت
جس نے فکر و نظر کو جس نے دی ہے تقویت

جس پہ قائم آج ہے ہر ایک جمہوری نظام
جس سے کہ جمہور کی قدروں نے پایا ہے مقام

جو نظام زندگی کی اک نئی تصویر ہے
جو کہ دورِ نو کے خوابوں کی حسیں تعبیر ہے

جو ہر اک "دستور" کی اس دور میں بنیاد ہے
جو زمانہ کی نئی رفتار کی "روداد" ہے

جس میں ہوتے ہیں ہر اک طاقت کا سرچشمہ عوام
جس میں ہر اک "رند" خود ساقی ہے خود مینا و جام

ہے جہاں کوئی نہ "بندہ" اور نہ "بندہ نواز"
ایک ہی صف میں جہاں ملتے ہیں محمود و ایاز

ہے جہاں پر امن اور قانون کی بالا تری
جس میں ہے دستور کے ہاتھوں میں ہر اک سروری

ہے مساوات و اخوت کے جو ہر نغمہ کا ساز
جو ہر اک انس و مروت کے ہے افسانہ کا راز

ہم ہیں جو فکر و نظر کا اک نیا سنگم کہیں
ہم جسے اس دور کے گیتوں کا اک سرگم کہیں

عدل اور انصاف کے موتی جہاں ہوتے ہیں عام
سب کے ہاتھوں میں چھلکتے ہیں جہاں خوشیوں کے جام

جس میں ہر اک خار و گل ہوتے ہیں جانِ گلستاں
ہے جہاں ہر ایک غنچہ فصلِ گل کا رازداں

جو کہ ہے اس دور کے خوابوں کا اک رنگیں محل
فکرِ انسانی کی قدروں کا ہے جو دلکش کنول

ہاں مگر ہے آج کی جمہوریت بھی ساحری
اس کے پردہ میں بھی تو ہوتی ہے اک جادوگری

اس میں بھی تو "آمریت" کا ابھی تک روپ ہے
"چاندنی" اس کی بھی تو اک چلچلاتی دھوپ ہے

اس میں بھی تو بکتے ہوئے دیکھے ہیں طاقت کے صنم
اس میں بھی بکتے ہیں اہلِ ذوق کے فکر و قلم

اس میں بھی انساں کے خونِ دل سے جلتے ہیں چراغ
اس میں بھی زر سے ابھی مفلوج ہوتے ہیں دماغ

اس میں بھی تو آج تک بھٹکے ہوئے ہیں کارواں
اس میں بھی ملتا نہیں انساں کو منزل کا نشاں

اس میں بھی تو ہیں فضا میں بجلیاں شعلہ فگن
اس میں بھی تو راہبروں کے بہروپ میں ہیں راہزن

اس میں بھی انسان کا ہوتا ہے انسان "دیوتا"
ناخدا اس میں بھی تو بنتے ہوئے دیکھے "خدا"

اس میں بھی تو آج تک درجات کی تقسیم ہے
اس میں بھی لازم ابھی "آقاؤں" کی تعظیم ہے

اس کے پردہ میں بھی تو ہوتا ہے رقصِ سیم و زر
اس کے سایہ میں بھی تو انسانوں کے کٹتے ہیں سر

میکدہ میں اس کے بھی ہے تشنہ کاموں کا ہجوم
اس میں بھی ہے صبحِ نو کے پہلو میں بادِ سموم

اس میں بھی تو آج تک انسان کا بہتا ہے خون
اس میں بھی تو عقل کے پردہ میں ہے رنگِ جنوں

اس میں بھی تو چار سو ہے جبر کے شاکے ابھی
اس میں بھی انسان کی بربادی کے ہیں نقشے ابھی

اس میں بھی تو ہے ابھی کچھ "آہنی پنجوں" کا زور
اس میں بھی تو ہے دکھی انسان کی آہوں کا شور

ہے ابھی جمہوریت بھی گویا اک رنگین خواب
آپ جہاں کے نئے پردوں میں ہے [illegible]

آؤ دنیا کو محبت کا نیا پیغام دیں
پھر سے انساں کو مسرت کا حقیقی جام دیں

کوکھ جلی

چچی کو پتہ نہیں، صدیقی فیملی سے کیا دشمنی تھی۔
امّی کے سامنے اِن جیسا فران کی کئی بُرائیاں انگلی پر گنوا دیں۔ اس پر بھی امّی نے روشن خیالی کا مظاہرہ کیا تو چچی نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔

" شادی بیاہ کا معاملہ کوئی گڈا گڑیا کا کھیل تو نہیں اور پھر اللہ نے تمہیں ایک ہی تو لعل دیا ہے، کون سے تمہیں دو چار بچّے ہیں دس بیاہ رچانے ہیں" پھر اپنے لہجے میں ہمدردی کا جذبہ اُبھارتیں قدرے جھک کر بولیں۔

"سوچ سمجھ کر زبان لگا کر ہاں کہہ دی۔ ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور وضع داری پر جا رہی ہو۔ ان میں اندرونی طور پر کیا خرابیاں ہیں جانتی ہو؟"

" کیا؟" امّی سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھتی ہوئی بولیں

"تم تو گھر میں بیٹھی رہتی ہو، میں دس گھر جاتی ہوں اور دس قسم کی باتیں سُنی ہیں میں نے۔"

" دو چار مجھے بھی تو سنائیے" امّی بولیں۔

تیر کو نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر چچی نے دائیں گال پر انگلی رکھتے ہوئے بڑے طنطنے سے کہا۔

" اس گھرانے کی لڑکیاں بانجھ ہیں۔ نری بانجھ"

امّی کو اک دم ہنسی چھوٹ گئی، میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

" شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آتا" چچی ناگواری سے بولیں۔

امّی نے کوئی جواب نہ دیا، بدستور ہنستی رہیں تو چچی چڑھ گئیں، بزرگانہ انداز میں ڈانٹنے لگیں۔

" اب ہنسے ہی جاؤ گی ...... یا کچھ سنو گی بھی [illegible] کوڑی کی عقل نہیں تم میں"

" اچھا سنائیے" امّی سنجیدہ ہوتی ہوئی بولیں۔

" ان کی تین لڑکیوں کی شادی ہوئی مگر کسی لڑکی کو بھی ....." امّی نے ان کی بات مکمل نہ ہونے دی

"بیگم چچی! بے چاری بڑی تو شادی کے چھ ماہ بعد ہی بیوہ ہوگئی۔ دوسری خوش ہے۔ تیسری کی شادی کو کیا ایک سال بھی نہیں ہوا سو اس کا دولہا بھی شادی کے دو ماہ بعد ہی [illegible] چلا گیا"

" اور فرزی" چچی نے گویا امّی کی یاد دہانی کرائی

" وہ تو اپنے شوہر کے پاس ہے اس کی شادی کو بھی چار سال ہو رہے ہیں"

" ہاں" امّی سوچتی ہوئی بولیں "واقعی فرزی کی شادی کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ بیچاری"

" اے! بے چاری کا ہے کی۔ بانجھ کہو..... بانجھ"
امّی کی بات کاٹ کر چچی چہک کر بولیں۔

" اس کا شوہر میرے ڈیپارٹمنٹ میں ہی ہے" بہت دیر بعد میں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے کہا۔ "عطا میاں کی بات کہہ رہے ہو" چچی جان میری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ "ہاں چچا جان۔ بڑا سیدھا شریف، اچھا گانے کی طرح [illegible] لڑکا ہے"

"[illegible] آپ [illegible] سے زندگی [illegible] سمجھ رہا ہوں میں" میں نے کہا۔ امّی جیسے کو گویا [illegible] مجھ کو [illegible] کہہ رہی ہوں"

"قطعی نہیں۔" میں ہنسا اور پھر امّی سے بولا

شبانی کو زمانے [illegible] صورت بھی ہوتی
[illegible] تو چاہے سونا [illegible] مسکراہٹ تو کبھی ہونٹوں پر
[illegible] نہیں ہوتی۔ اسکول میں سب اُسے جلی روٹی کہہ کر چڑاتے
تھے" امی مسکرائیں .... لیکن چچی کی تیوریاں
بل پڑ گئے۔ "چڑچڑا اور بد مزاج نہیں ہوگا تو کیا غریب"
عطا کی حمایت میں بولنے لگیں، "گھر میں کوئی جیتا جاگتا
کھلونا، کوئی دل لگی کا سامان بھی نہیں"
"بیٹا جو اچھی سلیقہ مند خوبصورت اور شائستہ
ہے" امی بولیں۔ "وہ تو بے چاری فوزی ہی ہے جو اتنے
[illegible] بد مزاج خاوند کے ساتھ نباہ کئے جا رہی ہے"
"تعریف اس کی نہیں بلکہ عطا میاں کی ہے" چچی
[illegible] سے بولیں "جو بانجھ عورت کے ساتھ زندگی گزار
رہے ہیں۔ اولاد کے لئے چاہیں تو وہ شرعی و سماجی طور پر
دوسری شادی کر سکتے ہیں"
"اگر انہوں نے دس شادیاں بھی کیں تو باپ نہیں
بن سکتے" مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔
"کیوں؟" چچی مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔
"اونہہ!" امی نے کہنی سے انہیں ٹھوکا دیتے ہوئے
کہا "کیا بچوں جیسا سوال کر ڈالا" چچی نے بے یقینی سے
میری طرف دیکھا تو میں مسکراتا ہوا بولا۔
"دس باتوں کے علاوہ یہ گیارھویں بات آپ سے
کسی نے نہیں بتائی تھی"
"تو چپ رہ! بڑوں کے معاملے میں دخل دیتا ہے" [illegible]
مجھے ڈانٹ دیا۔ امی [illegible] دیکھ کر چچی
[illegible] سخت [illegible] کر [illegible] کے بہانے
وہاں سے کھسک گئیں۔
خالدہ [illegible] کالج میں [illegible] دلکش خدو
خال کی بے حد جاذب نظر! ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو
[illegible] کرتے تھے۔ [illegible] کے [illegible] سے بے حد
[illegible] تھے۔ [illegible] امتحان کے بعد بھی
[illegible] میرا

رشتہ طے ہو گیا، میں بڑا خوش ہوا۔ کتنی اچھی ہوتی ہیں
وہ مائیں جو اپنے بچوں کے جذبات کی قدر کرتی ہیں،
میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی، خالدہ اور
میں ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن کر بڑے مسرور
تھے، امی اور خاندان کے دیگر افراد بھی خالدہ سے
خوش تھے، لیکن چچی اس سے کبیدہ خاطر ہی رہتیں۔
اسے دیکھ کر ناک بھنویں چڑھاتیں، الٹی سیدھی باتیں کہتیں۔
ایک مرتبہ امی کی کوئی واقف کار آئیں، امی نے
ملاقات کے لئے خالدہ کو بلایا، تھوڑی دیر بعد خالدہ
پیر پٹختی ہوئی کمرے میں واپس آئی غصے سے اس کا چہرہ
سرخ ہو رہا تھا۔
"آپ کی چچی بہت بری ہیں..... اک دم گنوار...!"
اس کی آواز روہانسی ہو گئی۔
"انہوں نے میرا نام دریافت کیا تو آپ کی چچی فوراً
بولیں "خلاء"
"خلاء.....؟" میں حیرت سے بولا "کیا مطلب؟"
"خالدہ کو خلاء بنا دیا انہوں نے اور عرشی کو عرش
اور فروزاں کو فرش اور کہنے لگیں عرش و فرش
کے درمیان خلاء ہی ہوتا ہے"، خالدہ کی آنکھوں میں
آنسو تیرنے لگے۔
چچی کی ان تشبیہات پر میں دل ہی دل میں انہیں داد
دیئے بغیر نہ رہا۔ کبھی کبھی یہ بوڑھی عورتیں جلی اور طنز میں
کیسی مزیدار باتیں کہہ جاتی ہیں۔ مجھے خالدہ پر رحم
آگیا۔ اس کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے
پیار سے کہا۔
"غصے کی گرمی سے تمہارے حسن کا پھول مرجھا گیا ہے"
شادی کے ایک سال بعد گھر میں چہ میگوئیاں ہونے
لگیں۔ اماں تو خیر سمجھدار تھیں، منہ سے کچھ نہ بولیں،
لیکن چچی نے طعنوں کے تیر برسانا شروع کر دیئے۔
"بیٹے" ایک دن کھانے کی میز پر امی نے نرمی سے
کہا، "دولہن کو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کو دکھاؤ"

"کس لئے؟" میں نے ہاتھ کا لقمہ پلیٹ میں چھوڑ کر حیرت سے امی کی جانب دیکھنے لگا۔ "خالدہ کی نیت تو اچھی ہے۔"

"اس کی عقل تو گھاس چرنے کے لئے گئی ہے" بازو میں بیٹھی چچی ہڈی کا گودا زور زور سے روٹی پر جھٹکتی ہوئی تنک کر بولیں۔

خالدہ کو امی کے وسوسوں کا احساس ہو گیا، اس نے پانی کا گلاس اٹھایا، میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور پھر ہونٹوں کی مسکراہٹ چھپانے کے لئے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ بہت دیر بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی اور میں نیچا سر کر کے سعادت مندی سے بولا۔

"جی...... اچھا..... دکھا دوں گا۔"

خالدہ نے میری طرف دیکھا، اچانک اسے ہنسی آگئی، منہ کا پانی فوارے کی طرح باہر آ گرا..... چچی جان بپھر گئیں۔ خالدہ کو گھورتے ہوئے بولیں "ارے! یہ کونسے ہنسنے کی تک ہے۔ نگوڑا کھانا ستیاناس ہو گیا۔ پڑھی لکھی..... لڑکی.....!"

"چپ بھی رہئے آپ خدا کے لئے" امی نے کہا۔ خالدہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"بیٹے!" امی پھر مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں "تم سے دو تین مرتبہ کہا لیکن تم بات کو ٹال جاتے ہو۔"

"دلہن چچی کے ساتھ نہیں جائیں گی اور میں گھٹنوں کے درد کی تکلیف سے معذور پڑی ہوں۔"

"مجھے تو پہلے ہی سے اس بات کا کھٹکا تھا..... لیکن تم میری بات نہ مانے۔ اب سمجھو یہاں سے نسل کا شجرہ ختم ہو گیا۔" انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کو آری کی طرح چلاتے ہوئے گویا درخت کو جڑ سے کاٹ پھینکا۔

"ارے قسمت میں پھل ہی نہ ہوں گے تو کیا ڈاکٹر ڈاکٹرنی خدا بن جائیں گے۔ آج بھی میری بات لکھ کر رکھو، اس کوکھ سے کوئی کونپل نہ پھوٹ سکے گی۔"

"آپ تو بس ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئی ہیں!" میں چچی پر چوٹ کرتا ہوا بولا۔

"کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں" چچی سینہ زوری سے بولیں۔

"ابھی اتنی جلدی کا ہی کیا ہے......" میں امی سے بولا "کچھ دن انتظار کیجئے۔"

"تو تو ایسا کہہ رہا ہے جیسے تیرے پاس اوپر سے چٹھی آگئی ہے کہ تو فلاں فلاں تاریخ تک باپ بننے والا ہے۔" چچی طنز سے بولیں۔

"بچے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔" میں نے مزید جلانے کے لئے کہا۔

"ارے! اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے لوگوں نے یہ نیا نعرہ شروع کیا ہے۔"

"خالدہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرنا چاہتی ہے امی۔ اس لئے.....؟"

"اپنے تن کے تھوڑے پن کو کم کرنے کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کے پاس سوائے ڈگریوں کے اور کیا علاج ہے؟"

میں اپنے کمرے میں آیا، خالدہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ میں شوخی سے بولا۔ "کیوں کیا ارادہ ہے.....؟ سارا الزام تمہارے ہی سر آ رہا ہے۔"

"اوں..... ہونہہ!" وہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئی بولی "میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا، لیکن آپ کو پہلے تو شادی کی جلدی تھی..... اور اب.....؟" اس نے غصے سے کپکپاتے دانتوں میں باقی الفاظ پیس ڈالے۔

"مجھے نہیں [illegible]! امی اور چچی کو.....؟"

"یہ گھر میں بیٹھنے والی عورتیں.....؟"

خالدہ غصے سے بولی "جانے کیوں بچوں کو زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں۔"

"ماحصل نہ سہی لیکن ازدواجی زندگی کا [illegible] ضرور ہے" میں ہنستا ہوا بولا۔

"مجھے ابھی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ [illegible]..... اور ویسے بھی میں آپ کے لئے بچے پیدا کرنے [illegible]

[illegible] کھانا کھاتے کھاتے خالدہ [illegible]

امّی نے گھبرا کر کہا۔
"کیا ہوا؟" اور پھر جیسے اچانک ان کی باچھیں کھِل گئیں مجھ سے بولیں "جا بیٹا! ذرا لیڈی ڈاکٹر کو بُلا لا"
"یوں حواس باختہ کیوں ہوئی جا رہی ہو" پچی، امّی سے بولیں "دو بہن ٹھنڈا اور میٹھا بہت کھاتی ہے نا۔ پیٹ اُچھل گئے ہوں گے، بھلا اس میں ڈاکٹر کو بُلانے کی کیا بات ہے!؟"
"آپ تو یقیناً سٹھیا گئی ہیں۔ کچھ نہیں سمجھیں شاید..." امّی نے جَل کر کہا۔
اور جب لیڈی ڈاکٹر نے آکر مژدہ سُنایا تو امّی کھِل اٹھیں، پچی سے بولیں۔
"مبارک ہو پچی...... آپ کو بہت ارمان تھا...... پوتے جھُلانے کا۔ واللہ نے یہ خوشی کا دن دکھایا۔"
پچی نے ہونق سی صورت بنا کر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ پھر تخت کے نیچے پیر لٹکا کر سلیپر ٹٹولے، کھڑے ہو کر ساڑی برابر کی اور مَری سی آواز میں بولیں۔
"میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ دیر سے لَوٹوں گی"
"ارے یہ آپ کو کیا ہو گیا؟" میں پچی کے قریب اپنا سر لے جا کر ذرا جھکتے ہوئے بولا "خالدہ کی طبیعت کے ساتھ آپ کا مُوڈ کیوں خراب ہو گیا ہے؟"
"یہ مُوڈ پھوڈ کیا بلا ہے۔ کتنی مرتبہ کہا مجھ سے گفتگو کرتے وقت یہ موئے انگریزی لفظ استعمال نہ کیا کرو" پچی انتہائی ناگواری سے بولیں۔
"اچھا چاچی۔" امّی پچی سے بولیں۔ "ذرا جلدی سے جاکر [illegible] سُنا دیجئے کہ کوکھ جلی کی زندگی میں بہار آ رہی ہے۔"
"اے لو! ہو" پچی ہاتھ پر [illegible] مارتی ہوئی ہونٹ سکیڑ کر عادت کے مطابق اپنے دیدے مٹکاتے ہوئے بولیں۔
"[illegible] کیوں سی خوشخبری ہے۔ محلّے بارے میں کوئی بچوں کا کال پڑا ہے۔ جو [illegible] یہ بات سن کر حیرت [illegible]

موئے چلے آ رہے ہیں سال سے۔ [illegible] سال! اسی نے تو سرکار روک لگا رہی ہے ——!"
امّی، میں اور خالدہ — ہم تینوں کا ملا جُلا قہقہہ اُبھرا۔
اور ——
پچی پاؤں پٹکتی ہوئی —— بڑبڑاتی ہوئی، جھلاتی بڑبڑاتیں باہر چلی گئیں ——

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
اقبال

(ص ۳۳ کا بقیہ)

کی سیر کراؤں گا میں شاعر ہوں تمہارا ساتھ پا کر میری شاعری چمک اُٹھے گی غزلیں میری ہوں گی ترنم تمہارا ہوگا تم میری غزلوں کا حسین عنوان ہو گی تم میری شاعری کو ایک نیا حسن بخشو گی۔
یہ سُن کر رملہ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُلٹا اُتر جانے والے انداز سے کہا شاذی [illegible] مجھ میں اب اتنی سکت نہیں رہی کہ میں کوئی [illegible] کا سہارا سکوں۔ شاذی نے بے اختیارانہ اور والہانہ انداز میں [illegible] ہاتھ تھام لیا اور دل کی گہرائیوں سے کہا کہ [illegible] اب تمہارا دُکھ ختم ہو گیا ہے آنے والی صبح تمہارے لئے ایک نیا پیغام لائے گی۔
اتنے میں پیڑوں کی اوٹ سے نکلتے ہوئے چاند نے اپنی روشن کرنوں سے ہر طرف چاندنی پھیلا دی جیسے کہ وہ [illegible] اور رملہ کا رازدار ہو۔

کیا آپ کو شرم آتی ہے؟

خط لکھتے وقت اپنا پورا پتہ درج کرتے ہوئے یا اپنا خریداری نمبر لکھتے ہوئے، یا جوابی وقت خط لکھتے وقت [illegible] نہیں تو پھر دفتر کو خط لکھتے [illegible] کیوں [illegible]
(ایڈیٹر)

محلّہ

ممتاز مفتی

"میں کیا پرواکرتا ہوں محلے والوں کی" منظور نے غصے میں کہا۔ "آخر وہ ہمارا اپنا محلہ ہے اور ایک نا ایک دن ہمیں وہاں جانا ہی ہوگا۔"

جواب میں ثریا نے سر جھکا دیا اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

لیکن اس کے باوجود وہ ثریا کو محلے میں لے جانے سے گھبراتا تھا چونکہ وہ محلے کی لڑکی نہ تھی اور چوگان میں کھیل کھیل کر اور کھڑکی میں چوکی پر بیٹھ کر محلے والیوں کی باتیں سُن سُن کر جوان نہ ہوئی تھی، محلے کی لڑکیاں گورے چٹے بدن سے بھری ہوئی چوکیاں چوری چوری تاکنے والی سادہ نظریں، چڑھے ہوئے پائینچے، منظور نے اک جھرجھری لی۔ اس کی نگاہ سامنے ثریا پر جا پڑی، گویا ہوا میں اک مختصر مگر رنگدار سا جالا تنا ہوا تھا حیران سی آنکھیں، معصوم، خمدار ہونٹ، زرد زرد اُداس حسن، پتلا سا صراحی دار جسم گویا کسی زرد بوتل میں جان پڑ گئی ہو مُرقع غالب کی کوئی تصویر چپکے سے کتاب سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہو، ہاں محلے کی لڑکیوں سے کس قدر مختلف تھی وہ۔ اور پھر شادی پر اس نے محلے والوں کی رضامندی پوچھنا تو کیا انہیں بلاوا تک نہ بھیجا تھا منظور کی بہن نے آکر جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا تھا دِن محلے میں ایک نئی لڑکی لا بسانا، بیوی کے چناؤ میں انہیں قطعی نظر انداز کر دینا گویا وہ محلے والے ہی نہ تھے، محلے والیوں کے لئے یہ ایک ان ستی بات تھی، اس کے علاوہ اپنی سگی چچی جو محلے میں سب سے بڑی پردھان تھی اس کی بات کو یوں رد کر دینا، محلے میں ایسا کون تھا جو یہ نہ جانتا ہو کہ چاچی باتوں ہی باتوں میں اک بار اپنی بیٹی زبیدہ کو منظور کے نام کر چکی تھی

انہیں باتوں کی وجہ سے وہ ثریا کو محلے میں لے جانے سے گھبراتا تھا، لیکن بے چارہ مجبور تھا، دو ماہ کی چھٹی کہاں بسر کرتا۔ اس لئے انہیں محلے میں آنا ہی پڑا، اور وہ دونوں وہاں آگئے۔

محلے کے درمیان میں ایک چوگان تھا جس میں ایک تنگ و تاریک گلیاں بل کھاتی ہوئی اِدھر اُدھر کو نکل گئی تھیں۔ چوگان کے ارد گرد کالی کالی خمدار سہ منزلہ دیواریں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ صدیوں کے بوجھ تلے وہ جھک گئی تھیں اور یہاں وہاں کئی ایک جگہ سے اینٹیں نکل آئی تھیں، لیکن وہ خم اور شگاف عرصہ دراز سے ان دیواروں کے جزو ہو چکے تھے، چوگان میں چند ایک چھوٹی چھوٹی محراب دار کھڑکیاں کھلتی تھیں، جن پر میلے سے ٹوٹے پھوٹے سرکنڈے لٹک رہے تھے جو شاید کسی زمانے میں چقیں ہوں، چوگان کے بیچ میں ایک کبڑی لالٹین جھکی جھکی کھڑی تھی اور رات کو ٹمٹما کر اندھیرے کو اور واضح کیا کرتی۔ دائیں طرف مسجد کا سلیٹی گنبد اُبھرا ہوا تھا جو کبوتروں اور چمگادڑوں کی آوازوں کو اچھال کر محلے میں نشر کیا کرتا۔

دن کے وقت محلے والیاں اپنا اپنا کام لے کر چوگان میں آ بیٹھتیں چرخوں کی روئیں روئیں میں کوئی نا کوئی بات چھڑ جاتی، بیاہ بیماری یا موت کی بات یا کوئی پرانا شکوہ کسی کے دکھے زخموں کو ہرا کر دیتا۔ ایک ہاتھ مٹکا مٹکا کر کچھ کہتی دوسری ناک پر انگلی رکھ کر سنتی، کوئی بیچ میں بول اٹھتی اس سے چاچی کی کرخت آواز اُن دیواروں سے ٹکرا کر گنبد میں سوئے ہوئے کبوتروں اور چمگادڑوں کو جگا دیتی اور وہ چیخنے لگتے چرخوں کی مدھم گنگناہٹ میں وہ

سرحت اور بھیانک آوازیں سُن کر یوں محسوس ہوتا جیسے کسی ویران کھنڈر میں اونچے اونچے بوسیدہ سُتون بھوتوں کی طرح چل پھر رہے ہوں۔

کھڑکیوں میں چوکیوں پر بیٹھی جوان لڑکیاں غور سے ان کی باتیں سنتیں اور کبھی کبھی وہیں سے کوئی نا کوئی لقمہ دیتی رہتیں۔ چوگان میں بچے کھیلتے رہتے اور یا تھک جاتے تو کسی دہلیز پہ بیٹھ کر ان کی باتیں سنتے اور آپس میں کچھ نہ کچھ کہہ کر چوری چوری ان کا منہ چڑاتے کبھی کبھار کسی محلے والے کی کھنکھار سنائی دیتی اور کوئی مرد سر جھکائے دبے پاؤں چوگان سے گزر جاتا۔ یوں ہی دن گزر جاتا، سال بیت جاتے، چوگان میں کھیلنے والی لڑکیاں جوان ہو کر کھڑکی میں چوکی پر جا بیٹھتیں اور محلے والیوں کی باتیں سننے میں لگ جاتیں، دلہنیں پرانی ہو کر نیچے چوگان میں اتر جاتیں لڑکے جوان ہو کر کھنکھارنا اور سر جھکا کر دبے پاؤں چلنا سیکھ کر اندر گھروں میں جا بیٹھتے، چھوٹے چھوٹے بچے گھسٹ گھسٹ کر دہلیزوں سے نیچے اُتر آتے اور چوگان میں جا پہنچتے، ان کی کالی کالی دیواروں میں ایک آدھ جھجا اور پڑ جاتا اور وہ اور بھی کالی ہو کر اس کبڑی لالٹین کو کچھ اور اندھا کر دیتیں، مسجد کے گنبد میں سے نئی نئی کرخت آوازیں گونجتیں، لیکن محلے کی زندگی میں کوئی فرق نہ آتا یوں ہی دن گزر جاتے، سال بیت جاتے۔

محلے والوں نے بڑی تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا چاچی نے دوڑ کر دہلیز پہ تیل ٹپکایا اور ثریا کو گود میں اٹھا کر اوپر لے گئی۔ محلے والیوں نے بڑھ کر ان کے ارد گرد حلقہ ڈال لیا، چوگان میں بچے شور مچانے لگے، چاچی بولی بسم اللہ دلہن اپنے گھر آئی، محلے کے مکین باری باری سلام کرنے کو آئے، لیکن ان باتوں کے باوجود منظور دو ایک دن پریشان سا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کالی کالی دیواروں نے اس کے ارد گرد ناچ ناچ کر جھومنے لگا اور چوگان کی کبڑی لالٹین نے مسکرا مسکرا کر جانے اس کے کان میں کیا کہہ دیا، اس کی گردن جھک گئی، اور وہ اندر باہر دبے پاؤں یوں چلنے پھرنے لگا جیسے کسی بخیل کو کوئی جوہر مل گیا ہو۔

ثریا کو تو چاچی نے اس قدر اپنایا کہ وہ سہم سی گئی اس کے ہر قدم پر بسم اللہ اور چھینک پہ الحمد للہ پڑھتی اور بات بات پہ بول اٹھتی "کیوں بیٹی خیر تو ہے، کیا ہے تمہیں، دشمنوں کی طبیعت ناساز ہے کیا؟" یا محلے والیوں کو اس کے ارد گرد بیٹھے دیکھ کر کہتی "اے بی تم نے بیچاری کو گھیر کر پریشان کر رکھا ہے، ذرا ہوا تو لگنے دو، لڑکی کی طبیعت اچھی نہیں، دیکھو تو کیا ذرا سا منہ نکل آیا ہے سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے ہائے" پھر وہ غصے میں ہاتھ چلا کر کہتی "توبہ ان جوان لڑکوں پر خدا کی سنوار۔ بس بیاہ کرنے ہی کے بھوکے ہوتے ہیں دیکھو تو بھابی ایک ہی ماہ میں لڑکی کو کیا کر دیا ہے، منہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور چلتی ہے بہن تو جھٹکے لگتے ہیں، اب تو آپ آرام سے اندر بیٹھ رہتا ہے نا۔ نہ دوا نہ دارو۔ اللہ کرے میری بچی کو آرام ہو جائے۔ توبہ ماں کا دل بھی کیسا ہوتا ہے ہاں۔ آخر میرے لئے تو اپنا ہی بیٹا ہے نا اور جیسے میری زبیدہ ویسے ہی دلہن"

چاچی کے منہ سے یہ بات سُن کر کئی ایک نے ہاں ہاں ملائی۔ ایک بولی "بیچاری کو چار دن بھی دلہن بن بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ نند تو چار کلمے پڑھا کر سُرخ ہو گئی اور اپنے میاں کے پاس جا بیٹھی۔ دوسری کہنے لگی "آج منظور کی ماں زندہ ہوتی تو دیکھتے کیسے ناز وں رکھتی اپنی بہو کو"، تیسری نے کہا "میں کہتی ہوں چاچی بس اپنی زبیدہ کی ہم عمر ہوگی۔ پر اسے دیکھو اللہ رکھے اس وپھیر" میں ہے ذرا سُنے تو منہ اتار کر بیٹھ جاتی ہے لیکن دلہن ہے!"

چاچی بات کاٹ کر بولی "نہ بہن ایسی بات نہ کہو اللہ چاہے گا تو بالکل راضی ہو جائے گی میں تو یہی دعائیں مانگتی ہوں۔ منظور کی بہن چاہے جا جانے پر مجھے ان سے بڑھ کر اور کون عزیز ہے۔"

...چھایاں نے کیسوچے تا یہ بات یہ ثریا کے لئے وہ محلہ وہ کالی ...دیواریں اور ان عورتوں کی باتیں عجیب سی تھیں ان کے جھرمٹ ...وہ اور بھی پریشان ہو جاتی اور اس کے اُداس چہرے پر ...سرانی چھا جاتی اس سے اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا گویا ...ئی پرائیویٹ بات عام کر دی گئی ہو۔

منظور نے اندر بیٹھے ہوئے منجملہ محلے والیوں بالخصوص ...چچی کی باتیں سُنیں اور بہت خوش ہوا کہ وہ ثریا کو یوں ...نا رہی ہیں۔ چاچی تو بالکل اس پر جان دیتی تھی حالاں کہ اس ...خیال تھا کہ چاچی ان سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گی۔ ...خر اُسے دُکھ تو ہوا ہوگا۔ لیکن کیسی اچھی چاچی تھی وہ اس نے ...ہ بات جتائی بھی نہ تھی۔ اُسے منظور دل ہی دل میں اپنے ...شتہ شکوک پر نادم ہو رہا تھا اُس کا جی چاہتا تھا کہ جا کر ...چچی کے پاؤں پڑ جائے اور اس سے معافی مانگ لے۔ بہر حال اُسے ثریا کے متعلق اک اطمینان سا ہو گیا۔ گو ...س کے علاوہ چچی کی بات نے اس پر اور کوئی اثر نہ کیا۔ ...یماری کے متعلق سن کر وہ مسکرا پڑا، عورتیں جو ہوئیں۔ ...ھوڑی سی بات پر گھبرا جاتی ہیں شاید ثریا سفر کی کوفت ...سے پریشان سی دِکھتی ہو۔

لیکن اُس روز جب چاچی ثریا کے لئے منظور سے ...ی اُسے محسوس ہونا شروع ہوا کہ واقعی ثریا کو کسی ڈاکٹر ...دکھانا چاہیئے۔ چاچی کہنے لگی "یہ بھی کوئی طریقہ ہے بیٹا! ...پرائی بیٹی کو گھر لا کر اس کا یہ حال کر دو، اسے دیکھو تو ہلدی ...طرح زرد ہو رہی ہے۔ بس اسی لئے بیاہ کر لائے تھے ...ہے۔ اپنا مطلب نکل گیا تو بیوی گئی بھاڑ میں۔ پر میں ایسا ...ہونے دوں گی، آخر وہ بھی کسی کی بیٹی ہے، اس کی ماں کا ...ن دل ہے، اسے کتنا صدمہ ہوگا اور پھر دوا نہ دارو، میری ...، زبیدہ ہے اسی کی عمر ہو گی، مگر دیکھو تو کیسی جوان ہے اور ان محلے والیوں کو نہیں جانتے تم وہ تو پہلے ہی ...ن کی بھوکی بیٹھی ہیں، زبانیں قینچی سی چلتی ہیں، خدا ...ہے کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں گی، آخر پرائی لڑکی تھا! ان کو کیا پڑی تھی کہ اس کا خیال رکھتے، مر گئی

چلو چھٹی ہوئی۔ جان چھوٹ گئی، پر بیٹا مجھ سے تو یہ نہ سُنا جائے گا، اگر میرے بیٹے ہو تو اب بھی ہوش میں آؤ، ابھی تک ہاتھ سے کچھ نہیں گیا ہے۔ ہاں اور اس حالت میں اسے کام کاج نہ کرنے دوں گی، سُنا تم نے! مجھے برادری میں اپنی ناک نہیں کٹوانی، جب تک اسے صحت نہیں ہوتی زبیدہ یہاں رہے گی، آخر تمہاری بہن ہی ہے نا، گھر کا کام بھی کر دیا کرے گی اور دُلہن کا خیال بھی رکھے گی۔"

اُس روز وہ سارا دن بے چین پھرتا رہا، بار بار ثریا کی طرف دیکھتا اور جانے کیا سوچتا، پھر ثریا کو اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر ایک موہوم سی آہ کھینچ کر کہتا ثریا زیادہ چلو پھرو نہیں، یہاں کبھی آرام نہ کیا تم نے تو ہوگا کیا اس سے ثریا کا اُداس چہرہ اور بھی اُداس ہو جاتا اور وہ آہ بھر کر لیٹ جاتی۔ رات کو جب وہ سو گئیں تو منظور اُٹھ کر صحن میں پھرتا رہا گویا کچھ کھو بیٹھا ہو، چاندنی میں ثریا کا رنگ اور بھی زرد دکھائی دیتا تھا اور وہ بچوں کی طرح چارپائی پر گٹھری بنی پڑی رہتی۔ جانے کیا ہے؟ اسے اس نے غور سے دیکھا اور اُسے چاچی کی وہ بات یاد آ گئی "یہ شہر کی لڑکیاں بس دیکھنے ہی کو ہیں، ہاتھ لگایا اور چھوئی موئی ہو گئیں ——" واقعی چاچی سچ کہتی تھی، ایک سال ہی میں کس قدر لاغر ہو گئی ہے۔ اب کیا ہوگا —— کسی خیال پر اس نے اک جھرجھری لی اور نگاہیں پھیر لیں۔ دُوسری چارپائی پر زبیدہ پڑی تھی، گلابی گلابی بدن سے چارپائی بھری ہوئی تھی، شلوار کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے اور قمیص کا گلا کھلا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ" کہہ کر وہ اٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ چاچی نہ ہوتی تو مجھے اس کی بیماری کا پتہ نہ لگتا اس نے سوچا۔ میں بھلا کیا جانوں کیا ہوتی ہیں ان کی بیماریاں۔ بیچاری علاج کے بغیر ہی —— توبہ ہے، اس نے کھڑکی پر سے نیچے جھانکا، چوگان میں کوئی بوڑھیا سر پہ دیا رکھ کر ناچ رہی تھی۔ ارد گرد کالی کالی گہری دیواریں ہاتھوں میں ہاتھ دئے گھوم رہی تھیں۔ ثریا ثریا کوئی کالی سی چیز چیخ کر گنبد کے گرد پھڑپھڑا رہی تھی۔

زبیدہ نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا، اگر ثریا اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے کچھ کرنے لگتی تو وہ جھٹ بول اٹھتی دیکھو، اماں کو معلوم ہو گیا تو ـــــ میں اُسے کیا جواب دوں گی۔ یا تو ثریا سارا دن لیٹی رہتی یا کبھی کبھار اُکتا کر کوٹھے پر چڑھ جاتی۔ اس وقت دفعتاً زبیدہ کو اس الماری سے کوئی برتن نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی جس کے قریب منظور کرسی پر بیٹھا کرتا تھا، اسے دیکھ کر منظور سوچ میں پڑ جاتا، کیسی اچھی صحت ہے۔ بس صحت کے سوا زندگی میں ہے ہی کیا، پھر اسے خیال آتا کہ وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا ہے اور وہ گھبرا کر آنکھیں جھکا لیتا۔ اُس سمے زبیدہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی۔ اس کا ہاتھ یا اُس کا ہاتھ یا جسم کا کوئی حصہ اتفاقاً اس سے چھو جاتا خوشبو کی ایک ہلکی سی لپٹ اسے گھیر لیتی۔ زبیدہ تو برتن لے کر مڑ کر مسکرا کر چلی جاتی لیکن وہ دیر تک اپنے خیالوں میں گم رہتا یا روز بلا ناغہ ورزش کرنے کا ارادہ کرتا۔ اگر ثریا آجاتی تو اُس کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ترس جھلکتا، اور وہ دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر ثریا کی صحت بھی اچھی ہوتی اگر اس کا جسم بھی بھرا بھرا ہوتا، منظور کی نگاہیں ثریا کے چہرے تلے ایک اور ہی گورا گورا بھرا ہوا جسم لگتا، ان پتلی پتلی باہوں کی جگہ دو بھری باہیں اس کی طرف اٹھتیں پھر اُس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ ایک آہ بھر کر کہتا "ثریا تم زیادہ چلا پھرا نہ کرو۔ ہاں اور وہ دوائی کھائی تھی کیا؟"

جب سے وہ محلے میں آئے تھے، محلے والیوں کو گویا کسی اور بات میں دلچسپی ہی نہ رہی تھی، چوگان میں بیٹھے کوئی نہ کوئی ثریا کی بات چھیڑ دیتی اور نہیں تو چاچی خود کچھ نہ کچھ کہہ دیتی اور جب چاچی آپ کوئی بات چھیڑ دے تو کس کی مجال تھی کہ اس کی ہاں میں ہاں نہ ملائے یا اس کی بات کو کاٹ کر کوئی اور قصہ چھیڑ لے وہ منظور کی چاچی نہ تھی بلکہ سارا محلہ اسے چاچی کہہ کر بلاتا تھا حتیٰ کہ محلے کے بوڑھے بھی چاچی کہتے، کوئی جھگڑا ہو خوشی ہو یا غم ہو ہر معاملہ چاچی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، چاچی ہونٹ پر انگلی رکھ کر غور سے سنتی رہتی اور پھر ہاتھ ہلا ہلا کر اپنا فیصلہ سناتی اور تمام چپ چاپ بیٹھی سُنتیں یا کوئی بیچ میں بول کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی، باقی رہے محلے والے انہیں تو ایسی باتوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ گھروں کی باتیں عورتیں ہی جانیں، اور عورتوں کے معاملے میں ان کا بس یہی کام تھا کہ کھنکار کر سر جھکا لیں اور دبے پاؤں پاس سے گزر جائیں یا کما کر لائیں تو اُن کی جھولی میں ڈال دیں یا بر وقت ضرورت لڑائی میں یا بیاہ پر یا کسی مشکل کے وقت انہیں بلا کر پوچھیں کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہئے اور ان کے بزرگ کہتے تھے۔ ہاں تو چاچی کی بات کو رد کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اور پھر جب چاچی بذاتِ خود ثریا میں اتنی دلچسپی لیتی تھی تو بھلا وہ کر ہی کیا سکتی تھیں، کئی ایک کا خیال تھا کہ چاچی منظور کو منہ تک نہ لگائے گی اس نے جو سلوک چاچی سے کیا تھا وہ کسی سے چھپا ہوا نہ تھا، سب جانتے تھے کہ وہ شروع سے ہی منظور کو اپنا ہونے والا داماد سمجھتی تھی اس کے باوجود منظور کی بہن نے اسے یوں نکال کر رکھ دیا جیسے دودھ کی مکھی۔ ان باتوں کے باوجود جب چاچی کی باتیں سُنتیں اور دیکھتیں کہ وہ ثریا کے نام پر بسم اللہ پڑھتی ہے تو دل ہی دل میں اسے سراہتیں۔

"تو نہیں جانتی بھابی،" چاچی نے رازدارانہ انداز میں کہا "یہ آج کل کے نوجوان بھلا عورتوں کی بیماری کو کیا جانیں یہ تو بس کنگھی پٹی کر کے ٹہلنا ہی جانتے ہیں بس جانے دے تو اس بات کو۔ ہاں" لیکن وہ بات جانے کیسے دیتیں۔ وہ کیا جانتی نہ تھیں کہ جب چاچی "جانے دے اس بات کو" کہے۔ تو اسے جاری رکھنا اشد ضروری ہو جاتا ہے۔ بھابی بولی۔ "اے چاچی مردوں کو کیا پڑی کہ وہ جانیں، اُن کی بلا سے ایک نہ سہی دوسری ہی، بیویوں کا کیا کال ہے" "نہ بھابی یہ نہ کہہ" چاچی نے زبان ہونٹوں میں دبا کر کہا۔ "اللہ نہ کرے ہمارے منہ سے ایسی بات مردوں کا کیا قصور، خود اللہ میاں نے چار کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس لئے نا ایک بیمار ہو جائے یا بچہ نہ ہو تو ہزار باتیں ہوتی ہیں۔ شرافت کی بات پر نکتہ چینی

"۔ میری [illegible] " اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ لیکن چاچی ذہن کو ہے کیا " کسی نے پوچھا۔ چاچی رازدارانہ انداز میں کہنے لگی " وہی اپنی برکت والی بیماری۔ دیکھا نہیں رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوتا جا رہا ہے وہ بھی اسی طرح " اس نے انگلی کھڑی کر کے کہا " سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، جیسے مشکل سے نکالے ہوں گے کیوں بھابی۔

"۔ تو یہ میری۔ اللہ اپنا فضل و کرم رکھے کون سی بیماری ہے جس کا علاج نہیں۔ لیکن اب تو وہاں جا کر اس سے نہ کہنا بتانا بابا۔ مریض سے ایسی بات چھپا کر رکھتے ہیں "۔

اندر منظور نے سنا تو وہ گھنٹوں گم صم بیٹھا جانے کیا سوچتا رہا۔

گو محلے والیاں ثریا سے وہ بات نہ کہتی تھیں پھر بھی آپ جانتے ہیں جب محلے میں کوئی بیمار ہو تو دن میں ایک مرتبہ اس کی عیادت کے لئے جانا ہی پڑتا ہے اور وہاں جا کر پوچھنا ہی پڑتا ہے کہ بی بی اب کیا حال ہے اور اپنی دلی ہمدردی جتانے کے لئے " دیکھو منہ کتنا اتر گیا ہے " کہنا لازم ہو جاتا ہے، محلے والیاں اپنے اس فرض میں کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ دن بھر گھر میں آنا جانا لگا ہی رہتا ثریا تو چپ چاپ لیٹی رہتی تھی لیکن زبیدہ جو تھی وہ ہر آنے جانے والی کے سوال کا جواب دیتی یا اکثر چاچی آپ بیٹھی ہوتی اور کوئی پوچھنے آتی تو وہ جھٹ بول اٹھتی " ابھی تو کوئی افاقہ نہیں پر اللہ اپنا فضل کرے گا اس کے فضل سے مایوس ہونا سب سے بڑا کفر ہے آخر ہوتے ہوتے ہی آرام ہو گا نا " اندر منظور پڑا چاچی کی باتیں سنتا رہتا یا صحت ٹھیک کرنے کے لئے کوئی نا کوئی ورزش کرتا یا کسی بھرے ہوئے جسم کے قرب کی آرزو کرتا، ثریا کا عشق اس کی نگاہ میں کسی بیماری کی علامت کے اور کچھ نہ رہا تھا یوں ہی دن گزرتے گئے حتیٰ کہ منظور ایک ہچکیاں باقی رہ گئیں۔

چاچی کو چپ چاپ بیٹھے ہوئے دیکھ کر منظور نے پوچھا " فکر مند ہو چاچی؟ " اس نے ایک آہ بھری، کہنے لگی

" بیٹا مجھے کیسی فکر بس یہی سوچ رہی ہوں کہ اب کیا ہو گا " " کیا ہو گا؟ " منظور نے حیرانی سے پوچھا، چاچی بولی " دلہن کو آرام آ جاتا تو مجھے فکر نہ رہتی وہاں تم جانے سارا دن کہاں پھرتے رہتے ہو گے، اللہ مارا دفتر کا کام بھی تو ختم ہونے میں نہ آتا ہو گا اور گھر میں وہ اکیلی بیٹھی رہا کرے گی۔ اتنا بھی نہیں کہ کسی سے بات ہی کرے۔ ایسے بھرے گھر سے جا کر وہاں اجاڑ میں پڑ جانا مجھے تو خیال آتا ہے تو ہول اٹھتا ہے، خدا کرے تمہاری ترقی ہو جاتی تو نوکرانی ہی رکھ لیتے پر چالیس روپے میں کیا بنتا ہے آج کل پھر پردیس کا معاملہ ہوا، اور کال کا سماں۔ میں تو زبیدہ کو ساتھ ہی بھیج دوں پر تم جانتے ہو محلے والیوں کی گز بھر کی زبان ہوتی جانے کیا کیا کہتی پھریں اللہ کے فضل سے تمہارے گھر کوئی بچہ بالا ہوتا تو بھی تھا کہتے ہیں اکیلا ایک اور دو گیارہ پہ بچے کی ہوس تو ساری عمر لگی رہے گی۔ اب اس بیماری میں بچہ کہاں۔ برکت کو بھی یہی بیماری تھی منا ساری عمر بچے کو ترستی رہی بس اس گھر کا نام بھی باقی نہ رہا مجھے تو یہ دکھ کھائے جاتا ہے۔ پھر خیال آتا ہے،" یہ کہہ کر وہ رک گئی۔ پھر بولی چلو چھوڑو اس بات کو جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا فضول فکر کرنا ———

" تم بات تو کرو چاچی " منظور کہنے لگا۔

" بات کیا کروں۔ ماں کا دل تو تم جانتے ہی ہو آخر میں تمہاری ماں کی جگہ ہوئی نا، سوچتی ہوں کہ اور نہیں تو کم از کم بچے کے لئے ہی دوسری شادی کر لیتے تو کم از کم گھر کا نام تو رہتا، اس کے علاوہ وہ تمہاری بیوی کا بھی خیال رکھتی، بیمار کی جتنی خدمت ہو کم ہے بیٹا "

" بات تو ٹھیک ہے چاچی " منظور نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " مجھے سوچ لینے دو "

" چل پگلا " چاچی بولی " خواہ مخواہ سوچ سوچ کر اپنے آپ کو ہلکان کرنا پر یاد رکھو جو ہونا ہے وہ

نہ تیرے بس میں ہے نہ میرے بس میں جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ ویسے اگر یہی بات ٹھہر گئی تو بیٹا تو سوچ تو سہی وہ کون سی ماں ہوگی جو اپنی بیٹی کو سوکن کے بھاڑ میں جھونک دے کس کا جی چاہتا ہے میں نے مان لیا کہ اللہ رکھے تیری بیوی مزاج کی بُری نہیں۔ یہ لوگ تو سوکن کے سایے سے دُور بھاگتے ہیں، ہاں البتہ کوئی اپنا عزیز گوارا کرلے تو کرلے۔ برادری کے لوگ کہاں ایسی قربانی کرنے لگے قربانی ہی ہے نا۔ کیوں بیٹا تو تو اب سیانا ہے، پھر وہ محلے کی لڑکی بھی نہ ہوئی۔ میں تو بس تیرے ہی فکر میں گھل رہی ہوں۔ چاچی نے اک آہ بھری۔ ایمان سے منظور جی چاہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو تجھے سکھی دیکھوں۔ اگر تجھے ضرورت ہو تو میں تو اپنے کلیجے کی بوٹی بھی کاٹ کر دے دوں۔

رات کو اسے نیند نہ آتی تھی "کوئی بچہ نہ ہوگا" اس کے کانوں میں گونجتا اور معًا اسے وہ دیواریں اور مکانات ایک بے معنی سا پھیلا نظر آتا، گویا اس مکان کی رُوح پرواز کر چکی ہو اور چونے کا اک بے جان ڈھیر رہ گیا ہو، وہ کھڑکی میں جا بیٹھا نیچے چوگان یوں منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے کوئی عمیق غار ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس غار میں گرا جا رہا ہے وہ اٹھ بیٹھا اور ادھر اُدھر پھرنے لگا، زبیدہ کا سفید سفید چہرہ اور باہیں اندھیرے میں جھلملا رہی تھیں ثریا تو چادر اوڑھ کر پڑی ہوئی تھی وہ ثریا کی پائنتی پہ جا بیٹھا زبیدہ کی چارپائی پہ کوئی بھرے جسم کا بچہ اپنے ہاتھ اٹھا کر رو رہا تھا "ابا ابا۔ آں۔ آں"، گنبد سے کوئی کبوتر چلایا اس نے اس طرف دیکھا گنبد پہ کبوتروں کا ایک جوڑا بیٹھا ہوا دکھائی دے رہا تھا، پھر اس کی نگاہ زبیدہ پر جا پڑی، عین اسی وقت زبیدہ نے کروٹ لی اور اس کی باہیں منظور کی گود میں آگری، گوری گوری گرم گرم باہیں اس کی آنکھیں نہ جانے کیوں چمک اٹھیں اس کے ہونٹ اس باہیں پہ جھکے۔ پھر وہ رک گیا اور اٹھ کر کوٹھا پھاند کر چاچی کے پاس چلا گیا اس وقت یہی دس گیارہ کا وقت ہوگا، چاچی بیٹھی [illegible] رہی تھی

کیوں خیر تو ہے۔ اسے دیکھ کر گھبرا کر بولی "نہیں یا تو کوئی نہیں"، منظور نے جھجک کر جواب دیا۔ ویسے چاچی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ہاں ہاں شوق سے کہو چاچی بولی۔ میرا مطلب ہے اس نے کہا۔ تم جانتی ہو اس حالت میں ثریا کو ساتھ کیسے لے جا سکتا ہوں، اور ساتھ نہ لے جاؤں گا تو مجھے روٹی کی بے حد تکلیف "ہاں ہاں بیٹا"، چاچی کہنے لگی "بازار کی روٹی کھر کی۔ توبہ اس سے بھوکا رہنا بہتر ہے" تو چاچی میرا ہے اگر تم بُرا نہ مانو" نہ پگلا میں کیا تیری بات مان سکتی ہوں۔ تو جو جی میں آئے کہہ" میرا مطلب — منظور نے دُہرایا۔ اگر چاچی تم مجھے اپنی غلامی میں — وہ کہتے کہتے رک گیا چاچی بھی یوں چپ بیٹھی رہی۔ کسی سوچ میں پڑ گئی ہو "تمہارا مطلب زبیدہ رشتے سے ہے"۔ چاچی پوچھنے لگی "چاچی میں س عمر تمہارا احسان مند رہوں گا" منظور نے جھجک جھجک سے کہا "خیر احسان کو تو جانے دے"، چاچی بولی، "تو شاید اس بات میں بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا آخر بڑھ کر مجھے کون عزیز ہے پر بیٹا محلے والے کیا "محلے والے"، منظور نے سر اٹھا کر غصے میں کہا۔ کی میں کیا پروا کرتا ہوں۔ سُنا تم نے چاچی "مجھ مسجد کا گنبد چلا اٹھا۔

نیچے چوگان میں کوئی بڑھی جادوگرنی سر پہ دیو چرخے کی لے پہ ناچ رہی تھی اس کے ارد گرد کالی خمیدہ دیواریں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جھوم رہی کوٹھے پہ اندھیرے میں چاچی کے سفید سفید دانت رہے تھے۔

افسانہ

تدبیر کا گھاؤ

گورنام کھنہ
لندن

اتوار کی صبح کو جب جیمز ہڈسن کی آنکھ کھلی تو بیڈروم کی دیوار پر لگی گھڑی ساڑھے نو بجا رہی تھی۔ باہر کافی دن نکل آیا تھا اور کھڑکیوں پہ تنے پردوں پر سورج کی سنہری کرنیں چھن چھن کر تیں اندر سرک رہی تھیں۔ جیمز بستر سے اٹھ کر ٹہلنے کے لئے جب باہر بالکونی میں آیا تو ساتھ والے مکان میں نئے پڑوسیوں کو دیکھ کر اس طرح اچھل پڑا جیسے یکایک کسی بچھو نے اسے ڈس لیا ہو۔ قریب تھا کہ اس کی چیخ ہی نکل جاتی کہ وہ بجھنے سے پہلے کسی شعلے کی لپک کی مانند بیڈروم میں واپس کود پڑا۔ اور چیخنے کے سے انداز میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

"باربرا۔ باربرا۔ ارے اٹھو...... اٹھو...... دیکھو...... وہ...... وہ......"

"کیوں صبح سویرے ہی چلا رہے ہو۔ وہ... وہ... وہ کیا۔ آخر ہوا کیا ہے؟" باربرا بستر میں لیٹے لیٹے بولی۔

"یہ پوچھو کہ کیا نہیں ہوا...... وہ...... وہ...... ساتھ والے مکان......" اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا۔

"کیا ہوا ساتھ والے مکان کو۔ آگ لگ گئی کیا۔ یا اس مکان میں کوئی بھوت نظر آ گیا تمہیں۔؟"

"آگ لگ جاتی تو اچھا تھا۔ ڈارلنگ۔ مگر یہاں تو واقعی بھوت آ گئے ہیں۔ بھوت"

"بھوت آگئے ہیں۔ یہ صبح صبح کیا اناپ شناپ بک رہے ہو۔ کتنی بار کہا ہے کہ زیادہ بیئر پی کر مت سویا کرو" باربرا اب بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بک نہیں رہا ہوں [illegible] ڈارلنگ۔ سچ کہہ رہا ہوں۔ [illegible] ایک نیگرو فیملی آگئے ہیں یہاں اگر یقین نہیں آتا تو آکر خود دیکھ لو" جیمز کے کہنے پہ باربرا اٹھ کر ساتھ بالکونی میں آگئی۔ ساتھ والے مکان کے [illegible] بنا باغیچہ وہاں سے بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ خالی مکان اب آباد ہو گیا تھا اور وہاں [illegible] کی ایک کالی عورت اتوار کی اس سہانی صبح کو باغیچے [illegible] مزے سے ایک آرام کرسی پہ بیٹھی موسم بہار کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی ـــ باربرا اسے دیکھ جیمز سے مخاطب ہوئی۔ "یہ کالے لوگ بھی تو انسان ہیں جیمز۔ یہ یہاں آگئے تو کون سی آفت آ گئی، کون آسمان پھٹ پڑا۔"

"تم انہیں انسان کہتی ہو۔ ارے میڈم یہ سیاہ ہیں۔ سانپ۔ یعنی جنگلی جانور۔ مائی ڈارلنگ یہ ایسے لوگ ہیں جو پانی کی بجائے "جنگل جوس" پی کر گلیوں، محلوں اور بازاروں میں شور مچاتے ہیں۔ دنگہ فساد کرتے ہیں۔ عقل کی بات کرو تو مارنے کو دوڑتے ہیں۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر سفید فام لڑکیوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ میں ایسے فتنوں کو ہرگز اپنے پڑوس میں نہیں رہنے دوں گا۔"

"مگر تم ان کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہو۔ وہ زبردستی تو یہاں نہیں گھس آئے۔ ضرور کونسل نے ہی انہیں مکان الاٹ کیا ہوگا۔"

"مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ان لوگوں کو ہرگز ہرگز اپنے پڑوس میں تو کیا پوری اسٹیٹ میں نہیں رہنے دوں گا۔ یہ اصلی نسل کے شریفوں کی اسٹیٹ ہے۔ ڈرٹی نیگروں اور جنگلی جانوروں کے لئے یہاں کوئی

نہیں۔ میں ان کو یہاں سے نکال کر ہی دم لوں گا۔" جیمز غصّے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"وہ کیسے؟" باربرا نے پوچھا۔

"میرے پاس ایسے کئی طریقے ہیں۔ سب سے پہلا تو یہ تھا ایک پٹیشن (PETITION) لیکر محلّے والوں کے پاس جاؤں اور کوئی پانچ چھ ہزار لوگوں کے دستخط کرواکر ہاؤسنگ اتھارٹی پر زور ڈالوں گا کہ وہ ایک ذلیل اور نچلے درجے کے لوگ جن کے یہاں بس جانے سے ہمارے اور ہمارے بچوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ یہاں سے نکال کر کسی اور جگہ آباد کر دے۔ اگر خدا نخواستہ میری یہ اسکیم ناکام رہی تو پھر میں ان کو اپنے فٹ بال کلب کے ممبروں کی مدد سے اس قدر تنگ کروں گا کہ وہ خود بخود یہاں سے چلے جانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

"مگر تمہاری پٹیشن پر دستخط کون کرے گا جیمز؟"

"سبھی کریں گے تم دیکھ لینا۔ آج نہیں تو کل دوپہر تک میرے پاس ان سانپوں کو اس اسٹیٹ سے نکالنے کے لیے پورے پانچ ہزار معزز شخصیتوں کے دستخط ہوں گے۔ آخر میری بھی کوئی حیثیت ہے۔ میں کوئی معمولی آدمی نہیں۔ بلکہ کیو۔ پی۔ آر۔ فٹ بال کلب کا ایک اعلیٰ رکن ہوں۔ سمجھی۔"

"فٹ بال کلب کے ممبر ہو تو کیا ہوا۔ اس سے ان لوگوں کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ہاں یہ تمہیں بتلائے دیتی ہوں کہ رنگ اور نسل کی بنا پر نفرت کرنے کے الزام میں حکومت کے ریس ریلیشنز ایکٹ کے تحت تم خود ہی دھر لیے جاؤ گے۔"

"میں اتنا کم عقل نہیں جتنا تم سمجھتی ہو، بلکہ سفید فام لوگوں کی اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتا ہوں، میں ایسا چکر چلاؤں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" یہ کہہ کر جیمز تو تھوڑا اپنا کالی اسپورٹس جیکٹ پہن کر دوپہر ایک دوست ٹام کے گھر روانہ ہو گیا۔

کالے اور دوسرے رنگ دار لوگوں سے جیمز کو تو

شروع سے ہی کاشدید نفرت تھی۔ وہ زبردست روایت پرست تھا اور زمانے کی بدلتی ہوئی تہذیبی۔ تمدنی اور اخلاقی قدروں کو قبول نہیں کر سکا تھا، اُسے اپنی نسل کی برتری پر ناز تھا اس کا خیال تھا کہ کالے لوگ صرف پسماندہ۔ جاہل۔ گنوار۔ اور گھٹیا نسل کے لوگ ہیں ان کی شکلیں گھٹیا ہیں۔ دماغ گھٹیا ہیں۔ اور وہ صرف گھٹیا اور ادنیٰ درجے کے کام کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ سفید فام لوگوں کے برابر رہنے بسنے کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں۔ وہ ان کالے لوگوں کو معمولی لوگوں سے زیادہ حیثیت دینے کے حق میں نہیں تھا اسی وجہ سے وہ اپنی بیوی باربرا سے اکثر اوقات بحث کرتا رہتا تھا۔ کئی بار تو وہ بڑی عجیب عجیب حرکتیں بھی کرتا تھا۔ اگر بس یا گاڑی میں سفر کرتے وقت کوئی رنگ دار مسافر اس کے قریب آکر بھی کھڑا ہو جاتا تو وہ نفرت اور حقارت سے منہ اس طرح دوسری طرف پھیر لیتا جیسے یہ رنگ دار لوگ انسان نہیں ہوں بلکہ کسی گھٹیا سے سگریٹ کا دھواں ہوں جو اس کی آنکھوں میں گھسا جا رہا ہو۔ وہ کالے اور رنگ دار لوگوں کو دیکھ کر چلتی بس سے اُتر کر پیدل ہی گھر کو ہو لیتا۔ رنگ دار لوگ اُسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ سب کو گولی سے اُڑا دیتا۔ مگر وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔ مگر کالے لوگ کو دیکھتے ہی وہ دل ہی دل میں جل اُٹھتا اور پھر دھیمی سی آواز میں "بلیکی" "باسٹرڈ" یا ڈرٹی جیسی گالیاں دے کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا کرتا تھا اب جب کہ کونسل کی اس اسٹیٹ میں ایک کالا کنبہ اُس کے پڑوس میں بس گیا تھا اُس کا جینا حرام تھا اور وہ ان کو وہاں سے کسی بھی طرح نکال دینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

اُس دوپہر کو جب کافی چکر لگانے کے بعد گھر لوٹا تو اُس کا چہرہ قدرے مرجھایا ہوا

جیمز بونڈ ڈائننگ روم میں آکر بیٹھا۔ باربرا اس سے مخاطب ہوئی۔ "کیوں جیمز ہو گئے تمہارے پٹیشن پر پانچ ہزار آدمیوں کے دستخط؟"

"ہاں۔ ہاں۔ ہو گئے"۔ جیمز غصے کے عالم میں چلّا رہا تھا۔

"کتنے لوگوں کے" باربرا نے پوچھا۔

"ابھی تو جیفری ہی گھر پر ملا تھا۔ مگر دیکھ لینا آج نہیں تو کل شام تک میری اس درخواست پر اس ڈربی فیملی کو یہاں سے نکال دینے کے لئے پورے پانچ ہزار معزز شہریوں کے دستخط ہوں گے"۔

"رہنے دو جیمز۔ تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ تم مفت میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میری مانو تو حالات سے سمجھوتہ کر لو"۔

"سنو باربرا، اگر تم میری قدر نہیں کرتی تو کیا دوسرے بھی نہیں کرتے۔ تم کیا جانو کہ میں کیو۔ پی۔ آر فٹ بال کلب میں کس قدر ممتاز حیثیت کا مالک ہوں لوگ میرے ایک اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں"۔

"خوب جانتی ہوں تمہاری حیثیت اور وقار کو تبھی تو پچھلے ہفتے ہی کلب کے چیئرمین نے تمہیں کلب سے برطرف کر دئے جانے کی دھمکی دی تھی"۔ باربرا نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

"وہ اور بات تھی۔ یہ اور بات ہے۔ یہ محلے اور ملک کی عزت کا سوال ہے۔ جب میں کلب کے ممبروں اور اپنے محلے داروں کو یہ بتاؤں گا کہ اس نئی فیملی نے یہاں آتے ہی غل غپاڑہ مچانا اور جھگڑا کرنا شروع کر دیا ہے تو دیکھنا اس اسٹیٹ کے تمام لوگ انہیں یہاں سے نکال دینے میں میرا ساتھ دیں گے"۔

"مگر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ لوگ شور مچاتے ہیں یا شراب پی کر گالیاں بکتے ہیں۔ تم نے تو ان آدمی کو ابھی دیکھا تک نہیں"۔

"میں اس کمینے اور ادنیٰ درجہ کے ساہبو کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اور رہا شور و غل مچانے کا ثبوت۔ تو اس کا علاج میرے پاس ہے۔ میں آج ہی شام کو ٹام اور جیکو کو یہاں لا کر خواہ مخواہ اس ساہبو سے الجھا دوں گا۔ جب معاملہ بڑھ جائے گا تو تمام محلے داروں کو اکٹھا کر کے اس کے خطرناک جھگڑالو ہونے اور ہمارے امن و امان میں خلل ڈالنے کا الزام لگوا دوں گا۔ اس کے بعد اپنی درخواست پر تمام محلہ داروں کے دستخط کروا کر لوکل اتھارٹی پر زور ڈالوں گا کہ وہ ایسے خطرناک آدمی کو اس جگہ سے نکال کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیں"۔

باربرا کو جیمز کی ایسی باتیں سن کر بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اس کے لئے کھانا پروس کر میز پر رکھتی ہوئی بولی "جیمز تم کرسچین ہو۔ انگلش سہی مگر انسان ہرگز نہیں ہو"۔

گرم گرم کھانے کو دیکھ کر جیمز نے باربرا کی بات کو سنی ان سنی کر دیا اور پھر کسی ازلی بھوکے شیر کی مانند کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ نہ جانے کون سی جلدی میں تھا کہ سرعت سے کھانا کھاتے کھاتے کانٹا اس کے حلق سے جا ٹکرایا۔ وہ مارے درد کے کراہ سا اٹھا اور اس کے منہ سے بے اختیار "بلڈی ہیل" نکل گیا۔

"تم ہر کام بنا سوچے سمجھے اور جلدبازی میں کرتے ہو۔ یہاں تک کہ کھاتے بھی اتنی تیزی سے ہو کہ اپنا ستیاناس کر بیٹھتے ہو"۔ باربرا بول اٹھی۔

"ان رنگ دار اور گندے لوگوں کے پڑوس میں آ جانے سے میرا خون کھول رہا ہے اور جب تک یہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتے میرے لئے کھانا بھی حرام ہے۔ اٹھا لو یہ پلیٹ مجھے کچھ نہیں کھانا ہے"۔ یہ کہہ کر جیمز نے مارے غصے کے اپنی خالی پلیٹ باربرا کی طرف دھکیل دی۔ باربرا نے اس خالی پلیٹ کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ "ہاں جیمز تو

پیٹ میں کھانا واقعی تمہارے لئے حرام ہے "

" ڈارلنگ تم انگریز ہو کر کتنی کم عقل ہو۔ بجائے اس کے کہ ان کیلے پیلے وحشیوں کو یہاں سے نکالنے کا انتظام کرو " یہ کہہ کر جیمز نے وہی کالے رنگ کی اسپورٹس جیکٹ پہنی اور اپنے دو انتہائی شرارت پسند اور متعصب دوستوں جیکو اور گیری کو ملنے چلا گیا۔

شام کو وہ شام جیکو اور گیری کو ساتھ لے کر کیو۔ بی۔ آر فٹ بال کلب میں جا پہنچا اور اپنے ساتھیوں کو اکسانا شروع کر دیا — " دیکھو دوستو یہ اندھیر ہے کہ اب معمولی حیثیت اور گھٹیا نسل کے لوگ آج ہمارے جیسے اعلیٰ درجے کے شہریوں کے شانہ بشانہ چلنے لگے ہیں ہمارے جیسے شریف اور مہذب محلے داروں کے آرام میں خلل ڈالنے لگے ہیں۔ ساری ساری رات نشے کے عالم میں چور رہ کر شور و غل مچاتے ہیں۔ کونسل نے ایسے لوگوں کو ہماری اسٹیٹ میں مکان الاٹ کر کے نہایت بے انصافی کی ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ اس طرح کے کیلے اور غلیظ لوگ ہماری صاف ستھری اسٹیٹ میں آ بسیں ؟ "

" نہیں کبھی نہیں۔ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے ہم تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں " شام جیکو اور گیری نے یک زبان ہو کر کہا — مگر کلب کے دوسرے ممبر جیمز کی یہ سب باتیں سن کر بھی خاموش رہے۔ مگر گراہم جو جیمز کے تعصب اور پاگل پن سے اچھی طرح واقف تھا بولا " تم کیوں ایسی من گھڑت باتیں کہہ کے دوسروں کو اکسا رہے ہو۔ میں بھی اسی اسٹیٹ میں رہتا ہوں۔ میں نے اب تک نہ تو کالے لوگ دیکھے ہیں اور نہ ہی کوئی شور سنا ہے "

" گراہم تم انگریز ہو کر بھی اناڑی اور ناسمجھ ہو لیکن تم لوگوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں فتنوں کو ہرگز نہیں جانتے۔ میں اُن کی حرکتوں سے خوب واقف ہوں۔ اس لئے تمہیں وارننگ دے رہا ہوں۔ آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں۔ بیشتر اس کے کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے اس کو دبا کر آنے والے خطرے کو ہمیشہ کے لئے روک دینا چاہئے "

" یہ تم نہیں۔ تمہارا تعصب بول رہا ہے۔ ایسی من گھڑت باتیں کر کے تم صرف ہم لوگوں کے جذبات کو بھڑکا رہے ہو۔ مگر شاید تم یہ بھول رہے ہو کہ کالے لوگ بھی انسان ہیں۔ میری اور تمہاری طرح انسان۔ اور سب انسان ایک جیسے [illegible] جلد کا رنگ مختلف ہونے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ گھٹیا قسم کے — خطرناک یا جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ انسان کی پہچان اس کے رنگ سے نہیں اس کے کردار سے ہوتی ہے "

" تو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم آستین میں سانپ پال لیں۔ چپ رہ کر تماشہ دیکھتے رہیں۔ صدیوں پرانی تہذیب کو بدل ڈالیں — نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میں اپنی قوم اور اپنے لوگوں کو اپنے سامنے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا "

" یہ صرف تمہاری لاعلمی۔ نادانی اور تنگ دلی ہے۔ رنگ دار لوگ ہرگز ایسے نہیں۔ وہ ادنیٰ حیثیت کے نہیں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغوں کے مالک ہیں "

" نان سنس " جیمز جیسے گرج سا اٹھا۔ " تم ان کمینوں۔ جاہلوں اور بیچ لوگوں کو نہیں جانتے۔ یہ دائیٹ لوگوں کو کھلے عام گالیاں دیتے ہیں۔ اس ملک کی دولت لوٹ لوٹ کر اپنے اپنے ملکوں کو بھیج رہے ہیں۔ ان لوگوں میں ایک نہیں لاکھوں کروڑوں عیب ہیں۔ ایسے کردار کے لوگوں کا اس اسٹیٹ میں آ بسنا میرے لئے ہی نہیں تمام اسٹیٹ کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے — بھائیو! اب بھی وقت ہے۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو اور اس پٹیشن پر دستخط کرو۔ نہیں تو آنے والے تباہ کن وقت کا میں ذمہ دار نہیں ہوں گا " جیمز جو تقریباً طیش میں آ کر ہو رہا تھا کہہ رہا تھا۔ شام جیکو اور گیری نے اس کا ساتھ دیا

کے جذبات کو بھڑکاتے رہتے ۔ کلب کے کچھ ممبران
سے چھٹکارا پانے کی غرض سے جیمز کی درخواست
ستخط کر دئیے ۔ جیمز یہ سمجھ کر کہ سب اُس کے ساتھ
خوشی سے پاگل ہوا تھا ۔ پھر اس خوشی میں اس
سب کو بیر پلائی اور رات کے ساڑھے نو بجے کے
ٹام ۔ جیکو اور گیری کو لے کر اپنی اسٹیٹ میں
اور وہاں کے لوگوں کے گھروں میں جا کر انہیں
کرانا شروع کر دیا ۔ بہت سے لوگ تو اس کے نسلی
سے واقف تھے اور اُسے پرانا دماغی مریض سمجھ
اس سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے ۔ کچھ نے نہ چاہتے
نے بھی اس کی پٹیشن پر بنا پڑھے ہی دستخط کر دئیے
رات کے گیارہ بجے کے قریب جب وہ اپنے
ستوں کے ہمراہ گھر پہنچا تو اس کی درخواست پر اسٹیٹ
تقریباً ہزار ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے دستخط ہو چکے
اب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اسٹیٹ کے آدھے سے
دہ لوگ اُس کے ساتھ ہیں ۔ اپنی اس کامیابی
وہ انتہائی خوش تھا ۔ اس لئے اُس نے باربرا کو
ڈش یعنی فش اور چپس بنانے کے لئے کہا ۔
بھی وہ بہت خوش ہوتا تھا یا کسی میدان میں اُسے
کامیابی نصیب ہوتی تھی تو وہ تلی ہوئی مچھلی
کھاتا تھا ۔ تلی ہوئی مچھلی اور آلو کے قتلے اُسے
بھاتے تھے ۔ وہ مچھلی اور آلو کے قتلوں کو بہت
درجہ کی خوراک تصور کرتا تھا ۔ فش اور چپس کے
ساتھ اُسے فرانسیسی شراب بھی بہت پسند تھی ۔
وقت وہ اپنے تینوں دوستوں ٹام جیکو اور گیری
ساتھ بیٹھا اس حبشی کو اپنے پڑوس سے نکال دینے
منصوبے بنا رہا تھا ۔ سب نے طے کیا کہ دوسرے
ہی گیری دو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو لے کر مکان
میں فٹ بال کھیلنا شروع کر دے اور کہیں
میں فٹ بال کو اس زور سے مکان کی طرف
اس کی کسی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائیں

ایسا ہونے پر ضروری ہے کہ وہ آدمی اُس سے باز پرس
کرے گا ۔ اس حالت میں گیری اس سے خواہ مخواہ اُلجھ
پڑے جب معاملہ بڑھ جائے تو فوراً پولیس کو بلا یا
جائے اور پھر ہم سب مل کر یہ بیان دیں کہ اس شخص
نے اسٹیٹ میں آتے ہی جھگڑا شروع کر دیا ہے اور
اب مرنے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے ۔ اس طرح
پولیس اُسے اندیشۂ نقضِ امن کے الزام میں دھر لے گی
اور پھر ہم لوگ اپنی پٹیشن پر باقی محلہ داروں کے
دستخط کروا کر ہاؤسنگ اتھارٹی پر زور دیں گے
کہ ایسے بدقماش ، خطرناک اور جھگڑالو قسم کے شخص
کو اسٹیٹ سے نکال دیا جائے ۔ اسکیم بہت اچھی تھی ۔
ٹام ۔ جیکو اور گیری بھی اس سے متفق تھے ۔ ٹام نے کہا
کہ برو کونسل کے چند ایک کونسلرز تک اس کی بہت
رسائی ہے اور وہ یہ کام بخوبی کروا سکتا ہے —
وہ چاروں دوست شراب کے دور کے ساتھ ساتھ
اپنی تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سوچتے رہے
اور کامیاب ہو جانے کی اُمید میں قہقہے لگاتے رہے —
باربرا کو اُن کی باتیں سُن کر بہت صدمہ پہنچا مگر وہ
خاموش رہی اور اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق
مچھلی اور آلو کے قتلے تل کر اُن سب کے سامنے پر دس
دئیے ۔ فرانسیسی شراب کا نشہ اُن کو مدہوش بنا رہا
تھا اور بھوک خوب ستا رہی تھی ۔ گرم گرم فِش اور
چپس کی بھری پلیٹ دیکھ کر جیمز اس پر ایسے ٹوٹ پڑا
جیسے بھوکے گدھ کسی مُردہ جانور کی لاش پر ٹوٹ
پڑتے ہیں ۔ اس نے اپنے کانٹے اور چھری کو سنبھالا
اور جلدی جلدی مچھلی نگلنے لگا ۔ فرانسیسی شراب اور
تازہ مچھلی کا ذائقہ اس کے نشے کو دو آتشہ بنا رہا
تھا اور وہ کھاتے کھاتے " بلڈی گڈ ۔ بلڈی گڈ "
کہتا جا رہا تھا ۔ اس کے تینوں دوست اس کا ساتھ دے
رہے تھے مگر جیمز شاید باتوں میں سب سے آگے بڑھ
جانا چاہتا تھا ۔ اُسے اپنی تدبیر کامیاب ہو جانے کا

بھی نشہ تھا۔ اسی نشے میں چُور وہ قہقہے لگاتا ہوا مچھلی کو
بے پروائی سے کھانے لگا۔ اور پھر جب مچھلی کا ایک بڑا
ٹکڑا اس نے حلق میں ڈالا اور تیزی سے اُسے نگل جانا چاہا
تو اچانک اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی، چھری کانٹا
اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑے اور وہ کراہنے لگا ——

"ب - ب - بل - بلڈی ہیل ..... بو ..... بو ..... بون
(BONE) ..... م ..... م ..... م ..... میرے حلق میں
..... بو ..... بو ......" یہ کہتے کہتے اس کی آواز رک
گئی۔ شام، جیکو، گیری اور باربرا اسے فرسٹ ایڈ پہنچانے
لگے۔ مگر جب کوشش کے باوجود بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تو
باربرا نے جلدی سے ایمبولینس والوں کو فون کر دیا۔ ایمرجنسی
کیس تھا۔ منٹوں میں ایک ایمبولینس آموجود ہوئی اور اسے
فوراً ہی ہسپتال لے جایا گیا۔ اسی رات ڈاکٹر کیمبل نے
آپریشن کر کے اس کے حلق سے مچھلی کا کانٹا نکال دیا۔
اب وہ خطرے سے باہر تھا۔ دو دن بعد ہی اس کی حالت
بہتر ہو گئی۔ تیسرے دن دوپہر کو جب نرس الزبیتھ
اُسے دیکھنے آئی تو اس نے اسے بتایا کہ اب اس کی حالت
بہتر ہے اور شام کو ہی ڈاکٹر اس کا معائنہ کر کے اسے
گھر جانے کی اجازت دے دیں گے —— یہ سن کر جیمز بہت
بہت خوش ہوا۔ وہ جلدی سے جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا
وہ سوچنے لگا کہ شام گھر پہنچتے ہی شام، جیکو اور گیری کو
لے کر اپنی اسکیم کے مطابق کالے پڑوسی سے ان کا جھگڑا
کروا دے گا اور پھر کچھ دنوں بعد ہی جب کونسل والے
اُس حبشی کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اس کی وہ شاندار
اسٹیٹ گھٹیا قسم کے لوگوں سے نجات پا جائے گی۔ جیمز
بہت خوش تھا۔ اپنی نسلی برتری کو برقرار رکھنے
کے خوابوں کی تعبیر اسے صاف نظر آ رہی تھی ——

اسی شام نرس الزبیتھ ڈاکٹر کیمبل کے ساتھ وہاں آئی
جیمز اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا آنکھیں بند کئے نہ جانے کیا
سوچ رہا تھا کہ نرس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔
"مسٹر بوتھ یہ ہیں ڈاکٹر کیمبل جنہوں نے عین وقت پر
آپریشن کر کے آپ کو بچا لیا ہے۔"

جیمز بوتھ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک لمبا
تڑنگا، بھونڈی سی شکل والا کالا آدمی سفید
کوٹ پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے دیکھتے
جیمز کی تمام خوشی کافور ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا
جیسے زمین ڈولنے لگی ہو اور ساری کائنات ایک
کی زد میں آگئی ہو۔ اس کا چہرہ بری طرح تپنے لگا
کچھ لمحے یوں ہی بُت بنا لیٹا رہا۔ اسے ایسا لگا جیسے
اس کے سامنے کوئی بہت بڑا بھیانک ڈرامہ کھیلا
جا رہا ہو۔ پھر اچانک ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا
حیران کن لہجے میں بولا "تو کیا آپ ہی ڈاکٹر کیمبل
ہیں، اور آپ ہی نے میرا آپریشن کیا تھا ——؟"

"ہاں مسٹر بوتھ، ڈاکٹر کیمبل ایک نہایت ہی
سرجن ہیں اور ہماری استدعا پر ہی حال ہی میں بر
سے ٹرانسفر کرا کر یہاں آئے ہیں۔ دعا دو
جنہوں نے عین وقت پر آپریشن کر کے تمہاری جان
بچا لی ..... ورنہ ......" نرس نے کہا۔

جیمز ابھی تک حیرانی کے عالم میں ڈاکٹر
ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا اور ابھی وہ مزید کچھ کہہ
پایا تھا کہ ڈاکٹر کیمبل اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف
بڑھاتے ہوئے بولا "ویل مسٹر بوتھ، اب آپ
ٹھیک ہیں —— فکر کی کوئی بات نہیں —— اب آپ
جا سکتے ہیں۔ صرف چند دنوں تک فش نہیں کھانا
اپنا خیال رکھنا۔ ویسے میں تمہارے پڑوس میں ہی
ہوں۔ گاہے بگاہے تمہیں دیکھنے آتا رہوں گا،
دیکھ بھال کرنے میں مجھے دلی مسرت حاصل ہوگی"

جیمز بوتھ جو کسی رنگ دار سے ہاتھ ملانا
بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا۔ چپ چاپ ڈ
ہاتھ ملایا اور پھر ایک کھسیانی سی ہنسی ہنس
"تھینک یو ڈاکٹر۔ تھینک یو ویری مچ"
کے جاتے ہی وہ پھر ایک گہری سوچ میں

ے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ دیو جیسا کالا وہ شخص ہی کامیاب
جی اور ڈاکٹر کیمبل تھا۔ کیا واقعی وہ بدصورت حبشی ڈاکٹر
بن ہے۔ وہ رہ رہ کر یہی سوچتا رہا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک
سی عالم میں اسیر رہتا کہ کسی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔
ب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی بیوی باربرا جو اُسے گھر
جانے آئی تھی اُس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔
سی میں سفر کرتے ہوئے بھی جیمز تمام راستہ کالے ڈاکٹر
بارے میں ہی سوچتا رہا۔ وہ ایک عجیب سے تذبذب میں
تلا تھا۔ وہ تمام راستہ خاموش رہا، گھر پہنچ کر بھی اس نے
راستے کوئی بات نہیں کی اور چپ چاپ اپنے بستر پر جا
اور بستر پہ پڑا بس سوچتا ہی رہا۔

ابھی اسے گھر پہنچے آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ دروازے
گھنٹی بجی، باربرا نے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر کیمبل کو اپنی بیوی
ر سات سالہ بچی کے ساتھ وہاں کھڑا تھا۔ باربرا انہیں
ھ لے کر اوپر جیمز کے کمرہ میں آگئی۔ "دیکھو جیمز کون
ہے" باربرا اُس سے مخاطب ہوئی۔ جیمز نے پلٹ کر دیکھا
ر کیمبل اس کی بیوی اور سات سالہ بچی جس کے ہاتھ میں
برنگے پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ کھڑے تھے "ہیلو
ر لوتھر۔ کہو کیسے ہو اب؟" ڈاکٹر کیمبل پیار اور
مدردی بھرے لہجہ میں اس سے مخاطب ہوا۔ پیشتر اس کے
ر لوتھر اُس کا جواب دیتا چھوٹی بچی آگے بڑھی اور
پیار بھری دل کو موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی
ڈ ایوننگ انکل۔ لیجئے یہ پھول میں آپ کے لئے لائی ہوں
نے خاص طور پہ آپ کے لئے خرید کر دئے ہیں" یہ
اس ننھی بچی نے رنگا رنگ خوشنما پھولوں کا وہ
جیمز کی طرف بڑھا دیا اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی
ستہ بچی کے ہاتھوں سے لے لیا اور پھر اس کے منہ
تارہ [illegible] نکل گیا۔

کیمبل اور اُس کی بیوی اور بچی کے وہاں سے
جیمز بستر پہ خاموشی سے لیٹا رہا اس کے انگریز
سے کوئی بھی اس کی مزاج پرسی کے لئے نہیں
آیا تھا۔ کسی نے اُسے پوچھا تک نہیں تھا، وہ خاموش لیٹا
لیٹا سوچ رہا تھا۔ اپنے بارے میں، دوسروں کے بارے
میں۔ ابھی تک اُس کے ہونٹ اس طرح آپس میں
چپکے ہوئے تھے جیسے کسی نے اُن پر تالا لگا دیا ہو۔ اُسی
طرح لیٹا لیٹا پھر وہ اُن رنگ برنگے پھولوں کو دیکھنے لگا۔
جن سے پیار اور ہمدردی کی خوشبو آرہی تھی۔ پھولوں
پر نظر پڑتے ہی اُسے ایسا لگا جیسے پھر کوئی اس سے مسکرا
کر کہہ رہا ہو "ممی نے خاص طور پر آپ کے لئے خرید کر
دئے ہیں" وہ ان پھولوں کو دیکھتا ہی رہا۔ اُن کے
رنگوں پر غور کرتا ہی رہا۔ اور پھر نہ جانے کیوں اور
کیسے اُس پتھر دل کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بہتے ہی
چلے گئے۔ پھر اس کے جذبات اور احساسات نے
ایک نیا موڑ لیا۔ ایک نیا راستہ دیکھا اور اس نئے راستے
پر پہلا قدم رکھتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اس کے خون کی
گردش معمول پر آگئی ہو تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہو۔
نفرت، تعصب اور غرور کا ہر خیال کسی اندھیرے میں
ڈوبتا چلا گیا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے بستر سے
اُٹھا اور الماری سے دستخط شدہ درخواست نکال کر
اسے گھورنے لگا۔ آدھے سے زیادہ سفید فام محلے داروں
کے دستخط اب اُسے ایسے دکھائی دینے لگے تھے جیسے وہ
لوگوں کے نام نہیں زہریلے ناگ ہوں جو اسے چپکے سے
ڈس لیں گے۔ چند ثانیے وہ پٹیشن کو قہر آلود نظروں
سے گھورتا رہا اور پھر دفعتاً نفرت سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے
کر کے پاس پڑی ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

([illegible] کا بقیہ)

آدمی اور فرشتہ کا میل دُور کی بات ہے اسی لئے ساحر صاحب شیخ
کو آدمی ہی کر لینے کی استدعا کرتے ہیں۔ دنیا میں آدمی بننا ہی
مشکل ترین کام ہے حالی مرحوم نے بھی فرمایا ہے ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا ۔ مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

مختصر یہ کہ جناب ساحر ہوشیارپوری کی شاعری عمدہ افکار و تجربات
و محسوسات کی شاعری ہے جو خلوص سلاست، بے ساختہ پن روانی، تاثر
و تخیل کی خوبیوں کی حامل ہے
[illegible]

آفریں بر ساگناہ کند و رحمتِ من در آئینۂ عفو تجلی بنماید

اسی وجہ سے ساحر صاحب گناہ کرنے سے توبہ نہیں کرتے ۔ اس فانی زندگی انسان کو کیا کیا رنگ دکھاتی ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے اس بات سے انسان بے خبر ہے فرماتے ہیں ؎

زندگی بن جائے دوزخ شکر ہے
آدمی انجام سے واقف نہیں

اگر آدمی زندگی کے انجام سے واقف ہو تو اس کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ اسی قبیل سے میرا شعر ہے ؎

جو دوسرے دلوں کا ہر اک راز جان لے
بھولے سے بھی تو ایسی نظر اے بشر نہ مانگ

اگر ہماری نظر دوسروں کے دلوں کا بھید جاننے لگے تو ہمیں زندگی کرنا مشکل ہو جائے ۔ اور ملاحظہ فرمائیں ؎

اے عقل مجھے تجھ سے یہی خوف لگا ہے
تو موت کی آمد سے خبردار نہ کر دے

اگر انسان کو اپنی موت کا وقت یا اس کا آنا معلوم ہو جائے تو خدا جانے اس کا کیا حال ہو۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ موت کے آنے کا وقت انسان کو معلوم نہ ہو ۔ زندگی کرنے کا انداز آپ یوں بتاتے ہیں ؎

زندہ رہنا ہے تو انداز بدلتے رہئے
کوئی سانچہ ہو ہر اک سانچے میں ڈھلتے رہئے

انسان اس پر عمل نہیں کرتا اسے دکھوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ آگے فرماتے ہیں ؎

فی زمانہ سب منصور کا نعرہ ہے یہی
سچ نگل جائیے اور جھوٹ اگلتے رہئے

یہ بھی زندگی کرنے کا عمدہ طریقہ ہے، حضرت منصور کو سچ (انا الحق) کہہ کر سولی پر چڑھنا پڑا ۔ آج کے زمانے میں یہی بہتر ہے کہ سچ چھپایا جائے اور جھوٹ زبان پر لایا جائے ورنہ زندگی گزارنا دشوار ہے ۔ شعر ہذا میں ساحر نے منصور کی مثال دے کر بات کھول دی ہے اور ساتھ ہی صنعت تلمیح سے شعر کو مزین کر دیا ہے ۔

؎ غمگساروں سے محفوظ رکھئے ، نہیں
غم کہیں لٹ نہ جائیں خوشی کی طرح

شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ساحر کی خوشیوں کو ان کے غمگساروں نے لوٹا ہے اس لئے اب وہ اس معاملہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتے ہیں، اور اپنے احباب کو بھی ایسی تلقین کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے غمگسار ان کے غموں کو بھی ان کی خوشیوں کی طرح لوٹ لیں ۔ ؎

کیا ہوئے ہیں وہ دور نظروں سے
نظر آتی ہے کائنات اداس

جس کی دید سے دل جمعی ہوتی ہے اگر وہ نظروں سے دور ہو جائے تو کوئی چیز بھی عاشق کے لئے کشش نہیں رکھتی بلکہ تمام کائنات اداس نظر آنے لگتی ہے، کسی شاعر کا شعر ہے ؎

کھٹک رہی ہے چمن کی بہار آنکھوں میں
بغیر یار کے سب گل ہیں خار آنکھوں میں

جو آنکھ دیدِ دوست سے محروم ہے اسے گل بھی خار نظر کیوں نہ آئے ؎

دو روزہ حسن پہ اترانے والو
گلوں کا رنگ کچھ کچھ زرد بھی ہے

حسنِ فانی پر ناز کرنا نادانی ہے اسے ایک روز فنا ہونا ہے مگر ساحر صاحب یہ بات کھلے لفظوں میں نہیں کہتے بلکہ حسن پر نازاں ہونے والوں کی توجہ گلوں کے زرد رنگ ہونے کی طرف مبذول کرتے ہیں کہ وہ حسن کا انجام دیکھ لیں اور نازاں نہ ہوں اشارہ اور کنایہ سے کہی گئی بات صاف بات کہنے سے زیادہ لطف دیتی ہے اسی قبیل کا شعر کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ
حسن والے حسن کا انجام دیکھ

ساحر صاحب فرماتے ہیں ؎

ہم فرشتوں سے بھلے ہیں شیخ جی نہ مل سکو تو ملو آدمی کی

(بقیہ صفحہ ۲۲)

گدھ

کے۔کے۔ سنگھ میلک
(زِ قلم)

> اس نظم کے خالق جناب سنگھ نے ایک گدھ کی زبانی آجکل
> کے انسان پہ جو چوٹ کی ہے اس سے متاثر ہو کر یہ نظم
> شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔ (ایڈیٹر)

دو گدھ ساتھ ساتھ اُڑے جا رہے تھے
بھائی چارے کا مطلب اک دوجے کو سمجھا رہے تھے
ایک دوسرے کے کام آنا ہے ضروری
تاکہ ہوں ایک دوسرے کی ضرورتیں پوری
جب اُنہوں نے دوڑائی نظر آس پاس
دکھائی پڑی اک سڑی گلی لاوارث لاش
چھوٹے کے مُنہ میں پانی بھر آیا
اور بے صبر ہو کر وہ اُس کے قریب آیا
اور یکایک وہ ماس کھانے لگا
اپنی قسمت پہ اِترانے لگا
بڑا بولا صبر سے کام لو بھائی
اپنے سبھی رشتہ داروں کو بلائیں گے
تب پیار سے مِل جُل کر اس لاش کو کھائیں گے
چھوٹا بولا
ایسا نہیں کرنا
جب سب مِل کے اس کو کھائیں گے
تو ہمیں کیا ملے گا
ہم بھوکے رہ جائیں گے
اس لئے اکیلے ہی اس کو کھا کر موج اُڑائیں گے
بڑا بولا کیسی باتیں کرتا ہے تو
گھٹیا اور بے کار
چھوٹے کا سر شرم سے جھُک گیا
اور بولا معاف کرنا بھائی
کچھ عادت ہی بگڑ گئی ہے
کیوں کہ چند دن پہلے
انسانوں کی بستی میں رہ کر آیا ہوں

غزل

ایس۔ کے۔ کوکب

سب [illegible] اُنہی خشکیوں کے ہیں
یہ سخت مرحلے جو مرے امتحاں کے ہیں

اخفائے رازِ ربط کی کوشش فضول ہے
میں جانتا ہوں تیرے ارادے جہاں کے ہیں

نظرِ زمانہ جبیں پہ مسلط نہ ہو سکا
ہم خانماں خراب اُسی خانماں کے ہیں

اک اک سے فراز صفِ حُسن میں مگر
نقش و نگار اور ہی اُس نوجواں کے ہیں

وائے نصیب یوں بھی کیا اُس نے دل شکن
"تیری دُعا میں رنگ ہی آہ و فغاں کے ہیں"

آغاز پہ نگاہ نہ انجام پہ نظر.....
کچھ روز سے طواف جو کوئے بتاں کے ہیں

اُف، اہلِ حُسن بھی نہ بچے دردِ عشق سے
وہ بھی مریضِ قلب تا شعف گماں کے ہیں

مرغوب رُو کو دیکھ کے ہونا فریفتہ
اے چشمِ معتبر یہ طریقے کہاں کے ہیں

کوکب نظر نہ آئے تو میری نظر سے دیکھ
دامانِ اضطراب میں منظر اماں کے ہیں

غزل

مقبول آزاد نوری

گر اصل حُسنِ ذات نمایاں نظر آئے
آئینہ خانہ دیکھ کے حیراں نظر آئے

در پردہ اُن کے دل میں تھا جو درد جانکاہ
گو چند لوگ داعیِ ایماں نظر آئے

احساں کو نمود و نمائش سے واسطہ؟
احساں ہی نہیں ہے جو احساں نظر آئے

کثرت کے امتزاج سے وحدت کے یہ نمو
اجزا ملے تو حضرتِ انساں نظر آئے

مقبولؔ جس کو امر و نہی پر یقیں نہیں
مومن نہیں ہے لاکھ مسلماں نظر آئے

غزل

محسن ہاشمی
بلاروی

اک [illegible] آئینوں کے شہر میں
ہے کسی [illegible] آئینوں کے شہر میں
کس کے آنے کی خبر ہے آئینوں کے شہر میں
سہما سہما ہر بشر ہے آئینوں کے شہر میں
حسن کی جلوہ طرازی میں کمی کوئی نہیں
[illegible] ہر نظر ہے آئینوں کے شہر میں
حیف! وہ انسان پتھر پھینکتا ہے اس طرف
جس کا خود اپنا بھی گھر ہے آئینوں کے شہر میں
ہم نے مانا آئینے پانی بھی رکھتے ہیں مگر
مضمحل کیوں ہر شجر ہے آئینوں کے شہر میں
فکر و فن علم و تمدن عدل معیارِ ادب
میری ہر شے پہ نظر ہے آئینوں کے شہر میں
کیا غضب ڈھاتا ہے محسن آؤ دیکھیں تو سہی
آج شورِ الحذر ہے آئینوں کے شہر میں

غزل

ذکی طارق

میکدہ بھی ہے غم کا گھر بابا
اس لئے لگ رہا ہے ڈر بابا
میرے خوابوں کا جو محل تھا کبھی
ہو گیا وہ تو اب کھنڈر بابا
ایک صیاد کی طرح غم نے
نوچ ڈالے ہیں بال و پر بابا
لوگ کہتے ہیں زندگی جس کو
کتنی مشکل ہے وہ ڈگر بابا
پوچھتے پھر رہے ہیں دیوانے
ہے کدھر میکدہ کدھر بابا
کوئی رہبر نہ ہم سفر کوئی
کیسے کٹ پائے گا یہ سفر بابا
توڑنا دل کا اور پچھتانا
[illegible] یہ ہنر بابا

غزل

عبدالحکیم شاہد
رتلامی

تنہائی میں اکثر تری تصویر سے کھیلے
ماضی کے حسیں خواب کی تعبیر سے کھیلے
اک شب جو تری زلفِ گرہ گیر سے کھیلے
وہ عمر کے ہر موڑ پہ زنجیر سے کھیلے
ہم درد کے صحرا میں تری یاد کو لے کر
برسوں تری منہ بولتی تحریر سے کھیلے
جو اپنے مقدر کا گلہ کرتا ہے لوگو
اُس پر یہ ضروری ہے کہ تدبیر سے کھیلے
ہر زخم ہمارے لئے ناسور بنا لیکن
ہم اہلِ وفا وقت کی شمشیر سے کھیلے
ہوں جن کے مقدر میں گھنی رات کے سائے
وہ کیسے ترے حسن کی تنویر سے کھیلے
شب بھر ترے پیکر سے یوں کھیلا کیا شاہد
جس طرح کوئی رانجھا ہیر سے کھیلے

غزل

ڈاکٹر گوپال کرشن شفق
پٹیالہ

ترے بغیر دل کی یہ حالت ہے اِن دنوں
اک ایک لمحہ روزِ قیامت ہے اِن دنوں
مکر و ریا کی باتیں ہیں اک اک زبان پر
اک ایک دل سے دور صداقت ہے اِن دنوں
حد سے بھی کچھ بڑھی ہیں زمانے کی الجھنیں
پہلی سی اب کہاں وہ فراغت ہے اِن دنوں
جکڑے ہوئے ہیں خواہشوں کے جال میں سبھی
دنیا میں کون ہے جسے راحت ہے اِن دنوں
اب کاروانِ زیست کا دنیا میں کون ہے
رہبر کی رہزنوں سے رفاقت ہے اِن دنوں
اگلے سے اب کہاں رہے ہمدرد و غمگسار
مطلب کی ہے جسے بھی محبت ہے اِن دنوں
یہ دورِ کشمکش ہے شفق چین ہے کسے
کٹ جائے جو بھی لمحہ غنیمت ہے اِن دنوں

بابِ انتقاد

شبیر حسن خاں

نام کتاب .... ہندی کے مسلمان شعراء
نام مصنف .... ابوالبلاغت رتن پنڈوروی
ناشر .... ماہنامہ شانِ ہند۔ فلیٹ ۸
.... انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
صفحات ۴۹۲
قیمت .... اکیاون روپیہ

ہندوستان کا بیشتر قدیم مذہبی اور اخلاقی لٹریچر اُن رشیوں اور مُنیوں کا رہینِ منت ہے جنہوں نے علائقِ دنیا سے دُور رہ کر جنگلوں اور گپھاؤں میں ساری زندگی گزار دی اور یہ ادب ہمارے لئے آج تک مشعلِ راہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اسی روایت کو بیسویں صدی میں جناب رتن پنڈوروی نے تازہ کیا ہے، رتن صاحب گورداسپور کے ایک دُور افتادہ مقام پنڈوری میں برسہا برس سے ایک مندر کے صحن میں قیام پذیر ہیں اور پنڈوری وہ جگہ ہے جہاں رتن صاحب کے بتائے ہوئے تفصیلی سہاروں کے بغیر باہر کے آدمی کی رسائی مشکل ہے اور اسی مقام پر فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے ہوئے رتن صاحب اپنی خرابیٔ صحت کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں، رتن صاحب نے بچپن ہی سے نہایت عسرت کی زندگی گزاری اور تعلیم کی لگن میں ان کو بڑی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ ایسے پس منظر میں ان کے قلم سے اُردو کے متعدد مجموعہ جات کلام اور اُردو زبان کے بارے میں کئی کتابیں نکل کر پنجاب میں اور پنجاب کے باہر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں لیکن ان کی زیرِ نظر تصنیف "ہندی کے مسلمان شعراء" اس اعتبار سے حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ اس کی تیاری کے لئے بے شمار سہاروں اور حوالوں کی ضرورت تھی اور جیسا کہ کتاب کے مُطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے ان کو دو سو سے زائد ہندی، سنسکرت، اُردو، فارسی اور انگریزی کتابوں اور متعدد اُردو و ہندی جرائد کا مُطالعہ کرنا پڑا، اور بہت سے اہلِ علم حضرات سے مُراسلت کر کے مواد فراہم کیا گیا۔ اس طور پر ایک ایسے مقام پر بیٹھ کر جہاں کوئی معقول کتب خانہ تو دُور کی بات ہے اُردو بولنے اور سمجھنے والے بھی خال خال نظر آتے ہوں، اُن کی یہ تصنیف ایک معجزہ سے کم نہیں، کتاب کے مُطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تیاری میں اُن کو کم و بیش بیس سال صرف کرنا پڑے۔ اور پھر تنگ دستی کے باعث اپنی سالہا سال کی عرق ریزی سے تکمیل دی جانے والی کتاب کی طباعت سے جب وہ مایوس ہو گئے تو غیبی طور پر اُن کو ایسے سہارے مل گئے کہ کتاب نہ صرف عمدہ طور پر چھپی ہے بلکہ متعدد تصاویر اور خوب صورت سرِ ورق سے مزین ہے۔

یہ مجلد کتاب تقریباً ۵۰۰ صفحات کی ضخامت لئے ہوئے ہے ابتدائی چار ابواب بالترتیب ہندی کی مختصر تاریخ، ہندی زبان کی خصوصیات، ہندی اور اُردو اور ہندی اور مسلمان پر مشتمل ہیں جن میں آخر الذکر دو عنوانات کے تحت فراہم کردہ معلومات اُردو داں طبقہ کے لئے بطورِ خاص نہایت محققانہ اور بصیرت افروز ہے

اس کے بعد ہندی شاعری کے مختلف ادوار یعنی قدیم ہندی کا دَور، رَزمیہ شاعری کا دَور، بھگتی دَور، فنی دَور، اور دَورِ حاضر، ان سارے اَدوار کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد ہر دَور کے مسلمان شعرا کے حالات اور اُن کا نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے، اس طور پر ایک ہزار سال کی تاریخ کا احاطہ کرتے ہوئے ہندی کے ۳۸۲ مسلمان شعراء سے ہم کو رُوشناس کرایا گیا ہے۔ ان میں متعدد ایسے شعرا کا ذکر اور اُن کا ہندی کلام ہے اُن کی اُردو تخلیقات کی بنا پر ہی متعارف تھے۔

ہندی اور سنسکرت زبان کی مسلمان سلاطین نے جس طور پر سرپرستی کی اور ہندو شعرا و ادبا کو جس طرح انہوں نے نوازا، اس پر روشنی ڈال کر رتن صاحب نے واضح کر دیا کہ مسلمانوں نے اپنے دَورِ حکومت میں ہندی اور سنسکرت کو زبانِ غیر نہیں سمجھا بلکہ ہندو شعرا کے دوش بدوش مسلمان سلاطین، امرا، اور صوفیائے کرام، ہندی زبان کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بناتے رہے، انہوں نے سنسکرت کے قدیم بیش بہا ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اُس کے فارسی میں تراجم کر کے عام مسلمانوں کی دسترس میں لے آئے۔ رتن صاحب نے اپنی اس تصنیف میں یہ ثابت کر دکھایا کہ مسلمان سلاطین پر تنگ نظری اور عدم رواداری کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ حقیقت سے کتنا دُور ہے۔ انہوں نے پورے طور پر اس حقیقت کو عیاں کر دیا ہندی زبان مسلمانوں کو کتنی عزیز رہی ہے اور آج کے دَور میں بھی جب ہندی اردو تنازعہ اکثر اپنا بدنما رُوپ ظاہر کرتا رہتا ہے ہندی میں لکھنے والے مسلمان شعرا نہ صرف بھارت میں بلکہ پاکستان میں بھی کتنی معقول تعداد میں موجود ہیں۔

یہ کتاب ایسے دور میں جب قومی یک جہتی کی بے شمار مساعی کی جا رہی ہیں ایک بیش قیمت اور قابلِ قدر و تحسین کوشش ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی بھرپور طریقہ پر اشاعت کی جائے اور حتی۔

کالیداس گپتا رضا کی

تاحال مطبوعہ تصانیف

شعلۂ خاموش
مجموعۂ کلام قیمت ۵۰ روپے

شورشِ پنہاں
مجموعۂ کلام قیمت ۲۰ روپے

شاخِ گل
مجموعۂ کلام قیمت ۱۵ روپے

اُجالے
نعت اور سلام
قیمت ۱۰ روپے

شعورِ غم
سلام وغیرہ
قیمت ۳ روپے

شعاعِ جاوید
مجموعۂ رباعیات
قیمت ۲۰ روپے

دی سائیلینٹ فلیم
THE SILENT FLAM
ENGLISH
RS. 10/-

ہندوستان مشرقی افریقہ میں
(تاریخ)
قیمت ۱۰ روپے ۵۰ پیسے

مکتوباتِ جوش ملسیانی
بنام رضا (خطوط)
قیمت ۱۹ روپے ۵۰ پیسے

منشوراتِ جوش ملسیانی
قیمت ۲۰ روپے

متعلقاتِ غالب
قیمت ۲۰ روپے

دُعائے صباح
غالب کی ایک مثنوی
قیمت ۱۵ روپے

غالبیات چند عنوانات
قیمت ۵۰ روپے

انتخاب آتش و غالب
چکبست قیمت ۳۰ روپے

چکبست اور باقیاتِ چکبست
قیمت ۴۰ روپے

کلیاتِ چکبست (نظم)
قیمت ۶۰ روپے

سہو و سراغ
مجموعۂ مضامین
قیمت ۳۵ روپے

مقالاتِ چکبست
قیمت ۷۵ روپے

غیر مطبوعہ تصانیف کا اعلان
طبع ہونے پر کیا جائے گا

رضا پبلیکیشنز ۳۰۵ چرچ گیٹ چیمبرز نیو میرین لائنز
چرچ گیٹ بمبئی ۴۰۰۰۲۰

سہرا در صنعت توشیح

بتقریب سعید شادی خانہ آبادی جناب ڈاکٹر احساس کمار صاحب خلف الرشید عالی جناب ڈاکٹر اودے سرن صاحب ارمان بلاروی

ش | شبابِ حسن ہے یا ہے شری احساس کا سہرا
ی | یہ ہے ارمان کا ارمان اوشا کی تمنا ہے
ا | اِدھر چہرے کی رعنائی اُدھر سہرے کی زیبائی
ا | اُٹھا کر ہاتھ دیتی ہیں دعائیں رم شری اوشا
س | سُبھاشِ نام ور پرماسِ عاقل دل میں شاداں ہیں
س | ستارے چن کے سارے چرخ نے سہرے میں جڑ ڈالے
م | منیشا اور ممتا نے پرویا جوشِ فرحت میں
ر | رخِ زیبا پہ سہرا دیکھ کر بدھ سین کہتے ہیں
و | وفورِ شادمانی سے جنک وشواس خنداں ہیں
ہ | ہنسے پڑتے ہیں رام اوتار وما ہیش دکھلا رہی جی
ا | ادب پرور ادب گستر ہے ہر اک موج سہرے کی
ب | بہارِ خرمی اب کیوں نہ چھا جائے فضاؤں میں
ر | رخِ نوشہ کی رنگینی پہ یہ سہرے کی گل چینی

ر | رخِ روشن پہ نورِ شوق بن کر چھا گیا سہرا
م | مسرت کی مسرت ہے مسرت آشنا سہرا
ن | نچھاور ہو رہے ہیں دیکھ کر سب دلربا سہرا
ح | حسینِ بے بدل یارب رہے فرزند کا سہ
ا | اری نازشِ ادب پرور نے دیکھا بھائی کا سہ
ک | کمالِ جوشِ الفت سے بنا حسنِ وفا سہ
ا | اثر انداز ہے بہنوں کے سچے پیار کا سہ
ک | کہ کتنا خوشنما ہے بھائی کے فرزند کا
س | سراپا شوق بن کر دیکھتے ہیں شوق زا
ر | رتن جی دیکھتے ہیں بھانجے کا دل رُبا
م | مقابل میں شری کوشک کے آ کر جھک گیا
ا | ازل سے ہے سمن کی زندگی کا مدعا
ک | کمالِ شوق سے ہمشں و قمر کا بھی بنا

ہ | ہجومِ شادمانی کی حیات افروزیاں دیکھو
و | وفورِ شوق سے مسرور سرور نے کہا سہرا

پیشکش: ۔ وِدیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۲ ۔۔۔ ۱۱	بتاریخ ۹ ر دسمبر

نوٹ: ہر مصرع کے حرفِ اوّل کو ملانے سے یہ عبارت حاصل ہوتی ہے ”شری مان احساس کمار کو سہرا“

اُردو
ہمارا قومی سرمایہ ہے

کیا آپ اپنے اس قومی سرمائے کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ واقعی چاہتے ہیں کہ کوثر و تسنیم سے دھلی اور گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار یہ زبان زندہ رہے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی لٹریچر ہندوستان میں جس قدر اردو زبان میں شائع ہوا کسی دوسری زبان میں شائع نہیں ہوا۔

آپ

اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں؟ تو کیا آپ نے اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے بچوں کو اُردو پڑھائی؟ اگر نہیں تو اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیے اور کم سے کم ایک غیر اُردو داں کو تو اُردو ضرور پڑھائیے۔

کیا

آپ کی ذاتی لائبریری میں اُردو کی کتابیں ہیں؟ کیا آپ کے شہر، قصبہ یا گاؤں کی پنچایت لائبریری میں اُردو کی کتابیں ہیں؟ کیا آپ کے کالج لائبریری میں اُردو کی کتابیں ہیں؟ اگر نہیں تو ایسے ذرائع اختیار کیجئے کہ آپ خود اپنی ذاتی لائبریری کے لئے اردو کتابیں خریدیئے۔ اپنے ہاں کی نزدیکی لائبریریز کے منتظمین پر زور دیجئے کہ وہ اُردو کی کتابیں بھی رکھیں۔ اپنے کالج کی لائبریری کے لئے اُردو کتب کی خریداری کے لئے متعلقہ حضرات سے مطالبہ کیجئے۔

اُردو کی بہترین کتابیں

انتخاب کرنے کے لئے یہ فہرستِ کتب پیشِ خدمت ہے۔ اسے بغور پڑھئے یقیناً آپ کے ذوق کی کتابیں اس میں موجود ہیں۔ ہر لائبریری کو لائبریری کمیشن دیا جاتا ہے۔ ذاتی طور پر بھی اگر نیچے پسند کی کتابیں خریدیں گے تو ہر ممکن رعایت دی جائے گی۔ اپنی فرمائش اس پتہ پر بھجوائیے۔

دفتر ماہنامہ "شانِ ہند"

فلیٹ ۷، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ترجمان القرآن مکمل چار حصے	ابوالکلام آزاد	-/۱۲۰
خطبات	"	-/۳۰
تذکرہ	"	-/۲۵
آدم خور	نانک سنگھ	-/۱۵
عورت	سیارام سرن گپتا	-/۴
گنجی کی کہانی	ہدراساکی	۶/۵۰
ماہی گیر	تھاکاذی سیوانشنکر	-/۹
نرائن راؤ	ادیوی باپی راجو	-/۳۰
ولہیم مائسٹر اوّل	گوئٹے	-/۶
" دوم	"	-/۶
" کتاب دوم	"	-/۸
گیلی لیو	بریخت	-/۵
ہیملٹ	شیکسپیئر	-/۱۰
کنگ لیر	"	-/۵
اوتھیلو	"	-/۵
میڈیا		-/۵
سمندری لٹیرے	الیس	۲/۵۰
تین ناٹک	رابندر ناتھ ٹیگور	-/۷
گرل	ترودلور	-/۴
تمن زار	ضیا احمد بدایونی	-/۱۲
پریم چند	پرکاش چند گپتا	۲/۵۰
تاریخ بنگلہ ادب	سکومار سین	-/۲۵
بھگوان بدھ	دھرما نند کوسمبی	-/۷
کمال اور زوال	ستھوسی ڈانڈس	-/۲۰
ریاست	ارسطو	۱۲/۵۰
گورا	ٹیگور	-/۴۰
سنجوگ	"	-/۱۱
انمیسں کہانیاں	"	-/۳۰
دو سیر دھان	سیوانشنکر پلے	-/۱۲
ودلیکا نند	رومن رولاں	۴/۵۰
دالڈن	ستھورو	۶/۵۰

نئی فصل	سید الابرار	۸/۴۵
اجنبی تیں	مودمن ڈاب	۱۰/۵۰
ریل گاڑی	سید آل رسول	۷/۴۵
تصویر بتاں	حسرت سہروردی	۱۲/۷۵
بنگر واڑی	عرش ملسیانی	۵/۲۵
تاش کے محل	زینت ساجدہ	۵/۵۰
یہ ہماری زندگی اور آدھے چاند کی رات	عرش ملسیانی	۱۴/۲۵
راگ درباری	راشد سہسوانی	۱۵/۵۰
نقشہ پنجاب	رام آسرا راز	۸/۵۰
خلا کا سفر	ایس ایم شاہنواز	۹/۷۵
ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ		
مشینی گھوڑا		
عمر قید	سید آل رسول	۱۴/۵۰
ہیروں کی آواز	راج نرائن راز	۱۹/۵۰
بنتی بنتی تصویریں	رضیہ سجاد ظہیر	-/۵
آئینہ	کنہیا لال گاندھی	۱/۵۰
سورت تیرا اپنا پانی	مظہر الحق علوی	-/۱۳
بادل چھٹ گئے	رضوان احمد	۰/۵۰
دود چراغ محفل	سید آل رسول	۱/۲۵
دیمک	رفعت سروش	۷۵/
زمین کی کہانی	راشد سہسوانی	۵۰/
پنجابی افسانے	مخمور جالندھری	-/
گنگا چیل بنکہ	رضیہ سجاد ظہیر	۵
خسرو شناسی	ظ انصاری	-/
سزا	پریم گوپال متل	
برہمن لڑکی	اگر سین نارنگ	
روح انیس	سید مسعود حسن رضوی	
خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ	کاظم علی خان	
اندر سبھا	سید مسعود حسن رضوی	
مثنوی حزن اختر آپ بیتی	واجد علی شاہ	

سلطانِ عالم	واجد علی شاہ	۳۰/-
تاجدار اودھ	امجد علی خاں	۵/-
لکھنؤ کے چند نامور شعراء	سلیمان حسین	۱۲/-
اردو زبان اور اس کا رسم الخط	سید مسعود حسن رضوی	۴/-
تذکرہ نادر	"	۶/-
نگارشاتِ ادیب	"	۱۲/-
عروض آہنگ اور بیان	شمس الرحمٰن فاروقی	۲۴/-
تعبیرِ غالب	نیر مسعود	۱۰/-
خورشید	مسیح الزماں	۷/۵۰
رانی کیتکی کی کہانی	سلیمان حسین	۷/۵۰
شہید انسانیت		۳۰/-
فکری ادب	منیر علی زیدی	۱۰/۵۰
آگ الاؤ صحرا	قمر احسن	۲۵/-
عرضِ ہنر	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
فلسفہ اور ادبی تنقید	ڈاکٹر وحید اختر	۲۵/-
بنگال میں اردو زبان و ادب	شانتی رنجن	۱۲/-
سب رس کا تنقیدی جائزہ	احسان الحق	۳/۵۰
بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۱۵/-
ہوا البم	اقبال متین	۱۵/-
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۱۲/-
دو غنڈے	مظفر حنفی	۱۵/-
فٹ توٹ	یوسف ناظم	۷/۵۰
آدھا راستہ	کرشن چندر	۱۵/-
آئینے اکیلے ہیں	"	۱۵/-
دارا شکوہ	قاضی عبدالستار	۱۵/-
غبارِ شب	"	۱۵/-
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۱۲/-
تنکے کا سہارا	شکیلہ اختر	۱۵/-
...اغ تہہ داماں	اقبال متین	۱۰/-
...لونے	مسعود تقی	۵/-
...انِ حوادث	پروین سرور	۵/-

بیگانے	زبیر حامد	۱۰/-
جانان جاناں	احمد فراز	۱۵/-
تنہا تنہا	"	۱۵/-
امیج	بشیر بدر	۱۵/-
خوشبو	پروین شاکر	۱۵/-
دیوان	ناصر کاظمی	۱۵/-
تذکرہ شعرائے اتر پردیش حصہ اول		۳۰/-
"	حصہ دوم	۴۰/-
"	سوم	۴۰/-
"	چہارم	۴۰/-
عطرِ آگہی	شجاعت علی سندیلوی	۲۰/-
عربی زبان و ادب عہدِ مغلیہ میں		۳۰/-
باتوں کے بادشاہ	مجیب سہالوی	۸/-
کلیاتِ شہزادہ سلیمان شکوہ		۳۰/-
جوش کی انقلابی نظمیں	ڈاکٹر قیصر ملیح آبادی	۲۰/-
بیسویں صدی میں اردو غزل		۱۰/-
رتن ناتھ سرشار		۶/-
رہنمائے بیت بازی	کاظم علی خاں	۱۵/-
اردو میں خود نوشت	ڈاکٹر صبیحہ انور	۶۰/-
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۹/-
مقدمہ شعر و شاعری	حالی	۵/-
انیسیات	سید مسعود حسن رضوی	۷/-
وجودیت پر ایک تنقیدی نظر	سلطان علی شیدا	۱/۲۰
دلی کا دبستان شاعری	نور الحسن ہاشمی	۱۵/۸۵
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۱۶/۷۵
تزیر الشمس		۳/-
غار سے جھونپڑی تک	غلام حیدر	۹/۵۰
مراثی مرزا دبیر	اکبر حیدری	۱۸/۵۰
فغانِ آرزو	آرزو لکھنوی	۷/-
نشانِ آرزو	"	۶/۴۰
روحِ نظیر	مخمور اکبرآبادی	۲۰/۷۵

زرد پتوں کی بہار	رام لعل	۱۳/-
سخنِ جوہر	انتخاب محمد علی جوہر	۴/۵۰
جدید اردو تنقید اصول و نظریات	شارب ردولوی	۲۸/-
ادب کے نوبل انعام یافتگان		۷/۶۵
سخن دانِ فارس	محمد حسین آزاد	۱۲/۵۰
گنجینۂ تحقیق	بیخود موہانی	۱۰/۵۰
جہانِ آرزو	آرزو لکھنوی	۶/۸۰
سُریلی بانسری	″	۵/۱۵
نظامِ اردو	″	۳/۱۵
رباعیاتِ انیس	انیس	۴/۱۰
بکٹ کہانی		۲/۶۰
سیاسی نظریے	نور الحسن ہاشمی	۲/۲۰
مضامینِ سجاد ظہیر	سجاد ظہیر	۴/۲۰
نیا ساز نیا انداز	نازش پرتاپ گڑھی	۱۸/۳۵
کلیاتِ نعت	محسن کاکوروی	۱۲/-
متفرقاتِ آرزو	آرزو لکھنوی	۳/۶۰
انتخابِ صبا	صبا لکھنوی	۴/۴۰
اربابِ سخن	حسرت موہانی	۳/-
ہندوستانی تہذیب		۴/۳۵
اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل		۶/-
روسی کہانیاں		۴/۴۰
مقالاتِ چکبست	کالیداس گپتا رضا	۵/-
کلیاتِ چکبست	″	۶۰/-
چکبست اور باقیاتِ چکبست	″	۴۰/-
انتخاب آتش و غالب	چکبست	۳۰/-
شعلۂ خاموش	کالیداس گپتا رضا	۵۰/-
شورشِ پنہاں	″	۲۰/-
شاخِ گل	″	۱۵/-
اجالے (نعت اور سلام)	″	۱۰/-
شعورِ غم (سلام)	″	۳/-
شعاعِ جاوید	″	۲۰/-

ہندوستان مشرقی افریقہ میں	کالیداس گپتا رضا	۱۰/۵۰
مکتوباتِ جوش ملسیانی	″	۱۹/۵۰
منشوراتِ جوش ملسیانی	″	۲۰/-
متعلقاتِ غالب	″	۲۰/-
دعائے صباح	″	۱۵/-
سہو و سراغ	″	۳۵/-
غالبیات چند عنوانات	″	۵۰/-
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۱۵/-
تنقیدی نظریات اول	احتشام حسین	۱۵/-
″ دوم	″	۱۵/-
اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	احسن فاروقی	۸/-
اردو زبان اور فنِ داستان گوئی	کلیم الدین احمد	۹/-
حسرت موہانی	عبد الشکور	۹/-
ادب کا تنقیدی سرمایہ	″	۹/-
ادبی تنقید	احسن فاروقی	۹/-
ادبی خطوط	حسن عسکری	۹/-
تنقیدی جائزے	احتشام حسین	۹/-
دہلی کا یادگار مشاعرہ	فرحت اللہ بیگ	[illegible]/۵۰
ذوقِ ادب اور شعور	احتشام حسین	۸/-
روایت اور بغاوت	″	۱/-
عکس اور آئینے	″	۱/-
غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۹/-
مضامینِ وقت اول	فرحت اللہ بیگ	/-
″ دوم	″	/-
نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	/-
اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری	/-
تاریخ ادب اردو جلد اول	جمیل	/-
ارسطو سے ایلیٹ تک	″	-
ایلیٹ کے مضامین	″	-
اردو افسانہ روایت و مسائل	گوپی چند نارنگ	
انیس شناسی	″	

متاع سخن	ڈاکٹر عبدالحق	۳۰/-
سفرنامۂ پنجاب	سرسید احمد خاں	۴۰/-
اقبال سب کے لئے	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۶۰/-
اصول تحقیق و ترتیب متن	ڈاکٹر تنویر علی	۵۰/-
تاریخ آصفی	مرزا ابوطالب اصفہانی	۳۰/-
پارسی (اولین تاریخی ڈرامہ)	آصف علی مرحوم	۲۵/-
اقبال کا شعور و فن	قمر رئیس	۲۵/-
مقالات	مجموعۂ خطبات	۲۵/-
ارمغان آصف	آصف علی مرحوم	۳۰/-
حضرت نظام الدین اولیا حیات اور تعلیمات		۲۰/-
دکنی کلچر	ہارون خاں شیروانی	۷/۵۰
اوراق مصور (عہد وسطیٰ کی دلی)	خلیق نظامی	۱۵/-
فلسفہ شاعری اور اقبال	پروفیسر ظفر احمد	۱۲/۵۰
دیوان شاکر ناجی	ڈاکٹر فضل الحق	۲۰/-
اردو میں رپورتاژ نگاری	عبدالعزیز	۳۵/-
محمد تقی میر	ڈاکٹر جمیل	۳۰/-
انیس کے مرثیے اول	صالحہ عابد حسین	۲۰/-
" دوم	"	۳۸/-
ہندوستان میں عورت کی حیثیت	صغرا مہدی	۹/-
تشریح الہیکل اول		۱۱/-
وضاحتی کتابیات	گوپی چند نارنگ	۱۷/-
کتاب کی تاریخ	شایاں قدوائی	۱۲/۵۰
کلیات ذوق	تنویر علوی	۲۰/۵۰
تعلیم سماج اور کلچر	اختر انصاری	۱۰/-
شاہ کا ترکی روزنامچہ	نعیم الدین	۴/۵۰
مغلیہ سلطنت عروج و زوال		۲۳/۵۰
…لی ہند کی تاریخ	آر کے بھٹناگر	۲۲/-
…ی سندھ اور تہذیبیں	زبیر رضوی	۸/-
…مسلم عہد میں	سعید انصاری	۱۳/۲۵
…م ہندی فلسفہ	رائے شیو موہن لال	۱۵/۵۰
…ر	غازی حمید اللہ خاں	۴/۵۰

دفتری انتظامیہ	محمد سعید	۱۲/-
مدرسۂ عمل	شیخ غلام حسنین	۹/۵۰
سائنس کی تدریس	غلام دستگیر	۱۶/-
تاریخ فلسفۂ اسلام	سید عابد حسین	۵/۵۰
لسانی مطالعے	گیان چند جین	۸/۵۰
ہمارا قدیم سماج	سید سخی حسن	۶/۵۰
وضع اصطلاحات	وحید الدین	۱۲/۸۰
تیمارداری	حسین فاروقی	۱۲/۲۰
اصول تعلیم	غلام السیدین	۲۲/-
ہمایوں نامہ	عثمان حیدر مرزا	۶/۲۵
فن طباعت	بلجیت سنگھ	۷/۲۵
مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن خاں صابری	۶/-
فطری علاج	حسن الدین احمد	۶/-
یونانی ادویہ	حکیم سید ظل الدین احمد	۱۰/-
درس بلاغت	ترقی بیورو	۷/-
قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	جعفر حسین	۲۷/-
ہندوستانی مصوری ایک خاکہ	انیس فاروقی	۱۰/-
نئی اردو قواعد	عصمت جاوید	۱۷/-
قومی تہذیب کا مسئلہ	سید عابد حسین	۹/۶۰
ریاست اور متبادل …	عبدالرشید انصاری	۱۵/-
کیمیا کی کہانی	سید شہاب الدین	۷/۵۰
امریکی ادب کا جائزہ	سلامت اللہ خاں	۹/۵۰
برنارڈ شا	عبدالمغنی	۴/-
پوشکن	ظ انصاری	۱۲/-
پھول بن (مثنوی)	ابن نشاطی	۸/-
دیوان حسرت عظیم آبادی	اسما سعیدی	۱۸/-
شعریات	شمس الرحمٰن فاروقی	۵/۷۵
عربی ادب کی …	عبدالحلیم ندوی	۲۰/-
طباعت و اشاعت …	انور کمال الحسینی	۷/-
غزل اور غزل …	اختر انصاری	۲۵
مجموعۂ نغمہ	محمود شیرانی	-/-

بہشت نظر	رتن پنڈوروی	۱۸/-
پیامِ نظر	″	۱۵/-
آئینے	اودے سرن اماں	۱۰/-
یادوں کے سائے	ممتاز میرزا	۲۰/-
بوئے سمن	مسعودہ حیات	۲۰/-
کلید عروض	زار علامی	۲۰/-
لخت جگر	جگر جالندھری	۱۰/۲۵
آئینۂ سکندر	قمر مراد آبادی	۱۰/-
نوائے ازل	ازل دہلوی	۱۰/-
متوازی سائے	آزاد بہاول پوری	۸/-
تریا چلتر	شفیق صدیقی	۸/-
اردو کا پہلا ڈرامہ	اخلاق اثر	۸/-
آئینۂ عروض و قافیہ	طالب ہاتھرسی	۶/-
انتخاب تیر و نشتر	خوشتر گرامی	۱۸/-
پیاز کے چھلکے	فکر تونسوی	۱۵/-
بدنام کتاب	″	۱۲/-
آخری کتاب	″	۱۴/-
آدھا آدمی	″	۱۷/-
باقیات اقبال	سید عبدالواحد	۵/-
سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۰/-
کاش	کاشف اندوری	۱۰ -
جیسے دریا	واجدہ تبسم	۲۵/-
پھول کھلنے دو	″	۳۰/-
تبصرے	کریمی الاحسانی	۲۰/-
ادبی تاثرات	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۰/۷۵
پتھر کا گلاب	شمع کرن بانو	۵/۲۵
اقبال اور سید سلیمان ندوی	طاہر	۲۰/-
اشاریہ کلام فیض	ڈاکٹر عقیل	۱۲/-
فیض ایک جائزہ	اشفاق حسین	۱۶/-
بابائے اردو: احوال و افکار	معین الرحمٰن	۳۰/-
غنیۃ الطالبین (عکسی) (اردو)	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی	۴۵/-

اردو شاعری میں قومی یک جہتی کی روایت	ڈاکٹر رام آسرا راز	۲۵/-
اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ	″	۱۴/-
یادوں کی برات کا خصوصی مطالعہ	صابر کمال	۱۲/-
اردو میں سکھوں کا حصہ	امام مرتضیٰ نقوی	۳۰/-
بوڑھا درخت	ضیا فتح آبادی	۱۵/-
میرے لہو کی آگ	نشتر خانقاہی	۱۰/-
شام میکدہ	یکتا اوری	۸/-
آئینہ	حیرت بدایونی	۱۵/-
بادہ و جام	شارق میرٹھی	۲/۵۰
چاند کا زخم	شمس فرخ آبادی	۲/-
قلم کا سفر	دانش علی گڑھی	۵/-
روشنی کی کرنیں	روی بہار دواج	۶/-
نوائے شوق	ناز مانکپوری	۱۵/-
ارمغان	نوبہار صابر	۴/۵۰
غالب کی باتیں	شمس بگرامی	۱/۵۰
گل افشانیاں	خوشتر کھنڈی	۱/-
ادھورے خاکے	شرف کمالی	۳/-
ستارے اور سیارے	جلیل عرشی	۳/-
رعنائیاں	برج لال رعنا	۲/۵۰
تیر و نشتر	ساحر سنالی	۱/-
خواب و بیداری	صغرا مہرواری	۳/-
مشاہدات	بابا کھنہ	۷/-
نذرانہ	شمس	۲/۵۰
حیرت کدہ	اودے سنگھ شائق	۵/-
ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	۳۵/-
کس نام سے پکاروں	ہمدم	۲۰/-
پاس وفا ناول	ضیا لکھنوی	۳/-

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸
انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارا مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسلیکس" ایک بار صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو، جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں، اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔

قیمت: سات روپے ۲۵ پیسے —— شرع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

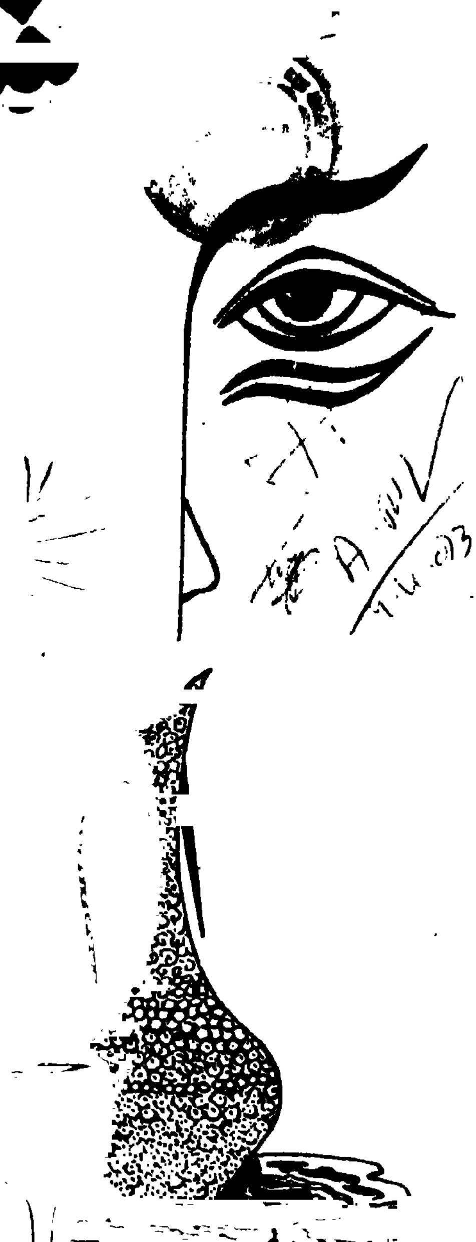
Phone : 275602

Regd. No·D-(DN)370

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/





سرور تونسوی



سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے
ی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دَوا
جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے
دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جِلد جل بھی جایا
تی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے
ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور
آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

ت: چھ روپے

شرع لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶-۱۱۰۰

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرۂ وطن سے ہے نیازؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
نیازؔ گوالیاری

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

شانِ ہند
نئی دہلی

زرسالانہ -/۲۴ روپے
فی پرچہ اڑھائی روپے

جلد نمبر ۴۴ | فروری ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۲

اِدھر آ سِتمگر

فیض احمد فیضؔ کی تازہ نظم

وہ یہ کہتے ہیں اب کوئی چارا نہیں
کلمۂ حق کسی کو گوارا نہیں ...
رہِ مہوشاں میں گزر بند ہے
چشمِ عشاق کب سے نظر بند ہے
غنچۂ سرخیِ لب چٹکنے نہ دو
شعلۂ روئے زیبا بھڑکنے نہ دو
گرچہ حسرتِ جنوں محشر انگیز ہے
حذر الحذر محتسب تیز ہے
دل یہ کہتا ہے سب احتیاطیں بھلا دیں
چلو آج مقتل میں چل کر صدا دیں
اِدھر آ ستمگر ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

پبلشر سرورؔ تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائیلٹ پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۵، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

دو پھول

جناب شمبھو دیو چاند چیف پبلک ریلیشنز آفیسر نار درن ریلوے

یہ کس بے تاب کی جلوہ گری ہے
چمن میں روشنی ہی روشنی ہے
ہنسی ہونٹوں پہ ہے دل میں خوشی ہے
بتا اے زندگی اب کیا کمی ہے
مسائل سے کبھی ہمت نہ ہارو
یہی ہمت سے بساؤ زندگی ہے
وہاں کیا ہوں بلاؤں کے اندھیرے
جہاں عزم و عمل کی روشنی ہے
جہاں تاریکیوں میں تھے لٹیرے
وہاں امن و اماں کی روشنی ہے
قدم جو بڑھ گیا آگے بڑھے گا
یہی حسنِ کمالِ رہبری ہے
بس اب اپنے حدودِ زندگی میں
یہ آبادیِ وبالِ زندگی ہے
سفینہ مختصر ہے زندگی کا
سفینے میں مگر اک بھیڑ سی ہے
فقط دو پھول گلشن میں اگاؤ
اسی میں گلستاں کی بہتری ہے
پشیماں جس سے ہیں کتنے ستارے
اسی اک چاند کی یہ چاندنی ہے

ص
اگر ہم ایسا نہ کرتے تو تم بگڑ جاتے یا کوئی تم کو ورغلا کر لے جاتا اور مار ڈالتا اور رقم ہڑپ لیتا دوست نما دشمنوں کی کمی نہیں ہے یاد رکھنا کہ دولت اور عورت نا سمجھ کے پاس نہیں رہتی ہے ہر بھجن کھڑا کھڑا سوچ رہا تھا واقعہ ماموں بھی دوست نما دشمن ہی ہیں مجھے برباد کرنے کی چال چل رہے ہیں وہ فوراً راہِ راست پر آ گیا اس کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ ممی کے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ••

(صٹ کا بقیہ)

"بیٹے ساری رقم تمہارے ماں باپ کی بیماری اور تمہارے پالنے پوسنے میں ختم ہو گئی یاد نہیں ہے ماں کا پیٹ پھاڑ دیا تھا سانڈ نے تمہارے باپ ضرورت کے وقت ہم سے قرض لیتے رہے تھے اور بھگتان کبھی ہو نہیں پایا آخر ہم نے اپنی رقم اسی طرح وصول کر لی۔"

یہ سن کر اس کو ماموں کی ہر بات لفظاً لفظاً ٹھیک معلوم دینے لگی جس پر ہر بھجن کچھ سوچ کر بولا "ممی میں کل ماموں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔" "ہوں آنا ہم نے تم کو کہیں جانے کو منع تھوڑے ہی کیا ہے۔"

"ممی جی آپ نے میری بڑی مدد کی ہے اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں مستقل آپ پر بوجھ بنا رہنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے آپ کی مہربانیوں اور ہمدردیوں کے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے بیٹے مگر شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے ہم نے ایسا کچھ کیا بھی تو نہیں ہے ایک فرض تھا وہ پورا کر دیا تمہاری ماں کی وصیت پوری ہو گئی ہمیں خوشی ہے کہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ اور ماں باپ چاہتے ہی کیا ہیں۔"

ڈاکٹر بترا جب گھر آئے تو انہیں یہ سب باتیں بیوی نے سنائیں اور رات بھر ڈاکٹر بترا اور ان کی بیوی سو نہ سکے۔ صبح ہوئی ماں نے دونوں بیٹوں کو ناشتہ کرایا آج ہر بھجن نے ناشتہ بھی کچھ بے دلی سے کیا اس کی آنکھیں لال تھیں جیسے کہ ہر بھجن رات بھر روتا رہا ہو بینک کی دو پاس بکیں سامنے رکھتے ہوئے ماں کہنے لگی بیٹے آج تم اس گھر سے جانے کی تیاری میں ہو اس لئے وہ راز جس کو ہم تمہاری بھلائی کے لئے چھپائے بیٹھے تھے ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تمہارے باپ کے لگائے گئے دو ہزار یوکلپٹس کے پیڑ چالیس ہزار روپے میں بیچ کر چھ سال کے لئے فکسڈ ڈپازٹ کر دئے تھے جو اب اسی ہزار ہو گئے ہیں اور بیس ہزار روپے بیگھے کے حساب سے پانچ بیگھے زمین فروخت کی تھی جو ایک لاکھ کی ہوئی یہ رقم بھی ایف۔ ڈی میں جمع کر دی تھی جو اب دو لاکھ ہو گئی ہے اس طرح تم اس وقت دو لاکھ اسی ہزار روپے کے مالک ہو جو چاہو کرو جہاں چاہو رہو۔ پیڑ اور زمین اس لئے بیچ ڈالے تھے کہ تم بچے تھے تمہارے ماموں یا اور کوئی عزیز اسکو خرد برد کر سکتا تھا اور تم پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے۔

"ممی جی میں یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے یہ کیوں کیا میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے سکھایا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہئے پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔" ••

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی انتظامیہ کمیٹی اور عہدہ داران کی دوسالہ میعاد ۱۵ر فروری سنہ ۸۳ء کو ختم ہوگئی۔ان دوسالوں میں اس اُردو اکاڈمی کے سیکریٹری عزیز الجبار خاں صاحب نے اُردو اکاڈمی کو قعرِ مذلّت سے نکالنے کی بھرپور کوششیں کی۔خاں صاحب چونکہ پراونشل سول سروس کے ایک مشہور دیانت دار اور انتھک کام کرنے والے افسر ہیں اس لئے انہوں نے سب سے پہلے اکاڈمی میں بھری بددیانتیوں اور بے ایمانیوں کا قلع قمع کرنے کی کوششیں کی بددیانتی اور بے ایمانی نے اُردو اکاڈمی کو اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا کہ جس کی مثال کسی دوسری اُردو اکاڈمی میں مشکل سے ہی مل سکے گی۔بس یوں سمجھئے کہ زیادہ تر تعداد اس اکاڈمی میں ایسے افراد کی تھی کہ جنہوں نے اللہ کے بجائے بددیانتی اور بے ایمانی کو ہی اپنا خدا سمجھ رکھا تھا۔اس ضمن میں صرف دو بہت ہی چھوٹی سی مثالیں آپ پر روشن کردیں گی کہ یار لوگوں نے اُردو اکاڈمی کو کس نادرانہ انداز میں لوٹا ہوگا۔

اکاڈمی میں اخبارات۔رسائل اور دیگر بے مصرف کاغذات کی ردّی فروخت کرنے کی کوٹیشن طلب کی گئیں تو ردی خریدنے والوں کی یونین نے مختلف ناموں سے جو کوٹیشن دیں وہ تین صد روپیہ سے زائد نہیں تھیں خاں صاحب ابھی نئے نئے اکاڈمی میں وارد ہوئے تھے۔ردّی فروختگی کی یہ فائیل جب ان کے سامنے آئی تو وہ چپکے سے کسی بہانے اس کمرے کا معائنہ کرآئے جہاں ردی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔خاں صاحب نے فائیل کو ایک طرف رکھا اور کوئی فیصلہ نہ کیا ایک ماہ گزرنے کے بعد ردّی خریدنے والوں کا وفد خانصاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ردی فروختگی کے لیے کوٹیشن طلب کئے گئے کافی دن ہوگئے ہیں لہٰذا اس کا فیصلہ کردیجئے خانصاحب جانتے تھے کہ یہ وفد از خود نہیں آیا بلکہ ان صاحب کی انگیخت پر آیا ہے جنہیں اس ردّی کی فروختگی سے دلچسپی ہے چنانچہ خانصاحب نے وفد کو بڑی عزّت کے ساتھ اپنے کمرے میں بٹھایا اور فائیل کھول کر فرمانے لگے آپ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ کوٹیشن تین صد روپیہ تک کی ہے مگر میں نے اپنے طور پر کچھ لوگوں سے بات چیت کی تو آپ کی یونین کے لوگوں نے ہی ۳۵ سو روپے کی کوٹیشن دی ہے مگر میں اس کوٹیشن کو بھی منظور نہیں کرسکتا جب تک کہ میں ردی کا وزن نہ کرالوں۔چنانچہ جس ردی کے لئے یار لوگوں نے تین صد روپیہ تک کی کوٹیشن لی تھیں وہی ردی تین ہزار سے بھی زائد کی فروخت ہوئی۔

اکاڈمی کا ٹھنڈے پانی کا کولر خراب ہوگیا اس کی مرمّت کے لئے متعلقہ شخص نے جو کوٹیشن حاصل کی وہ تقریباً ایک ہزار سے زیادہ کی تھی۔خانصاحب چوں کہ مینارٹی کمیشن سے ہی اکاڈمی کے سیکریٹری ہوکر آئے تھے لہٰذا لکھنؤ کے چپّے چپّے سے وہ اچھی طرح واقف تھے چنانچہ انہوں نے کسی مکینک کو فون کیا اور اس مکینک نے یہ کولر ٹھیک کرنے کے بعد صرف ساڑھے بائیس روپے کا بل اپنی مزدوری کا دیا۔ان دو معمولی واقعات سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اکاڈمی میں کیسی لوٹ مچی ہوئی تھی

ایڈیٹر شان ہند نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اکاڈمی کی کتابیں شائع کرانے کے لئے خانصاحب آئے دن دہلی

تشریف لاتے اور مختلف پریسوں میں چکر لگانے اور کتابوں کی اشاعت کے دوسرے مراحل کو طے کرانے میں انہیں کس قدر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیوں کہ بدقسمتی سے اکثر کتابوں کی اشاعت کا کام دہلی کے ایک ایسے شاطر کو دیا جاچکا تھا جس کا اپنا نہ پریس تھا اور نہ آفسیٹ چھپائی کے لئے دوسرے لوازمات اس کے پاس تھے۔ یہ دیکھا گیا کہ خانصاحب کو اگر جھوٹوں بھی کسی نے کہدیا کہ فلاں پلیٹ میکر یا نگیٹو بنانے والا کچھ کم ریٹ پر کام کرسکتا ہے تو یہ دن بھر مارے مارے پھرتے تاکہ اگر ایک فرمے کی تیاری چھپائی وغیرہ میں دس روپے بھی کم لگیں تو ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ خان صاحب اب اس اکاڈمی کو چھوڑ چکے ہیں کیوں کہ انہیں آگرہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا سیکریٹری مقرر کیا گیا ہے خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ خانصاحب ایسے ایماندار اور دیانت دار افسر اتر پردیش اردو اکاڈمی ایسے گندگی کے گڑھے سے اپنا دامن پاک و صاف بچا کر لے گئے۔

جناب ڈاکٹر عمار رضوی نے ابھی تک نئی انتظامیہ کمیٹی اور نئے عہدہ داروں کا اعلان نہیں کیا کیوں کہ ایک تو ۱۹۸۲ء کی نئی کتابوں پر انعامات کا اعلان اسی موجودہ انعامی کمیٹی نے ہی کرنا تھا اور دوسرے رضوی صاحب ایسا انداز اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اکاڈمی پچھلے دنوں کی طرح شیعہ سنّی تنازعہ کا شکار نہ ہو۔

اکاڈمی کے نئے سکریٹری جناب سریش چندر سریواستوا کو مقرر کیا گیا ہے اور فی الحال ان کا تقرر ایک سال کے لئے کیا گیا ہے کیوں کہ سکریٹری تو لازمی طور پر کوئی مسلمان ہی ہوگا اور وہ یقیناً شیعہ مسلمان ہی ہوگا فی الحال ایک کائستھ شری سریواستوا سکریٹری بنائے گئے ہیں جوں ہی ہوا سازگار ہوگی کوئی شیعہ سکریٹری آجائے گا۔

ان دو سالوں میں شروع کا ایک سال تو اکاڈمی شیعہ سنّی تنازعہ کا اکھاڑہ بنی رہی۔ پریذیڈنٹ شیعہ اور چیرمین سنّی۔ چیرمین درس و تدریس کا پروردہ شریف اور ایماندار پریذیڈنٹ گورنمنٹ آف انڈیا سے ریٹائر شدہ ایک گھاگ اور توڑ جوڑ کا ماہر۔ متضاد طبائع اور متضاد مذہبی عقیدت ایسی ٹکرائیں کہ بیچاری اردو اکاڈمی مہاشور خانہ بن کر رہ گئی۔ اخبارات میں واویلا ہوا۔ اردو کے مسلمان دانش وروں میں چہ میگوئیاں ہوئیں (اردو کے مسلمان دانشوروں کی دانش وری صرف حکومت کی طرف سے پھینکے ہوئے ہر لقمۂ تر کو جھپٹنے تک ہی رہ گئی ہے) اور اسی شیعہ سنّی تنازعے کے باعث ان اردو کے مسلمان دانش وروں کا مالی نقصان ہو رہا تھا اور وہ اس طرح کہ اگر اکاڈمی میں ٹھیک طرح سے کام ہو کتابیں چھپیں تو کئی بزعم خود اردو کے مسلمان دانشوروں کو معقول معاوضے ان کتابوں کی تالیف اور انتخاب وغیرہ کے معاوضے میں ملتے۔ لہذا یار لوگوں کی کوششوں اور ڈاکٹر عمار رضوی کی وجہ سے یہ مورچہ کچھ سرد پڑا تو چیرمین نے کچھ ہی مہینوں میں کتابوں کی اشاعت کی لائن لگا دی اور کتابیں بھی وہ جن پہ اردو زبان اور اردو ادب تا ابد نازاں رہیں۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب چیرمین اکاڈمی نے جس محنت اور کاوش، ایمانداری و دیانت داری سے اکاڈمی کی خدمت کی ہے وہ اکاڈمی کی تاریخ میں ہمیشہ اپنا ایک جداگانہ مقام رکھے گی۔ اگر علی جواد زیدی صاحب پریذیڈنٹ اکاڈمی انتظامیہ کمیٹی کے فیصلوں اور خصوصاً چیرمین کے قابلِ تعریف اقدامات کو تارپیڈو نہ کرتے تو ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس اکاڈمی کو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں ہندوستان کا واحد مثالی ادارہ بنا دیا ہوتا (یہ اعزاز ڈاکٹر محمود الٰہی نے اب بھی حاصل کیا ہے) اگر ڈاکٹر عمار رضوی تک ہماری آواز پہنچ سکے تو انہیں ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کو اب بھی اکاڈمی کا چیرمین بنے رہنے دینا چاہئے۔ وائس چیرمین جناب ڈاکٹر حکم چند نیر کے بارے میں

ملک و قوم کی شاندار ترقی کیلئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

جدید ۲۰ نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک لمیٹڈ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی تمام تر خدمات وقف کرتا ہے

بینک نے موجودہ مقروضہ جات کی رقم کا ۴۰ فیصد بیس نکاتی پروگرام کے تحت پسماندہ طبقوں کو فراہم کیا ہے

ہیڈ آفس
۷۸ محمد علی روڈ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
فون نمبر ۶۵ - ۳۲۵۹۶۱

دہلی برانچ
۳۰۵۴-۵۵ نیتاجی سبھاش مارگ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر ۲۷۴۲۳۴۰ - ۲۶۸۲۴۴

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

یادش بخیر سلامت علی مہدی نے پھر ہزارہا خطوط ملک بھر کے مخیّر اور دردمندوں کو بھجوائے ہیں ان خطوط کے ساتھ انہوں نے منی آرڈر فارم بھی اپنے مکمل پتہ کی مہر لگا کر بھجوایا ہے۔

سلامت علی مہدی کے اس تازہ ترین فراڈ کی اطلاع مشہور افسانہ نگار جناب جی۔ کے مانک بالا نے دی ہے جن سے کہ یہ حضرت پانچ صد روپیہ پہلے ہی ٹھگ چکے ہیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ سلامت علی مہدی اس قول کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ "چوں احمق درجہاں باقی ست کس مفلس نمی ماند" یعنی جب تک دنیا میں بے وقوف موجود ہیں کوئی مفلس نہیں رہ سکتا اور ہمیں یقین ہے کہ ملک بھر سے سیکڑوں بے وقوفوں نے سلامت علی مہدی کے بھجوائے ہوئے منی آرڈر فارموں کے باعث اپنی جیب خالی کر کے اس ازلی فراڈ اعظم کی جیب بھری ہو گی۔

سلامت علی مہدی کے بے حساب دھوکہ دہی کے واقعات میں سے ایک دلچسپ واقعہ قارئینِ شانِ ہند کی نذر ہے اس واقعہ کے راوی قبلہ حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلیٰ "شمع" ہیں۔

کے۔ آصف فلم مغلِ اعظم بنا رہے تھے اور انہیں ایک لڑائی کے سین کی شوٹنگ راجستھان میں کرنی تھی جس میں متعدد ہاتھیوں کی ضرورت تھی۔ سلامت علی مہدی نے کسی ملاقات میں آصف صاحب کو یہ یقین دلایا کہ وہ لکھنؤ سے ہاتھیوں کا انتظام کر سکتے ہیں۔ لہٰذا آصف صاحب نے یہ کام سلامت علی مہدی کے ذمہ لگایا اور حسب طلب ہزارہا روپیہ انہیں دے کر لکھنؤ بھجوایا گیا۔ جب شوٹنگ میں چند دن باقی رہ گئے تو آصف صاحب نے مسٹر عشرت نقوی کو لکھنؤ بھجوایا کہ سلامت علی مہدی سے مل کر تسلی کر لیں کہ مطلوبہ ہاتھی وقتِ مقررہ پر شوٹنگ کے مقام پر پہنچ جائیں۔ عشرت صاحب لکھنؤ پہنچے تو سلامت علی مہدی نے انہیں اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا (بل کی ادائیگی تو عشرت صاحب نے ہی کرنی تھی) اور باتوں باتوں میں انہیں بتلایا کہ سب انتظام ہو گیا ہے اور میں نے فیل بانوں کو بلوایا ہے تاکہ ان کی ملاقات آپ سے کرا دوں۔ دوسرے دن ایک درجن کے قریب اشخاص ہاتھی بانوں کی مخصوص پوشاک میں عشرت صاحب کے سامنے پیش کئے گئے اور سلامت علی مہدی ان میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہنے لگے تمہارے کتنے ہاتھی تیار ہیں؟ اس نے کہا حضور پندرہ تو بالکل تیار ہیں اگر حضور کچھ روپیہ پیشگی دے دیں تو میں اپنے ایک ملنے والے ہاتھی بان کے بھی تیار کر سکتا ہوں اس کے چار ہاتھی ہیں۔ سلامت علی مہدی نے فوراً عشرت صاحب سے کہا ان کے لئے ایک ہزار روپیہ دیدیجئے تاکہ میں اس سے رسید وغیرہ لکھوا کر دیدوں۔ دوسرے شخص سے سلامت علی مہدی کہنے لگے دیکھو تمہاری جو وہ ہتھنی ہے وہ لڑائی میں کام نہ دے گی لہٰذا اسے مت لے جانا ہاں باقی تمہارے ہاتھی سب ٹھیک ہیں تمہیں بیعانہ کتنا مل چکا ہے اس نے کہا حضور آپ نے تین ہزار دیا تھا دو ہزار اور دیدیجئے تاکہ راستے میں مجھے ہاتھیوں کی خوراک وغیرہ کے لئے دقت نہ ہو پھر ان کی خوراک پر بھی تو میرے مالک کافی اخراجات ہوں گے۔ سلامت علی مہدی نے بے ساختہ عشرت صاحب سے کہا ہاں ہاں ان کے لئے بھی دو ہزار دیدیجئے میں ان سے رسید لکھوا کر دے دوں گا۔ تیسرے شخص سے سلامت علی مہدی نے فرمایا دیکھو بھئی تمہارے چار ہاتھی نہایت کمزور ہیں وہ لڑائی کے میدان میں چیخ چنگھاڑ کو سن کر میدان سے بھاگ نکلیں گے اس لئے میں نے انہیں ریجیکٹ کر دیا

رآپ اچھے ہاتھیوں کا انتظام کرسکتے ہیں تو پیشگی روپیہ اور بھی یا جاسکتا ہے ورنہ جو ایک ہزار روپیہ تم نے رکھا ہے وہ بھی واپس کردو۔ اُس شخص نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا حضور ہ غریب کا نقصان نہ کیجئے، میں اپنے کسی رشتہ دار سے ہاتھی مانگ ں گا اور ان چار کمزور سا ہاتھیوں کو چھوڑ کر سات آٹھ بہت اقتور ہاتھی لے جاؤں گا اس پر سلامت علی مہدی نے شرت صاحب سے کہا کہ ان کے لئے بھی پانچ سو روپیہ اور یدیجئے۔ غرضیکہ عشرت صاحب کو پورا پورا یقین دلا یا گیا کہ طلوبہ ہاتھیوں کا پورا پورا انتظام ہوچکا ہے اور اس قین دہانی کے پردے میں سلامت علی مہدی نے عشرت صاحب سے مزید کئی ہزار روپیہ بھی اینٹھ لیا۔ عشرت صاحب نے بمبئی واپس پہنچ کر آصف صاحب کو ساری روداد سنائی در یقین دلایا کہ وقتِ مقررہ پر ہاتھی جے پور پہنچ جائیں ے۔ اتفاق سے قبلہ یوسف دہلوی آصف صاحب کے ہاں ہی تشریف فرما تھے عشرت صاحب کی ساری روداد سُننے کے بعد انہوں نے فرمایا، عشرت صاحب آپ نے اپنی آنکھ سے ہاتھیوں کو دیکھا بھی۔ اس پر عشرت صاحب نے پھر پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ جناب ایک درجن کے قریب ہاتھی بان میرے ہوٹل میں آئے اور اُن سب نے بتایا کہ ہاتھی بالکل تیار ہیں کچھ روپیہ سلامت علی مہدی ان کو پیشگی ے چکے تھے اور کچھ مَیں نے مزید پیشگی دیدیا ہے تاکہ ہاتھی انوں کو راستے میں کوئی دقت نہ آئے۔ اس پر حافظ یوسف صاحب دہلوی نے مُسکراتے ہوئے آصف صاحب سے کہا کہ یاں شوٹنگ سے پہلے کاغذ کے نقلی ہاتھی بنوا لینا لکھنؤ سے ایک بھی ہاتھی واقعی نہیں آئے گا۔ عشرت صاحب پر سلامت علی مہدی کی چرب زبانی کا رنگ چڑھا ہوا تھا ہٰذا انہوں نے پھر پورے اعتماد سے کہا کہ نہیں صاحب تھی آئیں گے اور ضرور آئیں گے مَیں سب انتظامات دیکھ کر آرہا ہوں۔

آصف صاحب شوٹنگ کے لئے تمام ساز و سامان اسٹاف کے ساتھ راجستھان پہنچ گئے اور کئی روز پہلے سلامت علی مہدی کو تار دیدیا گیا کہ فلاں روز ہاتھی یہاں پہنچ جائیں تاکہ دو چار دن ہاتھی سفر کی تکان دور کرلیں اور اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوگی۔ سلامت علی مہدی نے فوراً تار سے ہی جواب دیا کہ مطلوبہ ہاتھی فلاں دن روانہ ہورہے ہیں۔ آصف صاحب اور عشرت صاحب کو تار پڑھ کر اور بھی یقین ہوگیا۔ اب ہر روز تار آنے شروع ہوئے کہ آج ہاتھی ملیح آباد پہنچ گئے آج فلاں مقام پر ہیں اور آج فلاں جگہ ہیں۔ آصف صاحب کو ہر روز سلامت علی مہدی کا تار ملتا اور وہ اپنے یونٹ کو تاکید کرتے کہ شوٹنگ کی سب تیاری مکمل کرلیں۔

ادھر حقیقت یہ تھی کہ نہ تو کوئی ہاتھی بُک کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی ہاتھی راجستھان جانے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ عشرت صاحب کے سامنے ہوٹل میں جو فرضی ہاتھی بان پیش کئے گئے تھے وہ سب کے سب سلامت علی مہدی کے حواری جُواری تھے جن کو محض شراب اور عیاشی کی دعوت پر یہ ڈھونگ رچانے کے لئے کرایہ پر حاصل کیا گیا تھا۔

جب شوٹنگ میں صرف دو دن رہ گئے تو آصف صاحب کی پریشانی بڑھی اور انہوں نے جے پور سے سو سو میل تک اپنے آدمی بھجوائے تاکہ جوں ہی ہاتھیوں کے قافلے کو دیکھیں تو انہیں فون سے یا تار سے فوری اطلاع دیں مگر ہاتھی کہیں ہوں تو نظر بھی آئیں۔ مگر سلامت علی مہدی تار پر تار دئے جارہے ہیں کہ ہاتھی اپنا سفر بخیر و خوبی طے کررہے ہیں اور [illegible] جے پور پہنچا ہی چاہتے ہیں۔ جب عین شوٹنگ کا دن آگیا تو آصف صاحب کو سلامت علی مہدی کا تار موصول ہوا کہ حکومتِ راجستھان نے یوپی کے ہاتھیوں کو اپنی حُدود میں داخل نہیں ہونے دیا کیونکہ ان ہاتھیوں سے راجستھان کے ہاتھیوں میں بیماری پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ آصف صاحب، سلامت علی مہدی کی اس دھوکہ دہی اور منطق پر سر پیٹ کر رہ گئے اور اُن سے جیسا بھی بنا شوٹنگ،

سکے۔ نیز چند زندہ اور ہاتھی فوری طور پر فراہم کئے گئے اور باقی نقلی ہاتھیوں کی قطاریں دور کی کرک کیمرہ ٹرک سے شوٹنگ کی۔

آصف صاحب سلامت علی مہدی کی اس ہاتھی سے جو بارہ لاکھ قرار دھوکہ دہی اور جعلسازی پر اس قدر آتش زیر پا ہوئے کہ انہوں نے سلامت علی مہدی پر مقدمہ دائر کرنے کی ٹھانی، قبلہ حافظ محمد یوسف شاہ دہلوی نے آصف صاحب کو سمجھایا کہ اس بد دیانت اور دھوکہ باز پر مقدمہ نہ کیا جائے ورنہ انہیں اس مقدمہ میں سلامت علی مہدی [illegible] بنائے آصف۔ [illegible] قدموں میں ہر [illegible] سی مانگنے کے ساتھ ساتھ ناک رگڑنے جا رہے تھے کہ تصویر واقعی حکومت راجستھان نے ہاتھیوں کو اپنی حدود میں داخل نہ ہونے دیا تھا۔

پچھلے دنوں ایڈیٹر شانِ ہند جب لکھنؤ گیا تو اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سابق سکریٹری جناب عزیز الجبار خاں صاحب کے دفتر میں لکھنؤ کے مجھ ادیبوں اور شعراء کے ساتھ سلامت علی مہدی بھی تشریف فرما تھے۔ راقم الحروف کو دیکھتے ہی سلامت صاحب نے منہ نیچا کر لیا۔ علیک سلیک کی پہل ایڈیٹر شانِ ہند نے کرتے ہوئے سلامت صاحب سے کہا کہ شرم تو آنی جانی چیز ہے کہئے اب آپ کی صحت کیسی ہے اس پر [illegible] صاحب نے فرمایا کہ سرور صاحب اکاڈمی نے سلامت صاحب کی ڈیڑھ صد روپیہ پنشن مقرر کر دی ہے۔ اس پر ایک صاحب نے لقمہ دیا کہ ہاتھی کے منہ میں زیرہ۔ سلامت علی مہدی نے دھوکے دہی سے جو روپیہ حاصل کیا ہے اگر اس میں سے صرف اسی ناجائز روپیہ کو لیا جائے جو انہوں نے جناب بہوگنا کے نام پر عوام سے بٹورا تو یہ اس روپیہ کے کرنسی نوٹوں سے دو بار تولے جا سکتے تھے مگر واہ ری شراب اور عورت کہ لاکھوں روپیہ ہتھیانے کے باوجود سلامت علی مہدی آج بھی صبح کے وقت چائے کی ایک پیالی کے لئے کسی نئی دھوکہ دہی کی اسکیم کا مرہونِ منت ہے۔

مولانا محمد علی نے ایک بار فرمایا تھا کہ ایک فاسق و فاجر مسلمان کا... ہی جی ہے، بہتر ہے اس لئے ہندوستان اور ممالک غیر کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ سلامت علی مہدی کے لئے شراب اور عورت کا انتظام کرنے کے لئے اس کی مالی مدد کرتے رہیں۔

●●

(ص۴۷ کا بقیہ)

سر لے لیا تو کیا احسان کیا کبھی تم نے اس سمپتی کا حساب پوچھا ہے یا انہوں نے کچھ حساب دیا ہے۔"

"نہ انہوں نے کبھی حساب دیا اور نہ میں نے حساب لیا پھر بکنے اور کا تو مجھے معلوم ہے زمین فروخت کرنے کی بھی مجھے خبر ہے مگر مجھے یقین ہے کہ وہ جو کچھ کریں گے میرے حق میں اچھا ہی کریں گے"

"تم بالکل ہو بدھو اگر وہ اپنی سرکار کو نہیں بخشتا جس کا نمک وہ تمہیں کیسے بخش دیگا جانتے نہیں لاکھوں روپے کی دوائیں سرکار سے اور وہ پیچھے کے دروازے سے کمیشن لئے گھر پہنچ جاتی ہیں مریض کو باہر سے دوائیں خریدنی پڑتی ہیں ایسے بھرشٹ لوگ کیا کسی کا بھلا کریں"

"ماموں مجھے ابھی ان سب باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے کہ میں حساب کتاب پوچھوں" — "ہاں، واقعی ابھی ضرورت نہیں ہے ضرورت تب ہوگی جب تم کو کسی بہانے سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر کر دیا جائے گا اور تم پیسے پیسے کو محتاج ہو جاؤ گے تب یاد کرو گے ہم لوگ جن کو آج غیر سمجھتے ہو۔"

"اچھا ماموں صاحب آپ کے کہنے کے مطابق میں یہ دونوں باتیں آج پوچھوں گا"۔

"یہ بھی یاد رکھو کہ اس میں سے تمہیں کانی کوڑی بھی نہیں، سب برابر کر دیں گے کچھ تمہارے خرچ میں دکھا دیں گے کچھ ماں باپ کی بیماری اور دوا دارو میں دکھا دیں گے دیکھو اگر ان سے نہیں پٹے تو میرے پاس چلے آنا میرا دروازہ تمہارے لئے کھلا رہے گا بھینس لے کے دوں گا گھاس کھودنا دودھ پینا اور اڑانا"۔ ہر بھجن یہ باتیں سن کر گھائل ناگ کی طرح نیم مردہ اور سوچنے لگا کہ ماموں پھر ماموں ہی ہیں ان کی ہر بات تو غلط نہیں ہو سکتی اور یہ صحیح ہے کہ اتنا روپیہ ان کے پاس ہے اس پر انہوں نے میری پرورش کر بھی دی تو کیا احسان ہے صرف ماں باپ کا پیار ہی تو زندگی گزارنے کے لئے کافی نہیں۔

اسی کشمکش میں اداس اور مضمحل ہر بھجن گھر میں [illegible]

ہر بھجن کو اس طرح شکست اور اداس دیکھ [illegible] بیٹے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری — کوئی خاص بات [illegible] بنا دی مسکان چہرے پر بکھیرتے ہوئے ہر بھجن۔ [illegible] کھوڑنے لگا شام کو اس نے ماموں کے بتائے ہوئے سامنے رکھے وہ جواب میں بولیں۔

(باقی)

معرفت عقیل صدیقی

کُل ہند طرحی مسالمہ کامٹی

خلیل انجم
کامٹی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ بمطابق ۱۰ ر نومبر ۱۹۸۲ء کی شب میں آستانہ صوفی کامٹی میں سجائے گئے پنڈال میں خرابیٔ موسم کے باوجود شائقین شعر و ادب نیز عقیدت مندانِ امام عالی مقام حضرت امام حسین جمع ہیں۔ خواتین کے لئے پردے کا مناسب انتظام کیا گیا ہے، اسٹیج کو مناسب طریقے سے سجایا گیا ہے جس پر شعرائے کرام و مہمانِ خصوصی عالی جناب عبید الرحمٰن نیازی اور صدرِ مجلس محترم المقام پرنس انجم قدر صاحب جلوہ افروز ہیں۔ یہ سب اہتمام ایک کُل ہند طرحی مسالمہ کیلئے کیا گیا ہے جو ہر سال کی طرح اس سال بھی حضرت صوفی عبد الحکیمؒ کے ۶۸ ویں عُرسِ مبارک کے موقع پر منعقد کیا گیا ہے اسس طرحی مسالمہ کا آغاز حسبِ معمول تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ رسول پاک سے ہوا۔ صدرِ مسالمہ جناب پرنس انجم قدر صاحب شہر کامٹی میں پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ ان کی آمد کا شہر میں کافی چرچا رہا۔ اپنی صدارتی تقریر میں موصوف شیعہ سُنّی اتحاد پر زیادہ زور دے رہے ہیں ان کا اندازِ تقریر نیا ہے اور اچھوتا بھی اور اس کے ساتھ ٹھوس اور جامع بھی سامعین بڑی توجہ کے ساتھ سماعت فرما رہے ہیں۔ صدارتی تقریر ختم کرکے پرنس انجم قدر بگھر واپس آگئے ہیں اور مائیک پر جناب ثقلین حیدر صاحب تشریف لائے ہیں ثقلین حیدر ایک لمبی چوڑی تقریر کے موڈ میں ہیں، ان کی تقریر کا عنوان "سیرت پاکؐ" ہے شہر کامٹی اطراف میں دو روز سے معمولی بارش کی وجہ سے موسم خراب سا ہے آج بھی شام میں معمولی بارش ہوئی ہے لیکن اب جبکہ رات کے تقریباً گیارہ بج رہے ہیں بارش کے کوئی آثار نہیں ہیں ہاں موسم کچھ بھیگ سا گیا ہے ـــــ ثقلین حیدر صاحب اپنے مخصوص اور جوشیلے انداز میں تقریر کر رہے ہیں اور پسینے سے تر نظر آ رہے ہیں لیکن دلجمعی اور بیزاری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سامعین اس تقریر کو سماعت فرما رہے ہیں تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کرنے کے بعد مسالمہ کے آغاز کے لئے عالی جناب علیم الدین علیم سہارن پوری صاحب کو آواز دی گئی ہے۔ علیم سہارن پوری بذاتِ خود مسالمہ میں شریک نہیں ہو سکے تاہم ان کا سلام پڑھنے کی غرض سے کامٹی کے نہایت خوش گلو فن کار جناب محمد جابر مائیک پہ تشریف لائے ہیں محمد جابر اس وقت شہر کے قابلِ ذکر گلوکار ہیں اور اکثر ایسی روحانی اور نورانی محفلوں میں اپنی مسحور کُن آواز کا جادو جگاتے ہیں۔ اس طرحی مسالمہ کے لئے دو مصرعے دئے گئے ہیں پہلا مصرعہ ہے ؎

ع "حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری"

دوسرا مصرعہ ہے ؎

ع "شبنم سے دُھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی"

علیم سہارن پوری صاحب نے دوسرے مصرعہ پہ طبع آزمائی کی ہے۔ محمد جابر مائیک پر آکر اپنے مخصوص انداز میں علیم سہارن پوری کے سلام کا مطلع عنایت کر رہے ہیں سماعت فرمائیے ؎

آمد جو ہے حسینِ شہادت پناہ کی
شبنم سے دُھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی

سلام کے وہ اشعار بھی سماعت فرمائیے جنہیں سامعین نے بے حد پسند فرمایا ؎

نورِ رسولِ پاک کا پیکر حسینؑ ہیں
پہونچی نظر نہ رُخ پہ کسی کم نگاہ کی

میدانِ کربلا کا یہ اعجاز ہے عسکیم
کانوں میں آرہی ہے صدا لا الہٰ کی

محمد جابر سلام ختم کرکے داد و تحسین کی صداؤں میں اپنی جگہ واپس آرہے ہیں اور ناظمِ مسالمہ ناگپور کے نوجوان شاعر خلیل صادق کو آواز دے رہے ہیں۔ خلیل صادق مائیک پر آکر پہلا مصرعہ پر اپنا سلام نذرِ سامعین کررہے ہیں دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

شعورِ جینے کا سکھلا گئی زمانے کو
لبِ فرات یہ عباس کی جواں مردی
ترستے پانی کو ہرگز نہ وارثِ کوثر
نہ ہوتی پیشِ نظر جو مشیتِ ایزدی

خلیل صادق کچھ شاد کچھ ناشاد مائیک سے رخصت ہورہے ہیں ۔ اب عابد ابی جون پوری کو آواز دی جارہی ہے راہی جونپوری کا صرف مطلع ہی سماعت فرمائیے ؎

بیعت قبول کرتے کسی کج نگاہ کی
فطرت نہ تھی یہ سبطِ رسالت پناہ کی

اب کامٹی کے قمر اسرار کو دعوتِ سخن سرائی دی جارہی ہے قمر اسرار تحت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں ۔ قمر اسرار نے اپنا سلام صنفِ مخمس میں کہا ہے ۔ سلام کے دو بند پیشِ خدمت ہیں ؎

شبیر تیرے جذبۂ ایثار کو سلام
ہمدردی و خلوص کی تلوار کو سلام
شانِ عطا متانتِ کردار کو سلام
حسنِ عمل کے روئے پُر انوار کو سلام
دنیا تلاش میں ہے تری بارگاہ کی

تیر جفا کے ساتھ چلے نیزۂ ستم
دن رات آپ سہتے رہے صدمۂ الم
شانہ خوابِ چشم نازتھی جب تک تھا دم میں دم
صبر و ثباتِ اصغرِ مظلوم کی قسم
بنیاد ہل کے رہ گئی قصرِ گناہ کی

قمر اسرار کامیاب ہو کر لوٹ رہے ہیں، اسٹیج پر بیرونی و مقامی شعرائے کرام کے علاوہ مسالمہ کی واحد شاعرہ ملکہ نسیم بھی تشریف فرما ہیں ۔ ناظمِ مشاعرہ کہہ رہے ہیں کہ ملکہ نسیم فرما رہی ہیں کہ مسالمہ میں رنگ نہیں آرہا ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ کربلا کا رنگ ہے دھیرے دھیرے آتا ہے ۔ اب ناگپور کے بزرگ شاعر جناب عبدالحق ارنی صاحب سے درخواست کی جارہی ہے ۔ ارنی صاحب کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

کوثر پئیں گے ساقیِ کوثر کے ہاتھ سے
پیاسوں نے اس لئے کبھی نہ پانی کی چاہ کی
دوزخ میں سیدھا جائیگا ہر قاتلِ حسینؑ
محشر میں کب پڑے گی ضرورت گواہ کی

ارنی صاحب کے بعد اب عبدالرب سدا جوسیونی (مدھیہ پردیش) سے تشریف لائے ہیں کو بڑے احترام و ادب کے ساتھ تکلیف دی جارہی ہے ۔ سدا صاحب عنایت کررہے ہیں ۔ سلام کے دو شعر آپ کی نذر ہیں ؎

ستم کے حق میں نہیں شوکتِ جہاں گیری
کہ سر بلند ہے نیزے پہ شانِ سبطِ نبی
جہاں کہ تیرِ ستم گر لہو میں ڈوب گیا
دکھا گئی وہیں طفلی بھی عظمتِ پیری

اب طالب ناگپوری صاحب کو آواز دی گئی ہے ۔ طالب صاحب کا کلام معمولی تھا اس لئے کوئی شعر بھی نوٹ نہیں کرسکا ۔

اب ناگپور کے نومشق شاعر شکیل انور کو سخن سرائی کی دعوت دی جارہی ہے شکیل انور ترنم سے پڑھتے ہیں ۔ سلام اچھا ہے اور ترنم بھی گوارا ۔ سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں ۔ چند شعر پیش کئے جارہے ہیں ؎

تعلیم جس نے دی ہے فقیرانہ راہ کی
کب وہ چلا ہے چھاؤں میں تاج و کلاہ کی
سرور نے سر دیا تو سرافراز ہو گئے
تدبیر چل سکی نہ یزیدی سپاہ کی
سوئے گا اس پہ اصغرِ معصوم اس لئے
شبنم سے دھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی "

شکیل انور مائیک سے نہایت کامیاب ہوکر

ہیں اب کامٹی کے عبدالباری عارف مائیک پر آ گئے ہیں لیکن سامعین سے داد وصول نہیں کر پا سے ان کا مطلع ہی اچھا تھا جس پر کہیں کہیں سے "واہ واہ" کی صدائیں گونجی تھیں مطلع آپ بھی سنئے ؎

یارب تجھے قسم ہے تری عز و جاہ کی
شبنم سے دھولی جائے زمیں قتل گاہ کی

اب ناظمِ مشاعرہ نے خاکسار کو یاد کیا ہے دو تین روز سے طبیعت ناساز تھی تاہم شاطر حکیمی کے حکم پر حاضر ہوا حسبِ معمول ترنم میں اپنا کلام سنایا کچھ اشعار سامعین نے پسند فرمائے جسے میں اپنی حوصلہ افزائی خیال کرتا ہوں ورنہ "من آنم کہ من دانم" والی بات مجھ پر صادق آتی ہے سلام کے دو شعر آپ کی نذر ہیں ؎

کوفے کے لوگ سرکش و گمراہ ہو گئے
ذاتِ حسینِ پاک تھی منزل پناہ کی

تابانیٔ حسین سے روشن ہے کائنات
انجم بساط و قدر ہی کیا مہر و ماہ کی

اب کامٹی کے یونس آفسر صاحب کو دعوتِ سخن دی جا رہی ہے یونس آفسر تحت میں پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں آج بھی حسبِ معمول وہ نہایت کامیاب ہیں سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں اور یونس افسر داد و تحسین کے پھولوں سے اپنا دامن بھر رہے ہیں چند اشعار حاضر ہیں ؎

وہ چاہتے تو پانی ابلتا زمین سے
تاریخ کہہ رہی ہے یہ زم زم کے چاہ کی

حق بات کا یزید پہ ہوتا نہیں اثر
اب اور کیا دلیل ہو قلبِ سیاہ کی

طوفانِ نوح آئے یا سیلابِ انقلاب
ہرگز نہ ڈھل سکے گی زمیں قتل گاہ کی

شبیرؑ نے بتا دیا جینے کا راستہ
حاجت نہیں ہے ہم کو کسی خضرِ راہ کی

کیوں وقت کے یزید ہیں آمادۂ ستم
ہرگز نہ دب سکے گی صدا لا الٰہ کی

یونس آفسر خوش و خرم مائیک سے لوٹ رہے ہیں اور ناظمِ مشاعرہ ان کے کلام پر دل کھول کر تبصرہ کر رہے ہیں مشاعرہ میں اب رنگ آ رہا ہے اور یہ رنگ دھیرے دھیرے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اب ناگپور کے ڈاکٹر غازی امان صاحب کو دعوتِ سخن دی گئی ہے۔ ڈاکٹر غازی امان ٹمس سنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں افسوس کہ میں ان کا کوئی بند نوٹ نہیں کر سکا۔ اب نہایت احترام کے ساتھ کامٹی کے جانے پہچانے شاعر اور ادیب جناب خلش قادری صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے خلش قادری ایک پختہ گو شاعر ہیں اور عوام میں بہت مقبول بھی۔ کلام ترنم میں سناتے ہیں لیکن ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے آج کلام تحت میں سنا رہے ہیں۔ مطلع ہی سے داد و تحسین کا سلسلہ شروع ہے اور خلش قادری بہت کامیاب جا رہے ہیں، سلام کے چند اشعار آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

گریز پا ہے غرور و ستم کی تیرہ شبی
نہ ہوگا قتل صداقت کا آفتاب کبھی

صفات و ذات کے اسرار کوئی کیا جانے
بتائے کون کہ کیا ہے مقامِ شبیریؑ

سلگتے صحرا میں جلتے بدن پکار اٹھے
وہ نخلِ صبر کہ تھا شاخِ سایہ دار کوئی

خلش قادری اپنا مرصع کلام سنا کر "واہ واہ" اور "سبحان اللہ" کی گونج میں مائیک سے واپس ہوئے تو ناظم مشاعرہ ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ جس کے دل میں عشقِ حسینؑ ہو وہی ایسے شعر کہہ سکتا ہے۔ اب ہمسر ناگپوری کلام سنا رہے ہیں لیکن سامعین توجہ سے نہیں سن رہے ہیں حالاں کہ ان کا کلام اچھا ہے۔ اب ظفر فرخ آبادی کو زحمت دی جا رہی ہے لیکن ظفر صاحب بھی مجمع کو متاثر نہیں کر پائے تاہم ان کا یہ شعر اچھا رہا ؎

اسلام کی بقا کے لئے سر کو دے دیا
بیعت قبول کی نہ مگر روسیاہ کی

اب کامٹی کے بزرگ شاعر حضرت کیفی اسماعیلی صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی جا رہی ہے ان کے دو شعر

آپ کی نذر ہیں ؎

کیا جانتا وہ قدرِ شہِ دیں پناہ کی
عینک تھی جس کی آنکھ پہ جرم و گناہ کی

کعبہ بھی ہے اسیرِ غمِ اہل بیت میں
اوڑھے ہوئے ردا ہے غلافِ سیاہ کی

کیفی صاحب کے بعد تابش حلیمی صاحب مائیک پر آئے ہیں ترنم تو گوارہ ہے لیکن کلام معمولی ہے۔ تابش حلیمی کچھ شاد کچھ ناشاد مائیک سے واپس ہو رہے ہیں اب کامٹی کے ہی رحمٰن راہی صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے۔ راہی صاحب کے یہ دو شعر خاص طور سے بہت پسند کئے گئے ایک شعر میں طرحی مصرعہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ آیا ہے ؎

کس تشنہ لب کا آہ بہے گا یہاں لہو
"شبنم سے دھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی"

اے شام وہ بھی کیسی قیامت کی تھی سحر
جب گردشیں رکی تھیں ترے مہر و ماہ کی

راہی صاحب کامیاب لوٹ رہے ہیں اب ناگپور کے مولوی جناب مصطفےٰ شائق صاحب سے نہایت احترام کے ساتھ درخواست کی جا رہی ہے۔ شائق صاحب ترنم میں کلام سناتے ہیں آج بھی بڑے ذوق و شوق سے اپنا کلام سنا رہے ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

تا عمر اب نہ بھٹکے گا منزل سے کارواں
وہ روشنی ملی ہے مجھے شاہراہ کی

اب کامٹی کے اشفاق نجمی کو دعوت دی جا رہی ہے اشفاق نجمی صاحب اپنے مرصع کلام اور دل نواز ترنم کی بدولت محفل پر اچھا اثر چھوڑ رہے ہیں، بڑے حوصلے کے ساتھ سلام پڑھ رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں چند شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

ملتی نہیں مثال حسینی سپاہ کی
ہم رنگ سیرتیں ہیں سفید و سیاہ کی

قدموں میں ہیں نبی کے صنم دوش پر علی
تطہیر ہو رہی ہے یوں بیت اللہ کی

اکبر کے حسن میں ہیں محمدؐ کی جھلکیاں
ہٹ جائے اب مجال نہیں ہے نگاہ کی

ہے کون بی بی جو شبِ عاشورائے حسین
بالوں سے جھاڑتی ہے زمیں قتل گاہ کی

اشفاق نجمی نہایت کامیاب مائیک سے لوٹ رہے ہیں آج خواتین سامعین کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو بڑے شوق سے کلام سماعت فرما رہی ہیں۔ اب مسالمہ کی واحد شاعرہ محترمہ ملکہ نسیم کے نام کا اعلان کیا گیا ہے تمام سامعین سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ گزشتہ مسالمہ میں بھی ملکہ نسیم بہت کامیاب رہی تھیں۔ ملکہ نسیم اگرچہ تحت میں پڑھتی ہیں لیکن ان کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا ہے۔ انہوں نے دونوں طرحی مصارع پر سلام کہے ہیں، پہلے سلام کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ٹوٹے سکوتِ شامِ غریباں کا کس طرح
اکبر نہیں جو گونجے صدا لا الٰہ کی

بکھرے ہیں پھول باغِ امامت کے ہر طرف
"شبنم سے دھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی"

جنت نسیم چاہے نہ کوثر طلب کرے
الفت اسے ملی ہے شہِ دیں پناہ کی

ملکہ نسیم کے دوسرے سلام کے چند شعر یوں ہیں ؎

شبِ دہم ہے جگر کانپتے ہیں ماؤں کے
سحر کے بعد بجھیں گے چراغ شبیری

تمہارا جسم تھا آغوشِ کربلا تھی مگر
تمہارے سر سے تھی روشن شعاعِ تنویری

بھری بہار میں کس کی نظر لگی افسوس
جواں کی لاش پہ روتی ہے باپ کی پیری

یزیدیت کا فسانہ تو کب کا ختم
"حقیقتِ ابدی ہے مقامِ

ملکہ نسیم نہایت کامیاب ہو کر "واہ وا
غل میں واپس اپنی جگہ لوٹ رہی ہیں اور
سامعین بھی ایک ساتھ اٹھ کر اپنے گھر د

ہیں گویا انہیں ملک نسیم کے پڑھنے ہی کا انتظار تھا۔
ملک نسیم نے واقعی سامعین کو خصوصاً خواتین کو بہت متاثر کیا
رات اب بھیگ چکی ہے پنڈال میں پھر بھی اہلِ ذوق
کی اچھی تعداد مستند شعرائے کرام کے کلام سننے کی منتظر ہے
اب ناگپور کے بزرگ شاعر جناب شارق جمال صاحب کو
زحمت دی جا رہی ہے۔ شارق صاحب کا شمار علاقہ کے
اساتذہ میں ہوتا ہے۔ شارق صاحب کے سلام کو سامعین
نہایت توجہ کے ساتھ سماعت فرما رہے ہیں اور داد دے
رہے ہیں چند شعر آپ بھی سنیئے ؎

سوئیں گے گُل رخانِ علی اَسس پہ اس لئے
"شبنم سے ڈھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی"
شارق اندھیرا خیموں میں ان کے ستم غضب
ظلمت نثار جن پہ رہی مہر و ماہ کی

شارق صاحب کے بعد پروفیسر یونس صاحب تشریف
لا کر کچھ اچھے اور چپے تلے اشعار سنا کر داد وصول کر رہے
ہیں۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

کسی بسنت کے قاتل نے پھول کو مسلا
مگر سگندھ امر تھی فضا میں پھیل گئی
ادا ہو خوں کے وضو سے تو زندگی ہے نماز
وگرنہ چند نفس کی ذخیرہ اندوزی

پروفیسر یونس صاحب کے بعد علاقہ کے مشہور
شاعر اور سوشیل ورکر جناب جلیل ساز صاحب کو آواز
دی گئی ہے۔ جلیل ساز صاحب حسبِ معمول آج بھی کامیاب
ہیں اور ایک بار پھر سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دے
رہے ہیں ان کے یہ شعر بے حد پسند کئے گئے ؎

آمادہ ہیں کہ ڈھائیں بنا لا الٰہ کی
[illegible] تاب یہ مجال یزیدی سپاہ کی
گم ہو گئے تھے جس میں شہیدوں کے قافلے
دُنیا کو جستجو ہے اسی گردِ راہ کی
[illegible]بار، واستقامت و قربانی و خلوص
[illegible]سرخیاں ہیں آپ کے فکر و نگاہ کی
[illegible]ے ساز جبر و ظلم سے گھبرائیں کس لئے
ہم جب پناہ میں ہیں رسالت پناہ کی

ساز صاحب محفل کو گرما گئے ہیں اب ناگپور کے ایک
اور بزرگ شاعر صوفی زین العابدین عابد کو زحمت
دی جا رہی ہے عابد صاحب کے دو مصرعے درج کئے
جاتے ہیں ؎

جانِ عزیز نذر کو لائیں گے اہلِ بیت
شبنم سے ڈھل رہی ہے زمیں قتل گاہ کی
یاد آ گئے ہیں شاہِ شہیدانِ کربلا
دُنیا لٹی ہے جب بھی کسی بے گناہ کی

اب مشاعرہ کے دو شاعر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر
منشاء الرحمٰن خاں منشا اور مشاعرہ کے کنوینر حضرت
شاطر حکیمی۔ سامعین کی تعداد اس وقت بھی اچھی خاصی
ہے اور ایسا بہت کم ہوا ہے۔ اس وقت ساڑھے تین
بج چکے ہیں اور رات کافی سرد ہو چکی ہے۔
لیجئے! اب ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشا صاحب سے
درخواست کی جا رہی ہے۔ کوئی سمیلن کی محفل ہو یا
بزمِ مشاعرہ دونوں جگہ منشا صاحب سامعین سے داد
وصول کر لیتے ہیں آج بھی وہ حسبِ معمول کامیاب ہیں
ان کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

جب تک چمک دمک ہے حسیں مہر و ماہ کی
باقی رہے گی شان تری جلوہ گاہ کی
باطل کو اپنا زورِ شجاعت دکھا دیا
آئی نہ جب نظر کوئی صورت نباہ کی

منشا صاحب خوش و خرم اپنی جگہ واپس آ گئے ہیں
اور اب مشاعرہ کے آخری شاعر اور کنوینر شاطر حکیمی صاحب
کو زحمت دی جا رہی ہے۔ قبلہ شاطر حکیمی صاحب
مصرعہ "حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری" کے ہر لفظ کا
قافیہ بنا کر مسدس کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔
نظم کے تمام بند خوب ہیں اور شاعر کی مشاقی کا ثبوت
ہیں۔ نظم کے دو بند آپ کی خدمت میں پیش ہیں ؎

اٹھا کے دیکھ کتاب پیام شبیری
رہے گا تا بہ قیامت مقام شبیری
حریف گردش دوراں ہے جام شبیری
سرور و کیف کا حاصل ہے نام شبیری
حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی
حسن کا عزم قوی ہے مقام شبیری
ضیائے قلب علی ہے مقام شبیری
فروغ دین نبی ہے مقام شبیری
تجلی ازلی ہے مقام شبیری
حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

اور اس طرح یہ طرحی کل ہند مسالمہ بھی گزشتہ طرحی مسالموں کی طرح بحسن و خوبی اختتام کو پہنچا ثقلین حیدر نے اراکین مسالمہ کمیٹی کی جانب سے تمام بیرونی و مقامی شعرائے کرام اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اپنے مخصوص انداز میں مندرجہ ذیل الفاظ میں مسالمہ کے اختتام کا اعلان فرمایا ۔

• یہ مسالمہ آئندہ سال کیلئے ملتوی کیا جاتا ہے ۔

دوستی

(قطعات)

یوسف ثانی سلیمانی ۔ پا

شاعروں نے کہی نہیں ثانی
آج تک اس سے بہترین غزل
خوبیاں خوبیوں کی ہیں اس میں
دوستی روح کی حسین غزل

یہ نہ بدلی کبھی نہ بدلے گی
کون ہے جس کو اعتراف نہیں
دوستی ایک ایسا رشتہ ہے
جس میں دیکھا نہ اختلاف کہیں

آئینہ دوستوں کا دوست ہو
دوستی آئینہ ہو دوست کا
زندگی میں وہ بات پیدا کر
زندگی آئینہ ہو دوست کا

ڈھونڈ اپنے لئے جو مل جائے
اک عدد بہترین دوست یہاں
دو اگر مل گئے تو زیادہ ہیں
اور مصیبت ہیں تین دوست یہاں

ایک مدت سے ڈھونڈتا ہوں اسے
وہ ابھی تک مجھے ملی نہ کہیں
ہے ارسطو یہ تیرا قول صحیح
صاحبو! دوستی کہیں بھی نہیں

ہے جو ثانی کی تجھ کو چاہ عزیز
صبر کر اتنا جلد باز نہ ہو
دوستی اس سے کر مگر پہلے
کھا نمک اس کے ساتھ پانچ کلو

غزل

زیڈ۔ اے۔ ہلال سناودی

منزلِ عشق میں پناہ نہیں
گام زن عام ہوں وہ راہ نہیں
ہائے کیا وصل کیا سوال و جواب
اب نظر میں وہ جلوہ گاہ نہیں
بے حجاب آ بھی جا عیادت کو
دیکھ ظالم یہ کچھ گناہ نہیں
میرے ظلمت کدہ کا تو ہے چراغ
خوش نصیب اتنے مہر و ماہ نہیں
برق گر شوق سے نشیمن پر
نقشہ نظروں سے تو تباہ نہیں
میری ہو جائیں سب دُعائیں قبول
یارب ان کی وہ بارگاہ نہیں
کوئی کہہ دے کہ دیکھو وہ ہے ہلالؔ
اُن کی شاید ادھر نگاہ نہیں

غزل

مونسؔ اعظمی

بن اُن کے ہر شام دھواں ہے
سُونا سُونا مرا مکاں ہے
دُکھ تو یہی ہے اُن کے دل میں
کوئی نہ میرا نام و نشاں ہے
میرا نشیمن پھونکنے والے
تیرے دل کا چین کہاں ہے
بڑھتے ہوئے جس راہ پہ جائے
رستہ وہی منزل کا نشاں ہے
اُن سے وفا کی کیسی توقع
سینے میں اُن کے دل ہی کہاں ہے
دو کشتی پہ بیٹھنے والے
پار اُترنا سب پہ عیاں ہے
ہجر کا عالم کیا پوچھتے ہو
ویرانہ مونسؔ کا جہاں ہے

تضمین (بر غزل اُستادی زار علامی)

لذت لعل گردھر (بری وال منڈی)

آہِ سوزاں کارگر ہونے لگی
تھی تو انہونی، مگر ہونے لگی
وہ نگاہِ ناز ادھر ہونے لگی
"آبروئے چشمِ تر ہونے لگی
بوند پانی کی گہر ہونے لگی"

وقعتِ خونِ جگر ہونے لگی
نابِ گل تابندہ تر ہونے لگی
چشمِ نرگس دیدہ ور ہونے لگی
"ہر کلی آتش نظر ہونے لگی
فصلِ گل اب معتبر ہونے لگی"

نوریز داں جلوہ گر ہونے لگا
ذرّہ ذرّہ دیدہ ور ہونے لگا
غافلِ حق، حق نگر ہونے لگا
"جب سے عرفانِ نظر ہونے لگا
آئینہ میری نظر ہونے لگی"

راہ کی دشواریوں سے بےخبر
عزمِ نو لے کر اُٹھے ہیں راہبر
وسعتِ کونین ہے پیشِ نظر
"دیکھئے اب کون سی منزل ہو سر
جستجو گرمِ سفر ہونے لگی"

دَیر و کعبہ میں یہ طوفاں کس لئے؟
یہ ٹھکانے سر بداماں کس لئے؟
فرقِ قدرِ نوعِ انساں کس لئے؟
امتیازِ کفر و ایماں کس لئے؟
اے نظر کیوں کم نظر ہونے لگی؟

آگیا ہے کیا مقامِ بےحیگوں ؟
گم ہوئے جاتے ہیں اوسان و سُکوں
خضرِ دانش بھی جہاں ہے سرنگوں
کن مراحل پر اب آپہنچا جنوں
دل کی دھڑکن تیز تر ہونے لگی

شفقتِ اُستاد کا ہے یہ اثر
سنگ ریزہ بن گیا رشکِ گہُر
کوردیدہ پر کھلے دانش کے در
"زارؔ فیضِ سحر سے میری نظر
محرمِ عیب و ہنر ہونے لگی"

غزل

سوہن راہی (لندن)

مرے ویران خوابوں کو، کوئی منظر بہاری دے
کوئی خوشبو کی نعمت دے، کوئی رنگوں کی کیاری دے
شجر نیندوں کے اُجڑے، اب کوئی خوابوں کی ڈاری دے
سکوتِ حال کو کچھ تو، ہوا کی بےقراری دے
سفر میرے لہو کا تھم گیا، دھڑکن کی وادی میں
مرے جذبوں کو منزل کے جُنوں کی آشکاری دے
صداؤں کے صحیفے زندگی کے زخم گنتے ہیں
مری تہذیب کے ننگے چلن کو پردہ داری دے
یہ لفظوں کے تیشے نہ اُتارو میرے سینے میں
دکھی لمحات کو اب اور نہ تو سنگ ساری دے
مرے ہونٹوں کے غنچوں پر آجائے کرذرا رقصاں
مرے دل کی تپش کو اے خدا کچھ سحر کاری دے

غزل

دلشاد علیگڑھی (دہلی)

عارضی ہے رہی رہی نہ رہی
یہ خوشی ہے رہی رہی نہ رہی
موت سے رشتۂ محبت دیکھ
زندگی ہے رہی رہی نہ رہی
تو اندھیروں سے رسم و راہ نہ توڑ
روشنی ہے رہی رہی نہ رہی
دشمنی بھی تو ایک رشتہ ہے
دوستی ہے رہی رہی نہ رہی
اپنے دامن کو تار تار نہ کر
بےخودی ہے رہی رہی نہ رہی
اُن سے اُلفت بھی اب تو اے دلشاد
نام کی ہے رہی رہی نہ رہی

حفیظ بقلم خود

مرحوم ابوالاثر حفیظ جالندھری آخری عمر میں اپنے شعری مجموعوں میں بقلم خود کے عنوان سے اپنے اور اپنی شاعری کے متعلق کچھ باتیں کرنے لگے تھے۔ درحقیقت انہیں احساس تھا کہ وہ چراغ سحری ہیں اپنے نظریاتِ فن اور اپنے متعلق حساب صاف کردیں۔ ذیل میں ہم ان کے اولین مجموعہ نغمہ زار کے ایک بقلم خود کا اقتباس پیش کر رہے ہیں۔

مَیں سات برس کا تھا۔ اُردو شعر کی رنگارنگی میرے کانوں تک ابھی صرف اس قدر آسکی تھی کہ مدرسے آتے جاتے ایک بازار سے لازماً گزرتے ہوئے مہین سُروں میں ایسے بول تننے پڑتے تھے "آیا کرو ادھر بھی مری جاں کبھی کبھی۔ نکلیں ہمارے دل کے بھی ارماں کبھی کبھی" ع —
یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی —
ع — "نہ جا غیر کے گھر زمانہ بُرا ہے"

ہمارے شہر میں آریہ سماج والے نگر کیرتن کیا کرتے دیاکھیان دیتی ہوئی دوسرے مذاہب کا کھنڈن کرتی ہوئی ہندی پنجابی بھجنوں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ اُردو میں بھی کچھ سناتیاں سناتی گاتی بجاتی ٹولیاں بازاروں میں سے گزرتیں مجھے اب تک ایک بول خدا جانے کیوں یاد ہے جسے میں نے ایک مُنڈے ہوئے سر کے پیچھے اوپر سے نیچے کو لٹکی ہوئی چٹیا اور گھٹی ہوئی ٹھوڑی پر جھکی ہوئی "پاجامہ نما" مونچھوں والے بھجنیک سے سُنا تھا۔

گر دل سے جب برہمچاری آئیں گے
مکے میں جا کے آریہ مندر بنائیں گے

مُسلمان میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے۔ بزرگ حصولِ ثواب اور بچے شیرینی وصول کرنے اور دھتم مچانے اور گھر لے جانے کے لئے موجود ہوتے۔ عربی، فارسی پنجابی کے ساتھ اُردو نعت خوانی بھی شروع ہو گئی تھی۔ ان نعتوں کے چند مصرعے مجھے یاد ہیں۔

ع "یہ اُمت تمہیں بخشوانی پڑے گی" اور
ع — "احد سے ہوگیا احمدؐ جو باندھا میم کا پٹکا" اور
ع — "محمدؐ سِرِّ وحدت ہے کوئی رمز اس کی کیا جانے" اور
ع — "نوحؑ کا بیڑا پار لگایا کھیون ہار محمدؐ نے"۔ یا

مشہور مناجات "تری شان ہے اکبری سروری مری بار کیوں دیر اتنی کری"

یہ باتیں میری سمجھ سے بلند تھیں اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ میرے نصاب کی نظمیں دوسرے موزوں بول جو سمجھ میں آئے بغیر کانوں کو بھلے لگتے ہیں ان کو مجھ ایسے انسان ہی گھڑتے ہیں یہ بھید مجھ پہ اچانک کھلا اس طرح کہ ایک دن میں چند ہمجولی لڑکوں کے ساتھ گیند بلا کھیل کر گھر پلٹ رہا تھا۔ سرِ راہ ایک حویلی کے صحن میں بہت سے

لوگ جمع ہائے واہ وا۔ ہائے ہائے مار ڈالا کا شور سن کر ہم بھی جا گھسے۔

محفل کے درمیان ایک مردِ معقول "یہ بخشا" کی بولی میں جو مجھے مسجد میں رٹائی جا چکی تھی۔ ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ سنا رہا تھا۔ سننے والے واہ کبھی واہ سبحان اللہ ہائے ہائے خوش گفتی در شفتی کہتے سر ہلاتے زانوؤں پر ہاتھ مارتے اور لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔

بے اختیار ہنسی چھوٹی بہن اور میرے ساتھی بیچ میداں کود کر وہی حرکتیں کرنے لگے جو دوسرے بڑے بوڑھے کر رہے تھے۔ لیکن فوراً "چپتیائے" اور "دھکیائے" گئے۔ تھپڑ مارنے سے میری نکسیر پھوٹ گئی مگر اس پٹائی کے باوجود ہم اپنے گھروں تک کرتی ڈر ستی ہائے مار ڈالا کی مہارانی سے باز نہ آئے۔

گھر پر والد نے سوجا ہوا منہ دیکھ کر چپڑ غنڈ کیا ہوتا لیکن دادا آڑے آگئے اور دادا ہی کی تقریر سے پتہ چلا کر وہ "کریما بہ بخشا" کی بولی بولنے والا فارسی کا ایک بڑا شاعر ہے جالندھر ہی کا رہنے والا ہے ہمارے دوست شیخ سکندر بخش کا بیٹا ہے بچپن میں سب اسے مست کہتے تھے۔ "تکیں جوٹا کرتا تھا، اب دیوان حافظ" کی ٹکر کا ہے۔ ماں باپ نے غلام قادر نام رکھا تھا گرامی خود بن گیا ہے۔ تمہارے باپ کا ہم مسجد تھا اب دکن کے بادشاہ کے دربار میں رہتا ہے کبھی کبھی جالندھر آتا ہے۔ بے فکرے وکیل وکلا اور فارسی کے عالم علماء محفل جماتے ہیں اس کی فارسی سن کر واہ وا کرتے ہیں، دیکھا دیکھی اور لوگ بھی تکیں جوڑنے لگے ہیں گو تو برجی کہاں راجہ بھوج کہاں گنگا تیلی۔

دادا نے یہ لمبی گفتگو خالص پنجابی میں فرمائی تھی جس کا بھونڈا خلاصہ میں نے اردو میں لکھ دیا ہے۔

سند رہے کہ یہ عرفان (یا گیان) جو مجھے ۱۹۰۷ء میں اپنی عمر کے ساتویں برس کسی پیڑ تلے آنکھیں بند کرکے سمادھی لگانے سے نہیں محض ایک محفلِ مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بغیر اذن جا گھسنے سمجھ میں نہ آنے والی بولی پر داد دینے والوں کی نقلیں اتارنے اور تھپڑ کھا کر پھوٹی نکسیر لئے ہوئے نکالے جانے پر ہوا تھا —— اس عرفان کے دوسرے تیسرے دن گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کاٹھ کی تختی کی مشق اور خوشخطی کی کاپی پر میری پہلی نظم منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوئی جس کو میں دوسرے دن مدرسے لے گیا تو ہم جماعتوں کو بڑے فخر سے سناتا ہوا پکڑا گیا مولوی فتح دین سے چانٹے کھائے اور اپنی شاعری کی پہلی داد یوں پائی ("اوئے کھوتیا کتھوں نقل کرلیا ہے کیا تیرے باپ نے بھی کبھی شاعری کی تھی")

یہ نظم اردو نصاب کی اکثر نظموں کی بحر میں اچھی خاصی لمبی تھی اور اس میں وہ تمام خیالات و جذبات تھے جو میری طفلی نے اب تک اخذ کئے تھے، نظم جس دن میں گم ہو گئی مزید لکھنے کا شوق بھی پٹائی کے خوف سے دم سادھ گیا صرف دو بیت یاد ہیں، الفاظ غلط سلط ہیں تو کیا ہوا واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ میری منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

محمد کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا کبھی پار
محمد حفیظ نے بنائی غزل
خدا کا ہے اس وقت اس پر فضل

سات برس کی عمر میں یہ خیالات اور ان کے اظہار کے لئے اردو کیوں آ موجود ہوئی ان امور پر اس دور کے معاشرے میں پنجاب کے مسلمانوں کی زندگی سے باخبر نقاد کے سوا کون روشنی ڈال سکتا ہے۔ اس بیان پر اکتفا کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں کہ ترکِ شعر گوئی نے بخوفِ سرزنش نظم ہو یا نثر اردو میں جو کچھ ہاتھ آیا سمجھ میں آئے یا نہ آئے پڑھنے لگا۔ میلوں ٹھیلوں کی تقریبوں پر دوسرے قصبات میں میں نے مطبوعہ اردو کہانی کہاں سے کہ

یہ کہانی طولانی ہے مختصر یہ کہ پڑیاں باندھنے والے کاغذ تک
بغیر پڑھے نہ چھوڑتا ۔ کہیں سے ایک پھٹی ہوئی جلد
طلسم ہوش رُبا کی مل گئی چھپا کر ہتھیا لایا مدرسے کا ۔۔۔۔
پڑھنا ڈٹنا خیال سے کھسکا" بستے میں باندھ کر گھر سے
اسکول کے لئے نکلتا اور ایک تالاب کے کنارے امیر حمزہ کے
کارنامے اور عمر عیار کی عیاریاں پڑھا کرتا۔ اس دفتر بے پایاں
کی جلدیں بھی گھر سے پیسے چرا کر منگائیں مدرس حائل ہو
گئی تھی۔ پڑھتا اور خواہ مخواہ روتا اسکول میں اُردو فارسی
کے سوا سب مضامین میں صفر ثابت ہوتے چلے جانے کے
سبب پٹنا غیر حاضریوں کا پتا چلنے پر ابا اماں کے ہاتھوں
مرمت ہوتی ۱۹۱۱ء میں چھٹی جماعت میں تھا کہ عشق
کا پہلا اور شعر گوئی کا دوسرا وار مجھ پر ہوا ۔۔۔۔
اب سنبھل نہ سکا۔ بُت ہرجائی پر بس نہ چلا اپنی جان
پر اور غزل پر مشقِ ستم جاری کی ۔۔۔ اصلاح کے لئے
جالندھر میں اپنے سے بہتر نہ پایا۔ دیوان داغ اور
دیوان امیر مینائی حاصل کئے گھر کی جمع جتھا اُڑا کر لاہور
امرتسر ہی نہیں دہلی میرٹھ، مراد آباد بلکہ بمبئی تک بھاگ
دوڑ شروع ہو گئی۔ اکثر دست بدستے پلٹتا پلٹتا ہوا
مدرسے کی سمت چلتا نظر آتا آخر بھاگ جانا غالب آ گیا
ساتویں کا امتحان دے کر نتیجہ سننے نہیں گیا سُنا ہے ۔
پاس ہو گیا تھا۔

بے اُستاد کہلانے کے خوف سے اُستاد پکڑنا
ضروری تھا حضرت گرامی کا پتہ دریافت کر کے دو غزلیں
طفلانہ درخواست کے ساتھ دکن ارسال کیں جواب آیا
گرامی فارسی کا شاعر ہے اُردو سے بہرہ ور نہیں حفیظ گرامی
کے وطن کا جوہرِ قابل معلوم ہوتا ہے، حفیظ کو چاہیئے
اپنا کلام اپنی ہی ناقدانہ نظر سے بار بار دیکھے اُستادی
ردی کے پھیر میں نہ پڑے ۔"

میں نے اس ارشاد پر عمل کیا (اب تک کر رہا ہوں
[redacted]یات کا ایک نسخہ لاہور سے خرید منگوایا بار بار پڑھا
[redacted] اور شاعر بھی پڑھ ڈالے چند دوستوں سے مل کر جالندھر
میں اُردو مشاعرے کی بزم قائم کی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ
جناب بشیر خاں رعنا اور غازی آباد میں مدرس رہ چکے
والے سید محمد آذر بھی شامل ہوا کرتے میاں محمد جان
کی حویلی میں مشاعرے ہوتے لدھیانہ سے فیاض ہریانوی
کپور تھلہ سے مسرور آتے جو اپنے والد رنجور تلمیذ داغ
کا کلام سُناتے میں کسی کا شاگرد ہونے کے بجائے جالندھر
میں بہتوں کا بھلا کرنے کے لئے اُستاد بن گیا تھا اسکول
کے چند طالب علم اصلاح لیا کرتے مولوی اصغر علی احسن
ایم اے (مرحوم) اور مولوی فخر الدین ناطق (مرحوم)
مجھے کلام دکھائے بغیر مشاعرے میں نہ سناتے۔

پہلی جنگِ عظیم میں لاہور سے اُردو اخبار آنے
لگے تھے میرے والد ایک اخبار وطن منگانے لگے۔ اردگرد
لوگ بیٹھ کر پڑھتے اور سُنتے اور انگریزوں کے خلاف
گپ ہانکنے کی پاداش میں گندھک اور قلمی شورے کے
فروخت کے لائسنس اور ہزار ہا کا مال بھی ضبط ہو
گیا پولیس اور فوج میں وردیوں اور بارود کے ٹھیکے
بھی منسوخ ہو گئے۔

ہیضہ اور پلیگ سے میرے بھائیوں بہنوں کی
جوانا مرگیاں۔ گھر میں بیوہ بہنوں اور بھاوجوں کی
بے چارگیاں۔ اب یہ ضرب کاری ۔۔۔ والد شکستہ، گھر تباہ
برباد لیکن میں قافیہ ردیف کی دنیا میں آباد ۔۔۔
مجھے میرے والد کے لکھ پتی ماموں رانا کرم بخش خان نے
متبنیٰ کر لیا تھا، لہذا لاڈلے کو خزانہ مل گیا تھا۔
بھگوڑا ابھی تھا کھلنڈرا بھی۔

بعد ازاں یہ نہیں کہ مجھے کھانے کے ساتھ کمانے کا
احساس نہ تھا لیکن ساتویں جماعت تک تعلیم کمسنی اور
ردیف قافیے ملازمت کے سفارش نہ بنے تجارت کرنے
سوجھی کرم بخش خان کی بڑی بھاوجہ (دادی اماں
جس نے مجھے متبنیٰ بنا رکھا تھا) کا زیور فروخت کیا:
خوشبویات کی دکان کھولی جو عشق و محبت کی دکان ثابت
اصلاح لینے والوں کا ہجوم اور شاعروں کا جمگھٹ رہ

لگا رنگ رنگ کے حسین صورت لوگ عطر اور لونڈر کی قیمتی شیشیاں مسکرا مسکرا کر اٹھالے جانے لگے گرمی بازار ایسی بڑھی کہ دکان سرد ہوگئی، بڑھانی پڑی اس دکان کے آخری دنوں کی یادنت پنڈت ہری چند شرما آخر میں جن کی جنم پتری ہیں پر وہتوں نے مجھ سے اصلاح سخن لینے کے بہانے میرا دوست شاگرد اور میری سپر بنا لکھ دیا تھا۔

عطر کی دکان اُڑ گئی تو اپنے پرائے سب مجھ سے مایوس ہوگئے۔ لیکن میری ماں کو نہ جانے کیوں میرا علاج سوجھ گیا اس نے میری خالہ کی لڑکی کو دلہن بنا کر میری جھولی میں ڈال دیا شادی کے ساتویں دن میرے والد نے نئی دلہن سمیت مجھے گھر سے نکال دیا —— میں والدہ روسگی بہنوں اور اپنی دلہن کو ساتھ لے کر کرائے کے مکان میں اُٹھ گیا۔ اسی دن سے شاعری کے ساتھ روٹی کمانے کی پنچ بھی لگ گئی۔ میری ماں نے مجھے احساسِ ذمہ داری کے کھونٹے سے باندھ دیا تھا وہ دن اور آج کا دن ہے کہ برابر معیشت کی چکی پیس رہا ہوں رانا کرم بخش کی حویلیاں زمینیں بنگلے جس طرح ٹھکانے لگے بعد کی طولانی کہانی ہے۔

اب روحانی شاعری کے ساتھ میں جسمانی مزدوری میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک دنگل ہوا۔ کمشنری جالندھر کے پانچ ضلعوں سے شاعر کشتی لڑنے آئے آریہ اینگلو ورنیکلر اسکول کے ماسٹر گوپال داس کی انگیخت پر طرحی غزل اور متعین مضمون پر ایک نظم راتوں رات میں نے لکھی ماسٹر جی مجھے میرے گھر سے اپنے ساتھ دنگل میں لے گئے ہیں۔ ایک سادہ پتلا دبلا لڑکا بھاری بھرکم شاعروں کے مقابلے میں اکھاڑے کے اندر اترا۔ میری عمر اور وضع پر سب ہنسے لیکن میں فسانہ آزاد کا صف شکن بیڑا نکلا اول انعام سونے کا تمغہ دوسرا انعام سو روپے دونوں مجھی کو مل گئے۔ گوپال داس جی کی قیادت میں پنڈت ہری چند کے ساتھی طلبہ مجھے کندھوں پر اٹھا کر شہر کے بازاروں میں دھائی دیتے پھرے۔

اب میں تمغہ یافتہ شاعر ہوگیا مگر شاعر برادری بے استاد اکہتی تھی خوش نصیبی سے حضرت گرامی دربار دکن سے وظیفہ لے کر وطن آگئے۔ میں غازی رحمت اللہ (حمید جالندھری مالک مکتبہ کارواں کے مرحوم والد) کی معیت میں مٹھائی اور پیازی رنگ کی ایک پگڑی پر پانچ روپے رکھ کر ملک الشعرا فارسی کے حضور ... دو زانو ہوا۔ اب بے استاد نہ رہا مرحوم اصلاح کی بجائے شعر سہل ممتنع بنانے اور بار بار خود غور کرنے پر زور دیتے رہے۔ فرماتے میاں تقلید نہ کرو، اپنے قلب کو چیرو، اپنی ذات کو باہر لاؤ۔

جنگ عظیم ختم ہوگئی خلافت اور کانگریس کا زور شور ہوا میں نے ایک نظم ڈاکٹر سیف الدین صاحب کچلو کی فرمائش پر جالندھر کے ایک بہت بڑے جلسے میں پڑھ ڈالی تیسرے دن امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا یہاں بھی پکڑ دھکڑ ہوئی پولیس نے مجھے تین دن حوالات میں رکھا پھر پانچ مہینے لاہور کے بورسٹل جیل یعنی سسرال میں پھینکا اس کے بعد کم سنی اور شاعری کے الزام میں چھوڑ دیا

ع محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا

میری فردِ عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

گھر سے باہر رہنے کا شوق تھا سنگر مشین بیچنے کی نوکری کر لی اڈا کاڑہ چلا گیا منٹگمری قریب تھا وہاں مشاعرے ہوتے تھے میں بھی سو کام چھوڑ کر پہنچتا، یہیں پہ ملاقات جناب نشتر جالندھری سے ہوئی وہ منٹگمری ساہیوال میں گوروں کو ہندوستانی پڑھاتے تھے۔ ان سے تعلق بھی غزلوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اقبال، آغا شاعر دہلوی کے کلام پر لکھی ہوئی تنقید دے دے کر ہم نو مشقوں کو مرعوب کیا کرتے تھے لاہور سسرال کی وجہ سے آنا جانا رہتا ایک مشترک ہمسن حمید بدر کی قیام گاہ پلیزنٹ ہاؤس میں قیام پذیر سالک بٹالوی سے وہاں نیاز کا شرف ملا وہ

"اور" "تہذیبِ نسواں" سے منسلک تھے۔ اس وقت ایک شمع کے دو پروانوں کی مُٹ بھیڑ کتی مقابلے میں دَر رہنے کے لئے میں نے دو تین غزلیں سُنائیں اس طرح دیرینہ مراسم کی داغ بیل پڑ گئی بقول داغ ــــ ع

تم سے تو کوئی واسطہ نہ رہا
اب طبیعت رقیب پر آئی

سید امتیاز علی تاج کی نام نہاد ادارت میں سالک صاحب کی نگرانی میں ایک ادبی رسالہ "کہکشاں" نکلتا تھا۔ مَیں نے اُسے سنگر مشین کی ملازمت کے دنوں میں اپنے نام جاری کرالیا۔ یہ بہترین صحیفہ جلد بند ہو گیا سالک صاحب کو حضرت مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کے لئے چُن لیا۔ مجھے بھی شعر کے شوق نے مشین سے بہت جلد بے دل کر دیا۔ نوکری چھوڑ دی۔ جالندھر سے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی دُھن سمائی مرحومہ دادی اماں سے وراثت میں ملے ہوئے مکانوں میں سے ایک مکان چپکے سے گروی کر دیا۔

استادِ گرامی صاحب سے حکیم اجمل خاں (مرحوم) لانا عبدالحلیم شرر کے نام تعارفی چٹھیاں لے کر دہلی عنوٴ اور شعر و ادب کے دوسرے مراکز میں مشاہیر سے ّدعائے تعاون نکلا مضامین اور وعدوں کے بوجھ لدا ہوا پلٹا۔ لاہور علامہ اقبال کی خدمت میں حضرت ، کی سفارش لے کر گیا۔ مصوّرِ مشرق جناب چغتائی ب سے بھی شناسائی ہوئی میرے لنگوٹئے چودھری ن علی (کھوسٹ) جو اُن دنوں میو اسکول آف آرٹس صوری سیکھتے تھے۔ وسیلہ بنے۔

مارچ ۱۹۲۱ء میں رسالہ "اعجاز" جالندھر ری ہو گیا۔ لیکن ایک مہمان شاعر پنڈت نفرسو بازی مد کو آئے تھے میرے صندوقچے کو روپے کی سے پاک صاف کر کے غائب ہو گئے اس لئے ز" نے پانچ مہینے کے بعد دم توڑ دیا۔ تاہم میرے اعجاز ہی تھا۔ کیوں کہ اس کے طفیل مجھے بہت سے

مشاہیر حضرات شررؔ، صفیؔ، عزیزؔ، یگانہؔ، شوقؔ، قدوائیؔ، ہوشؔ بلگرامی، آثرؔ، جگرؔ، جوشؔ، بیخودؔ، ناصرؔ، نذیرؔ، فراقؔ، کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مکان کا گروی رکھنا کب تک مخفی رہتا والد نے میری بیوی اور شیر خوار بچّی کے سامنے میرے سَر کو جوتوں سے نوازا اور میری والدہ کو شوہریت کے دعوے سے واپس گھر لے گئے۔ اب کے بہت شرم آئی مَیں اپنی بیوی کو اس کے میکے میں لاہور چھوڑ کر پیدل کشمیر چلا گیا۔ کشمیر کا یہ سفر ۱۲ جون ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ "رزم نہیں بزم" ایک کتاب حال ہی میں شائع کی گئی ہے جس میں آزادیٔ کشمیر پہ میری تمام نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کا دیباچہ بعنوان وصیت دیکھ لیجئے۔ وہاں حکیم فیروز طغرائی مل گئے چند روز غزل خوانیاں رہیں جیب خالی مگر حُسنِ نظر سے لبریز واپس لاہور پلٹا۔ فاخر ہریانوی جو میری شاگردی کا دم بھرتے تھے اب جالندھر سے آکر یہاں کالج کے طالب علم تھے۔ ایک مشاعرے میں لے گئے لاہور میں شعر سُنانے کے خیال سے مجھ پر کپکپی طاری تھی۔ پروفیسر اور ایڈیٹر شاعروں کا مجھ پر بڑا رُعب تھا۔

اس مشاعرے کے صدر میلا رام وفاؔ اور ان کے ساتھ ایک بڑے موٹے شاعر تشریف فرما تھے۔ مجھے عین ان کے پیچھے بنچ پر جگہ ملی۔ سامنے زیادہ تر کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ تھے۔ اردو کے پنجابی نومشقوں میں میرا نام بھی پکارا گیا۔ جی کڑا کر کے ایک غزل "تحت اللفظ" سُنائی اور بنچ پر دبک گیا۔ ایک اور، ایک اور کا شور ہوا، مَیں نے ان بڑے موٹے شاعر صاحب کو یہ فقرہ صدر کے کان میں کہتے اپنے کانوں سُنا "حرامزادہ چھا گیا ہے"۔

یہ ایک نامور شاعر کی طرزِ سخن تھی۔ ان کا تخلص تاجور تھا۔ مولانا بھی تھے مجھ پر چھایا ہوا سارا رُعب اتر گیا دِل نے کہا حفیظ: "لوگ تو کچھ بھی نہیں ہیں"۔

گالی کے ساتھ "چھا جانے کی داد"، مجھے وہیں ختم کر دیتی اگر سر شیخ عبد القادر، حکیم احمد شجاع اور جناب چغتائی ایسے مربی شروع ہی میں نہ مل جاتے۔ اگر پطرس بخاری، سید امتیاز علی تاج، حضرت سالک و مہر، نشتر و میکش مجھے بزم شماصان ادب کا رکن نہ بنا لیتے۔ سید احمد شاہ بخاری پطرس کے برادرِ خورد ذوالفقار علی بخاری میرے شاگرد ہو گئے۔ ان سب کا مذاقِ سخن حوصلہ افزائی اور نقادانہ نگاہ میری ترقی کا باعث ہے۔ دراصل مجھے دوسروں کو اصلاح دینے کی مشقِ استادی نے شاعر بنا دیا۔

یہ مراسم ہوئے تو میں نے اپنے دل سے پوچھا۔ کیا مشاعرے پر محض پرانی طرز کی غزل سے چھا جانا کافی ہے۔ دل نے کہا ہرگز نہیں اب تو سخن فہموں میں باریاب ہے اب "کچھ اور چاہیئے وسعت" ترے "بیاں کے لئے" گرامی کی یقین یاد آئی۔ تقلید نہ کر اپنی ذات کو باہر نکال۔

سوگوار، ممناتی ہوئی بے ثبات فرسودگی کے بجائے میں نے شگفتگی کو اپنا فن بنانے کی ٹھانی لاہور میں جم گیا۔ شباب اردو، ہزار داستان، نونہال، تہذیب نسواں، پھول کے علاوہ بہت سے اداروں میں قلم کی چکی پیستا ہوا میں اربابِ علم کے مشاعروں اور لاہور کے سخن سنج و سخن فہم حلقوں میں در آیا ۔۔۔ اب لیجیو، پکڑیو، جانے نہ دیجیو کا شور اٹھا اس لئے کہ ان دنوں زندہ دلی کی اس سرزمین پر "آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے"، والوں کا تسلط تھا اور جب تک "ناتواں دیکھا کئے" کی غلامی کا حلقہ کان میں نہ ڈال لے پنجاب کا کوئی اردو شاعر یا ادیب ملک سخن کا شہری کہلانے کا حق دار نہ تھا۔

اس طرح لاہور میں ۱۹۲۲ء کی آخری سہ ماہی سے میری شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا۔ آپ کو "نغمہ زار" میں میری عمر کے ۱۲ برس سے ۲۲ برس تک کی مشقِ غزل کے نمونے ملیں گے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کی نظموں اور غزلوں کی بھی آپ دیکھیں گے میں نے محض پس منظر بیان کر دیا ہے

ساتھ ہی ہر غزل ہر نظم کے نیچے اس کا "سنِ پیدائش" درج ہے تاکہ میری موت کے بعد قلم اٹھانے والے ناقد کو میرا آغاز و انجام بتاتے وقت الجھن نہ ہو۔

چغتائی صاحب کے قدر دان تاثیر سے میری ملاقات "نغمہ زار" کی اشاعت کے بعد اس وقت ہوئی جب اہلِ زبان نے باقاعدہ لام بندی اور اعلانِ جنگ کے ساتھ مجھ پر دھاوا بول رکھا تھا چونکہ یہ معاصرانہ معرکہ آرائی "نغمہ زار" کے بعد کی داستان ہے اس لئے اس کا تذکرہ نغمہ زار کی بجائے سوز و ساز کے تازہ اشاعت میں بقلم خود ہی کے زیرِ عنوان کر رہا ہوں لیکن اسی قدر جس قدر میری کاوشوں سے اردو شعر میں جو ترقی یا تنزل رونما ہوا اس کا پس منظر میرے قلم سے آپ دیکھ لیں گے ــ ••

حفیظ

۲۶ نومبر ۱۹۵۷ء

غزل

ڈاکٹر گوپال کرشن شفق پٹیالہ

عالم تو دیکھئے ذرا اُن کے شباب کا
جیسے ہو موجزن کوئی دریا شراب کا

کیا کہیئے اس کے حسنِ تبسم کی کیفیت
دیکھا تو ہوگا آپ نے کھلنا گلاب کا

جلوہ دکھا کے اس نے تو لوٹا قرارِ دل
بھاری پڑا ہے ہم پہ پلٹنا نقاب کا

کیوں بڑھ کے اس کے مصحفِ رخ کو نہ چوم لوں
لازم ہے احترام مقدس کتاب کا

ڈھائے گا سو قیامتیں توبہ کی خیر ہو
دورِ بہار میں یہ امڈنا سحاب کا

رندوں کی انجمن میں کیوں اے شیخ محترم
جھگڑا اٹھا دیا ہے ثواب و عذاب کا

بیداریوں ہیں نغمے دلِ بیقرار میں
چھیڑا ہو جیسے تار کسی نے رباب کا

محبوب وہ چنا ہے کہ جس کا نہیں جواب
کیا کہنا اے شفق ترے اس انتخاب

مطبوعاتِ اترپردیش اردو اکادمی

ادب کے نوبل انعام یافتگان	شری مراری سنہا	۷/۶۵
اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل	مرتبہ عابد سہیل مجلد	۶/-
انتخاب افسانہ		۶/۵۰
انتخاب قصائد		۲/۶۵
انتخاب مراثی دبیر	ڈاکٹر اکبر حیدری	۱۸/۵۰
نکمٹ کہانی	مرتبہ نورالحسن ہاشمی و مسعود حسن خاں	۲/۶۰
بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	۱۸/-
تنویر الشمس	اعجاز رقم منشی شمس الدین	۳/-
جدید ادب منظر پس منظر	سید احتشام حسین	۹/۵۰
جدید اردو تنقید، اصول و نظریات	شارب ردولوی	۲۵/-
جہانِ آرزو	انور حسین آرزو لکھنوی	۶/۸۰
رباعیاتِ انیس	مرتبہ محمد حسن بلگرامی	۴/۱۰
روحِ نظیر	مخمور اکبرآبادی	۲۰/۷۵
سخن دانِ فارس	مولانا محمد حسین آزاد	۱۲/۵۰
سُریلی بانسری	انور حسین آرزو	۵/۱۵
سیاسی نظریے	نورالحسن ہاشمی	۲/۲۰
غارِ سجھو نیڑی تک (بچوں کے لئے ناول)	غلام حیدر	۹/۵۰
قصیدہ نگارانِ اترپردیش	علی جواد زیدی	۱۸/۷۵
گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ	عشرت علی صدیقی مجلد ۱۲/۵۰، غیر مجلد	۹/۵۰
لالہ شاداب	مسعود اختر جمال	۵/۴۰
گنجینۂ تحقیق	سید محمد احمد بیخود موہانی	۱۰/۵۰
لکھنؤ کا دسترخوان	مرزا جعفر حسین	۷/۳۰
مرآۃ الشعر	عبدالرحمٰن	۱۳/۷۵
مضامین سجاد ظہیر	سید سجاد ظہیر	۴/۲۰
مونا وانا	مترجمہ اے۔ این سپرو	۶/۵۰
مطالعۂ اقبال		۵/۲۵
نظامِ اردو	انور حسین آرزو لکھنوی	۳/۱۵
نیا ساز نیا انداز	نازش پرتاپگڈھی مجلد ۱۸/۲۵	غیر مجلد ۱۵/۲۵

وجودیت پر ایک تنقیدی نظر	سلطان علی شیدا	۱/۲۰
دلی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی مجلد	۱۵/۸۵
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور غیر مجلد	۹/۷۵
فغانِ آرزو	انور حسین آرزو لکھنوی مجلد ۷/-	غیر مجلد ۵/۷۵
نشانِ آرزو	انور حسین آرزو لکھنوی ۶/۴۰	۵/۱۵
جاپانی کہانیاں	مترجمہ حامد اللہ افسر	۵/۲۰
مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	۵/-
اربابِ سخن	مولانا حسرت موہانی	۳/-
رباعیاتِ حالی	خواجہ الطاف حسین حالی	۳/-
آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	۹/-
کلیاتِ نعتِ محسن	مرتبہ محمد نورالحسن	۱۲/-
انتخاب مضامین علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	سر سید احمد خاں	۳/۷۵
ہندوستانی تہذیب	ڈاکٹر اقبال حسین	۴/۳۵
مبادی فلسفہ	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱۰/-
انیسیات	سید مسعود حسین رضوی ادیب	۶/-
نددیتوں کی بہار	رام لعل (مجلد) ۱۳/- غیر مجلد	۱۱/۸۰
متفرقاتِ آرزو	سید انور حسین رضوی آرزو	۳/۶۰
انتخاب کلام مصحفی	مرتبہ سید سلیمان حسین	۵/۸۰
انتخاب صبا	کاظم علی خاں	۴/۴۰
روسی کہانیاں	حامد اللہ افسر	۴/۴۰
سخن جوہر (انتخاب کلام محمد علی جوہر)	مرتبہ اختر بستوی	۴/۵۰
گلشن سے خزاں	قطب الدین باطن	۱۲/۲۵
انتخاب غزلیات نظیر اکبرآبادی	مرتبہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد	۵/-
انتخاب حالی	مرتبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۳/۶۰
انتخاب رشک	مرتبہ ڈاکٹر انصار اللہ	۳/-
انتخاب منیر شکوہ آبادی	مرتبہ جناب ریاض الدین	۵/-
انتخاب مرزا شوق	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	۲/۵۰
انتخاب مضامین رشید احمد صدیقی	جناب شہاب الدین ثاقب	۶/-
انتخاب ذکاء اللہ	ڈاکٹر اصغر عباس	۵/-

یومِ برق کا مشاعرہ

ڈاکٹر زار علامی
پٹیالہ

مصرع طرح :- زندگی نے لوٹا ہے موت کے بہانے سے

شان ہند، بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء میں عنوانِ بالا تحت ۱۹۵۳ء کے مشاعرہ کی روداد شائع ہوئی ہے ۔بں صرف 'شان ہند' ہی ایک ایسا جریدہ ہے جس میں ۔مدت سے مشاعروں کی روداد باقاعدگی سے شائع ہوتی ہی ہے۔

طالب دہلوی حضرت برق دہلوی کے معتمد اور ممتاز ندہ میں شمار ہوتے تھے۔ یوم برق پر طرحی مشاعروں کا ام انہیں کی زیرِ نگرانی ہوتا تھا اس مشاعرے کے کرتا دھرتا ی طالب ہی تھے۔ مصرع طرح جو تجویز کیا گیا تھا یہ ہے۔

زندگی نے لوٹا ہے موت کے بہانے سے

اس مشاعرہ میں یوں تو ملک کے کئی بزرگ شعرائے کرام دادِ سخن دی تھی مگر ہمارے سامنے صرف تین حضرات ہیں جن کے ارشادات اس مضمون کے محرک ہوئے۔ حضرت امن لکھنوی حضرت تلوک چند محروم۔ رت گلزار دہلوی۔

ں تو ہر مشاعرہ میں ناموزوں کلام پڑھنے والوں کی یں ہوتی لیکن تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شعر خلاف توقع اس قسم کے اشعار پڑھتا ہے بے شک کرنے والے کچھ بھی تاویلیں گھڑیں مگر ناموزوں ناموزوں ہی رہتا ہے اور متوقع شاعر کا وہ بھرم رہتا۔ مصرع طرح میں اگر کچھ قباحتیں ہیں یا یہ کسی وزن میں ہونے کے سبب رواں دواں نہیں اور اس میں مصرع تجویز کرنے والوں کو کسی قسم کا اشارہ دینا بھی دے تو اس کے اور بھی کئی طریق ہو سکتے ہیں، ناموزوں پڑھ کر احتجاج کرنا ہمارے نزدیک ہرگز مستحسن نہیں۔

حضرت امن لکھنوی نے یہ کہتے ہوئے کہ "صرف ایک شعر کہا ہے اور اس کا بھی ایک مصرع موزوں اور دوسرا ناموزوں ہے،" یہ شعر پڑھا ؎

خام کاری، ہمت، عجز، ناخنِ تدبیر
ہے گلہ مقدر کا شکوہ ہے زمانے سے

یہ تو امن صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ انہوں نے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ شعر ناموزوں ہے اس کو پڑھنا کس مصلحت کے پیشِ نظر لازم سمجھا مگر سخن فہم حضرات نے جو تاثر لیا ہوگا اور ان کے حساس دل پر جو گزری ہوگی وہ کون جانے۔ ہمیں موصوف کی یہ ادا اچھی نہیں آخر ناموزوں اشعار پڑھنا کہاں کی سخن دانی ہے۔

محروم صاحب کا مقطع یوں ہے ؎

زندگی سے ترساں ہے موت اب تلک شاید
مونھ چھپا کے آتی ہے ورنہ کیوں بہانے سے

حضرت محروم نے 'تلوک' کو مخفف کر کے 'تلک' بطور تخلص استعمال کیا ہے اس پر اعتراض تو اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ کوئی بھی شاعر اپنا دوسرا تخلص تجویز کرنے میں مختار ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، لیکن سوال تو یہ ہے کہ موصوف نے ایسا کیوں کیا؟۔

حضرت محروم کا پورا کلام دیکھ جائیے کہیں بھی 'تلک' نظر نہیں آتا۔ ان کی اس جدت کی اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انہیں اس وزن میں محروم فٹ کرنا مشکل نظر آیا۔ ان کا یہ قدم بھی صاف طور پر اس امر کا غماز ہے کہ اس قسم کا مصرع طرح تجویز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس مقام پر سرور تونسوی نے تو کہہ دیا تھا کہ طالب صاحب نے

مصرع ہی ایسا تجویز کیا جس میں کئی قباحتیں ہیں۔۔
گلزار دہلوی فرماتے ہیں ؎

لکھ سکے نہ ہم مقطع بحر کے تقید سے
رہ سکے نہ ہم پھر بھی حالِ دل سنانے سے

موصوف کا بحر کی طرف اشارہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اس وزن میں اپنا تخلص کھپا ہی نہ سکے اور کھلے الفاظ میں اپنی معذوری کا اظہار فرما دیا غالباً موصوف نے یہ اشارہ دیا کہ اس وزن میں گلزار۔ محروم۔ سرشار۔ تسنیم وغیرہم الفاظ جو "مفعول" کے وزن پر ہیں سما ہی نہیں سکتے۔ بہت ممکن ہے کہ محروم صاحب نے بھی اسی مجبوری کے سبب اپنے لئے نیا تخلص "تِلک" تجویز فرمایا ہو۔

گلزار صاحب کے اس شعر کو دیکھ کر کوئی بھی عروض سے نابلد موزوں طبع شاعر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کے الفاظ مصرع کے آخر میں آسانی فٹ ہو سکتے ہیں۔
مثلاً :۔ گو بہت ہی مشکل تھا ضبط کے سبب گلزار
رہ سکے نہ ہم پھر بھی حالِ دل سنانے سے

محروم صاحب بھی مصرع کے آخر میں محروم رکھ کر مقطع بنا سکتے تھے مگر دونوں اصحاب نے اس سے احتراز کیا، آخر کیوں؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وزن کا تعین کر لیا جائے۔ تجویز کردہ مصرع بحر ہزج مثمن کے مزاحف وزن سے متعلق ہے۔

وزن :۔ فاعلن مفاعی لن فاعلن مفاعی لن

اس وزن میں آخری مفاعی لن سالم رکن ہے از روئے عروض سالم رکن پر تسبیغ یا اذالہ کا عمل ہرگز واجب نہیں یعنی مفاعی لن کو "مفاعیلان" نہیں بنایا جا سکتا۔ غالباً اسی لئے محروم اور گلزار دونوں حضرات نے مصرع کے آخر میں اپنا تخلص رکھنے سے احتراز کیا۔

آئیے اب یہ معلوم کریں کہ "مفعول" کے ہم وزن الفاظ اس وزن میں سما بھی سکتے ہیں کہ نہیں۔

مذکورہ وزن میں "فاعلن" جو شروع میں واقع ہوا ہے یعنی صدر وابتدا سے متعلق ہے زحاف اشتر کا مرہونِ منت ہے،

اشتر :۔ قبض اور خرم کا مرکب ہے اور صدر وابتدا سے مخصوص ہے۔

قبض سے مفاعی لن کا پانچواں حرف جو سببِ خفیف کا ساکن ہے ساقط کیا اور خرم سے "مفا" کا میم ساقط کیا فاعلن حاصل ہوا۔

چوں کہ مفاعی لن سے حاصل شدہ فاعلن/اشتر صدر وابتدا سے مخصوص ہے لہٰذا حشوین میں اس کے اشتر ہو کر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یعنی اس وزن میں حشو دوم سے متعلق فاعلن ہرگز اشتر نہیں بلکہ کسی اور صورت سے وارد ہوا ہے۔ وہ صورت کیا ہے ذیل میں دیکھئے۔

مفاعی لن پر کف کے عمل سے مفاعیل حاصل ہوتا ہے یعنی رکن سے ساتواں حرف ساکن ساقط کرنا بشرطیکہ وہ سببِ خفیف کا ساکن ہو مفاعی لن میں "لن" سببِ خفیف ہے اور نون ساکن۔ ساتواں حرف ساکن ہے مفاعی لن پر قبض کے عمل سے مفاعلن حاصل ہوتا ہے (قبض کے متعلق لکھا جا چکا)

شتر۔ کف اور قبض تینوں عام زحافات ہیں اور بیت کے ہر مقام پر آ سکتے ہیں لہٰذا ان تینوں زحافات کے عمل سے یہ وزن قائم ہوا۔ فاعلن مفاعیل مفاعلن مفاعی لن۔ اصطلاحی نام یہ ہوا "بحر ہزج مثمن اشتر مکفوف مقبوض سالم"، اس وزن پر تخنیق کے عمل سے "فاعلن مفاعی لن فاعلن مفاعی لن" حاصل ہو جاتا ہے۔

زحاف تخنیق کی تعریف یہ ہے۔ وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل رکن کے حرفِ آخر متحرک سے پیوست کرنا۔ مفاعلن کے مفا (جو وتد مجموع ہے) سے میم کو ساکن کیا اور ماقبل رکن مفاعیل کے حرفِ آخر لام سے جو متحرک ہے پیوست کیا مفاعی لم فاعلن حاصل ہوا۔ مفاعی لم کو مفاعی لن سے بدل لیا گیا۔

(نوٹ) یاد رکھئے کہ یہاں مفاعی لن ہرگز سالم نہیں بلکہ زحاف کے اثر سے مفاعیل نے یہ شکل اختیار کی ہے) اسی وزن "فاعلن مفاعی لن فاعلن" اسی طرح فاعلن دوم بھی ہرگز اشتر نہیں مفاعلن زحافات کے اثر سے یہ [illegible] ہے۔

کا اصطلاحی نام یہ ہوا۔ بحر ہزج مثمن اشتر مکفوف مقبوض مخنق سالم۔

اس بحث سے ثابت ہوا کہ فاعلن مفاعیلُ مفاعلن مفاعیلن اصل وزن ہے اور فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن اس وزن کی رعایتی صورت ہے۔ دونوں اوزان ایک شعر میں جمع ہوسکتے ہیں اور اس عمل سے شعر ہرگز ناموزوں نہیں ہوتا۔

اصل وزن میں محروم، گلزار، سرشار اور اسی قسم کے دیگر الفاظ بڑی آسانی سے حشو اول میں رکھے جاسکتے ہیں۔

اب گلزار صاحب کے شعر کی یہ صورت مع تقطیع دیکھئے ؎

ضبطِ غم نے کی گلزار ہزار کی زبان بندی
رہ سکے نہ ہم پھر بھی حالِ دل سنانے سے

تقطیع۔ ضبطِ غم | نِ گلزار | ہزار کی | زبان بندی

فاعلن	مفاعیلُ	مفاعلن	مفاعیلن	اصل وزن
رہ سکے	نہ ہم پھر بھی	حالِ دل	سنانے سے	
فاعلن	مفاعیلن	فاعلن	مفاعیلن	رعایتی وزن

گلزار صاحب کے مصرع میں ترمیم صرف اس لئے کی گئی ہے کہ قارئین یہ ملاحظہ فرما سکیں کہ اس وزن میں ایسے الفاظ جو مفعول کے ہم وزن ہیں آسانی سے فٹ کئے جاسکتے ہیں اور موزونیت میں کسی قسم کی قباحت پیدا نہیں ہوتی اس کے علاوہ ہمارا کوئی مدعا نہیں۔

اس ڈھنگ سے مصرع بنانے میں عیب شکست ناروا بھی وارد نہیں ہوتا۔

●●

(صفحہ ... کا بقیہ)

نہایت پُرسکون اور مطمئن نظر آرہی تھی رضیہ نے اُسے خوف اور تعجب سے دیکھا رضیہ کا شوہر بھی مبارکباد دینے کے لئے دوسرے کمرے سے آگیا آج اس کی آنکھوں میں کچھ کہنے والی کوئی بات نہ تھی خود اُسے بھی اپنے جسم میں کوئی بے چینی محسوس نہ ہوئی واپسی پر اپنے شوہر کی معیت میں چلتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں تلے زمین بالکل ہموار ہوگئی ہے اس نے ایک مانوس خیال کے تحت پُر اس یقین کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھا کہ لوہے کے ذرات مقناطیس کے اردگرد جمع ہوگئے ہوں گے مگر سب لوگ اس سے بے خبر اور لاپرواہ دُور ہی سے گذرے چلے جارہے تھے اس سے پہلے تک وہ اعتماد کے کھوکھلے ڈھیر پہ بیٹھی اپنے آپ کو ہمیشہ اندھیرے غار میں بیٹھا دیکھتی رہی تھی اب اس کے اعضا بے جان ہوکر اِدھر اُدھر گرنے لگے۔

اِسی لمحے یکایک بے اختیار اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ سب کو اپنی طرف متوجہ کرلے۔

●●

غزل

اُمِ ھانی (لکھنؤ)

دُنیا کی گردشوں سے گزرتے چلے گئے
بگڑا کئے کہ اور سنورتے چلے گئے

کچھ خشک پتیوں کی طرح ہم خزاں نصیب
جو بن پہ فصلِ گل تھی بکھرتے چلے گئے

راہِ وفا میں قافلے ایسے بھی آتے ہیں
نقشِ قدم مٹا کے گزرتے چلے گئے

اے اُمِ ہانی بزمِ تمنا میں رات دن
جو کام ہم کو کرنا تھا کرتے چلے گئے

بیگم صاحبہ

کرگس سہسوانی

بھر کے سر میں ڈھیر سا سیندور بیگم صاحبہ
بن گئی ہیں جانے کیوں لنگور بیگم صاحبہ

یوں چلی ہیں آج کرنے "ٹور" بیگم صاحبہ
جیسے جا کے لیں گی دم میسور بیگم صاحبہ

آپ کی تعریف کو الفاظ تو ملتے نہیں
ہو سراپا نور رشکِ حور بیگم صاحبہ

ہو سکا ممکن تو لے آؤں گا چندن ہار بھی
آپ کا غصہ کروں گا دور بیگم صاحبہ

تم تو میکے جا کے مجھ کو بھول ہی بیٹھیں مگر
لیکن تمہارے غم میں ہوں رنجور بیگم صاحبہ

تم تو "میک اپ" کر کے بن جاتی ہو چودہ سال کی
اور پھر لگتا ہوں میں لنگور بیگم صاحبہ

ناز برداری کا چسکہ مجھ سے اب ہوتا نہیں
اب تو بس سمجھو مجھے مغفور بیگم صاحبہ

جب سے اُن کے چار چھ بچے سیانے ہو گئے
ہو گئی ہیں بے طرح مغرور بیگم صاحبہ

تلخ گوئی کا تمہاری ہر جگہ ہے تذکرہ
ہو گئیں غصے میں تم مشہور بیگم صاحبہ

کی نہیں تم نے اگر اپنے رویے پر نظر
دل سے ہو جاؤ گی کوسوں دور بیگم صاحبہ

ساٹھ سے اُوپر ہی ہو گی عمر اب تو آپ کی
پھر بھی لگتی ہو مجھے تم حور بیگم صاحبہ

آپ نے بچوں کی کر ڈالی ہے اتنی ریل پیل
عشق میرا ہو گیا کافور بیگم صاحبہ

تنگ آ کر روز کی جنگ و جدل سے ایک دن
بھاگ جاؤں گا مظفر پور بیگم صاحبہ

آپ کے میکے سے آ جاتا ہے جب مہماں کوئی
گھر سے کر دیتی ہو مجھ کو دور بیگم صاحبہ

کھل اُٹھیں گی ایک دن "پروین بابی" کی طرح
روز اگر کھاتی رہیں انگور بیگم صاحبہ

بات جب بھی راز کی اُن کو بتاؤں گا کبھی
پھونک دیں گی شہر بھر میں صور بیگم صاحبہ

دیکھنے والے پٹاخہ جان کہتے ہیں تمہیں
اور کہتے ہیں مجھے لنگور بیگم صاحبہ

جب سے وہ میرے پڑوسی کو بھگا کر لے گئیں
کر گئی ہیں دل کو چکنا چور بیگم صاحبہ

آدمیت جس کو کہتے ہیں وہ تم میں ہے نہیں
آدمیت سے ہو کوسوں دور بیگم صاحبہ

شاعرہ بننے کی سوجھی ہے تو پھر ایسا کرو
گل خلیقی سے ملو جے پور بیگم صاحبہ

حضرت کرگس کی جب سے ہو گئی ہے پینشن
اور بھی رہنے لگی ہیں دور بیگم صاحبہ

بھیڑ میں تنہا ہونے کا کرب

طاہر نقوی

بے مقصدیت کی اُداسی چھپائے جیسے ہی وہ ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہوئی، سُست بیٹھے ہوئے سیلز مین چھبنے والی نظروں کے ساتھ اس کی طرف ایسے لپکے جیسے بھوکے گدھ بھوکی نظروں کے ساتھ جھپٹتے ہیں۔ اُن کی نظروں کی تیز شعاعیں اُن کے جنس کے محدّث عدسے سے گزر کر اس کے جسم پر مرکوز ہو رہی تھیں اسے اپنے جسم پر جگہ جگہ چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں اس کا جی چاہا کہ اُن کے مُنہ پر ایک ایک تھپڑ رسید کرے لیکن شعور نے اس کو اس لاشعوری حرکت سے روک دیا احساسات کی گہرائیوں میں سُلگتے ہوئے الاؤ پھر بھڑ کنے لگے۔

اِس کے ذہن کے احاطے میں ہوا جیسے بند تھی جس طرح ہوا کا دباؤ پڑتا وہ اُدھر ہی نہ چاہنے کے باوجود چل پڑتی اپنے آپ کو آزاد ضرور محسوس کرتی لیکن کسی بگولے کی مانند اپنے وجود میں کبھی کوئی ٹھہراؤ نہ پاتی اور راستے میں ہمیشہ دل ہی دل میں برابر سے گزرنے والوں کو بُرا بھلا کہتی، ناک سکوڑتی، ہونٹ سکوڑتی، بڑی چوکنی ہوکر گزرتی ہر لمحے اسے یہی دھیان رہتا کہ اس کے صاف و شفاف وجود میں کسی جسم کے لمس سے کوئی کالک نہ سرایت کر جائے جو اس کی پیشانی پر دھبّہ بن کر نمودار ہو جائے اسٹور سے نکلنے کے بعد اسے ساتھ چلنے والے کے مہذب چہرے کے پردے کے پیچھے انسان کی ابتدائی دور کی درندگی اور حیوانیت جھانکتی نظر آئی انسان ترقی ضرور کر گیا ہے مگر عورت کے معاملے میں ابھی تک حیوان ہے اس نے غیر ارادی طور پر اپنی پیشانی کو ایک انگلی سے رگڑا اور پھر وہی ہاتھ پتہ نہیں کس تحریک کی بنا پر حیوانیت کے چہرے پر شرافت کا طمانچہ بن کر جا لگا۔

اس آواز نے غیر محسوس طور پر اِدھر اُدھر جمع ہونے والوں کے جسموں کے گہرے اور نامعلوم احساسات پر دستک دی اس دستک کا اثر ہر ایک نے مختلف طور پر قبول کیا اور اس کے نتیجے میں اُبھرنے والے سوالات کی بوچھار سے وہ گھبرا گئی اس نے نظر اُٹھا کر ارد گرد اپنے ہمدردوں کو دیکھا کوئی میٹھی مُسکراہٹ اس پر پھینک رہا تھا کوئی اسے اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا، کوئی آنکھوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کوئی الفاظ کے ذریعے اور کوئی لب ہلا کے رہ جاتا سب کا مطلب ایک تھا بس طریقے مختلف تھے لوگوں کی آڑی ترچھی تیز اور چیر دینے والی نگاہیں چاروں طرف سے اس کے عضو عضو پر پڑ رہی تھیں —— جیسے وہ ایک کمرے میں ننگ دھڑنگ کھڑی ہو جس کی دیواروں اور چھت میں جگہ جگہ سوراخوں سے سورج کی شعاعیں اس کے بدن پر پڑ رہی ہوں، اس وقت اس کے اعصاب نے آپس میں گڈمڈ ہو کر اسے اعصابی طور پر شل کر دیا تھا مجبوری اس کے ذہن پر پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہر کر کسی عریاں فلم کا اشتہار بنی رہنا نہیں چاہتی تھی۔ بچتی بچاتی وہاں سے نکلی تو مختلف قہقہوں نے دُور تک اس کا پیچھا کیا، شرافت، حیوانیت کے ہجوم سے بچ نکلنے کے بعد ایک طرف ڈری ڈری کھڑی گھُٹے گھُٹے سانس لینے لگی ہر مرد عورت کو سرِ راہ اُگے ہوئے درخت کا پکا پھل سمجھ کر جھاڑ لینا چاہتا ہے۔ اس کے اعصاب پر مختلف احساسات کے تحت کپکپی طاری تھی، نزدیک ہی پولیس والے کو دیکھ کر اس کی جانب مدد کے لئے بڑھی تو پولیس والا بڑے اشتیاق انداز میں اس کی طرف متوجہ ہوا اس نے دل ہی دل میں پولیس والے کی

فرض شناسی کی داد دی اور اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنے
لگی۔ حیوانیت کو گرفت میں لینے کے لئے جھجکتے ہوئے کچھ کہنے
کی کوشش میں محض اُدھر اشارہ کرنے پر اکتفا کیا، وہ
ہنستے ہوئے بولا۔

"اپنے آدمی کے ساتھ نکلا کرو"

پولیس والے کا یہ لہجہ کرچیوں کی صورت میں اس
کے سینے کو چھلنی کئے دے رہا تھا اُس نے اپنی صنف کی
بے چارگی کی چیخ کو دبا دیا اُس نے محسوس کیا کہ یہ بے بسی
اس کے شعور ہی کی نہیں لاشعور کی بھی ہے اس بے بسی کے بوجھ
تلے اس کا ضمیر کراہ رہا تھا۔ بے آواز آنسو اس کی روح پر
ٹپکنے لگے تھے۔ نظروں کے تیروں سے زخمی اپنے وجود کو اٹھائے
وہ کچھ دیر سستانے کے خیال سے پاس ہی رضیہ کے گھر چلی
دی وہاں جا کر اس نے صوفے میں دھنس کر آنکھیں بند کرکے
سر پیچھے ٹکا دیا اور گہرا سانس لیا اس کے دکھیں روئیں
کا کھنچاؤ کم ہوا تو دماغ کے ہر پرزے کو اپنی اصلی حالت
میں لانے کی کوشش کرنے لگی کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں
تو رضیہ نے پوچھا۔

"ہاں اب بتاؤ ماجرا کیا ہے"

"وہی جو ہوتا ہے" اس نے چڑ کر کہا اور کھڑے ہو کر
ساڑھی درست کرنے لگی "کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا"

"نہیں میں ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ باہر نکلتی ہوں
کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ نظر اُٹھا کر بھی دیکھے میں تو
اپنے آپ کو بڑا محفوظ سمجھتی ہوں"

اُسی لمحے اسے پولیس والے کی بات بھی یاد آگئی اس کے
وجود کی گہرائی سے ایک سرد لہر اُبھری اور وہ اُس پتے کی مانند
تنہائی محسوس کرنے لگی جو درخت سے گر کر ذرا سی ہوا سے
کھڑکنے لگتا ہے اور بے مقصد اِدھر اُدھر اُڑتا پھرتا ہے
رضیہ کے اس جملے نے اس کی نفسیات کو جا کھٹکھٹایا تھا
لیکن اس قسم کی کیفیت میں جھنجھلاہٹ بے چین ہو کر ہمیشہ
اس کے جسم کے گوشے گوشے میں سرگرداں رہتی اس شدت
میں وہ یہ بھی بھولی رہتی کہ وقت گزرتے ہوئے راہوں کی

خاک اس کے سر پہ ڈال دے گا وہ چاہے گی کہ کوئی اس
دروازے پہ آکر دستک دے اور پھر انتظار کرتے کر
آخر خود دروازے پر آجائے گی اور مسافر دور ہی
گزرتے چلے جائیں گے اس وقت اس کی زندگی سوا
مُرجھائے ہوئے پھول کے اور کچھ نہ ہوگی۔ چاہے گی
تو ماضی کی خوشیوں کی ایک ہلکی سی کرن تک واپس نہ
لا سکے گی رضیہ اس کی یہ اعصابی کیفیت دیکھ کر ہمیشہ
طرح چپ رہی عین اس لمحے رضیہ کے شوہر کو دیکھ
اس کے جسم میں پھر وہی عجیب سی بے چینی اور ذہن پر
چھانے لگی رضیہ کے شوہر کی جو نگاہوں کے احاطے
خود اپنے وجود کے دلدل میں پھنسی وہ ہاتھ پاؤں مار
لگی ہر دم چاہے کچھ نہ بولے مگر اس کی نظریں سب کچھ
دیتی ہیں۔ وہ مردوں سے خوف زدہ ہونے والی نہیں
یہ بھی خوب جانتی تھی کہ مرد عورت کا سب کچھ بگا
ہے اور عورت اس کا کچھ بھی نہیں۔ اس کے شعور ا
لاشعور پر چمٹی ہوئی بے بسی نے ایک بار پھر اس کے
کو مضمحل کر دیا اور زبان پر پہرہ بٹھا دیا۔

رضیہ کو چائے کی پیالی تھامے لوٹتے دیکھ کر تیز
سوئیوں کی چبھن جاتی رہی اور وہ اپنی پچھلی حا
آگئی بالکل ایسے جیسے موسمی اثرات قبول کرکے تصو
فریم سے باہر نکل آتی ہے اور موسم کی تبدیلی کے د
دوبارہ فریم میں صحیح واپس آجاتی ہے اس وقت
اپنے جسم کے فریم میں سما گئی تھی یونہی بلا کسی ارا
جلدی جلدی چائے ختم کرکے چائے کی پیالی میز پر ر
اُسے اپنی زندگی بھی اس خالی پیالی کی طرح لگی اس
ساتھ ہی ماحول کی ساری خاموشی اُس کے ذہن میں
نروس میں گھومنے والی جانی بوجھی اُلجھن جھنجھلاہٹ
بیزاری نے سمٹ کر اس کے جسم میں حسبِ معمول ایک
دباؤ ڈالا اور وہ بے ارادہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑ

کئی دن گزرنے کے بعد وہ رضیہ کے ہاں د
اس بار اُس کا شوہر اس کے ساتھ تھا وہ خلا

(بقیہ)

درّۂ خیبر

اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

ہ کتنی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا تھرّا کے چلتی ہے

نا ہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار لافانی پُرانی داستانوں کے

ہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں

ہ ذرّے رہروؤں کی ہمتوں پر مُسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سُناتے ہیں

ہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں

ے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دُنیا بھر کے ہنگامے

ہ بے آباد، دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شورانگیز تہذیبوں کا افسانہ

ہی دُشواریوں سے آریوں کا کارواں گزرا
زمینِ ہند پر جاتا ہوا اک آسماں گزرا

سی رستے سے ہو کر ہنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے کئی آباد کار آئے

ہ مٹی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک

سی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
انہی فولاد کے دیوؤں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا

اڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دھواں ہو کر

سے تیمور نے روندا اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا

یہاں سے بارہا گزرے اٹھالے بارگاہوں کے
قدم چومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے

یہاں اب وہ شکوہِ نادری اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی

ہے وہ خار زار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے

ہوائے درہ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

ہندوستان میں اُردو کتابوں کی اشاعت

محمد حفظ الکبیر قریشی (کینیڈا)

جناب محمد حفظ الکبیر قریشی کینیڈا میں اُردو کا علم جس جی داری سے بلند کئے ہوئے ہیں وہ اس امر کی ضمانت ہے کہ جب تک قریشی صاحب ایسے اُردو کے پرستار موجود ہیں اُردو کے وقار میں کمی نہیں آسکتی۔ خدا قریشی ایسے فدایانِ اُردو کو عمرِ خضر عطا فرمائیں۔

مندرجہ ذیل مضمون میں قریشی صاحب نے ہندوستان کے اکثر اُردو کے مصنفین اور ناشرینِ کتب کے منہ پر جو کالک پوتی ہے وہ ہر اُردو پرست ہندوستانی کے لئے باعثِ تشویش ہونی چاہیے۔ کاش ہمارے ہاں کے اُردو ناشرین جلبِ زر کے ساتھ ساتھ اُردو کی بقا و حیات کا بھی خیال رکھیں اور ہمارے مصنفین قریشی صاحب کا یہ مضمون پڑھنے کے بعد اپنے فرض کا احساس کریں۔

ادارہ شانِ ہند قریشی صاحب کو یقین دلاتا ہے کہ اُنہیں خود یا اُن کے کسی بھی اُردو دوست کو کسی بھی اُردو کتاب کی ضرورت ہو تو ہمیں خدمت کا موقع دیا جائے ہم ممالکِ غیر میں رہنے والے ہر اُردو دوست کو اُردو کتابیں اصل قیمت سے بھی کم قیمت میں بھجوائیں گے اور اس سلسلے میں ہر جوابِ طلب خط کا جواب فوری طور پر ہوائی ڈاک سے دیا جائے گا۔

(سرور تونسوی)

پچھلے سال ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شمالی امریکہ کے دورہ پر آئے تو ازراہِ کرم انہوں نے اپنی کچھ کتابیں بھی عنایت فرمائیں۔ ان کی یہ کتابیں کتابت اور طباعت دونوں اعتبار سے دیدہ زیب تھیں۔ جہاں تک سکالرشپ کا تعلق ہے اس میں دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔ انیس شناسی اور اُردو افسانہ، روایت اور مسائل پر گوپی چند نارنگ نے بڑی توجہ محنت اور گہرے مطالعہ کے بعد لکھا ہے اور ہر اعتبار موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ نارنگ شمالی امریکہ میں لیکچروں کے سلسلہ میں اکثر آتے رہتے ہیں اور اپنی شیریں بیانی اور ذہانت سے شمالی امریکہ کے سامعین کو مسحور کرکے چلے جاتے ہیں۔ انجمن اُردو کینیڈا کی دعوت پر وہ دو دفعہ ٹورانٹو آچکے ہیں۔ پچھلے سال انجمن نے کینیڈا کی پہلی اُردو کانفرنس منعقد کرائی تو اس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے نارنگ صاحب کے علاوہ سردار جعفری اور پاکستان سے احمد فراز، جمیل الدین عالی، ادا جعفری، اور انگلینڈ سے افتخار عارف اور بیروت سے فیض احمد فیض بھی تشریف لائے تھے ان کے علاوہ [illegible] سے مغیث الرحمٰن، کارلو کپولا، نیر جہاں حسین امام، مامون ایمن، [illegible] کوہ، شاہین، عرفانہ عزیز اور فاروق حسن بھی شریک تھے۔ کانفرنس ہوئی اور ہنگامہ آفریں مشاعرہ بھی۔ دراصل انجمن کی وجہ سے اُردو زبان و ادب پہ شمالی امریکہ میں جو کام ہو رہا ہے

اس کا اندازہ وہاں ہندوستان والے نہیں لگا سکتے، تراجم کے کام ہو رہے ہیں۔ شعر و ادب پہ کام ہو رہا ہے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے لکھا جا رہا ہے۔ اور زبان و ادب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بھی چل رہا ہے۔ اب جو یہ اردو شوق کی لہر چل نکلی ہے تو عوام کو اردو کتابوں کا بھی شوق پیدا ہوا ہے جو بھی ہندوستان، پاکستان جاتا ہے کچھ نہ کچھ کتابیں ضرور خرید لاتا ہے امریکہ میں اب بڑی تعداد میں اردو بولنے والے آباد ہو گئے ہیں اور کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں لیکن کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ جو صورت اختیار کر گیا ہے وہ ہر طرح حوصلہ شکن ہے — یہ مشکل دو تین طرح سے پیش آتی ہے۔

پہلی تو یہ کہ ایک عام اردو کا قاری ہندوستان سے اپنی پسند کی اکا دکا کتاب نہ خرید سکتا ہے اور نہ ہی ایسے معمولی آرڈر کا ہندوستانی ناشر جواب دیتے ہیں۔ پہلے تو ناشروں کا پتہ لگانا ہی ٹیڑھی کھیر ہے اس لئے کہ شمالی امریکہ کے علمی اداروں یا لائبریریوں میں اردو کے ناشروں کی نہ تو کوئی لسٹ ملتی ہے اور نہ ہی اس کا پتہ چلتا ہے کہ کون کون سی کتابیں کہاں سے مل سکتی ہیں، اردو کے اشاعتی پروگرام سے عام لوگ قطعی واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے بدقسمتی سے کسی قسم کا تجارتی سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا اور خطوں کے جوابات دینے کے لئے ہندوستانی ناشرین قائل ہی نہیں۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کوئی کتاب خریدنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو سمندری ڈاک سے آتے آتے کوئی تین چار مہینے نکل جاتے ہیں اور اس پر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کتاب منگوائی تھی کچھ اور نکلی کچھ۔ پھر اس کی خستہ حالت، ٹوٹی ہوئی دفتی، پھٹے ہوئے سرورق کو دیکھ کر مزید کوفت ہوتی ہے۔ عام کتاب کا رنگ و روپ کچھ اتنا اڑا ہوا ہوتا ہے کہ کتاب پڑھنے کا سارا جمالیاتی ذوق گرد پوش کی خاک میں مل جاتا ہے، کتابت خراب اور طباعت اکثر اتنی ناقص ہوتی ہے کہ بیشتر کتابوں کے صفحات پڑھے نہیں جاتے۔ جلد سازی بھی اتنی بودی ہوتی ہے کہ کتاب کے ہاتھ میں آتے ہی اس کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے اکثر کتابوں پہ یہ گمان ہوتا ہے جیسے وہ سو سال پرانی ہوں۔ ہمارے ہاں کا ایک کسٹم آفیسر مجھے ایک دفعہ پرانی کتابوں کا ڈیلر سمجھ بیٹھا۔

مزید ستم یہ کہ تقریباً ہر کتاب کی اصلی قیمت شائع شدہ قیمت پہ اضافہ شدہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد تیسرا مسئلہ ذرا سنجیدہ قسم کا ہے اور اس سلسلہ میں اکثر احباب نے شکایتیں کی ہیں

یہاں کے لوگ شمالی امریکہ کی زندگی اور یہاں کے معیار کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہاں کتابوں کے نام اور ان کے مندرجات میں منطقی ربط ہوتا ہے۔ آم دکھا کر املیاں نہیں بیچی جاتیں۔ مگر ہندوستانی کتابوں کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔

مثال کے طور پہ ایک کتاب کا نام ہے حیاتِ بیدل۔ از ڈاکٹر امانت۔ قیمت ۱۲ روپے۔ جب کتاب یہاں پہنچی تو اس پہ قیمت ۱۵ روپے درج تھی اس کتاب میں حیاتِ بیدل محض ایک مضمون تھا باقی غیر متعلقہ مضامین تھے اور یہ مضمون بھی دراصل عباد اللہ اختر اور پروفیسر غنی کی کتابوں کی انتہائی مختصر تلخیص۔ جو صاحب حیاتِ بیدل کے اشتیاق میں چھ مہینے سے کتاب کی آمد کا انتظار کر رہے تھے اسے دیکھ کر بیدل ہی سے بددل ہو گئے

دوسری مثال:۔ ایک کتاب یوں مشتہر کی گئی —

غالب تقلید اور اجتہاد۔ پروفیسر خورشید الاسلام۔

دوسری کتاب غالب اور تقلید۔ پروفیسر خورشید الاسلام

دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں لیکن ان کے ٹائیٹل علیحدہ علیحدہ۔ ایک کتاب زبردستی پلے پڑی۔

قیمت ۳۰ روپے۔ اشتہار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں کے موضوعات الگ الگ ہیں۔

ایک اور کتاب غالب شناسی۔ ناشر ادارے کے اشتہار کے مطابق غالب پر نظر انصاری کے مضامین کا مجموعہ۔ دراصل وہ غالب کی اردو فارسی شاعری کا نظر انصاری صاحب کا

انتخاب ہے۔ اس انتخاب میں جو پہلی بات کھٹکتی ہے وہ فہرست مشمولات کی عدم موجودگی۔ کون سی غزل کس صفحہ پر ہے۔ اگر اس کا پتہ چلانا ہو تو پوری کتاب کے اوراق الٹنے بیٹھیے پھر کس مقصد کے لئے یہ انتخاب عمل میں لایا گیا اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ دراصل کسی بڑے شاعر کے کلام کے انتخاب کے پیچھے جو علمی، ادبی اور تحقیقی اصول ہوتے ہیں اور انتخاب کرنے والے کے سامنے جو مقاصد ہوتے ہیں ان میں سے کسی ایک بات کی بھی وضاحت اس کتاب میں نہیں ہوتی۔ یہ تو بعض ظ انصاری کے غالب کے پسندیدہ اشعار کی ڈائری ہے چار پانچ مہینے کے بعد جب وقت ... مقصود غالب اور کتاب کی قیمت ۲۰ روپے پوسٹ خرچ علیحدہ۔ آپ کے شوق کا جرمانہ ثابت ہوتی۔

غالب ہی کا ایک دیوان ہندوستان میں شائع ہوا ہے۔ مرتب ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔ ناشر کی دیدہ دلیری اور ڈاکہ زنی بذاتِ خود قابلِ نفرین فعل ہے لیکن ڈاکٹر نور الحسن نقوی صاحب کو یہ بات ضرور لکھنی چاہئے تھی کہ یہ دیوان حامد علی خاں کا ایڈٹ کیا ہوا ہے اس پر حاشیہ اور اعراب اور اوقاف انہی کی ریسرچ کا نتیجہ ہیں لاہور والوں نے حامد علی خاں کا ایڈٹ کردہ دیوان غالب بڑی تقطیع پہ نہایت دیدہ زیب چھاپا ہے۔ نور الحسن نے چھوٹی تقطیع اور معمولی کاغذ پہ اس کی فوٹو کاپی کرکے اس کی مٹی پلید کی ہے اور چوری کے مال پر اپنی اسکالرشپ کی دکان سجائی ہے۔

ہندوستان میں اردو میں علم و ادب اور فکر و تنقید سے متعلق کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں پچھلے ایک دو سالوں میں شاید ہی آٹھ دس ایسی کتابیں شائع ہوئی ہوں لیکن ان میں سے بعض کتابوں کے لئے ناشر نے بڑے بینڈ باجے کا اہتمام کیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کتاب پہ مصنف کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی گئی۔ کئی احباب نے وہ کتاب بڑے شوق سے منگوائی خیر کتابت اور طباعت تو حسبِ معمول خراب تھی ہی لیکن

نفسِ مضمون اور موضوع پہ مصنف نے جو کچھ اور جیسا کچھ اور جتنا کچھ لکھا وہ ہرگز ڈی لٹ تو خیر، پی ایچ ڈی کے بھی لائق نہیں تھا یعنی یہ کہ شمالی امریکہ میں جس علمی اور تحقیقی بنیادوں پہ پی ایچ ڈی دی جاتی ہے اس معیار پر وہ کتاب پوری نہیں اترتی۔ اب یہاں عام خیال یہ پیدا ہو چلا ہے کہ علی گڑھ اسکول کی سکالرشپ ہی رقیق ہے اور وہ قابلِ اعتبار نہیں رہی۔ اس سے پہلے دلی اور علی گڑھ کے سکالروں میں ... احمد فاروقی اور خلیق احمد نظامی جیسے لوگوں کی وجہ سے علم و ادب کی آبرو قائم تھی لیکن اب ان دانش گاہوں سے ایسے اربابِ فکر و نظر غائب ہوتے جا رہے ہیں —

ہندوستان کے لکھنے والوں میں جن لوگوں کی عالمانہ اور شانِ اجتہادی کے ساتھ تخلیقی صلاحیتوں کا یہاں اکثر لوگ اعتراف کرتے ہیں ان میں سے چند مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی، وحید اختر، خورشید الاسلام رشید حسن خاں، گیان چند جین وغیرہم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی کتابیں عموماً اپنے موضوعات کا سنجیدگی سے احاطہ کرتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مصنفین نے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر موضوعِ زیرِ بحث کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

آج کل ہندوستان میں ایک وبا یہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ اردو کے معیاری ادب کو دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی اشاعتی ادارے ان کتابوں کے جو اشتہار دیتے ہیں وہ بجائے اصل مصنف کے ایڈیٹر کے نام سے ہوتے ہیں مثلاً مقدمہ شعر و شاعری، رشید حسن خاں یا فردوسِ بریں۔ ڈاکٹر قمر رئیس یا امراؤ جان ادا۔ ڈاکٹر محمد حسن وغیرہ وغیرہ۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ دوسرے ہندوستانی ناشرین غالباً پچھلی شائع شدہ کتابوں میں جو کتابت کی غلطیاں رہ گئی تھیں یا اعراب و رموز کی کمی رہ گئی تھی اس کی تصحیح کو ایڈیٹنگ سمجھتے ہیں

مُرتب کے ذمہ صحتِ متن کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ وہ فرہنگ شامل کرے۔ ان تہذیبی و تمدنی مسائل کو جو وقت کی رفتار میں موجودہ معاشرہ کے لئے اجنبی ہو گئے ہیں ان پہ وضاحتیں نوٹ لکھیں اگر زبان و محاورہ میں تبدیلیاں آ گئی ہیں تو ان کی وضاحت کرے قاری کو پس منظر سے پوری طرح آگاہ کرے مگر ہندوستان میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں حالاں کہ ان ناشرین کے سامنے مالک رام کے تذکرہ وغیرہ کی مثالیں موجود ہیں۔

بعض علمی و ادبی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن میں فارسی اشعار یا نثر کے ٹکڑے بطور حوالہ کے دئے جاتے ہیں ہندوستانی مصنفین یا مرتبین کی تساہل پسندی یہاں دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ کتنے اشعار فارسی کے ایسے بھی آتے ہیں جہاں ان کا مفہوم یا زبان و بیان کا کوئی نکتہ زیرِ بحث ہوتا ہے۔ اُردو کے عام قاری کو اگر فارسی آتی بھی ہے تو اتنی نہیں کہ فارسی شعر کو بغیر لفظی ترجمے کے آسانی سے سمجھ سکے اس لئے ایسی کتابیں عموماً اُردو قاری کے لئے بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔

اگر کتاب اُردو میں لکھی جا رہی ہے، اور زبان و بیان یا کسی اہم نکتہ کی وضاحت منظور ہو تو ضروری ہے کہ فارسی، عربی یا انگریزی یا کسی بھی زبان سے جو حوالہ جات دئے جائیں اُن کا اُردو ترجمہ بھی فراہم کیا جائے۔ ہماری نظر سے غالب کی فارسی شاعری سے متعلق دو مضامین گزرے ہیں ایک وارث کرمانی کا اور ایک اسلوب احمد انصاری کا۔ ہمارے قارئین وارث کرمانی صاحب کے مضمون سے محض اس لئے مستفید ہو سکے کہ انہوں نے فارسی اشعار سے اُردو تراجم بھی فراہم کئے تھے۔ اس کے برخلاف اسلوب احمد انصاری کے مضمون کی قدر و قیمت اس لئے متعین نہیں کی جا سکی کہ جس نکتہ کے گرد انہوں نے غالب یا بیدل یا عرفی کا شعر پیش کیا وہ اُردو کے قاری کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ ہر وہ مضمون یا کتاب جو غیر زبانوں کے حوالے استعمال کرے ان کے مصنفین کو چاہئے کہ وہ ان حوالہ جات کے تراجم بھی پیش کرے۔ آج سے پچاس ساٹھ پہلے شاید اس کی ضرورت نہ رہی ہو لیکن آج یقیناً ہے۔

غرض کہ یہ مختصر سا مضمون محض اس لئے لکھا جا رہا ہے کہ ہندوستانی ناشرین و مصنفین بیرونی ممالک میں رہنے والے اُردو کے قارئین کے نقطۂ نگاہ کو سمجھیں۔ اُن کی دشواریوں کا حل نکالیں اور زبان و ادب کی تبلیغ کی جس ذمہ داری کو وہ اٹھائے ہوئے ہیں اُسے بحسن و خوبی انجام دیں۔ اس سے علم و ادب کی بھی خدمت ہوگی اور تجارتی اعتبار سے بھی یہ نفع کا سودا ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی کوئی ایسی صورت ضرور اختیار کرنی چاہئے جس سے ان کے اشاعتی پروگرام کی اطلاع شمالی امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کو ملتی رہے۔ ادھر کے لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی نشو و نما کو قائم رکھنے کے لئے کتابوں کی فراہمی انتہائی ضروری ہے۔ موجودہ صورت حال کسی صورت بھی اطمینان بخش نہیں کہلائی جا سکتی۔ ●●

(صـ۵ کا بقیہ)

کے دوست احباب ہی ہوتے ہیں۔

جہاں تک اس شکایت کا تعلق ہے ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کسی ایک آدھ ادیب یا شاعر کے ساتھ ایسی رعایت برتی گئی ہو گی ورنہ عام طور پہ ہمارے ہاں مدھیہ پردیش اُردو اکادمی جو چند کتابیں برائے تبصرہ موصول ہوئی تھیں وہ سب کی سب ہر لحاظ سے قابلِ تعریف تھیں۔ دراصل معاملہ یہ ہے کہ ہر ادیب اور ہر شاعر اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں بہتر ہی نہیں سمجھتا ہے اور یہی جذبہ "غلط فہمی" وجہِ شکایت بن جاتا ہے۔ ہم اس قسم کی شکایت کرنے والوں سے پوری پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اکادمی کے کارکنوں کی مجبوریاں ملحوظِ خاطر رکھیں۔ ہاں اگر کوئی صاحب اس سلسلے میں ٹھوس ثبوت رکھتے ہیں تو شائع شدہ سند مع [illegible] احتجاج میں اُن کا ساتھ دیں

اپنے اور بیگانے

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
بلاروی

چک بندی کے سی۔ او صاحب رام پھول مکھیا کے مکان پر رہتے تھے مکھیا نے بھی سی۔ او صاحب کی خوب خاطر تواضع کی اور یہاں تک کہ مکان کا کرایہ تو در کنار خورد و نوش کا تمام ذمہ بھی اُٹھایا۔ مُنہ کھاتا ہے اور آنکھ شرماتی ہے۔ سی۔ او صاحب نے بھی حق نمک ادا کر دیا اور مکھیا کی مرضی کے مطابق دھنّا رنگریز کی دس بیگھے گوہان کی زرخیز زمین ان کے چک میں ملا دی اور دھنّا کو سڑک کے کنارے جا پٹکا۔ بے چارے دھنّا کے پاس نہ تو اتنا روپیہ تھا جو سی۔ او صاحب کی جیب گرم کر کے کہیں اچھا چک بنوا لیتا اور نہ مکھیا کے مقابلے آنے کی طاقت ہی تھی لہذا مجبور ہو کر جو ملا اسی پر بسر کر لیا۔

اوّل تو سالوں سے کھڑے لحیم شحیم پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے پیڑ ہی آدھے کھیت میں کوئی فصل نہیں اُگنے دیتے تھے جیسے بڑے آدمی کے سائے میں چھوٹا آدمی پنپ نہیں پاتا اور جو کچھ فصل اُگ بھی آتی تھی تو کھیت کو سڑک پر ہونے کی وجہ سے چرنے والے جانور اُجاڑ دیتے تھے۔

لوگ دُکھی ہیں ان کو ہی یہ دُنیا اور ستاتی ہے جس آنکھ میں تنکا گرتا ہے وہ اور مسل دی جاتی ہے بیچارہ دھنّا پہلے ہی سے غریب تھا اب اور بھی دس بیگھے زمین سے ہی گزارا نہیں چلتا تھا مسئلہ آب و دانہ اور بھی پیچیدہ بنتے گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کی زمین کے پاس ہی بجلی گھر ہو گیا اور اس کا آدھا کھیت پاور ہاؤس میں چلا گیا اور جو زمین دو ہزار روپے بیگھے کی قیمت کی تھی صرف پانچ سو روپے معاوضہ میں نکل گئی یعنی سرکار نے صرف سو روپے بیگھا ہی دیا۔

دھنّا کی بیوی نے گھر کا خرچ چلانے کے لئے سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر بترا صاحب کے گھر چوکا چولہے کا کام کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی بیوی نے صرف برتن ملنے پر رکھا تھا مگر اور بھی کئی کام اُس سے لینے لگیں۔ لیکن مالتی (دھنّا کی بیوی) بھی لب نہیں ہلاتی تھی۔ اور جو بھی کام ملتا خوش خوش پورا کرتی اور چلی جاتی اُس کی اس خدمت گزاری کے عجیب انداز نے ڈاکٹر کی بیوی کے دل کو موہ لیا اور ایک دن وہ خود ہی بولیں "مالتی ہم تم سے بہت کام لیتے ہیں اب تمہیں تنخواہ بڑھا کر دیا کریں گے"۔

مالتی یہ سُن کر مُسکرائی اور بولی "بہن جی ایک لڑکا ہے گھر پہ کچھ کام نہیں اگر یہاں کچھ جادہ کام کرنا پڑ گیا تو تنکھا بڑھانے کی کیا جرورت ہے وہاں بھی تو کھالی بیٹھی رہتی ہوں۔ بھگوان نے ہاتھ پیر کام کرنے کو ہی تو دئے ہیں کھالی رہنا تو پاپ ہے"۔

مالتی کی ان باتوں سے ڈاکٹر کی بیوی کے دل میں مالتی کے تئیں ایک خاص ہمدردی پیدا ہو گئی اب وہ کھانا تو روز ہی کھلا دیتی تھی کبھی کبھار کوئی کپڑا لتا بھی دے دیتی تھی۔ میڈیکل سیمپل میں آئیں دواؤں میں سے طاقت کی شیشیاں اُس کے لڑکے کو دیتی رہتی تھی۔ اب دھنّا کا کنبہ خوش تھا کوئی پریشانی نہیں تھی آرام سے

چاقو اٹھایا اور جلدی سے کھولنے لگا چاقو بغیر صاف کئے بند کر دیا گیا تھا اس لئے کھولنے میں کچھ دقت ہوئی اور سجن کی اُنگلی پر چاقو کی تیز دھار نے قدرے زخم کر دیا سجن نے کٹا ہوا حصہ دوسری اُنگلی سے دبا لیا اور مُسکراتا ہوا چاقو لے کر ڈاکٹر صاحب کو دیا۔

"کیا چاقو کھولتے وقت اُنگلی کٹ گئی ہے"، "جی ہاں۔"

بیٹا تم چاقو دے آتے میں خود کھول لیتا۔"

"تو کیا ہو گیا پاپا جی مجھے کون سے مریض دیکھنے ہیں سے آپکے ہاتھ میں لگ جاتا تو آپ کو مریض دیکھنے میں کتنی پریشانی ہوتی" ہر سجن نے معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ مسز بترا پاس کھڑی سجن کی باتیں سُن رہی تھیں انہوں نے سجن کی زخمی اُنگلی کو اپنے ہاتھ سے دباتے ہوئے پیار سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بال سہلائے کمر پر ہاتھ پھیرا کیونکر سجن کے معصومانہ اندازِ ہمدردی سے اُن کا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔ سجن ماں کے اس ممتا بھرے دُلار کے لئے ایک عرصہ سے بہانے تلاش کر رہا تھا آج اس کی یہ دلی خواہش پوری ہونے پر وہ بے انتہا خوش تھا ڈاکٹر صاحب نے سجن کے پٹی باندھ دی اور پوچھا "درد تو نہیں ہے بیٹے؟"

"درد تو ممی سے چمٹتے ہی ختم ہو گیا تھا" ہر سجن نے کہا۔

"عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں" ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیوی کی طرف مُسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جس پر سجن اور اس کی ممی بھی ہنسنے لگے مگر ہر سجن ممی سے ایسا لپٹا ہوا تھا جیسے رسی کی دو لڑیں۔ مالتی کے مرنے کے بعد ہر سجن کے لئے یہ پہلا موقع تھا جو وہ کسی دوسری عورت کے سینے سے چمٹا تھا اور اُسے ماں کا پیار ملا تھا وہ ممی کے سینے سے لگا لگا سوچ رہا تھا کہ اگر اسی طرح چوٹیں لگتی رہیں تو ممی کا پیار خوب ملتا رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہر سجن کی اُنگلی کا زخم بہت جلدی ٹھیک کر دیا جس کا ہر سجن کو دکھ ہوا کہ زخم جلدی کیوں ٹھیک ہو گیا اس بہانے جو چلے دکھانے کو مل جاتے تھے اور ممی کا ڈھیر سارا لاڈ پیار بھی جس کا کہ وہ بھوکا تھا اُسے ماں کے دُلار میں کتنا لطف آتا تھا جب ممی کہا کرتیں "پٹی دھیرے باندھو میرے بیٹے کے درد ہو رہا ہے باہر کے مریضوں کی طرح گھر میں برتاؤ مت کیا کرو"۔ ہرکشن ذرا دکھا دیتا تھا تو وہ زور سے چلاّ پڑتا تھا اور ممی ہرکشن کو ڈانٹ پھٹکار دیتی تھیں اسے سینے سے لگا لیتی تھیں پھونک مارتی تھیں اور کہتی تھیں "آنے دو اس ہرکشن کے بچے کو ایسا پیٹوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا" اسکے لئے یہ الفاظ تاثیرِ مسیحائی رکھتے تھے۔

دونوں بھائی کافی بڑے ہو گئے تھے اور دونوں بھائیوں میں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ کیا مجال جو باہر کا کوئی آدمی ان کی طرف اُنگلی اٹھا دے ایک دن راستے میں کہیں ہر سجن کے ماموں مل گئے اور انہوں نے کہا۔

"بیٹے اب تم جوان ہو گئے ہو میں چاہتا ہوں تمہاری شادی ہو جائے میری نظر میں کئی لڑکیاں ہیں جو سگھڑ بھی ہیں اور جہیز بھی ملے گا تم ہاں کر دو تو بات کروں۔"

"اس سلسلے میں ممی سے پوچھ کر بتاؤں گا، ہر سجن نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ مجھ سے بھی بڑی ہیں؟"

"جی ہاں ماں سب سے بڑی ہوتی ہے۔"

"ہر سجن تم غیروں کے ٹکڑوں پر پل کر اپنوں کو بھول گئے۔"

"آپ اپنے ہیں جو ماں کے مرنے کے بعد آج دکھائی دئے ہیں کبھی آکر یہ بھی نہ پوچھا کہ بھانجے تیرا حال کیا ہے؟ جن لوگوں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے ان کو غیر بتاتے ہو۔"

"بیٹے تم جن لوگوں کے گُن گا رہے ہو پتہ ہے انہوں نے تم کو مفت میں پال کے اتنا بڑا نہیں کیا ہے۔"

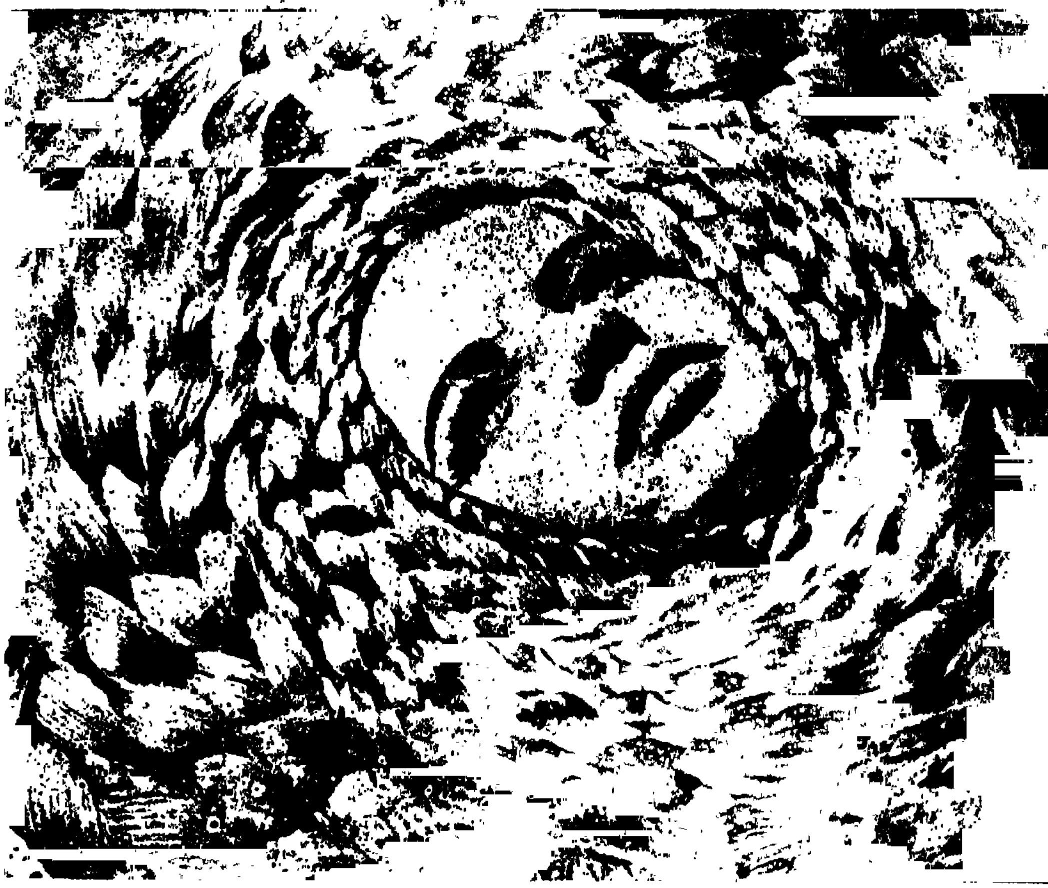
"کیا لے لیا ہے انہوں نے مجھ سے۔"

"تمہیں پتہ نہیں ہے تمہارے باپ کے دو ہزار روپلیٹس کے پیڑ بیچ کر انہوں نے اپنی جیب بھر لی اور وہ زمین بھی ایک پیٹرول پمپ کے مالک کو بیچ دی اس طرح تمہارا لاکھوں روپیہ اُنکی تجوری میں بند ہے۔ لوگ شہد حاصل کرنے کے لئے زہریلی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں اتنی رقم ہضم کرنے کے لئے انہوں نے تمہیں پالنے کا جھنجھٹ اپنے

(بقیہ صفحہ پر)


ذرا ٹھہریئے!

THE [illegible]-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر
ٹانک ہی استعمال کیجئے. یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے. زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے. سر پر نئے
بال اُگانے میں مدد دیتا ہے. اپنے بال صابن سے نہ دھوئیے. یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے. سر دھونے
کے لئے زلفی پاوڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے. ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے.



قیمت زلفی ہیر ٹانک: بارہ روپے ● شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ● زلفی پاوڈر: چھ روپے

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں!
متحدہ اور مکمل تنظیم بمعہ
ایم۔ ایم۔ ملیباری
باب شریف، عرب بلڈنگ وجدہ

متحدہ عرب امارات میں
مینک بیورا یجنسی:
● دبئی (فون نمبر: ۲۲۵۹۵۲، ۲۲۶۹۰)
● مسقط (فون نمبر: ۲۲۲۲۸۳)

● دیرہ (فون نمبر: ۲۲۲۲۶۹)
● شارجہ ● ابوظہبی
دیگر ممالک کیلئے
ایجنسی حاصل کرنے کیلئے لکھئے









جناب سردار گورپال سنگھ واحد

قطعہ تاریخِ وفات حضرت واحد موگوی مرحوم

سُنا ہے کہ واحد عدم کو گئے
اندھیرے میں چھوڑا ہے تیرِ اجل
اُٹھا حاتمِ ثانیٔ روزگار
پرستار تھی اُس کی اِنسانیت
رَوادار و ہر دلعزیز و سخی
شریف و عفیف و نجیب و غنی
یتیموں کا ملجا و ماویٰ تھا وہ
محبت سے بھرپور تھا اُس کا دِل
مِلے گا نہ واحد کا ہرگز بدل
ہزاروں سوالی کھڑے رہ گئے
یہ کہہ کہہ کے روتا ہے سارا جہان

فقط آنِ واحد میں کیا ہو گیا
قضا و قدر نے غضب کر دیا
مٹا دہر سے نامِ جود و سخا
وہ اِنسانیت کا پرستار تھا
وہ سچ مچ تھا اِیثار کا دیوتا
خُدا ترس و خوش سیرت و پارسا
ضعیفوں کا تھا اُستوار آسرا
اُسے ہر بشر سے دِلی پیار تھا
زمانہ اُسے تا ابد روئے گا
اَجل کا فرشتہ اُسے لے اُڑا
کہ واحد حقیقت میں واحد ہی تھا

رتنؔ سالِ رحلت کہو اِس طرح
غریبوں کا ہمدرد آج اُٹھ گیا

١٩٨٣ عیسوی

With Best Compliments From -

A C M E
Papers Limited

Mannfactures of Writing & Printing Papers

Factory :-
SEHORE 466 001
Madhya Pradesh
Telephone 249
314

Gram "ACME" SEHORE.

Regd. Office :-
Herald House, 2nd Floor,
5-A, Bahadur Shah Zafar Marg,
New Delhi 110 002

Telephone 273703 (4 lines)
Telex NOPANY ND 37[illegible]0
Gram "NOPANY", NEW DELHI

With Compliments From

SSI Regd. M.P.S.T. No. BPL III/SRE 2423

SHREE RAM GRAH UDYOG

SEHORE (M. P.)

High Class Liqued & Washing Soap Manufacturers

Please Contact for Bussness Purpuse



ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۲۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
امن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضی مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
نیاز گوالیاری

ایڈیٹر
سرور تونسوی

شانِ ہند نئی دہلی
(ہولی ایڈیشن)

زرِ سالانہ ۲۴/- روپے
فی پرچہ ڈھائی روپے

جلد نمبر ۴۴		مارچ ۱۹۸۳ء		شمارہ نمبر ۳

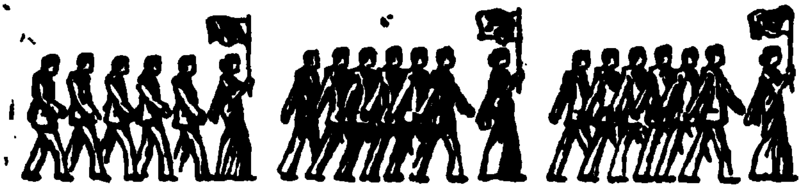
خوابِ بسیرا

فیض احمد فیض

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

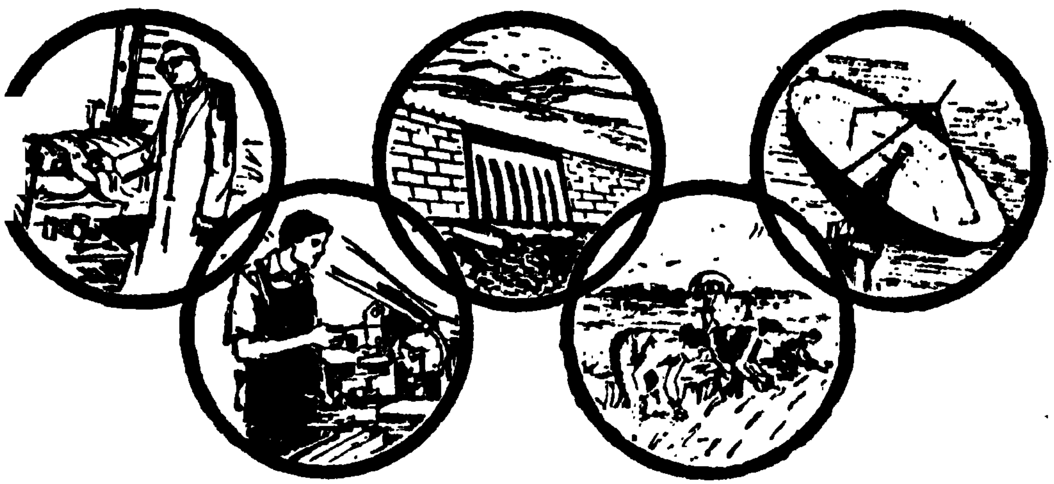
(دورانِ علالت میو ہسپتال لاہور سے)

پبلشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس جنہ شی نگر جامع مسجد دہلی اور ورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔



سدا بڑھتے قدم

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی کے فرائض با اہتمام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں
ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔
اسٹیڈیم ریکارڈ ٹائم میں تعمیر کئے گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں رنگین
ٹیلی ویژن پر کھیل ورزش کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کمپیوٹروں، الیکٹرانک ایکسچینجوں، مائکرو ویو
اور مصنوعی سیارے کے ساتھ رابطوں کے عظیم سلسلے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔





تال میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے

اگر ہم قومی تعمیر کے دیگر شعبوں میں بھی اسی لگن سے کام کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل
کی جا سکتی ہیں۔

آئیے ہم سب مل جل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

پگڑی اپنی سنبھالئے "کھلر"

روزنامہ "قومی آواز" دلی جب سے یشپال کپور صاحب کے اہتمام میں شائع ہونا شروع ہوا ہے اس کا شمار اردو روزناموں کی صفِ اول میں ہونے لگا ہے۔ قومی آواز کی حیاتِ ثانیہ نے اس دور کی اردو صحافت کو ایک نیا موڑ دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ یہ روزنامہ خصوصاً دلی ایڈیشن اردو صحافت کا ایک ایسا نمائندہ ہے جس کے باعث اردو صحافت کا وقار بڑھا ہے اور جس کے لئے قومی آواز دلی ایڈیشن کے ادارتی عملے کو داد دی جانی چاہئے۔

اتوار کو قومی آواز کا ہفتہ وار ضمیمہ شائع ہوتا ہے جو چھپتا تو لکھنؤ میں ہے مگر قومی آواز کے دلی، پٹنہ، بمبئی ایڈیشنوں میں بھی قارئین تک پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ قومی آواز کا لکھنؤ ایڈیشن کسی بھی لحاظ سے دلی ایڈیشن کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس ہفتہ وار ضمیمہ میں کے۔ کے کھلر ایسے طفیلی اردو ادیب کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حالیہ ہفتہ وار ضمیمہ میں "پگڑی اپنی سنبھالیو ذرا میر" کے عنوان سے کھلر صاحب کا مضمون پہلے صفحہ پر شائع کیا گیا ہے۔

ہم نے یہ مضمون تین بار پڑھا اس خیال سے کہ شاید میر سے متعلق کوئی نئی بات کہی گئی ہو کیونکہ جناب گوپال متل صاحب مدیر "تحریک" کا فرمانا ہے کہ کھلر صاحب کے مضامین انگریزی سے اردو میں منتقل کئے ہوتے ہیں اس لئے ہمیں کھلر صاحب کا یہ مضمون تین بار پڑھنا پڑا کہ شاید میر کے بارے میں انگریزی میں کچھ ایسے انکشافات کئے گئے ہوں جن سے اردو ادب اب تک محروم رہا ہو اور کھلر صاحب نے میر سے متعلق ان نئے انکشافات پر اپنے اس مضمون میں کچھ روشنی ڈالی ہو۔ مگر مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ جس طرح کھلر صاحب نے اپنی [illegible]

صاحب کے مضمون کی نقل میں اپنے اصل کو بھی کھو دیا تھا اس مضمون کا بھی وہی عالم ہے چنانچہ ایک جگہ آپ لکھتے ہیں۔

"آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ جب میر لکھنؤ پہنچے تو کسی کو جانتے نہیں تھے بہرحال ایک سرائے میں گئے۔ پتہ لگا کہ مشاعرہ ہو رہا ہے اسی وقت ایک غزل لکھی"

آبِ حیات میں کتابت کی سیکڑوں غلطیاں ہیں۔ محمد حسین آزاد کو رشید حسن خاں چاہے کتنی ہی نقطہ شناس مگر آزاد ایسے گئے گزرے نہیں تھے کہ وہ غزل کہنے اور غزل لکھنے کے فرق کو نہ سمجھیں۔ آبِ حیات میں دیکھئے جہاں سے کھلر صاحب نے یہ عبارت نقل کی ہے اس سے پہلے اور اس کے بعد سارے مضمون میں غزل کہنا ہی لکھا گیا ہے۔ یہ سہو سو فیصد کاتب کا ہی ہو سکتا ہے۔ مگر کھلر صاحب چونکہ خود غزل کہنے اور غزل لکھنے کے فرق کو نہیں سمجھتے اس لئے انہوں نے بھی مکھی پہ مکھی ماردی۔ شاعر شعر کہتا ہے لکھتا نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جو ادیب شعر کہنے اور شعر لکھنے کے فرق سے واقف نہیں وہ میر پر کیا لکھے گا۔ بہار، کھلر صاحب کی بے علمی تو مسلمہ ہے مگر حیرت تو لکھنؤ ایڈیشن کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے کسی صاحب کو کھلر صاحب سے اپنی کتاب کو ایجوکیشن منسٹری کی لائبریریوں میں بھجوانے کی فکر دامن گیر ہے اور وہ کھلر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس قسم کے غیر ضروری اور غیر معیاری مضامین شائع کر کے قومی آواز کے ہفتہ وار ضمیمہ کی ساکھ خراب کر رہا ہے۔

گلام علی کی گگائی گالب کی گجل

آکاش وانی اور دوردرشن پر اکثر غلام کی جگہ گلام، غالب کی جگہ گالب، غزل کی جگہ گجل، راگنی کی جگہ راگنی، ذلیل کی جگہ جلیل، جلیل کی جگہ ذلیل، قسم کی جگہ کسم، قربانی کی جگہ کربانی، قدم کی جگہ کدم، زخمی کی جگہ جخمی کہا جاتا ہے۔ آکاش وانی کے ودوو بھاگ کو

اسٹیشن سے ہر جمعرات کی شام کو پونے چھ بجے "شامِ غزل" پروگرام نشر ہوتا ہے اس نصف گھنٹے کے پروگرام میں اناؤنسر اُردو الفاظ کو جس بے دردی اور کند چھری سے ذبح کرتا ہے اس کے پیشِ نظر غزلوں کے اس بہترین پروگرام کو سننے کو ہی دل نہیں چاہتا اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو الفاظ کا یہ جھٹکا محض اناؤنسر اور گانے والوں کا ہندی داں ہونے کا نتیجہ ہے مگر کیا آکاش وانی اور دُوردرشن کے ذمہ دار کارکنان کا فرض نہیں کہ وہ اناؤنسر کے لئے ایسے امیدواروں کا انتخاب کریں جن کا تلفظ درست ہو اور گانے والے کلاکاروں کو براڈکاسٹ یا ٹیلی کاسٹ کرنے سے پہلے ان کے صحیح تلفظ کی جانچ کر لیا کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آکاش وانی اور دُوردرشن اُردو کا جنازہ نکالنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں اور ان دونوں اداروں کو اس کا رتی بھر احساس نہیں کہ ہمارے ملک کی وزیرِ اعظم کا اُردو کے لئے کیا نظریہ ہے۔ مگر وزیرِ اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کو کامیاب بنانے کا دعویٰ کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عملی طور پر وزیرِ اعظم سے وفاداری کا ثبوت دیں محض زبانی اور فرضی دعوے جب کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں تو ایسے دوغلے لوگوں کو منہ چھپانے کے لئے کہیں جگہ نہیں ملتی

بزمِ صادق رتلام

سیاسی لوگوں کا یہ کہنا حرف حرف صحیح ہے کہ اُردو کو ختم کریں گے تو اُردو والے ہی اور خصوصاً مسلمان اُردو داں ہی اس کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے اس کی ایک چھوٹی سی مثال رتلام میں "بزمِ صادق" کے قیام پر دیکھنے میں آئی۔ جناب شاہد رتلامی نے اپنے استاد جناب بسمل نقشبندی کی رفاقت میں بزمِ صادق قائم کی اور اس بزم کی سرپرستی کے لئے جناب کے۔ کے۔ سنگھ مینک ایسے ہندی کوی میدان میں آگئے اور نہ صرف یہ کہ بزمِ صادق کے توسط سے اُردو کی بقا و حیات کے لئے کمر ہمت باندھی۔ مینک صاحب نے تو اپنی ہندی شاعری کو سو فیصد اُردو زبان میں منتقل کر دیا اور اُردو پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ چونکہ مینک صاحب اکبرآباد کے رہنے والے ہیں لہٰذا ایسی رواں دواں خالص اُردو بولتے ہیں کہ آج کل کے اُردو شعراء ان کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔ مینک صاحب کا ہندی مجموعۂ کلام "جذبۂ عشق" اس قدر سہل اور سلیس اُردو میں ہے کہ ان کا کلام ہر سننے اور پڑھنے والے کی سمجھ میں آسانی سے آسکتا ہے مینک صاحب کا یہی ہندی مجموعہ اضافہ کے ساتھ اُردو رسم الخط میں شانِ ہند شائع کر رہا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ رتلام کے اکثر شعرائے کرام بزمِ صادق اور اس کے بانیوں کے ساتھ ساتھ مینک صاحب ایسے فرشتہ سیرت انسان کے لئے بھی زہر اگل رہے ہیں اور اپنی ناپاک کوششوں کے ذریعہ بزمِ صادق کو ختم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں ہم نہیں چاہتے کہ نام بہ نام اُردو کے ان دشمنوں کو ننگا کریں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان مخالفین بزمِ صادق میں ایسے بھی شعراء ہیں جنہیں اپنا نام بھی اُردو میں لکھنا نہیں آتا۔ ضرورت تو اس امر کی تھی کہ بزمِ صادق کو ہر لحاظ سے کامیاب بنایا جاتا مگر یہ کم ظرف کنوئیں کے مینڈک بزمِ صادق کی مخالفت میں ہی اپنی شاعری کا عروج اور رتلام میں شاعری کا ٹھیکہ دار ہونا سمجھتے ہیں۔ بزمِ صادق نے جشنِ جمہوریت کے موقع پر قومی ایکجہتی پر مشاعرہ منعقد کر کے رتلام کے دشمنانِ اُردو کے سینوں پر جو سانپ لوٹائے ہیں اس کا تقاضا یہ نہیں کہ اندھا دھند بزمِ صادق کی مخالفت کی جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب مل جل کر اُردو کی بقا و حیات کے لئے کوشش کریں

بزمِ سخن کویت کی انعامی طرحی غزلوں کا فیصلہ

بزمِ سخن کویت کی طرحی انعامی غزلوں کا فیصلہ ہونے میں دیر یوں ہوئی کہ اول تو کویت میں اس امر کا فیصلہ ہونا مشکل تھا پھر جن جج حضرات کو جج بنانے کی تجویز سوچی گئی انہیں حضرات کے ہاں سفارشیں آنی شروع ہو گئیں۔ آخرکار چکی والا صاحب نے تمام غزلیات جو ہر دو طرحی مصارع پر ۱۶۵ اور ۱۶۳ ہیں دفتر شانِ ہند میں بھجوا دیں۔ کسٹم والوں نے اس وزنی پارسل کو دیکھنے بھالنے میں کافی وقت لگایا۔ چکی والا صاحب نے اکثر و بیشتر شعراء کو یہ اطلاع دی کہ تمام غزلیات ایڈیٹر شانِ ہند کے ہاں بھجوا دی گئی ہیں بس پھر کیا تھا یار لوگوں نے ایسے ایسے خطوط لکھے کہ اکثر اُردو شعراء کا اخلاقی دیوالیہ نکل گیا۔ کسی نے لکھا کہ انعام مجھے دلوا دیجئے نصف شانِ ہند کی نذر کروں گا۔ کسی نے کوئی لالچ دیا اور کسی نے بڑی سے بڑی سفارش کرائی کہ انعام انہیں دے دیا جائے کیونکہ یہ ضرورت مند ہیں

سی کو لڑکی کی شادی کے لئے یہ انعام حاصل کرنا ضروری تھا تو کسی کو عزت شہرت پانے کے لئے یہ انعام چاہئیے تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد یہ غزلیں ایک ایسے جج کے سپرد کی گئیں کہ جن پر کسی سفارش کا اثر ہونا ناممکن تھا اور جو غلط فیصلہ کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔
اب یہ صاحب ساڑھے تین صد سے زائد غزلوں کا اچھی طرح جائزہ لے چکے ہیں اور جو غزلیں ان کے نزدیک قابلِ انعام ہیں اکی وجہ تسمیہ لکھ رہے ہیں چنانچہ یہ سب کچھ بہت جلد ہو رہا ہے اور مکمل کارروائی کی رپورٹ جیجی والا کے ہاں بھجوا دی جائے گی۔ تاکہ وہ مکمل رپورٹ پڑھنے کے بعد انعامی فیصلے کا اعلان کر دیں۔ یہ فیصلہ شانِ ہند میں شائع ہوگا اور گلدستہ بھی ادارہ شانِ ہند ہی شائع کرے گا۔ تمام ادیبوں اور غزلیات کو ترتیب دیا جا رہا ہے اور خدا نے چاہا تو یہ گلدستہ ماہِ جولائی میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

ڈاکٹر ارمان کو مبارک باد

جناب ڈاکٹر اردے سرانِ ارمان بلاردی کے افسانوں کا مجموعہ "ماں سروور" شانِ ہند نے شائع کیا ہے قومی یک جہتی پر مبنی ان حقیقی افسانوں کو اس قدر پسند کیا گیا کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی نے اس کی متعدد جلدیں ان لائبریریوں کو بھجوائیں جنہیں وہ مالی اور کتابوں کی مدد دیتی ہے۔ دلی پبلک لائبریری نے ماں سروور کی متعدد جلدیں خریدیں۔ یوپی کی سرکاری لائبریریوں میں بھی افسانوں کے اس مجموعہ کی خریداری کی گئی۔ حال ہی میں اتر پردیش اردو اکاڈمی نے "ماں سروور" کو نقد انعام سے نوازا ہے۔ حالانکہ یوپی اردو اکاڈمی کی انعامی کمیٹی میں ایسے بھی مہربان ہیں جنہیں شانِ ہند کے نام سے چڑ ہے اور اگر ان کا بس چلے تو شانِ ہند اور اس کے ایڈیٹر کو دیس نکالا دے دیں۔ مگر ماں سروور کو اردو کے یہ تخریبی ہستیاں بھی نظر انداز نہ کر سکے اور اس کتاب پر انعام کا اعلان کرنا ہی پڑا۔ ادارہ شانِ ہند ڈاکٹر ارمان صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے کہ انہیں اپنی اردو کی پہلی تخلیق پر انعام سے نوازا گیا۔

درباری شاعر

حکومت آندھرا پردیش نے فوری طور پر ریاست میں درباری شاعر اور استعمانہ و دوان کے عہدوں کو ختم کر دیا ہے آندھرا پردیش کی کابینہ کی میٹنگ کے بعد اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ جناب این ٹی راما راؤ نے کہا کہ یہ عہدے جاگیردارانہ اور شاہی عہد کی عکاسی کرتے ہیں اور ہندوستان ایک جمہوری ریاست بن جانے کے بعد ایسے عہدوں کی گنجائش نہیں رکھتا۔
ہم وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش کے اس اقدام کی یقیناً قدر کرتے ہیں مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تلگو دیشم حکومت اردو کے سلسلے میں کسی حد تک متعصب ضرور ہے جس کی امید این۔ ٹی۔ راما راؤ ایسے عوام پسند اور مقبول وزیر اعلیٰ سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ امید ہے کہ تلگو دیشم حکومت آندھرا پردیش میں اردو کے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کرے گی۔

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کا قابلِ تعریف فیصلہ

"ظہورِ قدسی" "بہارستانِ اولیاء" اور مختلف تصانیف کے مصنف حضرت آرزو سہارن پوری اس وقت ملک بھر میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں آرزو صاحب کی کہی ہوئی نعتیں اور مناقب اکثر و بیشتر پاکستانی روزناموں کے صفحہ اول پر سالم صفحہ میں شائع کی جاتی ہیں۔ ظہورِ قدسی کے اس وقت تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں نعتوں اور مناقب کا ایسا بہترین مجموعہ آج تک کوئی دوسرا شائع نہیں ہوا۔ اور بہارستانِ اولیاء بھی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے آرزو صاحب کے دوسرے شعری مجموعے دنیائے شعر و ادب میں ایسا مقام رکھتے ہیں کہ اہلِ سخن اور سخن فہم حضرات انہیں مشعلِ راہ بنائے ہوئے ہیں۔
آرزو صاحب کسی وقت حیدر آباد کے شاہی خاندان میں اپنی ادبی اور شعری صلاحیتوں کے باعث استادانہ مقام رکھتے تھے پھر کلکتہ میں آپ آنریری مجسٹریٹ بھی رہے مگر اب پیرانہ سالی کے باعث اور پاؤں ٹوٹ جانے کی وجہ سے بے یار و مددگار رہتے۔
اتر پردیش اردو اکاڈمی نے آرزو صاحب کے لئے دو صد روپیہ ماہانہ ادبی پینشن دینے کا فیصلہ کیا ہے اور ادارہ شانِ ہند اتر پردیش اردو اکاڈمی کے اس دانشمندانہ اور قابلِ ستائش فیصلے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ••

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

سفیرِ انسانیت گوپال سنگھ واحد

۲۵ سال ہوئے کہ ایک دن سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست سے ملنے گیا۔ سرور صاحب یہ ہیں موگا کے سردار گوپال سنگھ واحد آپ ایک مشہور جرنلسٹ ہیں ریاست کے مداح اور اپنے مہربان اور دیرینہ دوست ہیں اور کافی امیر ہیں۔ کھدر کا کرتا اور کھدر کا ہی کچھا دیکھا زیب تن کئے سر کے بال کٹے ہوئے فرشتوں ایسا پاک اور چمکتا ہوا چہرہ روشن آنکھیں۔ یہ تھے واحد صاحب جو ریاست کا نمونہ بنے بیٹھے تھے۔ میں نے واحد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا واحد صاحب ست سری اکال جی! واحد صاحب نے خشوع و خضوع سے مصافحہ کیا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون واحد صاحب کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے یہ ہیں سرور صاحب۔ ماہنامہ شانِ ہند کے ایڈیٹر ہیں ان کا رسالہ بہت اچھا ہوتا ہے ہماری معذرت کی مینشن ان کے بغیر کبھی نہیں رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

واحد صاحب نے زبان کھولی تو سیدھی سادی بولی جو اردو اور پنجابی کی آمیزش لئے ہوئے تھی اور بولنے کا انداز ایسا دلکش و دلفریب کہ واحد صاحب بولتے رہیں اور کانوں میں رس گھولتے رہیں اس مختصر سے تعارف کے بعد کئی ماہ بعد واحد صاحب کا خط موصول ہوا کہ شانِ ہند کا ایک شمارہ دفتر ریاست سے سردار صاحب سے مانگ لایا تھا رسالہ پسند آیا اسے میرے نام ہر ماہ بھجوایئے۔ زرِ سالانہ بذریعہ منی آرڈر بھجوا دیا ہے وہ دن اور ۲۵ فروری ۱۹۶۸ء تک واحد صاحب شانِ ہند کو پسند فرماتے رہے اور شانِ ہند کے ایڈیٹر کے ساتھ ان کے سگے بھائیوں سے تعلقات رہے۔

سردار دیوان سنگھ کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا اور اس حلقۂ احباب میں کثرت کھاتے پیتے حضرات کی تھی سردار دیوان سنگھ نے بے شمار لاکھوں روپیہ کمایا مگر ان کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا موقعہ آیا ہو کہ انہیں روپیہ کی ضرورت نہ رہی ہو اس کا سبب

یہ تھا کہ خواہ کتنا ہی روپیہ کیوں نہ آئے سگریٹ کو ان کا کیش بکس جو کہ کریم کریکر بسکٹ کا ڈبہ ہوتا تھا نقدی سے قطعاً خالی ہو جاتا تھا اگر بھولے بھٹکے سے دو چار آنے بھی اس کیش بکس میں پڑے رہ جاتے تو سردار صاحب کو رات کو نیند نہیں آتی تھی ایک رات گیارہ بجے تک انہیں نیند نہیں آئی تو نوکر کو آواز دی وہ بھاگا بھاگا اوپر سردار صاحب کے پاس آیا فرمانے لگے اندر سے پیسوں والا ڈبہ اٹھا کر لاؤ ملازم نے فوراً تعمیلِ حکم کی۔ ڈبے میں رکھے کاغذات چیک وغیرہ بستر پر ہی الٹ دئے تو ایک دونی بھی برآمد ہوئی قہقہہ لگا کر کہنے لگے اب پتہ چلا ظالم ذرا سی نیند کیوں نہیں آتی تھی۔ دونی نوکر کو دے کر کہنے لگے۔ جگت سینما پر جاؤ وہاں رہ خوانچے والے بارہ بجے تک ملیں گے دو آنے کی گنڈیریاں لے کر چوس لو۔ نوکر باہر سے تالا لگا کر تعمیلِ حکم کے لئے چلا گیا اور سردار صاحب پانچ منٹ کے اندر اندر گہری نیند میں تھے۔

ہر قسم کے اخراجات میں فراخ دلی ان کا خاصہ تھا لہٰذا روپیہ کی ضرورت انہیں ہر وقت رہتی تھی اس لئے انہوں نے ایسے کھاتے پیتے حضرات سے مراسم پیدا کر رکھے تھے جن سے طلب کرنے سے فوراً روپیہ مل جاتا تھا ایسے کھاتے پیتے حضرات میں ہی سردار گوپال سنگھ واحد کا بھی شمار ہوتا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نہ تو سردار دیوان سنگھ کو ہی یاد تھا کہ انہوں نے واحد صاحب سے کتنی بار مالی مدد لی ہوگی اور نہ ہی واحد صاحب کو یاد تھا کہ انہیں کتنے چیک اس "نیک کام" میں دینے پڑے ہوں گے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون میں یہ کمی احسان فراموشی کی حد تک تھی کہ اگر کبھی کبھار ان کا کوئی مطالبہ کسی دوست نے مجبوری یا حالات کے تحت پورا نہ کیا تو وہ ناراض ہو جاتے تھے خواہ اس دوست نے ان کی سینکڑوں بار مالی مدد کی ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ سردار صاحب نے واحد صاحب سے کچھ مالی مدد چاہی جو انہوں نے وعدہ کیا کہ

موگا جاتے ہی چیک بھجوا دوں گا۔ واحد صاحب کا پنجاب کی سیاست میں بڑا عمل دخل رہتا تھا، وہ خود تو کسی سیاسی عہدہ یا وزارتی کرسی کے خواہش مند کبھی نہ رہے مگر نہ معلوم کتنے وزیروں کی منسٹری واحد صاحب کے طفیل قائم تھی، ہمارے موجودہ راشٹرپتی گیانی ذیل سنگھ صاحب سے بھی واحد صاحب کے انتہائی بے تکلف اور برادرانہ مراسم عمر کے آخری دن تک رہے۔ چنانچہ واحد صاحب کو موگا پہنچتے ہی کسی سیاسی معاملہ میں کچھ دنوں کے لئے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنی پڑی اور ادھر سردار دیوان سنگھ مفتون چیک کے انتظار میں دیوانگی کی حد تک آ چکے تھے۔ دس پندرہ دنوں کے بعد واحد صاحب نے رجسٹرڈ خط سے چیک سردار صاحب کو بھجوایا اور سردار صاحب نے غصے کے باعث چیک کے چند ٹکڑے کئے اور لفافے میں رکھ کر واحد صاحب کو واپس کر دئے۔

کچھ دنوں بعد واحد صاحب دہلی تشریف لائے اور حسب سابق سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں تشریف لائے میں بھی سردار صاحب کے ہاں موجود تھا چپراسی نے آکر کہا کہ موگا سے واحد صاحب آئے ہیں۔ سردار صاحب نے قدرے خفگی کے انداز میں کہا بھیج دو۔ واحد صاحب اوپر آئے تو سردار صاحب نے بیٹھے بیٹھے ہی ہاتھ ملایا، واحد صاحب صوفے پر میرے قریب ہی بیٹھ گئے دو چار منٹ بعد سردار صاحب نے کچھ لکھنے کے بعد کرسی کو گھماتے ہوئے واحد صاحب کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا سناؤ جی کیسے آنا ہوا۔ واحد صاحب نے اپنی روایتی متانت اور شیریں بیانی کے موتی بکھیرتے ہوئے کہا مفتون جی میں ایک عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے کوئی ایسا تحفہ لوں جو مجھے آپ کی یاد دلاتا رہے اور آپ نے میری یہ دلی خواہش پوری فرما دی اس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کیونکہ آپ نے مجھے ایسا تحفہ دیا ہے کہ جسے میں دوسروں کے سامنے بھی فخریہ پیش کر کے کہہ سکتا ہوں کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایک غیور اور بے غرض نیز روپیہ کے لالچ سے کوسوں دور ہے۔ مفتون صاحب حیرت سے واحد صاحب کی یہ تقریر دلپذیر سن ہی رہے تھے کہ واحد صاحب نے کرتے کی اندرونی جیب سے مفتون صاحب کا لفافہ نکال کر چیک کے ٹکڑے انہیں دکھائے اور کہا کہ جب آپ کے کوئی مخالف یا میرے احباب یہ دیکھیں گے کہ سردار صاحب نے ایک ہزار روپیہ (اس زمانے میں ایک ہزار روپیہ میں کافی جان تھی) کا چیک ٹکڑے ٹکڑے کر کے واپس کر دیا ہے تو اس سے زیادہ مفتون صاحب کی غیوری اور بے غرض نیت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ سردار صاحب کو اپنی غلطی کا احساس کبھی ہوتا ہی نہیں تھا مگر واحد صاحب کی شیریں بیانی متانت اور بات کرنے کے اس ڈھنگ نے مفتون صاحب ایسے گرگِ باراں دیدہ کو بھی مجبور کر دیا اور وہ کرسی سے اٹھے واحد صاحب کو گلے لگایا اور واقعی ندامت آمیز لہجے میں کہا واحد یار معاف کرنا۔ اس کے بعد واحد صاحب نے چیک دیر سے بھجوانے کی وجہ بیان کی تو سردار صاحب کو اپنی جلد بازی پر بظاہر افسوس ہوا اور واحد صاحب نے ایک ہزار کے نئے نوٹ سردار صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ سردار جی ایک ہزار روپیہ تو میں آپ کے سر پہ سے وار سکتا ہوں (صدقہ دے سکتا ہوں)

سردار دیوان سنگھ مفتون بڑے شکی مزاج تھے اس لئے انہوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ جن حضرات سے انہیں مالی مفاد پہنچتا ان سے کم سے کم ملا جائے چونکہ سردار دیوان سنگھ مفتون کا واسطہ اکثر ریاستوں کے دیوانوں، وزراء اور افسران سے پڑتا تھا اور یہ لوگ اپنے نواب یا مہاراجہ سے مفتون صاحب کے نام پہ روپیہ لیتے زیادہ اور مفتون صاحب تک پہنچتا کم اس لئے ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا سردار صاحب کو ریاستوں کے دیوانوں، حکام اور افسران سے ودیعت ہوا چنانچہ جب کبھی میری موجودگی میں واحد صاحب یا کوئی دوسرا ایسا شخص سردار صاحب کے ہاں آتا تو میں ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ ان صاحب سے میری بھی علیک سلیک ہے چنانچہ واحد صاحب نے خود ہی شانِ ہند میں میرا کوئی ادارتی نوٹ پسند آنے پر خط لکھے تو میں انہیں شکریہ کا خط لکھ دیتا۔

ریاست بند ہونے پر جب سردار صاحب دہرہ دون تشریف لے گئے تو واحد صاحب سے میرے تعلقات میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور جب سردار دیوان سنگھ مفتون کا انتقال ہوا تو واحد صاحب نے مفتون صاحب کے انتقال پر اظہارِ افسوس کا خط مجھے لکھا اور دو تین دن بعد ہی دہلی تشریف لائے اور مفتون صاحب کے چوتھے میں میرے ساتھ ہی شریک ہوئے۔

اب واحد صاحب جب بھی دہلی تشریف لاتے تو غریب خانہ پر

ضرور تشریف لاتے اور اگر میں گھر پر موجود نہ ہوتا تو چنڈی گڑھ یا موگا سے فون کرتے واحد صاحب شورش کاشمیری کی تحریروں کے عاشق تھے۔ شورش کاشمیری سے ان کے ذاتی تعلقات بھی بہت اچھے تھے شورش کاشمیری صاحب کا ہفتہ وار اخبار "چٹان" میرے ہاں آتا تھا واحد صاحب کا حکم تھا کہ چٹان کا ایک پرچہ بھی گم نہ ہو اور نہ کسی کو دیا جائے جب بھی دہلی تشریف لاتے چٹان کے تمام پرچے لے جاتے۔ رئیس امروہوی سے بھی ان کے برادرانہ تعلقات تھے۔ رئیس صاحب نے اپنے قطعات کے مجموعوں کی دونوں جلدیں بذریعہ ڈاک مرحمت فرمائیں واحد صاحب دہلی تشریف لائے تو فرمانے لگے کہ دونوں جلدیں تو میں لئے جا رہا ہوں آپ اور منگا لینا۔ موگا پہنچے تو یہ دونوں جلدیں رئیس صاحب کی طرف سے ان کے ہاں بھی آ چکی تھیں فوراً فون پر اطلاع دی اور اگلی مرتبہ جب دہلی آئے تو دونوں جلدیں واپس دے گئے۔

پنجاب میں واحد صاحب اردو کے ایسے نمائندہ تھے کہ اب کوئی دوسرا ایسا نظر نہیں آتا اردو کی ہر بہترین کتب ان کے ہاں موجود ملتی۔ واحد صاحب نے شادی نہیں کی، عمر میں کبھی شراب نہیں پی گوشت سے بھی پرہیز کرتے تھے، غرضیکہ کوئی عیب ان کے قریب سے بھی ہو کر نہیں گزرا تھا بس شوق تھا تو اردو کی بہتر سے بہتر ہر کتاب کو خریدنے کا۔

جناب ابوالبلاغت رتن پنڈوروی کا فرمان بالکل بجا ہے کہ واحد صاحب نے اپنا تخلص واحد رکھا اور ان پر واحد معنوی لحاظ سے اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ ان کی ہر ادا واحد کی ہی حیثیت رکھتی تھی

قبلہ رتن صاحب کی شہرہ آفاق کتاب "ہندی کے مسلمان شعراء" کا مسودہ جب تیار ہو کر برائے اشاعت آیا تو چھپائی میں فنانشیل پرابلم سامنے آئی۔ جناب راجندر سنگھ بیدی جناب عقیل احمد صاحب صدیقی حکیم رئیس سنبھلی کو اس کتاب کی اشاعت کے لئے مالی تعاون کے لئے لکھا تو سردار واحد صاحب کو بھی لکھا اور جواب خط کے ساتھ اکیس صد روپیہ کا چیک بھی ملفوف تھا۔ کتاب چھپنے کے بعد یہ واحد صاحب کا ہی احسان تھا کہ چنڈی گڑھ میں اس کتاب کو جناب پانڈے صاحب وزیر صحت سے ریلیز کرایا اور جہاں حکومت پنجاب نے رتن صاحب کی عزت افزائی فرمائی وہاں واحد صاحب نے اپنی جیب خاص سے گیارہ صد روپیہ اور ایک اونی شال رتن صاحب کی نذر کیا۔ رتن صاحب کا منظوم ترجمہ گیتا "سر معرفت" جسے ناشر شائع کر رہا ہے جناب پانڈے صاحب وزیر صحت کی رہائش گاہ پر گیتا کی اشاعت کے سلسلے میں ذکر آیا تو پانڈے جی نے دریافت فرمایا سردار صاحب گیتا کی اشاعت پر کس قدر اخراجات ہوں گے عرض کیا گیا کہ پانچ ہزار روپیہ کا اندازہ ہے تو واحد صاحب نے فرمایا کہ کتنا اچھے کاغذ پر چھاپئے گا سردار صاحب ایک ہزار روپیہ میں دوں گا۔ انتقال فرمانے سے ایک روز پہلے واحد صاحب نے چنڈی گڑھ سے فون پر کہا کہ گیتا کے بارے میں میں بھی کچھ لکھنا چاہتا ہوں جسے گیتا میں شامل اشاعت کرنا ہے ایک صفحہ خالی رکھئے گا اور یہ ایک صفحہ اب بھی خالی ہے اور گیتا کی چھپائی وقتی طور پر معرض التوا میں ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۸۰ء کی صبح چھ بجے واحد صاحب کا فون آیا چند منٹ تک بات چیت ہوتی رہی میرے کئی کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے جس کی نسبت انہوں نے یقین دہانی فرمائی، اور کہا کہ میں آج ایک دو دن کے لئے موگا جا رہا ہوں واپس آتے ہی مینی صاحب ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز پنجاب سے مل کر ہندی کے مسلمان شعراء کی بقیہ پچاس جلدوں کی قیمت کا ڈرافٹ بھجوانے کی سعی کروں گا پانڈے صاحب سے کہوں گا کہ گیتا کی اشاعت کے بارے میں اپنا وعدہ پورا کریں اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ ہفتہ دس دن کے اندر اندر دہلی آ رہا ہوں اور گیتا کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ آپ کو دوں گا اور آپ کے مشورہ سے ہی گیتا میں شائع ہو گا ایک صفحہ خالی رکھئے گا فلاں فلاں کتاب لے رکھنا میں لیتا آؤں گا

میں واحد صاحب کا منتظر تھا کہ ۳ مارچ کو ایک ماتمی پوسٹ کارڈ ملا جس میں یہ افسوسناک خبر دی گئی تھی کہ واحد صاحب ۲۶ فروری کو موگا میں اچانک انتقال فرما گئے رسم بھوگ اور ارداس ۶ مارچ ۱۹۸۰ء کو ہو گا خط کو کئی بار پڑھا یقین نہیں آتا تھا کہ واحد صاحب اب اس جہاں میں نہیں رہے اس افسوسناک اطلاع سے دل کو ایسا دھکا لگا کہ ایک ہفتہ تک چارپائی پر رہا جب حواس کچھ بجا ہوئے تو ماتمی کارڈ بھجوانے والے سردار کرتار سنگھ مینیجنگ ڈائریکٹر مالوہ سٹیل ٹیوبز اور جناب پانڈے

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

عقیدت صدیقی

مُشاعرہ نارنول (ہریانہ)

منشی لعل تلخ

ہریانہ پردیش کا شہر نارنول ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں نارنول ایک صوبے کی حیثیت رکھتا تھا زمانہ ماضی کی تعمیر شدہ عمارتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ تہذیبی معیار سے یہ کس قدر عروج پر رہا ہوگا۔ یہ درست ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد اردو زبان مسلسل زوال پذیر ہے۔ دو سال ہوئے نارنول میں "کاویہ کلا کیندر" کا قیام ظہور میں آیا حقیقتاً آج بھی نارنول کی مٹی میں وہ جراثیم موجود ہیں جن کو اگر سازگار ماحول ملے تو اردو زبان کو بلندی نصیب ہو سکتی ہے۔ کاویہ کلا کیندر کے اہتمام میں مورخہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۸۲ء کی شام سات بجے جناب بی۔ ڈی کالیہ ہمدم کے ناول "کس نام سے پکاروں"، کے جشنِ اجرا کے موقع پر ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں پنجاب اور ہریانہ کے شعراء حضرات نے شرکت کی۔

جناب این بالا باسکر ڈپٹی کمشنر نارنول نے ناول کی رسم اجرا کرتے ہوئے مصنف کی اس کامیاب کاوش پر مبارکباد دی اور اُن کے ادبی ذوق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمدم صاحب نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود اپنے ناول میں سماج کے ہر پہلو کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے جس سے قاری سحر زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ باسکر صاحب کے بعد زار علامی صاحب، خمار صاحب، نرمل صاحب اور تلخ صاحب نے اس ناول پہ ناقدانہ تاثرات پیش کئے۔ بعد ازاں پروفیسر آتش بہاولپوری سکریٹری انجمن ترقی اردو ہریانہ نے حسب ذیل نظم پیش کر کے سامعین سے داد حاصل کی۔

اے مرے ہمدم مرے دمساز میرے غم گسار
تیرے ہی دم سے گلستانِ ادب میں ہے بہار
تیرا ناول کیا ہے اک تصویر ہے اس دور کی
سر بسر الفاظ [illegible]

فخر کے لائق ہے تیری کاوشِ فکرِ جمیل
یہ ترا ناول ہے تیری قابلیت کی دلیل
جاذبیت بھی ہے اس میں دلکشی بھی اس میں ہے
درسِ عبرت بھی پیامِ زندگی بھی اس میں ہے
اس میں حسنِ شمع بھی ہے سوزِ پروانہ بھی ہے
تیرا ناول اک حقیقت بھی ہے افسانہ بھی ہے
جانتا ہوں ترجمانِ فطرتِ انساں تجھے
سخت حیراں ہوں 'پکاروں میں تجھے کس نام سے'
کامرانی پر تری تخلیق کی ہوں شاد میں
آج تجھ کو کیوں نہ دوں دل سے مبارکباد میں

آتش صاحب کی اس نظم کے بعد مشاعرہ کی کارروائی زیرِ صدارت جناب پریم مہرا صاحب ایس پی نارنول شروع ہوئی سکریٹری کے فرائض پروفیسر موہن منشی نے انجام دیتے ہوئے جناب غافل بھوانی کو کلام پڑھنے کی دعوت دی۔ غافل صاحب سے ایک عاقلانہ قطعہ سُنئے ؎

میرا ہی درد میرا رہنما بنتا گیا اکثر
اسی کی رہبری میں خانۂ معبود تک پہنچا
فقط غافل سمجھ کر چھوڑ آئی تھی مجھے دنیا
مگر میں سب سے پہلے منزلِ مقصود تک پہنچا

غافل صاحب کو قطعہ پر خوب داد ملی ہے اب مائیک پر آئے ہیں بھوانی کے کیلاش شاہین صاحب جو ترنم سے غزل سرا ہیں حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

پھر نیا کوئی نہ کوئی حادثہ ہونے کو ہے
آج پھر ان سے ہمارا سامنا ہونے کو ہے
کھینچتا ہے اک طرف طوفاں، کنارا اک طرف
کشتیِ دل آج تیرا فیصلہ ہونے کو ہے

دیکھئے گا کس طرح کروٹ بدلتی ہے فضا
آج پھر شاہیں یہاں نغمہ سرا ہونے کو ہے

شاہین اپنی جگہ آگئے تو ناظم صاحب نے ڈاکٹر ست نام سنگھ خمار کو دعوتِ نغمگی دی خمار صاحب بھی ترنم سے غزل ارشاد فرمارہے ہیں ان کے چار اشعار سماعت فرمائیے ؎

گھر کے افراد کو تقسیم کیا ہے جس نے
دل کی ٹھوکر سے وہ دیوار گرادو یارو
پہلے سمجھاؤ مجھے لفظِ خطا کے معنی
پھر مجھے میرے گناہوں کی سزا دو یارو
اس کے مفہوم کی خوشبو بھی فضا میں پھیلے
میرے پیغام کو سولی پہ چڑھادو یارو
اگلے ٹھہراؤ پہ ہے جس کو بدلنی گاڑی
وہ ابھی نیند میں ہے اس کو جگادو یارو

خمار صاحب مناسب داد پاکر مائیک سے الگ ہوئے
دیوار ٹی کے ڈاکٹر دویا ساگر قمر کو کلام عنایت فرمانے کی درخواست کی گئی ہے۔ قمر صاحب حضرت برق دہلوی کے خاندان سے ہیں سنئے قمر صاحب دلی کی زبان میں کس قدر اچھے اشعار مرحمت فرمارہے ہیں ؎

لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
بگڑا ہوا کسی کا مقدر نہیں ہوں میں
باغِ جہاں میں شاخِ بریدہ بھی میں نہیں
ٹوٹا ہوا فلک سے بھی اختر نہیں ہوں میں
جامِ جہاں نما ہے تخیل مرا مجھے
جمشید میں نہیں ہوں سکندر نہیں ہوں میں
ورثہ میں شوقِ شعر و سخن تھا ملا مجھے
اہلِ کلام وقت کا ہمسر نہیں ہوں میں
شاید ہو کوئی شعر کسی کام کا مرا
پھر بھی میں نہیں ہوں جو تونگر نہیں ہوں میں

قمر صاحب اچھی داد پاکر اپنی جگہ تشریف لے جانے لگے تو سامعین نے پرزور اصرار فرمایا ہے کہ قمر صاحب ایک غزل اور سنائیں چنانچہ قمر صاحب نے ایک نظم قطرۂ اشک

سنائی ہے اور مناسب داد پائی ہے۔
سٹیج سکریٹری صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے کہ خمار صاحب نے ان سے مائیک لے کر اعلان کیا ہے کہ اب آپ کے سامنے بھن نام سے پکاروں کے خالق ہمدم صاحب جو اچھے شاعر بھی ہیں کلام پیش کریں گے۔ لیجئے جناب بی۔ ڈی۔ کالیہ ہمدم صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور تحت میں غزل سنائی ہے آپ بھی ان کے مطلع کو سنئے ؎

تشنگی محوِ فغاں ہے ساغروں کے شہر میں
آرزوئیں بند ہیں اب لاکروں کے شہر میں

سامعین نے دل کھول کر داد دی ہے۔ سنئے ہمدم صاحب کس قدر بہترین شعر سنا رہے ہیں ؎

یہ سکوتِ زندگی ہے یا زباں بندی ہے کیا
کوئی فریادی نہیں ہے حاکموں کے شہر میں

اس شعر پہ صاحب صدر نے بھی بے ساختہ داد دی ہے، ہمدم صاحب داد سے بے نیاز ارشاد فرمارہے ہیں ؎

بے وفائی ہے کہیں تو ہے کہیں دلکش فریب
کیا نہیں دیکھا ہے ہم نے دوستوں کے شہر میں
اب ہماری دوستی ہے گردشِ ایام سے
زندگی نغمہ سرا ہے قاتلوں کے شہر میں
ہم ستمگر سے بھی پیش آئے خلوصِ دل کے ساتھ
ہم نے آئینے تراشے پتھروں کے شہر میں

اس شعر پہ داد کا عالم ہی کچھ اور ہے اور ہمدم صاحب مقطع ارشاد فرمارہے ہیں ؎

صاحبِ دیوان تو ہمدم بہت مل جائیں گے
شاعری لیکن کہاں ہے شاعروں کے شہر میں

ہمدم صاحب داد و ستائش جھولی میں سمیٹے اپنی جگہ پر واپس جا رہے ہیں اور سکریٹری صاحب نے جناب نرنجن لعل صابر بھوانی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ لیجئے صابر صاحب ترنم سے غزل سرا ہیں ان کے ترنم نے ایسا سحر کیا کہ صرف ایک شعر ہی نوٹ کیا جا سکا۔ آپ بھی سن لیجئے ؎

یوں مست نگاہوں سے دیکھو نہ میرے دل کو
معلوم نہیں کافر کس وقت بدل جائے

اب جناب رمیش شرما صاحب کو جو نابینا ہیں دعوتِ سخن دی گئی ہے۔ آپ مقامی کالج میں موسیقی کے ماسٹر ہیں لہٰذا موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے غزل ترنم میں عطا فرما رہے ہیں ان کے فنکارانہ ترنم کا تو خیر آپ لطف نہیں اٹھا سکتے البتہ دو اشعار سُن لیجئے ؎

دید کو تا عمر ترسے موت پر آئے بھی وہ
پر ہمارے درمیاں دیوار بن بیٹھا کفن
دیر سے بنتا تو کیا پر عکس مٹتا تو نہیں
ریت کے بدلے اگر پتھر پہ ہم کرتے جتن

شرما صاحب نے اچھی موسیقی کے باعث خوب خوب داد پائی۔ اور اب سکریٹری صاحب نے بڑے اچھے انداز سے 'نذرِ اقبال' کے خالق جناب پروفیسر آتش بہاولپوری سونی پت کو دعوتِ سخن دی ہے۔ آتش صاحب نے علامہ اقبال کے اشعار پر تضمین پیش کر کے مناسب داد پائی ہے اور اب وہ غزل عطا فرما رہے ہیں ؎

بے سبب لب نہ کھولئے صاحب
بات کچھ ہو تو بولئے صاحب
حرف گیری نہ کیجئے ہم پر ...
اپنے دل کو ٹٹولئے صاحب
آپ کا جس طرف اشارہ تھا
ہم اُسی سمت ہو لئے صاحب
دل کی باتوں کو دل سمجھتا ہے
بولئے یا نہ بولئے صاحب
جس نے کانٹوں سے بھی نباہ کیا
اس کو پھولوں سے تولئے صاحب
جس قدر زہر میلے نخیت میں ہے
ہم نے دل میں سمو لئے صاحب

آتش صاحب نے غزل پر خوب خوب داد پائی ہے۔ اب جناب اندرجیت سنگھ نازؔ پرنسپل گورمنٹ کالج کرنال سے گزارش کی گئی ہے کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں۔ سنئے نازؔ صاحب کس قدر اچھے اشعار عنایت فرما رہے ہیں ؎

زندگی کے واسطے جتنے جہاں بنتے رہے
وقت کے چہرے پہ اُتنے ہی نشاں بنتے رہے
رات بھر برسات میں چھپر مرا ٹپکا کیا
ذہن میں لیکن مرے کتنے مکاں بنتے رہے
آہ بھی کوئی نہیں فریاد بھی کوئی نہیں
زخم لیکن سب مرے میری زباں بنتے رہے
مدتوں سے میرے گلشن کا یہی احوال ہے
بجلیاں گرتی رہیں اور آشیاں بنتے رہے

نازؔ صاحب داد سے جھولیاں بھرے مائیک سے ہٹے تو ہمدمؔ صاحب نے سکریٹری صاحب سے کچھ کہتے ہوئے مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ سنئے ہمدمؔ صاحب فرما رہے ہیں۔ فخرِ ادب، ماہرِ عروض جناب زارؔ علامی صاحب نے نہ معلوم کتنے متلاشیانِ شعر و سخن کو شعر گوئی اور شعر فہمی کی دولت عطا کی ہے۔ قبلہ زارؔ صاحب کا تعارف چند الفاظ میں کرانا ناممکن ہے بس یہ کہنا ہی بجا ہے کہ زارؔ صاحب ایک ایسے آفتاب ہیں جن سے جو چاہے شعر و شاعری کے سلسلہ میں روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ سنئے جناب زارؔ علامی صاحب نے اُستادانہ انداز کی رُباعیات عطا کرنے کے بعد غزل عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

شامِ غم سخت گھڑی ہو جیسے
نزع میں جی پہ بنی ہو جیسے
عالمِ حسن کا عالم عالم۔
کیاری پھولوں سے بھری ہو جیسے
اللہ اللہ، یہ تبسم کی بہار
چاندنی رات کھلی ہو جیسے
حسن کی جھیل جوانی کے کنول
آگ پانی میں لگی ہو جیسے
یوں تربت نور سے پایا نور
شمع سے شمع جلی ہو جیسے
گوشۂ عاشق پہ یہ سبزے کا نمود
چادرِ سبز چڑھی ہو جیسے

ذرا اس حسینِ سراپا کا ذکر
چھوٹا منہ بات بڑی ہو جیسے

غزل یقیناً حاصلِ مشاعرہ ہے ہر شعر پہ جو والہانہ داد دی گئی ہے وہ اس کی غمازی کرتی ہے کہ سامعین شعرا اور اس کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اب مجھ ناچیز سے بھی ایک قطعہ سُن لیجئے۔ عرض کیا ہے ؎

آج پینے کا ہم کو ہوش کہاں
ان نگاہوں سے مے برستی ہے
مست و بے خود ہوں میں مگر ساقی
زندگی کیف کو ترستی ہے

اب جناب سنتوش کمار کوکب صاحب سے سکریٹری صاحب نے گزارش کی ہے کہ تشریف لائیں اور کلام مرحمت فرمائیں کوکب صاحب کی غزل نوٹ نہ کی جا سکی آپ کی دو رباعیات سماعت فرمائیے ؎

تقدیر پہ آرام نہیں کرتے ہم
کردار کو بدنام نہیں کرتے ہم
تسلیم نہیں ہم کو خوشامد کوکب
اے دوست یہی کام نہیں کرتے ہم

خوش حال کو بد حال سمجھ لیتی ہے
زر دار کو کنگال سمجھ لیتی ہے
پتھر پڑے اس آنکھ پہ کوکب
جو آنکھ خود دار کو پامال سمجھ لیتی ہے

کوکب صاحب نے غزل اور رباعیات پر اچھی داد پائی ہے۔
صاحب صدر نے مشاعرے کی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ آج کی یہ محفل شعر و سخن خوب تھی اور یاد داشتوں میں یہ محفل مدتوں اپنی خوشگوار مہک قائم رکھےگی مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی نارنول میں خدمتِ ادب کے لئے ایسے مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہے گا۔ آخر میں جناب نریندر سنگھ یادو پریذیڈنٹ بار ایسوسی ایشن نارنول نے مہمانِ خصوصی، صدرِ مشاعرہ شعرا حضرات اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور یہ یادگاری محفلِ مشاعرہ رات کے بارہ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ ●●

قطعات

بسمل خیستی

(جناب ساحر ہوشیارپوری کے نئے مجموعۂ کلام سحرِ حرف کی اشاعت پر)

یہ "سحرِ حرف" ہے ساحر کا سحرِ حسنِ کمال
یہ سحرِ حرف ہے ساحر کا سحرِ فکر و خیال
یہ سحرِ حرف ہے کہ ہے سحرِ سامری کا جواب
نِرا گمان ہے اس کی برابری کا سوال

○

بسمل اس پہ کوئی حرف آئے یہ ہے محال
نہیں کسی میں یہ دم خم، یہ حوصلہ یہ مجال
یہ سحرِ حرف امینِ حرفِ ادب کی تجلی ہے
یہ سحر وہ ہے کبھی جس پہ آئے گا نہ زوال

○

یہ سحرِ حرف عروسِ غزل کا سحرِ جمال
تلاش پر بھی نہ اس کی کہیں ملے گی مثال
بسمل کیوں نہ ہوں مسحور شعر کے رسیا
یہ سحرِ حرف تو فی الواقعہ ہے سحرِ حلال

○

یہ سحرِ حرف ہے آئینۂ بلاغت بھی....
بیاں میں زور ہے تخیل کی لطافت بھی
یہ سحرِ حرف ہے وہ حرفِ معتبر کہ بسمل
خوشی سے جھوم اٹھی روحِ "ابوالفصاحت" بھی
(۱) استاذی قبلہ جوش ملسیانی مرحوم و مغفور)

(صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

وزیر صحت پنجاب کا افسوس کا خط لکھا، سردار کرتار سنگھ نے مختصراً یہی لکھا کہ سرور صاحب آپ تو خیر دور ہیں میں نے خود اپنے ہاتھوں سے واحد صاحب کو سپردِ آتش کیا ہے اس پر مجھے خود ان کے انتقال کا یقین نہیں آتا مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ واحد صاحب ہم سب کو چھوڑ گئے ہیں۔ سردار کرتار سنگھ جناب واحد مرحوم کے بڑے بھائی ہیں۔
موت قرآن کریم کی ایک آیت کے مطابق "ایسا ذائقہ ہے جسے ہر ذی روح کو چکھنا ہوگا اور واقعی اس سے کسی کو مفر نہیں۔ دیکھو وزیروں اور کچھ سرمایہ داروں کے سوا مگر جب واحد صا

انبالہ میں انڈو پاک مشاعرہ

"منڈیوں میں بک رہے ہیں کھاد کے بھاؤ ضمیر"

بہار ٹرسٹ انبالہ کی جانب سے اس سال بھی انڈو پاک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اس مشاعرہ کی صدارت وزیر آبپاشی و زراعت جناب وسنت ساٹھے نے اور افتتاح جناب اندر کمار گجرال نے کیا۔ پاکستان کے پریس منسٹر جناب حسن عسکری نے بطور خاص اس میں شرکت کی۔

اپنی افتتاحی تقریر میں جناب گجرال صاحب نے کہا اس سرزمین پر اتنے بڑے پیمانے پر مشاعرہ کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اردو اس ملک کی زبان ہے ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ اردو کے ادیب و شاعر اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی ہوتی رہے۔ آج وسنت ساٹھے صاحب کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کوشش پر سرکاری مہر لگ جائے گی۔

مسٹر حسن عسکری نے کہا کہ بعض مصروفیات کی بنا پر سفیر پاکستان آج شریک نہ ہو سکے۔ انبالہ میں اردو زبان کے لئے محبت اور اس کے فروغ کے لئے جذبہ قابل ستائش ہے آج جو شاعر اپنا کلام پیش کریں گے وہ پاکستان کی نمائندگی کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں بہار ٹرسٹ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستانی سفارت خانے کا تعاون انہیں حاصل رہیگا۔

مسٹر وسنت ساٹھے نے کہا کہ زبان کی سرحد یا جغرافیہ نہیں ہوتا۔ زندہ زبانیں سرحدیں پھلانگتی ہیں زبان دراصل میل کا کام کرتی ہے اور اردو وہ زبان ہے جو ہم دو ملکوں (ہندوستان و پاکستان) کو آپس میں باندھے ہوئے ہے۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے انجام دئے اور سب سے پہلے پاکستان کی شاعرہ بسمل صابری کے نو عمر صاحبزادے احمد فواد کو دعوت سخن دی گئی احمد فواد نے اپنی عمر کے لحاظ سے چھوٹی بحر کی تحت میں غزل سنائی ؎

اس نے منتیں کھا کر بھی بات نہ کوئی پوری کی

احمد فواد کے بعد مراد آباد سے آئی ہوئی تسنیم صدیقی مائک پر آئیں اور یہ غزل پڑھی ؎

اداسیوں کا سبب اس کی حساب کر دوں گی
ہنسا ہنسا کے میں اس کو گلاب کر دوں گی

سامعین کے اصرار پر انہوں نے ایک اور غزل ترنم سے پڑھی ؎

اب کے بچھڑوں گی تو کھو جاؤں گی
راستہ روک لے پاگل میرا

پاکستان کے مہمان شاعر صادق سعید نے تحت میں غزل پڑھی اور داد پائی ؎

صورت سرمد بہت ہیں کوئی سرمد ہی نہیں
جذب کا بہروپ بھی ہے اور عریانی بھی ہے

اس شعر پر خوب داد پائی ؎

منڈیوں میں بک رہے ہیں کھاد کے بھاؤ ضمیر
اِس گرانی کے زمانے میں یہ عریانی بھی ہے

بمبئی سے آئے ہوئے رسالہ "شاعر" کے اڈیٹر افتخار امام نے شعراء اور سامعین کی فرمائش پر کئی غزلیں سنائیں ؎

کہاں کہاں سے الگ کر سکو گے تم مجھ کو
ہزار رشتوں میں تم سے بندھا ہوا ہوں میں

کیا جانئے کس چیز کی چہروں میں کمی ہے
آئینے تو ہیں اُن پہ مگر گرد جمی ہے

واقف ہیں اپنے قتل کے ہر فیصلے سے ہم
قاتل ہمارے خود بھی گواہوں کے ساتھ ہیں

افتخار امام کے بعد ملک زادہ منظور احمد نے پاکستان کے مشہور شاعر جعفر شیرازی کو دعوت سخن دی۔ غزل سنا کر

سامعین سے داد وصول کی ؎

اورنگ آباد کی ظفر شاہین نے مرصع غزل پڑھی ؎

دو دھڑکتے ہوئے دِل جب بھی ہوئے ہیں یکجا
آنکھ مہتاب نے جھپکائی ستارے جاگے
کتنی ناکام تمناؤں نے کروٹ بدلی
پھر گھٹا چھائی ہے پھر درد کے مارے جاگے

پاکستان سے آئے ہوئے طنز و مزاح کے شاعر انور مسعود نے محفل کو زعفران زار بنا دیا ؎

آپ کرائیں ہم سے بیمہ، چھوڑیں سب اندیشوں کو
اِس خدمت میں سب سے بڑھ کر نام ہمارا ہے
خاصی دولت مل جائے گی آپ کے بیوی بچوں کو
آپ تسلّی سے مر جائیں باقی کام ہمارا ہے

بسمل صابری دوسری بار انبالہ آئی تھیں اور پاکستان سے آنے سے پہلے اُن کا یہ شعر ہندوستان پہنچ گیا تھا ؎

وہ اشک بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

مائک پر آئیں اور یہ غزل ترنم سے پیش کی ؎

رُت ہے غنچوں کے مسکرانے کی
اب گھڑی آئی تیرے آنے کی
جس کی خاطر جہاں سے رُوٹھ گئے
اُس نے زحمت نہ کی منانے کی

نازش پرتاپ گڑھی نے ایک فلسطینی مجاہد کی دعا، خوبصورت اور پُر تاثر پیش کی اور سامعین سے زیادہ شعراء سے داد پائی۔ پاکستان کے نئی حسیت کے معتبر شاعر اجمل نیازی نے یہ غزل پڑھی ؎

اک شخص جزیرہ راتوں کا اور ہم سب اُس پار اترتے ہیں
اک گھر میں تنہا یادوں کا اور ہم سب [illegible]

اظہر عنایتی رامپور سے تشریف لائے تھے چند متفرق اشعار اور غزل پڑھی ؎

[illegible] اپنے ہاتھ کسی حادثے میں کھو بیٹھا
وہ آدمی جو ہتھوڑوں سے وار کرتا تھا

بہت مخلص ہیں اس کے گاؤں والے
پڑھا لکھا مگر کوئی نہیں ہے

ناظم مشاعرہ نے اظہر عنایتی کے بعد راشدہ باقی حیا کا نام پکارا، حیا مائک پر آئیں اور یہ غزل پڑھی ہے ؎

اب نہ ہونٹوں پہ ہنسی اور نہ آنکھوں میں چمک
زندگی درد کے پہلو میں سمٹ آئی ہے

بلرام پور سے آئے ہوئے انجم عرفانی نے دو غزلیں پڑھیں اور سامعین پر گہرا تاثر چھوڑا ؎

چُپ چاپ [illegible] قتل ہُوا بھی نہیں جاتا
قاتل کا [illegible] لیا بھی نہیں جاتا
تا حدِ نظر [illegible] خریدار کھڑے ہیں
جب تک [illegible] بکا بھی نہیں جاتا

انجم عرفانی کے بعد [illegible] کے ایک اور مہمان شاعر امداد ہمدانی نے یہ غزل [illegible] ؎

نہ جانے کس طرف [illegible] میرا شعور لے گیا
مقامِ عشق سے مگر بہت ہی دور لے گیا
نگاہ میں کبھی روشنی خیال میں کبھی روشنی
رہا تو جانے کی طرح گیا تو نور لے گیا

امداد ہمدانی کے بعد بشیر بلد نے پہلے دو شعر اور پھر ترنم سے غزل پڑھی ؎

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
جی بہت چاہتا ہے سچ بولیں
کیا کریں حوصلہ نہیں ہوتا

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو جو سنا نہیں وہ کہا کرو

پاکستان سے [illegible] نے یہ غزل پڑھی تھی ؎

قربتیں مٹ جائیں گی اور دوریاں رہ جائیں گی
راہِ الفت میں انا کی سولیاں رہ جائیں گی

ملکہ نسیم ہوشنگ آباد سے آئی تھیں انہوں نے نہایت سجل غزل پڑھی اور خوب داد پائی ؎

اس کی آنکھوں میں جو موتی ہیں تو حیرانی کیوں
یہ سمندر بھی اسی نے تو کھنگالے ہوں گے

اس طرح گھیر لیا مجھ کو غموں نے جیسے
میں جزیرہ ہوں میرے چاروں طرف پانی ہے

ملک نسیم کے بعد ناظمِ مشاعرہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے اپنا کلام سنایا۔ ان کا تعارف ڈاکٹر بشیر بدر نے معنوی تہہ داری سے کرایا۔ ملک زادہ منظور احمد نے جواباً یہ شعر سنائے ؎

کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں دونوں میری ذات کے نام
ایک غزل منسوب ہے تجھ سے ایک غزل حالات کے نام

ترکِ تعلق اپنی خطا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے
وہ اب بھی پابندِ وفا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے

ہندوستان میں احمد فراز کا نام ان کے اس شعر سے پہنچا تھا ؎

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

وجودی طور سے احمد فراز ہندوستان پہلی بار اپنا لے کے اس مشاعرہ میں لندن سے آئے انہوں نے بے تحاشہ تالیوں کے درمیان یہ غزل شروع کی ؎

اے خدا جو مجھے پندِ شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو میرے زخم کی گہرائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

اس غزل کے آخری شعر کے ساتھ ہی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کافی دیر تک جاری رہا۔

پروین فنا سید بھی پہلی بار ہندوستان آئیں۔ ناظمِ مشاعرہ نے احترام سے اُن کا نام پکارا وہ مائک پر آئیں اور ترنم سے دو غزلیں پڑھیں

کھل کے رو لوں تو ذرا جی بہلے
مسکرانا ہی مسرت تو نہیں

ہم سفر تھے تو وہ بچھڑے کیوں تھے
اپنی منزل ہی جدا تھی شاید

پھر تیج نرائن ناتھ آزاد نے اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار ان الفاظ میں کیا ؎

جی میں آتا ہے کہ میں فرقہ پرستوں سے کہوں
دل کی نظروں سے حجابات اٹھا کر دیکھو

گھر جلانے میں جو ملتا ہے مزہ
ایک دن اپنے گھروں کو بھی جلا کر دیکھو

شمیم سہگل صاحبہ پاکستان سے تشریف لائیں اور سادہ زبان میں گہرے معنی سمو دئے ؎

تن من اپنا خاک کیا، تب نگری ایک بسائی تھی
جاتے سمے جو تُوٹ کے دیکھا ہر ایک اینٹ پرائی تھی

مجھ سے میرا پتہ نہ پوچھو میرا اطوار ٹھکانہ نہ کیا
میں نادان پرائے گھر پہ جانے کیوں اترائی تھی

عطاء الحق قاسمی بھی پاکستان سے تشریف لائے تھے اور اپنے کلام سے سامعین کو نوازا ؎

کیسے سفر سے لوٹی ہیں یہ ریزہ ریزہ آنکھیں
اک چہرہ کی دھن میں کتنے چہرے بھول گئی ہیں

آخر میں کیفی اعظمی نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ایک نظم "میرا ماضی میرے کاندھے پہ" سنائی اور بعد میں سامعین کی فرمائشیں پوری کیں۔

یہ مشاعرہ ساڑھے تین بجے رات کو ختم ہوا۔ ●●

(صفحہ ۲ کا بقیہ)

ایسے مخلص، نیک، بھائی پسند، غیر متعصب اور ہر کسی کا دُکھ درد محسوس کرنے والے اس دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو وہ اپنی یادیں اس انداز سے چھوڑ جاتے ہیں کہ برسوں یاد کئے جاتے ہیں۔

ڈسکہ ضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں ان کے اُستاد کا انتقال ہوا تو واحد صاحب [illegible] پاکستان جانے کے لئے ویزا اپنے [illegible] ان کا تعارف وزیر [illegible] خاور زماں صاحب سے کرایا تو [illegible] واحد صاحب کے لباس کرتا اور [illegible] میں نے عرض کیا جناب یہ اسی لباس میں سارا یورپ گھوم آئے ہیں اور پاکستان تو ان کا وطن رہا ہے جب میں نے واحد صاحب کی خوبیاں اور ان کا قومی یکجہتی کا علمبردار ہونے کے بارے میں خاور زماں صاحب کو بتایا تو خاور زماں صاحب نے بے ساختہ فرمایا تب تو یہ سفیرِ انسانیت بن کر پاکستان جا رہے ہیں اور واقعی واحد صاحب نے پاکستان میں اپنے آپ کو سفیرِ انسانیت ہی ثابت کیا۔ دوسری مرتبہ واحد صاحب اپنے اُستاد کی برسی پہ گئے پاکستانی اخبارات نے واحد صاحب کی انسان دوستی پر بہت اچھے مضامین شائع کئے۔ اس جہانِ فانی میں تو سردار گوربچن سنگھ نے اپنے آپ کو [illegible] لحاظ سے واحد [illegible]

[illegible]

کمار پاشی کی شاعری

(باطنی سفر کی ایک مثال)

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید
(پٹیالہ)

کمار پاشی کی نظم "سمندر جاگتا ہے" کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

سمندر چپ نہیں رہتا
سمندر چیختا ہے اور مجھے آواز دیتا ہے
نہ جانے میں کہاں ہوں کس کے گھر

یہ فکر عرفانِ ذات کی طرف پہلا قدم ہے۔ وہ دشتِ لامکاں جس کی حدوں میں انسان کا "میں" دوڑ رہا ہے وہ بذاتِ خود کیا ہے؟ اس کا تعلق کس سے ہے؟ اس بدن کا انسانی "میں" سے کیا رشتہ ہے؟ کیا انسان کی اصل یا اس کی اصل ذات وہ ہے جو اس بدن میں قید ہے؟ انسانی وجود جو کائنات کی بلندیوں پہ ہواؤں کی طرح محوِ سفر تھا اسے یہ لباسِ خاک کیوں پہنا دیا گیا؟۔

بلندیوں پہ تھا محوِ سفر ہوا کی طرح
لباسِ خاک جو پہنا تو خاکسار ہوا

اس کی جلالی قوتوں کو مقید کر دینا آخر کس جرم کی سزا ہے!

تمام عمر رہا ہوں میں جسم میں محصور
تمام عمر کٹی ہے مری سزا کی طرح

ان تمام باتوں کا آخر راز کیا ہے؟ انسانی ذات کو بے پردہ دیکھنے کی یہی خواہش کمار پاشی کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔

تو کون ہے تنہائی میں پوچھے کوئی
رہ رہ کے یہی بات کرُیدے کوئی
بتلائے بھی اب کس کو کیسے کوئی
وہ راز ۔ جسے خود بھی نہ جانے کوئی

انسان کو اس بات کا علم نہیں کہ آخر رُوح کو جسم میں کیوں بند کیا قید کر دیا گیا ہے اور رُوح بذاتِ خود کیا ہے؟ کیا وہی انسان کا اصل وجود ہے؟ اسی اصل وجود کو دیکھنے کی تمنا اور اسے حقیقی آزادی دلانے کی آرزو پاشی کو بے چین رکھتی ہے، وہ جسم اور جان کی ایک دوسرے سے الگ حیثیت کے قائل ہیں جب پاشی "میں" کہتے ہیں تو اس سے مُراد باطن کی اس ہستی سے ہوتا ہے جو ظاہری ڈھانچے کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے اسی لئے پاشی کے ہاں "میں" غیر شخصی تصوّر میں اُبھرتا ہے۔ اور وہ "میں" کو اپنے جسم سے علاحدہ کر لیتے ہیں اور ان کا یہ طرزِ عمل اس لئے ہے کہ جب تک انسان اپنے آپ کو زندہ حرکت کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اسے صرف اپنے جسمانی حدود کا شعور ہوتا ہے۔ اس حقیقی وجود کا نہیں جس کی بدولت یہ پیکرِ جسم حرکت پذیر ہے۔ اس لئے اپنی ذات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے اس جسم کے حصار کو توڑ دے اور باہر نکل آئے انسانی اصل وجود ایک دوسرے کے درمیان دیوار بنے ہوتے ہیں۔

اس کے اندر کا "میں" اس کے باہر کی دیوار ہے
میں تو زندانِ ظاہر میں ہوں
وہ جو باطن میں ہے
اور اس کے میرے درمیاں رنگ ہے
میں نہیں جانتا: اس جزیرے میں کیوں قید ہوں
اس کا "میں" اس کے رستے کی دیوار ہے
میرا "میں"، میرے رستے کی دیوار ہے
(نظم: جسم و جاں کا سفر)

انسان اپنے جسم ہی کو اپنی حقیقی ذات تصور کرتا ہے۔

لیکن فلسفے کی رُو سے یہ حقیقت نہیں۔ فلسفی کہتے ہیں اگر یہ حقیقت ہوتی تو پھر 'میں' کے بجائے 'جسم' کہا جاتا۔ 'میں اس کمرے میں جا رہا ہوں' کے بجائے 'جسم' اس کمرے میں جا رہا ہے کہا جاتا۔ لیکن انسان ایسا نہیں کہتا بلکہ جب جسم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ 'میرا جسم' کہتا ہے۔ گویا جسم کو وہ اپنی میراث تصور کرتا ہے۔ اگر کوئی شے ہم سے متعلق ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ 'ہم' خود ہیں جس طرح ہماری کتاب، ہمارا قلم، ہمارے کپڑے، ہمارے بال، ہماری چیزیں، خود 'ہم' نہیں ہیں اسی طرح ہمارے ہاتھ، ہمارے پیر، ہماری جلد، ہماری ہڈیاں، ہمارا خون بھی 'ہم' نہیں ہیں ——————

—————— اگر اس بات پر ہم غور کریں تو ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو بھی خود اپنی ذات سے جدا کوئی شے تصور کرنے لگیں اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ اعضا جنہیں ہم استعمال کرتے ہیں اور خود ہماری 'ذات' ایک دوسرے سے جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ جسم ایک میراث ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جسم جس کی میراث ہے وہ 'کون' ہے! کوئی ہمارے اندر موجود ضرور ہوتا ہے جو ہم سے 'میرا' کہلواتا ہے، لیکن ہم شعوری طور پر اس سے واقف نہیں ہوتے۔ پاشی اس راز سے واقف ہونا چاہتے ہیں لیکن ویسے بھی یہ بہت مشکل ہے اس لئے کہ اگر ہم حقیقت سے واقف ہو بھی جائیں تب بھی حقیقت کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ البتہ اس راز سے واقف ہونے کے بعد پاشی پر عظمتِ انسانی ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ اس کائنات میں انسان کی عظمت کا تعین کرنے لگتے ہیں۔

اس پھیلی ہوئی خلاء کا منظر بھی ہے
اور گھومتے سیاروں کا لشکر بھی ہے
جو کچھ کہ نظر آتا ہے باہر میرے
پاشی وہی سب کچھ میرے اندر بھی ہے

اپنی ذات سے پردہ اٹھانے کے بعد وہ کائنات کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں۔

تُو دیکھ مجھ میں ذرا کائنات عکس اپنا
کہ اپنی ذات سے پردے اٹھا رہا ہوں میں

شعورِ خویشتن کے بعد اس حقیقت کا ان پر انکشاف ہوتا ہے کہ اس کائنات کا وجود انسان ہی کی بدولت ہے انسان ہی نے اپنی نظر کے نور سے اس کائنات کو منور کر رکھا ہے جس طرح آنکھ بند کر لینے سے پوری دنیا تاریک ہو جاتی ہے اسی طرح ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سب خود اپنی ذات سے وابستہ ہیں باہر کچھ بھی نہیں۔ دراصل ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہیں اور اپنی صورت پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔

یہ میرا آئینہ۔ آئینہ خاموش ہے، بے حس
ذرا حرکت نہیں اس میں
یہ گویا سرد پتھر ہے : مگر شکلیں سجھاتا ہے
اگر میں سامنے آؤں : میرا چہرہ دکھاتا ہے
میں جب باتیں کروں اس سے
تو مجھ سے بات کرتا ہے
ہنسوں تو مجھ پہ ہنستا ہے
اگر خاموش ہو جاؤں :
تو یہ بھی پاگلوں سا مجھ کو تکتا ہے
اگر میں سامنے سے اس کے ہٹ جاؤں
تو یہ خاموش ہے : بے حس
ذرا حرکت نہیں اس میں
ہمارے دم سے زندہ ہے یہ سارا آئینہ خانہ
اگر ہم تم نہ ہوں تو یہ بھی اپنی موت مر جائے
سیاہی میں اُتر جائے

(نظم : آئینہ خانہ)

پاشی کی نظر میں انسان خود کائنات ہے یا ساری کائنات اس کی ذات میں پوشیدہ ہے اسی لئے انسان خود اپنی ہی ذات میں تمام حقائق کا مشاہدہ کر سکتا ہے اس کائنات کی ساری چہل پہل صرف انسان ہی کے وجود

مرہونِ منت ہے۔ اگر انسان کا وجود نہ ہو تو یہ ساری کائنات بے معنی ہو کر رہ جائے۔ یہ تو خود انسان کے وجود میں سمائی ہوئی ہے اس طرح انسان خود اپنی ذات کا عرفان "شعورِ خویشتن" سے "شعورِ دیگر" حاصل کر لیتا ہے اور اس کائنات کے رازہائے سربستہ اس کے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

اپنی ذات کی غیر ارضی اور مبہم کیفیات کی عکاسی پاشی کی نظم "نجات" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ دُنیا (ستاروں کے پیچھے کی دُنیا)
مری دیکھی بھالی ہے، پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
نظر آئے گی اجنبی اور ان دیکھی مجھ کو
لُبھائے گی دل کو
نہ جانے یہ کیسا طلسم حسیں ہے
تو میرے قریں ہے
مگر جسم ترا اُفق کے دھندلکوں میں تحلیل ہوتا
نظر آرہا ہے۔

ایک طرف دیکھئے کہ انسانی ذات میں لامحدود خلا کا منظر ہے۔ جو کچھ اسے باہر نظر آتا ہے وہی سب کچھ اس کے اندر بھی ہے۔ دوسری طرف خدا نے اپنی ذات کا مشاہدہ کرنے کے لئے اس کائنات کو پیدا کیا تو گویا انسان خدا کی ذات سے الگ نہیں ہے۔

وہ ایک رنگ : کہ جس میں تمام رنگ چھپے
اس ایک رنگ میں خود کو میں جا بجا دیکھوں

جب انسان کو اس بات کا شعور ہو جائے کہ اس کی ذات خدا کی ذات سے جُدا نہیں تو پھر خدا اور انسان کے درمیان وہ کون سا پردہ ہے جس نے انسان کو اپنی اصل سے جُدا کر دیا ہے۔

یہ رنگ و نُور کا جادو عجب ہے
کہ تجھ سا ہوں مگر تجھ سے جُدا ہوں

اس لئے وہ اپنی اصل سے ملنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے اور "شعورِ ذاتِ حق" حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ خدا کی ذات میں اپنے آپ کو ضم کر کے اپنی معراج کو پہنچ جائے لیکن خدا کی ذات پر حجاب اس لئے پڑا ہے کہ انسان کی ہستی خود ایک بیچ میں پردہ بن گئی ہے۔

وہ جبرِ خاکی جس نے انسان کو چاروں طرف سے گھیرے رکھا ہے انسان اسی کو اپنی ذات تصوّر کرتا ہے تو یہ اس کا دھوکہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی وجود ہے اور وہ اس بات کو محسوس بھی کرتا ہے کہ وہ اس دنیا میں موجود ہے لیکن اس کا یہ احساس ان عادات کی پیداوار ہے جو وہ ہمیشہ سے محسوس کرتا آیا ہے اور یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ انسانی اصل اس کا اپنا جسم ہی ہے جسے اس نے ایک نام بھی دے رکھا ہے یہ وہ نام ہے جو دوسروں کے درمیان اپنی شناخت اور پہچان کراتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک ہم اپنی پہچان اپنے نام سے کرائیں گے اور جب تک ہم اپنی شناخت اپنے جسم سے محسوس کریں گے یہی نام اور یہی جسم ہم کو اپنی تلاش میں کسی نہ کسی الجھنوں میں مُبتلا کرے گا اس مہم کو سر کرنے کے لئے صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ سے علاحدہ ہو جائیں، اپنے آپ کو اور اپنے نام کو بھول جائیں اور یہ احساس پیدا کریں کہ اس وقت ہماری اپنی ذات کا وجود ہی نہیں ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان اپنے ماحول اور خود اپنے آپ کو بھول کر عالمِ استغراق میں پہنچ جائے جس طرح ایک شخص جب خیالات کے تسلسل میں ڈوب جاتا ہے تو وہ کسی دوسرے ایسے شخص کا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتا جو اس سے مخاطب ہوتا ہے۔ سماعت کا احساس ایسے وقت ناکام ہو جاتا ہے یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دراصل جو سُننے والا ہے وہ اس وقت اس ظاہری جسم میں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان خود اس جسم سے الگ ایک علاحدہ وجود بھی رکھتا ہے جب تک اس کا حقیقی وجود جسم کی طرف متوجّہ نہ ہو جسم خود، غیر وجود بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ ظاہری کان صرف ایک آلہ ہوتے ہیں جن سے حقیقی وجود آواز سُنتا ہے اور یہ حقیقی وجود جو آواز سُنتا ہے وہ جسم سے عظیم کوئی شے ہے

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسم، خود انسان نہیں اور نہ یہ اس کا حقیقی وجود ہے۔ جب کبھی انسان اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو گویا وہ اپنے باطن اور اپنے اندرون کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کمار پاشی کی شاعری کو اگر "اندرون کا سفر" نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی شاعری میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جب وہ اپنے سے ماوراء ہو کر وقت کی طرح تمام سمتوں میں پھیل جاتے ہیں اور ان کا یہ عمل متصوفانہ عمل سے متشابہ ہوتا ہے، جس طرح انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی ذات میں ضم کر دے ایک قطرے کی مانند سمندر میں اپنے آپ کو فنا کر کے بقا حاصل کر لے پاشی بھی عارفوں کے اسی مقام پہ پہنچنا چاہتے ہیں جہاں وہ خدا سے اس حالت تک وابستہ ہو جائیں کہ جب وہ خدا کو بلائیں تو خود جواب دیں اور اپنے آپ کو آواز دیں تو خدا لبیک کہے۔

ندی بہہ رہی ہے
کہیں دور نیلی ندی بہہ رہی ہے
کوئی دھیمے دھیمے مجھے مختلف نام سے
پانیوں میں آواز دینے لگا ہے
تو کیا میں فقط نام کی حد تک مختلف ہو گیا ہوں
تو کیا آج بھی میں وہی ہوں
مگر بہتی ندی تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے
یوں ہی بس یوں ہی رفتہ رفتہ
میں شاید کوئی اور ہی بن گیا ہوں
مری شخصیت سے میں شاید الگ ہو گیا ہوں
اور اب چپکے چپکے
کہیں دور دھرتی کی تاریک نیندوں کی دلدل میں گھرنے لگا ہوں
یہ بہتی ندی آج بھی، مجھ میں شاید مجھے
بس مجھے دیکھنا چاہتی ہے
میں اب خود کو محسوس کرنے کی حد تک ہی زندہ ہوں شاید
تو شاید میں اب دھیمے دھیمے
کناروں سے اپنے کہیں دور، بہتی ہوئی
کوئی نیلی ندی ہوں

(نظم: میں کے نام)

مختلف ناموں سے دھیمے دھیمے پانیوں میں سے آواز دینے والا اور کوئی نہیں بلکہ وہ لامحدود سمندر ہے جو اپنے جزو کے فراق میں خود بھی برسوں سے جاگ رہا ہے۔

سمندر چپ نہیں رہتا
سمندر چیختا ہے اور مجھے آواز دیتا ہے
نہ جانے میں کہاں ہوں، کس کے گھر
کس کے بدن میں قید ہوں اب تک
سمندر چیختا ہے، مجھ کو رہ رہ کر بلاتا ہے
وہ شاید سو نہیں سکتا

(نظم: سمندر جاگتا ہے)

پاشی کے ہاں خود اصل بھی اپنے جزو سے ملنے کے لئے مضطرب ہے اور چونکہ اصل کا جزو "میں" ہے اور "بدن" (نقل) اس کا جزو ہے اس لئے خدا سے حقیقی رشتہ "میں" ہی کا ہے جسے حصارِ جسم میں قید کر لیا گیا ہے۔ اصل کے جزو کو نقل کے جزو میں قید کر کے اسے محدود کر دیا گیا ہے اب اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام کائنات پر چھا جانے کے لئے اپنے وجود کو منتشر کر کے اور "ہوا" کا ہمسفر ہو کر بلندیاں کو چھو لے۔ نظم: "دور کے منظر" میں پاشی کہتے ہیں۔

تو اپنے خول سے باہر نکل
ہوا کے پیرہن میں، گھوم جا چاروں دشاؤں میں
نہ کر محسوس کچھ بس دیکھتا جا
اور بکھرے جا
تو اپنی روح کی خوشبو ہواؤں میں
تو اپنے خول سے باہر نکل

آئینہ خانہ۔ جسم و جاں کا سفر۔ میرا جرم۔ سارے منظر خالی۔ میں کے نام۔ سمندر جاگتا ہے۔ نجات۔ اور دور کے منظر جیسی نظمیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ پاشی کائنات خدا اور انسان کے باہمی رشتوں پہ روشنی ڈالتے ہیں اور انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلا کر مادیت سے اوپر اٹھا کر روحانیت کے مقام پہ دیکھنا چاہتے ہیں جہاں انسان اپنے محدود خول سے نکل کر لامحدود وسعتوں میں گم ہو کر خود بھی لامحدود ہو جاتا ہے غرض کہ پاشی کی شاعری میں انسان اپنی تمام تر عظمتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنی ذات کا عرفان حاصل کر کے عرفانِ کائنات و عرفانِ [illegible] ہو انفرا[illegible]

جہاں بدلہ وفا کا

ماہ منیر عروج

"ہائے راحیل کتنی پیاری جگہ ہے یہ دل چاہتا ہے کہ اسی طرح تمہارا ہاتھ تھامے ان اونچی اونچی راہوں پر چلتی رہوں" خوشی کی کلیاں سیما کے چہرے پر کھلی پڑ رہی تھیں "اگر تمہیں یہ جگہ پسند ہے تو شادی کے بعد یہیں آئیں گے"، راحیل نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیا۔

دونوں چھٹیاں گزارنے اسلام آباد آئے ہوئے تھے اور وہیں سے مری سوات وغیرہ کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ان دونوں کا یوں تو آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا کلاس فیلو بھی نہیں تھے۔ ہاں یونیورسٹی میں ساتھ ہی پڑھا کرتے تھے کسی فنکشن میں آپس میں تعارف ہوا اور پھر زندگی بھر کے عہد و پیمان کر بیٹھے۔

سیما اور شاہین دونوں بہنیں تھیں والدین کا انتقال ہو چکا تھا، یوں شاہین ہی سیما کی سرپرست تھی۔ والدین کے انتقال کے بعد دونوں بہنوں نے کسی کا سہارا لینا گوارا نہ کیا کافی بڑی جائیداد تھی جس کا انتظام ان کے ابو کے ایک قابل اور مخلص دوست نے سنبھالا ہوا تھا اپنی ذاتی کوٹھی تھی جس میں وہ دونوں بہنیں اپنے ایک پرانے وفادار ملازم کے ساتھ رہتی تھیں کوٹھی کے ایک حصے میں ان کے ایک عزیز بھی رہتے تھے شاہین خود بھی ایک آدھ گھنٹے آفس میں بیٹھ کر حسابات چیک کرتی تھی یوں کاروبار بڑی ایمانداری سے چل رہا تھا، دونوں بہنوں میں بڑی محبت تھی شاہین سیما کو بالکل ماں کی طرح چاہتی تھی اور اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی کبھی اس کی کوئی بات رد نہ کرتی اسی لئے جب اس بار اس نے یونیورسٹی کے طلباء کے ساتھ تفریحی پروگرام بنایا تو شاہین نے اسے بہت سمجھایا کیونکہ وہ اس قسم کی آزادی کے خلاف تھی، لیکن جب سیما نے بہت اصرار کیا تو وہ اس کی خواہش رد نہ کر سکی اور مجبوراً اجازت دینا پڑی۔

ادھر راحیل نے بھی پروگرام بنا لیا یونیورسٹی کے ساتھیوں کے ساتھ تفریح کا تو ایک بہانہ تھا ان دونوں نے الگ سفر کیا اور الگ ہی الگ گھومتے رہے۔ لاہور، اسلام آباد مری سوات جانے کہاں کہاں کی سیر کر ڈالی، ہر حسین جگہ پر عہد و پیمان ہوتے ہر خوبصورت جگہ پر تصویریں اتاری گئیں۔ یونیورسٹی گروپ سے الگ ہو کر ہاتھوں میں ہاتھ دیئے یہ میلوں دور چلے جاتے اس طرح یہ سفر ان کا یادگار سفر بن گیا۔

سیما گھر واپس آئی تو اس کے طور ہی بدلے ہوئے تھے چہرہ گلاب کی طرح کھلا پڑ رہا تھا نگاہوں میں ایک چمک اور بے تابی تھی اداؤں میں شوخی اور بیقراری تھی، ہر فون کی گھنٹی پر وہ چونک پڑتی، دوڑ پڑتی، بیٹھی بیٹھی آپ ہی آپ مسکرا دیتی تب جیسے شاہین کو کسی خطرہ کا احساس ہوا آخر کو بڑی بہن تھی اور کافی دنیا کی اونچ نیچ سمجھتی تھی۔ ایک دن وہ سیما سے پوچھ ہی بیٹھی "کیا بات ہے سیما آج کل بہت خوش نظر آ رہی ہو"

"تو کیا پہلے اداس رہتی تھی؟" سیما شوخی سے بولی۔

"نہیں مگر اب تو انداز ہی بدلے ہوئے ہیں"

"کیا ہوا میرے انداز کو۔؟"

"اب تم سے کون جیتے کسی وقت فرصت سے بات کروں گی؟"

شاہین نے سوچا کہ پہلے وہ اپنے طور پر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرے تاکہ سیما آسانی سے قابو میں آ سکے، اسی لئے بات ٹال گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک دن... آفس سے آتے ہوئے وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ وہ کئی روز صاحب فراش رہی جب اسے ہوش آیا تو اس کی ایک ٹانگ پر

پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور حالت غیر یقینی تھی صدمہ اتنا شدید تھا کہ شاہین اپنی زندگی سے بیزار رہنے لگی ہر وقت بھاگنے دوڑنے والی پلنگ سے بندھ گئی تھی اس پر یاسیت کا غلبہ رہنے لگا تھا ایسے میں سیما اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی بہن کی تکلیف کے آگے وہ سب کچھ بھول گئی تھی ہر وقت اسے نئی امید دلاتی رہتی ہمت بندھاتی رہتی۔ راحیل نے کئی بار اسے فون کیا لیکن معلوم ہوا کہ سیما ہسپتال میں ہے۔ ادھر سیما بھی دامن بچاتی پھر رہی تھی کہ اگر اس نے بات کی تو راحیل ملاقات پر اصرار کرے گا اور پھر وہ بھی ضبط نہ کر سکے گی کافی عرصہ بعد شاہین کی حالت بہتر ہوئی اور اس کا پلاسٹر کھل گیا وہ ہسپتال سے گھر آگئی تو اس نے دفتری معاملات کی طرف توجہ دی فی الحال اس کا آفس جانا ممکن نہیں تھا کیوں کہ وہ ابھی پیر پر زیادہ زور نہیں دے سکتی تھی اسی لئے اس نے سیما کو سمجھایا کہ وہ دفتری معاملات دیکھ لیا کرے ضروری فائل وہ گھر لے آیا کرے اس طرح اسے بھی کام کا تجربہ ہو جائے گا ایک دو دن تو دفتری معاملات سمجھنے میں لگ گئے۔ اس کے بعد اسے راحیل کا خیال آیا اس نے سوچا کہ آج وہ اس کے سارے گلے شکوے دور کر دے لیکن کافی کوشش کے بعد اس سے رابطہ قائم نہ ہو سکا پھر وہ کئی روز تک اس سے ملنے کی کوشش کرتی رہی تب جا کر اس سے ملاقات ہوئی ــ راحیل اس سے بہت سخت ناراض تھا۔

"بے وفا اب خبر لی ہے"

"ایمان سے بہت مصروف تھی تمہیں پتہ ہے آپی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا"

وہ اس کی خفگی پر مسکرا دی۔

"سب پتہ ہے لیکن کیا ذرا سا ٹائم میرے لئے نہیں نکال سکتی تھیں"

"چلو سزا دے لو"

"واقعی" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا۔

"جو سزا دوں گا قبول کرو گی؟"

"سر و چشم"

"تین ماہ غیر حاضری ہو اب تین ماہ میرے ساتھ رہو"

"آہا!" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"کیا میں نے لطیفہ سنایا ہے؟"

"بڑا مزے دار"

"ارے تم تو خفا ہو گئے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو یہ کیسے ممکن ہے ــ؟"

"سب کچھ ممکن ہے اگر تم کوشش کرو"

"نہیں راحیل" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں آپی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی"

"میں چاہتا ہوں کہ کچھ دن ہم شہر سے باہر گزاریں اور ان دنوں کی یاد تازہ کریں جو ہم نے ٹور پر گزارے تھے"

"یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن حالات اس وقت کچھ اور تھے اور اس وقت کچھ اور میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تو ایسا کرتے ہیں تم اپنی آپی کو ساتھ لے لو"

"پھر تم کیسے ساتھ ہو گے ــ؟"

"ہاں یہ بات تو ہے ــ" وہ کچھ دیر سوچ کر بولا۔

"سیما کیا تم میرا تعارف اپنی آپی سے نہیں کرا سکتیں"

"اس سے کیا ہو گا ــ؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو انہیں اعتماد میں لینا میرا کام ہے"

"اچھا کسی موقع پر ملوا دوں گی"

"کسی موقع پر نہیں بہت جلد۔ اب میں زیادہ جدائی برداشت نہیں کر سکتا"

"اچھا جلد ہی کوشش کروں گی"

"دو تین دن کے اندر"

"اتنی جلدی ــ؟"

"ہاں ورنہ لڑائی"

"تم نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے راحیل، سمجھ میں نہیں آتا کس طرح تمہیں ان سے ملواؤں"

"اور تم نے جو اتنے دن مجھے پریشان کیا ہے اس کا اندازہ ہے کچھ؟"

"میں سب سمجھتی ہوں لیکن میری مجبوری کا بھی خیال کرو"

"میں نے تمہاری مجبوری کا خیال کیا اب تم کچھ میری بے تابی اور بے قراری کا خیال کرو"

"اچھا سوچتی ہوں کوئی ترکیب ——"

"یہ بات ہوئی نا"

دوسرے ہی دن اس نے راحیل کو اطلاع دی کہ وہ کل شام کی چائے اس کے ساتھ پیئے۔ سیما نے اسے اپنی کوٹھی پر ہی مدعو کیا تھا۔ اس شام راحیل خوب توجہ سے تیار ہوا اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا اور بن سنور کر اس کی کوٹھی جا پہنچا۔ بہت ہی شاندار کوٹھی تھی لیکن اس میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا گیٹ پر ایک چوکیدار تھا جس نے اندر جا کر اطلاع دی تو فوراً ہی سیما آگئی اور اسے لے جا کر وسیع شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"اتنی بڑی کوٹھی میں کیا دونوں اکیلی رہتی ہیں؟"

راحیل کو بڑا تعجب ہوا آخر وہ سیما سے پوچھ ہی بیٹھا۔

"ہاں راحیل ہم دونوں بہنیں اپنے وفادار ملازموں کے ساتھ اکیلے رہتے ہیں ویسے پیچھے ایک حصہ ہم نے اپنے ایک عزیز کو دیا ہوا ہے"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا ——؟"

"پہلے لگتا تھا اب عادی ہو چکے ہیں"

"یہاں آکر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے کہ میں نے بہت اونچی اڑان اڑی ہے میں اتنا اونچا نہیں اڑ سکتا اتنی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔ میرا خیال ہے مجھے واپس چلا جانا چاہئے"

"یہ کیا کہہ رہے ہو راحیل؟"

"ہاں سیما یہاں رک کر خود میں اپنی نظروں میں ذلیل نہیں ہونا چاہتا"

"معلوم نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" سیما پریشان سی ہو گئی۔

"یہ ٹھیک ہے کہ تم نے مجھے بغیر میری حیثیت معلوم کئے پسند کیا ہے لیکن مجھے تمہاری حیثیت کا اچھی طرح علم ہے"

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھے میری حیثیت کا اندازہ کئے بغیر چاہتے رہے ورنہ مجھے میری دولت کے لالچ میں بہت سے پرستار مل جائیں گے بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ہم دونوں بہنوں کو صرف دولت کی وجہ سے اپنانا چاہتے ہیں"

"لیکن ——!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں مجھے تم پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے"

"تمہیں تو ہے لیکن کیا تمہاری آپی بھی اسے پسند کریں گی"

"ضرور کریں گی اگر تم نے کوشش کی۔ آج تو میں تمہارا تعارف اپنی سہیلی کے بھائی کی حیثیت سے کراؤں گی۔ تم لاہور سے اس کا کوئی پیغام لے کر آئے ہو۔ سمجھے ——؟"

"سمجھ گیا ——" وہ مسکرا دیا۔

"اور ہاں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ شاید تمہاری پوسٹنگ یہیں ہو جائے تاکہ آنے جانے کا سلسلہ برقرار رہے۔۔۔"

"بہت خوب بڑا اچھا پلان ہے"

"یہ سب مجھے تمہاری خاطر کرنا پڑ رہا ہے۔ ویسے وہ سمجھ گئی ہیں تمہارا تذکرہ کیا تو وہ مسکرا دیں۔ بولیں تمہاری پسند اچھی ہی ہو گی"

"ملوا بھی چکو اب ان سے"

"میں ابھی بلا کر لائی"

سیما پردہ اٹھا کر دوسری طرف چلی گئی اور وہ کھڑا ہو کر دیواروں پر آویزاں تصاویر دیکھنے لگا بڑی اچھی پینٹنگز تھیں جس کا بھی انتخاب تھا بہت اچھا تھا وہ آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا کونر ٹیبل کے پاس جا پہنچا اور اس پر پڑے میگزین دیکھنے لگا تب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی کوئی بڑی آہستگی سے چل کر آ رہا تھا۔

"راحیل، ان سے ملو یہ میری پیاری سی سویٹ سی آپا ہیں جو مجھے جان سے بھی زیادہ پیاری ہیں ایمان سے"

وہ تیزی سے مڑا لیکن ٹھٹک کر رہ گیا۔

"آپ ——!!"

"تم ——!!" شاہین کی آنکھوں میں ایک قہر تھا

"راحیل تم..... تم...؟" شاہین نے ضبط کی کوشش میں اپنے ہونٹ بھینچ ڈالے۔

"سیما اس سے کہہ دو یہ یہاں سے چلا جائے" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

راحیل ایک لمحہ گم صم سا کھڑا رہا پھر وہ تیزی سے اٹھا اور بغیر اس سے کچھ کہے سنے کمرے سے باہر نکل گیا چند ہی لمحوں بعد اس کے اسکوٹر اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی۔ تب سیما ہکا بکا سی رہ گئی، یہ سب کیا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا حالات نے ایک دم سے پلٹا کھایا تھا وہ پریشان سی ہو گئی اٹھ کر شاہین کے کمرے میں گئی تو دیکھا وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی تھی۔

"آپی!——" اس نے جا کر آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سیما——!" شاہین نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بتاؤ تم راحیل کو کب اور کیسے جانتی ہو؟"

"آپی کیا آپ بھی اسے جانتی ہیں——؟"

"پہلے تم مجھے میری بات کا جواب دو!"

"میری اس سے ملاقات بہت پرانی ہے"

"مجھے یقین تھا اس کا——"

"وہ..... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے"

"واقعی!"

شاہین کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ وہ سمجھ نہ سکی۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟——"

"یہی کہ اب تم اس سے جا کر معلوم کرو کہ وہ اب بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی——؟"

"تم سے جو کہا گیا ہے وہ کرو——"

"کیا آپ اسے جانتی ہیں آپی——؟"

"ہو سکے تو اس کا جواب بھی اسی سے لے لو"

"آپی خدا کے لئے کچھ تو بتائیے کہ یہ سب کیا ہے؟"

وہ بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔

"وقت تمہیں سب کچھ بتا دے گا اب جا کر آرام کرو"

سیما بہت کچھ کہنا چاہتی تھی بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن شاہین کے تیور کچھ ایسے تھے کہ وہ آگے کچھ بولنے کی ہمت نہ کر سکی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شاہین اور راحیل ایک دوسرے کو کیسے جانتے ہیں اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

"کیا آپی؟——" لیکن نہیں اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اس کے علم میں ضرور ہوتی انہیں کسی کا ڈر یا خوف نہیں تھا وہ مکمل طور پر خود مختار تھیں۔

شاہین بالکل خاموش تھی سیما کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کا جواب شاہین کے پاس تھا یا راحیل کے پاس لیکن راحیل جانے کہاں غائب ہو چکا تھا کئی بار اس نے فون کیا جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا وہاں معلوم کیا لیکن وہ تو جیسے لاپتہ ہو چکا تھا شاہین اس دن سے بالکل خاموش تھی نہ ہی اس نے سیما سے کچھ پوچھا اور نہ ہی سیما کی ہمت پڑی کہ اس سے کچھ معلوم کرے لیکن وہ ٹوہ میں ضرور رہی پھر..... طویل خاموشی سے وہ جھنجھلا سی گئی۔

"آپی! راحیل جانے کہاں غائب ہو گیا ہے میں اسے تلاش کر کے تھک چکی ہوں"

"مجھے بھی یقین تھا۔ بہتر ہے اس بات کو یہیں ختم کر دو"

"لیکن آپی کچھ معلوم تو ہو"

"اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا"

"میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی آپی۔ میں بہت پریشان ہوں" وہ ایک دم سے جذباتی ہو گئی۔

"تو اسے جا کر تلاش کر لو"

"آپی آپ اتنی کٹھور کیوں بن گئی ہیں؟"

"سیما میں جانتی ہوں کہ تم پر میری نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ محبت اندھی ہوتی ہے اس میں سیدھا راستہ دکھانے والا ہمیشہ دشمن سمجھا جاتا ہے اس لئے بہتر یہی کہ تم اس وقت کا انتظار کرو جب حقیقت سامنے ہوگی، یا اسے بھولنے کی کوشش کرو"

"آپی——!" وہ سسک پڑی۔

لیکن شاہین اپنی جگہ اٹل تھی "میرے پاس اب کچھ کہ

[illegible] ناکام ہو کر واپس
آ [illegible] گئی۔

ایک بار [illegible] سامنے نظر آیا، وہ متجسس نگاہوں سے [illegible] دیکھ رہی تھی کہ اسے اپنی گاڑی بھی نظر آگئی۔

وہ آ گیا ــــــ۔

[illegible] ذہن میں ایک خیال آیا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی [illegible] ذرا آگے بڑھی تو سامنے ہی سے اسے وہ دونوں آتے نظر آگئے۔ تب وہ جلدی سے اپنی نگاہوں سے بچنے کے لئے ایک پیڑ کی اوٹ میں ہو گئی شک یقین میں تبدیل ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا [illegible] سب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی تو مر کر بھی کسی کی بات کا یقین نہ کرتی لیکن اب ــــــ اب سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل اب بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ شاہین کا راحیل سے کوئی تعلق ہے وہ [illegible] سکی تھی۔

[illegible] ایک دن اس کی سہیلی نے چائنیز کا پروگرام بنایا ــــــ [illegible] دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ سب کی سب [illegible] چائنیز ہوٹل میں پہنچیں تو ساری میزیں بھری ہوئی تھیں ویٹر نے انہیں اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ [illegible] سنبھل کر بیٹھ بھی نہ پائی تھیں کہ سیما کی نگاہ نیچے پڑی [illegible] راحیل ــــــ [illegible] دونوں تھے شاید [illegible] قدم سے قدم [illegible] اس کا خون کھول اٹھا ایک [illegible] بڑھ کر بہن کا منہ نوچ [illegible] اس کے ہاتھ [illegible] گیا، بس [illegible] جذبات [illegible] کا

[illegible]

شاہین آئی۔

"آپ کہاں تھیں ــــــ؟" [illegible] چھپا سکی۔

"کیا بات ہے بہت پریشان نظر آ رہی ہو؟" [illegible] شاہین نے آہستہ سے اس کے گال تھپتھپا[illegible]

وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ دل کے جذبات آنسو [illegible] شاہین کچھ دیر اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہی [illegible] کچھ کم ہوئیں تو شاہین بولی۔

"راحیل یاد آ رہا ہے ــــــ؟"

"آپی ــــــ!" وہ ایک بار تڑپ کر [illegible]

"سیما ایک بات یاد رکھو وہ تمہیں کسی حال [illegible] مل سکتا اسے بھولنے کی کوشش کرو۔"

"اس لئے آپی کہ آپ ــــــ آپ ..." آگے کچھ نہ کہہ سکی زبان نے ساتھ چھوڑ دیا۔

"جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کرو" کہہ کر [illegible] شاہین نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

"[illegible] ہاں سیما کل میری ایک دوست [illegible] جا رہی ہے اسے لینے ایئرپورٹ چلنا ہے۔"

سیما بے بسی سے بہن کو دیکھ کر رہ گئی [illegible] تھی لیکن جانے کیوں شاہین کے سامنے [illegible] جواب دے جاتی تھی۔

دوسرے دن شاہین کی سہیلی تہذیب آگئی وہ [illegible] اور سنجیدہ سی لڑکی تھی اس کی گود میں ایک چھوٹا سا [illegible] جانے وہ ہر وقت کیا سوچتی رہتی تھی جیسے [illegible] کی ہمت نہیں تھی افسردہ اور دلگیر سی، شاہین نے [illegible] کہہ کر تعارف کرایا تھا کہ یہ اس کی بہت پرانی [illegible] اور ایک عرصہ کام سے آگئی ہے اس کے بعد وہ [illegible] مصروف رہی اتنی مصروف کہ شاہین [illegible]

"اس کی کوئی بہن بھی ہے جس کے بغیر وہ کھانا تک نہ کھاتی تھی جس کے بغیر ایک قدم تک گھر سے باہر نہ نکالتی تھی اسی بہن کے بغیر جانے کہاں کہاں کی سیر کرتی پھر رہی تھی، سیما بہن کی اس تبدیلی پہ اکثر بیٹھے بیٹھے رو پڑتی۔ کاش اس نے راحیل کو شاہین سے نہ ملوایا ہوتا جس دن سے وہ راحیل کو گھر لے کر آئی تھی اس کا سکون ختم ہو گیا تھا۔

ایک دن صبح ہی ناشتے پر شاہین نے اس سے کہا "آج شام کھانے پر میرے کچھ مہمان آ رہے ہیں تمہاری موجودگی ضروری ہے"۔

"کس خوشی میں۔ کیا کوئی تقریب ہے ——— ؟" وہ اپنے لہجے کے طنز کو نہ چھپا سکی۔

"یہی سمجھ لو"

شاہین نے ایک لمحہ اسے گھور کر دیکھا اور مسکرا دی۔

"شاید آج تمہاری ساری اُلجھنیں دُور ہو جائیں"

"اُلجھنیں ؟" وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔

سارا دن شاہین اور تہذیب مصروف رہیں، شاہین نے کچن میں جا کر کئی بار خود جائزہ لیا۔ دو چار چیزیں اپنے ہاتھوں سے بھی بنائیں۔ تہذیب کے ہونٹوں پہ آج اس نے پہلی بار مسکراہٹ دیکھی۔ شام ہوئی تو اس نے ایک ہلکے سے کام والا سوٹ نکال کر پہنا۔ شاہین تہذیب کی تیاری میں خود دلچسپی لے رہی تھی اس کا میک اپ وہ خود کر رہی تھی، تب سیما بور ہو کر اپنے کمرے میں چلی آئی دیر تک چینلز پہ مختلف دُھنیں سنتی رہی پھر اُکتا کر کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا ہو گا کہ شاہین آواز دیتی ہوئی اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"ارے سیما ابھی تک تم تیار نہیں ہوئیں ؟"

"مہمان آ گئے ——— ؟"

"ہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ چلو ———"

"آپی میرا دل نہیں چاہ رہا میں کیا کروں گی وہاں جا کر ———"

"بور نہ کرو سیما ذرا چل کر تو دیکھو کون آیا ہے ... "

"مجھے کیا کوئی بھی آیا ہو ———"

"میری اچھی بہن۔ شاباش جلدی آؤ کھانا لگنے والا ہے"۔

"اچھا آپ چلیے میں ابھی آتی ہوں" وہ مُردہ دلی سے بولی۔

"ہاں بس فوراً تیار ہو کر آ جاؤ"

شاہین اس کے گال ہمیشہ کی طرح تھپتھپاتی کمرے سے نکل گئی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی پھر بے دلی سے اُٹھ کر منہ دھویا ایسا ہی عام لباس ہینگر سے نکال کر جلدی پہن لیا اور بالوں پر سے اُلٹا سیدھا برش پھینک کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رہ گئی۔ سامنے ہی راحیل بیٹھا تھا اس کی گود میں تہذیب کا بچہ تھا اس کے برابر ہی تہذیب بیٹھی تھی۔ اس انداز میں کہ اس کے چہرے پر کرنیں بکھری پڑ رہی تھیں اور وہ مسکراتی ہوئی راحیل سے کچھ سرگوشیاں کر رہی تھی، راحیل بھی ہنس رہا تھا وہ واپس پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ راحیل نے اسے دیکھ لیا اور جیسے یکدم ہی اس کی ہنسی میں بریک لگ گیا وہ بوکھلا سا گیا پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی تب ہی شاہین نے اسے آواز دے لی۔

"آؤ سیما آؤ۔ کھانا شروع ہی ہونے والا ہے تمہارا ہی انتظار تھا"

وہ خاموشی سے اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے ؟

"سیما ان سے ملو یہ میری عزیز دوست تہذیب کے شوہر ہیں مسٹر راحیل"۔

"جی ———!" وہ بُری طرح چونک پڑی۔

یہ دوسرا دھماکہ تھا جو اس پر ہوا تھا اس نے راحیل کو دیکھا جس کا سر جُھک گیا تھا، تہذیب کے چہرے پر فتح مندی کے آثار تھے۔

"یہ لوگ کل واپس جا رہے ہیں اسی لئے میں نے آج ان کے اعزاز میں ڈنر دیا ہے"

"اچھا ———" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ماحول ایک دم سے بوجھل سا ہو گیا تھا۔ اسی خاموشی میں کھانا ختم ہوا اس نے تو بس برائے نام ہی کھایا دل پر ایک بوجھ سا تھا کھانا کھا کر وہ لوگ رخصت ہو گئے تہذیب بھی

راحیل کے ساتھ ہی چلی گئی۔ یہ رات اسے اپنی سسرال میں ہی گزارنی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگی تو شاہین نے اُسے روک لیا۔

"ٹھہرو سیما مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"جی فرمایئے"۔۔۔۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

"آج میں تمہارے سارے شکوے دُور کر دینا چاہتی ہوں تم میری طرف سے جانے کتنی غلط فہمیوں کا شکار ہو گی۔"

"مجھے آپ کی طرف سے نہ ہی کوئی شکایت ہے اور نہ ہی غلط فہمی"، سیما کی آواز بھرا گئی۔

"زندگی کے فیصلے نہ تو خود مختاری سے کئے جاتے ہیں اور نہ ہی اکیلے" شاہین نے اسے ہاتھ بڑھا کر اپنے پاس کر لیا۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں کہ راحیل ایک بہت ہی خراب انسان تھا لڑکیوں کو بہکا کر انہیں تباہی کے راستے پر لگانا اس کا مشغلہ تھا دولت مند باپ کا آوارہ بیٹا جو لڑکیوں پر اپنی عزت کا رعب ڈالتا ہے کیوں کہ لڑکی میں اگر ذرا بھی عقل ہو تو وہ سوچ سکتی ہے کہ دولت مند لڑکے دولت سے لڑکیوں کا شکار کرتے ہیں اسی لئے عام طور پر لڑکیاں اوسط درجے کے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں یہ سوچ کر کہ ایسے لڑکے ضرور شریف ہوں گے، معاشی مسائل کب انہیں آوارگی کی طرف توجہ دینے کی مہلت دیتے ہیں اونچے خاندان کی لڑکیاں اکثر متوسط طبقے کے لڑکوں کو پسند کرتی ہیں کیوں کہ انہیں اونچے خاندانوں کے لڑکوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔"

شاہین دم لینے کو رُکی

"راحیل اور تہذیب کا فلرٹ بہت پرانا ہے دو سال قبل جب میں پنڈی گئی تھی تو ان کا افیئر بہت زوروں سے چل رہا تھا اور اسی سلسلے میں تہذیب نے کئی بار مجھ سے اس کی ملاقات بھی کرائی تھی اسی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے مجھے راحیل شروع ہی سے ناپسند تھا میں نے کئی بار تہذیب کو سمجھایا کہ یہ سب غلط باتیں ہیں کہ ہوٹلوں اور پارکوں میں ملا جا رہا ہے آپس میں خط و کتابت ہو رہی ہے اس سے بہتر یہ ہے کہ تم شادی کر لو اور شادی کے لئے جب بھی راحیل سے کہا گیا وہ ٹال گیا اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا۔

میرا قیام تو وقتی تھا میں کراچی واپس آ گئی لیکن برابر میں اسے خطوط میں سمجھاتی رہی۔ راحیل نے اسے بڑے سبز باغ دکھائے تھے اسی لئے میری کوئی نصیحت اس پر اثر نہیں کر رہی تھی پھر ایک دم سے ہی تہذیب کے خط آنے بند ہو گئے کافی عرصے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور راحیل غائب ہو چکا ہے میرے اندیشے صحیح ثابت ہوئے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اپنی عزت بچانے کے لئے تہذیب خودکشی پر آمادہ تھی لیکن میں نے اسے بہت سمجھایا کچھ مخلص سہیلیوں نے مدد کی یوں بدنامی کے داغ کو ماتھے پر سجانا ہی پڑا، گھر والوں نے وہ محلہ چھوڑ دیا اور دوسری جگہ رہنے لگے یہ مشہور کر دیا کہ تہذیب نے شادی کر لی ہے اور شوہر کچھ عرصے کے لئے باہر گیا ہوا ہے یہ الفاظ ایک بہلاوا تھے لوگ بیوقوف تو نہیں ہوتے جو بہل جاتے اس کے سامنے کھلم کھلا پھبتیاں کستے والدین سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہے تھے سب سے کٹ کر رہ گئے تھے راحیل کے طفیل تہذیب کو کن کن صبر آزما لمحات سے گزرنا پڑا یہ وہی بہتر جانتی تھی پھر تم اسے لے کر آئیں اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا تازہ شکار میری بہن ہے اسی لئے مجھ سے منہ چھپا کر غائب ہو گیا، میرے سینے میں سہیلی کے انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی اُس وقت میں اگر تمہیں کچھ بتاتی تو شاید تم کبھی یقین نہیں کرتیں اسی لئے میں نے مع ثبوت سب کچھ تمہارے سامنے پیش کر دیا وہ مجھ سے چھپتا پھر رہا تھا اور میں شکاری کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی کہاں تک چھپتا میں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ اس کے والدین سے ملی تہذیب کو فون کر کے بلایا، راحیل کے والدین اس کی طرح کمینے نہ تھے تہذیب نے جب ان کے سامنے تصاویر اور خطوط رکھے تو انہوں نے بڑھ کر پوتے کو گود میں لے لیا اور راحیل کو اتنا ذلیل کیا کہ اسے سر جھکاتے ہی بن پڑا اس کی ماں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر وہ تہذیب سے شادی نہیں کرے گا تو وہ اس کی بہن کو بھی تباہی کے راستے سے نہ بچا سکیں گے تہذیب بھی کسی ماں کی عزت ہے اسے اس کی عزت کرنا ہی پڑے گی کل شام ہی ان دونوں کا نکاح بڑی خاموشی سے کر دیا گیا تم خوش قسمت تھیں جو بچ گئیں اور تہذیب کا ستارہ عروج پر تھا کہ جیت گئی"

شاہین نے بڑھ کر بہن کو گلے لگا لیا۔

"میری جان یہ بہت خراب جگہ ہے یہاں بہت سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتا ہے"

"آپی۔۔۔۔" اس کی آنکھوں میں تشکر اور افسوس کے آنسو آ گئے کہ اس نے اپنی بہن کو کتنا غلط سمجھا تھا۔"

●●

بچوں کا ادب — ترقی اردو بیورو کی اہم مطبوعات

	کتاب کا نام	مصنف / مترجم	صفحات	قیمت
۱	چار درویشوں کا قصہ	نور الحسن نقوی	۹۲	۳/۲۵
۲	چندر دیو	ہیم لتا / کشور سلطان	۲۵	۳/-
۳	حاتم طائی کا قصہ	مرتب نور الحسن نقوی	۱۲۰	۶/۵۰
۴	رابنسن کروسو	ڈینیل ڈیفو / م ندیم	۸۰	۳/۴۰
۵	راجہ رام موہن رائے	سچندر لال گھوش / انعام الحق	۱۱۲	۳/۵۰
۶	سہاتا اور جنگلی ہاتھی	شنکر / ایس ایم شاہ نواز	۳۹	۲/-
۷	سرسید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن)	پیر نجابت علی / سید ابوالحسنات	۲۴	۱/-
۸	شریف زادہ	مرزا ہادی رسوا / مرتب حفیظ عباس	۶۴	۳/۲۵
۹	عقل مند بھیڑا اور دوسرے ڈرامے	مرتب م ندیم	۴۸	۲/۳۰
۱۰	نٹ ہال کی کہانی	راج نرائن راز	۶۷	۶/-
۱۱	گاندھی جی کے مختلف روپ	انو بندھو پادھیائے / عقیل اختر فاروقی	۲۱۱	۳/-
۱۲	مشینی گھوڑا	اطہر پرویز	۱۴۳	۵/-
۱۳	مولانا روم کی کہانیاں	مرتب محمد حفیظ الدین	۴۰	۲/-
۱۴	مہاگری	ترجمہ حفیظ الکبیر پرواز	۲۴	۳/۷۵
۱۵	نصوح کا خواب	مرتب حفیظ عباس	۱۲۴	۳/۵۰
۱۶	ناگ متی	ساوتری / سلمیٰ اجمیری	۴۵	۳/-
۱۷	نورتن کہانیاں	انتخاب اور بازگوئی شمیم احمد	۱۹۲	۹/۵۰
۱۸	ہری اور دوسرے ساتھی	شنکر / پریم نرائن	۶۱	۶/-
۱۹	سیما کی کہانی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۲۸	۷/۵۰
۲۰	خط کی کہانی	غلام حیدر	۱۰۸	۳/۷۵
۲۱	گلستان کی کہانیاں	مرتب امیر حسن نورانی	۷۹	۴/-
۲۲	بچوں کی مسکان	سیدہ فرحت	۶۴	۲/۷۵
۲۳	للن پت کا سفر	جوناتھن سوئفٹ / م۔ ندیم	۴۸	۲/۱۰
۲۴	دیس بدیس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۳۵	۲/-
۲۵	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۸۳	۲/۲۵

نوٹ:- ہمارا سہ ماہی رسالہ "اردو دنیا" اور فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

— کتابوں اور دیگر معلومات کے لیے لکھیں —

شعبۂ فروخت ونمائش، ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم و ثقافت، حکومت ہند، ویسٹ بلاک ۸

آر. کے. پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

جرسِ زندگی

سائرہ ہاشمی

پنجرہ ایک بار پھر خالی ہے۔

میں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ اسے خالی ہی رہنے دوں لیکن میرا چھوٹا بیٹا کہیں نہ کہیں سے اُسے ڈھونڈ نکالتا اور پھر ضد کرتا ہے کہ اُسے کچھ رنگین چڑیاں یا ایک باتیں کرنے والا طوطا خرید دوں پنجرہ تو ہے، پھر خالی کیوں رہے۔ لیکن اس پنجرے کو دیکھ کر مجھے گھٹن کا احساس ہوتا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ یہ خالی ہی رہے۔

پنجرہ میرے ذہن میں پھیل کر کتنی ملک بن گئے ہیں ایسے ملک جن کو میں نے صرف کاغذ پر کھینچی ہوئی رنگین لائنوں میں دیکھا ہے پھر بھی مجھے اس سے اپنا رشتہ بڑا گہرا اور اٹوٹ لگتا ہے۔

کیا صرف سوچنا ہی کافی ہے، میرے پاس اس کا کوئی مثبت جواب نہیں، میری اپنی ذمہ داریاں ہیں جو مجھ سے چمٹی ہوئی ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے تقاضے۔ اُس کے لئے دی ہوئی انمول قربانیاں۔ ہاں آزادی کی دُلہن خون سے سُرخ راہوں پر پگ دھرتی آنسوؤں اور آہوں کی جھانجن بجاتی کسی قوم کی سیج پر قدم دھرتی ہے۔ یہ دُلہن اپنا سوئمبر رچاتی ہے اور قوموں کو ناممکن کمان کو جھکانا پڑتا ہے لیکن میں تو آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سُنانا چاہتی ہوں۔

پنجرہ خالی ہے اور طوطے نے آزادی حاصل کر لی ہے وہ آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا اس کے لئے جان دینی جانتا تھا میں خالی پنجرے کے سامنے کھڑی ذہن کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہوں میں تاریخ میں سفر کرتی ان راہوں پر بھٹک رہی ہوں جن کو میرے پاؤں چھو نہیں سکے۔ میں نے اپنا سر زور سے جھٹکا ہے اور مسکرادی ہوں۔ بھلا ایک حقیر پرندہ اور ایک طاقتور انسان دونوں کی جد و جہد میں کتنا بُعد ہے..... شاید یہ ننھا انسانوں سے زیادہ آزاد اور خود مختار ہے۔ اپنی کردہ

میں بھری۔

طوطے نے اس چھوٹے سے پنجرے میں قید جب آسمان کو دیکھا ہوگا تو اسے لگا ہوگا جیسے جنگلوں کی ہریالی، جھرنوں کا شور اور زمین کی روئیدگی کو اس سے چھین کر کہیں پاتال میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ننھی ننھی جھاڑیاں، خود رو گھاس اور اس کے ساتھی، کیا ہوئے سب؟ وہ سلاخوں کے ساتھ لگا رو رہا ہوگا۔ ایسے آنسو جو مجھے نظر نہ آئے جو میرے بیٹے کو نظر نہ آئے اور اب جب وہ نہیں رہا مجھے اس کی حرکتوں کے نئے نئے معانی سمجھ آرہے ہیں۔ میں شاید تھک گئی ہوں۔

میرے بیٹے نے جب ٹیلی ویژن کی ایک انگریزی فلم میں ایک طوطے کو باتیں کرتے دیکھا تو وہ بضد ہو گیا کہ میں اسے ایک طوطا خرید دوں جو باتیں کر سکتا ہو..... میں نے کہا، بولنے والا طوطا بڑا مہنگا ہوتا ہے۔ اس نے کہا آپ مجھے طوطا خرید دیں باتیں میں اسے خود ہی سکھا لوں گا۔ میں اسے دنوں ہی ٹالتی رہی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میں کسی کا آزاد رہنے کا پیدائشی حق چھینوں، کوئی بے زبان میرے ہاتھوں کی صعوبتیں جھیلے۔ قید جو بظاہر بیرونی تبدیلیوں کے زندان کو ذہنوں میں اتار دیتی ہے اور پھر ذہن اندھیروں اور منفی سوچوں کا عادی ہو جاتا ہے، وہ کھلی فضاؤں، نرم ہواؤں اور آزادی کی تابندہ روایات کو ٹھکرا دیتا ہے پھر ہر بات صرف اپنی ذات کی ڈوری سے بندھی یادوں میں جھولتی رہتی ہے۔ مجھے اپنا بوڑھا ڈرائیور یاد آ رہا ہے جو اکثر کہا کرتا تھا "بی بی جی انگریزوں کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا ہر طرف امن کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ وقت کے بڑے پابند تھے"

میں نے بے چین ہو کر پوچھا "تو پھر لاکھوں لوگوں نے آزادی کی جد و جہد میں کیوں حصہ لیا تھا؟ — انہوں نے جانیں کیوں

گنوائیں" - "بس جی وہ تو بیرطحیال تھی ...؟ ... بابا نہ جانے کون سی خوشگوار یادوں میں کھویا ہوا تھا.... یا شاید اُسے آزادی کی کوئی قیمت نہیں دینی پڑی تھی..... نایاب چیزیں جب بن مول ملیں تو اپنی وقعت کھو دیتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح میرے ذہن میں حادثات کی کڑیاں ملنے لگی تھیں ــــ مجھے آزادی سے پہلے کا ایک دُھندلا سا واقعہ یاد آگیا۔ واقعہ جو میرے ذہن میں کھو سا گیا ہے۔

پتہ نہیں اُس حیوان کو آزادی سے محبت کا درس کس نے دیا تھا جو وہ یوں بے خوف موت کی سرحد کو پار کر گیا.... وہ بھی تو انگریزوں کے دَور کا ہی تھا۔ پتہ نہیں اس کی سوچ مختلف کیوں تھی۔ کرفیو آرڈر نے گلیوں کو سُونا اور دلوں کو اداس کر رکھا تھا.... میں نہیں جانتی کہ لڑکے کیا سوچتے تھے مجھے تو بس اپنے سکول نہ جانے کا دُکھ تھا، بند دروازوں اور کھڑکیوں کے اُس پار میری سہیلیاں تھیں جنہیں میں مل نہیں سکتی تھی۔ ماں کہتی اگر تم نے باہر جھانکا تو سپاہی تجھے گولی مار دے گا اور میں موت کے انجانے خوف سے لرز کر پیچھے ہٹ کر ماں کا دامن تھام لیتی۔ اس رات شاید زوروں کی بارش ہو رہی تھی، تیز گرج اور چمک کی خوفناک آواز در در گھومتی ہمارے دروازے بھی کھٹکھٹا رہی تھی کہ ماں نے چونک کر دروازہ کھول دیا۔ اور پھر ماں اور بابا اسے گھسیٹ کر اندر لے آئے اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ تھام رکھا تھا اس نے اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ماں جی میں کرکنڑہ اکرم سنگھ کا رہنے والا ہوں.... (ہم دشمن پر حملہ کرنے گئے تھے)... میری ماں کو میرا اسلام دینا.... اسے کہنا روئے نہیں"۔ اور پھر اس کی گرفت اپنے پیٹ پر ڈھیلی ہو گئی.... سُرخ خون کے بیچوں بیچ اس کی آنتیں ڈھیر ہو گئیں..... نیم وا ہونٹوں کے کناروں پر کرب میں ڈوبی مسکراہٹ کی ہلکی سی تحریر کھنچ گئی ہے۔ ماں اور بابا ساکت کھڑے آنسو بہا رہے تھے اور میرا ننھا سا ذہن موت کے پَروں کی پھڑپھڑاہٹ کو سُن کر خوفزدہ ہو گیا تھا اور مجھے لگا تھا جیسے بادل بھی اس کا ماتم کر رہے ہوں۔ میں یاد میں کھو گئی اور ڈرا تیور بابا کہہ رہا تھا...

"بی بی جی کتنا اچھا ہو وہ وقت پھر واپس آ جائے"۔ کیا وہ وقت واپس آجانا چاہیئے کیا وہ دن واپس آنے چاہئیں؟... کیا لاکھوں انسانوں نے ان دونوں کے خلاف گواہی کے لئے اپنا خون نہیں بہایا تھا.... میں اسے کیا کہتی، میں اسے کون سا سبق دیتی.... اس نے اپنے آپ کو ذات کے زنداں میں قید کر رکھا تھا اور وہ اس طوطے کی طرح رہائی کے لئے خون کا ایک قطرہ بھی بہا نہیں سکا تھا... میں اس کے لئے کون سا نیا محاورہ بناتی..."طوطا چشم" نہیں بابا اس قابل نہیں تھا کہ میں اسے طوطا چشم بھی کہوں۔ شاید یہ محاورہ انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ کیا آزادی کی لگن طوطے سے زیادہ کسی اور پرندے میں ہے۔ سچ ہے میں آپ کو اس طوطے کی کہانی سُنانا چاہتی ہوں جو میرے سامنے مر گیا میں اس کی گواہی دینا چاہتی ہوں کیوں طوطا ان آزاد زمینوں کی طرف پرواز کر جاتا ہے جو اس کی منتظر ہوتی ہیں وہ ہماری تمام محبتوں کو تج دیتا ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اور پنجرہ خالی ہے۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کا جسم پنجرے میں ساکت پڑا تھا اور اس کا سُرخ خون سیاہ دھبے کی طرح زمین پر گرا ہوا تھا جس میں سیاہ بڑے بڑے مکوڑوں نے اپنے مُنہ گاڑ رکھے تھے۔

طوطے کی آنکھیں بند تھیں وہ آنکھیں جو پورے چار دن سلاخوں میں سے دُور او پنیلے آسمان اور چہکتی فضا کو شاید تمنا میں دیکھتی رہی تھیں۔ اس کا دل یقیناً آزاد ہونے کی خواہش میں تڑپ رہا ہوگا ــــ مجھے اسے آزاد کر دینا چاہیئے تھا لیکن میں نے تو اسے بڑے مہنگے داموں میں خریدا تھا اس پر میرا قانونی حق تھا..... اور میں اس سے زیادہ طاقتور بھی تو تھی..... وہ مجھے قید کرنے کے لئے نہ تو پنجرہ خرید سکتا تھا اور نہ بنا سکتا تھا... لیکن پھر بھی وہ میری دسترس سے دُور چلا گیا... میلا مُنہ اُڑتا ہوا۔

جب میں اپنے بیٹے کے مجبور کرنے پر ٹولنٹن مارکیٹ گئی تو رنگین طوطوں اور خوبصورت ننھی مُنی چڑیوں کی چہکار سے فضا ایک مسلسل شور اور بے ہنگمیت میں ڈوبی

ہوئی تھی، مرغیوں کی بیٹھوں کی بدبو، خون کی باس، تیز چھریاں ڈرم میں زندگی کے آخری سانس لیتی اور پھڑ پھڑاتی ہوئی مُرغیاں اور پرندوں کی خوشگوار آوازیں، جبر میں زندگی اور موت کی خاموشی ۔ تعفن کی خواہش ـــــــ میں نے طوطوں کے بڑے سے پنجرے کے پاس کھڑے ہو کر جالی کے ساتھ چپٹے ہوئے طوطوں کو دیکھا... ان کی آنکھیں ایک شدید انتظار اور خواہش سے دُھندلائی ہوئی تھیں وہ اپنی چونچوں سے جالی کو کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید یہ آواز انہیں جبر میں زندگی لگ رہی تھی "امی کتنے بے وقوف ہیں یہ طوطے بھلا لوہے کی جالی بھی چونچوں سے کاٹی جا سکتی ہے" میرا بیٹا طنز سے ہنسا ۔

" وہ آزاد ہونا چاہتے ہیں بیٹے" دوکاندار بڑے فلسفیانہ انداز سے سر ہلا کر بولا۔ ہاں آزادی کی خواہش کو قید نہیں کیا جا سکتا ... میں ہولے سے بولی۔ میرا دل نا معلوم غم سے بھر گیا۔ میں نے کہا تم لوگ کیوں پکڑ لاتے ہو انہیں، میرے اندر کی ممتا یکایک جاگ اُٹھی ۔

"جی کیا کریں اسی نے روزی ہی اسی طور لکھی ہے"۔ اس نے پنجرے میں ہاتھ ڈال کر ایک طوطے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ طوطے پھڑ پھڑا کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے میں نے پاس پڑے چھوٹی چڑیوں کے پنجرے کو دیکھا وہ آپس میں چونچیں ملائے چہک رہی تھیں ۔

سب تو اتنے مطمئن ہیں لیکن طوطے کس اضطراب کا شکار ہیں وہ کون سی زمینوں پر پرواز کرنا چاہتے ہیں کون سے گھنے جھنڈ انہیں پکار رہے ہیں، کون سی فضائیں اُن کے پھیلے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سُننا چاہتی ہیں ۔

میرا دل چاہا انہیں خرید کر آزاد کر دوں لیکن صیاد پھر انہیں پکڑ لائیں گے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمام صیادوں کے دام خرید کر انہیں جلا ڈالوں لیکن دام تو اور بھی بن جائیں گے۔

میں اپنے آپ کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھی میں نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا کر کہا.... دیکھو بیٹے.... کسی کو پنجرے میں قید کرنا گناہ ہے۔ آؤ میں تمہیں کوئی اور چیز خرید دوں کوئی تصویروں والی کتاب یا بھالو کے چہرے والا ماسک اور میں تمہیں بڑی سی چاکلیٹ بھی لے دوں گی ۔

میرا بیٹا سر جھکا کر آنسو بہانے لگا اور میں ممتا کے ہاتھوں ہار گئی ۔ انسان کی اپنی مصلحتیں !

میں نے اسے طوطا خرید دیا... میں نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ـــ "یہ تو صرف ایک حقیر سا پرندہ ہے! اور میں جانتی ہوں بڑے بڑے ظلم اسی ایک فقرے کو دُہرا کر کیے جاتے ہیں اور کیے جا سکتے ہیں اور میں نے بھی ایک مظلوم جان کو اپنا زر خرید بنا لیا ہے ـــــ

گھر پہنچے تو میرے بیٹے نے اپنے حصّے کا بہت سا پھل اُس کے آگے ڈال دیا اور پنجرے کے سامنے بیٹھا مسلسل اُسے سکھانے کی کوشش کرنے لگا.... لیکن وہ درمیان میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ اداس اور اکیلا ـــ بولو تمہارا نام ٹونی ہے ـــ تمہارا نام ٹونی ہے " "کیوں اپنا سر کھپا رہے ہو، یہ اتنی جلدی نہیں سیکھے گا"..... میں آہستہ سے بولی، اُس نے اپنی آواز مدھم کر لی.... " ٹونی .... ٹونی ... پھل کھاؤ گے"۔ کیا اپنی ذات کی پہچان بھولنا اتنا آسان ہے، کیا میرا بیٹا اسے غلامی کا سبق سکھا سکے گا ۔ قید میں خوش رہنے کا سبق پڑھا سکے گا ۔ کیا یہ سبق پڑھنا اتنا ہی آسان ہے..... لیکن یہ کھیل نہ جانے کب سے کھیلا جا رہا ہے۔ طوطے نے زور سے ٹیں ٹیں کیا اور آگے بڑھ کر میرے بیٹے کی انگلی پکڑنے کی کوشش کی ـــ وہ شاید پوری طاقت سے احتجاج کر رہا تھا۔ احتجاج جو زندہ فطرت کا مظہر ہے ۔

میں کام میں مصروف ہو گئی اور میرا بیٹا پنجرے کے پاس بیٹھا اُسے دیکھنے لگا ۔ وہ طوطے کا مالک بن کر خوش تھا۔

" امی طوطے کے پنجے سے خون نکل رہا ہے"، وہ زور سے چلّایا ۔ طوطا پنجرے کے تاروں کے ساتھ چمٹا ہوا انہیں کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور باریک تار نے اس کے پنجے کو زخمی کر دیا تھا ۔

" امی کیا اسے درد نہیں ہوتا ..؟"... میرا بیٹا فکر مند ہو کر

بولا... "بٹیا یہ آزاد ہونا چاہتا ہے... اسے آزاد کر دو"
نہیں ماتی نہیں وہ پھر رونے لگا... میں نے طوطے کو دور رکھنا چاہا لیکن وہ ہماری پروا کئے بغیر تاروں کو مسلسل نوچ رہا تھا — کیوں آخر کیوں — کیا اتنے قیمتی پھل اسے لبھا نہیں سکتے۔

میرا دل دکھ سے بھر گیا... لیکن میرے بیٹے کی خوشی —

ـــــــــ خون کی لکیر تیلیوں سے ہوتی ہوئی

فرش تک پہنچ رہی تھی ہم خاموش کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

"امی پلیز آپ اسے چھوڑ دیجئے — یہ مر جائے گا"

میرے بڑے بیٹے نے اپنی نرم دلی سے مجبور ہو کر التجا کی۔ لیکن میرے چھوٹے بیٹے کی ہانک ہٹ۔

میں نے پنجرے کو اٹھایا اور پانی کی دھار کے نیچے خون کو صاف کر دیا۔

"کیسا بے وقوف اور ڈھیٹ طوطا لائی ہیں آپ ممی"
میری بیٹی بیزار آواز میں بولی.... طوطا پھر سلاخوں سے چپٹا ہوا تھا اور ایک دفعہ باریک تار اس کی چونچ کے اوپر غائب گئی — سرخ خون اس کی آنکھوں کو بھگوتا تیزی سے نیچے بہہ رہا تھا، لیکن طوطا خاموشی سے تار کو پکڑے اسے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "امی آپ اسے چھوڑ ہی دیں، میرا چھوٹا بیٹا بھی خون دیکھ کر پریشان ہو گیا"۔ میں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا — ہاں اسے اڑ جانا چاہئے۔ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے دل میں کہا۔ طوطا آہستہ سے پھدکتا ہوا کھلے دروازے سے باہر آیا — اس نے اڑان بھری لیکن تھوڑی دور گر گیا۔

اس کے پر کٹے ہوئے تھے۔

ہم سب اسے دیکھ رہے تھے — میں نے اسے زبردستی پنجرے میں دھکیل دیا۔ وہ زور زور سے احتجاج کر رہا تھا وہ پھر سلاخوں کو نوچ رہا تھا۔

شام پڑے باہر لان کے درختوں پر چڑیوں کی تیز خوشگوار آوازیں آ رہی تھیں۔ طوطے تیز آواز میں ٹیں ٹیں کرتے آزاد فضا کی طرف پرواز کر رہے تھے کوّے چیلیں.... اور ہم خود... فضا میں کتنی طمانیت تھی۔

خوشی سے بھرپور آوازیں۔ طوطے نے سر اوپر اٹھایا وہ ان کی آوازوں کو سن رہا تھا — شاید وہ اسے بلا رہے تھے۔ اس نے آہستہ سے ٹیں ٹیں کی — احتجاج اور دکھ سے بھرپور — غم زدہ اور بے بسی سے لتھڑی ہوئی۔

رات آہستہ آہستہ میرے گھر کے چاروں طرف اتر آئی۔ فضا خاموش تھی، ہزاروں کی آوازیں ختم ہو گئی تھیں۔ لیکن اندر روشنی کی چکا چوند میں طوطا ابھی تک سلاخوں سے چپٹا ہوا تھا اس کے سر کا بالائی حصہ ایک بار پھر سرخ ہو رہا تھا۔

میں نے بڑا سا کپڑا پنجرے کے گرد لپیٹ کر اسے ایک اندھیرے کونے میں رکھ دیا۔ لیکن اندھیرا شدید تمنا کی دنیا کو تاریک نہیں کر سکتا — دوسرے اور تیسرے روز بھی وہ سلاخوں کو نوچتا رہا — سلاخیں جو اسی مضبوطی سے قائم تھیں چوتھے روز وہ سلاخوں سے چپٹا آنکھیں بند کر لیتا شاید وہ تھک گیا تھا لیکن اس نے کوشش کو جاری رکھا تھا — شاید وہ جانتا ہو کہ وہ پرواز نہیں کر سکتا — اس کے باوجود بھی۔

کتنا اچھا ہوتا اگر اس کے پر ہوتے، یہ پرواز کر سکتا میں اسے دیکھ رہی تھی — میرے ذہن میں نئی نئی کہانیاں جنم لے رہی تھیں۔ دکھ کی، جد و جہد کی — آزادی پھر پانے کی — لامحدود آزادی کی خواہش کی، میں بیٹھے بیٹھے اسے تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈنے لگی لیکن مجھے بہت دور سفر نہیں کرنا تھا کیا ہمارا اپنا زمانہ ان کہانیوں سے بھرا ہوا نہیں؟ میں نے اپنے سامنے پڑے اخبار کو اٹھایا۔ افغان مجاہدین پھر حملے کر رہے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں خون کی لکیریں ان کے دامن کو بھگوتی اس زمانہ کو لالہ زار کر رہی ہوں گی۔ ان کے چہرے دل کی لگن سے دہکتے ہوں گے۔ وہ ان سلاخوں کو توڑ ڈالیں گے جو انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

لیکن نہیں یہ تو ایک حقیر سے طوطے کی کہانی ہے اور کچھ نہیں۔

اگلی صبح جب میں نے پنجرے سے کپڑا اٹھایا تو وہ طوطا ساکت لیٹا تھا ہمارا منہ چڑاتا ہوا — وہ ایک وسیع آزاد دنیا کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو روک لو مجھے تم تو بڑے طاقتور ہو؛ اور تم جانتے ہو آزادی کی راہ ہمیشہ قربانیاں دیتی ہے

اکیلا

رضیہ بٹ

وہ سرد دیوں کی یخ بستہ سی اندھیری رات تھی۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے درختوں کے سوکھے پتے جھڑ کر ہواؤں کے ریلے سے ادھر اُدھر جا رہے تھے۔ جب کوئی زور کا ریلا آتا تو شاں شاں کی آوازیں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ میں مل کر کسی بین کا تاثر چھوڑ جاتیں۔ ماحول میں ویران سناٹوں کی گونج محسوس ہوتی اور اداسی کہُر کی طرح روح کے اندر بڑے مبہم طریق سے اُترنے لگتی۔

وہ اپنے پلنگ پر رضائی میں دبکا پڑا تھا۔ نظام دین نے رضائی کے اوپر کمبل بھی ڈال دیا تھا۔ جانتا تھا بوڑھے جسم کو اس شدید ترین سردی سے بچانے کے لئے ایک رضائی ناکافی ہے آتش دان میں موٹی موٹی لکڑیاں جل کر راکھ زدہ انگاروں میں بدل چکی تھیں۔ غسل خانے کی بتی روشن تھی اور آدھ کھلے دروازے سے روشنی کی موٹی سی لکیر کمرے کی تاریکی کو معتدل بنا رہی تھی۔ نظام دودھ کا گلاس بھی پلنگ کے قریب پڑی چھوٹی سی میز پر رکھ گیا تھا لیکن اس نے دودھ پیا نہیں تھا۔ نظام کی ساری ہمدردانہ توجہ کے باوجود وہ اپنے اکیلے پن کے احساس پر قابو نہ پا رہا تھا اس کو اپنا آپ سردیوں کی اس یخ بستہ رات کی طرح لگ رہا تھا جو اندھیری تھی۔ بوجھل ہواؤں کے جھکڑ اور سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اسے اپنے اندر محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کتنا اکیلا تھا۔

تنہائی خاردار جھاڑیوں کی طرح اس کے اندر اُگ رہی تھی پھیل رہی تھی، بڑھ رہی تھی۔ گھبرا کر اس نے کروٹ بدلی رضائی میں لپٹا سر باہر نکالا ہوا کے دباؤ سے کواڑ بار بار بج رہے تھے کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا اور اس کے برابر

پلنگ خالی پڑا تھا۔

یہ پلنگ مریم کا تھا۔

مریم جس کے ساتھ اس نے زندگی کے چالیس طویل سال بڑے بھرپور انداز میں گزارے تھے اور جس کی زندگی میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مر کر اس کا من یوں خالی کر جائے گی۔

اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اس پلنگ کو ٹٹولا۔ یہ پلنگ خالی تھا لیکن اس پلنگ سے کتنی بھری بھری یادیں وابستہ تھیں اس نے لاشعوری طور پر ہاتھ رضائی سے نکالا۔ اور مریم کے خالی بستر پر یوں پھیرنے لگا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔

اس بستر پر یادوں کے انبار تھے ایک ایک پہلو یادوں کا ڈھیر تھی۔ یہ بستر چالیس برسوں سے اس کے ساتھ ساتھ تھا کمرے بدلے تھے، ترتیب بدلی تھی لیکن یہ بستر اس کے ساتھ ہی رہا تھا۔ یہ بستر اس کی چھوٹی سی دنیا تھی — یہ دُنیا — کس خوبصورتی سے آباد ہوئی تھی، اس کی بوڑھی آنکھوں میں اس آبادی کا تصور آج بھی جوان تھا مچھلی کی طرح پھسلتی، چکنی مٹی کی سی نرم نرم مورت، صندلی رنگت، اور سیاہ چمکتی آنکھیں۔ مریم جب اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اپنے کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان جانا تھا وہ اس کی زندگی میں بہار کی دلکشی اور رنگینی بن کر داخل ہوئی تھی وہ دن کتنے جاندار تھے۔ رفاقتوں، چاہتوں سے بھرپور دن، انگ انگ سے خوشیوں کے سوتے اُبلتے تھے سینے میں میٹھے میٹھے درد کا احساس ہمہ وقت رہتا تھا چند دنوں کے لئے بھی وہ میکے چلی جاتی تو زندگی خالی خالی محسوس ہوتی۔

لیکن — گھبرا کر اس نے کروٹ بدلا۔ ایک گہرا

ٹھنڈا سانس لیا۔ باہر جھکڑ آندھی کا روپ دھار رہے تھے۔ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بڑھ رہی تھی اور شاں شاں کی آوازیں شدت اختیار کر رہی تھیں۔

اس نے سوچا ـــ جب کی خالی خالی زندگی اب کی خالی زندگی سے کتنی مختلف تھی، اُس خالی پن میں ملن کی آس کا شدید پن ہوتا تھا اور اس خالی پن میں کرب و اذیت کے سوا کچھ نہیں۔

آنکھیں بند کیے چپ پڑا وہ لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ مریم کی زندگی کے آخری تین سالوں کا کرب اُس کی ڈوبتی اُبھرتی سانسوں میں بھرنے لگا۔ مفلوجی کے تین سال اس نے بستر پہ گزارے تھے۔ ان دنوں وہ گم صُم رہتی تھی ہائے ہائے کے سوا بہت کم الفاظ اس کے ہونٹوں پہ آتے۔ اپنے آپ سے بیزار محتاج مریم بے کار سی شے تھی، جو اس بستر پہ پڑی رہتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی اس بے کار شے سے اُکتا جاتا تھا ـــ لیکن بے کار شے ہونے کے باوجود بھی اس کا وجود اپنا ہی مقام تھا۔ تنہائی کا دُکھ اور اکیلے پن کا کرب اس کے ہوتے ہوئے تو کبھی نہ جھیلا تھا۔

اس نے اپنے ناتواں وجود کو بڑی شعوری کوشش سے اٹھایا پلنگ کے چوبی تکیے سے سرہانہ ٹکا کر پشت اس سے لگاتے ہوئے رضائی سینے تک کر لی۔

آج نیند نہیں آ رہی تھی جھکڑوں کے شور اسے اپنے اندر محسوس ہو رہے تھے مریم کو مرے کتنے ماہ ہو چکے تھے اس کے چاروں بچے چالیسویں کے بعد نگئے تھے۔

بچوں کے ہوتے ہوئے مریم کی کمی اور اکیلے پن کا احساس اتنی شدت سے نہ جاگا تھا تین بیٹے اور ایک بیٹی مع آل و اولاد کے حویلی میں مقیم تھے۔ ہر وقت مریم ہی کی باتیں ہوتی تھیں بیٹے ولگیر تھے، بہوئیں آنسو بہا رہی تھیں اور بیٹی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی بچے بھی نانی اور دادی اماں کی شفقتیں یاد کرتے تھے تو اسے مریم کے بچھڑنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا سب اس کے دکھ میں شریک تھے غم مشترک تھے جدائی بھی سب کی سانجھی تھی پھر بھلا اسے اکیلے پن کا اتنی شدت سے احساس کیوں کر ہوتا۔

اور

اس کے چاروں بچوں کو اس کا خیال بھی کتنا تھا وہ اسے یوں بہلاتے تھے جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہے کتنے ہی دن اس کے بیٹے اس کمرے میں اس کے ساتھ سوتے رہے تھے جب تک اسے نیند نہ آ جاتی وہ ماں کی باتیں کرتے رہتے، بہوئیں بھی اس کا بہت خیال رکھنے لگی تھیں گھر میں تین تین نوکروں کی موجودگی میں اس کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتیں کوئی اس کے کپڑے تہہ کر رہی ہے کوئی کھانے میں پسند کا پوچھ رہی ہے۔

اور اس کی بیٹی کتنے دُکھ سے روتی تھی، "باپ کے گلے لگ لگ کر سسکتی تھی۔ چالیسویں کے بعد جب وہ اپنے گھر جا رہی تھی تو پچھاڑیں کھا رہی تھی اور اسے اک گونہ اطمینان مل رہا تھا کہ مریم کی جُدائی کا غم سہنے میں وہ اکیلا نہیں اس کے بچے اس کا دُکھ بانٹ رہے ہیں۔

اس نے تکیہ درست کرتے ہوئے سوچا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں اکیلا کیوں ہونے لگا۔ میرے بیٹے۔ میری بیٹی، میرے پوتے پوتیاں سبھی تو ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں اکیلا کیوں ہوں۔ یہ سب میرے ہیں، میرے اور مریم کے وجود کے حصے ہیں"

اس نے اپنے نحیف وجود میں توانائی محسوس کی ذہن سے تنہائی کے سائے جھٹکتے ہوئے اپنے آپ سے بولا۔ "میں اداس صرف اسی لئے رہتا ہوں کہ ان سب سے کٹ کر جی رہا ہوں میں اپنے جسم اور اپنی شخصیت کے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر دوں گا ان کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اکیلا سمجھنا حماقت ہے، مریم ان سب کے وجودوں میں زندہ ہے۔

خیالات کے اس پلٹے نے اسے تازگی بخشی حوصلہ دیا۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ سب یہاں اکٹھے ہو جائیں مریم کے ہونے نہ ہونے کی باتیں کریں اس کے اندر پھیلنے والی تنہائی کی خاردار جھاڑیوں کو کاٹ پھینکیں اس کی اُداسی کو دُور کر دیں اس کے اندر خلوص سے جھانکیں۔

اس کے بچے اعلیٰ عہدوں پہ فائز تھے لیکن وہ جانتا تھا

کہ وہ بہت سعادت مند ہیں ہر بیٹے نے ماں کے چالیسویں کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش بڑی شدت سے کی تھی۔

وہ تو خود ہی نہیں آمادہ ہوا تھا۔

اپنا نشیمن چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بھرا پُرا گھر تھا۔ اس کی ذاتی چیزیں تھیں۔ بہوؤں کے سامان سے کمرے پٹے پڑے تھے وہ یہ سب کچھ نوکروں پر تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اور

سب سے بڑی بات

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ یہ وہ حویلی تھی جہاں اس نے مریم کی رفاقت میں زندگی کا بہترین حصہ گزارا تھا۔

یہ گھر ـــ اس گھر کے در و دیوار ـــ اپنے تھے، فضا اپنی تھی، ماحول اپنا تھا، یہاں اس نے زندگی کے کتنے بھرپور دن گزارے تھے۔ وہ بیٹوں کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

لیکن یادوں سے لپٹ لپٹ کر کئی ماہ گزار کر اس کے اندر سونے پن سے ویرانی ہونے لگی تھی۔ کاش مریم نہ مرتی ـــ یا وہ اس کا ساتھ دے سکتا مریم کے ساتھ دکھ سکھ کے ایام کہیں آسودگی سے گزارے تھے۔

وہ پھر سوچوں میں کھو گیا۔ اپنا ناتواں سا سوکھا ہوا ہاتھ اس نے اپنے جھریوں زدہ چہرے پر پھیرا چندھیائی ہوئی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے بڑھاپے کا اندوہناک احساس اسے اندر ہی اندر دہلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں برسوں پہلے کا وجود لہرا گیا۔ تنومند۔ جوان اور آرزوؤں سے بھرپور خوبصورت وجود ـــ موہنی سی مریم۔ خوبصورت بچے اور معروف زندگی اور اب ـــ وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ مریم کی بیماری کے آخری تین سالوں نے اس کی جو ہیئت تبدیل کی تھی سب اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

اور اس کا دل دُکھنے لگا۔ قدرت کی حسین ترین تخلیق کا اتنا بدصورت انجام۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں وہ کئی لمحے یونہی پڑا رہا، پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سب بچوں کو بلا بھیجے گا حویلی میں سب اکٹھے ہوں گے رونق بڑھ جائے اور گہما گہمی ہو گی ـــ اس کے بچے اس کی تنہائی کا کرب بانٹ لیں گے وہ تنہا نہیں رہے گا سب، سب! اس کے پاس ہوں گے۔ وہ پریشان اسی لئے ہے کہ اپنوں سے کٹ گیا ہے۔ کئی ماہ سے کٹا ہوا ہے اس کے مونس و غم خوار بچے آجائیں گے تو اکیلے پن کی ویرانی خود بخود ختم ہو جائے گی وہ اتنا پیار دیں گے کہ بڑھاپے کی بدصورتی اور تنہائی کا احساس حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

سوچوں کے اس انداز نے اُسے سکون بخشا اور وہ بستر میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا جلد ہی نیند نے آلیا۔

صبح اس نے پہلا کام اپنے بیٹوں اور بیٹی کو خط لکھنے کا کیا۔ عید قریب آ رہی تھی اس نے سب کو یہ عید حویلی میں منانے کا تاکیداً لکھا۔ پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کو اصرار سے بلایا۔

گہما گہمی کے تصور ہی سے اُسے سکون ملا وہ اب ان سب کی آمد پر حویلی میں رچ بس جانے والی رونق ہی کا سوچتا رہا اس کے بچے اسے پیار کرتے تھے عزت و احترام کرتے تھے، اس کے دُکھ میں ساجھی تھے، اس کے غم میں شریک تھے

ہفتہ بھر پہلے اس نے حویلی کی صفائی کروائی، کمرے ٹھیک کروائے۔ ضرورت کی چیزیں ان کمروں میں رکھوائیں بڑی بہو ہمیشہ اوپر والے کمرے میں ٹھہرا کرتی تھی، منجھلی نیچے والے بیرونی کمرے میں اور چھوٹی بائیں ہاتھ کے کمرے میں۔ اس کی بیٹی ہمیشہ اس کی اپنی خواب گاہ کے دائیں ہاتھ والے بڑے کمرے میں قیام کرتی تھی جس طرح مریم ان سب کی آمد پر تیاری کیا کرتی تھی اسی طرح اس نے بھی سب کچھ کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے کسی کمی کو بھی محسوس کریں۔

ان دنوں مریم اسے بے طرح یاد آئی اپنا آپ کھو کھلا کھو کھلا لگا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے تصویر کائنات میں رنگ محض مریم کے دم سے تھا اپنی بھرپور زندگی کے چالیس سالوں کے کئی عکس اس کے ذہن میں لہرا لہرا گئے ہر آن ہر لمحہ اسے یہی محسوس ہوا کہ مریم کی رفاقت سے ٹوٹ کر وہ اس بھری دُنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔

لیکن

اس نے بڑی سختی سے ہر اس آن اور اس لمحے کو کچل دیا اتنے بڑے کنبے میں اپنے آپ کو اکیلا کہنے اکیلا سمجھنے کی حماقت اب وہ کبھی نہیں کرے گا۔

عید کے دو دن پہلے سبھی آن پہنچے۔ کوئی صبح کی گاڑی سے آیا اور کوئی دوپہر کی سے۔ بڑا بیٹا نو بجے کی فلائٹ سے پہنچا اور بیٹی اپنی گاڑی میں شام کو آ گئی حویلی میں جیسے بہار آ گئی چھوٹے بڑے چودہ پندرہ بچے، بیٹی بیٹے بہوئیں اور داماد۔ رونقیں آباد ہو گئیں۔ بیٹے تپاک سے ملے، بہوئیں احترام سے پیش آئیں۔ بیٹی گلے لگ کر سسکی، بچے دادا ابا اور نانا ابا پکارتے ہوئے لپٹ گئے۔

مسرت کی لہریں اسے اپنے وجود میں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ ان انبساطی لمحوں نے اس کے سونے سونے من میں اکیلے پن کے جاگتے احساس کو یکسر ختم کر دیا۔ مریم کی بھی کتنی ہی باتیں ہوئیں۔ بیٹوں کی سرد آہیں اور بیٹی کے بہتے آنسوؤں نے ماں کی یاد کو تازہ کر دیا۔

لیکن جلد ہی موضوع بدل گیا سب بہن بھائی ایک عرصے کے بعد اکٹھے ہوئے تھے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا جانے لگا۔

اور پھر

احوال پرسی کا سلسلہ کچھ اس طرح چلا کہ سب ایک دوسرے میں کھو گئے۔ اُسے یوں نظر انداز کر دیا جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں اُسے اپنے اندر ہی اندر دُکھ قطرہ قطرہ چھلکتا محسوس ہوا، لیکن اس نے اپنے دُکھ پر قابو پا لیا ان سب کی باتوں میں خود بھی حصہ لینے لگا کسی بات پر ہنس پڑا، کسی کی پیٹھ پر تھپکا دیا، کسی کو ٹوکا، کسی کو پیار سے دو بول کہے وہ سب آپس ہی میں لگے رہے، گلے شکوے، باتیں، ہنسی مذاق سبھی کچھ ہوا۔

پھر اس کی بہوئیں اپنے اپنے کمروں میں سامان وغیرہ ترتیب سے لگانے چلی گئیں۔ بچے کمروں اور صحن میں بکھر گئے۔ بیٹی اور داماد بازار چلے گئے دونوں بیٹے اپنے دوستوں سے ملنے چل دئے اور بڑا بیٹا اخبار لے کر وہیں قالین پر لیٹ گیا۔

وہ اُٹھ کر برآمدے میں آ گیا اس نے بیٹے سے دو ایک باتیں کی تھیں، وہ اخبار پڑھنے میں مگن تھا، ہوں، ہاں کے سوا کچھ نہ کہا۔

تنہائی کی کاٹ کاٹنے کو اس نے بچوں کو پکارا، چھوٹے بچے تو کھیل میں مصروف تھے، متوجہ نہ ہوئے مگر دو اس کے پاس آ گیا اور سبھی گو کے بجانے پر آ گئی۔

وہ ان سے ان کی پڑھائی اور سکول کی باتیں کرنے لگا۔

"کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟"

"سکول کیسا ہے؟"

"کیا بننے کا ارادہ ہے؟"

وہ دونوں بڑی سعادت مندی سے جواب دیتے رہے وہ انہیں دل لگا کر پڑھنے کی تلقین کرنے لگا، نصیحتوں کو بور سمجھتے ہوئے مگر وہ سبھی نیچی نیچی نگاہوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہوئے مسکرانے لگے، وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی بوڑھی جہاندیدہ نظروں نے ناتجربہ کار بچکانہ نظروں کی عیاری بھانپ لی۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا "جاؤ بچو — اپنے اپنے کمرے ٹھیک کر لو جا کر"

"بہت اچھا دادا ابا" کہتے ہوئے دونوں برابر والے کمرے میں گھس گئے۔

"کوئی بات نہیں بچے ہی تو ہیں" اس نے اپنے من سے اُٹھنے والی تنہائی کی گونج کو دبانے کی کوشش کی۔

رات کھانے کے کمرے میں بڑی گہما گہمی تھی، میز پر سب آ پورے نہ آ سکتے تھے کوئی کھڑا تھا کوئی بیٹھا، کسی نے مونڈھا گھسیٹ لیا تھا کوئی سائڈ ٹیبل پر چڑھ بیٹھا تھا ہنسی قہقہوں کی کھنکھناہٹ پلیٹوں چمچوں کی آوازوں میں مدغم ہو رہی تھی۔

"بڑے دنوں سے اکٹھا ہونے کو جی چاہ رہا تھا"

"خدا قسم خود میرا دل بھی چاہتا تھا"

"ابا جان نہ بلاتے تو میں خود سب کو گھر آنے کا لکھنے کا سوچ رہا تھا"

"سال میں دو بار ایسا اجتماع ضرور ہونا چاہئے"

"اور کیا ۔۔ یہ نہ ہوا تو سب ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے"
"آئندہ پروگرام ہی ایسا بنایا کریں گے۔ آگے پیچھے چھٹیاں سے لطف نہیں آتے گا ۔۔ ایک ایک ہفتے کی چھٹی کی بجائے مہینہ مہینہ چھٹی لینی چاہئے تھی"

"آئندہ سہی"

"بہت ضروری ہے۔"

"ہاں تو۔ ورنہ ہمارے بچے ایک دوسرے سے اجنبی ہو جائیں گے"

"بالکل بالکل ۔۔ اسی لئے تو کہتا ہوں۔ سال میں کم از کم دو دفعہ سب اکٹھا ہوا کریں گے"

کھانے کے دوران ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں وہ سب کی باتوں سے متفق ہو کر سر اثبات میں ہلاتا رہا۔ ہاں اس کا دل چاہتا رہا کہ سب یہ بھی کہیں کہ اباجی کی خاطر سب سال میں دو بار اکٹھا ہوا کریں گے۔

رات سبھی بڑے کمرے میں جمع تھے ایک کونے میں ٹی وی پڑا تھا اور بچے بڑے انہماک سے پروگرام دیکھ رہے تھے، اس کی بہوئیں اور بیٹی ٹی وی سے بے نیاز اپنی باتوں میں گم تھیں۔ دبے دبے قہقہے تھے، دلچسپ سرگوشیاں تھیں، راز و نیاز کی باتیں تھیں۔ دونوں بیٹے گاؤ تکیوں کے سہارے اپنی ملازمتوں اور ہوتی ترقیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ بڑا بیٹا اور داماد ماحول سے بے نیاز ملکی سیاست پر بحث کر رہے تھے۔

اُسے کوئی کمرے میں بیٹھنے کے لئے بلانے بھی نہ آیا یوں جیسے وہ بڑی غیر اہم شے ہو۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی وہ خود ہی اُٹھ کر چلا آیا۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والے دُکھ کو پھیلنے سے روکنے کا یہی بہتر طریق تھا نا۔

"آئیے اباجی ۔۔ ہم سمجھے آپ سو گئے" بڑے بیٹے نے گدے پر ٹھیک سے تکیہ رکھتے ہوئے ان کے لئے جگہ بنائی بہوئیں اور بیٹی چند لمحے چپ ہو گئیں۔

"آپ آرام ہی کرتے تو اچھا تھا" بڑی بہو نے عقیدت سے کہا۔

"ہاں اباجی ۔ صبح سے آپ چل پھر رہے ہیں تھک گئے ہوں گے" بیٹی نے کہا۔

"ٹی وی بند کر دوں" چھوٹا بیٹا بولا۔

"نہیں نہیں" بچوں نے دادا ابا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شور مچا دیا۔

"دیکھو بھئی دیکھو" وہ بڑے بیٹے کے قریب گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا، دو چار منٹ سب اس کی طرف متوجہ رہے سرسری گفتگو۔ اور پھر سب اپنی اپنی باتوں میں کھو گئے وہ چپ چاپ بیٹھا رہا کبھی ٹی وی پر نگاہ ڈال لی کبھی اپنے گرد و پیش پر۔

"موی" اکتا کر اس نے آٹھ سالہ پوتی کو پکارا۔

"جی دادا ابا" وہ اُلٹی لیٹی اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ کوئی بڑا جاذب نظر اشتہار تھا۔

وہ چند لمحے کچھ نہیں بولا پھر اس نے شوکی کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"ٹھہرئیے نا دادا ابا" اس نے بازو سختی سے چھڑا لیا شوکی شوق سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

اس نے جس بچے کو بھی اپنے پاس بلانا چاہا وہ کسمسا کر ٹی وی میں گم ہو رہا ۔۔ چھوٹی بہو نے دو تین بچوں کو دھیرے دھیرے ڈانٹا بھی لیکن ان پر اثر نہ ہوا۔

وہ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھا اپنے اندر ہوتی ہوئی ٹوٹ پھوٹ سے گھبراتا رہا ۔۔۔

پھر

شاید

اُسے اونگھ آگئی۔

"اباجی ۔ پلنگ پر چل کر سوئیے" بیٹے نے اس کا کندھا ہلایا۔

"چلئے میں چھوڑ آؤں" بیٹی بولی۔

"تھکان سے طبیعت خراب نہ ہو جائے ۔ دوسرا بیٹا بولا۔

"یہاں شور بھی تو بہت ہو رہا ہے" بہو نے کہا۔

"اٹھئے ۔ جائیے" وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں یہی الفاظ اُتر رہے تھے ان الفاظ میں احترام کی ملائمت تھی۔

وہ نہیں اٹھا "کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں" کہتے ہوئے وہ اپنے کرب کو چھپاتا رہا وہ تو ان سب میں گھل مل کر باتیں کرنا چاہتا تھا اپنی تنہائیوں کو مٹانا چاہتا تھا، اُداسیوں کو

نوچ پھینکنا چاہتا تھا ــ آسودگی ــ ذہنی آسودگی کا خواہاں تھا۔
لیکن کوئی اس کے اندر نہیں جھانک رہا تھا۔

اور جب کئی بار سب کے کہنے کے باوجود بھی وہ نہ اٹھا تو اس نے لہجے کا فرق صاف طور پر محسوس کیا۔ "اب اٹھئے سو جائیے جا کر" کہنے میں احترام کی ملائمت کی جگہ غیر محسوس سا کھچاؤ بھی تھا۔ وہ کھچاؤ جو کسی ضدی بچے کو ایک ہی بات بار بار کہنے سے اپنے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ چپکے سے اٹھا ــ اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

جب وہ بستر میں لیٹا تو انتہائی بے چین تھا۔

آج جبکہ ڈیک چل رہے تھے نہ سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی، کوا بھی نہیں بج رہے تھے اور سائیں سائیں کرتی آوازیں بھی نہ تھیں بڑے کمرے سے بہوؤں، بیٹی اور بیٹوں کے چہچہانے ہنسنے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں کسی من پسند پروگرام پر بچے کھلکھلا کر ہنس بھی رہے تھے۔ شور و غل مچا رہے تھے تالیاں بھی پیٹتے تھے۔

لیکن

ان سب باتوں کے باوجود ــ گہما گہمی اور رونق کے باوجود تنہائی کا احساس اسے ڈس رہا تھا بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ اداسی کی کٹار اس کے اندر اتر رہی تھی سناٹے گونج رہے تھے اور اکیلے پن کا کرب پوری وحشت سے اسے نگل رہا تھا۔

مریم کے خالی بستر پر اپنا ناتواں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بڑے درد سے سسک اٹھا۔

"مریم ــ میں کتنا اکیلا ہوں ــ کتنا اکیلا"

انجمن اردو کینیڈا کا انتخاب

انجمن اردو کینیڈا کے حالیہ الکشن کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل حضرات منتخب ہوئے۔

صدر:۔ ڈاکٹر جمال نقوی۔ سیکریٹری:۔ ہارون صدیقی
نائب صدر:۔ عبدالسلام۔ خزانچی:۔ صابرہ اسحٰق
بورڈ آف ڈائرکٹران میں محمد حفظ الکبیر قریشی، پنڈت ہاکسر، اقبال خالد، زبیدہ برہانیہ، شہلا، فریدہ صدیقی اور کلیم انصاری۔

انجمن کی پہلی نشست (۲۰ جنوری) میں شہر کے تمام مشہور شعرا اور ادبا نے حصہ لیا۔ جناب محمد حفظ الکبیر قریشی نے مرحوم سلطان پوری کی شاعری پر مقالہ سنایا۔ اس جلسہ میں پاکستان کے مشہور شاعر احمد فراز بھی شریک تھے۔

انجمن کا دوسرا جلسہ احمد فراز صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا جس میں محمد حفظ الکبیر قریشی صاحب نے فراز کی شاعری پر ایک مضمون پڑھا اس کے بعد احمد فراز نے اپنا تازہ کلام سنایا اور خوب خوب داد و تحسین وصول کی۔

شہر کے وہ شعرا جو ان جلسوں میں شریک رہے ان میں افضل حافظ طالب، نزہت صدیقی، سلیم صدیقی، جمال زبیری، جمشید جمال نقوی اور انور کمال کو بہت پسند کیا گیا۔

ایک جلسہ ۲۷ فروری کو بھی ہونے والا ہے جس میں توقع ہے کہ احمد فراز بھی شریک ہوں گے۔

ہارون صدیقی سکریٹری

خنجر خیرآبادی

برج لعل کوٹھا

کوروائی ضلع ودیشا (مدھیہ پردیش) کی ایک چھوٹی
ی بستی ہے اور غیر ادبی ماحول یہاں کی خصوصیات میں
حضرت مضطر خیرآبادی کے پوتے جناب برتر خیرآبادی کے
ے فرزند جناب خنجر خیرآبادی یہیں مستقلاً قیام پذیر ہیں
خنجر صاحب کی شاعرانہ حیثیت وہی جان سکتا ہے
س نے آپ کے ساتھ کچھ زمانہ گزارا ہو۔ میں اب سے تقریباً
یس پچیس سال قبل باراں ضلع کوٹا میں ڈیڑھ سال تک
پ کے ساتھ رہا ہوں اس وقت بھی آپ اپنے وقت کے
ستاد فن تھے۔ آپ کی ادبی خدمات کا یہ عالم رہا ہے کہ سلسلۂ
ملازمت جہاں جہاں تعینات ہوئے وہیں شمعِ ادب جلائی
ور غیر ادبی ماحول کو بھی شعر و ادب کی سرزمین بنا دیا۔
چند باذوق معتبدی حضرات کو اپنی شاگردی میں لے کر انہیں
شعری اصناف سے واقف کردیا اور اب پنشن یاب ہوکر
اور بھی زیادہ وقت خدمتِ علم و شعر میں صرف کرتے ہیں۔
کوروائی بزم تعمیر ادب کا قیام آپ کی کوشش کا نتیجہ
ہے اور آپ ہی اس کے نگراں ہیں۔ پچھلے دنوں ان سے ایک عرصہ
کے بعد ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ خنجر صاحب آٹھ کتابیں ترتیب
دے چکے ہیں جن میں سے پانچ مسودات اردو اکاڈمی مدھیہ
پردیش میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے کے لئے داخل
ہو چکے ہیں۔ اور باقی تین کتابوں کی اشاعت کی کوشش کی جا رہی ہے۔
خنجر صاحب نے حضرت سیماب اکبرآبادی حضرت جگر مرادآبادی
اور دیگر ہم عصر شعرائے کرام کے ساتھ کئی مشاعروں میں شرکت
فرمائی آج کل مشاعروں میں مترنم شاعروں کا فن کارانہ ترنم
پسند کیا جاتا ہے اور شعر کی اچھائی برائی پر کسی کی نظر نہیں
جاتی لہٰذا آپ نے مشاعروں میں شریک ہونا چھوڑ دیا ہے۔
اگر [illegible] مجموعۂ کلام جب منظرِ شہود پر آئیگا
تو واقعی اسے ایک بہترین مجموعۂ کلام قرار دیا جائے گا۔
خنجر صاحب اس وقت عمر کے ۶۷ ویں سال میں ہیں اور خرابیٔ
صحت کے باوجود شعری اور ادبی خدمت انجام دینے میں کوئی دقیقہ
نہیں چھوڑتے۔ دعا ہے کہ خدا انہیں صحت دے اور یہ عمرِ خضر پائیں
حالیہ ملاقات میں خنجر صاحب نے خرابیٔ صحت کے باوجود ایک
غزل عنایت فرمائی تھی آپ بھی سماعت فرمالیجئے ؎

ارے او راہ چلتے خود سراپا دیکھنے والے
بہت ہیں تیرے جلووں کا تماشہ دیکھنے والے
نظر تھی جس کی جیسی اس نے ویسا ہی تجھے دیکھا
مری نظریں کہاں سے لائیں جلوہ دیکھنے والے
یقیں تھا جس کو دل پر زعم تھا اپنی نگاہوں پر
تماشہ بن گئے وہ ہی تماشہ دیکھنے والے
اگر ہے شوقِ نظارہ تو آجا سامنے آجا
چھپے چوری تڑپنے کا نظارہ دیکھنے والے
بہت اچھا ہوا خنجر نہ تھا کوئی دمِ رخصت
تڑپ کر جان دے دیتے وہ نقشہ دیکھنے والے

منصور علی پرویز حیدری رتلامی

میں بی. کام ہوں اور میری ۲۵ سال کی عمر ہے، انٹرنیشنل ایجنسی رتلام کا مالک ہوں. شاعری کی ابتدا ۱۹۷۳ء میں ہوئی کاروباری مصروفیات کے باعث بیرونی مشاعروں میں جانا کم ہوتا ہے البتہ رتلام کی سرگرمیوں میں شریک رہتا ہوں ریڈیو اسٹیشن اندور سے کبھی کبھی میرا کلام اچھے گانے والے سناتے رہتے ہیں میں خود کئی بار اندور ریڈیو اسٹیشن سے کلام نشر کر چکا ہوں۔ غزل ملاحظہ فرمایئے ؎

زندہ رہنے کا کم از کم حوصلہ باقی رہے
اُن کے میرے درمیاں کچھ فاصلہ باقی رہے

لوٹ کر آتی ہے ہر شے اپنے مرکز کی طرف
دشمنی میں دوستی کا راستہ باقی رہے

بازوؤں میں دوڑنے والی حرارت کے لئے
تذکرہ طوفان و ساحل، ناخدا باقی رہے

اے امیرِ کارواں تو قیدِ منزل کے لئے
راہ میں دشواریوں کا سلسلہ باقی رہے

کس قدر بے جان ہے پرویزؔ اب نامِ وفا
دل کی تسکیں کو مگر یہ مسئلہ باقی رہے

فارم نمبر ۴ (رجسٹریشن آف نیوز پیپر رولز ۱۹۵۶ء)

نام اخبار — شانِ ہند
وقفہ اشاعت — ماہانہ
مقامِ اشاعت — فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
طابع و ناشر — ودیا پرکاش سرور
قومیت — ہندوستانی

پتہ :- فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مالک اور اس کا پتہ :- ودیا پرکاش سرورؔ، فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ودیا پرکاش اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔

ودیا پرکاش سرور، یکم مارچ ۱۹۸۳ء

غزل

[illegible] سلیمانی

وہ شخص ضرورت سے بھی کم بول رہا ہے
موتی لئے بیٹھا ہے..... مگر رول رہا ہے

خواہش کے پرندے کو ہے سمتوں کا پتہ بھی
رہ رہ کے جو پرواز کو پَر تول رہا ہے

وہ جانتا ہے کرب چھپانے کا ہنر خوب
ہر ایک سے گھل مل کے جو ہنس بول رہا ہے

آنکھوں کی وہ میزان وہاں ہو تو ہٹا دو
سکوں میں جہاں گاؤں اسے تول رہا ہے

تالاب کے دونوں ہی کنارے ہیں ابھی تک
یہ زخمِ زمیں تو یوں ہی مُنھ کھول رہا ہے

برگد کی ہر اک شاخ ہے برگد کی طرح ہی
چوپال پہ ثانی کبھی یہی بول رہا ہے

بہار اَب نشترؔ فتحپوری (کویت)

مِلتی ہے آفت دعاؤں سے اُن کی
ملتی ہے جنت دعاؤں سے اُن کی
جہاں تک ہو ماں باپ کی لو دعائیں
سنورتی ہے قسمت دعاؤں سے اُن کی

میسّر جو ماں باپ ہوں نونہالو
تو تم ان کے بدلے میں جنت کمالو!

اگر چاہو دنیا میں نام اُن کا کرنا
اطاعت گزاری ہے کام اُن کا کرنا
کریں صبح و شام اہتمام اُن کا کرنا
سدا چاہیئے احترام اُن کا کرنا

میسّر جو ماں باپ ہوں نونہالو
تو تم اُن کے بدلے میں جنت کمالو

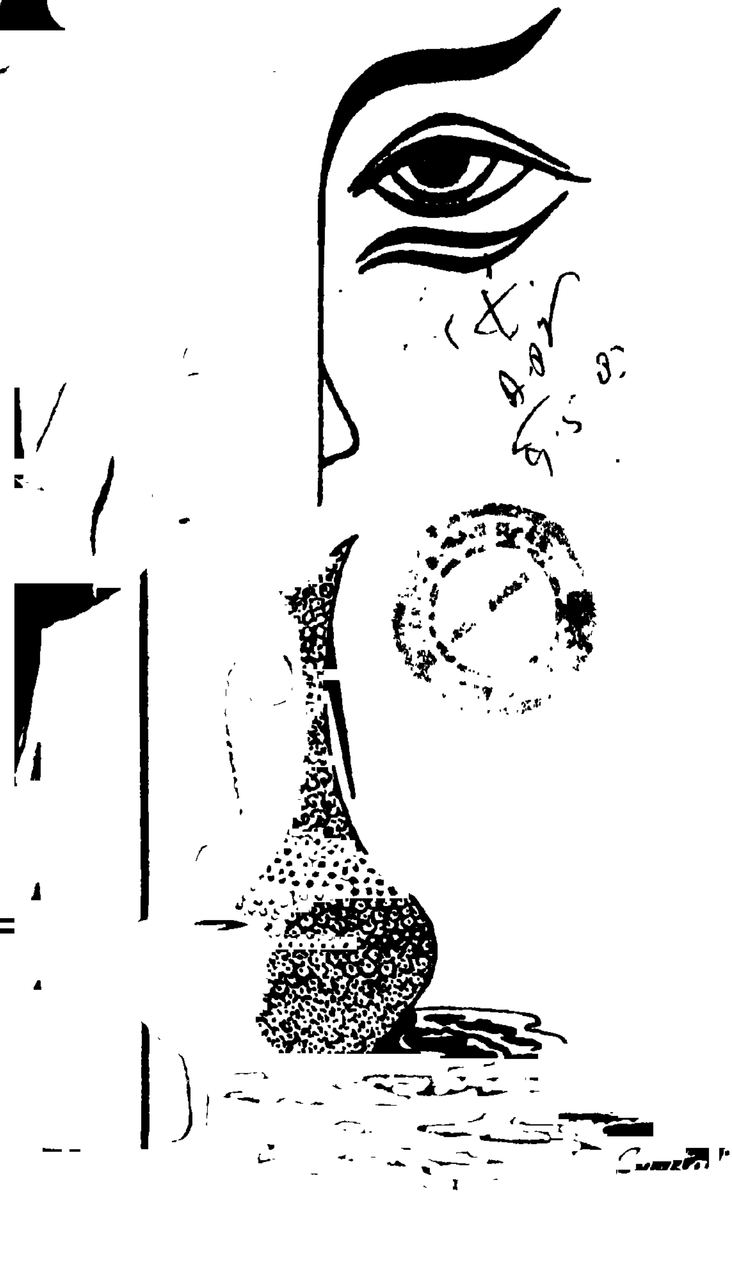
جو ماں باپ کی [illegible] تم
تو اللہ کی رحمتیں [illegible]
ہر اک کام میں [illegible] تم
[illegible]

[illegible] نونہالو
[illegible] جنت کما[illegible]

MARCH 1983 Phone : 275602 Regd. No: D-(DN)

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57



سرور تونسوی

[illegible] آزادی نمبر

نہ ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
پرست ہوں نہ گرجا پرست ہوں

آزاد دل ہے فیاض مجھکو پیار
وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
فیاض گالیاری

زرِ سالانہ ۲۴/- روپے
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
شمارہ نمبر ۴

شانِ ہند
دہلی

اپریل ۱۹۸۳ء

ممالکِ غیر کے اردو خواں حضرات
کے لئے ایک ضروری اطلاع

یہ شکایت عام ہے کہ بعض ادارے منگوائی ہوئی کتابوں کی قیمت اور محصول ڈاک وغیرہ ڈرافٹ غیر ممالک کے اردو خواں حضرات سے پیشگی منگا لینے کے بعد کتابیں نہیں بھیجا کرتے اور کچھ ادارے اصل قیمتوں پر ناجائز اضافہ کرکے زیادہ رقم بٹورتے ہیں۔

اس بدعت

کو دُور کرنے کے لئے ادارہ شانِ ہند اعلان کرتا ہے کہ ممالکِ غیر کے اردو دوست اپنی پسندیدہ اردو کتب کی فرمائش ہمیں بھجوائیں اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمائیں کہ ان کی فرمائش کی تعمیل بذریعہ ہوائی ڈاک کی جائے یا سمندری ڈاک سے۔ ہم بغیر کسی پیشگی ڈرافٹ وغیرہ کے کتابیں بھجوادیں گے اور بل بھجوادیں گے۔ جس کی ادائیگی بعد میں بذریعہ ڈرافٹ کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ

ممالکِ غیر سے اردو کتابیں طلب کرنے والے ہر خریدار کو ساڑھے بارہ فیصد رعایت دی جائے گی۔

خط و کتابت اس پتہ پر کیجئے

ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

THE , SHAN-E-HIND, MONTHLY- FLAT 8
ANSARI- MARKET-DARYA GANJ—
NEW DELHI 110002

پرنٹر پبلشر [illegible] نے [illegible] پرنٹنگ پریس محلہ جامع مسجد دہلی ۶ سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریاگنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

در مدح [illegible]

[illegible] تعلیم میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ [illegible] کے ذریعہ اہتمام لائبریریوں میں اردو کتابوں کی خریداری [illegible] ذریعہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یار لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لئے انہیں اردو کا ادیب اعظم بنانے کے لئے بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہیں چاہے ان کی اردو [illegible] سے متعلق شان میں ایک دو مرتبہ تبصرہ کیا گیا تو بر سبیل تذکرہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ایڈیشن کے ہفتہ وار ضمیمہ کے ادارتی عملے [illegible] کہ ککڑ صاحب کے مضامین ہر ہفتہ رطب و یابس کا بے مثال نمونہ ہوتے ہیں۔ انہیں ضمیمہ کے صفحہ اول پر نمایاں طور پر شائع کرنا کم از کم لکھنؤ کی ادبی و صحافتی روایات کے خلاف ہے۔ ہاں اگر لکھنؤ ایڈیشن کے ضمیمہ کے ادارتی اسٹاف کے کسی ممبر کو اپنی کوئی کتاب ککڑ صاحب کے ذریعہ سرکاری لائبریریوں کے لئے فروخت کرنی مطلوب ہو تو دوسری بات ہے مگر اس قسم کے ذاتی مفاد کے لئے قومی آواز جیسے اخبار کی ساکھ کو بٹہ نہ لگایا جائے تو بہتر ہوگا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قومی آواز لکھنؤ ایڈیشن کا ادارتی اسٹاف اپنی ذمہ داری کا احساس کرتا اور ککڑ صاحب جیسے بزعم خود ادیب اعظم کا مضمون شائع کرنے سے پہلے ایک نظر دیکھ لیا کرتا [illegible] کہ لکھنؤ سے یہ گمنام [illegible] جس [illegible] قومی آواز کے ضمیمہ [illegible] ہے [illegible] شائع [illegible] کے خلاف اعتراضات [illegible]

ہم ان [illegible] گزارش [illegible] کرتے ہیں

بعد ازاں روزنامہ قومی آواز دہلی ایڈیشن کے ۱۸ اپریل کے شمارہ میں ککڑ صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا جو [illegible] ککڑ صاحب کے اس مضمون کا پوسٹ مارٹم جس بہتر انداز میں کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قومی آواز دہلی ایڈیشن لکھنؤ والوں کی نظروں سے نہ گزرتا ہو اس لئے ہم یہ مراسلہ [illegible] قومی آواز دہلی سے نقل کر رہے ہیں تاکہ خط لکھنے والے صاحب اور لکھنؤ ایڈیشن کے ضمیمہ انچارج [illegible] پڑھ کر اپنی واقفیت میں اضافہ کر سکیں۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ جناب [illegible] صاحب (سری نگر) نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ مولانا حالی کی دو مشہور نظمیں ہیں ایک مسدس حالی اور دوسری مد و جزر اسلام حالانکہ یہ دونوں عنوانات ایک ہی نظم کے ہیں۔ اسی طرح ککڑ صاحب نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ میر بلبل و عندلیب کے شاعر تھے۔ جو شخص بلبل اور عندلیب کو الگ الگ پرندہ سمجھتا ہو وہ میر پر خامہ فرسائی کی حماقت کرے تو یقیناً ادیب اعظم کی بجائے احمق اعظم سمجھا جائے گا۔ ککڑ صاحب اور ان کے حواریوں کی واقفیت کے لئے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میر کی کلیات میں کہیں بھی ۱۳ سے زیادہ [illegible] آیا ہے میر صاحب یا میر جی [illegible] کا استعمال ہوا ہے۔ بہرکیف آپ ذیل میں وہ مراسلہ ملاحظہ فرمائیے۔

پگڑی اپنی سنبھالیے میر

[illegible] عنوان سے [illegible] اپریل [illegible] کو ضمیمہ قومی آواز میں جناب [illegible] ککڑ کا مضمون شائع ہوا ہے اس مضمون کو پڑھنے والا کوئی بھی شخص صاحب مضمون کے مبلغ علم کا اندازہ

[illegible]

کی طرف اشارہ کیا ہے [illegible]

"میر کی شاعری، اُن کا اپنا پن، ان کا لباس، ان کا رنگ خیال ... یا ان کا وسعت خیال" مضمون نگار کی [illegible] سمجھ رہا ہے۔ دوسرے شاعر اور ان کے [illegible] کی بات ہے جو لکھتے ہیں۔ پورے [illegible] (۳) انہوں نے ہندی، برج بھاشا، پوربی [illegible] جو لفظ ہیں وہ ہندی اور برج کی [illegible] میر کی شاعری کا کوئی رشتہ نہیں [illegible] زبان بغیر [illegible] کے نہیں لکھنا چاہیے [illegible] چھیلا، عطر، کوٹ، ڈوپٹہ غرضیکہ جسم و [illegible] یہ الفاظ ہیں کہ چھیلا، عطر، کوٹ، دوپٹہ [illegible] لیکن اگر اس معنی [illegible] مان کو [illegible] بھی پایا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ [illegible] صاحب میر کے زمانے میں موجود تھے اور انہوں نے میر کو کوٹ اور ڈوپٹہ پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ (۴) حسرت موہانی کے شعر کو [illegible] خراب کیا ہے کہ "شعر میرے بھی ہیں [illegible] [illegible] رکھا ہے [illegible] صاحب [illegible] کا مزدور تھا۔ (۵) [illegible] اس کا [illegible] یہ مضمون [illegible] بات [illegible] صاحب اس وقت [illegible] موجود تھے اور انہوں نے [illegible] [illegible]

[illegible]

جاتا ہے [illegible] ہوتے ہیں (۷) "میر [illegible] مصنف کے نزدیک گویا [illegible] کے نام [illegible] میر صاحب [illegible] نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے مصنف کو [illegible] نہیں (۸) میر کی [illegible] گویا تمام علوم ہیں کہ اسکول کے بچے بھی [illegible] زندگی کا [illegible] یہ حیات ہیں [illegible] (۹) میر کی زندگی گنگا اور جمنا دریاؤں کے [illegible] وجہ ہے کہ ان کی زبان گنگا جمنی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے" میر آگرے میں پیدا ہوئے جہاں جمنا ہے دلی میں رہے یہاں بھی جمنا ہے [illegible] لکھنؤ میں رہے جہاں گومتی ہے۔ میر کی زندگی گنگا کے کنارے کب گزری؟ یا [illegible] صاحب [illegible] پورا [illegible] اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن بیانات سے بھرا ہوا ہے۔

قومی آواز کو ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں ایسے [illegible] بیانات سے [illegible] گمراہ ہوں گے [illegible] ہزاروں [illegible] غلط [illegible] کا [illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible] دہلی

[illegible]

جب نقوی صاحب بغیر کسی محرک یا ترغیب کے اردو کی [illegible]
[illegible] انجام
[illegible] مالی امداد
[illegible] تو ہمیں
[illegible] دلی میں کس
[illegible] یہ کام کر رہے ہیں اور
[illegible] ہیں۔ اس کے
[illegible] اکادمی کے
[illegible] اردو زبان کی ترویج کو مضبوط کرنے کی کوششیں
کی [illegible] چھپائی چھوڑ کر دکھایا گیا ہے۔

دلی [illegible] کے اندر پڑھنے والے طالب علموں کا پانچویں
جماعت کے امتحان پاس کرنے کے بعد ایک ٹیسٹ لیا گیا اور
ان میں چھ بالترتیب اول آنے والے طلبا کو [illegible] ماہوار
اور ان کے بعد چھ بالترتیب دوم آنے والے طلبا کو چالیس روپیہ
[illegible] وظیفہ دیا جاتا ہے جو کہ چھٹی جماعت سے دسویں کلاس
تک جاری رہے گا بشرطیکہ یہ طالب علم اپنی تعلیم کو امتیازی طور
پر جاری رکھیں پھر دسویں جماعت کے بعد ان کا ٹیسٹ ہوگا
اور جو طلبا کامیاب ہوں گے انہیں اردو کی آگے تعلیم حاصل
کرنے کے لئے [illegible] دیا جائے گا۔ اس کے
علاوہ یہ [illegible] کی سطح پر اردو سے
متعلق [illegible] کسی ایک بہترین ریسرچ
[illegible]

[illegible] وہ یہ ہے
[illegible] چاہتے ہیں
[illegible]
[illegible] امتحان
[illegible] اردو [illegible]

[illegible] ایک شخص [illegible] کی پہ [illegible]
[illegible] اس سے ان [illegible] پر عمل کر [illegible]
[illegible] اردو [illegible]
[illegible] کوئی شک نہیں کہ دلی اردو اکادمی
[illegible] بہت ہی کم ملتی ہے۔ مگر [illegible]
[illegible] گورنر دلی کا شکریہ ادا کرنا [illegible]
اب [illegible] کونسل کا کام ہے [illegible]
[illegible] کی [illegible] کا [illegible]
وہ [illegible] کے [illegible] کی پہ [illegible]
زبان کی بقا وحیات کے لئے [illegible]
اکادمی دلی کی مالی مدد میں اضافہ کرے گی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

جگر مرادآبادی۔ جوش ملیح آبادی۔ فراق گورکھپوری۔ نخشب جارچوی۔ شکیل بدایونی۔ ساحر لدھیانوی۔ مفتی کفایت اللہ۔ سید سلمان ندوی۔ شعری بھوپالی۔ اور نہ معلوم کتنے مشہور ادیبوں۔ شاعروں اور لیڈروں کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کو میں نے پہلی بار کتب خانہ عزیزیہ میں دیکھا۔ کتب خانہ عزیزیہ کے مالک مولانا سمیع اللہ مرحوم اپنے وقت کی ایک ایسی ہشت پہلو ہستی تھے کہ جنہوں نے اپنی نیازمندی۔ روایتی مہمان نوازی۔ خوش گفتاری۔ سادگی اور سچائی کے باعث اپنے کتب خانہ کو ایک ایسا ادبی پنچایتی گھر بنا لیا تھا کہ ملک کا ہر ادیب۔ شاعر اور لیڈر نیز کتب فروش اپنی دہلی یاترا کو تب تک مکمل نہیں سمجھتا تھا جب تک کہ وہ کتب خانہ عزیزیہ میں نہ آئے۔

ایک دن اُردو بازار سے میں گزر رہا تھا کہ مولانا سمیع اللہ صاحب نماز ادا کرنے مسجد کی طرف جاتے ہوئے ملے۔ فرمانے لگے سرور صاحب میں دس منٹ بعد نماز پڑھ کر واپس آرہا ہوں آپ بھی اُردو بازار کا کام ختم کرکے دس منٹ تک دوکان پر آجائیے گا۔ آج ایک ایسی ہستی سے ملاقات کراؤں گا کہ جس کی آپ نے کئی مرتبہ فرمائش کی ہے۔ ان دنوں شانِ ہند محبوب المطابع میں چھپتا تھا اور گاماں دفتری کے ہاں اس کی بائنڈنگ ہوتی تھی۔ لہٰذا میں محبوب المطابع کے مالک مرزا صاحب سے رسالہ جلد از جلد چھاپ کر گاماں دفتری کے ہاں دینے کی تاکید کرنے اور گاماں دفتری سے رسالے کے فرمے پریس سے اٹھوانے کی ہدایت دے کر کتب خانہ عزیزیہ پر حاضر ہوا تو مولانا سمیع اللہ صاحب فرمانے لگے جوتے کھول کر اندر تشریف لے آئیے۔ حکم کی تعمیل کی گئی تو فرمانے لگے پہلے چائے پیجئے اور فخر کیجئے کہ آج آپ مولانا حسرت موہانی کے ساتھ چائے پی رہے ہیں۔ میرے ذہن میں مولانا حسرت موہانی کا جو خیالی تصور تھا وہ پاس بیٹھے ہوئے منحنی سی شخصیت سے قطعاً مختلف تھا۔ تاہم میں نے چائے کی پیالی کو ایک طرف رکھتے ہوئے مولانا حسرت موہانی کے قدم چھوئے تو انہوں نے انتہائی شفقت سے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے مولانا سمیع اللہ سے کہا کہ آپ نے ان کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔

سمیع اللہ صاحب فرمانے لگے ان کا نام تو دیا پرکاش ہے مگر عوام انہیں سرور تونسوی کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ تونسہ شریف (پاکستان) کے رہنے والے ہیں۔ شرنارتھی ہونے کے باوجود مسلمانوں سے نفرت نہیں کرتے۔ ماہنامہ شانِ ہند کے ایڈیٹر اور مالک ہیں۔ کتابوں کا کام بھی کرتے ہیں پہلے مُلتان میں کاروبار تھا اب یہاں آگئے ہیں اور چاندنی محل میں رہتے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی فرمانے لگے مُلتان تو ایک بار میں بھی ہو آیا ہوں۔ عرض کیا کہ میں نے مُلتان میں آپ کی تشریف آوری کے بارے میں کبھی نہیں سُنا فرمانے لگے ہمیں خود معلوم نہیں تھا کہ ہم ملتان میں ہیں تو پھر آپ کو یا کسی دوسرے کو کیسے پتہ چل سکتا تھا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا ۱۹۴۲ء کی ہول سیل پکڑ دھکڑ میں مجھے بھی مُلتان سنٹرل جیل میں لے جایا گیا تھا اور ہمیں جیل کے اندر جا کر پتہ چلا تھا کہ یہ مُلتان سنٹرل جیل ہے۔ عرض کیا کہ آپ پُرانی سنٹرل جیل میں تھے یا نئی میں۔ چسکی لیتے ہوئے کہنے لگے ہم پُرانے وقت کے لوگوں کو پرانی سنٹرل جیل میں ہی رکھنا مناسب سمجھا گیا تھا۔ میں نے بتایا کہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" بھی تو آپ کے ساتھ ہی اسی جیل میں تھے۔ کہنے لگے

میاں ایک مفتون ہی کیا نہ معلوم وہاں کون کون بند تھا اور ایک کو دوسرے سے ایسے الگ تھلگ رکھا گیا تھا کہ کسی کو کسی کی خبر ہی نہ لگ سکتی تھی چند دنوں بعد کسی دوسری جیل میں منتقل کردیا گیا تھا۔

ان دنوں مولانا حسرت موہانی ممبر پارلیمنٹ تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا کہ آپ اپنا فلیٹ نمبر وغیرہ بتادیں تاکہ آپ جب پارلیمنٹ کے اجلاس کے دنوں میں دہلی تشریف لایا کریں تو میں قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کی غرض سے حاضر خدمت ہوسکوں۔ فرمانے لگے پارلیمنٹ کے سامنے ہی مسجد ہے نا جس دن ملنا چاہو کسی بھی نماز کے وقت آجایا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ممبر پارلیمنٹ ہیں آپ کو تو سرکاری رہائش گاہ الاٹ ہوئی ہوگی۔ فرمانے لگے میاں خدا کے گھر سے بڑھ کر اور اچھی رہائش گاہ کون سی ہوگی۔ میرا وقت پارلیمنٹ کے اجلاس کے بعد اکثر و بیشتر اسی مسجد میں ہی گزرتا ہے اس لئے جسے مجھ سے ملنا ہوتا ہے وہیں آجاتا ہے۔

میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں التماس کیا کہ حضور ملک کو آزادی دلانے میں آپ نے اپنا سب کچھ تباہ کردیا گاندھی جی آپ کو ملک کو آزادی دلانے والوں کی صف اول میں اعلیٰ مقام دیتے تھے تو پھر آپ کانگریس سے برگشتہ خاطر کیوں ہیں۔ ذرا سی تلخ نوائی سے فرمانے لگے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ گاندھی جی نے کہا تھا آزادی ملنے کے بعد کانگریس کو ختم کردینا چاہئے۔ اب کانگریس وہ نہیں رہی جو گاندھی جی کی کانگریس تھی۔ اب کانگریس حکمرانوں کی جماعت کا نام ہے انگریزی حکومت کی لاٹھیاں کھانے والوں اور جیلوں میں زندگیاں گزارنے والوں کی کانگریس اور تھی اور اب جو کانگریس ہے وہ حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں کی ہے سرور صاحب اسے مت بھولئے کہ

جان کو محو غم بنا، دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو، یوں قطع رہ مراد کر
حق سے بہ عذر مصلحت وقت پر جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ، اس پر نہ اعتماد کر

کلام حسرت بہ زبان حسرت سننے کی خواہش کا اظہار کرنے کی میں جسارت ہی نہ کرسکتا تھا مگر قدرت نے میری مدد کی اور مولانا نے از خود ہی جوش میں آکر یہ نعمت غیر مترقبہ عطا فرمائی تو میں نے داد اس انداز سے دی جو تحسین و آفریں کی بجائے آہ و واہ کی صدا تھی تو مولانا نے ازراہ کرم میرا بھرم رکھتے ہوئے کہا کہ داد اور بے داد کا فرق سمجھتے ہو اس پر مولانا سمیع اختر صاحب فرمانے لگے کہ سرور صاحب نے لال قلعہ کے اور دوسرے کئی مشاعروں کا جو آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اگر کبھی وقت ملے تو اسے ضرور پڑھئے۔ اس پر مولانا حسرت صاحب نے حکم دیا کہ شان ہند کے چند شمارے ان کی خدمت میں حاضر کردوں۔ جس کی تعمیل دوسرے ہی دن کی گئی۔ دوسری ملاقات میں ارشاد فرمایا کہ شان ہند کانپور کے پتے پر بھجواتے رہئے۔ تمہاری تحریر میں پنجابیت کے باوجود دلکشی اور دلچسپی کے ساتھ ساتھ سچائی صاف جھلکتی ہے۔

مولانا کا قلمی خاکہ شاید میں اس دلپذیر انداز میں پیش نہ کرسکوں جس انداز میں کہ جناب سجاد ظہیر صاحب نے لکھا ہے۔ ترقی پسندوں کی کسی کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی کو بھی مدعو کیا گیا تھا جس کا ذکر سجاد ظہیر صاحب نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کی ادبی سرگزشت "یادیں" میں کرتے ہوئے مولانا سے متعلق ان کی خصوصیات کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے ان کے خدوخال کا بھی بہت اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ سجاد ظہیر صاحب لکھتے ہیں (سجاد ظہیر صاحب کی یہ تحریر ہفت روزہ آئینہ نئی دہلی ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۲۸ سے نقل کی جارہی ہے)

"عام دستور تو یہ ہے کہ شاعروں کو جب مدعو کیا جاتا ہے، تو پہلے وہ اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہیں، پھر لوگ ان سے جاکر ملتے ہیں اور شرکت کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کا آنے جانے کا کرایہ اور اس کے علاوہ زاد سفر دیا جاتا ہے، اسٹیشن پر استقبال کیا جاتا ہے ضیافتیں اور مہمان داریاں ہوتی ہیں اور پھر جائے قیام سے

موٹر میں بٹھا کر شاعر کو محفل میں لایا جاتا ہے۔ یہ دستور ایسا بُرا بھی نہیں کیوں کہ ان موقعوں کے علاوہ شاعر اور ادیب کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا اور عام طور سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی زندگی تنگ دستی بلکہ فاقہ کشی کی ہوتی ہے اور اگر ایسا ہے تو عام لوگوں کا اس میں کیا قصور؟ عام لوگوں کی زندگی بھی تو آخر ایسے ہی بسر ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے ملک میں اگر کوئی ایسی ہستی تھی جسے ہر قسم کے تکلف، بناوٹ مصنوعی اور رسمی آداب سے سخت نفرت تھی اور جو اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ لوگ اس کی بات پر بُرا مانیں گے یا ناراض ہو جائیں گے، سچی بات کہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے کبھی نہیں جھجکتی تھی، تو وہ حسرت موہانی کی ہستی تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ جو بات کہتے تھے وہ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی تھی مگر جب سیاسی یا ثقافتی اور معاشرتی امور میں وہ کوئی پوزیشن اختیار کرتے تھے تو اس کی صحت اور سچائی پر انہیں پورا اعتماد ہوتا تھا اور پھر دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جاتی اور اس کی وجہ سے ان پر مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں، وہ اپنی جگہ پر اٹل رہتے تھے۔

مولانا کا قد چھوٹا تھا اور وہ جی بھر کے بدصورت تھے جسم گدبدا تھا جس پر وہ ایک کافی لمبی، میلی سی، کلی پڑی ہوئی گہرے سلیٹی رنگ کی کھدر کی شیروانی پہنتے تھے ان کی تصویریں سب نے دیکھی ہیں ان کی صورت سے سب آشنا ہیں۔ چیچک رُو، ڈھلکتا ہوا رنگ اور سارا چہرہ ایک بڑی گھنی غلوں سی داڑھی سے ڈھکا ہوا تھا جو شاید چھ انچ سے بھی کچھ لمبی ہی ہو گی اور جس کے بال کھچڑی تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس داڑھی کو شاید وہ کبھی نہ کترتے تھے اور نہ اس میں کنگھی کرتے تھے اس لئے کہ وہ چاروں طرف اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر پر وہ ہمیشہ ترچھی شوخ سُرخ رنگ کی چھوٹی سی فلیٹ کی ترکی ٹوپی پہنتے تھے جس میں پھندنا نہیں ہوتا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگاتے تھے جس کا فریم لوہے کا تھا اور جس کے شیشے پرانی وضع کے چھوٹے چھوٹے اور بیضاوی تھے لیکن ان کے پیچھے سے بھی ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چمک اور ان کا پھرتیلا پن چھلکتا رہتا تھا۔ ان کے انداز میں شوخی اور لطافت تھی، وہ تیزی سے اور مُسکرا کر بات کرتے تھے اور اس عمر اور بزرگی کے باوجود ان کے جسم میں ایک چلبلاہٹ اور پھرتی سی تھی۔ ان کی آواز پتلی تھی اور جب وہ جوش میں آ کر اور بڑے انہماک سے بولتے تھے، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی بچے کی ٹوٹی ہوئی سیٹی ہو جسے زور زور سے پھونکا جا رہا ہے لیکن جو پھر بھی مشکل سے بجتی ہے۔ ●●

عقیل صدیقی

بزمِ ادب

خلیل انجم

آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کا سالانہ مشاعرہ

آج ۱۲ مارچ ۸۸ء کی شب میں آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کا ہال بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ اسٹیج کو ہمیشہ کی طرح اس سال بھی دلہن کی طرح سجایا گیا ہے جس پر بیرونی و مقامی شعرائے کرام تشریف فرما ہیں آج بزمِ ادب آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کی جانب سے دسویں سالانہ جشن مشاعرے کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ مشاعرہ وقتِ مقررہ پر شروع ہو رہا ہے۔ اس مشاعرے کی ایک روایت رہی ہے کہ بزمِ ادب کا مشاعرہ ہر سال یومِ جمہوریہ تقریب کے سلسلے میں ۲۶ جنوری کی شب میں منعقد کیا جاتا ہے لیکن چند ناسازگار حالات کے تحت اس بار اس روایت کو توڑنا پڑا۔ اس سال بھی بزمِ ادب کی جانب سے ایک سوینیر شائع کیا گیا ہے جس کا اجراء تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کے ادب نواز جنرل منیجر گرامی قدر جناب [illegible] صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ہو رہا ہے جو آج کے جلسے کے مہمانِ خصوصی بھی ہیں۔ اجراء کے بعد صاحب موصوف نے اراکینِ بزمِ ادب کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے چند کلمات فرمائے۔

مہمانِ خصوصی تقریر ختم کر کے اپنی جگہ [illegible] مشاعرے کے صدر جناب فرید تنویر [illegible] مائیک پر آنے کی درخواست [illegible] وہ اپنے صدارتی خطبے [illegible] مختصر مگر جامع تقریر [illegible] آئے تو جلیل ساز صاحب مشاعرے کی نظامت [illegible] لے آئے [illegible] جلیل ساز [illegible] کے مشہور [illegible] ابتدائی [illegible] سامعین محظوظ ہو رہے ہیں اور دیکھئے

مشاعرے کے آغاز کے لئے آرڈیننس فیکٹری امباجھری ناگپور کے ہی ایک نوجوان سلیم درانی سلیم کو زحمتِ کلام دی جا رہی ہے۔ سلیم صاحب مائیک پر آ کر مترنم آواز میں اپنی غزل سنا رہے ہیں ان کے دو شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

ان کا کیا ہے وہ کسی موڑ پہ مڑ جائیں گے
میں وفا کا دیا لے کے گزر جاؤں گا
میں ستارہ ہوں تمہارا ہی رہوں گا شائق
چھوڑ کر آپ کے دامن کو کدھر جاؤں گا

سلیم صاحب مائیک سے رخصت ہوئے تو [illegible] جنرل سیکریٹری اور ہندی کے شاعر جناب ونود [illegible] ایک ہندی نظم سے بزمِ مشاعرہ کو [illegible] بنانے چلے ہیں اور فرما رہے ہیں ؎

جس [illegible] وہی انوکھا سا لگتا اک چہرہ ہے
[illegible] کی نگری میں پرجا تنتر کا شور ہے

[illegible] نظم کا وہ بند [illegible] جسے سامعین نے پسند فرمایا ہے ؎

چور [illegible] گیتوں [illegible] غزل نئی چور [illegible] ہوں
چھند بند [illegible] ہی [illegible] آ ہوں
[illegible] کے بکھرے [illegible] ادھر میں
[illegible] انوکھا سا لگتا اک چہرہ ہے

[illegible] امباجھری [illegible] پلٹ رہے ہیں اب [illegible] ناظم مشاعرہ [illegible]

[illegible]

جب بھی دیتے ہیں زخم دیتے ہیں
کس قدر با اصول ہیں یہ لوگ

خاکسار نے صدرِ محترم سے اجازت لے کر معمولی ترنم میں ایک غزل پیش کی ہے۔

ہنس ہنس کے مرا مجھ سے احوال نہ پوچھا کر
اب اور مرے غم میں ظالم نہ اضافہ کر
پھر پھولوں کی خواہش ہے گلشن کی تمنا کر
اے طائرِ دل پہلے کانٹوں پہ بسیرا کر
دل تیری نگاہوں میں شیشہ ہی سہی لیکن
آواز نہ پیدا ہو اس طرح شکستہ کر

سامعین اور اسٹیج پر تشریف فرما شعرائے کرام نے خاکسار کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ بالاں کہ من آنم کہ من دانم۔ اب ناگ پور کے شاعر غفار شاد کو مائیک پر آنے کی زحمت دی جا رہی ہے، یہ ترنم میں اپنی غزل سنا رہے ہیں ایک شعر سماعت فرمائیں

دیکھا ہے ان آنکھوں نے منظر یہ وہ پہنچا ہے
جم جم کے جو پھسلا ہے گر گر کے وہ سنبھلا ہے

اب بھوپال کے ساجد رضوی صاحب کو یاد کیا گیا ہے سننے ساجد رضوی مائیک پر آکر مترنم آواز میں اپنی غزل شروع کر رہے ہیں ؎

دریچے یادوں کے جب بھی وہ کھولتے ہوں گے
ستارے آنکھوں سے موتی کبھی رولتے ہوں گے
ہمارا حسن تو احساس کو جگاتا ہے
ہمارے شہر کے پتھر بھی بولتے ہوں گے

سامعین اپنی سخن فہمی کا ثبوت دے رہے ہیں اور ساجد صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہمارے ماضی کی رنگینیوں میں گم ہو کر
وہ اپنے خون کو اشکوں میں گھولتے ہوں گے
عجیب لمس کا احساس ہو رہا ہے مجھے
مرے لفافے کو شاید وہ کھولتے ہوں گے
خبر جدائی کی دی ہے کہیں یہ سچ تو نہیں
نہیں نہیں وہ مرا دل ٹٹولتے ہوں گے

ساجد رضوی نہایت کامیاب واپس ہو رہے ہیں۔ سامعین ایک ساتھ آواز لگا رہے ہیں "ایک اور" "ایک اور" لیکن آوازوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ساجد صاحب اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ہیں۔ لیجئے اب چندر پور سے آئی ہندی کی شاعرہ کماری نیر شبنم کو زحمت دی جا رہی ہے، سامعین سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں اور سب کی نگاہیں نیر شبنم کی طرف ہیں۔ لیکن افسوس، وہ کچھ زیادہ نہ کر سکیں اور اپنی بے ربط سی غزل سنا کر رخصت ہو گئیں۔ ساجد رضوی نے جو ماحول بنایا تھا وہ کچھ بگڑ سا گیا ہے، وقت ایک ایسے لمحے کا منتظر ہے جو مشاعرہ کو خوشگوار موڑ دے سکے لہٰذا ناظم صاحب نے جلگاؤں کے مزاحیہ شاعر سوبیدار فوجی سے مختصر سے تعارف کے بعد درخواست کی کہ مائیک پر تشریف لائیں۔ سنئے سوبیدار۔

فوجی قطعات سنا رہے ہیں ؎

یہ حقیقت ہے بار دو تیا ہیں — خون کے مارے شراب پیتے گیا
عیش میں مست رہے رات کو — خون بھی بے حساب پیتے گیا
وہ تیلے نٹ بولٹ ہیں سفینے کے — اور ظالم کی نا خدائی ہے
آسمان اوڑھ کر میں سوتا ہوں — یہ زمیں میری چارپائی ہے

فوجی صاحب اس قطعہ کو دو تین بار دہرانے کے بعد فرما رہے ہیں ؎

کار والے بھلا یہ کیا جانیں — کتنی آنکھوں میں دھول جاتی ہے
اپنی جنتا ہی بھولی بھالی ہے — ووٹ دیتی ہے بھول جاتی ہے

ماحول قہقہہ زار بن گیا ہے، شور کم ہوا تو پھر ارشاد ہوا

آپ کو اس میں کیوں تعجب ہے — اپنے جیسے تو ہم بہت سارے
ہم بناتے ہیں اس طرح نزلیں — جیسے ریل مولڈ ہوتے ہیں نالے

فوجی صاحب ہنسی کا خزانہ لٹا کر اپنی جگہ واپس آ گئے ہیں، مشاعرہ کا ماحول بدل گیا ہے، ناظم صاحب بھی موقع غنیمت جان کر ایک لطیفہ سنا کر سامعین کو محظوظ کر رہے ہیں مگر فوراً سنجیدگی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور آواز دے رہے ہیں غزل کے شاعر سلیم ردولی صاحب کو جو مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ سلیم صاحب مائیک پر آکر تحت میں

ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں ؎

وجود اپنا عدیم المثال رکھ نہ سکا
میں اپنے بارے میں اچھا خیال رکھ نہ سکا
نکل کے لب سے بکھر جائیں خوشبوؤں کی طرح
میں اپنے لفظوں میں ایسا کمال رکھ نہ سکا
میں اپنے شہر کی سڑکوں سے خالی ہاتھ آیا
کسی کے سامنے اپنا سوال رکھ نہ سکا

مناسب داد پا کر سلیم رومانی تحت میں ایک غزل کے کچھ اور شعر سنا رہے ہیں ؎

کل تک مرا بھی شہر میں اک خاندان تھا
جس کا وجود میرے لئے سائبان تھا
آنکھیں کھلیں تو سامنے تنہائیاں ملیں
احساس کی صلیب پہ میرا گمان تھا
جھیلیں پرا جہان ملیں اس کی لاش پر
جس شخص کی گرفت میں سارا جہان تھا

سلیم رومانی نے مکمل طور پر ماحول کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور اب مترنم آواز میں غزل سرا ہیں ؎

میں نے کہا قریب آ اس نے کہا نہیں نہیں
میں نے کہا کہ مان جا اس نے کہا نہیں نہیں

ترنم کے فنکارانہ زیر و بم نے ماحول کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور مطلع میں حسن و عشق کی تکرار نے جو تاثر پیدا کیا ہے وہ بیان سے باہر تو نہیں لیکن نور لکھنوی کے اس شعر کا ماحول ضرور بن گیا ہے ؎

میں تو غزل سنا کے اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے

سلیم رومانی کے مطلع نے شہزادہ سلیم اور انارکلی کے رومانس کی یاد دلا دی ہے۔ ماحول رومان پرور لگ رہا ہے اور سلیم صاحب جھوم جھوم کر اشعار سنا رہے ہیں ؎

میں نے کہا کہ ایک جام اس نے کہا خیالِ خام
میں نے کہا پلا پلا اس نے کہا نہیں نہیں
میں نے کہا مری نظر اس نے کہا کہ بے اثر
پھر سے کہا کہ آزما اس نے کہا نہیں نہیں
میں نے کہا مرے ندیم اس نے کہا مرے سلیم
میں نے کہا وفا وفا اس نے کہا نہیں نہیں

سلیم رومانی اپنی غزل ختم کر کے تالیوں کی گونج میں نہایت کامیاب اور شاداں مائیک سے لوٹ رہے ہیں جس طرح بسنت اپنے شباب پر ہے اسی طرح مشاعرہ بھی اپنے عروج پر ہے اور سامعین سے بھرا ہوا ہال پوری طرح مشاعرے سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ سلیم رومانی اتنے کامیاب ہوئے کہ ان کے بعد آنے والا شاعر قربانی کا بکرا ہی ثابت ہو سکتا تھا لیکن جلیل ساز صاحب موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کسی شاعر کو نہیں بلکہ گلبرگہ سے تشریف لائی ہوئی شاعرہ محترمہ صغریٰ عالم کو نہایت ادب کے ساتھ دعوتِ سخن دے رہے ہیں۔ صغریٰ عالم سنجیدہ شعر کہتی ہیں اور چونکہ ان کے اشعار عام فہم نہیں ہیں اس لئے شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والا ایک خاص طبقہ ہی انہیں داد دے رہا ہے ان کے پڑھنے کا انداز بہت اچھا ہے لیکن لوگ قدرے مایوسی کا بھی اظہار کر رہے ہیں کیونکہ وہ ترنم سے نہیں تحت میں سنا رہی ہیں چند شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

کس کی شوکت ہے یہاں کس کی یہ دارائی ہے
ظلمتِ شہر میں اک برق سی لہرائی ہے
کیا عجب ہے کہ نہ پہچان ہوئی تجھ سے مری
اک ترے دل کو تو احساسِ شناسائی ہے
اپنی ہر صبح گزرتی تھی سلیقے سے مگر
زندگی موت کے آداب اٹھا لائی ہے
ڈوبتی ناؤ میں اک ہاتھ تھا لہراتا ہوا
قربِ ساحل میں کہاں آج وہ سودائی ہے

اب ناظمِ مشاعرہ جلیل ساز صاحب ایک نظم "بیروت" سنا رہے ہیں جو سلیس اور آسان زبان میں ہونے کے علاوہ حقیقت کی ترجمانی بھی کر رہی ہے انتہائی توجہ سے سماعت فرما رہے ہیں اور داد بھی دے رہے ہیں نظم کے بعد غزل کے چند اشعار [illegible] سنا رہے ہیں غزل کے دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

[illegible] قدموں تلے آسمان تھا
[illegible] دلوں کی بات سے میں بے خبر حیران تھا

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس:- مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸ محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

بینک کاری کے تمام امور بشمولہ غیر ملکی زر مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے اس کے علاوہ آپ کا معیار زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈپازٹس پر

سیونگز اکاؤنٹس پر (چیک سہولت کے ساتھ ۶ فیصد سالانہ)

۲۔ فکسڈ ڈپازٹس پر ۲ مارچ ۱۹۸۱ء سے

۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک	۳½ فیصد سالانہ	۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم	۶½ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک	۴ " "	۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۲ سال تک	۸½ " "
۳۔ ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم	۵ " "	۷۔ ۲ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۳ سال تک	۹½ " "
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم	۵٫۵ " "	۸۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ عرصہ پر	۱۱ " "

مندرجہ بالا شرح انٹرسٹ تمام شیڈولڈ اور نیشنلائیزڈ بینکوں سے ایک فیصدی زیادہ ہے

دہلی برانچ

3655 نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

فون:- 264374 — 268266

مینجنگ ڈائریکٹر — دہلی زونل منیجر

زین جی رنگون والا — شمیم کاظم

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا ہند و پاک میر تقی میر سیمینار

خدائے سخن میر اردو کے واحد ایسے شاعر ہیں جنہیں قبولیت عام بھی ملی اور عظمتِ دوام بھی۔ اُن کی عظمت کا اعتراف ان کے زمانے سے لے کر آج تک ہر دور میں کیا جاتا رہا ہے ہر ایک ان کے اندازِ سخن کا شیدائی اور شیوۂ گفتار کا عاشق ہے۔ سودا جیسے قادر الکلام سخنور جو اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور غالب جیسے انانیت پسند شاعر، جنہوں نے کسی اردو شاعر کو لائقِ اعتنا نہ سمجھا، میر کی استادی کے معترف و معتقد تھے۔ میر کے بعد آنے والے شعرا نے اندازِ میر کا اثر بھی قبول کیا اور تقلیدِ میر کی ناکام کوششیں بھی کیں ناقدوں نے بھی حسبِ توفیق میر کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ بایں ہمہ میر نگاہِ عالم میں بہتر نشتروں ہی کے شاعر رہے۔ اردو تنقید اب تک ان کی پہلو دار شخصیت اور زندہ و پائندہ شاعری کے تمام گوشوں سے پردہ اٹھانے میں ناکام رہی ہے اور اس لئے میر کی مکمل تصویر آج تک نگاہوں سے اوجھل رہی۔

ایک مدت سے اردو تنقید اپنے کاندھوں پر میر کے قرض کا یہ بوجھ لئے پھر رہی تھی بالآخر انہیں کی دلّی کی ایک چھوٹی سی مگر عظیم دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فعال شعبۂ اردو نے اس قرضِ حسنہ کی ادائیگی کے لئے راہ نکالی اور ایک ہند و پاک میر تقی میر سیمینار کا انعقاد کیا۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اعلیٰ معیاری سیمیناروں کی ایک اہم بانشان روایت قائم کر چکا ہے۔ میر سیمینار اس کا ساتواں سیمینار تھا اس سے پہلے وہ جن چھ سیمیناروں کا اہتمام و انعقاد کر چکا ہے ان میں ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کا ہنگامہ خیز سیمینار اور اس سے تین سال پہلے کا اردو فکشن کے مسائل سے متعلق بین اقوامی سیمینار شامل ہیں۔

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابقہ سیمیناروں کی روایات کے مطابق ہند و پاک میر تقی میر سیمینار بھی پوری آب و تاب، شان و شوکت، حسنِ انتظام اور علمی وقار کے ساتھ ۱۹ مارچ سے ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء تک عمل میں آیا۔

ہندوستان کے ممتاز ادیبوں اور دانش وروں کے علاوہ اس سیمینار میں شرکت کے لئے پاکستان سے مشہور ادیب و مورخِ ادب ڈاکٹر جمیل جالبی اور نامور افسانہ نگار انتظار حسین اور لندن سے تازہ کار شاعر افتخار عارف تشریف لائے بی بی سی کی طرف سے سیمینار کی مکمل کاروائی ریکارڈ کرنے کے لئے رضا علی عابدی شریک ہوئے۔ ۱۹ مارچ کی سہ پہر کو اس کا افتتاح جمہوریہ ہند کے نائب صدر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے امیر جامعہ جناب جسٹس ہدایت اللہ نے کیا سیمینار کی افتتاحی تقریب کا انعقاد جامعہ کے مرکزی دفاتر کے سامنے کے ہرے بھرے لان پر ایک بڑے اور خوشنما پنڈال میں کیا گیا تھا۔ صبح ہی سے سیمینار کے مہتمم اور شعبہ اردو کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے رفقا اور طلبہ کے ساتھ اس تقریب کے انتظام و اہتمام میں مصروف تھے مہمانِ خصوصی کو ساڑھے چار بجے سیمینار کا افتتاح کرنا تھا مگر مہمانوں کی آمد تین بجے سے شروع ہو گئی تھی اور وقتِ مقررہ تک پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ آخر ساعتِ منتظر قریب آئی۔ نائب صدر جمہوریہ نے قدم رنجہ فرمایا۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین نے ان کا استقبال کیا۔ ریڈیو اور ٹی وی کا

عملاً حرکت میں آگیا اور ذہن ونظر کے جلووں کو صوت وصورت میں منضبط کرنے کا سامان کیا جانے لگا۔

افتتاحی تقریب کا آغاز اُستاد ہلال احمد خاں نے میر کے دیوان اول کی پہلی غزل "تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا" سے کیا اور اپنی فنکارانہ ادائیگی سے سماں باندھ دیا۔ اس کے بعد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سیمینار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اُردو غزل کی روایت اصلاً میر ہی کی روایت ہے تاہم میر کی قدر سنجی کا جیسا حق ادا ہونا چاہئے تھا، باوصف بعض اچھی کوششوں کے اس میں ابھی بڑی گنجائشیں ہیں اس کی ایک بنیادی وجہ شاید یہ رہی ہے کہ عام طور سے میر کو بہتر نشتروں کا شاعر سمجھا جاتا رہا ہے نیز اس گمراہ کن روایت کا بھی کچھ اثر رہا ہے جو "پستش اگرچہ اندک پست است اما بلندش بسیار بلند است" کے بجائے "بلندش بغایت بلند پستش بغایت پست" کے طور پر مشہور ہو گئی چنانچہ بالعموم یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ میر کے کلیات میں چند نشتروں کو چھوڑ کر رطب ویابس بھرا پڑا ہے سو ڈیڑھ سو سال تک اُردو والے میر کے اس دعوے کو تقریباً بھولے رہے۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ میر کی سوانح کی بہت سی کڑیاں ملادی گئی ہیں اور بہت سے نئے حقائق سے نقاب اٹھائی گئی ہے، لیکن تنقید کے ناخن پر میر سنجی کی گرہ نیم باز کا قرض ابھی باقی ہے موجودہ دور میں نئی شاعری نے میر سے اپنا تخلیقی رشتہ کچھ اس طور سے استوار کیا کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ فراق گورکھپوری سے ناصر کاظمی اور ناصر کاظمی سے بیسیوں نئے غزل گویوں تک جس نئی شعری روایت کا آغاز ہوا اس کا سلسلہ فیض آج بھی جاری ہے لیکن اس تخلیقی بازیافت کی معنویت اور میر کے آرٹ کی پرکارانہ اور تہ دارانہ جہات کو پوری طرح پہچاننا ابھی باقی ہے میر کی سادگی وسلاست پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا اس بارے میں بھی بہت سے مفروضوں کا ازالہ باقی ہے امید ہے کہ اس سیمینار سے میر کی قدر سنجی کی نئی روایت کا آغاز ہوگا نئی بحثیں اٹھیں گی اور میر شناسی کے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔

اس سلسلے میں ذوقِ سلیم تو رہنما رہا ہے لیکن ابھی شعریات کے تمام اصولوں کو بھی بروئے کار نہیں لایا گیا۔ بہرحال نئی تنقید کا سفر میر کی پرکاری اور معنیاتی تہ داری کی تحسین شناسی کی سمت میں ہوگا اور اس بارے میں نئی نفسیات، اسلوبیات، ساختیات اور نئی عمرانیاتی فکر سے بطورِ مدد ملی۔

افتتاحی تقریب کے صدر جناب انور جمال قدوائی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ آج کے دور میں میر کی شاعری کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ میر کی شاعری میں محبت اور انسانیت کی آواز ہے اور ہمارا دور جس باہمی نفرت اور ہیجان سے دوچار ہے اس میں محبت اور انسانیت کی آواز کی نہ صرف ہمارے مُلک بلکہ پوری دُنیا کو ضرورت ہے انہوں نے سیمینار کی کامیابی کی دعا کرتے ہوئے یہ اُمید ظاہر کی کہ اس سیمینار میں میر کی عظمت کے نئے نئے پہلو تلاش کئے جائیں گے اور ان پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا جائے گا جن کی اس دور کے انسان کو سخت ضرورت ہے۔

میر کی دردمندی

جناب ہدایت اللہ نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں میر کی زندگی، شخصیت، اور شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ میر اور ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ان کی سوانح اور شخصیت کا مطالعہ ناگزیر ہے اس ضمن میں انہوں نے بطورِ خاص میر کی تصانیف "ذکر میر" اور "فیض میر" کا ذکر کیا اور ان کے حوالے سے میر کے عہد اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی خوبصورت تصویر کشی کی میر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب ہدایت اللہ نے کہا کہ ان کی زبان جس کے ڈانڈے ہندی سے ملتے ہیں اُردو شاعری کی سب سے زیادہ میٹھی اور سریلی آواز ہے۔ میر اُردو غزل کے عظیم ترین شاعر ہیں، ان کا تصورِ عشق اسلامی تصوف اور ہندو بھگتی دونوں کی روایات کا مظہر ہے اور اس میں جو عظیم دردمندی اور سوز وگداز ہے اس نے پوری دو صدیوں پر اپنے اَنمٹ اثرات چھوڑے ہیں ان عشق کی یہ دردمندی جدید ذہن کو بھی اپنی طرف کھینچتی

وہ ایک تیزی سے بدلتے ہوئے صنعت کارانہ سماج میں ایک نظامِ اقدار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ میر جنہوں نے عظیم مغلیہ سلطنت کا زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان کا غم ذاتی بھی ہے اور اجتماعی بھی اور اسی لیئے اس میں اتنی تاثیر و توانائی ہے یہ حقیقت ہے کہ ہر دور کے شاعروں نے میر کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ہم عصر اردو اور ہندی شعرا ان کی شاعری سے متاثر ہوتے ہیں اس بات کا ثبوت ہے کہ میر کی شاعری کے احیا کا عمل برابر جاری ہے اور یہ عظیم شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

مہمانِ خصوصی کے افتتاحی خطبے کے بعد میر کی ایک اور مشہور غزل "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا" صلاح الدین کی آواز میں پیش کی گئی اس تقریب کا اختتام ہند کے قومی ترانہ پر ہوا جسے جامعہ ملیہ کے طلبہ اور طالبات نے پیش کیا۔

میر کی زمینوں میں شعری نشست

افتتاحی تقریب کے آدھے گھنٹے بعد ساڑھے چھ بجے شام کو میر کی زمینوں میں کہی جانے والی غزلوں پر مشتمل ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح جناب ضیاء الرحمن انصاری مرکزی وزیر ریاست برائے جہاز رانی و ٹرانسپورٹ نے کیا اس مشاعرے کی صدارت جناب محمد عثمان عارف نائب وزیر تعمیرات نے کی اور نظامت کے فرائض کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے انجام دئے۔ پروفیسر آل احمد سرور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، غلام ربانی تاباں، جگن ناتھ آزاد، قیصر زیدی، قاضی سلیم، رفعت سروش، عمیق حنفی، مظفر حنفی، شہریار، بلراج کومل، حسن نعیم اور بشیر بدر جیسے ہندوستانی شعرا کے علاوہ لندن سے آئے ہوئے افتخار عارف نے مشاعرے میں اپنا کلام سنایا اور سامعین سے دادِ تحسین وصول کی۔ صدرِ مشاعرہ جناب محمد عثمان عارف کی غزل کے ساتھ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

بزمِ مقالات

دوسرے دن یعنی ۲۰ مارچ کو صبح ساڑھے نو بجے سے سیمینار کی اصل کارروائی شروع ہوئی بزمِ مقالات کو ابتداءً دو دن کے چار اجلاسوں میں تقسیم کیا گیا تھا مگر مقالوں کی کثرت کے باعث ایک اجلاس اور بڑھانا پڑا، پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ذاکر نے انجام دئے۔ شمس الرحمان فاروقی نے میر کی چند غزلوں کی بلند خوانی سے بزمِ مقالات کا افتتاح کیا اور اپنی ادائیگی سے میر کی غزل کے نمایاں و زیریں لہجوں اور مختلف تاثرات و کیفیات کو ابھارا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کے مقالے "میر کا تصورِ انسان" سے مقالات کا آغاز ہوا۔ صاحبِ مقالہ نے میر کے تصورِ انسان کے دو نمایاں پہلوؤں کا ذکر کیا ایک عظمتِ آدم کا احساس، دوسرے انسان دوستی کا جذبہ اور کہا کہ یہ دونوں مل کر کلامِ میر میں بلند نگاہی، دل نوازی اور جاں سوزی پیدا کرتے ہیں ڈاکٹر نیر مسعود نے "میر کی شخصیت کا نثری اظہار" کے عنوان سے مقالہ پڑھا اور میر کی کتابوں "نکات الشعراء" "ذکرِ میر" اور "فیضِ میر" سے مثالیں دے کر یہ بات واضح کی کہ میر کی نثری تحریروں سے ان کی شخصیت کا بہت مبہم سا اظہار ہوا ہے اور ان تحریروں سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ لکھنے والا کسی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اسے اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے مقالے "میر اور اقبال" میں دونوں شاعروں کے یہاں فکری مماثلتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے تصورِ عظمتِ آدم، تصورِ عشق اور درد و گداز کی فراوانی کا ذکر کیا وارث علوی نے اپنے شگفتہ اور دلچسپ اندازِ بیان میں میر اور جدید ذہن کے رشتوں کا سراغ لگاتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ شعر کے معنی لفظوں کے معنی سے زیادہ ہوتے ہیں جو میر کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ میر کے اشعار کی یہ پہلو داری اور ان کا غم جس میں شخصی تجربے کی آنچ اور جوشِ فکر کا غلبہ دونوں شامل ہیں، جدید ذہن سے ان کی قربت کا وسیلہ ہیں۔ صدرِ اجلاس پروفیسر آل احمد سرور نے میر کی شخصیت اور فکر و فن کی مختلف جہات کو نمایاں کیا اور ان کی روشنی میں انہوں نے میر کو مکمل شاعر قرار دیا۔ نیز اس بات پر زور دیا کہ میر کی اہمیت اور عظمت اس لیئے مسلّم ہے کہ وہ آج بھی اپنے معنوی...

اور اس لئے وہ آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا میر کا ہے

دوسرے اجلاس کے صدر مالک رام صاحب تھے اور ناظم ڈاکٹر صغرا مہدی۔ اس اجلاس کا آغاز پروفیسر ثریا حسین کے مقالے "گارساں دتاسی اور میر تقی میر" سے ہوا۔ اس مقالے میں میر کی ان مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا فرانسیسی ترجمہ گارساں دتاسی نے کیا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے اپنے مقالے "میر کی شاعری کا سر یلسٹک پہلو" میں میر کی شاعری میں خواب، سحر، حیرت، آتش اور آشوب کے تجربوں کی نشان دہی کی اور کہا کہ یہ لاشعوری اور خارجی حقیقت سے قطعی لاتعلق تجربے اس بات کی دلیل ہیں کہ میر کے یہاں سرلیسٹ رویہ کی تمام و کمال موجود ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مقالے "ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا میر کا ہے" میں میر کی شاعری کے اسلوبیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی عظمت کا سب سے اہم پہلو یہ بتایا کہ میر نے پوری زبان کے پورے امکانات کو روشن کیا اور پوری زبان کی ظاہری اور زیریں ساختوں کو جس طرح برتا اور شعری اظہار کی اعلاترین سطحوں پر فائز کیا اور جس طرح ان کے لہجۂ گفتار کی تازگی آج بھی باقی ہے یہ اعجاز کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ پاکستانی ادیب انتظار حسین نے "میر کی پنچ تنتر" پیش کرتے ہوئے اس بات کی دعوت دی کہ میر کو ان کی غزل کے بند کمرے سے نکال کر ان کے رنگا رنگ عالم کی سیر کی جائے جس میں فطرت کا حسن اپنے پورے شباب پر ہے اس میں جنگل بھی ہیں اور بستیاں بھی، درندے بھی ہیں اور پالتو جانور بھی۔ ان جانوروں میں انسانوں سے زیادہ انسانی اوصاف پائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ جو احساس رفاقت نظر آتا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ مالک رام نے اپنے مقالے "میر اور غالب" میں غالب کی میر سے اثر پذیری کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ غالب نے میر کے کلام کا مطالعہ بالاستیعاب کیا تھا اس سلسلے میں انہوں نے یہ اہم اطلاع فراہم کی کہ میر کا سب سے پہلا انتخاب غالب نے کیا تھا جو اس زمانے میں چھپا تھا مگر آج یہ نسخہ بہت نادر ہے۔ غالب کی میر سے اس اثر پذیری کے باوجود انہوں نے اسے تقلید میر قرار دینے سے اختلاف کیا۔

ایلیٹ کا کھوکھلا آدمی

سیمینار کا تیسرا اجلاس ڈاکٹر جمیل جالبی کی صدارت اور ڈاکٹر مظفر حنفی کی نظامت میں ۲۱ مارچ کی صبح کو ہوا اس اجلاس کا پہلا مقالہ کاظم علی خاں کا تھا جس میں انہوں نے میر اور لکھنؤ کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے میر کے ان آخری اٹھائیس انتیس برسوں کا ذکر کیا جو انہوں نے اس شہر میں گزارے جسے میر کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حنیف کیفی نے اپنے مقالے "میر اور بندش الفاظ" میں شاعری میں بندش الفاظ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے میر کی شاعری میں بندش الفاظ کی مختلف صورتوں کو اُجاگر کیا جو ان کے اشعار کو نہ صرف ظاہری حسن عطا کرتی ہیں بلکہ ان میں معنوی پہلوداری بھی پیدا کرتی ہیں۔ نیز ان کے بروئے کار لانے میں میر کی اس فنکارانہ برجستگی و بے ساختگی کو نمایاں کیا جس کی بدولت وہ شعوری احترام کی مرہون منت ہوتے ہوئے بھی کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے لسانیاتی مطالعے کی روشنی میں میر کی شاعری کے لہجوں کے چند نمایاں صوتی میلانات کا جائزہ لیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ میر شعر میں الفاظ کی نشست ایسے رکھتے ہیں جس سے مناسب حال لہجہ از خود اُبھرتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مقالے "غالب اور میر۔ مطالعے کے چند پہلو" میں دونوں شاعروں کی ذہنی ساخت اور طرز فکر میں مماثلت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے یہاں اختلاف کی صورتوں کو بھی نمایاں کیا اور کہا کہ میر کی دنیا میں روزمرہ کے واقعات اور کرداروں کی کثرت ہے غالب کی دنیا اگرچہ میر ہی کے اتنی بھرپور ہے لیکن اس میں واقعات اور کرداروں کی یہ کثرت نہیں اس لئے دونوں کا تاثر بھی لازمی طور پر مختلف ہے۔ اس اجلاس کا آخری مقالہ "میر اور ہم" کے عنوان سے

باقر مہدی نے پیش کیا۔ اپنے اس مقالے میں انہوں نے اٹھارہویں صدی کے ہندوستان اور آج کے عہد کے ہندوستان میں چند مماثلتیں تلاش کرتے ہوئے میر کو ROMANTIC AGONY کا شاعر کہا اس سلسلے میں انہوں نے صبر و غم اور عشق کو میر کی شخصیت کی تثلیث قرار دیتے ہوئے آج کے دور کے آدمی کو ایلیٹ کے کھوکھلے آدمی سے مشابہ بتایا جو زندگی کے غم کا بوجھ بغیر صبر اور عشق کے اٹھانا چاہتا ہے اور نہیں اٹھا پاتا۔

میر کی شاعری کا اسم اعظم

سیمینار کے چوتھے اجلاس میں جس کی نظامت ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کو سونپی گئی تھی ڈاکٹر عنوان چشتی، ڈاکٹر ابن فرید، محمود ہاشمی، ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنے مقالے پیش کئے اور میر کی شاعری شخصیت اور عہد کے کئی فنی و فکری تہذیبی اور عمرانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے میر کی شاعری کو آیات حق کی شاعری قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ان کے متصوفانہ تصورات، تجربات کا رنگ اختیار کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر ابن فرید نے میر کی شاعری کے عمرانی پہلوؤں کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کے اسلوب میں حقیقت کے فنی برتاؤ کی کاملیت کی طرف توجہ مبذول کرائی محمود ہاشمی نے لفظ دل کو میر کی شاعری کا اسم اعظم قرار دیا اور ڈاکٹر ظ انصاری نے میر کو ایک کلچر کا نام دیتے ہوئے اس کی دو نمایاں جہات کی نشان دہی کی ایک شخصی کلچر جسے شاعر نے مر مر کے پالا ہے دوسرے وہ اجتماعی کلچر جو ایک بکھرتے، ڈوبتے اشرافیہ طبقے کا آدرش ہے جو فیوڈل ارسٹوکریسی اپنے بعد والوں کو امانتاً دی جاتی ہے اور جسے کاٹ چھیل کر مستقبل کے تہذیبی نقشے میں جما لیا جاتا ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام نے اپنے صدارتی خطبے میں اس اجلاس میں پڑھے جانے والے مقالوں پر اظہار خیال کر کے اس کا اختتام کیا۔

میر اردو کا قومی شاعر

سیمینار کا پانچواں اجلاس غزل کی مستزاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلوت تنگنائے غزل کی طرح سیمینار کا عرصہ مقالوں کی کثرت کا متحمل نہ ہو سکا اور بیان کے لئے کچھ اور وسعت درکار ہوئی جس کا اہتمام آدھے گھنٹے کے وقفے کے بعد ڈاکٹر جمیل الرحمان ہاشمی کی نظامت میں کیا گیا کرسیِ صدارت پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی متمکن ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بیت الغزل کے طور پر اپنا مقالہ "میر اور ہندوستانی کلچر" پیش کیا اور پُر زور الفاظ میں اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر ہندوستان کی کسی زبان کے کسی شاعر میں جدید ہندوستان کے قومی شاعر بننے کی صلاحیت موجود ہے تو وہ میر اور صرف میر ہو سکتے ہیں کیوں کہ انہوں نے جدید ہندوستان کی روح کو تخلیقی سطح پر دریافت کر کے اسے ایک ایسی آفاقی صورت دی جس میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کی روح جذب ہو کر ایک ایسی نئی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے جو ہندوستانی روح کی مہذب عالم گیر اور مثالی صورت ہے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے دل نشیں انداز میں شہر میر کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ میر کی دلّی اپنے تمام نقش و نگار کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ وہ دلّی جو میر کا دل تھی، جو ان کا وطن عزیز تھی، اور جس کی یاد وہ چاہے کہیں بھی رہے ہوں ان کے دل سے مرتے دم تک نہ گئی جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کی تھی اور جس کے ان گنت نقوش تہ دل میں لئے وہ دیارِ غیر میں زیر خاک چلے گئے۔ میر کی دلّی میں منعقد کئے گئے میر سیمینار کے اختتام کی اس سے زیادہ مناسب اور بہتر کوئی اور صورت ممکن نہیں ہو سکتی تھی جو تاثر شہر میر نے ابھارا تھا اسے بمبئی کی مغنیہ شہر بانو نے میر کی غزل "دل پر خوں کی ایک گلابی سے عمر بھر ہم رہے شرابی سے" اپنی پُر سوز آواز میں سنا کر اور ابھار دیا۔ اور غزل میر کے لہجوں کو ایک بار پھر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی بلند خوانی سے نمایاں کیا۔ سیمینار کے ختم پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کلمات تشکر پر اس سہ روزہ سیمینار کا اختتام ہوا حاضرین کے جذبات کی نمائندگی رضا علی عابدی نے کی اور اس سیمینار کے کامیاب انعقاد پر پروفیسر نارنگ اور ان کے ساتھیوں کو مبارکباد پیش کی اس طرح یہ سہ روزہ یادگار مذاکرہ جس نے نظر کے نئے زاویوں سے میر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی تھی بحسن و خوبی اپنے انجام کو پہنچا اور میر شناسی کا ایک نیا باب کھول گیا۔ ●●

تضمین بر غزل ڈاکٹر اظہار مسرت

رہنما: عبدالرب نشتر فتح پوری

چاند پورا ہو تو دریا بھی اُبل جاتا ہے
تیز ہو دھوپ تو پیکر بھی جل جاتا ہے
ہر کوئی وقت بدلنے پہ بدل جاتا ہے
جو خود دار سنبھالے تو سنبھل جاتا ہے
ورنہ دل غم کی تپش ہی سے پگھل جاتا ہے

ہر مصیبت کو سہا کرتے ہیں اہلِ ثروت، یا تھر
سوکھے دریا سے بھی جیا کرتے ہیں اہلِ ثروت، یا تھر
تشنگی وہ خاموش رہا کرتے ہیں اہلِ ثروت یا تھر
دھوپ کی راہ تکا کرتے ہیں اہلِ ثروت یا تھر
مہر تو اونچے مکانوں ہی سے ڈھل جاتا ہے

سختیاں روح تلک غم کے اُتر جاتی ہے
دھڑکنیں سینے میں گھٹتی ہے بکھر جاتی ہے
خواہشیں پوری نہیں ہوتیں تو مر جاتی ہے
بجلیاں پختہ مکانوں پہ سے گزر جاتی ہے
اور نادار کا چھپر ہو تو جل جاتا ہے

نام سنتی ہے تو گھبراتی ہے ساری بستی
خوف کھاتی ہے لرز جاتی ہے ساری بستی
دل میں نشتر سا چبھا جاتی ہے ساری بستی
غم سمجھ کر جسے ٹھکراتی ہے ساری بستی
میرے گھر آکے مسرت میں بدل جاتی ہے

غزل

ڈی۔ اے۔ ہیرنیسن قربان

بلبل نے میرے پیار کے نغمے چرائے ہیں
سُن سُن کے پھول باغ کے سب مسکرائے ہیں

دیر و حرم میں لائے کلیسا میں لائے ہیں
دُنیا نے تیرے کیا کیا تماشے بنائے ہیں

گلشن میں کس نے غم کا تیرے ذکر کر دیا
شبنم نے ساری رات جو آنسو بہائے ہیں

دُنیا کی نعمتوں سے ہمیں کچھ غرض نہیں
اپنے لئے خُدا سے تمہیں مانگ لائے ہیں

گلشن کے مالکو تمہیں یہ بھی رہے خیال
ہم نے لہو سے کتنے گلستاں سجائے ہیں

جب بھی کسی نے نام لیا تیرے پیار کا
دُنیا نے اُس کے خون کے چھینٹے اُڑائے ہیں

جس نے مٹانا چاہا زمانے سے کفر و شر
دُنیا نے اس کی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں

ہر مرتبہ دِکھائے نئے روپ آپ نے
جب بھی حریمِ ناز کے پردے اُٹھائے ہیں

اب دیکھنا یہ ہوتا ہے قربان کیا اثر
دُنیا کو ہم نے پیار کے نغمے سُنائے ہیں

غزل

بے بسی کے ساتھ ہم کارِ جہاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے غبار و دُھند کو
سُنتے آئے تھے جو قصے آج تک اسلاف کے
یہ زمیں کچھ اور بھی تنگی کا شکوہ کر چکی
ملتی نہیں منزل کہ ہم راہِ حرم کھو کر سبھی
کس طرح پہونچوں ترے در پر کہ دم آنکھوں میں ہے
گرچہ بجلی دُور ہی چمکی تھی اے ہائے مگر

جذبۂ شوقِ وفا شعلہ فشاں دیکھا کئے
آج بھی پیری کی آنکھوں سے جواں دیکھا کئے
نیند میں بدمست وہ خوابِ گراں دیکھا کئے
معجزے کے منتظر ہم آسماں دیکھا کئے
دَیر میں بیٹھے ہوئے نظرِ بتاں دیکھا کئے
یاس اور حسرت سے تیرا آستاں دیکھا کئے
ہم بڑی حسرت سے اپنا آشیاں دیکھا کئے

[illegible]

آکاش وانی رامپور کا آل انڈیا مشاعرہ

فضل شاہ فضلؔ

رام پور آل انڈیا ریڈیو اسٹوڈیو کے سبزہ زار میں پہلی مرتبہ اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر زبیر رضوی نے آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کیا جس میں ملک گیر شہرت یافتہ ادب سے تعلق رکھنے والے شعرا نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اسٹیشن ڈائریکٹر مسٹر زبیر رضوی خود ہی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مشاعرہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ مشاعرہ رام پور کے عوام کی دیرینہ خواہش کے پیش نظر کیا گیا ہے کیونکہ رام پور دبستانِ اردو کا تیسرا اسکول ہے۔ مجھے ۱۹۴۹ء کی وہ رات یاد آرہی ہے جب میں یہاں پہلی مرتبہ مشاعرہ پڑھنے آیا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہندوستان کا کوئی بڑا یا چھوٹا شاعر ایسا نہ تھا جو اس مشاعرے میں موجود نہ ہو مگر بعد میں مشاعروں میں کمی آتی گئی اور دبستانِ اردو کی کڑی ٹوٹنے لگی۔ انہوں نے کہا کہ ٹوٹنے والی کڑی کو جوڑنے اور تہذیب و تمدن کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا ہے اور صدارت ہزہائی نیس (سابق) نواب رفعت زمانی بیگم صاحبہ راج ماتا سے کرائی جارہی ہے جو خود بھی اپنے وقت کی بہترین کلام کہنے والی رہی ہیں۔

نواب رفعت زمانی بیگم راج ماتا نے کہا کہ مجھے بڑی خوشی ہے کہ میں جہاں کھڑی ہوئی ہوں اس ریڈیو اسٹیشن کی بنیاد میرے شوہر نواب رضا علی خاں مرحوم نے رکھی تھی اور افتتاح بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میری دعا ہے کہ یہ پودا ایک شجر بنے اور دور دراز کے لوگ اس سے مستفید ہوں۔ انہوں نے کہا، ہمیشہ میں نے چاہا کہ میں آپ لوگوں کے قریب رہوں مگر اس وقت میری طبیعت ناساز ہے اور میں دل کی مریضہ ہوں۔ انہوں نے اپنے ایک قطعہ سے آل انڈیا مشاعرہ کا افتتاح کیا اور کرسیِ صدارت پر بیٹھ گئیں۔

ناظمِ مشاعرہ نے سب سے پہلے امیر آغا قزلباش کو دعوتِ سخن دی اور انہوں نے مائک پر آتے ہی ایک نظم اور دو غزلیں سنائیں، سامعین برابر دادِ تحسین دے رہے تھے۔ امیر قزلباش شعر پڑھ رہے تھے۔

کس لئے جلائے ہیں اب دئے کناروں پر
اب تو ڈوبنے والا ڈوب بھی چکا ہوگا

ابھی تو راہ میں روشن ہوں اے ہوائے شب
میں بجھ گیا تو تجھے کامیاب لکھوں گا

اب والی آسی لکھنوی کا نام پکارا گیا وہ مائک پر آئے اور ترنم سے غزل پڑھی۔

میرے اطراف میں پانی تو بہت ہے لیکن
اب مجھے پیاس کا احساس نہیں ہوتا ہے

گیروے رنگ کے کپڑوں پہ نہ اِتراجوگی
صرف کپڑوں سے تو سنیاس نہیں ہوتا ہے

نظمیں اور غزلیں سنا کر والی آسی کامیاب پلٹے اور خوش گلو شاعر اظہر عنایتی کا نام پکارا گیا، سامعین نے تالیاں بجا کر اپنے رامپوری شاعر کا استقبال کیا۔ اظہر عنایتی نے چند مختلف اشعار اور ایک کامیاب غزل سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

کل اپنے ہاتھ کسی حادثے میں کھو بیٹھا
وہ آدمی جو ہتھوں پہ وار کرتا تھا

خبر اک گھر کے جلنے کی ہے لیکن
بچا بستی میں کوئی گھر نہیں ہے

اور اب باری آئی کئی رسالوں کے مدیر، شگفتنی اور آواز کا جسم بکشا شاعر محمود سعیدی کی۔ وہ داد حاصل کرتے ہوئے پڑھ رہے ہیں

مرے جلتے ہوئے گھر کی نشانی بس یہی ہو گی
جہاں اِس ... میں کچھ روشنی دیکھو ٹھہر جانا
پرانے موسموں کی یاد سکھلا گئے کس نے
افق پر دیدہ و دل کے دھنک بن کر بکھر جانا

محمود سعیدی کے بعد ناظمِ مشاعرہ نے آواز دی ہماچل پردیش کے مقبول شاعر ارمان شہ...ابی کو جو ... رہے ہیں:۔

دل دھڑکتا ہے ہچکیوں کے سا...
کچھ نہ کچھ بات ہونے والی ہے
یا کوئی دُور جا رہا ہے بہت
یا ملاقات ہونے وال...

اے غمِ یار میرے تیرے لئے
ہر خوشی کل پہ ملتوی کر دی

نازش پرتاپ گڑھی کو جب ناظمِ مشاعرہ نے آواز دی تو ہر طرف سے تالیاں سنائی دیں اور انہوں نے "فلسطینیوں کے نام" ایک نظم سنا کر ہر سامع کی آنکھیں نم ناک کر دیں اور واپس اپنی جگہ بیٹھ گئے اور اب بلایا گیا "نجات سے پہلے" شعری مجموعے کے خالق اور نئی نظم کے اہم شاعر اور ممبر پارلیمنٹ قاضی سلیم کو جنہوں نے دو جدید نظمیں سنائیں اور اب سامعین کے سرد موڈ کو گرمی اور قہقہوں میں بدلنے کے لئے طنز و مزاح کے شاعر اُستاد رامپوری کو آواز دی گئی اور مائک سنبھالنے سے پہلے ہی اُستاد سے متعدد قطعوں اور نظموں کا مطالبہ شروع ہو گیا انہوں نے ایک نئی نظم غالب کے مصرعہ "کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد" سنائی اور سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

جدید شاعر، نقاد، ڈرامہ نگار اور سہ ماہی "سطور" کے مدیر کمار پاشی کا نام پکارا گیا۔

ہیں دوست رو برو کسے تیر و تبر دکھائیں
کوئی حریف ہو تو ہم اپنا ہنر دکھائیں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کی پروفیسر، شاعرہ، نقاد، اور ڈرامہ نویس زاہدہ زیدی کو دعوتِ سخن دی گئی اور وہ سنا رہی ہیں ؎

فکر، ادراک اور جوشِ جنون
درد کی سرحدوں میں پلتے ہیں

اس کے بعد دعوت دی جا رہی ہے میرٹھ کالج میں اُردو کے اُستاد، نقاد، اور نئی غزل کے ایک معتبر نام ڈاکٹر بشیر بدر کو۔ انہوں نے دو غزلیں سنائیں۔

چھلک رہی ہے پرانی دُلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو
وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اُردو زبان کی خوشبو

محترمہ جمیلہ بانو کو دعوتِ سخن دی گئی وہ سامعین سے مخاطب ہوئیں۔

لمحہ لمحہ بیقراری دل کی بڑھتی جائے ہے
جب مرا ماضی مجھے اس حال میں یاد آئے ہے
راستوں کی گرد سے منزل کا اندازہ نہ کر
میرا ذوقِ جستجو ہر دم یہی سمجھائے ہے

"لمس بدن" کے مصنف اور پنجاب کے ممتاز شاعر پریم کمار نظر غزل سرا ہیں ؎

اب اس کو سزا دے کے گنہگار نہ بنئے
مجرم کے لئے جرم کا احساس بہت ہے
وحشی کو یہ کیا سوجھی کہ وہ شہر کو آئے
پہلے ہی گریبانوں کا یاں کال بہت ہے

ناظمِ مشاعرہ نے مشاعرے میں ایک نئی جان ڈالنے کے لئے اُردو کے مقبول شاعر اور "امراؤ جان" کے گیت کار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کے استاد شہریار کو آواز دی وہ تالیوں کی گونج میں مائک پر آئے۔

تیز آندھی میں اندھیروں کے ستم سہتے رہے
رات کو پھر بھی چراغوں سے شکایت کچھ ہے
زندگی سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا میرا
کل کا احوال تھا کچھ آج کی حالت کچھ ہے

اب مائک پہ بُلایا جا رہا ہے نئی نظموں کے ممتاز شاعر اور ادبی رسالوں کے مدیر نشتر خانقاہی کو، جنہوں نے آتے ہی کہا۔

مُسافر خانہ امکاں میں بستر چھوڑ جاتے تھے
وہ ہم تھے جو چراغوں کو منور چھوڑ جاتے تھے

اب سامعین چند خاص شعرا کو سُننے کے موڈ میں تھے۔ ناظمِ مشاعرہ سمجھ گئے اس لئے وہ بُلا رہے ہیں غزل اور گیت کے محبُوب شاعر اور بریلی کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر پروفیسر بسمل بریلوی کو۔ جنہوں نے آتے ہی سامعین کو داد دینے پر مجبُور کر دیا وہ ترنم میں غزل سرا ہوئے ؎

کتنی گناہ گار ہے راتوں کی زندگی
دیکھو کسی چراغ کی آنکھوں میں جھانک کر

کوئی منظر بھروسہ کے قابل نہیں
تیری آنکھوں کا دُکھ اور بڑھ جائے گا

ترقی پسند تحریک کے منفرد شاعر وامق جون پوری اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کر رہے ہیں ؎

خود گریزاں ہوں بڑا زہر ہے میرے اندر
اس کا تریاق ہے راتوں کو جگاتے رہنا
مُدتوں بعد جو دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے
خود کو آئینہ ہر روز دکھاتے رہنا

اس کے بعد خیال رام پوری کو آواز دی گئی انہوں نے مختلف شعروں کے بعد غزل پڑھی ؎

شہرِ وفا میں شور ہے مارا گیا وہ شخص
بے کار آدمی تھا چلو کام آ گیا

لفظِ وفا زبان پہ کبھی ہم نہ لائیں گے
اب تک بڑا تصرّفِ بے جا کیا گیا

خیال رام پوری کے بعد شاعر، نقاد، فلاسفر، جو علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ سے وابستہ ہیں ڈاکٹر وحید اختر کا نام پُکارا گیا انہوں نے یہ غزل پڑھی ؎

تھی تہی دست ہر اک شاخِ خزاں بھی جب تک
فصلِ گُل آئی تو ہر شاخ سے خنجر نکلا

ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضہ نہ ہُوا
حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پہ نکلا

اب نئی غزل کے شاعر حسن نعیم کو بلایا گیا انہوں نے یہ غزل سُنائی ؎

مٹ گئے سب داغ، داغِ عشق تنہا رہ گیا
گر گئی دیوار لیکن اُس کا سایہ رہ گیا

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے
کام کتنا ہو چکا ہے وقت کتنا رہ گیا....

"لفظوں کا پُل" اور "مور ناچ" شعری مجموعوں کے خالق اور فلمی دُنیا سے وابستہ جدید شاعر ندا فاضلی نے اپنی نئی غزل پڑھی ؎

بات کم کیجئے ذہانت کو چھپائے رہئے
یہ نیا شہر ہے کچھ دوست بنائے رہئے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دِل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہئے

رام پور کے سابق شہری اور پاکستان میں مقیم شاعر پرتو روہیلہ کو دعوت دی گئی اور وہ ایک غزل اور کچھ دوہے سُنا رہے ہیں غزل کے شعر یہ ہیں ؎

پیار سے اٹھی ہوئی باہیں گریں گی شرمسار
اُجڑے رستوں پہ لٹکتی ٹہنیاں رہ جائیں گی

یہ مکاں جب منہدم ہو گا گھنی برسات میں
راستہ تکتی ہوئی دو کھڑکیاں رہ جائیں گی

بزرگ شاعر حضرت قمر مرادآبادی کو اپنا کلام سُنانے کی دعوت دی گئی ہے قمر مرادآبادی غزل سرا ہیں ؎

جو نقش چھوڑ دئے ہم نے راہبر کے لیے
وہی چراغ بنے تیری رہگُزر کے لیے

شمیم بن کے گلستاں میں کیوں پریشاں ہو
مرے خیال میں بس جاؤ عمر بھر کے لئے

چھوٹی بحر کے کلاسیکی غزل کے منفرد شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کو بُلایا گیا وہ ترنم میں پڑھ رہے ہیں ؎

اس سلیقہ سے ان سے گلہ کیجئے
جب گلہ کیجئے ہنس دیا کیجئے

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجئے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے

تازہ ترین کتب کا بہترین انتخاب

ترجمان القرآن: مکمل چاروں حصے	ابوالکلام آزاد	۱۲۰/-
خطبات	"	۳۰/-
تذکرہ	"	۳۰/-
غبار خاطر		۴۰/-
اردو میں خود نوشت	ڈاکٹر صبیحہ انور	۶۰/-
سوانح حیات کا ارتقاء		
اردو میں تاریخی ناول کا ارتقاء	نزہت خلیق الزماں	۵۰/-
سب رس جدید اردو میں	قاضی انیس الحق	۵۰/-
مثنوی بہار سیرت سرکار دو عالم کی منظوم حیات طیبہ		۲۵/-
قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن	پروفیسر عبدالسلام	۱۲/-
باغ و بہار (مصور)	مقدمہ سلیم اختر	۱۵/-
منٹو کا فن	سید وقار عظیم	۵/-
دلی انتخاب و تہذیب	محمد خالد اشرف	۹/-
جیل	منشی پریم چند	۴/-
مقدمہ آب حیات	محمد حسین آزاد	۶/۵۰
فیروز اللغات	مجلد ریگزین	۲۵/-
فرہنگ عامرہ	عبداللہ خویشگی	۳۰/-
مرزا رسوا اور تہذیبی ناول	پروفیسر عبدالسلام	۴/-
مثنوی زہر عشق (جدید تحقیق کی روشنی میں)	عشرت رحمانی	۱۵/-
آب حیات کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	سید سجاد	۸/-
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	۲۰/-
فرہنگ آصفیہ مکمل سیٹ چاروں حصے		۱۵۰/-
قدیم ہندوستان کی تاریخ	راما شنکر ترپاٹھی	۲۷/۷۵
کلیات سراج اورنگ آبادی	عبدالقادر سروری	۴۴/-
کلیات ذوق	تنویر احمد علوی	۲۰/۵۰
کلیات نعت محسن کاکوری	نورالحسن ہاشمی	۱۲/-
اسلامی نام	مختار	۱۶/-
کشمیر کی کلی	الیاس سیتاپوری	۱۶/-
داستان حور	"	۱۵/-
عجائب خانۂ عشق	"	۱۵/-
شہزادی کا سلام	"	۱۵/-

چاند کا ٹکڑا	الیاس سیتاپوری	۱۵/-
حرم سرا	"	۱۵/-
بالا خانے کی دلہن	"	۱۵/-
اندر کا آدمی	"	۱۰/-
راگ کا بدن	"	۱۰/-
دیوی کے پرستار	"	۲۰/-
شیشے کی چٹان	سراج انور	۳۰/-
کالی دنیا	"	۱۵/-
نیلی دنیا	"	۱۵/-
خوفناک جزیرہ	"	۱۰/-
ننھا کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰/-
ننھا ترائی	"	۳۰/-
ننھا کا زخم	"	۳۰/-
ننھا کا بوجھ	"	۳۰/-
اُترن	"	۳۰/-
جیسے دریا	"	۲۵/-
پھول کھلنے دو	"	۳۰/-
بند دروازے	"	۱۵/-
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۱/-
اونچی دکان	سیما صدری	۱۲/۵۰
تیسری انگلی	"	۱۲/۵۰
ٹیڑھی لکیریں	"	۱۲/۵۰
ماں سرودور	اودے سرن ارمان	۱/-
ہندی کے مسلمان شعراء	ابوالبلاغت رتن پنڈوری	۱/-
ٹوٹتے ناتے	گلزار احمد چودھری	۳/-
اٹھتی لہریں	"	۱۳/-
بھارت کا آئین	ترقی اردو بیورو	۱/-
کلید عروض	ڈاکٹر زار علامی	۱۰/-
آئینہ عروض و قافیہ	علامہ طالب ہاتھرسی	۱/-
درس بلاغت	ترقی اردو بیورو	۱/-

دفتر ماہنامہ شان ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مانک ٹالا

باکمالوں کے درشن اور منشی پریم چند

اپنے ہر مضمون کی طرح شبلی صاحب نے "باکمالوں کے درشن" (فروغ اردو۔ فروری ۱۹۸۲ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے اس روایتی بنیے کی طرح ڈنڈی ماری ہے جو پیسے تو پورے وصول کرتا ہے لیکن سودا ہمیشہ کم تولتا ہے۔ شبلی صاحب نے اس مضمون میں بھی اپنی وہی پرانی تکنیک دوہرائی ہے کہ ادھر ادھر سے کچھ الفاظ یا ایک آدھ پیرے کو سیاق و سباق سے الگ کرکے پریم چند پر اسلام دشمنی، مسلم دشمنی اور اردو دشمنی کا الزام لگا کر مسلمان قارئین کے دماغ میں پریم چند اور ہندوؤں کے خلاف فرقہ پرستی کے زہر کا انجکشن لگا دیا۔

پریم چند کی ہر کہانی۔ ناول اور مضامین کو اگر پورے تناظر میں پڑھا جائے تو وہ اس تاثر کی مکمل طور پر نفی کرتا ہے جو شبلی صاحب اپنی لفاظی اور چرب بیانی کا سہارا لے کر قارئین کے دماغ میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ آئینہ جو وہ پریم چند اور اس کے ہم خیال لوگوں کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ آئینہ خود ان کا منہ چڑانے لگتا ہے۔ بہرحال شبلی صاحب کے عزم کی داد دینی چاہیے کہ وہ بار بار بے نقاب ہونے کے باوجود وہی پرانی لکیر پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔

پریم چند نے اگر راجپوتوں کی شجاعت۔ سرفروشی اور بہادری کی داستانیں بیان کی ہیں یا سوامی دویکانند اور ہندوؤں کی دوسری قابل احترام ہستیوں کے بارے میں لکھا ہے تو کون سا گناہ کیا ہے؟ انہوں نے آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی سوامی دیانند کے حق میں ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ سوامی دویکانند کے بارے میں ضرور لکھا ہے لیکن سوامی جی نے کبھی دوسرے مذہب کے خلاف آج تک ایک جملہ تک نہیں کہا۔ اس کے علاوہ پریم چند نے حضرت محمدؐ۔ حضرت علیؓ اور عالم اسلام کی دوسری [illegible] ہستیوں کے بارے میں [illegible] ہندی دونوں زبانوں میں

نہایت ہی اونچے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے تو صرف "اسلام عرب کے تاریخی واقعات لے کر مسلمانوں کی تہذیب۔ علو ہمتی۔ دین داری۔ فیاضی۔ مشاغل اور وضع داریوں" ہی کی داستانیں بیان کی ہیں (دادین میں الفاظ منشی پریم چند کے ہیں۔ ملاحظہ ہو "مضامین پریم چند" مرتبہ عتیق احمد مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔ صفحہ ۲۲۶ - پریم چند کے مضمون کا نام ہے "عبدالحلیم شرر" یہی مضمون باکمالوں کے درشن۔ دوسرا ایڈیشن اور اس کتاب کے ہندی ایڈیشن "قلم۔ تلوار اور تیاگ" میں بھی ہے)

مولانا کی علمی خدمات کے بارے میں پریم چند کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔ "مولانا علمی خدمت کے اس قدر حریص تھے کہ ان کا مد مقابل آج ایک متنفس بھی نظر نہیں آتا۔ ستر برس کی عمر ہوئی پچپن برس تک زبان اردو کی خدمت میں مصروف رہے (ایضاً۔ صفحہ ۲۲۸)

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مولانا شرر نے اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے مثنوی "گلزار نسیم" پر نہایت بودے اور بے بنیاد اعتراضات کئے کیوں کہ اس مثنوی کے مصنف پنڈت دیا شنکر نسیم ہندو تھے۔ چنانچہ اس کا جواب پنڈت برج نرائن چکبست کو دینا پڑا۔

ادھر پریم چند کے زمانے میں شبلی صاحب کی ذہنیت کے ایک مسلمان بزرگ حکیم برہم صاحب پیدا ہوئے تھے جنہیں پنڈت رتن ناتھ سرشار کی مقبولیت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے "اردوئے معلی" میں شرر اور سرشار کا مقابلہ کرکے شرر صاحب کو تو بانس پر چڑھا دیا اور سرشار کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے جواب میں پریم چند کو "اردوئے معلی" ہی میں ایک مدلل مضمون شائع کروانا

پڑا۔ (یہ ہنگامہ ۱۹۲۰ء کا ہے۔ پریم چند کے مضمون کا نام ہے "شرر اور سرشار" جو کہ مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۲۳۶ پر شائع ہوا ہے)۔

مولانا شررؔ کے ناولوں میں ہیرو تو ہر حالت میں مسلمان ہوتے تھے مگر ہیروئن کبھی ہندو اور کبھی عیسائی۔ شررؔ صاحب اس طرح کی اشتعال انگیزی کیا کرتے تھے۔ پریم چند نے اس بارے میں مُدلل اور مُفصل بحث کی ہے طوالت کے ڈر سے پریم چند کے اس مضمون سے اقتباسات نہیں پیش کر رہا۔ بہرحال شبلی صاحب چاہیں تو اس مضمون کے کچھ اقتباس پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اور چکبست نے شررؔ صاحب کے جواب میں گلزار نسیم پر جو بحث کی تھی اس کے بھی کچھ اقتباس پیش کروں گا۔

بہرحال شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ چکبست اور پریم چند نے مولانا شررؔ اور حکیم برہم صاحب کے بارے میں کبھی ویسی زبان استعمال نہیں کی جو شبلی صاحب پریم چند کے بارے میں استعمال کر رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں تعلیم و تربیت کا فرق!۔

مولانا راشد الخیری نے بھی مولانا شررؔ کی طرح اپنے افسانوں کو صرف اسلامی موضوعات تک ہی محدود رکھا لیکن اس کے باوجود پریم چند نے اپنے مضمون "راشد الخیری کے افسانے" میں مولانا راشد کی جس طرح تعریف و توصیف کی ہے اس کے کچھ اقتباس پیش ہیں۔

"...... کتنا ہی حُسنِ بیاں ہو لیکن ادیب کے دل میں درد نہیں تو اس کے کلام میں تاثیر ممکن نہیں ......
مولانا راشد الخیری میں یہ تینوں اوصاف موجود تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ انہوں نے نہایت درد مند دل پایا تھا اور اس کے ساتھ ہی حق پرور بھی...... مولانا راشد محض ادیب نہ تھے۔ وہ مُفکر بھی تھے اور مُصلح بھی...... مولانا راشد الخیری کے افسانوں میں صداقت ہے، درد ہے، غصہ ہے، بے چارگی ہے، جھنجھلاہٹ ہے، جیسے وہ سماج کی بے اثری، بے حسی، بے دردی سے نالاں ہیں اور دست بدعا ہیں کہ ان کے لفظوں میں تاثیر پیدا ہو...... ان کے جتنے سوشل ناول اور افسانے ہیں وہ بھی جوشِ اصلاح سے لبریز ہیں۔ وہ استقلال سے بھی کام لیتے ہیں، نصیحتوں سے بھی اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی۔ کاش ان کی آواز صورِ اسرافیل کی سی ہنگامہ خیز ہوتی...... مولانا راشد الخیری آئیڈیلسٹ تھے۔ ان کا تمدنی آئیڈیل اسلام کا ابتدائی دَور تھا، جب لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا اور ایمان کی روشنی تھی۔ جب لوگ مہمان نواز تھے اور اخوت پسند تھے۔ جب توحید اپنی خاص صورت میں جلوہ گر تھی (اسلام دشمن پریم چند اسلام کی تعریف کر رہا ہے۔ م) مولانا راشد الخیری کا آئیڈیل وہی سنہرا اسلامی دَور تھا...... غیر مسلموں کو اگر کوئی شکایت ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے مسلمانوں کے لئے لکھا ہے جس طبقہ کو اُٹھانا چاہتے ہیں وہ مسلمانوں کا طبقہ ہے اتنا ہی نہیں کہیں کہیں تو آپ کے افسانے مذہبی تبلیغ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں مگر اس سے قطع نظر آپ نے اردو میں عورتوں کے لئے جو لٹریچر مہیا کیا ہے وہ زندہ جاوید ہے اور اس کے لئے اردو ہمیشہ آپ کی ممنون رہے گی"

(مذکورہ بالا کتاب میں صفحہ ۲۶۵ اور ۲۷۴ کے درمیان چھپے ہوئے اس مضمون سے اقتباس پیش کئے ہیں۔ یہ مضمون جولائی ۱۹۳۶ء کے عصمت میں شائع ہوا تھا۔)

اس مضمون کا یہ اقتباس پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ قارئین اس تحریر کے آئینے میں دیکھ سکیں کہ پریم چند کون سی اور کس قسم کی جارحانہ فرقہ واریت کا حامل ہے اور کس قدر اسلام دشمن ہے۔

پریم چند نے "مہاتماؤں کے درشن" میں راجپوت راجاؤں کے بارے میں مضامین کے علاوہ راجپوتوں کے بارے میں کئی کہانیاں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ ان میں راجپوتوں کی مردانگی، شجاعت، علوالعزمی، دیش پریم اور آزادی کی مہا نتا کی کہانیاں پیش کی ہیں۔ ان کہانیوں میں پریم چند نے بین السطور میں اپنے قارئین کو غلامی کی لعنت کے خلاف اکسایا ہے کہ کس طرح پرانے زمانے کے راجپوت قومی آزادی کی خاطر کٹ مرتے تھے اس طرح انہوں نے بلا واسطہ طور پر ملک کے عوام کو انگریزوں کی غلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے لئے اکسایا ہے۔

ان کہانیوں میں جہاں راجپوتوں کے دشمن ترک اور تاتار ہیں (پریم چند نے دشمن کے لئے "مسلمان" کا لفظ غالباً کہیں بھی استعمال نہیں کیا۔ لیکن ترک اور تاتاری چونکہ مسلمان تھے اس لئے شبلی صاحب کو پریم چند کے خلاف واویلا کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا) وہاں راجپوتوں کے دشمن راجپوت بھی ہیں اور راجپوتوں کے دشمن مرہٹے بھی ہیں۔

"آلہا" (پریم پچیسی جلد اول - آخری کہانی) میں راجپوت چندیلوں کے دشمن چوہان (پرتھوی راج چوہان) ہیں جو آپس میں لڑ کر کٹ مرتے ہیں۔

"ستی" (خواب و خیال) میں راجپوتوں کے ایک فرقے بندیلوں کے دشمن مرہٹے ہیں۔ مرہٹے بندیلوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں کہانی میں جہاں جہاں بندیل سپاہی یا سردار دشمن کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہاں اس سے مراد مرہٹوں سے ہے جو کہ یقیناً ہندو تھے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"دفعتاً خبر ملی کہ دشمنوں کی فوج قلعہ کی طرف بڑھی آرہی ہے۔۔۔۔ بندیلوں نے سر بکف ہو کر لڑنا شروع کر دیا۔۔۔۔ سپاہی نے پھر کہا مرہٹے قریب آ پہنچے۔۔۔۔ ایک طرف تاریکی روشنی کو پیروں تلے کچلنا چاہتی تھی دوسری طرف مرہٹے لہراتے شعلوں کو۔ اور قلعہ میں چتا بن رہی تھی۔"

میرے خیال میں صرف "رانی سارندھا" ہی میں مسلمانوں کا ذکر آیا ہے وہ بھی اس طرح ۔

"بندیل کھنڈ میں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں مسلمان آئے اور گئے۔ بندیل راجہ آئے اور گرے ۔۔۔"

دوسری جگہ اس طرح ذکر ہے:۔

"انردھ سنگھ دلیر راجپوت تھا۔۔۔۔ ایک طرف مسلمان فوجیں پرا جمائے کھڑی رہتی تھیں۔ دوسری طرف زبردست بندیل راجے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو خوفناک نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔۔۔"

اس جگہ پریم چند نے جس طرح مسلمان فوجوں کا ذکر کیا ہے وہاں بڑے راجپوت راجوں کی ملوکیت پسندی کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس کہانی میں اورنگ زیب کا بھی ذکر ہے جب اورنگ زیب محی الدین تھا اور شاہجہاں کی بیماری کی خبر سن کر مراد کے ساتھ دکن سے دہلی کو روانہ ہوا تھا۔ چمپت رائے دلی عہد دارا شکوہ کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا لیکن جب دریائے چمبل پر شہزادوں کو پتہ چلا کہ شاہی فوجیں ان کے مقابلے کو آ پہنچی ہیں تو انہوں نے چمپت رائے سے مدد کی درخواست کی۔ چمپت رائے دارا شکوہ کی دوستی کے باعث گومگو کی حالت میں تھا۔ لیکن رانی سارندھا نے اسے یہ کہہ کر مدد کے لئے تیار کیا کہ مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والے کی مدد کرنا راجپوت کا دھرم ہے۔

کہانی بہت طویل ہے۔ دراصل یہ کہانی شاہی فوجوں کے سپاہ سالار ولی بہادر خاں کی بہت ہی اعلیٰ نسل کے وفادار گھوڑے کے بارے میں ہے کہ جب شاہی فوجوں کو شکست ہوئی تو ولی بہادر خاں زخموں سے چور نیم مردہ حالت میں میدانِ جنگ میں پڑا تھا اور اس کا گھوڑا اس کے پاس کھڑا اپنی دُم سے مکھیاں بلا رہا تھا۔ گھوڑے کو دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن وہ کسی کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ رانی سارندھا نے ممتا اور پیار سے اسے اپنے بس میں کیا اور گھوڑے کی مالک بن گئی۔ ولی بہادر خاں بچ گیا تھا اور اسے اپنے گھوڑے کے چھن جانے کا غم

کیا۔ ونعا حا۔ اپنی چرب زبانی کے باعث وہ اورنگ زیب کا نورِ نظر بن گیا تھا۔ اسی گھوڑے کے باعث ایک تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے جس کے باعث چمپت رائے پر اورنگ زیب کا عتاب نازل ہوتا ہے لیکن ساری کہانی میں کہیں بھی کوئی تاثر ایسا نہیں ملتا جس میں پریم چند نے اورنگ زیب یا ولی بہادر خاں کے خلاف ایسے لفظ استعمال کئے ہوں جن کی بین السطور ہی سے کہیں مسلم دشمنی کے آثار مل سکیں۔ بلکہ اورنگ زیب کے بارے میں ایک جگہ یوں لکھا ہے :۔

"اورنگ زیب میں قدر شناسی کا احساس کم نہ تھا اس نے سب سردارانِ شاہی کی خطائیں معاف کر دیں۔ ان کے مناصب بحال کئے۔ راجہ چمپت رائے کو اس کی جانبازانہ خدمات کے صلے میں منصب دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا اور۔ اورچھا سے بنارس اور بنارس سے جمنا تک جاگیر عطا کی ......"

پریم چند نے راجپوتوں کے بارے میں اپنی انیک کہانیوں میں (مثلاً "بڑے گھر کی بیٹی" "راج ہٹ"، "راجہ ہردول" "گناہ کا اگن کنڈ" وغیرہ ہم) میں راجپوتوں کی شجاعت مردانگی۔ آزادی پسندی کے ساتھ ساتھ ان کی انا پسندی آپس کی پھوٹ اور بدلے کی بھاونا کے تحت ان کی تباہی و بربادی کی عبرت ناک داستانیں بھی بیان کی ہیں۔ ان سبھی کہانیوں کی بین السطور آپسی پھوٹ کے خطرناک نتائج کو بیان کر کے انہوں نے ملک کے ہندو مسلمان کو قومی آزادی کے لئے متحد ہو جانے کا پیغام دیا ہے ۔

اب شبلی صاحب کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے :۔

"یہ کتاب ٹیکسٹ بک کمیٹی میں پیش کی گئی مگر داخلِ نصاب نہ ہو سکی اس لئے کہ یہ فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کی علمبردار تھی"

(باکمالوں کے درشن" فروغِ اردو۔ فروری ۱۹۸۲ء صفحہ نمبر۵)

اگر یہ کتاب فی الواقعی فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کی علمبردار ہوتی تو فوراً ٹیکسٹ بک کمیٹی کی طرف سے پاس کر دی جاتی۔ کیوں کہ انگریزوں اور ان کے گرگوں نے ہمیشہ فرقہ واریت اور علیحدگی پسندی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندو اور مسلمان ایک آواز ہو کر ملک کی آزادی کی تحریک کو آگے نہ بڑھا سکیں۔

اس کے علاوہ پریم چند کا یہ خیال بھی غلط تھا کہ چوں کہ "باکمالوں کے درشن" میں انہوں نے مسلمانوں کے باکمال شامل نہیں کئے تھے اس لئے کمیٹی نے ان کی یہ کتاب منظور نہیں کی۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر مسلمانوں کے پانچ مشاہیر شامل کر دینے کے بعد یہ کتاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے منظور کیوں نہیں کی تھی ۔ ؟

نامنظوری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس میں راجپوتوں وغیرہ کی آڑ لے کر پریم چند نے پھوٹ اور نفاق کی برائیاں اور آزادی کی خاطر لڑ مرنے کا سبق دیا گیا "باکمالوں کے درشن" کا اردو ایڈیشن دستیاب نہیں ہے لیکن "قلم۔ تلوار اور تیاگ" (دو جلد میں) کے نام سے ہندی میں اس کے سبھی مضامین موجود ہیں۔ میری طرف سے پیش کردہ اقتباسات ان ہی دو جلدوں سے حاصل کئے گئے ہیں (۱۹۸۲ء کا ایڈیشن)

شبلی صاحب نے اپنی ذہنیت کے مظاہرے کے لئے اپنی وہی پرانی تکنیک استعمال کی ہے جو کہ وہ پریم چند کے خلاف لکھتے وقت اپنے ہر مضمون میں استعمال کرتے آئے ہیں یعنی پریم چند کی تحریروں سے اپنے مطلب کے جملے سیاق و سباق سے نکال کر انہیں پورے تناظر سے کاٹ کر پیش کر دئے۔ اور اوپر سے اپنی لفاظی اور چرب زبانی کا گارا چونا پوتا اور چڑھا دیا پریم چند کو سولی پر ۔

شبلی صاحب نے "باکمالوں کے درشن" میں سے پریم چند کی تحریروں کے جو اقتباسات پیش کئے ہیں کیا انہیں ان کے پہلو بہ پہلو انہیں مضامین میں پریم چند کی یہ تحریریں نظر نہیں آئیں ۔

(۱) راجہ مان سنگھ میں ———— راجہ بھارمل (راجہ مان سنگھ کا دادا ۔ م) وہ پہلا سمجھدار اور دور اندیش

راجوتا جس نے ہزاروں سال کے دھارمک سنسکاروں کو ملک کے مجموعی فائدے (ساہیک ہت) پر قربان کرکے مسلمانوں سے ناطہ جوڑا۔ ۹۶۹ھ میں اپنی روپ گن وشیل بیٹی کو اکبر کی پٹ رانی بنایا۔ آمیر کے کچھواہا خاندان کو آزاد خیال اور مذہب کے معاملے میں فراخ دلی کے میدان میں قیادت کا فخر حاصل ہے اور جب تک زمانے میں اعلیٰ خوبیوں کی قدر و قیمت رہے گی اس گھرانے کا نام فخر اور توقیر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا“ (اور اس مضمون کی آخری سطریں) لیکن ہماری نظر میں اُس کی (یعنی مان سنگھ کی ۔ م) قدر اور اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس کے گھرانے نے پہلے پہل دو آپسی دشمن فرقوں کو باہم ملانے کی کوشش کی“ (قلم ۔ تلوار اور تیاگ ۔ جلد اول ۔ صفحہ نمبر ۱۲۳)

(۲) رانا پرتاپ میں ــــــ (ہلدی گھاٹی کی لڑائی کے بعد) ”اکبر جو مبدائے فیاض سے بہادری اور مردانگی کے (جوہر) لے کر آیا تھا اور بہادر دشمن کی قدر کرنا جانتا تھا خود بھی اپنے سرداروں سے پرتاپ کی بہادری اور ہمت کی تعریف کرتا تھا۔ درباری شاعر رانا کی بڑائی میں شعر تخلیق کرنے لگے۔ عبدالرحیم خان خاناں نے، جو ہندی بھاشا میں بڑی سُندر شاعری کرتے تھے، میواڑی بھاشا میں رانا کی بہادری کا بکھان کیا۔ واہ! کیسے باکمال اور فراخ دل لوگ تھے کہ دشمن کی بہادری کی تعریف کرکے اس کا دل بڑھاتے اور حوصلہ اُبھارتے“ (جلد اول ص ۲۰ ۔ ۲۱)

(۳) راجہ ٹوڈر مل میں ــــــ اکبر جیسا خوبیوں کی پرکھ کرنے والا بادشاہ ان خوبیوں کی قدر نہ کرتا یہ کیسے ممکن تھا“ (جلد دوم ص ۱۷)

میں ان مضامین میں سے اور بھی بہت سے اقتباسات پیش کرنا چاہتا تھا لیکن ہندی زبان سے اچھی طرح واقفیت نہ ہونے کے باعث ترجمے کی دشواریوں کے پیش نظر صرف مندرجہ بالا اقتباسات پر ہی اکتفا کر رہا ہوں اس کے ساتھ ہی راجہ ٹوڈر مل ہی، سے اردو اور فارسی کے بارے پریم چند کے خیالات پیش کرکے پریم چند کی ”اسلام دشمنی“ کے ساتھ ساتھ ”اُردو دشمنی“ کا نقشہ بھی پیش کرتا ہوں۔

”سکندر لودھی کے زمانے تک ہندو لوگ عام طور سے فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ انہیں ”ملیچھ ودیا“ کہتے تھے۔ ٹوڈر مل نے تجویز کیا کہ سارے ملک کی دفتری زبان فارسی ہو جائے۔ پہلے تو ہندو اس منصوبے سے چونکے لیکن ٹوڈر مل نے ان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بٹھادی کہ راجہ کی بھاشا ہی ذریعہ معاش ہوتی ہے اونچے عہدے اور عزت و توقیر چاہتے ہو تو راج بھاشا سیکھنی ضروری ہے۔ اکبر نے بھی سہارا دیا اور منصوبہ چل نکلا اور کچھ ہی سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی داں ہو گئے۔ اس زاویہ نگاہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”ٹوڈر مل اُردو زبان کا جدِ امجد تھا۔ کیوں کہ یہ اس کی دُور اندیشی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں میں فارسی کا چلن ہوا۔ فارسی الفاظ عام گھریلو گفتگو میں شامل ہونے لگے۔ اور اس طرح ریختے سے اُردو کی جڑ مضبوط ہوئی“

اس کے بعد اب ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی کے اُردو کے بارے میں تازہ ترین خیالات ملاحظہ فرمائیے:—

”دراصل اُردو کا محاورہ مجھے اور میں محاورے کو قبول نہیں کرتا۔ مختلف زبانوں کے چھوٹے چھوٹے لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اُردو زبان درباری زبان ہے جس میں پنج نہیں سماتا۔ آپ جب یہ زبان استعمال کریں گے تو ملمع سازی کریں گے“

ممتاز مفتی سے یہ انٹرویو پاکستان کے پانچ ادیبوں نے لیا تھا جن کے نام ہیں (۱) مرزا حامد بیگ (۲) احمد جاوید (۳) نذیر احمد (۴) جلیل عالی (۵) محمد منشا یاد۔ یہ انٹرویو پاکستان کے کسی نہ کسی جریدے میں ضرور شائع ہوا ہوگا۔ بہر حال ہندوستان میں اپریل ۱۹۸۳ء کے

بیسویں صدی میں بھی شائع ہوا ہے۔

ان انٹرویو لینے والوں نے انٹرویو کی ابتدا ہی پریم چند کی روایت اور وراثت سے کی ہے کیوں کہ اُردو افسانے کا ذکر پریم چند کی روایت اور وراثت کے بغیر شروع ہی نہیں ہو سکتا اور غالبًا یہی بات شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگوں کے گلے نہیں اُترتی۔ اور وہ کھلے ڈکار لینا شروع کر دیتے ہیں اور پریم چند کا جادو اُتارنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اب شبلی صاحب کے مضمون میں شبلی صاحب کے زہر میں بجھے ہوئے یہ الفاظ پڑھیے اور غور فرمائیے کہ ہندو مسلم کشیدگی کو ہوا دینے والے لوگ شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگ ہیں یا کوئی اور۔

"ہم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بودھوں کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا تھا جو آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔ اپنے ہی سماج میں خلفشار تھا کہ بھائی کی لڑکی بھی بھائی کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی....." (ایضاً)

مسلمانوں کے ساتھ آج کے ہندوستان میں جو سلوک ہو رہا ہے وہ یقیناً اس سلوک سے بدرجہا بہتر ہے جو مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ ہوتا رہا ہے اور یقیناً اس سے بھی کہیں زیادہ بہتر ہے جو آج کے دور میں مسلمان، عیسائی اور یہودی ملکوں میں دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ زیادہ تفصیل میں اس لئے نہیں جانا چاہتا کہ وہ سب کچھ شبلی صاحب جیسے لوگوں کے لئے ہضم کرنا مشکل ہو جائے گا۔

"بھائی کے ہاتھوں بھائی کی لڑکی کا محفوظ نہ ہونا" کے الفاظ استعمال کر کے شبلی صاحب نے جان بوجھ کر شر پسندی اور اشتعال انگیزی کا ثبوت دیا ہے حالاں کہ اس تاریخی واقعے میں حقیقت یہ ہے کہ سنجوگتا نے سوئمبر میں پرتھوی راج کے بت کے گلے میں جے مالا ڈالی تھی یہ بُت اس کے والد نے پرتھوی راج کی توہین کے لئے دربان کے طور پر کھڑا کیا تھا راجپوت ناری جس شخص کے گلے میں جے مالا ڈالتی ہے اسے سدا کے لئے اپنا مجازی خدا تسلیم کر لیتی ہے اسی لئے پرتھوی راج سنجوگتا کو بھرے سوئمبر سے اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا کر بھگا لے گیا تھا۔ اس سارے واقعے کو کس طرح توڑ مروڑ کر شبلی صاحب نے زہر کا انجکشن لگایا ہے۔ قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ کیا اس طرح کی مثالیں مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں نہیں ہیں؟ —

اس خلفشار اور ناچاقی نے اگر ایک جے چند پیدا کیا تھا تو وقت کے گزرنے پر اسی طرح کے خلفشار، ناچاقی اور لالچ نے میر جعفر اور صادق جیسے لوگوں کو بھی تو جنم دیا تھا۔

اب آئیے شبلی صاحب کی تاریخ دانی پر تفصیل سے بحث کی جائے۔ شبلی صاحب نے مندرجہ بالا الفاظ میں اپنے تاریخ داں ہونے کا جو ثبوت دیا ہے اس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنی روایت کے مطابق یہاں بھی جھوٹ گھڑنے میں شرم محسوس نہیں کی۔

ڈاکٹر تارا چند صاحب شبلی صاحب کے پسندیدہ اور معتبر تاریخ داں ہیں کیوں کہ شبلی صاحب نے جگہ جگہ بلکہ اکثر بلا ضرورت ڈاکٹر تارا چند کی کتاب "اہلِ ہند کی مختصر تاریخ"، (پہلا ایڈیشن ۱۹۶۸ء — ناشر اُردو اکیڈمی دہلی (رجسٹرڈ))۔۔۔ یہ کوئی خود ساختہ اکیڈمی تھی جس کا اب کہیں وجود نہیں) سے اقتباس پیش کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی اسی کتاب سے کچھ حوالے پیش کر کے ثابت کرتا ہوں کہ ہندوستان میں بُدھ مت محمود غزنوی کی پیدائش سے تقریباً دو صدی پہلے لگ بھگ ختم ہو چکا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے —

"یہ واضح رہے کہ بدھ مت کے زوال اور ہندو مذہب کے عروج کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کوئی سیاسی قوت کام میں لائی گئی ہو اس زمانے میں ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیرو ایک دوسرے سے رواداری برتتے تھے اور اختلاف

مذہب کی بنا پر کسی قسم کی سختی اور ظلم نہیں کیا جاتا تھا۔ بدھ مذہب کے ہندوستان سے نکل جانے کے کئی سبب تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی صورت بالکل بدل گئی تھی اور وہ ہندو مذہب سے اس قدر مشابہ ہو گیا تھا کہ مستقل حیثیت قائم رکھنا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے بہت سے مسائل ہندو پنتھوں اور فلسفوں میں داخل ہو گئے (ص ۱۳۵-۱۳۶)

شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ بدھ مت والے خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور وقت کے گزرنے کے ساتھ انہوں نے مہاتما بدھ کے دیو قد مجسمے بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی تھی۔ یعنی مہاتما بدھ کو خدا کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کیا یہ بات اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے؟ اگر ہے تو یقیناً بت شکن محمود غزنوی نے بدھ مت کے دفاع کے لئے ہندوستان پر سترہ حملے کئے ہوں گے۔ کیوں کہ بدھ مت کے احیا کے لئے یقیناً ایک دو حملوں سے کام نہیں چل سکتا تھا!۔

شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے مکرر عرض ہے کہ ڈاکٹر تارا چند کے مطابق مندرجہ بالا حقائق کے باعث بدھ مت کا زوال آٹھویں صدی تک مکمل ہو چکا تھا۔ (محمود کا زمانہ دسویں گیارویں صدی کا تھا — تخت نشینی ۹۹۷ء — انتقال ۱۰۳۰ء) ڈاکٹر تارا چند نے بدھ مت کے زوال کا ذکر تیسری اور آٹھویں صدی کے درمیانی عرصہ میں "تہذیب و تمدن" کے باب میں کیا ہے (صفحہ ۱۳۳ سے ۱۴۱ تک)

محمود غزنوی کے بارے میں ڈاکٹر تارا چند کے خیالات بھی ملاحظہ فرمایئے:—

"..... اس نے وسط ایشیا اور ایشیا کا بڑا حصہ اور فارس فتح کر لیا اور قریب تھا کہ خلیفہ وقت کی مملکت پر قبضہ کرے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے نام و نمود اور مال غنیمت (کی) خاطر ہندوستان پر بہت سے حملے کئے بہت سے مندروں کو لوٹا اور جلایا کیوں کہ وہ دولت کے خزانے تھے لیکن اس نے اسلام قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا۔ بلکہ اپنی فوج میں بہت سے ہندو سپاہی اور افسر مقرر کئے جو اس کی طرف سے فارس اور وسط ایشیا کی لڑائیوں میں لڑے۔ اس کا مذہبی تشدد محض ان بدعت پسند مسلمانوں پر تھا جو اس کی سلطنت کے امن و امان اور انتظام میں دخل انداز ہوتے تھے (ص ۱۵۸، ۱۵۹)

یہاں ضرورت سے زیادہ روا داری دکھانے کی دھن میں ڈاکٹر تارا چند کے الفاظ خود اپنی ہی چغلی کھا رہے ہیں کیا اسلام میں دوسروں کی عبادت گاہوں کو لوٹنا اور جلانا (دولت کی خاطر ہی سہی!— لیکن چلئے دولت کی خاطر لوٹنے کی بات تو ٹھیک ہے جلانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی) جائز ہے؟ اور محمود کا "مذہبی تشدد" "بدعت پسند مسلمانوں" پر نازل ہونے کی بات بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اسے تارا چند اور جناب ابو محمد شبلی صاحب ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور محمود غزنوی کی سوجھ بوجھ کی بھی داد دینی چاہئے کہ اپنے ہم مذہب لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کی بجائے اس نیک کام کے لئے اس نے ہندو افسر اور سپاہی مقرر کئے۔

ڈاکٹر تارا چند نے اپنی اسی تاریخ میں ایک نہیں بلکہ انیک جگہوں پر مسلمان حکمرانوں حملہ آوروں کے ہندوؤں کے مندروں کو لوٹنے اور جلانے کا ذکر کیا ہے شبلی صاحب چاہیں تو ان کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔

ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو تباہ و برباد کرنے اور ان پر مسجدیں تعمیر کرنے کا ذکر خود مسلمان تاریخ والوں اور سیاحوں نے کیا ہے۔ تاریخ رشیدی اور ابن بطوطہ کے سفرنامے کے صفحات اس کے گواہ ہیں۔

اب یہاں ایک مسلمان تاریخ دان مرحوم سید محمد لطیف کی انگریزی میں لکھی ہوئی "تاریخ پنجاب" کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ یہ تاریخ انہوں نے ۱۸۹۱ء میں انگریزوں کے دور میں شائع کروائی تھی۔ اس کے پچھتر برس بعد اس کا ہو بہو ایڈیشن (۱۹۶۶ء کے لگ بھگ) فوٹو آفسیٹ پر پاکستان سے دوبارہ پانچسو کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا (پیپلز پبلشنگ ہاؤس لاہور۔ لنڈن) اس کتاب کی ہر جلد پر نمبر کی سٹامپ لگائی گئی ہے۔ مجھے جو جلد دستیاب ہوئی ہے اس پر [illegible] نمبر ہے (صرف چند ماہ پہلے پاکستان میں ان کی یاد میں کوئی تقریب بھی منائی گئی تھی (افسوس کہ اخبار کا تراشا رکھنا یاد نہیں رہا۔)

سید محمد لطیف صاحب نے اپنے دیباچے میں جن مسلمان تاریخ دانوں کی کتابوں کا حوالہ (اس کتاب میں دیا ہے) ان کے نام یہ ہیں۔ فرشتہ۔ ابوالفضل۔ مولانا نظام الدین احمد۔ میر غلام حسین خان۔ مرتضیٰ حسین، ملا عبدالحمید وغیرہ۔ اور جن کتابوں سے حوالے پیش کئے ہیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ اکبر نامہ۔ طبقات اکبری۔ آئین اکبری۔ بادشاہ نامہ۔ اقبال نامہ جہانگیری۔ عالمگیر نامہ وغیرہم۔

سید محمد لطیف صاحب نے بھی اکثر جگہوں پر ہندوؤں کے مندر لوٹنے، جلانے اور ان پر مسجدیں تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے ان کی تفصیل میں جانے لگوں تو مضمون کے طویل ہو جانے کا ڈر ہے۔ بلکہ صرف محمود غزنوی کے سترہ حملوں ہی کی تفصیل پیش کروں تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ادھر ادھر سے محمود غزنوی کے حملوں کے صرف کچھ ہی اقتباس پیش کرنے پہ اکتفا کرتا ہوں۔

"۱۰۱۱ء میں (چھٹا حملہ) محمود نے تھانیسر کی فتح کا بیڑا اٹھایا جو کہ ہندوؤں کی نگاہوں میں اتنا ہی متبرک تھا جتنا کہ مسلمانوں کی نظروں میں مکہ۔"

(آنند پال نے تھانیسر کے مالیے کے علاوہ ہیرے جواہرات، بھاری دولت اور ہاتھیوں وغیرہ کی پیش کش کر کے اس حملے کو رکوانے کی کوشش کی تھی مگر محمود نہیں مانا تھا۔ اختصار کے پیش نظر مفصل ترجمہ نہیں پیش کیا ــــ م)

"لیکن محمود سارے ہندوستان سے بت پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا چنانچہ محمود نے اس پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر شہر پر حملہ کر دیا اور اسے فتح کر لیا۔ شہریوں کی لوٹ مار کی اور ان کے عظیم مندروں کو تباہ کر کے ان کے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ان بتوں میں سب سے اہم بت کا نام جگسوم تھا اس کے بارے میں یہ اعتقاد تھا کہ ابتدائے آفرینش ہی سے اس کا وجود تھا۔ اس کو ریزہ ریزہ کر کے اس کے ٹکڑے غزنی۔ مکے اور بغداد کو ارسال کئے گئے تا کہ انہیں (وہاں کی) گلیوں میں پاؤں تلے روندا جائے ..... (دو سال بعد) محمود نے کشمیر کی ساری عظیم دولت کو لوٹا اور اس کے شہریوں کو رسولؐ کے مذہب کو بغل گیر کرنے پر مجبور کر کے اپنی راجدھانی میں بے انتہا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس ہوا۔" (ص ۸۳)۔

سومناتھ کی فتح کے بعد ـــــ "جوں ہی وہ ہال میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے سامنے نو فٹ اونچا ایک پتھر کا بت دیکھا۔ سلطان نے بت کے قریب پہنچ کر اپنے گرز کی ایک ہی ضرب سے اس کی ناک توڑ ڈالی۔ اس نے حکم دیا کہ بت کے ٹکڑے غزنی لے جائے جائیں۔ ایک ٹکڑے کو جامع مسجد کی دہلیز پہ پھینکنے کے لئے اور دوسرا قصر شاہی کے

مہاراشٹر کے دروازے پر۔ اس کے علاوہ دو اور ٹکڑے بیک وقت مکہ اور مدینہ کو بھی روانہ کرنے کا حکم دیا۔ برہمنوں (پروہتوں) نے سلطان کی خدمت میں بُت کی بے حرمتی نہ کرنے کی دست بستہ گزارش کی اور اس کے بدلے میں بے انتہا سونے کی پیشکش کی۔ محمود کے درباریوں نے بھی مشورہ دیا کہ ایک بُت کی تباہی سے بُت پرستی کو نیست و نابود تو نہیں کیا جا سکتا (یعنی دولت لے کر بُت کی) جان بخشی کردی جائے ۔م) لیکن محمود نے اس تجویز کو پاکر حقارت سے ٹھکرا دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اگر وہ منفعت کی خاطر ایک بُت کی جان بخشی کردے گا تو آنے والی نسلیں اُسے بُت فروش کے نام سے یاد کریں گی (چنانچہ) فوراً بُت کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے گئے اور اس کے اندر (کے خلا) سے اس قدر ہیرے جواہرات برآمد ہوئے کہ جن کی مجموعی قیمت پروہتوں کے پیش کردہ سونے کی قیمت سے کئی گنا زیادہ تھی۔ (ص ۸۵، ۸۶)

شبلی صاحب مزید فرماتے ہیں :-

"منشی جی نے انگریزوں کی لکھوائی ہوئی تاریخ کے سہارے ایسے بہت سے افسانے اور مضامین لکھے ہیں جن سے فرقہ داریت کی آگ بھڑکتی رہے۔ انہیں رانا سانگا کو ذہن میں رکھ کر انہوں نے اپنی سب سے پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" (سوزِ وطن کی پہلی کہانی) لکھی تھی وہ رانا سانگا ہی کے دل کا لہو تھا جو "دنیا کا سب سے انمول رتن" قرار پایا تھا۔"

(فروغِ اردو صفحہ ۹)

کیا سید محمد لطیف صاحب نے جن مسلمان تاریخ دانوں کے حوالے دئے ہیں ان سبھی لوگوں نے انگریزوں کے ایما پر یہ تاریخیں اور یادداشتیں لکھی تھیں؟ ان کے وقت میں تو ہندوستان میں انگریزوں کا وجود بھی نہیں تھا۔ ابن بطوطہ کے سفرنامے اور تاریخ رشیدی کے بارے میں شبلی صاحب کا کیا خیال ہے؟ پریم چند نے نہ تو انگریزوں کی لکھوائی ہوئی تاریخ پر بھروسہ کیا ہے اور نہ ہی مسلمان مورخین کی تاریخوں سے استفادہ کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قومی یکجہتی کی خاطر اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر تاریخ کے چند صفحوں کا استعمال کیا ہے وہ بھی اس طرح کہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج کو وسیع کرنے کی کہیں بھی شعوری یا لاشعوری کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی سیکڑوں تحریریں اور ہزاروں صفحات اس بات کے گواہ ہیں۔

"سوزِ وطن" کی جس کہانی کا ذکر شبلی صاحب نے کیا ہے وہ کہانی بھی انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ میدانِ جنگ میں موت سے ہمکنار ایک راجپوت کے الفاظ کے تانے بانے میں ایک سچے محبِ وطن اور دیش بھگت کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ساری کہانی میں کہیں رانا سانگا یا مسلمان حملہ آوروں کا ذکر تک نہیں ہے۔ اس کے باوجود شبلی صاحب کو خوابی بواسیر جاری ہو گئی ہے۔ یہی وہ کہانی ہے جسے پڑھ کر انگریز حکمرانوں اور ان کے گرگوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے کہ یہ شخص سرکاری نوکر ہو کر ہندوستانیوں کو دیش بھگتی اور قومی آزادی کا سبق پڑھا رہا ہے۔ کہانی مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ کہانی کا ہیرو دلفگار ملکہ دلفریب سے عشق کرتا ہے جو اس سے کہتی ہے کہ اگر وہ دنیا کی کوئی انمول شے لے کر واپس آئے تو وہ اس سے شادی کرلے گی۔ کئی ناکامیوں کے بعد وہ اس بہادر راجپوت کے خون کا آخری قطرہ لے کر لوٹتا ہے جس نے قومی آزادی کی خاطر میدانِ جنگ میں جان قربان کردی تھی۔ اس کہانی میں بھی شبلی صاحب

کو قباحت نظر آئی اور انہوں نے جھوٹ اور بے ایمانی کا سہارا لے کر اس میں رانا سانگا کا نام اپنی طرف سے جوڑ دیا۔

پریم چند نے اسی مجموعے میں "شیخ مخمور" کے نام سے بھی ایک کہانی لکھی ہے اس میں سب مسلمان کردار ہیں اس میں فاتح بھی مسلمان ہیں اور مفتوح بھی مسلمان ہیں۔ مندرجہ بالا کہانی کی طرح یہ بھی کوئی تاریخی نہیں بلکہ فرضی کہانی ہے اور اس میں بھی قومی آزادی اور حب الوطنی کا بکھان کیا گیا ہے لیکن چونکہ یہ سبھی کردار مسلمان ہیں اس لئے شبلی صاحب اس کہانی کو تو چپکے سے ہضم کر گئے۔ لیکن پہلی کہانی میں چونکہ ایک راجپوت نے حب وطن کا درس دیا ہے جو کہ لازماً ہندو ہے (اگرچہ اس کے نام کا کہیں ذکر نہیں ہے) اس لئے شبلی صاحب کو بدہضمی کی شکایت ہوگئی ہے۔

میں اپنے پرانے الفاظ پھر دہراتا ہوں کہ ان سب حقائق کے باوجود ہم پچھلی تلخیاں بھول جانا چاہتے ہیں لیکن شبلی صاحب جیسے لوگ اپنے جراثیم سے بھرے ہوئے گندے ناخنوں سے بار بار ان کھرنڈوں کو کھرچ کر ہمارے زخم بار بار ہرے کرتے ہیں اور پرانی تلخیوں کو پھر سے زندہ کر دیتے ہیں اور یہی لوگ اسلام کی خدمت کے زعم میں اسلام کو بدنام کرنے کا باعث بنتے ہیں اسلام کی بدنامی میں ایک ہزار پریم چند بھی وہ رول ادا نہیں کر سکتے جو کہ اکیلے شبلی صاحب ادا کر رہے ہیں۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

چرب زبان

فوزیہ ناہید

وہ سنیچر کی ایک انتہائی سرد رات تھی لندن سے سات بج کر سولہ منٹ پر روانہ ہونے والی ٹرین، پیڈنگٹن پہنچی تو اسکاٹ لینڈ یارڈ کی واحد خاتون نائب کمشنر مسز ہیم نے اپنے ڈبے سے اُتر کر ایک گہری سانس لی۔ اس ٹرین سے اترنے والوں کی تعداد بے حد کم تھی۔ شاید موسم کی سختی لوگوں کے سفر میں حارج ہوئی تھی لیکن اگر واقعی یہی بات تھی تو ٹرین کے اگلے ڈبے کے گرد، ہجوم کیا معنی رکھتا تھا؟ مسز ہیم نے دُور سے دیکھا، سیاہ سوٹ والے ایک جوان سال شخص کے دائیں بائیں دو پورٹر کھڑے تھے قریب ہی ریلوے کا ایک سپاہی بھی موجود تھا اور متجسس مسافروں کا ایک مجمع تھا۔ مسز ہیم نے اپنے چاندی جیسے بالوں کو چھوا اور ہیٹ سر پر ٹھیک سے جما کر، اپنے چمڑے کا جیکٹ سامنے سے جھٹکا اور مضبوطی سے قدم اٹھاتی ہوئی مجمع کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے قریب پہنچتے ہی ریلوے پولیس کانسٹیبل نے اسے پہچان کر جلدی سے سیلوٹ کیا اس نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے جواب دیتے ہوئے اس کمپارٹمنٹ میں نظر دوڑائی تو اسے نشست پر ایک شخص غیر معمولی انداز میں دراز نظر آیا "میں بھی اسی ٹرین سے آتری ہوں" اس نے کانسٹیبل کو آگاہ کیا پھر اس کی نگاہ کمپارٹمنٹ کی کھڑکی پر پڑی جس پر مسٹر کمبر کے نام کی ریزرویشن سلپ لگی ہوئی تھی "کیا ماجرا ہے؟ کیا اس کی حرکت قلب بند ہو گئی ہے" اس نے دریافت کیا۔

اس کے تحکمانہ لہجے سے سیاہ سوٹ والے شخص کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی با اختیار شخصیت ہے لہٰذا اس نے اپنے لب کھولے "مادام، میں، مسٹر کمبر کا سیکریٹری ہوں میں ہمیشہ دورانِ سفر ان کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں سفر کرتا ہوں کیوں کہ مسٹر کمبر [illegible]

کرتے تھے، ہم عموماً اسی ٹرین سے سفر کرتے رہے ہیں مسٹر کمبر ٹکٹوں کے ڈیلر تھے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کی موت متوقع تھی۔ دراصل مسٹر کمبر دمے کے مریض تھے اور ان کا دل بھی کمزور تھا۔"

مسز ہیم اس کے بیان میں قطعی دلچسپی نہیں لے رہی تھی اسی لمحے چھوٹے قد کی ایک خاتون مجمع سے نکل کر آگے بڑھی اور بولی "میں مسٹر کمبر کے بائیں جانب والے ڈبے میں سفر کر رہی تھی اور پناہ خدا، وہ سفر کے آغاز سے اختتام تک مسلسل کھانستا رہا تھا۔ اس کے کھانسنے کی آواز واضح طور پر مجھے سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے درمیان محض ایک دیوار ہی تو حائل تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کھانستے کھانستے اس کا کلیجہ باہر آ جائے گا۔"

"یہ خاتون ٹھیک کہہ رہی ہیں"، سکریٹری نے تائید کی۔ "میں ڈبے کے دوسری جانب تھا۔ میڈن ہیڈ کے بعد ٹرین کہیں نہیں رکتی اس لئے میں اس بے چارے کے کھانسنے کی آواز سن تو رہا تھا لیکن اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا ایمبولینس آ رہی ہے؟" مسز ہیم نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

جواب میں کانسٹیبل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا یہ طبی امداد پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا؟" مسز ہیم نے سوال کیا۔

"جی ہاں" ایک پورٹر نے جواب دیا "اس شخص نے ٹرین کے رکتے ہی ہاتھ لہرا کر ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا تھا" اس نے سکریٹری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم پہنچے تو اس نے بتایا کہ برابر والے کمپارٹمنٹ میں اس کا باس شاید علیل ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ ہم دونوں نے مل کر دروازہ کھولا اندر گئے تو دیکھا کہ وہ ختم ہو چکا تھا اس میں شک و شبہے کی

کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایمبولینس لاش اٹھا کر لے گئی اور لوگوں نے بھی اپنی اپنی راہ لی۔ ہیڈ خانساماں تقریباً نڈھال ہو چکا تھا۔ مسز ہیم کے چیمبر پر بریگی کے آ جانے سے وہ ریلوے ڈویژنل پولیس کے انچارج انسپکٹر جروس کی جانب متوجہ ہوئی جو چند ہی سیکنڈ پہلے وہاں پہنچا تھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ یہ طبعی موت ہے؟" انہوں نے جروس کے خیالات سے آگاہ ہونا چاہا۔

"مادام میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" جروس نے حیرانی سے کہا۔

"ادھر آؤ" مسز ہیم اسے لے کر کمپارٹمنٹ کی سمت بڑھی:
"یہ دیکھو۔ یہ بالکل نیا کمپارٹمنٹ ہے۔ ٹرین کے سارے ہی کمپارٹمنٹ بالکل نئے ہیں۔ ان کے گدّے اور قالین کا رنگ بھی بالکل تازہ ہے ہر شے نئی ہے۔"

"اور مسٹر کبر کے ڈبے کے گدّے اور قالین کا رنگ اُڑا ہوا ہے بلکہ بدرنگ نظر آ رہا ہے۔ یہی کہنا چاہتی ہیں نا آپ؟" جروس نے دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں۔ دیکھو سبز قالین کا رنگ اُڑا ہوا نظر آ رہا ہے جبکہ دوسرے کمپارٹمنٹ کے قالین کی حالت ایسی نہیں ہے۔"

"مادام۔ یہ ایک سیدھا سادا اور عام سا کیس ہے متوفی دل کا مریض تھا اس پر کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔" انسپکٹر نے زچ ہو کر جواب دیا۔

"شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ایک عام سے واقعے کو اہم اور سنسنی خیز بنانے کی کوشش کر رہی ہوں" مسز ہیم کی آواز کی سختی نرمی میں ڈھل گئی۔ "لیکن برخوردار میرا ذہن ان معاملات میں بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔ یہ سیکریٹری کچھ قطعی پسند نہیں تھا مجھے ... زبان معلوم ہوتا ہے۔ مجھے چکنی چپڑی باتیں کرنے والے اور ہر قسم کے لوگوں سے سخت چڑ ہے وہ شخص بھی اسی قماش کا نظر آتا ہے ایسے لوگ بے حد خطرناک ہوتے ہیں جن کی زبان پر ہر سوال کا جواب پہلے سے موجود ہوتا ہے۔"

جواب میں انسپکٹر جروس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ... اس نے ... خاموش رہا ... پھر ... اسٹیشن سے

نکل کر اسپتال روانہ ہو گئے جہاں مسٹر کبر کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائی گئی تھی۔ مسز ہیم نے وہاں پہنچ کر لاش کا طبی معائنہ کرنے والے سرجن سے اس کی موت کی وجہ دریافت کی "کوئی غیر معمولی بات نہیں" باریش سرجن نے خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔ "بس حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ میں نے فون پر متوفی کے ذاتی معالج سے بات کی ہے وہ دمے کا مریض تھا اور اس پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا۔"

"تمہاری بات بظاہر تو درست ہے سرجن لیکن میرے حلق سے اتر نہیں رہی ہے چاہو تو اسے چھٹی حس کہہ لو ہر شے بظاہر معمول کے مطابق ہی نظر آتی ہے لیکن میرا مطلب ہے کیا کوئی معمولی سی بات بھی معمول سے ذرا ہٹی ہوئی نہیں ہے؟" مسز ہیم نے دریافت کیا۔

"بات یہ ہے کہ ..." سرجن ایک لمحے کے لئے ہچکچایا گیا۔ "میں نے ایک شے پر غور کیا ہے اور وہ ہے ... بُو ... ایسی ہی بُو جیسی زمین دوز ریلوے کی فضا میں رچی ہوتی ہے" اس نے رُک کر انسپکٹر پر نگاہ ڈالی اور دوبارہ گویا ہوا "ممکن ہے متوفی کا سوٹ کسی نئے کیمیکل سے دُھلا ہوا ہو اور یہ بُو اسی کی ہو۔"

مسز ہیم کی آنکھیں نہ جانے کس شے پر مرکوز تھیں اچانک ہی ان کے جسم میں جیسے نئی جان سی پڑ گئی وہ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی "یہ قتل ہے" اس نے سنسنی خیز انداز میں انکشاف کیا اس کا لہجہ کرخت اور بالکل سپاٹ تھا قتل کا ایسا ہی ایک واقعہ آج سے بیس سال قبل امریکہ میں آیا تھا میرے ساتھ آؤ میں اس سیکریٹری سے اسی وقت ملنا چاہتی ہوں" وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ جروس نے بے بسی سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور مسز ہیم کے حکم کی تعمیل میں پچھلی منزل پر واقع ویٹنگ روم کی جانب چل پڑا جہاں نوجوان سیکریٹری بیٹھا تھا ان دونوں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ہسپتال میں پڑی ہوئی اپنے باس کی لاش کے خیال نے اس کی مسکراہٹ چھین لی۔

"مجھے مسٹر کبر کے بارے میں بتاؤ" مسز ہیم نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔

”آ.... اچھا..... وہ ....“ سیکریٹری قدرے سراسیمہ ہو گیا ”وہ نادر و نایاب ٹکٹوں کا کاروبار کیا کرتے تھے کنوارے تھے اور ایک چھوٹے سے گھر میں تنہا رہتے تھے۔ میں معمول کے مطابق روزانہ ان کے دفتر جاتا تھا اور ہر سفر میں ان کا رفیق ہوتا تھا وہ کفایت شعار واقع ہوئے تھے۔ لیکن ساتھ حساب کتاب بالکل صاف رکھتے تھے“

”پھر اُسے تم نے کیوں ہلاک کیا؟“ مسز ہم نے براہِ راست سوال کیا۔

انسپکٹر جروس کو مسز ہم کی جانب سے اتنے بے باک سوال کی توقع نہیں تھی وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

سکریٹری ہکا بکا مسز ہم کو حیرت پاش نظروں سے گھورتا چلا گیا ”مم... میں.... میں نے.... اوہ.... خدا کی پناہ“

”کمبر کو قتل کیا گیا ہے“ مسز ہم کا لہجہ انتہائی سرد تھا ”تم اس کی موت کے خواہش مند تھے تم نے اس کے مرض کو قتل کا ہتھیار بنایا اور ٹرین کے دو الگ الگ لیکن آپس میں منسلک ڈبوں کو اس کا ذریعہ بنایا کیوں کہ ٹرین راستے میں کہیں نہیں رکتی اس لئے تم نے یوں جائے واردات سے اپنی عدم موجودگی کے ثبوت کا غیر معمولی ذریعہ فراہم کیا“

”کیا آپ مجھ پر اسے زہر دے کر ہلاک کرنے کا الزام....“

”ایسی کوئی بات نہیں، نوجوان“ مسز ہم نے اس کا جملہ اچک لیا ”کیا تم جاسوسی کہانیاں پڑھتے ہو؟“

”وہ.... ہاں.... بڑے شوق سے لیکن....“ وہ اچانک خاموش ہو گیا۔

”وہ نوجوان یقیناً بے حد ذہین تھا جس نے آج سے پچیس سال قبل، قتل کی ایک بالکل ایسی ہی سچی واردات کہانی کی شکل میں شائع کی تھی تم نے وہ کہانی پڑھی اور اسی کی روشنی میں تم نے یہ واردات کی ہے“

”میں مزید بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں اور تم مجھے روک نہیں سکتیں“ نوجوان نے یکایک بپھر کر کہا اور تیزی سے مڑ گیا۔

”اسے روکو فوراً روکو“ مسز ہم نے انگلی اٹھا کر حکم دیا۔ ”دیکھنا یہ اپنی جیب سے کوئی شے نکال کر پھینکنے کی کوشش کرے گا“

جروس با دلِ ناخواستہ نوجوان کے پیچھے لپکا اور کچھ فاصلے پر موجود ایک سادہ لباس والے کو مسز ہم کے حکم کی تعمیل کا اشارہ کیا سادہ لباس والے نے اشارہ پا کر قریب سے گزرتے ہوئے سکریٹری کو فوراً حراست میں لے لیا۔

اس واقعے کے تین گھنٹے بعد مسز ہم، انسپکٹر جروس کے ساتھ اسی کمپارٹمنٹ کے پاس کھڑی تھی جس میں کمبر ہلاک ہوا تھا۔

”اس نے کمبر کو یقیناً ہلاک کیا ہے“ وہ جروس سے مخاطب ہوئی ”قتل کا محرک غیر معمولی نہیں.... بلکہ دولت کا حصول ہی اصل محرک تھا۔ قاتل نے وہ کہانی پڑھی تھی اور پھر اسے عملاً اس ٹرین پر آزمانے کی کوشش کر ڈالی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک غیر معمولی منصوبہ تھا اور بڑی چالاکی سے تشکیل دیا گیا تھا“

”لیکن اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟“ جروس اب بھی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا۔ مسز ہم کی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

”کیا کمبر اسے بلیک میل کر رہا تھا یا اس پر کوئی بندش....“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے“ مسز ہم نے اس کی بات کاٹ دی ”مسٹر کمبر کے پاس چار عدد انتہائی نادر و نایاب ٹکٹ تھے جنہیں وہ یہاں نیلام کرنے لا رہا تھا اور یہی ٹکٹ اس کی موت کا سبب بن گئے یہ ٹکٹ مورٹیس کے ڈاک خانے نے ۱۸۴۷ء میں جاری کئے تھے۔ یہ ٹکٹ غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے اور انتہائی بیش قیمت تھے۔ اس سیکریٹری نے وہ ٹکٹ یہاں ٹرین کے رُکنے پر پورٹر کے ساتھ اس کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اس کی گود سے چپکے سے اُٹھا لئے تھے“

”اس نے کس قسم کا زہر استعمال کیا ہوگا؟“ انسپکٹر جروس نے جاننا چاہا۔

”ابھی کچھ دیر قبل میں نے ماہرین کو بلا کر یہ کمپارٹمنٹ دکھایا تھا اور انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ بدرنگ گدّے اور قالین کا سبب اوزون ہے“

”اوزون؟“ جروس نے حیرت سے دیدے گھمائے۔

”ہاں یہ آکسیجن کی ایک بُودار قسم ہے“ مسز ہم نے وضاحت کی ”تمہیں ڈاکٹر کی بات یاد ہے؟ اس نے کسی بُو کا ذکر کیا تھا یہ دراصل اسی آکسیجن کی بُو تھی۔ آکسیجن کا یہ مادہ ہلکا پھلکا ہوتا

ہے اور بے ضرر تصور کیا جاتا ہے لیکن عمل ارتکاز یعنی کثیف بنا دئے جانے کے بعد یہ اتنا مُہلک ہو جاتا ہے کہ کسی انسان کو بہ آسانی ہلاک کر سکتا ہے خصوصاً دمے کے مریض کے لئے تو یہ قاتل ہے مریض اس بُری طرح کھانسنا شروع کر دیتا ہے کہ لگتا ہے اب اس کا کلیجہ باہر آ جائے گا۔ یہی کھانسی اور گھٹن اس کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔"

"خدا کی پناہ۔ کیا کیمبر کے ساتھ بھی یہی پیش آیا تھا؟" انسپکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"ہاں! یقیناً" مسز ہم نے اثبات میں سر ہلایا "اسے کثیف اوزون کے ذریعے ہلاک کیا گیا ہے اس کے لئے قاتل نے یہ طریقہ کار اپنایا کہ اس کثیف آکسیجن کو تین انچ موٹے اور تقریباً ایک فٹ لمبے سلنڈر میں بھر لیا۔ یہ وہی سلنڈر تھا جسے اس نے اسپتال میں میری نشان دہی کے بعد اپنی جیب سے نکال کر پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلنڈر کا حصول دشوار نہیں ہے دواؤں کا کوئی بھی ہول سیلر جو تمہارا واقف کار ہو بہتیں یہ سلنڈر فراہم کر سکتا ہے اور پھر اس سکریٹری کا باپ اسی پیشے سے منسلک ہے۔ بہرحال.... سکریٹری نے یہ سلنڈر اپنے بریف کیس ہی میں رکھ لیا تھا اور حسب معمول دونوں ہی اپنے اپنے کمپارٹمنٹ میں تنہا تھے اور یہ کمپارٹمنٹ آپس میں منسلک بھی تھے ٹرین کے روانہ ہوتے ہی اس نے سلنڈر کی ٹونٹی اس پائپ سے جوڑ دی جو دونوں ڈبوں سے منسلک ہوتی ہے۔ ٹرین کے شور میں سلنڈر سے آکسیجن نکلنے کی آواز دب گئی۔ رات انتہائی سرد تھی اور کیمبر کے کمپارٹمنٹ کی کھڑکیاں مضبوطی سے بند تھیں۔ لہٰذا بند کمپارٹمنٹ میں آکسیجن نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔"

"یہ سیکریٹری کافی ذہین معلوم ہوتا ہے۔" جروس نے خیال آرائی کی۔

"چرب زبان!" مسز ہم نے تصحیح کی۔ "بہرحال، دلچسپ بات یہ ہے کہ "اوزون" رنگوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور آناً فاناً رنگ اُڑا دیتا ہے جبھی اس کمپارٹمنٹ کی نشستوں کے گدے اور قالین بدرنگ ہو گئے تھے یہ اتنا کہہ کر مسز ہم نے اپنا بٹوہ کھولا اور اندر سے چار عدد ٹکٹ نکالے جو سکریٹری کے پاس سے برآمد ہوئے تھے۔ اس سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جس وقت او[زون] گیس کمپارٹمنٹ میں خارج ہونا شروع ہوئی تھی، اس و[قت] یہ چار ٹکٹ کیمبر کے ہاتھ میں تھے۔ وہ ان کا معائنہ کر رہا[تھا] شاید ان کی دلکشی اور دیدہ زیبی سے محظوظ ہو رہا ہو۔ گدے اور قالین کے ساتھ ہی ان ٹکٹوں کا رنگ بھی اُڑ گیا۔

اس نے چاروں بے رنگ ٹکٹ ہتھیلی پر رکھ کر ج[روس] کے سامنے کر دئے پھر ہنس کر بولی۔ "سیکریٹری شاید ا[ن] کی اس خصوصیت سے واقف نہیں تھا اب ان لاکھوں ٹکٹوں کی قیمت دو کوڑی بھی نہیں رہی ان بدرنگ ٹکٹو[ں] اس سے بڑا ہی خوبصورت انتقام لیا ہے۔"

جروس اثبات میں گردن ہلاتے ہلاتے یکایک سر[...] میں مصروف ہو گیا۔

"ستی اور ساوتری"

اب ستی ہے نہ کوئی ساوتری
صرف قانون کی یہ چلتی ہے
کل جو رسماً چتا میں جلتی تھی
آج جبراً وہ گھر میں جلتی ہے

"روپ مینارے"

سنگ مرمر سے یہ تراشے بدن
چلتے پھرتے یہ روپ مینارے
کون کہتا ہے سر پہ گاگر ہے
جگمگاتے کلس ہیں سونے کے

"تیراک"

بنگلہ پہ ہیں صبح فقط ڈول گری تھی
تو کنویں میں کتنے ہی جواں کود گئے تھے
بڑھیا کی مگر لاش پہ آ بیٹھے یہی لوگ
آتا ہے کسے تیرنا یہ پوچھ رہے تھے

ہیڈلائن

وہ بُری طرح چونک پڑی۔

اس وقت وہ بروکیڈ کے جالی دار پردے کی اوٹ میں کھڑی اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی وہ دونوں اسے اچانک ہی نظر آگئے تھے۔ ایملی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا نہ جانے یہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ خیال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا حتیٰ کہ اسے، ان دونوں کو دیکھتے ہوئے پورے پانچ منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں ایملی نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ وہ دونوں بڑی گہری نظروں سے اس کے گھر کا جائزہ لیتے رہے ہیں ان کی نگاہیں متلاشی اور ٹٹولنے جیسے تاثر سے بھرپور تھیں اور ایملی کو ان کا یہ انداز قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔ اتنا اجنبی اور اس قدر پُراسرار انداز، ایک تنہا عورت کی دھڑکنیں تیز کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ایملی تو سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہو گئی تھی۔

وہ دونوں صورت ہی سے آوارہ لگتے تھے۔

ان کے بال رنگے ہوئے تھے اور ان میں بے پناہ چمک تھی لباس بھی بے ڈھنگے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جیل سے فرار ہو کر کئی دنوں تک جنگلوں میں مارے مارے پھرنے کے بعد بالآخر اس علاقے میں نکل آئے ہوں۔ ان کے کانوں میں پڑے ہوئے چھلے دیکھ کر تو ایملی کے اوسان بُری طرح خطا ہو گئے تھے کیونکہ اس نے آج تک کسی شریف لڑکے کے کانوں میں چھلے نہیں دیکھے تھے۔

ایملی جانتی تھی کہ پڑوس میں مار پیٹ اور چوری چکاری کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں۔ خاص طور سے وہ اس وقت بہت دہل گئی تھی، جب چرچ سے آنے والی دو عورتوں نے اسے بتایا تھا کہ کس طرح غنڈوں نے ان کے پرس چھین لیے تھے۔

کھڑکی کی اوٹ میں پسینہ پسینہ کھڑی ایملی نے خود کو سنبھالنا شروع کر دیا وہ جانتی تھی کہ اگر بدقسمتی دشمن کے دروازے پر آ ہی گئی ہے تو یوں گھبرانے سے بات نہیں بنے گی حواس مجتمع ہونے کے بعد اس کے چہرے اور آنکھوں میں خود اعتمادی کی چمک پیدا ہو گئی۔

"ٹھیک ہے" وہ زیرِ لب بولی "اگر تم دونوں ہمت کر کے اندر آ بھی گئے تو میں تمہیں ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھو گے تم مجھے اپنا صحیح مدِمقابل پاؤ گے" یہ کہتے ہوئے بھی دراصل اس کے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش یہ دونوں غنڈے کسی اور طرف نکل جائیں۔ اسے بلا وجہ کی دلیری دکھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

وہ انہیں توجہ سے دیکھنے لگی ان میں سے ایک طویل قامت تھا۔ لمبے قد والا یہ نوجوان ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد گھنٹی بجاتا ہے لیکن ایملی ٹس سے مس نہیں ہوتی ... مایوس ہو کر وہ باڑ پھلانگ کر گھر کے احاطے میں آجاتا ہے اور پھر ایملی اسے مکان کے پہلو میں جاتے دیکھتی ہے حتیٰ کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ایملی تھوک نگل کر رہ گئی "تم اس گھر کو لوٹنے کی کوشش کر کے دیکھ لو"، وہ اپنی ہمت بڑھانے کے لئے بولنے لگی "میں مر جاؤں گی لیکن تمہیں کامیاب نہیں ہونے دوں گی" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اخباری سرخیاں رقص کرنے لگیں جن کے مطابق کہیں تو کوئی بیوہ، کچلی ہوئی لاش بنا دی گئی تھی اور کہیں کسی تنہا عورت کو محض چند پاؤنڈ کی خاطر زد و کوب کر کے اپاہج کر دیا گیا تھا۔

"کیا حماقت ہے" وہ اپنے خیالوں پر خود ہی ہنس پڑی "یہ سب میرے سٹھیائے ہوئے ذہن کی اختراع ہے، یہ بے ضرر سے لڑکے ہیں، محض شرارتاً یہاں گھس آئے ہوں گے اگر ضرورت پڑی تو میں چیخ و پکار کر کے انہیں بھگا دوں گی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔

اس خیال سے اسے قدرے طمانیت حاصل ہوئی اور اس کے دل کی گہرائی میں بیٹھا ہوا خوف بھی قدرے کم ہو گیا لیکن اچانک ہی اسے ایک مدھم سی سیٹی سنائی دی اور وہ بُری طرح اچھل پڑی وہ دوبارہ پردے کی اوٹ سے لپے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔

پستہ قد کا نوجوان اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا گیٹ پر دوسرا نوجوان کھڑا متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے میں مصروف تھا۔ سیٹی اسی نے بجائی تھی۔ غالباً اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو کوئی اشارہ دیا تھا۔ کچھ دیر وہ گیٹ کے سامنے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اپنے چیک دار بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر اس نے ایک جست لگائی اور باڑ کے اوپر سے ہوتا ہوا ایمیلی کے قیمتی گلابوں کی کیاری کے قریب پہنچ گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی گھر کے پہلو میں دوڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایمیلی نے پیتل کا ایک وزنی گلدان اٹھالیا اور دبے پاؤں چلتی ہوئی کچن تک پہنچ گئی "تمہارا کیا خیال ہے ڈیگر" کچن کی کھلی کھڑکی سے ایک نحیف آواز تیرتی ہوئی اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میرا خیال ہے، یہ کام زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا بہرحال میں مکان کے سامنے والے حصے کی جانب جا رہا ہوں۔ خیال رکھنا اگر ادھر کوئی دکھائی دے تو مجھے آواز دے دینا۔

ایمیلی نے آہستگی سے کچن کا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ اسی لمحے اس کی نگاہ ایک لڑکے پر پڑی لیکن وہ دوسرے ہی لمحے مڑ کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جبکہ دوسرا لڑکا جو کہ سیٹی بجا رہا تھا، اپنے جیکٹ کی زنجیر درست کرنے لگا۔ ایمیلی بے آواز آگے بڑھی اور اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلدان بلند کر کے پوری قوت سے لڑکے کے سر پہ دے مارا۔

لڑکا حلق سے آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گیا۔

"تمہاری یہی سزا تھی" وہ ہانپتی ہوئی بڑبڑائی "مجھے لوٹنے آئے تھے مردود۔ اب دیکھتی ہوں کہ اخبار کی سرخیاں کیا کہتی ہیں۔ یقیناً یہی کہ ایک بڑھیا نے ایک جوان لٹیرے کو ہلاک کر دیا" یکایک اسے دوسرے لڑکے کے قدموں کی آواز سنائی دی وہ واپس جا رہا تھا۔ ایمیلی جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گئی اور جونہی وہ اس کے قریب پہنچا اس نے وزنی گلدان بلند کیا اور اس کے سر پہ دے مارا۔

ضرب پیشانی پر لگی تھی۔ لڑکا شدتِ کرب سے دوہرا ہو کر ساکت ہو گیا۔

ایمیلی نے گلدان ایک طرف پھینکا اور مکان کے پہلو سے دوڑتی ہوئی روش تک آگئی۔ اور اچانک ہی جونک میں ایک طویل قامت آدمی سے اس بُری طرح ٹکرا گئی کہ اس شخص کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے رنگوں کے ڈبے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئے

"کیا ہوا مسز ایمیلی ..." وہ بوکھلا کر بولا "میں ٹیڈ ہوں اور میرا تعلق اس انجمن سے ہے جو ضعیفوں کے لئے فلاحی کام انجام دیتی ہے"

"مم... میرے مکان... مکان کے عقبی باغیچے میں دو لٹیرے موجود ہیں" مسز ایمیلی وحشت بھری آواز میں چیخ پڑی

ٹیڈ بے اختیار ہنس پڑا "ارے شاید آپ کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہوگی وہ میرے ماتحت ہیں اور آپ کے باغیچے کی صفائی کرنے آئے ہیں۔ بے حد محنتی اور پھرتیلے لڑکے ہیں۔ وہ آپ کے مکان پہ رنگ و روغن بھی کریں گے ہم نے آپ کو اپنی آمد سے آگاہ تو کیا تھا لیکن شاید آپ بھول گئیں"

"او میرے خدا..." مسز ایمیلی کے منہ سے وحشت بھری ایک چیخ نکلی "میری یادداشت..." اس نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیا۔ ●

APRIL 1983 | Phone : 273602 | Regd. No. D-(DN)370

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57







ذرا ٹھہریئے!

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴/۶۲ رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۷۰/D N

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے نیا ؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں

ماہنامہ
شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زر سالانہ -/۲۴ روپے
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴۲ | مئی ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۵

آگ

توصیف علوی عاصی بی۔ اے
کیرانوی

جب چمن میں اپنا رنگ و روپ دکھلاتی ہے آگ
بجلیوں ہی سے نہیں پھولوں سے لگ جاتی ہے آگ

باغباں اپنی جگہ ہے پاسباں اپنی جگہ ..
کام جو کرنا ہے ہر طرح سے کر جاتی ہے آگ

کھیلنا پڑتا ہے پہلے آتشِ نمرود سے
یوں نہیں گلزارِ ابراہیم بن جاتی ہے آگ

سرد کر دیتی ہے ہر اٹھتے ہوئے طوفان کو
جب شکستہ کشتیوں کے دل میں لگ جاتی ہے آگ

کیا ضرورت ہے کسی اب اور محشر کے لئے
اک قیامت روز جب اس دور میں ڈھاتی ہے آگ

اس سے اہلِ دیر کا دامن بھی تو بچتا نہیں
جب کبھی صحنِ حرم میں شعلے بھڑکاتی ہے آگ

جس سے وابستہ ہے ہر روداد فصلِ گلستاں
کیوں اسی شاخِ نشیمن کو جلا جاتی ہے آگ

کس طرح ہوگی مرتب ان سے تاریخ بہار
داستانیں جو چمن میں چھوڑ کر جاتی ہے آگ

بجلیاں دامن میں ہیں ہر ناخدا کے آج کل
اور ہر ساحل کے پہلو میں نظر آتی ہے آگ

خود الجھ جاتے ہیں باہم جس سے اہلِ گلستاں
صحنِ گلشن میں کچھ ایسے گل کھلا جاتی ہے آگ

اس کی تاویلات میں صدیاں لگا کرتی ہیں پھر
جو کرشمہ چند لمحوں میں دکھا جاتی ہے آگ

یوں تو کانٹوں ہی کی جانب ہوتا ہے شعلوں کا رخ
روپ پھولوں کو بھی لیکن خوب دکھلاتی ہے آگ

بات دیوانوں کی چھوڑو وہ بھی ہوگا کوئی دور
اب تو فرزانوں کے دامن میں جنم پاتی ہے آگ

بھانپ لیتی ہے وہ جب اربابِ گلشن کی نظر
پھر گلستاں میں ہر اک پہلو سے اِٹھلاتی ہے آگ

ڈھیر ہو جاتا ہے عاصی پھر تو خوابوں کا محل
جب کبھی جذبات کی دنیا میں لگ جاتی ہے آگ

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند لیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔



ہم تمام رکاوٹوں کو پار کر سکتے ہیں....

نویں ایشیائی کھیلوں کی میزبانی میں بھارت کو جو شاندار کامیابی ہوئی ہے اس نے اس سے
متعلق تاریک پہلو دیکھنے والوں کے تمام خدشے باطل کر دیئے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے؟

واضح مقصد اور ڈسپلن کے احساس کے ساتھ سخت محنت:

یہ وہ یادگار اور فرض کا احساس ہے جو وزیر اعظم اندرا گاندھی نے نیا
20 نکاتی پروگرام شروع کرتے وقت قوم کو دیا تھا۔
اس احساس کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہوئے ریکارڈ مدت میں عالی شان
اسٹیڈیم تعمیر کئے اور باکمال صلاحیت کے ساتھ کھیلوں کا انتظام کیا۔
جو کچھ ہم نے ایشیاڈ کے لئے کر دکھایا
وہ چھٹے پانچ سالہ منصوبہ اور 20 نکاتی پروگرام
کے لئے بھی کر سکتے ہیں۔



آیئے ہم سب مل جل کر اپنے
وطن کو مضبوط بنائیں

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد؟

کے۔ کے کھنّر اور ان کے طنبوروں کے ہاتھوں میرؔ کی پگڑی خطرے میں

مسٹر کھنّر کے مضمون "پگڑی اپنی سنبھالیو اے میرؔ" پر روزنامہ قومی آواز اور دیگر رسائل و جرائد میں جو دلچسپ بحث چھڑی ہوئی ہے اس میں بعض غلط باتوں پر اصرار کیا جا رہا ہے جن کی صحت ضروری ہے کیوں کہ کھنّر صاحب تو اپنی بے علمی اور کج فہمی کے باوجود احمقانہ انداز میں اردو کے ادیب ہی نہیں بلکہ "عظیم ادیب" بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور انہیں عظیم ادیب ثابت کرنے یا منوانے پر ان کے کچھ طنبورے بھی میدان میں اتر آئے ہیں۔ حالاں کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب کوئی موسیقار خود ہی بے سُرا ہوگا تو اُسے ساز ندے یا ساز کیا سنبھالا دے سکتے ہیں۔

محمد فاضل صاحب کا خط قومی آواز کی اشاعت ۱۸ اپریل میں شائع ہوا اس کے جواب میں رئیس عالم صاحب کا خط ۲۸ اپریل اور حیدر دہلوی کا خط ۲۹ اپریل کے قومی آواز میں شائع ہوا۔ موخرالذکر دونوں مراسلے مسٹر کھنّر کی صفائی میں لکھے گئے ہیں اور واقعی ان مراسلوں نے کھنّر صاحب کی مضمون نگاری کا ایسا صفایا کر دیا ہے کہ اگر انہیں اپنی عزت کا ذرا سا بھی خیال ہو تو اردو مضمون نگاری سے توبہ کر لیں اور اس کے ساتھ ہی رئیس عالم اور حیدر دہلوی ایسی کچھیوں کو اُکھاڑ پھینکیں۔ کیوں کہ یہ دیمک خوردہ کچھیاں خود ان کے لئے نقصان دہ ہیں۔

چنانچہ جیسی روح ویسے فرشتے کے مصداق مسٹر کھنّر سے جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں ان دونوں مراسلہ نگاروں

نے ان پر مزید اضافہ فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر رئیس عالم لکھتے ہیں۔ کھنّر نے اپنے مضمون کے عنوان کے طور پر میرؔ کا جو مصرع استعمال کیا ہے وہ کلیاتِ میرؔ کے مختلف نسخوں میں مختلف انداز سے پایا جاتا ہے۔ حیدر دہلوی نے بھی اپنے خط میں اس مصرع کو میرؔ کا مصرع کہا ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رئیس عالم اور حیدر دہلوی نے کبھی "کلیاتِ میرؔ" کی ورق گردانی بھی نہیں کی ہوگی مطالعہ تو بہت دور کی بات ہے ہم رئیس عالم صاحب (اگر ان کا کوئی وجود ہے تو) کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کلیاتِ میرؔ سے اس مصرع کا حوالہ دیں اور ایڈیشن نیز صفحہ نمبر بھی لکھیں تعجب ہے ان لوگوں کو اتنی بات بھی معلوم نہیں کہ جس مصرع کو یہ دونوں حضرات بار بار میرؔ کا مصرع لکھ رہے ہیں وہ میرؔ کا مصرع ہے ہی نہیں۔ یہ دراصل بقاء اللہ خاں بقا کا مصرع ہے جو میرؔ کے خلاف لکھا گیا تھا۔ یہ مصرع ایک قطعہ میں آیا ہے۔ پورا قطعہ یوں ہے ؎

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے   چلے بیٹھے تو شیخ جیلی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میرؔ   اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

مسٹر کھنّر اور ان کے حمایتی مراسلہ نگار "آبِ حیات" مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۲۲۰ پر اس قطعہ کو ملاحظہ فرما کر اپنی بینائی روشن کر سکتے ہیں اور اگر خدا انہیں ہمت دے تو اپنی غلط بیانی اور کج فہمی کی اصلاح فرمالیں۔

صاف ظاہر ہے کہ محمد فاضل صاحب نے اپنے خط میں جو مصرع درج کیا ہے یعنی "پگڑی اپنی سنبھالیئے گا میرؔ" وہی اس کی اصلی شکل ہے اس مشہور مصرع کا جو ستیاناس مسٹر کھنّر نے کیا ہے اور اس کا جو سوا ستیاناس صفائی کے مراسلہ نگاروں (اگر ان کا وجود ... [illegible]

کم فکری اور بے علمی کی وجہ سے ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسٹر کھنّر کا مضمون اغلاط سے پُر ہے اور رئیس عالم اور حیدر ردولوی نے ان کی صفائی پیش کرتے ہوئے مزید اغلاط ان سے منسوب کر دی ہیں۔ محمد فاضل نے اعتراض کیا تھا کہ فورٹ ولیم کالج سے میر کا کلیات چھپنے پر انگریز پرنسپل کی آنکھوں میں آنسو آجانے والی روایت جو مسٹر کھنّر نے بیان کی ہے گپ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی (ویسے کھنّر صاحب کی گپ بازی کافی ہاؤس میں کافی مشہور ہے۔ کچھ احباب نے بتایا کہ جب سے شانِ ہند میں کھنّر صاحب کی حماقتوں کا پول کھولا جا رہا ہے کھنّر صاحب نے کافی ہاؤس میں آنا قریب قریب بند کر دیا ہے اور ان کے متعدد چمچے مُفت کی کافی سے محروم ہو گئے ہیں)

رئیس عالم فرماتے ہیں "پرنسپل سے کھنّر کی مراد ریورنڈ ڈیوڈ براؤن ہے" یہ وضاحت ہی طفلانہ ہے کیوں کہ کھنّر نے تو صرف "پرنسپل" لکھا ہے نام نہیں لکھا ہے کیا رئیس عالم کو یہ نام رازداری میں معلوم ہوا (اصل بحث نام سے نہیں بحث اس سے ہے کہ ایسا کون سا رقیق القلب پرنسپل تھا جو میر کا کلام پڑھ کر رونے لگا۔ یہ روایت کھنّر نے کہاں سے نقل کی ہے؟ ان کا فرض ہے کہ وہ اس کا حوالہ دیں۔

(ویسے کھنّر صاحب کے ایک دوست کا فرمان ہے کہ انہیں کھنّر نے بتایا کہ خود انہوں نے اپنے رومال سے اس انگریز پرنسپل کے آنسو پونچھے تھے)

ہمیں یقین ہے کہ مسٹر کھنّر یا ان کے مُراسلہ نگاروں نے فورٹ ولیم کالج کے چھپے ہوئے کلیاتِ میر کو دیکھا ہی نہیں۔ اگر انہوں نے اسے ایک نظر بھی دیکھا ہوتا تو ان کو خود بخود معلوم ہو جاتا کہ وہ کیسی بے بنیاد اور احمقانہ باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کلیات ۱۸۱۱ء مطابق ۱۲۲۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اور ۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر جو عبارت ہے اس میں چار انگریز والوں کے نام آتے ہیں۔ کپتان ٹیلر، ڈاکٹر ولیم ہنٹر، کپتان گالوی اور کپتان ٹامس روبک۔ اس میں کسی "ریورنڈ ڈیوڈ براؤن" کا نام درج نہیں ہے۔ نسخہ فورٹ ولیم میں یہ بھی درج نہیں کہ کلام میر دیکھ کر انگریز پرنسپل رونے لگا

مسٹر کھنّر نے یہ مضحکہ خیز روایت کہاں سے لی ہے۔ حیدر ردولوی کو چاہئے کہ اس کا ثبوت پیش کریں۔ حیدر ردولوی کا احتجاج برحق ہے کیونکہ محمد فاضل نے یہ غضب کیا ہے کہ انہوں نے اپنے خط میں مسٹر کھنّر کی ایسی ایسی غلطیاں پکڑی ہیں کہ اگر بچّے بھی مکتب میں مضمون نویسی کی مشق کرتے ہوئے ایسی غلطیوں کے مُرتکب ہوں تو انہیں کان پکڑنے پڑتے ہیں۔ رئیس عالم لکھتے ہیں کہ سادہ لوح کے معنی سیدھا سادہ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن میر کو سادہ لوح کوئی سادہ لوح مصنف ہی لکھ سکتا ہے کاش رئیس عالم فرہنگِ آصفیہ جلد سوم کا صفحہ ۵۳۸ ہی ملاحظہ فرما لیتے جہاں سادہ لوح کے پہلے چار معنی یوں دیئے ہوئے ہیں۔ کورا۔ بے وقوف۔ نادان۔ مورکھ اور پانچویں معنی ہیں "بھولا بھالا" اس ترتیب سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر یہ لفظ "بے وقوف" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یہ مسٹر کھنّر کی سادہ لوحی ہے کہ وہ میر تقی میر کو سادہ لوح لکھتے ہیں اس اعتبار سے اگر رئیس عالم کو کوئی ذات شریف کہے تو انہیں تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ ان باتوں سے ظاہر ہے کہ رئیس عالم اور حیدر ردولوی نے بغیر اصلیت کو پرکھے محض مدافعت کے جوش میں مراسلہ نگاری فرمائی ہے۔ حیدر دہلوی کے خط میں تو محمد فاضل پر ذاتی حملے بھی کئے گئے ہیں اور کج بحثی بھی کی گئی ہے ہم نے محمد فاضل کا خط اس نظر سے دوبارہ پڑھا اس میں ذاتی نوعیت کی کوئی بات نہیں ہے انہوں نے صرف علمی بحث کی ہے لیکن مراسلہ نگاروں کے پاس چونکہ علمی جواب نہیں تھا انہوں نے بجائے دلائل اور حقائق کا سہارا لینے کے کج بحثی فرمائی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے: کیا اس سچائی سے کسی کو انکار ہے کہ روزنامہ انقلاب بمبئی کے ۹ر اگست ۱۹۸۲ء کے شمارے میں مشہور انشائیہ نگار یوسف ناظم نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مسٹر کھنّر نے اپنے کئی مضامین میں ان کی آٹھ سال پہلے کی چھپی ہوئی کتاب "فقط" سے کئی جملے چرائے ہیں۔ یوسف ناظم کا یہ مضمون روزنامہ انقلاب بمبئی کے بعد "شانِ ہند" اور "اداس نسلیں" میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس حقیقت سے اُردو دنیا واقف ہے کہ مسٹر کھنّر نے

...ف ناظم کے چھپنے سے چھپنے بغیر کسی حوالے کے ہضم کر لئے ہیں
...بات کا ذکر یوں ضروری ہے کہ مسٹر کھلر نے اپنے میر تقی میر
...ے مضمون میں بھی کئی بیانات جمل کے توں آب حیات سے
...ہیں اور محمد حسین آزاد کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

ظاہر ہے کہ کج بحثی سے مسٹر کھلر کی غلطیوں پہ پردہ نہیں
...ڈالا جا سکتا۔ جو شخص میر کو بلبلوں اور عندلیبوں کا شاعر
...ہا ہو یعنی بلبل اور عندلیب کو الگ الگ پرندہ سمجھتا ہو
...جو لکھتا ہو "میر کی حیاتی میں کئی جنگیں ہوئیں" یا جو میر کی
...ان میں کچھو چھپوری کا اثر دیکھتا ہو یا جو میر کے دیباس میں
...ٹ کو شامل سمجھتا ہو یا جو گنگا اور گومتی جیسے مشہور دریاؤں
...فرق نہ کر سکتا ہو، ایسے شخص کے مضمون کا علمی پایہ
...ہوگا۔ اس کا فیصلہ قومی آواز کے قارئین خود کر سکتے ہیں
...ے شخص کے مضمون کی غلطیاں گنوا کر جو خود کو اردو کا بہت
...ادیب سمجھتا ہو اور جس کے عہدے کی وجہ سے خوشامدیوں
...ایک حلقہ ہر وقت اس کے چاروں طرف رہتا ہو۔ محمود فاضل
...جس حق گوئی اور جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے
...اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔ مسٹر کھلر کو چاہئے کہ
...ے مضمون لکھنے سے پہلے وہ طے فرمائیں کہ سنجیدہ تنقیدی
...مون لکھ رہے ہیں یا مزاحیہ مضمون۔ اگر سنجیدہ مضمون لکھ
...ہے ہیں تو دو چار پڑھے لکھے لوگوں کو دکھا لیا کریں یا ڈاکٹر
...ر دنیس کے ہاں تاش قند بھجوا کر اپنی غلطیوں کی اصلاح
...والیا کریں اور اگر مزاحیہ میں خامہ فرسائی کی گئی ہو تو اپنے
...ست فکر تونسوی سے رجوع فرمایا کریں تاکہ وہ قومی آواز
...نا اشاعت کے قابل ہو جائیں۔

اس ضمن میں ہمیں قومی آواز لکھنؤ کے ادارتی ذمہ داریوں
...سنبھالنے والے حضرات سے بھی یہ کہنا ہے کہ انہوں نے کھلر
...صاحب کا مضمون اپنے ہفتہ وار ضمیمہ میں شائع کر کے نہ صرف
...قومی آواز کی ساکھ اور معیار کو گرایا ہے بلکہ علے الاعلان
...یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ادارے کا کوئی کارکن کسی ذاتی مفاد کے
...تحت مجبور تھا کہ وہ کھلر کے اس احمقانہ مضمون کو صفحہ اول پہ
...شائع کر کے اپنے مفاد کی خاطر قومی آواز ادارے کی علمی و ادبی
...ساکھ کو نقصان پہنچائے۔

●●

(صفحہ کا بقیہ)

ہوتا ہے اس کا یہ چیک لیجئے۔ اور جو بقایا رہ گیا ہے وہ حسب وعدہ ایک ہزار روپیہ ماہوار آپ کو ملتا رہے گا۔ جے۔ این بسنگھ والوں نے حافظ صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا کہ ہمیں آپ کو سمجھنے میں غلطی ہو گئی، معاف کر دیجئے اور پھر سے حسب سابق کاغذ کا لین دین جاری کر دیجئے مگر حافظ صاحب نے فرمایا کہ آپ کا قرض ادا کرنا میرا فرض ہے۔ مگر میں اب کاغذ آپ سے کبھی نہیں خریدوں گا۔

جے۔ این۔ سنگھ کے سب بزرگ مالکان انتقال فرما چکے ہیں اور جے۔ این۔ سنگھ والوں کا کاروباری ستارہ جو اس وقت نصف النہار پر تھا اب ڈھل چکا ہے مگر اس فرم کے دیرینہ ملازمین اب بھی حافظ صاحب کی دیانت داری اور ہلیان داری کا تذکرہ اپنے نادہند گاہکوں سے کرتے ہوئے انہیں حافظ صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ●●

(صفحہ کا بقیہ)

دلہن کی ڈولی اٹھی اور آج ہی واپس آئی۔

دلہن نے سب کو تسلی دیتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ لڑکی کے پتا جی نے کہا۔ تمہارے وچن کا پالن کروں گا، بھگوان کی کرپا سے پل کی تیاری کا کام کل سے ہی شروع ہو جائے گا اور بھگوان کی دیا سے تمہاری ڈولی پانی میں اترنے کی بجائے پل پر سے گزر کر سسرال میں جائے گی۔

اپنے داماد سے کہا میاں تم نے بات ماری ہے۔ اپنی بیٹی کو طعنہ دیا ہے بہرحال میرے بیٹے ہو میں نے برا نہیں مانا تم سسرال میں بصد شوق آتے جاتے رہیں۔ مگر جب تک پل تیار نہیں ہو گی بیٹی کی رخصتی نہیں ہو گی۔ بہرحال اپنے وقت پر پل تیار ہو گیا اور دلہن لاڈو کی ڈولی اسی پل کے اوپر سے گزر کر سسرال پہنچی اور اسی لئے اس پل کا نام "لاڈو کی پل" اور مریا کا نام "لاڈو کی تالی" ہے۔

●●

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

ماہنامہ "شمع" کے مالکان پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فلم سازی کے باعث انہیں اٹھائیس لاکھ روپیہ کا نقصان ہونے کی وجہ سے "شمع معمہ" کے انعامات کی ادائیگی تک کرنا بھی مشکل ہوگئی مگر مرحوم حافظ محمد یوسف دہلوی کی قوتِ ارادی، بلند حوصلگی اور دیانت داری کے باعث رب العزت نے انہیں اس کڑے امتحان میں بھی سرخرو رکھا۔

انہی دنوں دہلی کے مشہور کاغذی میسرز جے۔ این۔ سنگھ کا بھی کافی روپیہ "شمع" کے ذمے واجب الادا ہوگیا تو میسرز جے این سنگھ نے روپیہ کی فوری ادائیگی کے لئے "شمع" کو نوٹس دیا۔ نوٹس موصول ہونے پر حافظ صاحب میسرز جے۔ این۔ سنگھ کے مالکان سے ملے اور یہ طے پایا کہ آئندہ ہر ماہ کا غذ نقد خریدا جائے گا اور سابقہ بقایا میں سے ایک ہزار روپیہ ماہوار ادائیگی ہوتی رہے گی مگر اس باہمی فیصلہ کے باوجود میسرز جے۔ این۔ سنگھ والوں نے "شمع" پر دیوانی مقدمہ دائر کردیا۔ عدالت سے سمن موصول ہونے پر حافظ صاحب پھر مالکان میسرز جے۔ این۔ سنگھ کے ہاں گئے اور ان سے باہمی فیصلہ ہوجانے کے باوجود مقدمہ دائر کرنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگے کہ روپیہ وصولی کی میعاد تین سال پوری ہو رہی تھی اس لئے مقدمہ دائر کرنا ضروری تھا۔ حافظ صاحب نے کہا کہ یہ معمولی بات تھی میعاد گزر بھی جاتی تو کیا تھا باہمی فیصلہ کے مطابق آپ کو ہر ماہ ایک ہزار روپیہ ادا ہوتا رہتا اور اگر آپ کو بے اعتمادی تھی تو کاغذات نئے سرے سے تحریر کئے جاسکتے تھے۔ مگر جب ستارہ گردش میں ہوتا ہے تو دیرینہ دوست بھی منہ پھیر لیتے ہیں۔ لہٰذا میسرز جے۔ این۔ سنگھ کے مالکان نے گزشتہ چوتھائی صدی کے تعلقات کو پس پشت ڈالتے ہوئے عدالتی کارروائی کو حق بجانب قرار دیا۔

تاریخ مقررہ پر حافظ صاحب وکیل کی معیت میں عدالت میں پیش ہوئے اور جواب دعویٰ پیش کردیا اور عدالت نے آئندہ پیشی ڈال دی۔ دیوانی مقدمات کچھ تو ویسے طوالت کھینچ لیتے ہیں اور اس پر حافظ صاحب نے اپنے وکیل کو ہدایت کی کہ جیسے بھی ہو مقدمہ کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے۔ لہٰذا عدالتی کارروائی کچھوے کی چال چلتی رہی ادھر حافظ صاحب نے کاغذ کا لین دین کسی دوسری فرم سے طے کرلیا مگر جے۔ این۔ سنگھ والوں کے لئے ایک ہزار روپیہ ہر ماہ بینک میں الگ جمع کراتے رہے۔ کافی طویل عرصہ کے بعد مقدمہ کا جب فیصلہ ہوا تو وہ جے۔ این۔ سنگھ والوں کے خلاف تھا اس پر بھی حافظ صاحب نے جے۔ این۔ سنگھ والوں سے کہا کہ میں اب بھی باہمی فیصلہ پر قائم ہوں لہٰذا ایک ہزار روپیہ ماہوار کے حساب سے جو روپیہ جمع ہے وہ لے لیجئے اور باقی روپیہ ہر ماہ ایک ہزار کے حساب ادا ہوتا رہے گا مگر جے۔ این۔ سنگھ والوں نے کہا کہ وہ مقدمہ کے جملہ اخراجات کے علاوہ روپیہ کا سود بھی لیں گے۔ اس پر حافظ صاحب خاموش ہو رہے اور جے۔ این۔ سنگھ والوں نے عدالتی فیصلہ کے خلاف اپیل کردی۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اس اپیل کا فیصلہ بھی جے۔ این۔ سنگھ والوں کے خلاف ہوا۔ مدعی اپیل کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں جا سکتا تھا مگر اس سلسلے کی کئی قانونی رکاوٹیں ایسی تھیں کہ مدعی نے ہائی کورٹ نہ جانا ہی مناسب سمجھا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ جب جے۔ این۔ سنگھ والوں کو اچھی طرح یہ ذہن نشین ہوگیا کہ اب یہ روپیہ وصول ہونے کی کوئی امید نہیں تو اچانک حافظ صاحب ان کے ہاں گئے اور کہا کہ باہمی فیصلہ کے مطابق ایک ہزار روپیہ کے حساب سے اب تک جو روپیہ

(باقی صـ ۵ پر)

لاڈو کی نالی

حاجی انجم وزیر آبادی
(لاہور)

سیالکوٹ جاتے ہوئے راستہ میں سوہدرہ کو پیا (؟) کا ریلوے اسٹیشن بھی پڑتا ہے۔ سوہدرہ دراصل لفظ ہے ستودرہ راجاؤں اور مغلوں کے دور میں ممکن ہے اس شہر کے دروازے یک صد ہوں جس کی بنا پر اسے سوہدرہ کہا جاتا ہے شہر موجود ہے اور اس کے گرد و نواح میں آثارِ قدیمہ بھی پائے جاتے ہیں۔ باغات کی پرانی روشیں، قدیمی حویلیوں اور محلات کے نشانات وغیرہ وغیرہ۔ ممکن ہے سوہدرہ بھی گردشِ دوراں کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ وزیر آباد سے سوہدرہ جاتے ہوئے راستہ میں ایک نالہ پڑتا ہے جو اب تک "لاڈو کی نالی یا لاڈو کی پُلی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سیالکوٹ سے نالہ ڈیک بھی اسی ندی میں آگرتا ہے اور پھر یہ دونوں ندیاں مل کر ملکھو میں شامل ہو جاتی ہیں۔ قدیمی طرز کا اس ندی پر جو پُل بنایا گیا تھا اس کا نام بھی لاڈو کا پُل ہے۔ سُنا ہے اور شاید کہیں پڑھا بھی ہے کہ گجرات (پاکستان) کے ولی اللہ حضرت پیر شاہ دھولہ ولی اپنے وقت کے ایک قابل ترین انجینیر بھی تھے۔ پُل نالہ ڈیگ اور پُل لاڈو کی ندی پر آپ ہی کے زیرِ اہتمام تیار ہوئے تھے۔ ندی کے پھیلاؤ، کٹاؤ طغیانیوں کی وجہ سے لاڈو کا پُرانا پُل تو اب موجود نہیں البتہ اس کے محرابی دروازے پانی کے نکاسی کے لیے اب بھی موجود ہیں اور اس قدر مضبوط ہیں کہ جیسے وہ حال ہی میں تیار کرائے گئے ہوں۔ ہاں تو اب لاڈو کی نالی کی وجہ تسمیہ بھی سُن لیجئے۔

سوہدرہ میں ہندو جاتی میں کسی لڑکی کی شادی تھی۔ برات آئی، اس کی خاطر خواہ تواضع کی گئی، بینڈ باجا اور شہنائیاں بجیں، نقارے گونجے، لگن منڈل کی رسومات ادا ہو گئیں، وقت خوش اسلوبی اور ہنسی خوشی گزرا، صبح برات کی روانگی ہوئی، دلہن ڈولی میں بیٹھ گئی اور دولہا میاں گھوڑے پر سوار تھے، برات سوہدرہ سے وزیر آباد واپس آرہی تھی، چلتے چلتے کہار رک گئے۔ اور دلہن کی پالکی کو ایک طرف رکھ کر کہاروں نے لنگر لنگوٹا کسنا شروع کیا، جوتے اتارے، پاجامے اوپر چڑھائے بلبے پلبلس تھامے پانی کی گہرائی کا جائزہ لینے کے لئے۔

دلہن نے کہاروں سے دریافت کیا "ڈولی کیوں رک گئی ہے" جواب ملا، ندی ہے اور پانی چڑھا ہوا ہے اور جل کا دھارا بڑے زور کا ہے کہار۔ اب تیاری کر رہے ہیں تاکہ ڈولی کو بحفاظت اُس پار لے جائیں۔ دلہن بولی "ارے رام رام مجھے تو پانی سے ڈر لگتا ہے کوئی اور راستہ نہیں جو جا سکا ہو" دلہا میاں نے بھی دلہن کے الفاظ سن لئے انہوں نے آوازہ کسا۔ پانی سے اگر اس قدر ڈرتی ہو تو شادی سے پہلے اپنے پتا کو کہہ دینا تھا کہ پہلے ندی پر پُل بنوا دے اور اس کے بعد اپنی لاڈلی کی ڈولی روانہ کرے۔ دلہن بولی پُل اب بھی بن سکتا ہے۔ کہارو آگے نہیں بڑھنا چلو ڈولی جہاں سے اُٹھائی تھی وہیں واپس چھوڑ آؤ۔ میرے پتا جی اس ندی پر پُل بنوا دیں گے تو ڈولی اُسی پل سے گزر کر سسرال جائے گی۔ میں اپنے پتا سمان براتیوں اور بھائیوں سے نیز اپنے پتی مہاراج سے معافی چاہتی ہوں مگر میری آواز اٹل ہے اور میرا سخن پتھر پر لکیر ہے، براتیوں نے، رشتہ داروں نے کہاروں نے سلامتی کی تسلی دی، دلہا میاں نے کہا کہ میں الفاظ واپس لیتا ہوں، مگر دلہن نہ مانی، براتی واپس آئے، ڈولی واپس آئی، گھر والے محلہ والے رشتہ دار حیران و ششدر رہ گئے کہ یہ کیا ہوا۔ آج ہی

(باقی صفحہ پر)

غزلیات

ڈاکٹر شگفتہ
کوروکشیتر یونیورسٹی

بے کار ہے منطق کا یہ قصۂ طولانی
سلجھے ہیں نہ سلجھیں گے اسرارِ جہاں بانی
ہمت سے ثریا تک انسان پہنچتا ہے
ہمت ہی سے ہوتی ہے آسان پریشانی
معیارِ فراست سے انسان اگر ناپے
اس زیست کی صہبا کا ہر گھونٹ ہے لاثانی
ہاں خاک میں ملنا ہی انسان کا مقدر ہے
مفلس کہ تونگر ہو ادنیٰ ہو کہ خاقانی
کب روح سے اترے گا پیراہنِ مادیت!
کب قید سے چھوٹیں گے احساس کے زندانی؟
میں ذاتِ معلیٰ ہوں، میں نور سراپا ہوں
آزادِ تناسخ ہوں، ہے کون مرا ثانی؟
اس قوم کی قسمت کا ہوتا ہے خدا حافظ
جو قوم کہ ہوتی ہے مشتاقِ تنِ آسانی
کردار سے ننگی ہے گفتار سے ننگی ہے
تہذیب کی دنیا کی اللہ رے عریانی
گو کارِ جہاں بینی مشکل ہے بہت شگفتہ
اس سے بھی مگر مشکل ہے کارِ جہاں بانی

قمر ایولوی بی۔ اے
(پال گھر)

کیا بہاروں کا نہیں ہوتا گزر اس شہر میں؟
سوکھا سوکھا دیکھتا ہوں ہر شجر اس شہر میں
اپنے ہی حالِ پریشاں میں ہیں سب الجھے ہوئے
کب کسی کی کوئی لیتا ہے خبر اس شہر میں
جذبۂ جہد و عمل انسان میں مفقود ہے
ایک زندہ لاش ہے ہر اک بشر اس شہر میں
ہے تگ و دو از سحر تا شام روزی کے لئے
پھر بھی خالی پیٹ ہیں اہلِ ہنر اس شہر میں
بے کسی بے مائیگی ہے روزِ روشن کی طرح
جاں کراں جاں ہیں اہلِ نظر اس شہر میں
شیطنت سے جن کی ہے مجروح انساں کا وقار
بن گئے وہ غم گسارانِ بشر اس شہر میں
نورِ الفت نفرتوں کے بادلوں کی زد پہ ہے
کس قدر بے نور لگتا ہے قمرؔ اس شہر میں

مقبول نصر باندوی

آواز یہ کس کی ہے کہ دل ڈول رہا ہے
کل تک تھا محبت پہ مری ناز اسی کو
اس آئینۂ دل کو مرے توڑ نہ ظالم
اڑ جائے کسی روز قفس ہی کو نہ لے کر
کیا خاک وہ سمجھے گا مرے دل کی حقیقت
اس جاتی ہوئی رات کے عالم میں کئی راز
ہچکے ہوئے دامن سے مرے پونچھ کے آنسو
یوں دل کو حقارت سے مرے دیکھنے والے
مقبولؔ زمانے کی نگاہوں سے ہے اوجھل

کانوں میں مرے کون یہ رس گھول رہا ہے
سم آج مرے جام میں جو گھول رہا ہے
نظروں میں کبھی یہ تری انمول رہا ہے
زنداں میں پرندہ جو یہ پر تول رہا ہے
ہیرے کو جو پتھر سے یہاں تول رہا ہے
مجھ پر دلِ بیدار مرا کھول رہا ہے
وہ شوخ محبت کے گہر رول رہا ہے
پر تیری محبت سے یہ کشکول رہا ہے
وہ شخص جو شعروں میں مرے بول رہا ہے

عقیل صدیقی

گھانا کھنڈی کا مشاعرہ

کریمی الاحسانی

یہ وہ مشاعرہ ہے جو ایک ایسے گاؤں میں ہو رہا ہے جہاں کے سادہ دل، مخلص، مہمان نواز اور ادب دوست تحسین داد بھی دینا نہیں جانتے ـــــ یہ الگ بات کہ جب شعراء کرام داد دیتے تو یہ سادہ لوح تالیوں سے اظہار خوشنودی کرتے ہیں۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ اس مشاعرہ میں شعرائے کرام کو طے شدہ رقم سے بھی کچھ زیادہ ہی پیش کیا گیا ـــ اسے چھوڑیئے کہ ہی کاروباری اور پیشہ ور شعراء مطالبات کے چکر میں پھنسے الجھے اور ڈوبے رہے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ اس کی خوشی میں گاؤں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا ہر خورد و کلاں کے بشروں سے ایسی خوشی ٹپک رہی تھی جیسے کہ آج عید کا دن ہو ـــــ بجا کہ گاؤں کے چند حضرات نے شرکت نہیں کی کیوں کہ گزشتہ سال کے الیکشن نے یہ شہری وبا یہاں بھی مسلط کر دی ہے لیکن کل یہ حالات ضرور بدلیں گے ـ

یہ وہ مشاعرہ ہے جو دوپہر کے بعد صرف اس لئے شروع کیا گیا تاکہ قرب و جوار کے اردو کے پرستار دیہاتی بھی مشاعرہ کو سن سکیں اس طرح یہ لوگ مشاعرہ سے محروم نہیں ہو سکے۔

یہ وہ مشاعرہ ہے کہ جس کے لیے شعرائے کرام کو عملی طور پہ ایک امتحان سے بھی گزرنا پڑا۔ سڑک سے گاؤں تک پیدل پد یاترا کرنا پڑی حالاں کہ واپسی پر سواری کا انتظام کر دیا گیا تھا گزشتہ مشاعرہ میں سہارنپور ہی سے گاؤں تک ٹرالی میں جانا پڑا تھا ـــــ دو کلو میٹر کے سفر سے شعرائے کرام نڈھال تو نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کی پرواز فکر تو سرحدوں سے بھی کو نہیں خلاؤں کو پار کر جاتی ہے ـ پھر یہ سفر تھا ہی کیا !

یہ گاؤں گھانا کھنڈی ہے جو سہارنپور بہٹ روڈ پر جانب مشرق واقع ہے ـ آیئے تو ذرا اسکول کے میدان تک میرے ساتھ چلنے کی زحمت فرمایئے ـــــ اسکول گاؤں سے باہر ایک کنارے پر جانب غرب واقع ہے اسکول کے ایک سمت وہ معمولی ندی ہے کہ کنارے پر بڑا سادہ پنڈال اور اسٹیج بنایا گیا ہے سامعین کے لیے فرش کا انتظام بھی کیا گیا ہے جس پر دیہات کے سادہ لوح سامعین براجمان ہیں بچوں کی بھی بھاری اکثریت ہے ایک طرف مستورات بھی نظر آ رہی ہیں۔ پنڈال سے قدرے فاصلے پر ایک چائے کی دکان بھی موجود ہے $3\frac{1}{2}$ بج چکے ہیں چوں کہ مجوزہ صدر رشید مسعود ایم پی کسی مجبوری کے باعث تشریف نہیں لا سکے لہذا صدارت کے لیے شوق مانوی کے نام کا اعلان کیا جا رہا ہے جس پر تالیوں سے تائید کی جا رہی ہے اور نظامت کے فرائض ادا کرنے کے لئے مظفر رزمی مائیک پہ آ کر اسلام انجم کو دعوت غزل دے رہے ہیں۔ انجم صاحب فرما رہے ہیں ـ

تو اگر پیدا کرے نور یقین حسن نظر
خوب سے بھی خوب تر ہو زندگانی کا سفر
یہ اُجالے جو نظر آتے ہیں اب سہمے ہوئے
وقت آنے پر یہ چیریں گے اندھیروں کا جگر

داد اس شعر کا حق ہے لہذا خوب خوب داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

ناپنے والے زمین و آسماں کی وسعتیں
تو نے دیکھا بھی کبھی ہے اپنے اندر جھانک کر

پھر داد شباب پر ہے اور انجم صاحب مائک سے الگ ہو رہے ہیں ادھر ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند ہوا۔ انجم صاحب سے

تین غزلیں سُنی گئی ہیں۔ آپ تالیوں کی جھنکار میں کامران
آرہے ہیں اور ناظم صاحب جناب فواز خاں فواز دیوبندی
کو غزل سرائی کی زحمت دے رہے ہیں فواز صاحب پُر وقار
انداز سے ایک قطعہ عنایت کر رہے ہیں ؎

مِلا دے خاک میں گر راستے کی میں رکاوٹ ہوں
یہ منزل کا جو رستہ ایسا پتھر بن کے رہنے دے
میں قطرہ ہوں مجھے تسلیم کر تو سمندر ہے
مگر تشنہ لبوں میں تو سمندر بن کے رہنے دے

پہلی بار چونکے تھے مدعو، داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ یوں
گلوکاری کرنے چلے ہیں ؎

اک روز یہ بھی حال ہمارا کریں گے لوگ
پتھر اُٹھا کے راہ میں مارا کریں گے لوگ
آپس میں جب بھی ذکر تمہارا کریں گے لوگ
میری طرف ضرور اشارہ کریں گے لوگ

لیجئے اب تالیوں سے داد دی جا رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں
کہ شعراء کرام تحمل سے کام نہیں لے رہے ہیں وہ بھی داد
دینے پر مجبور ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

وہ نقش چھوڑ جاؤں گا دُنیائے عشق میں
رہ رہ کے میرا نام پکارا کریں گے لوگ
یہ کیا خبر تھی سازشِ طوفاں کے فیض سے
ساحل سے ڈوبتوں کا نظارا کریں گے لوگ

پھر داد نغمہ غزل سے سوا ہے اور آپ مقطع عطا کر رہے ہیں ؎

میں تو فواز ان پہ زمانہ نواز دوں
لیکن یہ بات کیسے گوارا کریں گے لوگ

فواز صاحب کو پھر بار بار مائک کر دیا گیا ہے اور آپ اسی سج
دھج سے غزل سرا ہیں ؎

گرد کے ہم دوستوں سے کیا کہئے
اپنا غم پتھروں سے کیا کہئے
آبلے پھوٹ پھوٹ کر روئے
سوز پا منزلوں سے کیا کہئے
ہنس کے خنجر چبھو لیا دل میں
بے ہنر قاتلوں سے کیا کہئے

لیجئے داد کا شامیانہ شکن دھماکہ ہوا ہے اور سب کی زباں
پر ہے ؎

بے ہنر قاتلوں سے کیا کہئے

ابھی ہے دیکھا تو تالیوں کے بے ہنگم شور میں مائک سے دُور
ہو رہے ہیں اور ناظم صاحب اس دردسری کو کہ اب کس
شاعر کو اس امتحان گاہ میں لایا جائے لہٰذا وہ میرے نام کا
اعلان کر کے چپ بیٹھ گئے ہیں اور میں خوش ہوں کہ چلو
جلدی چھٹکارا ہوا اور یہ بات ضرور کھٹکی کہ فواز صاحب
مشاعرہ کو بلندی سے ہمکنار کر دیا ہے مجھے کون سُنے گا۔
بہرحال جب کچھ سُنانا ہی ٹھہرا تو جب بھی ہنسا آ جائے گا
دیا جائے کہ شعر اسقام اور درجہ کی تلاش میں رہتے ہیں
یہ انداز قطعی غلط ہے تو پھر سنئے ؎

ان کے نگر کا مانا بڑا فاصلہ بھی ہے
پھر بھی دل ونظر کا کوئی رابطہ بھی ہے
شوکیس میں سجائی کتابیں کچھ اس طرح
جیسے رئیسِ شہر الف آشنا بھی ہے
یہ رہزنی کا دھندہ تو ورثے میں پایا ہے
ورنہ یقین کیجئے یہ رہنما بھی ہے

آئیے پھر ایک مترنم شاعر ماجد دیوبندی سے یہ غزل سنئے

جینا بھی آج ہو گیا دشوار کیا کریں
ہر سانس جیسے بن گئی تلوار کیا کریں
ہیں یوں تو راز دار بہت دوست بھی بہت
لیکن نہیں ہے کوئی بھی غم خوار کیا کریں

آہ اور واہ کا ایک شور سا شور ہے اور آپ لہک رہے ہیں

اپنا ہی ہوش ہے نہ زمانے کی کچھ خبر
ہم اس سے بڑھ کے تیرے طلبگار کیا کریں

پھر داد شباب پر ہے کسی من چلے نے ایک دو پیہ بطور
پیش کیا ہے جسے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا ہے اور ایک
گیت سنا کر تالیوں کے ہنگامہ میں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور
اس عالم میں نسیم عثمانی مائک پہ قبضہ جما کر محفل کا جائزہ
لے کر غزل سرا ہیں ؎

زندگی ایسے گزرتی ہے خطا ہو جیسے
ہائے اس دور میں جینا بھی سزا ہو جیسے
ان کی معصوم ادا طرزِ تکلم کے نثار
اس طرح لب پہ شکایت ہے دُعا ہو جیسے
چلتے چلتے یُں رُکا راہ میں اس طرح نسیم
اس نے بڑھ کر مرے شانوں کو چھوا ہو جیسے

نسیم صاحب بھی داد لوٹتے مائک سے کھسک رہے ہیں اور اب سہارنپور کے ایک خوش گلو شاعر محمد احمد ساحل نغمگی بکھیرنے کے لئے پر تول رہے ہیں ؎

روز لمبی اُڑان سوچے گا
بے زمین آسمان سوچے گا
میں حقیقت بتاؤں گا اس کو
اور وہ داستان سوچے گا

اس کو تازہ بیان دینا ہے
پہلے پچھلا بیان سوچے گا

داد کا شور کم ہوا تو اسی سج دھج سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

عمر کی شام ڈھلے گی تو یہ کھو جائے گی
زندگی اپنی تھکن اوڑھ کے سو جائے گی

دوسرے مصرعہ پہ پنڈال میں ایک بھونچال سا آیا ہے اور آپ اسی دلکشی سے محفل کو لوٹنے چلے ہیں ؎

ہم نشیں غور تو کر تلخ کلامی تیری
کچھ نئے تیر مرے دل میں چبھو جائے گی
موج و ساحل کی ملاقات یقینی ہے مگر
موج ساحل سے ملے گی تو بھگو جائے گی

ساحل صاحب رنگِ محفل بدل کر تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں ادھر روشن سہارنپوری بوڑھا لے کر آئے ہیں یہ ایک آزاد نظم ہے چونکہ مشاعرہ اب عروج پر ہے اس لئے وہ بات نہ بنی۔ ریاض شیرازی جونپوری تالیوں کی جھنکار میں آ گئے ہیں فرمائشوں کو نظرانداز کر کے اعتماد کے ساتھ غزل سرا ہیں ؎

اندھیرے گھر میں اُجالوں کی آس چھوڑ گیا
[illegible] سورج قیاس چھوڑ گیا

ذرا سی بات پہ اس شہرِ دل کا شہزادہ
سجی سجائی حویلی اُداس چھوڑ گیا

داد کے شور پہ یقیناً گاؤں کے لوگ اس بڑبونگ اور ہنگامہ پر ڈر گئے ہوں گے کہ یہ کیا ہو گیا کئی بار دُہرا کر اسی بانکپن سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

وہ اپنی یاد کی کوری صراحی کا پانی
ہمیں پلانے کو خالی گلاس چھوڑ گیا

پھر داد زوروں پر ہے اور آپ فاتحِ محفل بنے فرما رہے ہیں ؎

مرا وجود جلا دے نہ تشنگی کی دھوپ
وہ میری پیاس سمندر کے پاس چھوڑ گیا
برہنہ جسم نہ دیکھا گیا ریاض اس سے
وہ اپنے سائے کا مجھ پر لباس چھوڑ گیا

ریاض صاحب خوب خوب داد لوٹ کر کامران آ رہے ہیں اور اب سہارنپور کے مشہور خطاط ظہیر آسوری فرما رہے ہیں ؎

پھینکا ہے تیر اس نے ہی اپنے مکان سے
بیکار ضد زمیں کو نہیں آسمان سے
پچھتایئے ہزار کہ آنسو بہا لیے
اب تیر جا چکا ہے نکل کر کمان سے
دُنیا انہیں یہ قتل کا الزام رکھ نہ دے
اُن کی بھی آستیں پہ ہیں خوں کے نشان سے

ظہیر صاحب بھی داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور حبیب عاصم دہلوی غزل سرا ہیں ؎

یہ اور بات کہ مدت سے سامنا نہ ہوا
مگر خیال تمہارا کبھی جدا نہ ہوا
وہ کیا بتائے کہ مفہومِ زندگی کیا ہے
جو شخص دردِ محبت سے آشنا نہ ہوا

لیجئے اب داد دینے والے تالیوں پر اُتر آئے ہیں اور آپ یوں نغمگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

ہماری یاد میں بیٹھا نہ ہو اداس کوئی
یہ سوچ کر کبھی ہنسنے کا حوصلہ نہ ہوا
جتنے ہیں شہر میں سڑکوں پہ ابھی خون دیکھ
وہ دن بتاؤ کہ جب کوئی حادثہ نہ ہوا

تالیوں کے شور میں ایک گیت سُنا کر اپنی جگہ واپس آرہے ہیں
اب مشاعرہ شباب پر ہے اور منظر زیدی اسے دو آتشہ کرنے کے
لئے مائک پر آکر لحن داؤدی میں غزل چھیڑ رہے ہیں سہ

سب کو انجام سے آگاہ کئے جاتا ہے
وقت آواز پہ آواز دئے جاتا ہے
زندگی ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے مگر
آدمی ہے کہ بہرحال جئے جاتا ہے
ڈوبنے والے کو آواز کوئی دے کہ نہ دے
ڈوبنے والا تو آواز دئے جاتا ہے

زیدی صاحب اور داد۔ لازم و ملزوم۔ لہٰذا محفل پر وجدانی کیفیت طاری کرکے تالیوں کی جھنکار میں جارہے ہیں اور اب آرہے ہیں شوق مانوی۔ شوق صاحب اپنے ساتھ طوفانِ باد و باراں لے کر آئے ہیں آندھی نے شامیانہ اور پنڈال کو ہلاکر رکھ دیا ہے اور ساتھ ہی کالی گھٹا بھی جھوم کر فضا پر چھا گئی ہے۔ اس عالم میں اراکینِ مشاعرہ بھی پریشان ہیں لیکن اس کا کوئی علاج نہیں اور نہ اس کا مقابلہ ہی ہوسکتا ہے شوق صاحب نے اس عالم میں قطعات چھیڑے ہیں ادھر شامیانہ کو یار لوگوں نے تھام رکھا ہے ایک قطعہ بمشکل نقل ہوسکا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے سہ

اب کسی در پہ نہیں ملتی ہے انصاف کی بھیک
وقت آپہنچا کہ یہ رسم اُٹھا دی جائے
ہاتھ مقتولوں کے اُٹھتے ہی نہیں ہیں ورنہ
ظلم خود چیخ رہا ہے کہ سزا دی جائے

لیجئے شعراء کرام بھی اسٹیج سے ذود گیارہ ہوگئے ہیں اور شوق صاحب کو وقت کی نزاکت کا احساس تک نہیں ہے سُنائے جارہے ہیں اور میں تو ملکھنوی کے اس شعر پر مسکرا رہا ہوں سہ

میں تو غزل سُنا کے اکیلا کھڑا رہا
سب اپنے اپنے چاہنے والوں میں کھو گئے

شوق صاحب جم کا تک چلو دیا ہے اگر یہ حالات نہ بنتے تو ابھی مشاعرہ اور چلتا افسوس کہ شوق صاحب کے سنجیدہ کلام سے محروم رہ گئے آپ کے ساتھ ہی یہ شستہ۔ مہذب، پُرخلوص محفل شعر و ادب بہ مجبوری۔ بادلِ ناخواستہ ½۵ بجے شام ختم ہوگئی۔

اس سادہ اور دیہاتی مشاعرہ نے یہ ثابت کردیا کہ اب مشاعرے دیہات اور قصبات میں بھی کامیابی ہردلعزیزی اور مقبولیت حاصل کر رہے ہیں ان چھوٹی جگہوں پر ابھی خلوص اور پیار کی کارفرمائی ہے لہٰذا اب مشاعروں کا رُخ قصبات اور دیہات کی طرف موڑ دیا جائے یہاں کے مشاعرے ابھی کاروبار سے قطعاً آشنا نہیں ہیں اگر یہ مشاعرہ کسی شہر میں ہوتا تو یقیناً ہڑبونگ اور ہوٹنگ کی نذر ہوجاتا لیکن یہاں تو اسے عید کی طرح دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب اور ان کے رفقاء کار نے بڑی دل جمعی اور دل چسپی نیز بلند حوصلگی سے مشاعرہ کو کامیاب کرایا جب کہ مقامی طور پر کچھ اختلاف بھی تھا خدا کرے کہ یہ اختلاف موت کے گھاٹ اُتر جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی شعراء کو مدعو کیا مگر وہ کاروباری اور پیشہ وری کی زبان بولنے لگے یہاں بجٹ میں اتنی رقم کی گنجائش نہ تھی لہٰذا ایسے شعراء کو نظرانداز کر دیا اور ع

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

اچھا خُدا حافظ۔ ع
پھر ملوں گا ذرا سا دم لے کر

بڑھاپا

سلمان بٹ

اگرچہ ابھی ہم بڑھاپے کی حدود میں پوری طرح داخل نہیں ہوئے۔ لیکن ذہن نہ جانے کیوں قبل از وقت ہی فکرمند ہوگیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بڑھاپا پہلے دماغ پہ حملہ آور ہوتا ہے بعد میں جسم کا رُخ کرتا ہے۔ یعنی انسان اسی وقت بوڑھا ہونا شروع ہوتا ہے۔ جب وہ خود کو بوڑھا تصور کرنے لگتا ہے۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے بھی ہم مجبور ہیں کہ خود کو بڑھاپے کے استقبال کے لئے ذہنی طور پہ تیار رکھیں چنانچہ ہمیں ہر وقت یہ خدشہ سا لگا رہتا ہے کہ کسی وقت اچانک ہی بڑھاپا دبے پاؤں ہمارے بدن میں گھس کر مستقل رہائش اختیار کرے گا اور پھر کبھی نکلنے کا نام نہ لے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں بھی ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

جو آکے چلی جائے وہ جوانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا

شعر یوں تو ہم نے لکھ دیا ہے لیکن شک سا پڑ رہا ہے کہ شعر نقل کرنے میں کہیں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ شاید ایسا بڑھاپے کے توسط سے ہوگیا ہے۔ ویسے بھی بڑھاپے کی آمد کے ساتھ ہی انسان کی یادداشت کمزور پڑنا شروع ہوجاتی ہے اور یہ حالت ہوجاتی ہے کہ

"...جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی"

ممکن ہے یہ آپ کہیں کہ یہ کیفیت نظر کی کمزوری سے پیدا ہوتی ہے۔ جی نہیں! ہمیں آپ سے اختلاف ہے، یہ یادداشت کی کمزوری کا کرشمہ ہے۔ ایک چہرہ آپ دیکھ رہے ہیں لیکن آپ کو یاد نہیں آرہا کہ یہ شخص کون ہے۔ دماغ پر زور دینے سے پتہ چلتا ہے کہ اوہو! یہ تو محلے کا دکاندار مولوی برکت ہے جس سے آپ برسوں اُدھار لیتے رہے ہیں اور جو سینکڑوں بار تقاضے کی غرض سے آپ کے در دولت پہ حاضر ہونے کا شرف حاصل کرچکا ہے۔

یہ درست ہے کہ بڑھاپے کا اثر بصارت پہ بھی ہوتا ہے لیکن فی الحال ہم یادداشت کا ذکر کر رہے ہیں جو بڑھاپے کے سامنے ہتھیار ڈالنے میں بصارت سے کہیں زیادہ تیز ہے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے بارے میں سُنا ہے کہ وہ اپنے پوتے، پوتیوں، نواسیوں وغیرہ کے نام بھول جایا کرتے تھے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا بڑھاپا اپنے پورے شباب پہ تھا۔ ویسے خواجہ صاحب اس میدان کے اکیلے ہی شہسوار نہیں ہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں بوڑھے اس میدان میں ان کے حریف ہیں لیکن یہ غریب گمنام لوگ ہیں خواجہ صاحب کی طرح معروف نہیں لہٰذا ان کے کارنامے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

ہمیں ایک بڑے میاں یاد ہیں جو ایک بار اپنی مرحومہ بیوی کے خصائل وعادات پر روشنی ڈال رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "بڑے میاں! آپ کی اہلیہ کا کیا نام تھا"؟ دماغ پر زور دیتے ہوئے بولے "بھلا سا نام تھا بیچاری کا"، پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو "اوئے پتر، اوئے پتر" کہہ کر آواز دی۔ وہ آیا تو کہنے لگے "پترا! تیری ماں کا نام کیا تھا؟"، ان کا پتر بے چارہ شرمندہ سا ہو کر وہاں سے کھسک گیا بڑے میاں بولے "لگتا ہے اس کی یادداشت بھی میری طرح کمزور ہوگئی ہے"

ہم بچپن ہی سے بوڑھوں کو دیکھتے چلے آرہے ہیں بلکہ ہم نے تو آنکھ ہی عمر رسیدہ بزرگوں کی گود میں کھولی تھی جن کے بارے میں تین چار سال بعد ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے چچا ہیں۔ ہمارے گھر میں ہمارے چچا سے بھی زیادہ بوڑھے اور بزرگ رہتے تھے جو چچا جان کے برادرِ بزرگ تھے۔ اور

انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی دیسے یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر انہوں نے شادی نہیں کی تھی تو وہ بوڑھے کیوں کر ہو گئے۔ بہرحال "بوڑھوں کی باتیں بوڑھے ہی جانیں"۔

ہم اپنے اردگرد بے شمار بوڑھے دیکھتے چلے آرہے تھے لیکن ہم نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایک دن ہمیں بھی یہ جامِ تلخ چکھنا پڑے گا۔ نیم شعوری طور پہ ہم یہ سمجھتے کہ یہ لوگ جو بوڑھے ہو گئے ہیں اپنی حماقتوں سے اس انجام کو پہنچے ہیں ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اچھا خاصا جوان آدمی بوڑھا ہو جائے۔ لیکن پچھلے دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ہمیں چونکا دیا۔ اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جوانی ہمارا ساتھ چھوڑنے کے لئے پر تول رہی ہے۔ ہوا یوں کہ نئی انارکلی سے گزرتے ہوئے ہماری نظریں ایک انتہائی خوش شکل خاتون پر پڑی تو وہیں رُک گئیں، حسن کا ایسا شاہکار بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہم ہکا بکا سے ہو کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں وہ خوب صورتی کا مجسمہ ہمارے بالکل پاس آگیا۔ ہماری آنکھیں جو پہلے ہی بھینس کی آنکھوں سے متشابہ ہیں۔ اور پھیل گئیں۔ گردوپیش کا ہمیں کوئی ہوش نہ رہا۔ وہ خاتون ہماری دیدہ دلیری پر کچھ جھینپ سی گئی اور ہونے سے بولی "کم بخت! اس عمر میں بھی باز نہیں آتا؟" یہ سن کر ہم عالمِ ہوش میں آگئے یہ الفاظ ہم پر بجلی بن کر گرے۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ ہمیں دو چار گالیاں دے دیتی یا بڑھ کر ایک تھپڑ ہی مار دیتی جس کے جواب میں ہم دوسرا گال آگے کر دیتے لیکن مندرجہ بالا الفاظ کہہ کر اس نے ہمارے غبارے سے ہوا نکال دی۔ گھر آکر ہم نے آئینے میں چہرے کو بغور دیکھا سر پہ دو چار سفید بال بھی نظر آگئے۔ چہرے پر دو چار ایسی لکیریں بھی دکھائی دے گئیں جو بالآخر جھریوں کی شکل اختیار کر لیا کرتی ہیں۔ ایک دن ہمیں آئینے میں یوں محو دیکھ کر ہماری گھر والی بولی "آئینے میں کیا جوانی تلاش کر رہے ہو؟" ان الفاظ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور ہم وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

دو مستند گواہوں کی شہادت کے بعد اب ہمارے لئے خوش فہمی کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ ہم نے بادلِ ناخواستہ خود کو بڑھاپے کی آمد کے لئے تیار کر لیا۔ اچانک ہمیں رستمِ زماں بھولو پہلوان کے الفاظ یاد آئے جس نے ایک بار کہا تھا کہ ــــــــ

"ورزش بوڑھوں کو بھی جوان بنا دیتی ہے"۔

چنانچہ اسی روز سے ہم نے ہلکی پھلکی ورزش شروع کر دی، ایک دن ورزش کے دوران یوں لگا کہ ریڑھ کی ہڈی اپنی جگہ سے کھسک گئی ہے۔ ہم نے چند روز کے لئے ورزش چھوڑ دی۔ ابھی دوبارہ ورزش کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک روز ایک نامور پہلوان کو ٹی۔ وی پر دیکھ لیا۔ ساٹھ کی عمر میں وہ ساٹھ ہی سال کا لگ رہا تھا۔ گویا ورزش بڑھاپے کو روکنے میں ناکام رہتی ہے ہمیں اس کے قول پر بھی اعتبار نہ رہا اور بولا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ بڑھاپے سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان جوانی میں اللہ کو پیارا ہو جائے۔ ●●

بزنس شیئر

عذرا اصغر

"ارے صاحب آپ اتنے متعجب کیوں ہیں؟"

"جی ہاں آپ نے بجا فرمایا۔ ایسے واقعات ہی تازہ سننے میں آتے ہیں۔"

"یہ تو سمجھئے بس اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔ اس خاکسار پر۔"

"جی جی۔ بالکل درست فرمایا جناب نے۔ اللہ کے فضل سے یہ حقیر فقیر، پُرتقصیر محلّے ہی میں نہیں شہر بھر میں مشہور ہے۔"

"جی ہاں! آپ کسی سے بھی چوہدری غلام رسول کا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔ جی؟ میرا کاروبار ــــ؟"

"خدا کا شکر ہے صاحب! وہ باری تعالیٰ عزت کی روٹی دئے جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اطمینان سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ ویسے بھی روٹی کی کیا فکر؟ جس نے پیدا کیا ہے وہ کھانے کو بھی دے گا ــــ مشغلہ؟ ــــ جناب مشغلے کا کیا پوچھتے ہو۔ بس خدمتِ خلق میرا مسلک ہے۔ اس کے علاوہ؟ اصل میں صاحب مجھے مخلوقِ خدا کی دیکھ بھال سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ کوئی مشغلہ اپنا سکوں۔

جی ہاں! اپنانا بھی چاہوں تو اپنا نہیں سکتا۔ دراصل زمانہ اتنا خراب ہے کہ ہمدردی نام کی تو چیز ہی لوگوں کے دلوں سے مٹ گئی ہے۔ لوگ بے حد سنگ دل، خود غرض اور مطلب پرست ہو گئے ہیں۔ آہ! کیا زمانہ آگیا ہے مت پوچھئے۔ ایک وہ وقت ہوتا تھا کہ کوئی کسی کو بھوکا نہ سونے دیتا تھا۔ دوسروں کے دُکھوں کے لئے لوگ اپنی جانِ عزیز کی بھی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ اب دیکھئے! دنیا میں کیا ہو رہا ہے بھائی بھائی کے گلے پہ خنجر پھیر دیتا ہے۔ باپ بیٹے سے خفا ہے اور بیٹا باپ سے لاتعلق جی ہاں! آپ درست فرماتے ہیں۔ نام و نمود کی خاطر شہرت و ثروت کے لئے انسان، انسان کا خون پی رہا ہے۔

اب یہی دیکھئے وہ ممالک جو خود کو متمدن کہتے ہیں اور صاحب ہیں بھی وہ بلا شبہ متمدن۔ وہ دیکھئے کیا کر رہے ہیں۔ جی ہاں! ایٹم بم کا ہوّا چھوٹے ملکوں کے سر پہ اٹھائے کھڑے ہیں۔ ارے صاحب آپ اپنے یہاں ہی دیکھ لیجئے کیا ہو رہا ہے۔ ایک صوبہ دوسرے صوبے کو نقصان پہنچانے پر تلا بیٹھا ہے۔ اور تو اور اللہ کی نعمتوں کا بھی لوگوں نے بٹوارہ کر لیا۔ میں پوچھتا ہوں۔ یہ زمین کس کی ملکیت ہے۔ پانی پہ کس کی اجارہ داری کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ مگر ایسا ہے ــــ ایسا ہو رہا ہے۔ دیکھئے گا یہ سب عذابِ الٰہی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ نے سنا وہاں کیا ہوا؟ جی ہاں راتوں رات پورا قصبہ تباہ ہو گیا ــــ کیا نام تھا جانے اس قصبے کا یاد نہیں آ رہا۔ بس خدا اپنا فضل کرے۔ ارے صاحب چھوڑیئے بھی کیسی آزادی؟ آزادی کا نعرہ لگا کر تو دوسروں کی آزادی سلب کی جا رہی ہے۔ زبان تک پر تو پہرے لگے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا اسی کا نام آزادی ہے؟ توبہ توبہ صاحب بہت بُرا وقت آ لگا ہے ہر شخص کانٹھ کا پکا ہے۔ محبت، ہمدردی اور خلوص تو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ریا اور مکاری کا دور دورہ ہے۔ ارے صاحب! کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں کیا اور میری ہستی کیا! بس پچھلے وقتوں کا کچھ اثر باقی ہے۔ باپ دادا کی نجابت و شرافت کا پاس لحاظ ہے خاندانی روایات ملحوظ ہیں ورنہ لوگ تو اپنے خاندانی، تہذیبی، تمدنی سب رشتے توڑ چکے ہیں۔ سب ماڈرن ہو گئے ہیں، ہر چیز، ہر رشتہ، ہر ناتہ ماڈرنائز ہو چکا ہے ایسے افراتفری کے دور میں بھلا مجھ جیسا ایک اکیلا انسان بھلا کیا دیانتس

اُڑائے گا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میرے پڑوس میں ایک خاندان رہتا ہے۔ سات لڑکیاں ہیں اور ایک بیچاری بیوہ ماں ۔۔ جی ہاں! آپ دُرست فرماتے ہیں۔ عورت کو تو عمر، ہر دَور میں ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک محافظ کی۔ کبھی وہ مرد باپ ہوتا ہے، کبھی بھائی، کبھی شوہر اور کبھی بیٹا۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے صاحب۔ اس اٹل حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے بھلا۔ لیکن صاحب بعض خواتین بھی بہت ہی اُلٹے دماغ کی مالک ہوتی ہیں اب سنئے! میں جس خاندان کا ابھی آپ سے ذکر کر رہا تھا، سات لڑکیاں ہیں وہ۔ اور ایک سے ایک حسین۔ قیامت خیز جوانی ہے ان کی اور دانش وروں نے کہا ہے کہ ایسی ہوش رُبا جوانی فرشتوں کو بھی بہکا دے۔ وہ بھلا دیکھ لیں تو ان کے پائے استقلال بھی ڈگمگا جائیں۔

مگر صاحب وہ خاندان اتنا بدلحاظ ہے کہ اب آپ سے کیا کہوں۔ بے وقت بے وقت ان کی خیر خبر رکھتا ہوں کہ مبادا انہیں کوئی دقت نہ ہو۔ ہر آنے جانے والے پہ نظر رکھتا ہوں۔ آپ ہی سوچئے! جوان بچیوں کا ساتھ ہے۔ ایسے گھر میں آنے جانے والے یوں ہی ایرے غیرے نہیں ہونے چاہئیں۔ گھر میں بڑا چھوٹا کوئی مرد ہو تو چلو پھر اور بات ہے مگر جناب اب تو یہ ذمہ داری بھی ہماری ہی ہے نا؟ ہمسایہ جو ہوا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمسائے کے کتنے حقوق ہیں۔ میں تو صاحب جیتے جی فرمانِ الٰہی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اور ان بیچاریوں پر تو مجھے از حد رحم آتا ہے ۔۔ ایک دن کیا ہوا جناب کہ ہمارے کپڑے کے ڈپو میں آگ لگ گئی خواتین تو پھر عورتیں ہیں، مرد اس بلائے ناگہانی سے بوکھلا رہے تھے میں یہ سوچتے ہوئے کہ بیچاری خواتین تنہا ہیں ان کے گھر چلا گیا کہ ذرا کچھ ڈھارس بندھاؤں۔ خدمت خلق میرا مشن ہے اور بچپن سے ان کے گھر میرا آنا جانا ہے تو صاحب بھاگا بھاگا میں ان کے گھر پہنچا۔ دیکھا تو واقعی وہ سب بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور منجھلی تو بہت ہی بدحواس تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا عورت جتنی خوبصورت ہوگی اتنی ہی نازک مزاج ہوگی۔ بس یہی حال منجھلی کا ہے۔ اور اس روز تو وہ بہت ہی پریشان تھی میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا وہ چپ رہی۔۔۔۔۔ یقین مانئے میری نیت قطعی بُری نہیں تھی بس یوں ہی بے ساختگی میں سر پہ ہاتھ پھیرا لیکن صاحب توبہ توبہ۔۔۔۔۔ خلوص کی تو اس دنیا میں قدر ہی نہیں رہی اب بھلا آپ ہی انصاف کیجئے۔ میں نے اپنے بے شمار کام چھوڑے۔ اپنا وقت برباد کیا۔ ان کی خاطر وہاں گیا۔ اور صلہ کیا ملا؟ چھوڑیئے صاحب آج کل کے اس پُرآشوب دَور میں سب بیکار ہے کسی کے ساتھ ہمدردی وردردی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن صاحب کیا کیجئے اس دل کا، جس میں یوں لگتا ہے جیسے کہ سارے جہاں کا درد سما گیا ہے اور پھر ورثے میں ملی ہوئی خصوصیات کیسے ختم کر دی جائیں؟ داداجان مرحوم کی دوست نوازی کا چہار سُو ڈنکا بجتا تھا اور یہی حال اللہ بخشے اپنے اباجان کا تھا۔ خداوندِ قدوس مرحومین کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ ذرا غور فرمایئے! داداجان مرحوم و مغفور نے کثیر شادیاں کیں، جی، بیوہ اور لاوارث عورتوں سے جی! محض ان کی سرپرستی کی خاطر۔ اباجان اللہ بخشے کچھ ڈھیلے آدمی نکلے۔ صرف تین پر اکتفا کیا لیکن صاحب میں کہتا ہوں اب وہ زمانہ کہاں رہ گیا ہے اوّل تو اس دَور کی عورت، اتنی خودسر ہو گئی ہے کہ ایک بیوی موجود ہو تو دوسری کا آنا گوارہ نہیں کرتی ۔۔ اور پھر حالات بھی اتنے بدل چکے ہیں کہ لوگوں میں اتنی بیویاں رکھنے کی استطاعت ہی نہیں رہی۔ اجی میں بتاؤں آپ کو۔ میرے گھر سے چار گھر چھوڑ کر نجمہ رہتی ہے بلا کی ذہین اور طرار لڑکی ہے صاحب۔ اچھے اچھوں کو گھاس نہیں ڈالتی۔ مگر صاحب اپنی اس سے خوب بنتی ہے اپن اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں جب کبھی کسی انجمن کی بنیاد ڈالتی ہے تو ہم دوسروں کے نام خود چندہ دے کر

کی پوری کر دیتے ہیں ۔ عجب زمانہ آگیا ہے جی۔ کسی احسان کی تو قدر و قیمت ہی نہیں رہی ۔ اوہ ! بہت دیر بعد آپ نے یہ سوال کیا۔ خیر بہت خوب ! ارے ہٹائیے صاحب کیا فرسودہ ذکر چھیڑا ہے آپ نے شادی ..... شادی .... کیا رکھا ہے بھلا شادی میں ؟ کیا فائدہ یوں ہی مفت میں شادی کی لعنت کا طوق گلے میں ڈالے پھرو ۔ پھر آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ ہم نے اپنا مسلک ہی خدمتِ خلق بنایا ہے ۔ اب آپ ہی کہئے شادی کروں تو سب خدمتِ خلق دھری نہ رہ جائے گی ۔ انسان کی تمام شخصیت ختم ہو جاتی ہے جناب ۔ بس پابند بن کے بیٹھے ۔ ہو بیگم صاحبہ کے ۔ ادھر کیوں دیکھا ، اس سے بات کیوں کی تھی ۔ کسی سے بات کر لو یا کسی کی تعریف کر بیٹھو تو گردن زدنی قرار پاؤ ۔ لاحول ولا..... نا بابا بھر پائے ۔ یوں ہی چھیڑے چھانٹ بہتر ۔ اپنی نیند سوا د اپنی نیند اٹھو ۔ لعنت بھیجئے اس مسئلے پر ہی ۔ اور آپ یقیناً میری اس بات سے اتفاق کریں گے ۔ سنئے ! میری ایک مہربان ہیں ۔ اچھی خاصی عمر ہو گی مگر صاحب اس عمر میں بھی ...... واللہ کیا چیز ہیں ۔ ویسے ہیں بڑی کھری طبیعت کی ۔ میں تو گھنٹوں بیٹھا ان کو تکتا رہتا ہوں ۔ بھائی وائی کچھ نہیں یوں ہی محاورتاً کہدیتی ہیں ۔ اور میں تو اس قسم کے منہ بولے رشتوں وشتوں کا بالکل قائل نہیں ۔

اوہ ! آپ نے میری عمر پوچھی ہے ۔ ارے قبلہ عمر وغیرہ میں کیا رکھا ہے ۔ آدمی کا دل جوان ہونا چاہئے ورنہ سن و سال سب بکواس چیز ہے ۔ ہم نے بہت سے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جن کے دل مُردہ ہوتے ہیں ۔ اور آپ سنئے ! دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس پر جوانی ہی ساٹھ سال کے بعد آتی ہے ۔ اب ان کا مقولہ کسی تجربے کی بنا پر ہی ہو گا نا ؟ خیر چھوڑیئے اس فضول بحث کو ۔ میں کہتا ہوں میں اب بھی لڑکیوں میں اس قدر مقبول ہوں کہ کوئی بائیس سالہ نوجوان بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ جی بالکل ـــ یہ میرا دعویٰ ہے پچاسوں لڑکیاں میرے پیسے سے بیاہی جا چکی ہیں ، سینکڑوں بیواؤں کا میں کفیل ہوں ۔ کتنے ہی بچے بچیوں کا میں وسیلہ ہوں ۔ بے شمار غریب باپ میرے مرہونِ احسان ہیں ۔ یہ کہنے کی بات نہیں ہے صاحب ۔ آپ نے ذکر چھیڑ دیا تو زبان تک آگیا ورنہ میں تو اس کا قائل ہوں کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو پتہ نہیں چلنا چاہئے ۔ انسان کی زندگی میں اور رکھا ہی کیا ہے ۔ یہی بھلائی ، نیکی تو آگے کا راستہ صاف کرتی ہے ۔ ارے بھائی میرے پھر وہی سوال ؟ کہا تو ہے اللہ عزت کی دال روٹی دئے جاتا ہے بس شکر ہے اس کا اور کیا چاہئے ہے ۔ شہر بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہوں یہ بھی اسی کی دین ہے ۔ شہر میں آپ کسی سے بھی چوہدری غلام رسول کا پتہ پوچھ سکتے ہیں ۔ لوگوں کی مہربانی ہے جی ۔ ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں کون کسی کو پوچھتا ہے ۔ اللہ بخشے ابا جان کو ۔ کاروبار تو ان کا تھا ۔ ہم تو یوں سمجھئے کہ ان کی کمائی ہوئی خون پسینے کی دولت لٹا رہے ہیں ۔ آخر انسان انسانیت کے لئے بھی تو کچھ کرے نا ؟ سدا تو دنیا میں بیٹھے نہیں رہنا ۔ ابا جان نے تو چاروں سرحدوں پر اپنا دھندا پھیلایا ہوا تھا ۔ ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا مال ادھر ۔ خود تو وہ بس بیٹھے رہا کرتے تھے ۔ کام کاج کے لئے کارندے چھوڑے ہوئے تھے ۔ سینکڑوں لوگوں کی روزی کا وہ وسیلہ تھے ۔ آخرت کی فکر تو ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے جی ۔ اپنا کیا ہے صاحب ۔ اکیلی جان ہے سو وہ عوام الناس کے لئے وقف ہے ۔ دیکھئے صاحب ! میں اپنا روپیہ بنک میں رکھوں تو کتنا منافع کماؤں ؟ لیکن میں اپنے منافع کی کبھی نہیں سوچتا ۔ میرا دل ہی خدا نے ایسی مٹی سے بنایا ہے جس میں دنیا والوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے ۔ میں تو اپنا تمام پیسہ ضرورت مندوں میں بانٹ دیتا ہوں اور کبھی خود واپس نہیں مانگتا کوئی لوٹانے آئے بھی تو اصرار کرتا ہوں کہ جب فراغت ہو گی تو لوٹا دینا ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دس دس برس سے میرے مقروض ہیں ۔ بلکہ بعض تو اس سے بھی زیادہ ـــ قرض کا نام میں نے اس امداد کو یوں دیا ہے کہ جی لینے والے احساسِ کمتری میں

مبتلا نہ ہوں قرض دیتا ہوں نا — ؟ پھر بھلا اس میں کیا احسان ؟ مجھے تو جناب ہر دم لوگوں کی بہتری کا خیال رہتا ہے یا اپنی عاقبت کا فکر دامن گیر ہے۔ اب دیکھئے ! انہیں کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ کسی سود خور کے ہتھے چڑھ جائیں تو کبھی کمر سیدھی نہ کر سکیں، تقاضے الگ ہوا کریں، شرمندگی بڑی علیحدہ — ارے صاحب یہ سود خور تو بدبخت چمڑی ادھیڑ لیتے ہیں چمڑی — بس ہتھے چڑھنا چاہئے کوئی غریب ضرورتمند۔ اور سود تو جناب مذہباً — شرعاً بھی حرام ہے۔ سُنا آپ نے اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ اب کہئے۔ یہ مسلمان بنے پھرتے ہیں — میرا تو جی بس سیدھا سادہ حساب ہے۔ تین پرسنٹ بزنس شیئر۔ صرف تین پرسنٹ۔ اللہ ایمان سلامت رکھے۔ ویسے تجارت پر منافع کی کوئی شرح مقرر نہیں۔ آپ جتنا بھی لیں ناجائز نہیں کہلائے گا اپنے اپنے بزنس TTS کی اور اہلیت کی بات ہے۔ بڑا دماغ کھپانا پڑتا ہے حضور۔ الگ الگ سب کے کھاتے کھولو، حساب کتاب رکھو۔ آخر محنت کا کچھ تو معاوضہ ہونا چاہئے۔ مگر قبلہ میں سوچتا ہوں زیادہ کما کر کرنا بھی کیا ہے، شہر میں دو مسجدیں تعمیر کرادی ہیں۔ ایک اسکول کھول دیا ہے (اسکول سے ؟) چاہوں تو لاکھوں کما کر رکھ سکتا ہوں مگر اس کی بیشتر آمدنی سے نادار بچوں کا خرچ چلتا ہے تھوڑا بہت اپنی دال روٹی کا خرچہ بھی نکل ہی آتا ہے میں چاہوں تو بزنس میں شیئر کی پرسنٹیج بڑھا بھی سکتا ہوں مگر وہ جو ابھی میں نے عرض کیا تھا نا کہ بس اللہ ایمان سلامت رکھے اور عزت کی دال روٹی ملتی رہے بس۔

مجھے تو صاحب نیکی سمیٹ لینے کی خواہش رہتی ہے آخرت پر نگاہ رکھنا مومن کی نشانی ہے جی — اجی۔ میری ضرورت ہی کتنی ہے۔ کھدر کے دو سوٹ مگر صاحب عجیب زمانہ آگیا ہے کھدر بھی اتنا مہنگا ہوگیا ہے کہ ...... خیر صاحب کیا کریں۔ تن تو ڈھانپنا ہی ہے نا — جی ! —

●●

بانسواڑہ کا آل انڈیا مشاعرہ

بسمل نقشبندی
رتلامی

یکم اپریل ۲۰۰۳ء کو حضور پیر و مرشد حضرت سید رحمت علی شاہ صاحب درویشؒ کے دسویں سالانہ عرسِ مبارک کے موقع پر ایک آل انڈیا مشاعرہ زیرِ صدارت شری ہری رام جی ذادیسے ہیلتھ آفیسر نگر پالیکا رتلام منعقد ہوا جس کی نظامت جناب ممتاز راشد نے کی۔ مشاعرے کا پہلا دور نعتیہ ہوا جو حسبِ معمول تلاوتِ کلام پاک اور حمدِ باری تعالیٰ سے شروع ہوا۔ نعتیہ دور کی صدارت قبلۂ عالم پیرِ طریقت حضرت سید شاہ عبد الحق صاحب اجمیری مدظلہٗ نے فرمائی۔ نعتیہ دور کے بعد سید مخدوم شعراء کرام کو گلشنِ رسول کے پھولوں کا ایک حسین ترین گلدستہ فرماتے ہوئے دعائیہ کلمات پر اپنی مختصر سی تقریر ختم کر کے تشریف لے جا رہے ہیں۔ ممتاز راشد نے مائک سنبھال لیا ہے اور مشاعرے کو سماجی، اخلاقی، تہذیبی وراثت بتاتے ہوئے اردو کی ترقی و بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ اردو پڑھنے اور بولنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک مقامی شاعر جناب سعید منظر کو زحمتِ کلام دی ہے۔ سعید منظر یوں ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ممکن ہو تو اجڑے ہوئے لوگوں کی دعا لے
پھر گنبدِ افلاک کو قدموں پہ جھکا لے
کمرے کی گھٹن چھوڑ کے آنگن میں نکل آ
دروازہ کبھی کھول کبھی تازہ ہوا لے

منظر صاحب مناسب داد پاکر اپنی جگہ چلے گئے ہیں اور اب سعید درویش تشریف لائے ہیں اور یہ بھی مناسب داد لیتے ہوئے اپنی جگہ آگئے ہیں۔ اب دعوتِ سخن دی گئی ہے ان شاعر شری ہستی مل جین ہستی کو۔ ہستی مل جی نعتیہ دور میں بھی اہلِ بانسواڑہ کا دل جیت چکے ہیں اور اب مائک پہ آکر یوں ارشاد ہوئے ؎

سیدھی نظر سے اس کی کوئی کا منکار ہے
ترچھی نظر میں اس کی کوئی خار و زار ہے
گردش سے اس کی ڈرتا ہوں ہستی میں اس لئے
گردش میں اس کی گردشِ لیل و نہار ہے

داد پاتے ہوئے ہستی مل جی والہانہ انداز میں ارشاد فرما رہے ہیں ؎

عدو کا یہ ماتم یہ زلف پریشاں
یہ کیا کر لیا ہے یہ کیا کر رہے ہو
مری جان ہو کر ستم میری جان پہ
تمہیں کیا ہوا ہے یہ کیا کر رہے ہو

ہستی مل جی ایک اور ایک اور کے شور میں مائک سے جدا ہو کر اپنی جگہ جا چکے ہیں اور ممتاز راشد صاحب نے طنز و مزاح کے شاعر جناب بیکل گیاوی کو زحمتِ کلام دی ہے۔ سنئے بیکل صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

جاہل ہیں کچھ ایسے جو لگائیں گے انگوٹھا
کاغذ پہ بصد ناز جمائیں گے انگوٹھا
نیتاؤں کی فطرت ہمیں معلوم ہے بیکل
مل جائے گی کرسی تو دکھائیں گے انگوٹھا

داد کا عالم نہ پوچھئے بیکل صاحب سے یہ قطعہ بار بار پڑھوا گیا ہے۔ بیکل صاحب خوب خوب داد پاکر اور محفل کو زعفران زار بنا کر مائک سے ہٹے تو ممتاز راشد صاحب کہہ رہے ہیں کہ جناب بیکل گیاوی نے مشاعرے کو ایسے موڑ پر چھوڑا ہے کہ ان کے بعد کسی سنجیدہ شاعر کو پڑھوانا اس کی قربانی پیش کرنے کے برابر ہے اب کوئی بھی سنجیدہ شاعر پڑھے گا یقیناً وہ شہید ہوگا۔ کیوں کہ اسلام میں مرتبۂ شہادت پانا خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے اس لئے یہ اعزاز و سعادت میں خود ہی حاصل کر رہا ہوں۔ لیجئے ممتاز راشد صاحب مائک پر تشریف لا چکے ہیں اور بہت ہی اچھے ترنم سے غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جھیل میں چاند نظر آنے تک حسرت اس کی
کب سے آنکھوں میں لئے بیٹھا ہوں صورت اس کی
بند مٹھی کی طرح وہ کبھی کھلتا ہی نہیں
فاصلے اور بڑھا دیتی ہے قربت اس کی

راشد صاحب ابھی داد پاتے ہوئے نغمہ سرا ہیں سہ

مایوسیوں کی دھول سے ہر نقش ہے دھندلا ترا
میں نے کبھی اے زندگی دیکھا نہیں چہرہ ترا
تو بھی کبھی محسوس کر کیا ہے بکھرنے کی کسک
اک روز یوں بازی سجے پتھر مرے شیشہ ترا

راشد صاحب نے جناب اختر گوالیاری کو دعوتِ غزل سرائی دی ہے۔ سامعین نے تالیاں بجا کر اختر صاحب کا خیر مقدم کیا ہے اور اختر صاحب لحنِ داؤدی میں یوں جادو جگا رہے ہیں سہ

اے پرستارِ عشرت نہ مغرور ہو زندگانی کا کوئی بھروسہ نہیں
جانے کس وقت یہ ختم ہو جائے گی اس کہانی کا کوئی بھروسہ نہیں
تیرا آنا بھی ہے جگنوؤں کی طرح تیرا جانا بھی ہے خوشبوؤں کی طرح
سوچتا ہوں کہ کس طرح روکوں تجھے بہتے پانی کا کوئی بھروسہ نہیں
شعلۂ عشق نے پھونکے کتنے ہی گھر شبنمِ حسن نے ڈوبی لتنے نگر
اپنی اپنی جگہ دونوں ہیں پرخطر آگ پانی کا کوئی بھروسہ نہیں

سامعین اور شعراء کی طرف سے بھرپور داد دی گئی ہے اختر صاحب غزل ختم کر کے واپس ہونا چاہتے تھے کہ جناب افتخار امام صدیقی نے مائیک پہ آ کر فرمایا کہ اختر گوالیاری مشاعروں کی جان ہیں کسی بھی مشاعرے میں ان کی موجودگی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت ہے میں ان سے درخواست کروں گا کہ یہ ایک غزل اور سنائیں۔

اختر گوالیاری افتخار امام صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسری غزل کا مطلع ارشاد فرما رہے ہیں سہ

جب رگ دل سینے میں غم دست سا جاتا ہے
تب کہیں جا کے دعاؤں میں اثر آتا ہے
دھوپ ہی ٹھیک ہے اس چھاؤں سے جو گم کر دے
کم سے کم دھوپ میں سایہ تو نظر آتا ہے

تم نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ وہ بھی نہیں۔ وہ بھی نہیں
کون ہے پھر جو غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے

داد کا سیلاب امنڈ پڑا ہے۔ اختر صاحب سے مذکورہ شعر کو کئی بار پڑھوایا گیا ہے۔ تحسین و آفرین سے لدے اختر صاحب ایک اور ایک اور کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور محترم راشد صاحب مجمع کو کنٹرول کرنے کیلئے فرما رہے ہیں کہ اختر صاحب دوبارہ آپ کے سامنے تشریف لائیں گے اور ایک نہیں بلکہ دو تین غزلیں آپ کو سنائیں گے۔ لیکن پہلا دور مکمل ہونے کے بعد۔ اور اسی کے ساتھ راشد صاحب جناب مسعود رضا بھوپالی کو دعوتِ سخن دی ہے فرماتے ہیں سہ

جاگنے والوں سے تم خواب کی باتیں نہ کرو
دامنِ خشک سے سیلاب کی باتیں نہ کرو
ان کا ایک ایک کرم نقش ہے میرے دل پر
رہنے دو تم مرے احباب کی باتیں نہ کرو

قطعات پر داد پانے کے بعد مسعود رضا صاحب نے مسحور کن ترنم میں غزل شروع کی ہے سہ

شفق کا رنگ کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے
لہو زمیں پہ ٹپکتا دکھائی دیتا ہے
ہمیں تو اپنی بھی صورت نظر نہیں آتی
تمہیں تمام زمانہ دکھائی دیتا ہے
انہیں کو کچھ نظر آتا نہیں زمانے میں
وہ جن کو حد سے زیادہ دکھائی دیتا ہے

غزل کے ہر ہر شعر پہ خوب خوب داد پانے کے بعد مسعود رضا واپس ہو رہے ہیں اور اب مائیک کے روبرو نظر آ رہے ہیں پروفیسر شاہد میر۔ ان کا تعلق میرو بنگ سے ہے طبیعت میں جدت پسندی کے جوہر نمایاں ہیں بڑے اچھے اشعار سنا رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے سہ

جلوہ گر لاکھ حوالوں میں حوالہ تیرا
صبح کی دھوپ نے لکھا ہے مقالہ تیرا
کیا ہوئی وہ شبِ ظلمت مجھے معلوم نہیں
میرے اطراف تو پھیلا تھا اجالا تیرا

میر صاحب کے مندرجہ ذیل شعر نے خوب داد پائی ؎

لے تو آیا ہوں تجھے ساتھ سفر میں لیکن
اب کھٹکتا ہے مرے پاؤں میں چھالا تیرا

میر صاحب خوب خوب داد پا کر مائیک سے جا رہے ہیں اور
ناظم مشاعرہ نے فیض رتلامی کو پکارا ہے۔ مقطع اور ایک شعر
بھی سن لیجئے ؎

کہاں ہے منزلِ مقصود کچھ پتا ہی نہیں
دیئے کی روشنی مدھم ہے کیا کیا جائے
شمار ہوتا فرشتوں میں فیضؔ انساں کا
گناہ فطرتِ آدم ہے کیا کیا جائے

مناسب داد پا کر فیضؔ اپنی جگہ تشریف لے جا رہے ہیں
اب "جذبۂ عشق" کے خالق جناب کے۔ کے۔ سنگھ میئنک
آبادی جو رتلام میں سینئر D.C.S کی پوسٹ پر فائز
سے غزل سرا ہونے کی التجا کی گئی ہے۔ آپ کا ترنم بھی
ہے۔ سنئے ارشاد ہو رہا ہے ؎

رخ اُٹھا کر جب کوئی پہلو بدلتا ہے
لگتا ہے جیسے صبح دم سورج نکلتا ہے
شہر کے لوگ یہ چہرے پہ چہرہ کیوں لگاتے ہیں
کہیں چہرے بدلنے سے کسی کا دِل بدلتا ہے
اب تم بدلتے وقت میں خود کو بدل ڈالو
دل میں ہر اک سوکھا شجر کپڑے بدلتا ہے

میئنک صاحب کو خوب سراہا گیا ہے۔ خاصی داد پا کر
صاحب جا رہے ہیں اور ممتاز رتلامی فرما رہے ہیں کہ
دنیائے شعر و ادب کے مقتدی اپنا اپنا دوگانہ ادا
شرفِ قبولیت حاصل کر رہے تھے اور اب بساطِ سخن
تشریف لا رہے ہیں قصر الادب کے امام جناب افتخار امام
اسٹیج پر تشریف فرما سبھی شعراء اور سامنے بیٹھے
سامعین نے تالیوں سے پُرخلوص مقدم کیا ہے۔
اب افتخار امام مائیک پر آچکے ہیں بڑے ہی دلپذیر
سے غزل سرا ہیں ؎

چہرے تمام شہر پناہوں کے ساتھ ہیں
جتنے بھی ڈاکو زن ہیں سپاہوں کے ساتھ ہیں
منزل کی دھوپ بن کے سمٹنے لگے ہو تم
ہم گردِ راہ ہو کے بھی راہوں کے ساتھ ہیں

داد کا عالم نہ پوچھئے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں
بلند ہو رہی ہیں اور افتخار امام صاحب والہانہ انداز میں
بڑی اہم بات کہہ رہے ہیں ؎

واقف ہیں اپنے قتل کے ہر فیصلے سے ہم
قاتل ہمارے خود ہی گواہوں کے ساتھ ہیں

داد دے دے کر سامعین کا بُرا حال ہو گیا ہے افتخار
امام صاحب کو مذکورہ بالا شعر کئی بار پڑھنا پڑا ہے، تحسین
و آفریں کی موجوں میں رواں دواں افتخار امام صاحب
مائیک سے ہٹے تو سامعین نے ایک غزل اور سنانے کی
پُرزور گزارش کی ہے۔ اسٹیج سے بھی تائید کی گئی، بمشکل
تمام افتخار امام صاحب پھر مائیک پر تشریف لائے ہیں
اور فرما رہے ہیں کہ اب آپ براہِ کرم مجھے داد دیں
اگر آپ نے داد دی تو میں سمجھوں گا کہ یہ میری بدقسمتی ہے
مجمع میں سے ایک آواز اُبھری کہ حضور ہم نے تو یہ سنا تھا
کہ جس شاعر کو داد نہ ملے وہ بدقسمت ہے! اس پر ایک
زوردار قہقہہ بلند ہوا اور جناب افتخار امام سُنی ان سنی
کرتے ہوئے یوں نغمہ سرا ہیں ؎

لمحہ لمحہ مرا سوالی ہے...
حیرتوں نے دکاں سجالی ہے

جی رہے ہیں کہ کچھ نہیں ممکن
زندگی اب تو ایک گالی ہے

پھونک دو ضبط کے نوشتے سب
کیا مصیبت گلے لگالی ہے

غم سے اس کا عجیب رشتہ ہے
ایک لڑکی جو بھولی بھالی ہے

دائروں میں اسیر ہوں پھر بھی
راہ جینے کی اک نکالی ہے

ریت کا پل تو یوں بھی کچا تھا
باڑھ نے راہ بھی بنالی ہے

افتخار امام صاحب ہر ہر شعر پر بھرپور داد پا کر مائیک سے جا رہے ہیں

اور اب ظہیر آتش اپنا کلام سُنا رہے ہیں ؎

کیا خبر تھی کہ بھرے شہر میں دنگا ہو گا
ظلم انساں پہ سر دردیٔ گنگا ہو گا

ظہیر آتش کے بعد سحر افغانی جن کا تعلق سرزمین مامیور سے ہے اور نئی اُدوال گلشن آباد ر جاؤڑہ میں سکونت پذیر ہیں مائیک پہ آ چکے ہیں اور بہت ہی پُرسوز لہجے میں غزل سرا ہیں ؎

وہ تو بس یونہی مسکرائے تھے
دل نے کیا کیا فریب کھائے تھے

نام لکھ لکھ کے ہجر میں ان کا
کاغذوں پہ دیئے جلائے تھے

برق بدنام ہے زمانے میں
آشیاں ہم نے خود جلائے تھے

اے سحر پھر کوئی جچا ہی نہیں
ایسے نظروں میں وہ سمائے تھے

سحر افغانی خاصی داد وصول کر کے اپنی جگہ تشریف لا چکے ہیں اور مقامی شاعر محشر افغانی کو دعوتِ سخن دی گئی ہے دیکھئے محشر افغانی کیسا خوبصورت مطلع ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کچھ لوگ زندگانی کے ایسے سفر میں ہیں
دن رات چل رہے ہیں مگر گھر کے گھر میں ہیں

منزل تو خوش نصیبوں کے حصے میں آ گئی
کچھ بدنصیب لوگ ابھی تک سفر میں ہیں

پتھراؤ کر رہی ہیں ہوائیں بھی ہر طرف
کچھ لوگ سہمے سہمے سے شیشوں کے گھر میں ہیں

محشر افغانی بھی مناسب داد پا کر کامیاب و کامراں واپس ہوئے تو ممتاز راشد صاحب نے راقم السطور کو پکار لیا ہے۔ چند اشعار برداشت کیجئے ؎

دوستو! اترآؤ پُرسکوں فصیلوں سے
تیر کر نکلنا ہے اب لہو کی جھیلوں سے

چاہتی ہے یہ دُنیا نقطۂ عمل کوئی
مطمئن نہیں ہوگی زندگی دلیلوں سے

حق شناسی و طاعت خود شناسی و جرأت
دار تک چلے آئے مختلف وسیلوں سے

اشتہار آلفت کے کیوں لگا رہے ہو تم
شاہراہِ ہستی پر نفرت کی کیلوں سے

لاشِ آدمیت کی کاش بچ سکے بسمل
جاں ستاں مسائل کی گوشت خور چیلوں سے

میرے بعد استاد الشعراء علامہ حضرت صادق اندوری کو دعوتِ سخن ملی ہے موصوف چند قطعات سُنانے کے بعد غزل کے اشعار سے نواز رہے ہیں۔ آپ بھی لطف لیجئے

فشارِ وقت کو قدموں میں ڈال کر رکھنا
حیات کے لیئے رستہ نکال کر رکھنا

بکھر نہ جائیں کہیں تار و پودِ احساسات
یہ زندگی کی ہے دولت سنبھال کر رکھنا

زمانہ سخت کیئے جا رہا ہے اپنی گرفت
بچت کے واسطے پہلو نکال کر رکھنا

یہ اک بدلتی ہوئی قدر احترام کی ہے
مذاق اپنا بہ ایں شکل ڈھال کر رکھنا

متاعِ عشق متاعِ حیات ہے صادق
قدم قدم پہ اسے تو سنبھال کر رکھنا

اُستاد صادق اندوری کے کلام بلاغت نظام کے بعد ہی ممتاز راشد صاحب نے صدرِ مشاعرہ کی اجازت سے رات کے تین بجکر ۲۰ منٹ پر مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا۔ ●

انجمن اردو کینیڈا کی ماہانہ نشستیں

انجمن اُردو کینیڈا کی ماہانہ ادبی نشستیں ۲۷ مارچ اور ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء کو حسبِ معمول ۲۵۲ بلور اسٹریٹ، انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کی عمارت میں منعقد ہوئیں۔

۲۷ مارچ کی نشست میں ہیملٹن سے پروفیسر سعید احمد صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے حسبِ وعدہ تاریخ نویسی پر اپنا مقالہ پڑھا۔ پہلے تو انہوں نے تاریخ نویسی کے مراحل کا تذکرہ کیا۔ پھر ان اُلجھنوں کا ذکر کیا جو تاریخ نویسی کے سلسلہ میں اصولی اختلافات کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کچھ اپنی سفارشات پیش کیں۔ لیکن سب سے اہم بات جو انہوں نے بتائی وہ یہ خبر تھی کہ تاریخ نویسی میں سہولت فراہم کرنے کے لئے انہوں نے ایک لغت تیار کی ہے اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے الفاظ دئے ہیں اور تراکیب فراہم کی ہیں جن کے اعداد بھی دئے گئے ہیں۔ مضمون پر حسبِ معمول گفتگو ہوئی اور پروفیسر صاحب سے حاضرین نے یہ سفارش کی کہ وہ اپنی سفارشات کو ہندوستان، پاکستان کے علمی ادبی لسانی حلقوں سے متعارف کرائیں اور اس لغت کو شائع کرائیں۔ پروفیسر صاحب کی تقریر کے بعد جناب رضا الجبار صاحب نے ایک بہت ہی مختصر سا اشاراتی طنزیہ فکاہیہ افسانچہ پڑھا۔ اور بعد میں ایک افسانہ بھی سنایا۔ ان کے افسانہ میں شمالی امریکہ اور ہندوستانی معاشرتی طرزِ فکر کا موازنہ پیش کیا گیا۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ کسی بھی خاندان میں ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے دباؤ کے تحت کس طرح بعض ایسے بھی مسائل حل ہو جاتے ہیں جو کسی نو شادی شدہ جوڑے کی زندگی میں پیدا ہوتے ہیں لیکن شمالی امریکی زندگی میں افرادِ خاندان کی عدم مداخلت کی پالیسی چونکہ اس قسم کا اخلاقی دباؤ نہیں پیدا کر سکتی اسی لئے شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔ افسانہ حاضرینِ مجلس نے پسند کیا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور افسانہ نویس سے سوالات کئے گئے۔ افسانہ کے بعد جناب حفظ الکبیر قریشی نے اپنی غزل اور پنڈت ہاکر نے اپنی نظم سنائی جسے حاضرین نے خوش دلی سے سنا اور پسند کیا۔

۲۷ مارچ کو اتفاق سے یکایک موسم خراب ہوگیا تھا برف بھی پڑنے لگی تھی اور سرد ہواؤں کے جھکڑ حوصلہ شکن ثابت ہو رہے تھے اس کے باوجود پچیس تیس لوگ پہنچ ہی گئے تھے۔

۲۴ اپریل کی نشست اسی جگہ منعقد ہوئی اس دفعہ بڑا ہال لیا گیا تھا اور سامعین بھی نسبتاً زیادہ تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ وائس پریذیڈنٹ عبدالسلام صاحب نے پچھلی میٹنگ کی روئیداد پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد رحیم انجان صاحب کو افسانہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ افسانہ مختصر۔ لیکن دلچسپ تھا اور جاہل سیاست دانوں کی قلعی کھولتا تھا۔ ایک دو جگہ انجان صاحب نے ذرا کھلے الفاظ استعمال کئے تھے جو شاید خواتین کی موجودگی میں بعض لوگوں کی دانست میں مناسب محل نہیں تھے۔ اس لئے گفتگو کے دوران انجان صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ان الفاظ کو بدل دیں تو بہتر ہوگا انجان صاحب مسکرا کر رہ گئے ... مان گئے۔

انجان صاحب کے بعد پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز نے اپنا ایک مزاحیہ افسانہ پڑھا جس میں داستان گوئی کا انداز تھا۔ مزاح مزاح میں طنز کے بھرپور وار بھی تھے

بعض جگہ زیرِ لب مسکراہٹ کا انتظام تھا تو کئی جگہ پہ قہقہے لگانے کا کافی سامان بھی تھا۔ انہوں نے اپنا افسانہ یہ کہہ کے شروع کیا کہ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنے استاد جگن ناتھ آزاد کو اپنی اردو تحریر دکھائی تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ تم میں بڑی ادبی صلاحیتیں ہیں اور تم اردو زبان کی بڑی خدمت کرسکتے ہو "پنجابی بولا کرو اور انگریزی لکھا کرو"

پروفیسر ہمیری کے بعد جناب شاہد حسین رزاقی صاحب نے "اقبال کی نظر میں اسلامی سیاسی تصورات" پڑھا۔ مقالہ طویل ہونے کے باوجود توجہ سے سنا گیا اور آپ کے گراں قدر خیالات اور دقتِ نظر کی داد دی گئی، اپنے مقالہ میں رزاقی صاحب نے موضوع کا نہایت خوبصورتی سے بسط و شرح کے ساتھ احاطہ کیا تھا۔ یہ مضمون سامعینِ جلسہ کے لیے نہ صرف کہ معلومات افزا تھا بلکہ اسلامی سیاسی تصورات کی وضاحت بھی کرتا تھا۔

شاہد حسین رزاقی صاحب کے مضمون کے بعد چائے پیش کی گئی۔ کچھ خوش گپیاں ہوئیں اور محفل کا دوسرا دور شروع ہوا۔ قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحبزادی ان دنوں یہاں موجود ہیں۔ انجمن کی دعوت پہ وہ بھی شریکِ جلسہ ہوئیں ... ایک نہایت دلچسپ مضمون "ایک محفلِ مشاعرہ" پڑھا جو ان کے گھر میں منعقد ہوئی تھی۔

۲۳ر اپریل کی شام میں رضا الجبار صاحب نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں شرکت کے لئے نیویارک اور شکاگو سے کئی احباب تشریف لائے تھے چونکہ اس محفل میں شمالی امریکہ کے خوش فکر خوش گلو بزرگ شاعر مظفر شکوہ موجود تھے اس لئے سامعین کے بیحد اصرار پہ انہوں نے اپنے مخصوص ترنم میں کچھ غزلیں سنائیں۔ فضا میں ایک نئی تازگی آگئی تھی۔ حاضرینِ جلسہ بے حد مسرور اور محظوظ ہوئے مظفر شکوہ ہی کی درخواست پر نزہت صدیقی صاحبہ نے بھی اپنا کلام پیش کیا اور داد پائی۔ لاس اینجلز سے محترمہ مہرالنساء مہر تشریف لائی تھیں انہوں نے اپنی مشہور نظم "مغرب میں" پڑھی اور ایک دو غزلیں اور سنائیں جنہیں بہت پسند کیا گیا

اس کے بعد پنڈت ہاکسر نے اپنی مختصر سی نظم سنائی۔

یہ محفل کوئی چار گھنٹے تک چلتی رہی ۲۴ر اپریل کو موسم خوشگوار تھا دھوپ چمک رہی تھی اور ہوا میں نہایت رومانی نمی محفل کے خاتمہ پر صدرِ جلسہ جناب نقوی صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخواست ہوا۔ نزہت صدیقی صاحبہ جو نظم پڑھی وہ قارئینِ شانِ ہند کی خدمت میں پیش ہے۔

غبارِ کارواں

سیدہ نزہت صدیقی

یاد ہے اپنے سفر سے پہلے
تو نے ہم سے کہا تھا
میں اب کھلے موسموں میں
قوسِ قزح کے رنگوں
بچپن کے ساحر خوابوں کی کھوج میں جاتا ہوں
جب میں اپنے سفر سے لوٹوں
تم سانسوں میں وصال کی خوشبو
آنکھوں میں امید کی لو
ہاتھوں میں پیار کے پھول لیے
اسی موڑ پر مجھ سے ملنا"
اور ہم پاگل
اسی موڑ پر ... جامد
جہاں رنگ نہ خواب نہ خوشبو
نہ سنگیت نہ گیت کا جادو
بس اک سناٹے کی یاہو
جس لمحے تو ہم سے بچھڑا
اس لمحے سے اب تک
جانے کتنی صدیاں گزریں
آنکھوں میں بے موسم کی برسات لیے
اور ہاتھوں میں تنہائی کے ہاتھ لیے
دل کے آئینے میں بس اک تیرا عکس جمال سجائے
ذہن میں تیرا خیال بسائے، لب پہ تیری بات لیے
ہم پاگل تیرے سودائی
جس لمحے تو ہم سے بچھڑا
تنہائی کے صحرا میں
[illegible]

ایک انٹرویو

یادگارِ فانی کا ٹمٹماتا چراغ

ڈی۔ اے۔ ہیرسین
قربان۔ سہارنپور

سب ہیں مری نگاہ میں غیب و شہود کے رموز
ربطِ لطیف ہے مرا نرگسِ نیم باز سے

یہ شعر ہے شہرۂ آفاق نعت و منقبت گو ہندو شاعر علامہ حضرت سادھو رام صاحب آرزو سہارنپوری شاگرد رشید مرحوم شوکت علی خاں فانی بدایونی کا۔ آرزو صاحب اب عمر کی اس منزل میں سفر کر رہے ہیں جہاں دو چار ہاتھ اب تو لبِ بام رہ گیا۔ وہ ۸۱ ویں سال میں ہیں ضعف و نقاہت نے بہت حد تک انہیں چلنے پھرنے سے معذور کر دیا ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا ہے سماعت میں فرق آچکا ہے۔ بصارت بھی نازک خرامی کے ساتھ دھوکہ دینے پر آمادہ ہے گویا ؎

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

وہ عمر کا بیشتر حصہ کلکتہ میں بسر کر کے اب اپنے وطن سہارنپور میں آگئے ہیں۔ سہارنپور کے ادب نواز حضرات نے یہ سوچ کر کہ جب تک اس محفلِ فن کی مدھم کرنیں جلوہ ریز ہیں غنیمت ہیں۔ جشنِ آرزو منانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ادھر اتر پردیش اردو اکاڈمی نے آپ کی خدمات کے صلہ میں دو سو روپیہ ماہوار وظیفہ تاحیات دے کر آپ کی قدر افزائی کی ہے۔

علامہ آرزو نے تمام عمر تصوّف و عرفان کی منازل طے کرنے میں گزاری ہے ان کے یہاں اس دشوار راہ گزر کے وہ وہ رموز و اسرارِ پنہاں منکشف کئے گئے ہیں جو انسان کو آخری حدود پر پہونچ کر ہی حاصل ہوتے ہیں اور بقولِ خود ؎

اللہ کا بندہ نہ مسلماں ہے نہ ہندو

یہاں من و تو کا امتیاز باقی نہیں رہتا صرف من تو شدم تو من شدی رہ جاتا ہے لیکن بقولِ آتش ؎

یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں

رسول اللہ ہوں یا جناب علیؓ حضرت حسینؓ ہوں یا خواجہ معین الدین چشتیؒ، رام ہوں یا کرشنا، عیسیٰ ہوں یا گرو نانک ان کو ہر آستانے سے محبت و عقیدت ہے اور ہر سجدہ گاہ پر ان کا سرِ نیاز خم ہو جاتا ہے کیونکہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں وہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

جبینِ شوق نے لبیک کہہ کے چوم لیا
ملا جو نقشِ کفِ پا سلیم چشتی کا

وجہ یہ کہ اب اسے ؏ ملنے لگا سراغ مقاماتِ [illegible] کا (آرزو)
ایسے ؎ نظر نہ آئے کسی کو تو کیا کسی کا قصور
نظر کے سامنے ہے مرکزِ شہود و ظہور (آرزو)

اس کے بعد اُس کے سامنے بجز رُوحانیت اور محبت باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے اوپر ایک وجد آفریں کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس کی زبان سے نکلتا ہے ؎

راز کیا راز کی حقیقت کیا۔ شرح و تفسیر راز نے مارا۔

لیکن یہ وہ نکتہ ہے جس کو عارفانِ دل سمجھتے ہیں

اس مختصر تمہید کے بعد آمدم بر سرِ مطلب۔ علامہ آرزو کے اخلاص و محبت کی ایک جھلک پیش کرتا ہوں۔ اللہ اللہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ.....

ایک ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے باوجود کبر سنی اور ضعف ۳ر فروری ۱۹۸۳ء کو آرزو صاحب رکشہ سوار پوچھتے پوچھتے میرے غریب خانے پر تشریف لے آئے مجھے جس قدر مسرت ہوئی اس کا اظہار الفاظ میں

ممکن نہیں۔ بہر حال میرے اور ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی بطور یادگار انہیں کے الفاظ میں ہدیہ ناظرین ہے۔

ق:۔ حضور آپ نے میرے غریب خانے پہ قدم رنجہ فرما کر مجھ ناچیز کی بے حد عزت افزائی فرمائی ہے یہ آپ کا کرم اور بزرگانہ شفقت ہے۔

آرزو:۔ قربان صاحب میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آج آپ کے در دولت پر حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

ق:۔ حضور آپ مجھے ناحق شرمندہ کرتے ہیں۔

آرزو:۔ نہیں میں آپ کی تصنیفات پڑھ چکا ہوں اور آپ کا مدّاح ہوں۔

ق:۔ یہ آپ کی کرم فرمائی اور ہمت افزائی ہے اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں چند باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

آرزو:۔ فرمایئے۔ میں حتی المقدور جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

ق:۔ آپ کو اپنی تاریخ ولادت یاد ہے؟

آرزو:۔ قربان صاحب دن اور تاریخ تو یاد نہیں لیکن ماہ دسمبر ۱۹۰۲ء نکھی دروازہ سہارنپور میں میری ولادت ہوئی تھی۔

ق:۔ غالباً آپ کی تعلیم بھی سہارنپور میں ہوئی ہوگی۔

آرزو:۔ میٹرک تک سہارنپور میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد میرٹھ اور لاہور سے بی۔ اے کیا۔ بعد ازاں انجینئرنگ ڈپلومہ حاصل کرکے کچھ عرصہ کوئٹہ بلوچستان اور ناگپور میں ملازمت کی پھر وطن سہارنپور واپس آگیا۔

ق:۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟

آرزو:۔ دو۔ فرزند سرکاری عہدہ دار ہے مگر میری جانب سے لاپرواہی برتتا ہے۔ دوسری بیٹی ہے وہ اپنے شوہر کے ساتھ احمد آباد میں مقیم ہے۔

ق:۔ یہ بچے اردو جانتے ہیں؟

آرزو:۔ لڑکا اردو جانتا ہے مگر اسے ادب سے کوئی شوق نہیں۔

ق:۔ آپ کے گھر میں شاعری و ادب کا کوئی ماحول تھا۔

آرزو:۔ قطعی نہیں۔

ق:۔ پھر آپ کو شاعری کا شوق کیسے پیدا ہوا۔

آرزو:۔ ان دنوں سہارنپور میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے میں بھی مشاعرہ سننے کے لئے جانے لگا اور سنتے سنتے مجھے شاعری کا شوق ہوگیا اور گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگا۔

ق:۔ سہارنپور میں آپ کس استاد کو کلام دکھاتے تھے۔

آرزو:۔ حکیم سہارنپوری کی بیٹھک میں باکمالوں کا مجمع رہتا تھا وہیں میں نے فن سیکھا لیکن کسی ایک استاد کی شاگردی میں نہیں رہا۔ ق:۔ یعنی آپ کا کوئی استاد نہیں رہا

آرزو:۔ جی ہاں مجھے فخر ہے کہ جناب فانی بدایونی میرے استاد تھے ویسے حضرت استاد فانی کسی کو شاگرد نہیں بناتے تھے ان کے دو چار ہی شاگرد تھے۔

ق:۔ انہوں نے آپ کو شاگرد بنانا کیسے قبول کرلیا

آرزو:۔ ان دنوں فانی صاحب آگرہ میں تھے وہاں ایک مشاعرے میں میں نے غزل پڑھی۔ فانی صاحب غزل کا مطلع سن کر بہت محظوظ ہوئے اور مجھے شاگردی میں قبول کرلیا۔ میں ان کے آخری دم تک خدمت کرتا رہا اور آگرہ و حیدرآباد میں انہیں کے ساتھ رہا۔

ق:۔ آپ کو وہ مطلع یاد ہے۔

آرزو:۔ جی ہاں ؎

لوٹ کر دل جو مہر انوار کا حامل ہو
اب یہ آئینہ تیرے جلوؤں کے قابل ہو

ق:۔ لیکن حضور ایک سوال میرے ذہن میں اٹھتا ہے وہ یہ کہ آپ کا کلام سراسر تصوف ہے آپ کے کلام میں استاد کے رنگ کا کوئی اثر نظر نہیں آتا وہ تو امامِ یاسیات تھے لیکن آپ کے یہاں یہ رنگ بالکل مفقود ہے۔

آرزو:۔ میں فلسفہ وحدانیت کا قائل ہوں جہاں تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری سمجھا جاتا ہے۔ ایک ایک دوسرے کا ہمدرد اور وفادار ہوتا ہے اور

ماحول میں یاس و مایوسی کا کوئی مقام نہیں۔ کہا ہے ؎

مجھے نگاہِ حقارت سے دیکھنے والو
میری نگاہ میں کوئی حقیر ہے نہ ذلیل

مجھے بس یہی افسوس رہا کہ لوگ محبت کی زبان نہیں سمجھتے ؎

زمانے کی تو شکایت ہی آرزو کیا ہے
وطن میں بھی کوئی اب ہم زباں نہیں ملتا

ق:۔ خوب۔ حضور آپ کلکتہ کب تشریف لے گئے۔

آرزو:۔ سب سے پہلے میں ۱۹۳۱ء میں کلکتہ گیا مگر چند روز بعد واپس آ گیا۔ دوبارہ ۱۹۴۰ء میں گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔

ق:۔ وہاں کن کن شعراء کے ساتھ ہم نشینی رہی۔

آرزو:۔ (ذہن پر زور دیتے ہوئے) وحشت کلکتوی علامہ ناطق لکھنوی۔ جمیل مظہری۔ آصف بنارسی۔ پرویز شاہدی۔ قمر صدیقی۔ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔

ق:۔ آپ کو وہاں کس طرح کا ادبی ماحول ملا۔

آرزو:۔ وہاں استادوں کے درمیان پارٹی بندیاں بہت تھیں اسی وجہ سے میں وہاں مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔

ق:۔ آپ کو کلکتہ شہر کیسا لگا۔ میرا مطلب ہے مرزا غالب کلکتہ کے بہت دلدادہ تھے انہوں نے کہا تھا ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

کیا آپ پر بھی اس قسم کا کوئی اثر ہوا ہے۔

آرزو:۔ (مسکرا کر۔ جیسے وہ اپنے ماضی کی یادوں میں کھو گئے ہوں) جی ہاں ؎

کلکتے سے چلا ہوں بصد زخم در جگر
ایک یادگارِ شہرِ نگاراں لئے ہوئے

ق:۔ واہ۔ اچھا حضور، آپ کن شعراء سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

آرزو:۔ میر تقی میر۔ غالب۔ استاد فانی، اصغر گونڈوی اقبال اور انیس کا مجھ پر بہت اثر ہے۔ ہاں ڈاکٹر اقبال میرے شعر سن کر بہت خوش ہوتے تھے۔ مشاعروں میں بہت داد دیتے تھے اور محبت سے مجھے مُنّا کہہ کر پکارتے تھے۔

ق:۔ درست ہے۔ آپ کی شاعری کا مزاج ان کی شاعری سے بہت کچھ ہم آہنگ ہے۔ اچھا حضور یہ فرمائیے کہ آپ کو نعت اور منقبت کہنے میں بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ آپ کے نعتیہ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ یہ کسی ہندو شاعر کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔ آپ کو یہ شوق کیسے پیدا ہوا۔

آرزو:۔ ناگ پور کے دورانِ قیام میں کچھ لوگوں کے ہمراہ میں بابا تاج الدین ناگ پوری رح کی خدمت میں جانے لگا۔ اولیائے اللہ کی خدمت کرنے کا مجھے لڑکپن سے شوق پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ ان کے سامنے نعت و منقبت پڑھا کرتے تھے میں نے بھی نعت کہنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں نے قرآن شریف، تفسیر قرآن و احادیث کا مطالعہ بھی کیا۔

ق:۔ عوام میں آپ کے اس کلام کی پذیرائی کیسی ہوئی۔

آرزو:۔ اس کے متعلق پہلی بات تو یہ کہ میرے سات مجموعے شائع ہوئے اور سب کے سب بک گئے بلکہ کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے مگر میرے پاس کوئی کاپی نہیں رہی۔

ق:۔ ان مجموعوں کے نام یاد ہیں۔

آرزو:۔ الہامِ سحر۔ نے و نغمہ۔ ظہورِ قدسی، بہارستانِ اولیاء۔ آیاتِ ادب۔ شعاعِ بغداد اور حدیثِ آرزو زیرِ طبع۔ کتنے ہوئے؟

ق:۔ سات۔

آرزو:۔ جی ہاں سات ہی ہوں گے۔ اس کے علاوہ دو تین سو غزلیں غیر مطبوعہ موجود ہیں (مسکرا کر) قربان صاحب ایک اور واقعہ سنئے۔ ۱۹۵۲ء کا ذکر ہے میں بمبئی گیا ہوا تھا وہاں محمد علی روڈ پر گیارہویں شریف کی مجلس منعقد ہوئی۔ میں نے بھی اس میں حضرت غوث سے متعلق

ایک سلام پڑھا۔ بعد مجلس ایک رئیس میمن ضعیف نے اپنے منتظم سے کہا کہ اس شخص کو صبح ناشتہ پہ مدعو کرو۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر انہوں نے وہی سلام پڑھنے کی فرمائش کی۔ بہت محظوظ ہوئیں اور بولیں۔ میں بغداد جا رہی ہوں آپ میرے ہمراہ تشریف لے چلیئے۔ میں خاموش رہا۔ فرمایا۔ آپ کسی بات کا تردد نہ کریں میں نے اظہار رضامندی کر دیا۔ انہوں نے دو تین روز کے اندر میرے لیئے نئے کپڑے اور ضروری سامان مہیا کر دیا۔ میں ان کے ہمراہ بغداد چلا گیا۔ وہاں ایک ہفتہ قیام رہا۔ اور کعبہ معلی، نجف شریف و کربلا شریف کی زیارت سے مشرف ہوا۔

ق:۔ ان مقامات کی زیارت سے آپ کے اوپر کیا اثر ہوا۔

آرزو:۔ میرا خیال ہے کہ تمام مذاہب کی تعلیم یکساں ہے۔ میں مسلم اکابر کا اس لیئے مداح ہوں کہ وہ واقعی بزرگ۔ درویش۔ خدارسیدہ۔ مصلح قوم اور انسانیت کے فیض رساں نیز حق بات پر جان تک قربان کر دینے والے لوگ تھے۔

ق:۔ آپ نے ہند اکابرین کی توصیف بھی کی ہے۔

آرزو:۔ جی ہاں۔ میری کتاب شردھا نجلی نام سے ہندی میں شائع ہوئی ہے اس میں رام۔ کرشن۔ کالی۔ ہریشچندر۔ گرو نانک۔ مہابیر سوامی وغیرہ پر کلام ہے۔

ق:۔ آپ نے اور ممالک کی بھی سیر و سیاحت کی ہے۔

آرزو:۔ جی ہاں دو مرتبہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں نواب زادگان حیدر آباد دکن کے ساتھ انگلینڈ، آئرلینڈ اسکاٹ لینڈ اور فرانس گیا ہوں۔

ق:۔ حضور آپ نے حضرت عیسیٰ مسیح کے متعلق کچھ لکھا کہ نہیں۔

آرزو:۔ لکھا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میں اس جانب بہت دیر سے متوجہ ہوا۔

ق:۔ حضرت مسیح سے متعلق آپ نے کہاں سے واقفیت اصل کی

آرزو:۔ عیسائی مذہب سے میری واقفیت بہت پرانی ہے۔ سہارنپور میں پادری عبدالحق زبردست عالم تھے۔ انہوں نے مجھے اس مذہب سے روشناس کرایا۔ ان کے علاوہ پادری سلطان محمد پال بڑے محقق اور عالم فاضل شخص تھے۔ دونوں اصحاب نے بہت سے مسئلے بڑی حسن و خوبی کے ساتھ مجھے سمجھائے۔ پھر کلکتہ میں میرے مکان کے قریب ایک محترمہ مسز ایوا (EVA) رہتی تھیں انہوں نے مجھے نئے عہد نامے یعنی انجیل شریف سے بہت کچھ بتایا۔ اتفاق سے لکھنؤ کینٹ گرجے کے ایک انگریز فادر بوچامن سے شناسائی ہو گئی۔ میں ان کے اخلاق، خلوص، محبت اور عارفانہ زندگی سے بہت متاثر ہوا... (کچھ دیر چپ رہ کر) لیکن حضرت مسیح کے متعلق غور فکر کرنے اور ان کی توصیف و ثنا میں کچھ کہنے کی تحریک مجھے آپ کی مثنوی داستانِ عجیب پڑھنے سے ہوئی۔ بلکہ یوں کہوں کہ اس مثنوی نے میرے غور و فکر کی کایا پلٹ کر دی۔ حضرت مسیح سے متعلق مجھ پر ایسے کوائف انکشاف ہوئے جن کا مجھے قطعی علم نہیں تھا انسانیت کے لیئے ان کی قربانی اور صلیبی موت کا ذکر پڑھ کر میرے اوپر ایک رقت سی طاری ہو گئی۔

ق:۔ حضور آپ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سن کر مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ مثنوی لکھنے کی میری ساری محنت ٹھکانے لگ گئی اور مجھے اس کا اجر مل گیا۔

آرزو:۔ قربان صاحب خدا آپ کو عمر دراز بخشے آپ نے یہ مثنوی کہہ کر اپنے مذہب اور انسانیت کی عظیم خدمت انجام دی ہے۔

ق:۔ ذرہ نوازی کے لیئے بہت بہت شکریہ حضور۔

آرزو:۔ میں نے آپ کی تصنیف فکرِ حسین بھی پڑھی اس کے چند مقالات پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ حضرت واقعی ابنِ یزداں ہیں، مالک و مختارِ کل جہاں ہیں

میں نے دعا کی اے ابنِ یزداں مجھے بھی اپنا غلام بنا لیجئے۔ اس کے بعد یہ اشعار خود بخود میری زبان پر آگئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی غیبی طاقت مجھ سے یہ اشعار لکھوا رہی ہے سنیئے ؎

اللہ کی رحمت کا خزینہ ہیں مسیح
دریائے محبت کا سفینہ ہیں مسیح
سمجھا نہ کوئی مرتبۂ اصلی ان کا
فطرت کی انگوٹھی کا نگینہ ہیں مسیح

ق:۔ کیا کہنا استاد۔

آرزو:۔ غم گسارِ اہلِ غم چرخ کا چاند
ہے سراپائے کرم چرخ کا چاند
حشر کا دن آرزو آنے تو دو
سب کا رکھ لے گا بھرم چرخ کا چاند

ق:۔ سبحان اللہ۔ حضور یہ فرمایئے کہ آپ نے کسی کو اپنی شاگردی میں قبول کیا۔

آرزو:۔ اصلاح تو بہت لوگوں کو دی ہے مگر صرف ایک نیلوفر ناہید ادیب کامل علیگ، ساکن کلکتہ کو اپنی شاگرد سمجھتا ہوں۔

ق:۔ حضور خدا کے فضل و کرم سے اس عمر میں بھی آپ کی یادداشت قابلِ رشک ہے اور ہزارہا اشعار اردو فارسی کے نوکِ زبان ہیں۔ اگر زحمت نہ ہو تو اپنے چند پسندیدہ اشعار مرحمت فرمائیں۔

آرزو:۔ (حافظہ پر زور دیتے ہوئے) جو یاد آتا جائے گا عرض کئے دیتا ہوں۔

آرزو:۔ ؎ مشکل ہے نظر آئیں تجھے تیرے مقامات
اُٹھ جائیں نہ جب تک نگہ و دل کے حجابات

؎ ہے دل اربابِ محبت کا اسی سے
وہ نور کہ ہیں نورِ دلِ ارض و سماوات
افسوس کہ تو نے ابھی دیکھا نہیں ناداں
وہ عالمِ بے رنگ کہ دن ہے نہ جہاں رات

ق:۔ واہ واہ کیا بات ہے حضور۔ قطع کلامی معاف ہو جدید شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

آرزو:۔ میں کسی کو برا نہیں کہتا۔ ہر ایک اپنے جذبات کے اظہار کے لئے جو راستہ اختیار کرے ٹھیک ہے۔ لیجئے حضرت عیسیٰ سے متعلق اور اشعار یاد آگئے ؎

نئی لے میں سنا کر نغمہ ہائے سرمدی تو نے
عطا کر دی ضمیر و نفس کو پاکیزگی تو نے
اٹھا کر دیدہ و دل سے حجابِ درمیاں تو نے
دکھائے جلوہ ہائے قدسِ حسنِ بے نشاں تو نے
گنہ گاروں کے حق میں تیری ہستی ایک نعمت تھی
سراپائے کرم تھی رحم تھی شفقت تھی رحمت تھی
نہ جانے کتنے بیماروں کو اچھا کر دیا تو نے
نہ جانے کس قدر اندھوں کو بینا کر دیا تو نے
مگر دنیا پہ کیا کچھ کم یہ احساں کر دیا تو نے
کہ ہر انساں کی بخشش کا ساماں کر دیا تو نے
شہادت سے تیری پھر کھل گئے دروازے جنت کے
محبت سے تری پھر کھل گئے دروازے جنت کے

ق:۔ کیا بات ہے حضور۔

آرزو:۔ سنیئے ؎ خدا کرے تو [illegible] اس مقام سے گزرے
جہاں نہیں ہے [illegible] ایمان و کفر کی تفریق

اسی درمیان اندر سے چائے آگئی۔ میں نے چائے کا پیالہ پیش کیا۔ آرزو صاحب نے لرزتے ہاتھوں سے پیالہ تھام کر شکریہ کہا۔ میں نے کہا حضور میں احسان مند ہوں۔ آپ نے میری باتوں میں دلچسپی لی۔ خدا آپ کو عمرِ خضر عنایت کرے۔ میں نے اپنی تازہ ترین کاوش اردو کے مسیحی شعرا کی ایک جلد خدمت میں پیش کی۔ بہت خوش ہو کر قبول فرمایا۔ میں نے رکشہ بلایا اور ہاتھ کا سہارا دے کر انہیں سوار کرا دیا۔ یہ دن میرے لئے یادگار ہو گیا ہے۔ ••

طالب چکوالی

جی ۔ ایل ۔ ادیب
۱۴۷ مکند نگر ۔ غازی آباد

جناب طالب چکوالی دنیائے ادب میں اتنی شہرت حاصل کر چکے ہیں کہ محتاجِ تعارف نہیں ۔ جناب کیفی دہلوی ۔ جناب محروم ۔ جناب منوّر لکھنوی ۔ جناب امن لکھنوی ۔ سید مسعود حسن رضوی ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ جناب علی جواد زیدی ۔ جناب منوہر سہائے انور ۔ جناب ضیا فتح آبادی ، خواجہ احمد فاروقی اور کتنے اہلِ فن نے جی کھول کر تعریف کی ہے ممتاز اردو اور انگریزی کے رسائل نے بھی مدحت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ۔ روزانہ اخبارات میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ جہاں کہیں مشاعروں میں شرکت کی ہمیشہ لوگوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا ۔ میں بھی ان کے ادنیٰ مگر سچے مداحوں میں ہوں ۔

کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی سے واقفیت ضروری ہے شرط یہ ہے کہ شاعر واقعی شاعر ہو ۔ محض ردیف و قافیہ کی پابندیوں میں الجھا ہوا نہ ہو ۔ یا محض عوام سے محفلوں میں سستی داد لینے کے لئے شعر نہ کہتا ہو ۔

یہ بحث بہت طویل ہے کہ شاعر کون ہے ۔ یوں تو سادہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاعر وہ ہے جو شعر کہتا ہے ۔ کچھ حضرات نے ان مناظرِ فطرت کو بھی شاعر قرار دیا ہے جن کا دل پر گہرا اثر پڑتا ہے مگر اس وقت میں صرف انسان تک شاعری کو محدود کرتا ہوں ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر کیا ہے یا شاعری کیا ہے ۔ مولانا صفی لکھنوی نے بڑے سادہ الفاظ میں فرمایا ہے کہ

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بے کار ہے تو شاعری بے کار ہے

انگریزی زبان کے نقادوں اور شاعروں نے شاعری کی مختلف [illegible] اور مختلف زاویہ نظر سے تعریفیں کی ہیں

ڈاکٹر جانسن فرماتے ہیں ۔ شاعری موزوں مضمون ہے شاعری فن ہے جو خوشی کو حقیقت سے ملاتا ہے ۔

کارلائل :- موزوں خیالات شاعری ہیں ۔ اندازِ بیاں شاعر کی شخصیت کا جزو ہے ۔

شیلی :- اظہارِ تخیل کو شاعری کہتے ہیں ۔

ہیزلٹ :- تخیل اور جذبات کی زبان شاعری ہے ۔

کالرج :- شاعری سائنس کے برعکس ہے ۔ شاعری کا مقصد مسرت ہے صداقت نہیں ۔

ورڈس ورتھ :- شعر علم انسانی کی سانس اور روح ہے

ایک فارسی شاعر کہتا ہے :- شاعری جزویست از پیغمبری

الغرض شاعری کے متعلق اس بات پر سب متفق ہیں کہ مناسب الفاظ میں احساسات اور تخیل کے اظہار کو شاعری کہتے ہیں ۔ یقینی شاعر کی شخصیت اس کے کلام میں نمایاں ہوتی ہے ۔ ان باتوں کے پیشِ نظر ہم جناب طالب کی شخصیت اس کے بعد ان کے کلام پر نظر ڈالیں گے ۔ اگرچہ اس مختصر مضمون میں صرف سرسری نظر ڈالی جا سکتی ہے ۔

صوری اعتبار سے جناب طالب کی شخصیت جاذبِ نظر ہے ۔ قد متناسب ۔ رنگ گورا ۔ جسم جامہ زیب [illegible] سڈول ، چہرہ آئینہ دل کی طرح صاف ۔ متانت اور سنجیدگی ہر طرزِ عمل سے نمایاں ۔ مگر برتاؤ میں خشکی نہیں ۔ ان کی پیشانی گزشتہ اور موجودہ عظمتوں کی آئینہ دار ہے اخلاق وسیع ۔ آئینۂ دل کدورت سے پاک ، محبت لفظ لفظ سے نمایاں ۔ ایک بار ملئے تو بار بار ملنے کو جی چاہے ۔ مہمان نوازی میں سب سے آگے ۔ کسی کی برائی

آپ ان سے شاید ہی سُن سکیں۔ باوجود شہرت کے غرور نام کو بھی نہیں۔

'برگ سبز' میں جناب طالب نے 'کچھ اپنے متعلق' کے عنوان سے مختصراً اپنے حالاتِ زندگی تحریر فرمائے ہیں۔ برگِ زرد میں تعارف کے عنوان سے مختصر حالات لکھے ہیں۔

۳۱ر مئی سنہ ۱۹ء کو بمقام چکوال ولادت ہوئی۔ مشکل سے ایک سال کی عمر ہوئی ہوگی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھوڑے ہی دنوں بعد ماں بھی داغِ مفارقت دے گئیں لیکن ان کے دادا لالہ ایشر داس نے فرطِ محبت سے پرورش کی اور اس یتیم کو دُرِ یتیم بنا یا۔ نام منوہر لال ہے۔ اور واقعی ان کا حسنِ اخلاق دلوں کو گرویدہ کرنے والا ہے۔ نام رکھنے والا یقینی کوئی رازدانِ مستقبل معلوم ہوتا ہے۔

تعلیم۔ بی۔ اے آنرس اور قانون میں ایل ایل بی تک پائی۔

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

ان کی ذہانت ابتدائے تعلیم سے نمایاں ہونے لگی۔ ہر امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ متعدد انعامات حاصل کئے۔

امتحانات سے فارغ ہوکر وکالت شروع کی۔ کچھ عرصہ وکالت کے بعد تجارت کی۔ شاعری کا شوق برابر جاری رہا۔ اکثر انگریزی مضامین بھی لکھے۔ بقول شاعر

"گلشن میں سرو۔ فوج میں مثلِ نشاں رہے
عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے"

بحیثیت ایک طالب علم کے صفِ اول میں۔ بحیثیت ایک وکیل کے معزز۔ بحیثیت ایک تاجر کے کامیاب اور بحیثیت ایک شاعر اور ادیب کے شہرتِ دوام کے حقدار بحیثیت ایک انسان کے قابلِ رشک۔

جہاں بھی رہے اُردو ادب کی پسندیدہ خدمت انجام دیتے رہے۔ دہلی آئے تو یہاں ادبی سبھا کے کنوینر رہے ہیں۔ ہندی ادیبوں، شاعروں اور علم دوست حضرات سے ہمیشہ قریبی اور مخلصانہ تعلقات رہے اور ہیں۔

نظموں پر کئی انعامات حاصل کئے۔ شعرائے دہلی اور بیرون جات نے ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھا۔ جناب امن لکھنوی حق گو ہیں۔ ان کا ارشاد ہے ؎

مرقعِ خلق کا نیکی کا قالب
سخن آرا منوہر لال طالب
وہ دل کی قوتوں کا بھی ہے عامل
دماغی قوتوں میں بھی ہے کامل

انگریزی۔ اردو اور پنجابی تینوں زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ پنجابی شاعری کی جھلک برگِ زرد کے آخر میں چند نظموں کی صورت میں نمایاں ہے۔

مذہبًا جناب طالب مہرشی دیانند کے بتلائے ہوئے ویدک دھرم کے پیرو ہیں۔ چنانچہ برگِ سبز میں صفحات ۹۶ اور ۹۷ پر نظم ستیارتھ پرکاش اسی عقیدے کے ماتحت لکھی گئی ہے جس کا ایک بند درج ذیل ہے مہرشی دیانند بانی آریہ سماج کی شان میں فرماتے ہیں۔

تیری وہ تعلیم جس سے کھل گیا سرِ حیات
جس سے ہم پر وا ہوئے رازِ جہان راہِ نجات
جس سے روشن ہوگئی اوہام کی تاریک رات
جس کی ہے مرہونِ منت ہند کیا سب کائنات
معنی رمزِ حقیقت ستیہ کا پرکاش ہے
اس کے نورِ پاک سے باطل کا پردہ فاش ہے

برگِ زرد میں ولادت آریہ سماج کا جشنِ صد سالہ کے عنوان سے بھی نظم اسی موضوع پر ہے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اس نئی تحریک سے حُبِ وطن
قوم کے افراد میں پیدا ہوا
آگ آزادی کی روشن ہوگئی
رفتہ رفتہ یہ شرر شعلہ ہوا

برگِ زرد ہی میں صفحہ ۹۸ پر شہنشاہ شہیداں کے عنوان سے شری سوامی شردھانند جی کے متعلق بھی ویدک دھرم کے بموجب ہی نظم تحریر ہوئی ہے۔ آغازِ نظم میں لکھتے ہیں ؎

اے نگہِ صداقت اسے نثار دیکھا
تیری حق گوئی کا شہرہ تیرا جانباز ہوا

جناب طالب کے کلام میں محبت اور حب الوطنی کے جذبات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ۱۹۲۹ء میں صدر کانگریس منتخب ہونے پر لکھتے ہیں۔

تاجِ ہفت اقلیم سے بڑھ کر ہے یہ کانٹوں کا تاج
قوم کا تحفہ ہے طالب ـــــ خارِ وطن

ستیہ گرہی، انقلاب، صدائے نہرو۔ ایکتا وغیرہ متعدد نظمیں ہیں جس میں انہوں نے ایک سچے دیش بھگت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

رواداری ان کے کلام کا ایک خاص جوہر ہے ہر مذہب کے اصولوں اور پیشواؤں کو انہوں نے شردھانجلی پیش کی ہے۔ حضرت مسیح، مہا دیو سوامی، حضرت محمدؐ، کرسمس وغیرہ نظمیں ان کی رواداری پر دلالت کرتی ہیں۔

اردو شاعری کے متعلق بہت سے معترض کہتے ہیں کہ اس میں شراب، کباب۔ گل و بلبل، شبِ ہجر کی بیقراری کے سوا کیا رکھا ہے۔ اگر وہ حضرات طالب صاحب کا کلام دیکھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ شراب کی مخالفت، وطن کی محبت۔ بڑوں کا ادب۔ خوش اخلاقی کی تعلیم سب مضامین موجود ہیں۔

غزل اردو کی سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن ہے اس میں جناب طالب نے اپنی مہارتِ فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ طالب کی غزلوں میں کہیں عریاں بیانی یا اخلاق سوز مضامین نظر نہ آئیں گے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینۂ خیال مرا علم و فن رہا
بجھ کر بھی یہ چراغ سرِ انجمن رہا

زندہ بشکلِ نور ہیں اقدارِ دائمی
نقشِ جدید عکسِ خیالِ کہن رہا

کہتا ہے کون حسن کو حاصل نہیں بقا
حسنِ خیال بن کے ترا بانکپن رہا

غربت میں بھی اداس نہ ہونے دیا مجھے
[illegible]

آواز دی کسی نے کہ موت آگئی قریب
یہ سن کے بھی میں اپنی ہی دھن میں مگن رہا

جناب طالب کے دو مجموعے اس وقت پیشِ نظر ہیں برگِ سبز اور برگِ زرد۔ ان میں مثنوی۔ قطعہ۔ غزل مسدس جملہ اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

طالب نے کسی شاعر سے باقاعدہ اصلاح نہیں مگر پنڈت برج نرائن چکبست کی طرح کلام میں پختگی البتہ جیسا انہوں نے خود لکھا ہے وہ مضمون کو فنی پابندی پر قربان نہیں کرتے وہ شاعرِ فطرت ہیں۔

ہر حقیقی شاعر مناظرِ قدرت سے متاثر ہوتا ہے حتیٰ کہ مرثیہ نگار شعرا نے بھی مناظرِ قدرت پر طبع آزمائی کی ہے۔ انیس۔ دبیر۔ مودب اور رشید مرثیہ نگاروں نے شاندار بہاریں لکھی ہیں۔ پھر طالب جیسا شاعر پر کیف مناظر کا اثر لئے بغیر رہ سکتا چنانچہ متعدد نظمیں اسی نوع کی ہیں۔ غمخانۂ فطرت ستاروں سے خطاب۔ صبح۔ لالۂ صحرا۔ صبحِ بہار وغیرہ نظمیں اسی طریقے کی ہیں۔

اپنے بچھڑے ہوئے یار پر پُردرد نوحے کہے ہیں ماہرینِ فن کا پُردرد الفاظ میں ماتم کیا ہے۔ محروم کیفی۔ منشی دیا نرائن نگم کی یاد میں پرزور نظمیں کہی ہیں۔

الغرض طالب صاحب کی نظموں اور غزلوں میں [illegible] بھی ہے اور پیغام بھی۔ آخر میں ایک اعتراض کئے بغیر نہیں رہا جاتا وہ ان کی تصنیف برگِ زرد کے نام پر برگِ زرد کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے کہیں خزاں کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ طالب صاحب لکھتے ہیں کہ میں آخری پتہ پھینک دیا۔ میں کیسے مان لوں برابر ان کی نظمیں رسائل میں نکلتی رہتی ہیں۔ شاعر بوڑھا ہو جاتا ہے اس کا کلام نہیں اور ما شاء اللہ طالب صاحب تو اس بھی جوان ہمت ہیں۔

آخر میں صرف یہ دعا ہے کہ طالب صاحب کی عمر دراز ہو تاکہ [illegible] تازہ سے تادیر [illegible]
[illegible]

پاکستانی ادیب اور گلوکار کے ہندوستان آنے کی داستان

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں میر تقی میر پر سیمینار وسط مارچ میں ہوا تھا۔ لاہور کے روزنامہ "امروز" نے ۲۲ مارچ کو اپنے کالم نویس مسعود اشعر کا ایک تبصرہ شائع کیا ہے کالم ہے "آئینہ" اور عنوان ہے "میر سیمینار اور پاکستانی وفد" "پاکستان کے دو ادیب کس طرح دہلی گئے"

یہ دو ادیب تھے انتظار حسین اور جمیل جالبی۔ تبصرہ درج ذیل ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میر تقی میر سیمینار شروع ہو گیا ہے یہ سیمینار ۱۹ مارچ سے شروع ہوا ہے اور اس میں دنیا بھر سے اردو لکھنے والے شرکت کر رہے ہیں دنیا میں پاکستان بھی شامل ہے اس کے بھی دو ادیب اس سیمینار میں شرکت کرنے روانہ ہو چکے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ یہ دلی کی خبر اس کالم میں دینے کی کیا ضرورت تھی یہ تو خبروں والے صفحات پر چھپ جائے گی لیکن ہمارا مقصد صرف خبر دینا نہیں ہے بلکہ ہم وہ بہت سی خبریں بھی آپ کے سامنے لانا چاہتے ہیں جو اس خبر کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پاکستان سے جو ادیب دہلی گئے وہ کس طرح گئے اور انہیں اس کام کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے۔

پہلے آپ صدر ضیاء الحق کا وہ انٹرویو یاد کیجئے جو انہوں نے ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس کے موقع پر دوردرشن کو دیا تھا۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں اور ثقافتی وفدوں کے تبادلے کی زبردست حمایت کی تھی اور ہندوستان کے ایک شاعر کو بہترین سفیر قرار دیا۔ اب سنئے میر سیمینار کے دعوت نامے کی کہانی۔ یہ دعوت نامہ چھ سات مہینے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور دعوت صرف دو پاکستانی ادیبوں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ پورے سات ادیب و نقاد بلائے گئے تھے قاعدے کے مطابق دعوت نامے اکیڈمی آف لیٹرز کے ذریعے بھیجے گئے تھے کہ پاکستان میں ادیبوں کی لگام اسی ادارہ کے ہاتھ میں ہے۔

چار پانچ مہینے تو اکیڈمی نے سانس ہی نہیں لی جب مدعو ادیبوں کی طرف سے دریافت کیا گیا تو کہا گیا کہ "ہاں انتظامات کئے جا رہے ہیں آپ کو بھیجنے کے" اس کے بعد پھر خاموشی۔ پھر پتہ چلا کہ اکیڈمی کے پاس ان ادیبوں کا کرایہ ادا کرنے کی رقم نہیں ہے اور جامعہ ملیہ والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اگر کرایہ بھی ادا کریں تو پاکستانی وفد بھیج دیا جائے گا۔ اس خط و کتابت میں چند مہینے اور گزر گئے آخر سیمینار کے منتظمین نے کرایہ ادا کرنے کی حامی بھر لی لیکن اس کے بعد اکیڈمی اور وزارتِ تعلیم میں پھر وہی خاموشی چھا گئی جیسے یہ معاملہ ہی ختم ہو گیا ہے اب دہلی سے بار بار یاددہانی کرائی جا رہی ہے اور یہاں وہی ایک خاموشی ہے سب کے جواب میں۔

آخر وزارتِ تعلیم میں تبدیلی ہوئی اور ڈاکٹر افضل نے وزارت سنبھالی۔ ڈاکٹر افضل کی ذاتی کوشش سے یہ مسئلہ پھر زندہ ہوا اور اکیڈمی کی فائلوں سے کاغذات برآمد کئے گئے لیکن اس وقت تک سیمینار میں صرف تین دن رہ گئے تھے اب بھی اکیڈمی نے سات ادیبوں کی بجائے صرف تین ادیبوں کے ناموں کی سفارش کی تھی۔ دو کراچی اور ایک لاہور سے۔ کراچی کے ایک ادیب نے جانے سے انکار کر دیا۔

اب رہ گئے "دو"۔

اب جانے والوں کی اپنی ہمت تھی کہ تین دن کے اندر سارے کاغذات مکمل کرا کے روانہ ہو گئے ورنہ اکیڈمی نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ کوئی ادیب بھی نہ جانے پائے۔

اس قسم کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت سے پاکستان کا نام ہی روشن ہوتا ہے دنیا بھر کے لوگ پاکستان کے بارے میں جانتے ہیں اور پاکستانی ادیب دوسرے ملک سے شناسائی پیدا کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اگر کوئی ملک آنے جانے اور ٹھہرانے کا سارا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہے تو آپ کو اجازت دینے میں کیا تکلیف ہے؟ اگر دو کے بجائے سات ادیب دہلی کے سیمینار میں چلے جاتے تو پاکستان کی اور آپ کی عزت ہی ہوتی۔ اور آپ کو تو ایک پائی بھی خرچ نہ کرنا پڑتی۔ آخر آپ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

ریشماں

کراچی کے روزنامہ "حریت"، نے پاکستان کی مشہور گلوکارہ ریشماں، کے ہندوستان آنے کا قصہ ۲۲ مارچ کو شائع کیا ہے عنوان ہے "اعزازات اپنی جگہ پر مگر مجھے تو سر چھپانے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی چاہیئے"۔ انٹرویو نگار رضا علی کاظمی نے ریشماں کا شمار پاکستان کے ان فن کاروں میں ہوتا ہے جو اندرون ملک ہر دلعزیز ہیں۔ وہ ممالک میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ ریشماں نے خانہ بدوشی کی زندگی سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور آج شہرت کی ان بلندیوں پر ہے جو ہر فن کار کا مقدر نہیں ہوتی لیکن اس کی سادگی اور بھولا پن اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس نے اپنے دوستوں، ہمدردوں اور برے دنوں کی یادوں کو فراموش نہیں کیا۔

حال ہی میں ریشماں کو ایک مقامی جوہری نے ہیرے کی انگوٹھی پہنا کر اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔ رضا علی کاظمی نے لکھا ہے کہ اس تقریب میں ریشماں نے اپنے حالیہ دورہ ہندوستان کی بابت کہانی سنائی جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک تکلیف دہ بھی ہے۔

یہ کہانی آپ ریشماں ہی کی زبانی سنیں تو آپ کو زیادہ لطف دے گی۔ ریشماں نے بیان کیا "جب میں بھارت سے پاکستان آئی تو میں ایک سال کی تھی میرے والدین اور کچھ عزیز بھارت سے پاکستان منتقل ہو گئے لیکن ہمارے بہت سے عزیز ابھی تک بھارت میں ہی مقیم ہیں خونی رشتے کے ناطے ہمارے والدین کی خواہش تھی کہ ہم ان سے ایک بار ملیں۔ چنانچہ ہم نے بھارت کے ویزا کے لئے درخواست دی ہمیں بھارت جانے کے لئے این او سی تو دے دیا گیا لیکن ہم پر یہ شرط عائد کر دی گئی کہ ہم وہاں کسی قسم کے گانے کے پروگرام میں حصہ نہیں لیں گے چونکہ ہمارا اصل مقصد تو اپنے بچھڑے ہوئے اعزا سے ملنا تھا لہٰذا اس شرط کو بخوشی قبول کیا گیا اور ہم لوگ بھارت چلے گئے۔

ہمیں فی آدمی ۴۵ ڈالر لے جانے کی اجازت ملی۔ ہم تین افراد کے لئے ۴۵/۴۵ ڈالر وہاں کے اخراجات کے حساب سے بے حد کم تھے۔ بمبئی میں جا کر ایک ہوٹل میں قیام کیا گو ہوٹل معمولی ہی تھا اور اس کے اخراجات بھی کچھ زیادہ نہ تھے لیکن دوسرے ہی دن ہمیں اپنے ۴۵ ڈالر کے ختم ہونے کے احساس نے پریشان کر دیا اور ہم نے خدا سے دعا کی کہ خدایا کوئی حل نکل آئے تاکہ ہمیں ناکام واپس نہ جانا پڑے اتفاق سے وہیں قریب ہی اسٹوڈیو میں دلیپ کمار بھی ایک شوٹنگ کے لئے آئے ہوئے تھے وہاں انہیں ہمارے آنے کی اطلاع ہوئی اور ہم بھی اپنے مسلمان بھائی فنکار سے ملنے اسٹوڈیو چلے گئے جب ہم نے اپنے آنے کی اطلاع دلیپ کمار کو بھجوائی تو انہیں پہلے تو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ پاکستان سے ریشماں آئے اور اس کا کوئی اعلان یا اطلاع نہ کی جائے جب انہوں نے مجھے بلا کر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ اور وہاں پر موجود تمام فنکار دنگ رہ گئے۔ گفتگو کے دوران دلیپ نے پوچھا کہ تم کہاں ٹھہری ہو میں نے ہوٹل کا نام بتایا تو انہوں نے

اپنے ذاتی ڈرائیور کو گاڑی دے کر ہمارے ساتھ بھجوایا اور ڈرائیور کو تاکید کی کہ انہیں سرک ہوٹل میں تبدیل کر دو یہ وہاں کا سب سے بڑا ہوٹل ہے جب ہم اس ہوٹل میں پہنچے تو ہماری پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا اس پریشانی کا سبب یہ تھا کہ اس ہوٹل کا خرچہ کون دے گا ہمارے پاس تو کوئی ایسی قیمتی شے بھی نہ تھی جسے ہم فروخت کرکے اس ہوٹل سے جان چھڑا سکتے۔

میں نے تمام صورتِ حال کے پیشِ نظر سائرہ بانو سے بات کی اور اپنی پریشانی کا سبب بتایا جس پر سائرہ نے بتایا کہ تم قطعاً پریشان نہ ہو۔ تم ہماری مہمان ہو۔ اب تمہارے بارے میں سوچنا ہمارے فرائض میں شامل ہے سائرہ کی اس بات سے مجھے کچھ سکون ہوا ورنہ میں کبھی ہوٹل کے باہر آتی تھی کبھی اندر جاتی۔ میری بے چینی دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ خاتون نئی نئی ہوٹل میں آئی ہیں شوق میں گھوم پھر رہی ہیں۔ لیکن میری دلی کیفیت کو میں ہی سمجھتی تھی۔ اس رات دلیپ کمار کے گھر پر میری دعوت کا اہتمام کیا گیا جب میں وہاں پہنچی تو وہاں بہت سے مہمان جمع تھے جن میں فلمی اداکار فلمی صنعت کے کچھ افراد اور کچھ معززینِ شہر شامل تھے۔ کھانے کے بعد مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں اپنے گائے ہوئے مقبول نغمے سناؤں۔ میں خاموش تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں انکار کرتی ہوں تو میرے ملک کی بدنامی ہوگی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے کہا کہ چونکہ میرے یہاں آنے کا مقصد اپنے اعزا سے ملنا تھا لہٰذا میں نے گانے کی اجازت کے لئے این او سی طلب نہیں کیا تھا اور اب چونکہ آپ نے اصرار کے پیشِ نظر انکار کرنا بھی بدتمیزی ہے لہٰذا کچھ گانے سناتی ہوں ویسے بھی یہ کوئی کمرشیل شو تو ہے نہیں لہٰذا رات دو بجے تک گانے کی محفل جاری رہی اس کے بعد ایک روز راج کپور اور امیتابھ بچن کے گھر پر بھی اسی نوعیت کی محفلیں منعقد کی گئیں میری آمد کی خبریں بھارت کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئیں تو بھارت کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی نے بھی مجھے بلایا اور گانے سن کر بے حد خوش ہوئیں اور میرے گانے کی تعریف کرکے میری حوصلہ افزائی کی۔ گانے کی محفل کے بعد میں نے اندرا گاندھی سے ایک دو شہروں میں جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا کہ "ریشماں تمہیں پورے ملک میں جانے کی اجازت ہے جہاں دل چاہے جاؤ اور سیر کرو۔"

جس گاؤں میں میرے عزیز رہتے ہیں وہاں بجلی نہیں تھی اور وہاں کے لوگ بارش کا پانی جمع کرکے پیتے تھے میں نے جب یہ صورتِ حال اندرا گاندھی کو بتائی تو انہوں نے اس گاؤں میں بھی بجلی اور پانی فراہم کرنے کے فوری احکامات صادر کر دئے اور آج کل وہاں بجلی بھی ہے اور پانی بھی۔ اس کے علاوہ وہاں سڑک بھی بن گئی ہے۔

اپنی طویل گفتگو کے دوران وہ ایک بار رک گئی اور کہا کہ بھائیو! اگر آپ بور ہو رہے ہیں تو میں خاموش ہو جاؤں، لیکن سامعین نے اصرار کیا کہ تم اسی طرح سناتی رہو۔

ریشماں نے بھارت کے دورے کے تاثرات کے بعد کہا کہ ہم اس ملک کے فنکار ہیں جنگ ہو یا امن ہماری آواز مال و جان تمام اس ملک کے لئے وقف ہے لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اگر ہمیں اپنے کسی مسئلہ کی وجہ سے کسی وزیر سے ملنا پڑ جائے تو وزیر صاحب تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا بلکہ مختلف حیلے بہانوں کے ذریعے ٹال دیا جاتا ہے۔ ریشماں کہتی ہیں کہ میں اس بات کی بے حد ممنون ہوں کہ صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے مجھے ایوارڈ کے شرف سے نوازا اور ۲۵ ہزار روپے کی خطیر رقم بھی دی لیکن کیا ہی بہتر ہوتا کہ وہ سر چھپانے کے لئے چند گز زمین بھی دے دیتے تاکہ میں اپنے اور بچوں کے سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ بنا سکتی۔ ●●

میر و غالب کی جنم بھومی

آگرہ میں ہند و پاک مشاعرہ

ڈاکٹر امبیڈکر کے یوم پیدائش پر ملک بھر میں تقریبات ہوئیں۔ آگرہ نے اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ رام جی امبیڈکر کا مجسمہ اکبر اعظم کے قلعہ کے سامنے ڈاکٹر امبیڈکر میدان میں نصب کیا گیا۔ شہر بھر میں گیٹ بنائے گئے اور راستوں کو سجایا گیا۔ اس موقع پر آگرہ کی رونق دوچند ہو گئی دوسرے دن مختلف ثقافتی پروگرام ہوئے اور انڈو پاک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے نامور اور نو عمر ابھرتے ہوئے شاعروں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی نمائندگی، عالمی شہرت کے حامل احمد فراز اور محترمہ پروین فنا سید نے کی۔

اس مشاعرہ کا انعقاد کنوینر مشاعرہ مسٹر رشید احمد قریشی مخلص قومی کارکن کانگریس (آئی) مشاعرہ سکریٹری، مسٹر ابرار حسین گوہر اور محمد صابر لطفی کے تعاون اور مسٹر گلاب سہرا وزیر حکومت، یوپی کی سرپرستی سے کیا گیا۔

نظامت کے فرائض مسٹر ابرار حسین گوہر نے انجام دئے اور سب سے پہلے اطہر نبی کو دعوتِ سخن دی انہوں نے اس شعر پر داد پائی ؎

مختلف رنگوں کے کاغذ سے سجائے رکھا
میں نے اس گھر کا ہر اک زخم چھپائے رکھا

اطہر نبی کے بعد رشاداں بارہ بنکوی جو مہمان ہو کر بھی مہمان نوازی کے فرائض انجام دئے ہیں مائک پر آئے اور یہ غزل پڑھی ؎

سفر میں ساتھ تو سب ہیں مگر میں جب مانوں
کہ میرے پاؤں کا کانٹا کوئی نکال تو دے

نظر ایٹوی، نوجوان شاعر ہیں خوبصورت ترنم سے غزل پڑھتے ہیں اور غزلوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

نکلو گے اگر تنہا غزلوں کے علاقوں میں
ہر لفظ کے سینے میں ارمان جواں ہوں گے

رعنا سحری کے ہاں فکر کی رعنائی اور جذبے کی تپش ہے جو انہیں اپنے ہم عمر شاعروں میں ممتاز کرتی ہے۔ رعنا سحری تحت میں شعر پڑھتے ہیں ؎

تتلی تو میں نہیں ہوں مگر مجھ کو چھو کے دیکھ
ایک نقش ذہن و دل پہ ترے چھوڑ جاتا ہوں

یہی نہیں کہ دیا راستے میں رکھ جانا
جب آئے شام میرا انتظار بھی کرنا

رعنا سحری کے بعد ناظم مشاعرہ نے مراد آباد سے آئی ہوئی شوخ و شنگ شاعرہ تسنیم صدیقی کو دعوتِ سخن دی انہوں نے چند شعر پہلے تحت میں اس کے بعد ایک غزل ترنم میں سنا کر سامعین سے داد پائی ؎

اب کے بچھڑوں گی تو کھو جاؤں گی
راستہ روک لے پاگل میرا

منظر بھوپالی، ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر ہیں، آگرہ کے اس مشاعرہ میں پہلی بار شرکت کی اور اپنے کلام و ترنم سے سامعین کو مکرر ارشاد، مکرر ارشاد کہلوانے پر مجبور کر دیا ؎

زینت بزم ہوا کرتی ہے دیوانوں سے
بات اتنی بھی نہ سمجھی گئی نادانوں سے

ان کے پیچھے بھی سیاسی کوئی لیڈر ہوگا
ورنہ انسان کہاں لڑتے ہیں انسانوں سے

مشاعرہ کے سکریٹری محمد صابر نظامی نے مخصوص شاعرانہ ترنم سے یہ غزل پڑھی ؎

انداز نرالا ہے ظالم کی محبت کا ....
ایک پل میں ہنساتا ہے ایک پل میں رُلاتا ہے

محمد صابر علی کے بعد ناظم مشاعرہ نے دہلی کے نوجوان شاعر شمس تبریزی کا نام پکارا، شمس تبریزی نے چند شعر اور ایک غزل سُنائی ؎

حادثوں سے مجھے جس شے نے بچایا ہوگا
وہ میری ماں کی دعاؤں کا ہی سایا ہوگا

کہیں بھی بیٹھ کے دو پہر کاٹ لوں گا میں
میرے دماغ میں ہیں پیڑ سایہ دار بہت

نوشاہ انوری نے پُر جوش انداز میں شعر پڑھ کر سامعین کو گرمادیا ؎

نئے انداز سے تعمیر اب کے گلستاں ہوگا
ہماری بجلیاں ہوگی، تمہارا آشیاں ہوگا
بس اسی امید پہ میں نے جلایا ہے چراغ
آندھیوں میں بچ گیا تو رہنما کہلاؤں گا

ایاز جھانسوی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ انہوں نے ایک قطعہ اور پھر ترنم سے ایک غزل سُنائی ؎

دولت بھی لے، عظمت بھی لے، ایمان بھی لے
میں اُف نہ کروں گا تو اگر جان بھی لے
اے لوٹنے والے، مگر ایک بات تو سن
پھر لوٹنا، پہلے مجھے پہچان تو لے

اس شعر پر

میرے نصیب کہ اب تک میں دربدر بھٹکا
وہاں نہ پہنچا جہاں انتظار میرا تھا

خوب خوب داد پائی

ایاز جھانسوی کے بعد خورشید افسر نے سنجیدہ لب ولہجہ میں غزل پڑھی ؎

جب سے تم نہیں آتے، مسئلے نہیں آتے
آندھیاں نہیں اٹھتیں، زلزلے نہیں آتے
دل کی راہ بھی شاید کٹ گئی ہے منزل سے
گرداب نہیں اُڑتی قافلے نہیں آتے

سکریٹری مشاعرہ و ناظم مشاعرہ ابرار حسین گوہر نے پہلے چند شعر اور پھر غزل پڑھی ؎

بارہا خطا کر کے یہ محسوس کیا ہے
جیسے کوئی چھُپ چھُپ کے مجھے دیکھ رہا ہے

تجھ سے بچھڑ کے تنہا ہوں، میرا قیاس تھا
ورنہ مرا ہی سایہ میرے آس پاس تھا

ناظم مشاعرہ نے اب انوکھے ترنم کے شاعر، زبیر رضوی کو دعوتِ سخن دی۔ زبیر رضوی بہت دیر سے سامعین کے سکوت کو بھانپ رہے تھے۔ مائک پر آئے اور ایسی غزل چھیڑی جس نے سامعین کے سکوت کو توڑ دیا ؎

سارا منظر ہے اجنتا کی گپھاؤں کی طرح
لڑکیاں شہر میں پھرتی ہیں گھٹاؤں کی طرح
بچ کے نکلو نہ یوں چندا سا بدن راہوں میں
رات بے رحم ہے قاتل کی جفاؤں کی طرح

زبیر رضوی واپس پلٹے لیکن سامعین اس کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اپنی پسند کا ایک گیت سُنایا اور پھر فرمائش پر اپنا مشہور گیت:
"یہ ہے میرا ہندستاں میرے سپنوں کا جہاں
اس سے پیار ہے مجھ کو" کے دو بند احمد فراز کی نذر کئے جو خود فراموشی کی حد تک خاموش بیٹھے تھے۔

زبیر رضوی کے بعد ناظم مشاعرہ نے پاکستان کے مہمان شاعر اور اردو کے مقبول ترین شاعر احمد فراز کا نام پکارا۔ احمد فراز کا تعارف نہایت جچے تلے الفاظ میں زبیر رضوی نے کرایا اور کہا، احمد فراز کی غزلیں جگجیت سنگھ، مہدی حسن اور غلام علی نے زیادہ گائی ہیں۔

اس میں گلوکار کی بڑائی نہیں۔ گلوکار کا تو کام ہی گانا ہے بڑا شاعر وہ ہے جس کی غزلیں فنکار گانا اپنے لئے باعث افتخار سمجھے۔ احمد فراز نہ صرف ہندوستان و پاکستان کے مقبول ترین شاعر ہیں بلکہ اردو کے تعلق سے دُنیا بھر میں جانے پہچانے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ اب تک احمد فراز کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں انہوں نے یہ غزل پڑھی ؎

آنکھ سے دُور نہ ہو، دل سے اُتر جائے گا
وقت کا پیار ہے، گزرتا ہے گزر جائے گا
اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

فرمائش پر انہوں نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کے ذریعے فراز کا نام ہندوستان پہنچا تھا ؎

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا خبر کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

پروین فنا سید بھی آج کل پاکستان سے آئی ہوئی ہیں سنجیدہ شعر کہتی ہیں۔ ان کی انگلیاں نبض دوراں دوراں پر رہتی ہیں اور تحت و ترنم دونوں میں پڑھتی ہیں انہوں نے پہلے تحت میں یہ شعر پڑھے ؎

تمہارا ذوق ہی کامل نہیں ہے
دگرنہ کوئی شے مشکل نہیں ہے
جہانِ رنگ و بو پہ ہنسنے والو!
یہ دُنیا موج ہے ساحل نہیں ہے

پھر یہ غزل ترنم سے پڑھی ؎

دل کی جلن نے آخر اس انداز سے آگ بجھائی....
اشک آنکھوں سے چھما چھم برسے، لب پہ ہنسی لو آئی

یوسف پاپا میاں مزاح میں اپنا جواب آپ ہیں انہوں نے محفل کو زعفران زار بنا دیا ؎

زلف کے پیچ میں اٹکے ہوئے شاعر کا وجود
تھک گیا ہوگا اسے مل کے اتار دو یارو
دَرد تو اپنی کمائی کا ہوا کرتا ہے
باپ کا مال ہے کھا کھا کے ڈکار دو یارو

ڈاکٹر عنوان چشتی کے مزاج میں شاعری رچی ہوئی ہے لیکن ادھر کچھ برسوں سے وہ تخلیق کے بجائے تنقید کے میدان میں کود پڑے ہیں اور ایک کے بعد ایک کتابوں کی تعداد بڑھاتے رہے ہیں لگتا ہے وہ پھر اپنی روش پر آ رہے ہیں انہوں نے نہایت مرقع غزل پڑھی ؎

تر آستیں ہی کی ہے نہ دامن بھگوتے ہیں
آنکھوں کی رسم چھوڑ کے ہم دل سے روتے ہیں

ڈوبنا ہی جو مقدر ہے تو خود میں ڈوبوں
میری آنکھوں میں جو پانی ہے وہ گہرا ہو جائے

ادھار جھانسوی 'ادھار' سے مزاح پیدا کرتے ہیں انہوں نے بہت قطعات سنائے مگر سامعین کی کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی ایک قطعہ آپ بھی ملاحظہ کریں ؎

مجھ کو کیا خاک جوانی کا مزہ آتا ہے
دودھ پیتا ہوں تو پانی کا مزہ آتا ہے
جو غذا کھاتا ہے اس دَور میں انسان ادھار
ہو بہو بھینس کی سانی کا مزہ آتا ہے

ناظم مشاعرہ نے راہی گوالیاری کو دعوتِ سخن دی وہ یوں غزل سرا ہوتے ؎

دل کو آباد کر لیجئے
پھول دامن میں بھر لیجئے
آپ ہو جائیں گے آشنا
کوئی الزام سر لیجئے

مہدی بدایونی غزل کا ایک معتبر نام ہے ؎

میں تو پھل تھا مجھ کو گرنا تھا، زمیں پر گرا
شاخ پر رہ بھی گیا ہوتا تو پتھر دیکھتا

آخر میں خان نسیم شیخ پوری کا نام پکارا گیا۔ انہوں نے یہ غزل پڑھی ؎

باقی نہ رہا ربط بھی دیوار سے در کا
منظر کوئی دیکھے مرے ٹوٹے ہوئے گھر کا

●●

بابِ انتقاد

عکسِ تمنا : مجموعۂ کلام کمال جعفری
حجم :- ۹۶ صفحات
قیمت :- پندرہ روپے
ملنے کا پتہ :- ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کمال جعفری کے فکری اور عمیق جائزوں کے عکس جو "عکسِ تمنا" بن کر کاغذی پیراہن پر بکھرے ہوئے ہیں میرے سامنے ہیں شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کلام سے اس کے عہد اور سماج کی تصویر کشی ہو کمال جعفری کی شاعری کے لئے میں اپنے پورے وثوق سے دعویدار ہوں کہ انہوں نے ہر موضوع پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے۔ کمال ان ادیبوں میں نہیں جنہوں نے صرف ذوق کی تشنگی بجھانے کے لئے فکری سفر کیا ہو بلکہ اپنے فن کو جولانی اور کو تابانی دینے کے لئے نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے ادب کو بھی پڑھا ہے سیکسپیئر کا مخصوص اسلوب بھی ان کے پاس ہے اور ملٹن کا رنگ بھی اپنے ذوقِ مطالعہ ہی کی وجہ سے "عکسِ تمنا" کی اشاعت میں عجلت نہیں برتی بلکہ موزوں وقت کا انتخاب کیا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے اور خود انہوں نے بھی یوں کہا

رک کے دم لے لوں سرِ راہ گزر
ایسا لمحہ کوئی آیا ہی نہیں

کمال جعفری اثباتی شاعر ہیں جن کے یہاں حراس نہیں ہے کہ آج کی شاعری عموماً NEGATIVE انداز پر گھومتی ہے۔

جن میں عظمت کی کرن تم کو نظر آئے کمال
ان ستاروں کی بلندی پہ نظر جانے دو

کمال نے اپنی شاعری کو اپنی محبوب کی زلفوں میں بھی اسیر نہیں ہونے دیا اور یہ بھی نہیں کہ غزل کی دلربائی سے انحراف کیا ہو۔ اگر انہوں نے اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کر کے شعریت کا پیکر دیا ہے تو اپنے اندر کا وہ عشق بھی نہ چھپا سکے کہ جو شاعری کا سبب ہوا

گفتگو عارض و گیسو کی بھی ہوگی لیکن
درد کی دھوپ تو چہرے سے

لیکن یہ ہی عشق اور محبت کا جذبہ اگر ان کے دل کی بات کو صفحات کی چادر پر بکھیر دینے کے لئے اکساتا ہے تو وہ یہ شکایت کئے بغیر بھی نہیں رہ پاتے کہ

اب تو یہ حال ہو گیا ہے مرا
اپنے ہر آشنا سے ڈرتا ہوں

کمال کے اشعار میں ان کا اپنا لہجہ ان کی اپنی زبان ہے کچھ شعر اور ملاحظہ ہوں

کوئی ترتیب دے سکا نہ جنہیں
ہم وہ بکھرے ہوئے ہیں افسانے

اک تسلسل ہے تفکر کا عجیب
جاگتے میں بھی ہیں ہم سوتے ہوئے

دورِ حاضر کا ہے شاعر آج بے امتِ رسول
فق ہے چہرہ ایسا جیسے رو رہا ہو کوئی پھول

خوشی کی بات یہ ہے کہ کمال جعفری میں اپنی زبان اور اپنے لہجے کو استعمال کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے "عکسِ تمنا" اس دعوے کا جواز ہے۔ ان کے مشاہدات جتنے ہمہ گیر ہوں گے اتنا ہی فن پختہ ہو تا چلا جائے گا کیونکہ انہوں نے ایسے بھی شعر کہے ہیں

مجھ کو اپنا ہی غم عزیز نہیں
میرے دل میں ہے کائنات کا غم

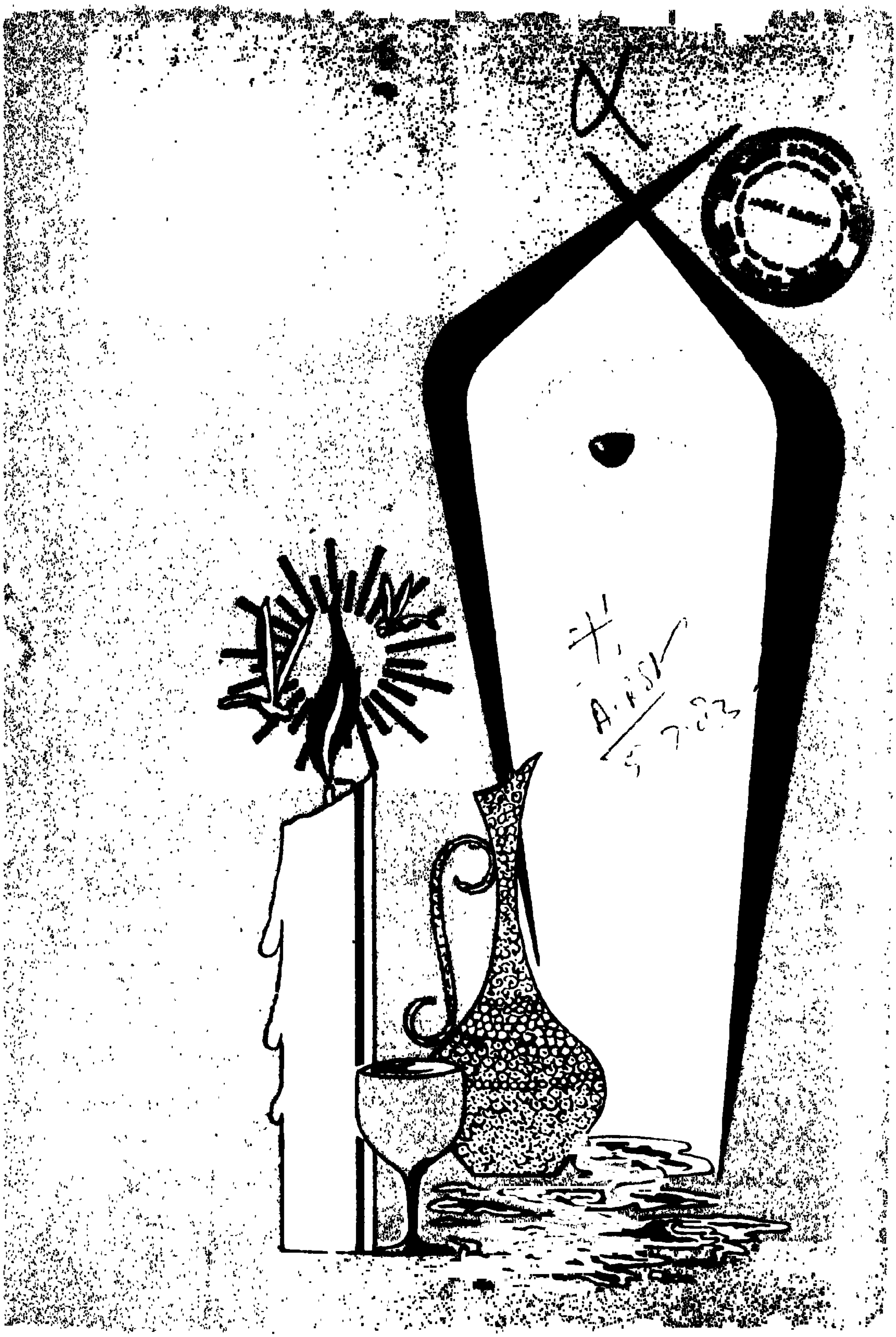
••

MAY 1983 Phone : 275602 Regd. No. D-(DN)370

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





بُلبُل چہ گفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

کے۔ کے۔ کھلر کی کتاب "اردو کا آخری نقاد" میں

پنڈت جواہر لعل نہرو کے خلاف توہین آمیز الزامات

پاکستانی ادیب سعادت حسن منٹو نے اپنی کسی کتاب کا دیباچہ "پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام ایک خط" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں پنڈت جواہر لعل نہرو جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے کے خلاف ایسے الزامات لگائے گئے جو نہ صرف جھوٹے اور فرضی ہی تھے بلکہ توہین آمیز بھی تھے۔

اگر پاکستان کا کوئی ادیب ہندوستان کے وزیر اعظم کے خلاف اپنے ملک میں بیٹھ کر جھوٹے، فرضی اور توہین آمیز الزامات لگاتا ہے تو سوائے اس کے کہ ہماری حکومت پاکستان کی حکومت سے احتجاج کرے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اگر یہی الزامات ہندوستان میں کوئی ادیب یا ناشر اپنی کتاب میں فخریہ طور پر نقل کرتا ہے تو یہ امر قابلِ مذمت ہی نہیں، بلکہ ایک جرم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کی یہ کتاب جب ہندوستان میں چور پبلشروں نے شائع کی تو جن چور اداروں نے اپنے ادارے کے نام سے اسے شائع کیا اُنہوں نے یہ دیباچہ شاملِ کتاب نہیں کیا۔ البتہ ایک آدھ ایسے چور ادارے نے یہ کتاب اس انداز میں شائع کی کہ جیسے یہ کتاب پاکستان مطبوعہ ہو اس نے اس دیباچے کو حرف بحرف شائع کر دیا۔

مسٹر کے۔ کے۔ کھلر ہندوستان کی وزارتِ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ اگر کھلر سعادت حسن منٹو کا یہ فرضی خط جو کبھی حوالۂ ڈاک نہیں کیا گیا، اپنی کتاب "اردو کا آخری نقاد" میں منٹو کی اعلیٰ اور منفرد ادبی پیش کش کے نمونے کے طور پر فخریہ انداز میں پیش کرتا ہے تو یہ در پردہ پنڈت جواہر لعل نہرو کے خلاف لگائے گئے فرضی اور جھوٹے الزامات کی حمایت کرتا ہے اور صاف لفظوں میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ جو کچھ لکھا وہ صحیح تھا۔

کھلر کی کتاب "اردو کا آخری نقاد" کے صفحہ ۱۲۱ پر لکھا ہے۔

"بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ منٹو نے ایک چٹھی پنڈت جواہر لعل نہرو کو لکھی تھی۔ اس چٹھی کی تاریخ ۲۰ اگست ۱۹۵۱ء ہے (یہ خط اس کتاب کے صفحہ ۱۲۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۳۱ تک چھپا ہے)"

ہم یہ طویل خط من و عن شائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے مگر ان فرضی، جھوٹے اور توہین آمیز الزامات کی ایک جھلک "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق دکھانا چاہتے ہیں، تاکہ آپ بھی اندازہ لگا سکیں کہ ایک ہندوستانی اعلیٰ سرکاری عہدہ دار کس قدر جرأت سے اپنے محبوب وزیر اعظم اور بے تاج بادشاہ کے بارے میں فخریہ طور پر جنہیں اپنی کتاب میں شائع کرتا ہے۔

۱۔ سیاست میں آپ کا نام میں بڑے فخر سے لے سکتا ہوں کیونکہ آپ بات کہہ کر فوراً تردید کر دیتے ہیں۔

۲۔ آپ صرف اس لئے کشمیر کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں کہ آپ کو کشمیر سے کشمیری ہونے کے باعث بڑی مقناطیسی قسم کی محبت ہے۔

۳۔ میں صرف بانہال تک گیا ہوں۔ کد، بٹوت، کشتواڑ یہ سب علاقے میں نے دیکھے ہیں۔ لیکن حسن کے ساتھ میں نے افلاس چپکا دیکھا۔ اگر آپ نے اس افلاس کو

ــــ دُور کر دیا ہے تو آپ کشمیر کو اپنے پاس رکھئے مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کشمیری ہونے کے باوجود اسے دُور نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ آپ کو اتنی فرصت ہی نہیں ہے۔

۴۔ یہ بخشی وغیرہ اب بخشش دینے کے قابل ہیں۔ اول درجے کے چار سو بیس ہیں۔ انہیں آپ نے خواہ مخواہ اپنی ضروریات کے مطابق اعلیٰ رُتبہ دیا ہے۔

۵۔ آپ نے جوناگڑھ پر ناجائز طور پر قبضہ کر لیا جو کوئی کشمیری کسی مرہٹے کے زیرِ اثر ہی کر سکتا ہے میرا مطلب ٹیل سے ہے۔

۶۔ حیدرآباد پر بھی آپ نے جارحانہ حملہ کیا۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا۔ اور آخر میں اس پر قبضہ جما لیا۔ کیا یہ سراسر زیادتی نہیں آپ کی؟

۷۔ آپ ہمارے دریاؤں کا پانی بند کر رہے ہیں۔

۸۔ لیکن ہم دونوں ایسی بندو قیں ہیں جو کشمیریوں کے متعلق مشہور کہاوت کے مطابق "دھوپ میں گھس کر تی ہیں"۔

۹۔ آپ ماشاء اللہ امریکنوں میں بڑے حسین متصوّر کئے جاتے ہیں۔

۱۰۔ آپ کو میرے اس خط سے جلے ہوئے گوشت کی بُو آئے گی۔ آپ کو معلوم ہے ہمارے وطن کشمیر میں ایک شاعر غنی رہتا تھا جو غنی کشمیری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پاس ایران سے ایک شاعر آیا اُسکے گھر کے دروازے کھُلے تھے۔ اس لئے کہ وہ گھر میں نہیں تھا۔ وہ لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ میرے گھر میں ہے کیا جو میں دروازے بند رکھوں۔ البتہ جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو دروازے بند کر دیتا ہوں اس لئے کہ میں ہی تو اس کی واحد دولت ہوں۔ ایرانی شاعر اس کے دیوان گھر میں اپنی بیاض چھوڑ گیا۔ اس میں ایک شعر نامکمل تھا۔ مصرعِ ثانی ہو گیا مگر مصرعِ اولیٰ اس شاعر سے نہیں کہا گیا تھا۔ مصرعِ ثانی یہ تھا۔

مصرع کہ از لباسِ تو بُوئے کباب می آید

(کہ تیرے لباس سے کباب کی بُو آتی ہے)

جب ایرانی شاعر کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو اس نے بیاض دیکھی۔ مصرعِ اولیٰ موجود تھا۔

مصرع کدام سوختہ جان دست زد بہ دامنِ تو

(کس سوختہ جان نے تیرے دامن پر ہاتھ مارا ہے)

چوں کہ کھوسلا اور اس کی کتاب کا ناشر سوز دونوں ہی فارسی سے نابلد ہیں اس لیئے دونوں نے اپنی بدذوقی کا ثبوت مصرعِ اولیٰ کو کتاب میں یوں شائع کیا ہے۔

مصرع کدام سوختہ جان دست زد بدامانم

دونوں مصرعوں کو ملا کر اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ "کس سوختہ جان نے تیرے دامن پر ہاتھ مارا ہے کہ تیرے لباس سے کباب کی بُو آتی ہے" دوسرے لفظوں میں منٹو یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے کتنوں کا خون کیا ہے اور کتنوں کو جلایا ہے۔ اور ان کے جلے ہوئے گوشت کی بُو تیرے لباس سے آ رہی ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو سے متعلق ایک پاکستانی ادیب کی اس یاوہ گوئی کو ہندوستان میں کسی کتاب میں فخریہ طور پر اہتمام سے پیش کرنے پر چاہیئے تو یہ تھا کہ کتاب کے مصنف، پبلشر، پرنٹر سب پر مقدمہ چلایا جائے اور یہ کتاب ضبط قرار دی جائے۔ مگر داد دیجئے ہمارے محکمۂ تعلیم کے سربراہوں کو کہ جو اس کتاب کے مصنف مسٹر کھوسلا کو ڈپٹی سکریٹری سے ترقی دے کر ڈائریکٹر بنا رہے ہیں۔ اور اس پر غضب یہ ہے کہ اس کتاب کو محکمۂ تعلیم کی لائبریریوں کے لئے سرکاری طور پر خریدا گیا ہے۔

کہاں ہیں ہماری پارلیمنٹ کے معزز ممبران جو اپنے پارٹی کے کسی ممبر کو زیادہ چھینکیں آنے پر بھی پارلیمنٹ میں سوال اٹھاتے ہیں کہ حکومتِ ہند موسم پر کنٹرول کیوں نہیں کرتی کہ جس کی وجہ سے ہمارے ممبر کو زیادہ چھینکیں آ گئی ہیں۔ کیا ان کے نزدیک مسٹر کھوسلا کا یہ کارنامہ قابلِ انعام ہے کہ اسے ترقی دے کر ڈائریکٹر بنایا جا رہا ہے۔

ہم کانگریس آئی اور حزبِ مخالف کے معزز ممبرانِ پارلیمنٹ سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں وزیرِ تعلیم سے دریافت کریں کہ کیا وجہ ہے کہ کھُلر کی اس کتاب کو اب تک ضبط قرار نہیں دیا گیا اور بجائے کھُلر کی معطلی کے اسے ترقی کس بنا پر دی جا رہی ہے۔ ہم ایسے معزز ممبرانِ پارلیمنٹ سے ذاتی طور پر مل کر کھُلر صاحب کی کتاب میں پنڈت نہرو پر لگائے گئے ان توہین آمیز الزامات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں جو کہ اردو پڑھ سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں وزیرِ اعظم صاحبہ سے بھی بطورِ خاص ملتجی ہیں کہ وہ اس مسئلے کی طرف فوری توجہ دینے کے لئے وزارتِ تعلیم کو ہدایات جاری کریں۔

ع شورِ ناقوس کو بھی صوتِ اذاں کر مسلم

روزنامہ "قومی آواز" ایک اچھا روزنامہ ہے اور اسے کانگریس آئی کا آرگن سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے بھی آنکھیں موندی نہیں جا سکتیں کہ اس اخبار کے کارکنان یہ سمجھتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے قومی آواز کو مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کے لئے سیکولرازم کے پردے میں مسلم نواز پالیسی اختیار کی جائے۔ اس روزنامہ کے صفحۂ اول پر اکثر سرخیاں عربی رسم الخط میں لکھی ہوتی ہیں جنہیں غیر مسلم قارئین کو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے جناب موہن چراغی صاحب کی توجہ اس طرف مبذول بھی کرائی مگر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے جس کا مطلب یہی تھا کہ عربی رسم الخط ہی تو مسلمان قارئین کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔

خیر۔ اس زمانے میں کسی اخبار یا رسالے کی تعدادِ اشاعت بڑھانے کے لئے جو بھی ہتھکنڈے استعمال کئے جائیں اس پر ہمیں کچھ کہنے کا کوئی حق نہیں مگر جب قومی آواز میں "رمضان المبارک کا پیغام" کے زیرِ عنوان نظم میں رضی بدایونی کا یہ شعر نظر سے گزرا ؎

پھر زمانے کو دکھا شانِ بلالِ حبشی
شورِ ناقوس کو بھی صوتِ اذاں کر مسلم

تو ہمیں حیرت ہوئی کہ سیکولر پالیسی کے دعویدار اور کانگریس (آئی) کے آرگن میں یہ شعر کیوں کر شائع ہو سکا۔ اس شعر کے دوسرے مصرعے کا صاف لفظی مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان جس جگہ سے شورِ ناقوس اُٹھ رہا ہو اُس کو اذان کی آواز میں بدل دے۔ اور یہ بات بالکل عیاں ہے کہ شورِ ناقوس مندروں سے اُٹھتا ہے اور اذان کی آواز مسجدوں سے تو اس مصرعے کا در پردہ مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمان مندروں کو مسجدوں میں بدل دے۔

اگر کانگریس آئی کا ترجمان قومی آواز مسلمانوں کو ایسا درس دینے کا کھُلم کھُلا اظہار کر سکتا ہے تو ہمیں جناب یش پال کپور صاحب اور محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ وزیرِ اعظم کی خدمت میں یہ گزارش کرنا ہو گی کہ نہ تو یہ سیکولرازم ہے اور نہ ہی کانگریس آئی کے مینو فیسٹو میں یہ درج ہے کہ وہ محض مسلمانوں کے ووٹ محفوظ کرنے کے لئے اس قسم کے نامناسب خیالات اور مجنونانہ جذبات کا اظہار کرنے کی کسی کو اجازت دے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ وزیرِ اعظم صاحبہ اور یش پال کپور صاحب قومی آواز کے ذمہ دار ادارتی ارکان کو خبردار کریں کہ اس قسم کی نازیبا حرکتوں سے قومی آواز کو پاک ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔

مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال

فروری ۸۳ء کے "شانِ ہند" میں مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی بھوپال سے متعلق ایک شذرہ شائع ہوا تھا جس کے بارے میں مدھیہ پردیش کے اردو پرستوں کے درجنوں خطوط ایڈیٹر شانِ ہند کی توجہ مبذول کرانے کے لئے موصول ہوئے ہیں کہ کس طرح اردو اکاڈمی بھوپال کے سکریٹری فضل تابش صاحب اردو اکاڈمی کو ذاتی جاگیر بنائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مدھیہ پردیش اردو تحریک کمیٹی بھوپال کا شائع کردہ پوسٹر "اردو کا مقدمہ عوام کی عدالت میں" دفتر شانِ ہند میں موصول ہوا ہے۔ اس پوسٹر کی ضمنی سرخیاں "مدھیہ پردیش اردو

اکیڈمی، ایک سوال، "وزیر اردو اکیڈمی خاموش تماشائی..." اور "سکریٹری اردو اکیڈمی کے کارنامے" مدیر شانِ ہند کی توجہ کھینچے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کے ساتھ ہی جناب سلطان احمد صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ) جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ "اجین" نے تحریر فرمایا ہے کہ اس پوسٹر میں لکھی باتیں حرف حرف صحیح ہے۔ اس پوسٹر میں جو الزامات سکریٹری اردو اکاڈمی بھوپال پر لگائے گئے ہیں اگر بقول سلطان احمد صدیقی صاحب حرف حرف صحیح ہیں تو شرافت اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ فضل تابش صاحب یا تو استعفے دے دیں یا پھر ان الزامات کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ افسوس ہے کہ مدھیہ پردیش کے متعلقہ وزیر (جن کے تحت اردو اکاڈی ہے) بھی اس سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کو خود مسلمان ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں، حیدرآباد اور اتر پردیش کی اردو اکیڈمی کی طرح ہر اکاڈمی کا سکریٹری غیر مسلم ہو تو یہ اکاڈمیاں بہتر کارکردگی دکھا سکتی ہیں۔

مدھیہ پردیش کے متعلقہ وزیر اگر چاہتے ہیں کہ مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی واقعی اپنے فرائض ٹھیک طرح سے نبھائے تو اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اکاڈمی کا سکریٹری کوئی غیر مسلم مقرر کیا جائے۔ حیدرآباد اور اتر پردیش میں یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا ہے اور مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کے حالات ٹھیک کرنے کے لئے بھی یہی نسخہ استعمال کیا جانا ضروری ہے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی شیعہ سنی جھگڑے کے باعث بدنام ہوئی جس روز سے غیر مسلم سکریٹری آئے ہیں یہ مصیبت کافی حد تک از خود ختم ہو گئی ہے۔ اسی طرح مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی میں فضل تابش صاحب نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے کسی بھی غیر مسلم سکریٹری کے آجانے سے یہ شکایت از خود ختم ہو جائے گی۔

بی بی ناتیئوں والی

لکھنؤ دور درشن کی پیشکش "بی بی ناتیئوں والی"

کئی اقساط میں دو بار ٹی۔ وی پر دکھائی گئی ہے۔ قومی یکجہتی باہمی میل ملاپ، اخلاقی رکھ رکھاؤ۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا۔ پڑوسی کے حقوق، اردو زبان کی شیرینی۔ بلا تخصیص مذہب و ملت ایک دوسرے کے کام آنا۔ اور لکھنوی تہذیب کا یہ ہمہ رنگی پروگرام بلا شک و شبہ ہندوستانی دور درشن کا ایک ایسا قابلِ قدر کارنامہ ہے جسے ہم فخر کے ساتھ کسی بھی ملک کے ٹی۔ وی پروگراموں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی پاکستان کے ٹی۔ وی پروگراموں کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ کہتے ہیں مگر "بی بی ناتیئوں والی" ایسا ہمہ صفت پروگرام شاید ہی کسی ملک میں ٹی وی پر پیش کیا گیا ہو۔

یہ مسلسل پروگرام بی بی ناتیئوں والی (محترمہ پرمود بالا) اور مرزا صاحب (جناب دشوناتھ مشرا) دو کرداروں کی اداکاری کا ایک ایسا بہترین اور جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ ان دونوں کرداروں کے اصلی نام بھی ڈرامائی ناموں میں ضم ہو کر رہ گئے ہیں۔

لکھنؤ دور درشن کی یہ پیشکش بلا خوفِ تردید ایک ایسا قابلِ تعریف اور قابلِ قدر کارنامہ ہے جس پر ہندوستانی دور درشن جس قدر بھی ناز کرے کم ہے اگر ہمارے ہاں سرکاری انعام و اکرام محض سفارشوں اور صاحبِ اقتدار لوگوں تک رسائی رکھنے والوں کی دست رس کے رہینِ منت نہ ہوں تو محترمہ پرمود بالا اور جناب دشوناتھ مشر یقینی طور پر "پدم شری" کے اعزاز کے مستحق ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح محترمہ پرمود بالا اور مشر صاحب نے اپنے آپ کو بی بی ناتیئوں والی اور "مرزا" کے کردار میں گم کر دیا ہے ہمارے ہاں کے بڑے سے بڑے فلمی اداکار بھی اس انداز سے یہ کردار نہ نبھا سکتے تھے۔

ہم وزیر نشریات کی انصاف پسندانہ روایات سے امید رکھتے ہیں کہ وہ سرکاری طور پر بی بی ناتیئوں والی اور مرزا صاحب کی عزت افزائی کریں گے۔

سینک سماچار کی اشاعت میں بے قاعدگی کا سبب

قابلِ توجہ وزیرِ دفاع

پارلیمنٹ میں ۶ر مئی ۸۳ء کو ایک معزز ممبر نے وقفہء سوالات میں فرمایا تھا کہ اخبار سینک سماچار میں نااہل سٹاف بھرتی کیا ہوا ہے جو پرنٹر کو وقت پر میٹر مہیا نہیں کرتا جس کی وجہ سے یہ اخبار مہینوں لیٹ شائع ہوتا ہے۔

«سینک سماچار» لیٹ کیوں چھپتا ہے اس کی وجہ نہ تو سینک سماچار کے سٹاف کی نااہلی ہے اور نہ ہی یہ عذرِ لنگ کہ پرنٹر کو وقت پر میٹر مہیا نہیں کیا جاتا۔ ہم معزز ممبرِ پارلیمنٹ اور جناب وزیرِ دفاع کی خدمت میں وہ وجوہات عرض کر رہے ہیں جن کی وجہ سے اخبار «سینک سماچار» اخباری حلقوں اور قارئین کی نظروں میں مذاق کا مضمون بنا ہوا ہے کہ وزارتِ دفاع کا ہفتہ وار اخبار مہینوں لیٹ چھپتا ہے۔

۱- «سینک سماچار» کو ہر زبان میں شائع کرنے کا ٹھیکہ مسٹر برج گپتا مالک یونیورسل ایڈورٹائیزرز جھنڈے والان دہلی کو دیا ہوا ہے۔ اس پرنٹر یعنی یونیورسل ایڈ ورٹائیزرز کا اپنا کوئی پریس نہیں اور اسے مختلف زبانوں کا سینک سماچار مختلف پریسوں میں چھپوانا پڑتا ہے اور پرنٹر کی اعلیٰ کارکردگی کا یہ ایک ادنیٰ سا ثبوت ہے کہ ہفتہ وار اخبار کو سہ ماہی اخبار سمجھ کر شائع کیا جاتا ہے۔

۲- حقیقت یہ ہے کہ ۱۹ر دسمبر ۸۲ء سے ۵ر مئی ۸۳ء تک کے شماروں کا میٹر دسوں زبانوں میں پرنٹر کے پاس اب سے بہت پہلے پہنچ چکا ہے چونکہ اپنا پریس نہ ہونے کے باعث پرنٹر کو سارا کام باہر سے کرانا پڑتا ہے اور اس کوشش اور کفایت کے ساتھ کہ مارکیٹ ریٹ سے کم نرخ میں کام ہو سکے اس لئے کوئی بھی پریس اس پرنٹر کا کام وقت پر دینے کا پابند نہیں ہے کیونکہ جب کسی پریس کو اپنی محنت کی پوری اُجرت نہیں ملے گی تو وہ ایسے کام میں دلچسپی کیوں لینے لگا اس لئے یہ سراسر جھوٹ ہے کہ سینک سماچار کا سٹاف وقت پر میٹر مہیا نہیں کرتا بلکہ سراسر یہ نااہلی پرنٹر کی ہے۔

۳- ہمیں اردو کاتبوں نے بتایا کہ پرنٹر انہیں سات روپیہ فی صفحہ کتابت دیتا ہے اور وہ بھی وقت بے وقت۔ جب کہ یہ ٹھیکیدار محکمہ دفاع سے چھبیس۲۶ روپیہ فی صفحہ اُجرتِ کتابت وصول کرتا ہے۔ اجمل رقم کاتب جو کہ شانِ ہند لکھتا ہے وہ اس پرنٹر کے ہاں کام کرنے کی غرض سے گیا تو اسے جب سات روپیہ فی صفحہ اجرت بتائی گئی تو وہ لاحول پڑھتا ہوا واپس آ گیا۔ عام رواج ہے کہ اگر کسی صفحہ میں تصاویر بھی ہوں تو تصاویر جس قدر جگہ میں آتی ہیں وہ بھی کتابت شدہ صفحہ ہی سمجھا جاتا ہے، مگر یہ پرنٹر تصاویر کی جگہ کی اُجرت نہیں دیتا۔ ایسی حالت میں وہی کاتب اردو سینک سماچار لکھنے کے لئے اس پرنٹر کو دستیاب ہوتے ہیں جو نو مشق ہوتے ہیں اور جنہیں کسی دوسرے اخبار یا رسالے میں کتابت کا کام ملنا ناممکن ہوتا ہے۔ اسی لئے سینک سماچار کتابت کے لحاظ سے ملک بھر میں سب سے زیادہ بدصورت اور بھدّی کتابت والا ہفتہ وار ہے۔

۴- کنٹریکٹ کے مطابق کاتبوں کو دفتر سینک سماچار میں بیٹھ کر ادارتی سٹاف کی ہدایات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ اور حالت یہ ہے کہ ایڈیٹوریل سٹاف کو کاتب کی شکل دیکھے تین تین ماہ گزر جاتے ہیں اور یہ سلسلہ بدنظمی محض پرنٹر کی وجہ سے ہے۔

۵- پرنٹر عام طور پر سینک سماچار لیٹ شائع ہونے پر یہ عذرِ لنگ پیش کرتا ہے کہ پریس میں ہڑتال ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پریس میں ہڑتال نہیں ہوتی بلکہ پرنٹر کے اپنے دفتر میں ہڑتال ہوتی ہے جو کہ پرنٹر کی بدعہدی اور عملے کو وقت پر اُجرت نہ دینے کے باعث ہوتی ہے۔ اور بفرضِ محال کسی پریس میں ہڑتال ہو بھی تو ڈیفنس منسٹری کے کام سے اس ہڑتال کا کیا تعلق؟ پرنٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ کنٹریکٹ کے مطابق یہ سرکاری کام کسی بھی دوسرے پریس سے کرا کے دے جب کہ محکمہ پریس برانچ کی طرف سے بھی ایسے حالات میں کسی بھی دوسرے پریس سے کام کرا...

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

تقسیمِ ملک سے پہلے تین مشتہرین ایسے تھے جو "مشتری ہشیار باش" کی معنوی تصویر تھے۔ یہ تینوں حضرات ہر شام کو جامع مسجد کے متصل سبزہ زار میں اکٹھے ہوتے اور عوام کی جیب سے اشتہاربازی کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ اور آسان سے آسان طریقہ سے روپیہ نکالنے کی تراکیب سوچتے۔ اس اتحادِ ثلاثہ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ فی ہزار اشاعت پر رسائل کو پانچ روپیہ فی صفحہ اور اخبارات کو اتنی ہی جگہ کے لئے یہی اجرتِ اشتہار دی جائے گی اس شرط پر ہر رسالہ یا اخبار ان سے جس قدر چاہے اشتہارات حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اشتہارات کی اجرت کی ادائیگی تبھی ممکن تھی کہ تعدادِ اشاعت کی تصدیق کرا دی جائے۔

تینوں حضرات ایک دوسرے سے بڑھ کر فطری اور ذہنی طور پر نہایت شاطر اور اعلیٰ مہذب اشتہاری نقب زنی کرتے تھے کہ قانونی طور پر بالکل محفوظ، معصوم اور دلی کے خاندانی شریف سمجھے اور جانے جاتے تھے۔ جس طرح ڈاکوؤں کے گروہ کا بھی ایک سردار ہوتا ہے اسی طرح اس اشتہاری تثلیث نے بھی ظفر نیازی کو اپنا امام مقرر کر رکھا تھا۔ ظفر نیازی بڑے ہی ہوشیار، چاق و چوبند اور خالص دلی پن کی مجسم تصویر ہونے کے مالک تھے۔ یہ مختلف پریسوں میں جاتے اور رسائل و جرائد کی تعدادِ اشاعت اپنی ٹیپ (فیتے) سے ناپتے۔ مثلاً ایک ہزار کتاب اگر پچ موٹائی رکھتی ہے تو تمام چھپا ہوا فرما اسی حساب سے ناپ لیا جاتا تھا جس سے کسی بھی اخبار یا رسالے کی تعدادِ اشاعت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں روسی نیوز پرنٹ کاغذ ۲۲ × ۱۸ سائز کا پندرہ آنے اور ۳۰ × ۲۰ سائز کا ایک روپیہ چار آنے میں رِیم ملتا تھا۔ اچھا خوشنویس ڈیڑھ روپیہ میں رسالہ شمع مِنَ کے سولہ صفحات کی کتابت کرتا تھا۔ اور چھپائی فی ایک ہزار کتاب کی آٹھ آنے سے ایک روپیہ تک ہوتی تھی۔

ماہنامہ "شمع" کے بانی الحاج حافظ محمد یوسف صاحب نے "شمع" کی توسیعِ اشاعت کے لئے ہمیشہ شمع کے مستقل خریداروں اور ایجنٹوں کی تعداد میں اضافہ پر دھیان دیا۔ حالانکہ عام طور پر رسائل و جرائد کے مالکان زیادہ سے زیادہ توجہ اشتہارات کی فراہمی پر صرف کرتے ہیں۔ ان دنوں شمع اپنی روشنی کی کرنیں پھیلانے میں کوشاں تھا اور مشتہرین کی یہ دہلوی تثلیث حیران تھی کہ شمع کا مالک ان کے حضور حاضر ہو کر حصولِ اشتہار کی درخواست کیوں پیش نہیں کر رہا۔ جب "شمع" کی طرف سے حصولِ اشتہارات کے لئے کوئی بھی سلسلہ جنبانی نہ ہوئی تو مشتہرین کی اس فرعون دماغ تثلیث نے مشورہ کیا کہ ظفر نیازی صاحب شمع کے مالک سے اشتہارات کی طباعت کے لئے گفت و شنید کریں۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق ظفر نیازی صاحب خود دفتر شمع کی تلاش میں نکلے اور حافظ محمد یوسف صاحب کو دعوت دی کہ وہ اکیڈمی روڈ میں تشریف لائیں۔ حافظ صاحب حسبِ وعدہ اکیڈمی روڈ جا پہنچے اور علیک سلیک کے بعد جب معاملہ پر بات چیت ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ شمع دو ہزار چھپتا ہے جس کی تصدیق ظفر نیازی صاحب پہلے ہی کر چکے تھے لہٰذا نرخِ مقررہ پر چند صفحات شمع میں اشاعت کے لئے دے دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی ظفر نیازی صاحب نے تاکید کی کہ ان کے دوسرے دو ہم پیشہ حضرات سے بھی اشتہارات لیتے جائیے۔ مسلم اور جیوتی کے مالک صاحبزادہ مستحسن فاروقی اپنے ان ہم پیشہ حضرات کے مقابلہ میں بد معاملگی کی صفت میں بھی جامع تھے۔ ان سے حافظ صاحب کا نباہ نہ ہو سکا البتہ دوسرے دونوں حضرات سے معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔

یہاں تک کہ شمع کی اشاعت چھ ہزار تک پہنچ گئی۔

ریلوے کی ہڑتال یا کسی دوسری وجہ سے نیوز پرنٹ کی کمی ہو جانے کے باعث ایک ماہ "شمع" کی اشاعت کے لئے کاغذ صرف اتنا میسر آسکا کہ یہ بجائے چھ ہزار کے دو ہزار ہی چھپ سکا۔ لہٰذا حافظ صاحب نے دو ہزار اشاعت کے حساب سے دس روپیہ فی صفحہ اُجرت کا بل بھجوایا تو چند دنوں کے بعد ایک ملاقات میں ظفر نیازی صاحب نے بڑے طمطراق کے ساتھ حافظ صاحب سے کہا کہ آخر پکڑ لی ہم نے آپ کی چوری — دوسروں سے دس روپیہ فی صفحہ اُجرت اشتہار لیتے ہو اور ہم سے تیس روپیہ فی صفحہ اُجرت لیتے ہو۔ اس مرتبہ تمہارے دفتر کے کلرک نے غلطی سے آپ کے مشورے کے بغیر ہمیں بھی دس روپیہ فی صفحہ کے حساب سے اُجرت کا بل بھجوایا ہے۔ آخر ہیرا پھیری ایک دن تو ثابت ہو کر ہی رہتی ہے۔ ظفر نیازی صاحب کی اس متکبرانہ تقریر پر حافظ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا میاں اس دفعہ شمع چھپا ہی دو ہزار ہے تو بل بھی اسی حساب سے بھجوایا گیا ہے۔ اس پر ظفر نیازی صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ شمع دو ہزار نہیں چھ ہزار ہی چھپا ہے، میں نے خود دفتر کے ہاں شمع کا سرورق چھ ہزار لگا دیکھا ہے۔ اس پر حافظ صاحب نے [illegible] کاغذ نہ ملنے کے باعث شمع دو ہزار ہی چھپا ہے [illegible] چھ ہزار چھپے [illegible] بقیہ چار ہزار سرورق اب بھی آپ دفتر کے ہاں دیکھ سکتے ہیں۔ اس پر نیازی صاحب کے دماغ کے چودہ طبق کھل گئے اور انہوں نے حافظ صاحب کو گلے لگاتے ہوئے کہا کہ آپ اس قدر دیانت دار ہیں اس کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اب میں کبھی بھی شمع کی تعداد اشاعت کے بارے میں تحقیق نہیں کروں گا اور آپ جس رقم کا بھی بل بھجوایا کریں گے ادا کر دیا کروں گا۔ اسی شام ظفر نیازی صاحب نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ حافظ محمد یوسف پہلا مالک و ایڈیٹر رسالہ دیکھا ہے جس نے دیانت داری کے معاملہ میں مجھے نیچا دکھا دیا ہے۔

کسی وقت شمع کے اشتہارات [illegible] غالباً [illegible] کا چار سو روپیہ اور نصف صفحہ کا اڑھائی سو روپیہ فی اشاعت تھا۔ کسی اشتہار دینے والی ایجنسی نے کسی کمپنی سے شمع کے لئے نصف صفحہ کا اشتہار چار سو فی صفحہ اُجرت کے خیال سے دو سو روپیہ میں لے کر اشتہار کا مسودہ دفتر شمع کو برائے اشاعت بھجوایا تو دفتر سے جواب گیا کہ نصف صفحہ کی اُجرت اشتہار اڑھائی سو روپیہ ہے لہٰذا ریلیز آرڈر اڑھائی سو اُجرت کا بھجوایئے۔ اس پر اشتہار بھجوانے والی ایجنسی نے لکھا کہ ہم نے بڑی کوشش کے بعد تو پارٹی سے اشتہار حاصل کیا ہے اور آپ ہیں کہ دو اور اڑھائی سو کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ مگر شمع کے ہاں تو اصول اور قاعدہ قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ لہٰذا اشتہار کی اشاعت سے معذوری ظاہر کر دی گئی۔ ایجنسی مذکورہ نے پارٹی سے اجازت لے کر بذریعہ تار اطلاع دی کہ اشتہار شائع کیا جائے اُجرت اڑھائی سو روپیہ ہی منظور ہے۔ اسی دوران کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ہندوستانی رسائل کا داخلہ پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا اور شمع کی اشاعت میں کئی ہزار کی کمی آگئی۔ چنانچہ جب اس اڑھائی سو روپیہ اُجرت کے نصف صفحہ والے اشتہار کا بل اس اشتہاری ایجنسی کو گیا تو وہ دو سو روپیہ سے بھی کم تھا۔ یہ بل دیکھ کر ایجنسی والوں نے دفتر شمع کو خط لکھا کہ آپ کا کاروبار عجیب قسم کا ہے کہ پہلے تو آپ نے دو سو کی بجائے اڑھائی سو روپیہ اُجرت لینے کا تقاضا کیا اور جب ہم نے پارٹی سے یہ اضافہ منظور کرایا تو بل دو سو سے بھی کم کا بھجوا دیا۔ آپ [illegible] اشتہار دینے والی پارٹی کی نظروں میں ذلیل کرانا چاہتے ہیں کیونکہ پارٹی تو یہی سمجھے گی کہ شاید ایجنسی والوں نے از خود روپیہ بٹورنے کی خاطر پچاس روپے کا بہانہ بنایا ہوگا۔ مگر دفتر شمع نے جواب میں لکھا کہ [illegible] تعداد میں چھپا ہے لہٰذا ہم اُجرت اشتہار [illegible] لیں گے۔ اس پر ایجنسی والوں نے لکھا کہ اشاعت کی کمی بیشی کا [illegible] حساب [illegible] آپ سے جو اُجرت طے ہو چکی ہے آپ وہ لے لیجئے۔ مگر شمع کے دفتر نے جواب دیا کہ ایسا کرنا ہمارے لئے ناممکن ہے ہم نے تمام مشتہرین اور

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

گوشۂ عقیل صدیقی

سرور تونسوی

انجمن دوستانِ ادب پٹھانکوٹ کا
تیرہواں ۱۳ کل ہند سالانہ مشاعرہ

پٹھانکوٹ (پنجاب) میں پنجابی زبان کے ایک شاعر ہیں جناب ستیہ پال راہی۔ تیرہ برس ہوئے کہ انہوں نے "انجمن دوستانِ ادب" کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کو ملک بھر میں متعارف کرانے کے لئے ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ پہلا مشاعرہ گو ان کی اپنی ہی مساعیٔ جمیلہ اور ذاتی تعلقات تک ہی محدود تھا مگر مشاعرہ بڑا کامیاب رہا اور "پھر قدم بڑھتے گئے اور کارواں بنتا گیا" کے مصداق آج اس انجمن دوستانِ ادب کا تیرہواں سالانہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ اب یہ انجمن دوستانِ ادب ملک میں ایک ایسی "اردو پرست" انجمن ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے، جہاں جناب پریم ادیب نے جناب پریم پرکاش نندہ ایڈوکیٹ، جناب اندر سین متل، جناب ڈاکٹر امیر چند جناب ڈاکٹر ایچ آر کھیڑا، ایسے حضرات نے اس انجمن کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں اپنا عملی تعاون دیا وہاں جناب دھیش مہاجن جناب نول کشور بخشی اور دیگر ممبرانِ انجمن کے علاوہ سردار ست پال سنگھ پال سردار ست وندر سنگھ باوا ایسے اراکینِ انجمن نے بھی انجمن اور انجمن کے زیرِ اہتمام ہونے والے مشاعروں اور پروگراموں کو کامیاب بنانے میں دامے درمے اور جسمے حصہ لیا۔ اور آج پٹھانکوٹ کی یہ انجمن دوستانِ ادب، ادبی دنیا میں بہترین اور کامیاب مشاعروں کی ایک ایسی علامت بن گئی ہے کہ ملک کا ہر چھوٹے سے بڑا شاعر انجمن دوستانِ ادب کے سالانہ مشاعرہ میں شریک ہونا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔

اس انجمن نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ہر سال اپریل کے آخری سنیچروار کو مشاعرہ ہوگا اور اراکینِ انجمن کوشش کرتے ہیں کہ ہر سال مشاعرہ میں ملک کے ایسے بہترین شعرا کو مدعو کیا جائے جو پہلے اس انجمن کے مشاعروں میں شریک نہ ہوئے ہوں۔ لہٰذا ہر سال چھ ماہ پہلے ہی شعراء حضرات کے انتخاب کا کام شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ شعراء ایسے ہیں جنہیں دو چار سالوں کے بعد پھر مدعو کر لیا جاتا ہے ورنہ کوشش یہی کی جاتی ہے کہ ملک کے کونے کونے سے اردو کے نمائندہ اور بہترین شعرائے کرام کو مدعو کیا جائے۔ ہر سال شعرائے کرام کی تلاش اور ان سے معاملات طے کرنے کا جان لیوا کام جناب ستیہ پال راہی صاحب کو ہی انجام دینا ہوتا ہے (جان لیوا اس لئے کہ آج کل شعرا حضرات کے نخرے اور ناجائز مطالبات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ بیٹی کی شادی کرنا تو آسان ہے مگر مشاعرہ کرانا مشکل ہو گیا ہے)

راہی صاحب کئی سال سے دفتر شانِ ہند میں تشریف لاتے ہیں اور اکثر شعرا کے انتخاب کے لئے مشورہ کرتے ہیں۔ ان کا ہر مشاعرے کے موقع پر یہ فرمان رہا کہ میں ان کے مشاعرے کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا حال تحریر کروں۔ مگر میری مصروفیات اور علالت ان کے فرمان کی تعمیل میں سدِّ راہ رہی، تین چار مرتبہ میں نے وعدہ بھی کیا مگر حالات اور علالت نے اجازت نہ دی ۱۹۸۱ء میں جب مجھے ہارٹ اٹیک کا شدید جھٹکا لگا تھا تو نرسنگ ہوم ہی میں میری بیوی نے یہ منت مانی کہ میری صحت یابی پر وہ مجھے ساتھ لے کر ماتا وشنو دیوی کے دربار میں حاضری کے لئے جائے گی۔

کے فضل و کرم سے میرے صحت یاب ہونے پر بیوی کا تقاضا
دن بڑھنے لگا کہ منت ہر حال میں پوری کرنی چاہئے۔ میرے
ما تھا کہ اتنی بلندی پر میں نہ جا سکوں گا اور پھر ڈاکٹری مشورہ
بھی تھا کہ دل کے مریض کو یہ سفر نہیں کرنا چاہئے۔ پچھلے سال
ن دوستان ادب کے مشاعرہ میں شریک ہونے کا وعدہ اس لئے
یا تھا کہ پٹھان کوٹ سے ہی ماں ویشنو دیوی کے درشنوں کے
چلا جائیں گے مگر عین وقت پر ڈاکٹر سبھروال صاحب نے منع
یا مگر اس سال جب راہی صاحب تشریف لائے اور انہوں نے
دعوت دی تو دل سے آواز آئی کہ اب کی بار پٹھانکوٹ جانا
ہے اور وہیں سے ماں ویشنو دیوی کی زیارت کے لئے بھی جانا
چنانچہ راہی صاحب سے وعدہ کر لیا گیا کہ اس مرتبہ ماں
یشنو دیوی لے چلا تو ضرور آؤں گا۔ دوسرے ہی دن دفتر کے
زم کو بھیجکر جموں توی میل کے ٹکٹ ریزرو کرا لئے گئے اور
لمز سے پہلے نمبر ۲۹ راپریل ۱۹۸۳ء کو جمرات کو روانہ ہو کر
راپریل کی صبح کو پٹھانکوٹ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو
ہی صاحب اور کچھ دوسرے حضرات اسٹیشن پر موجود تھے
سٹیشن کے ریلوے ... باہر جاتے ہوئے بڑے دروازے
لکھا نظر آیا "باہر جانا ممنوع ہے"
"NO EXIT" کا ترجمہ ... کو "ممنوع ہے"
ا گیا تھا۔ آج کل ریلوے کے دونوں منسٹرز خدا کے فضل سے
سلمان ہیں اور دونوں اُردو لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں کیا
مسلمان وزراء کے عہد میں بھی ریلوے اسٹیشنوں پر اُردو
ساتھ یہی سلوک روا رکھا جائے گا۔ ہم جناب غنی چودھری
احب ریلوے منسٹر سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ریلوے اسٹیشنوں
جہاں جہاں بھی اُردو میں کوئی بورڈ لگا ہوا ہے کم از کم
س کی املا کی درستگی ضرور کرا دیں۔

آج ۳۰ راپریل ۱۹۸۳ء سنیچر کا دن ہے گورنمنٹ گرلز
سکول پٹھان کوٹ کا کمپاؤنڈ مشاعرہ گاہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے
لندھر آکاش وانی اور دوردرشن کے کارکنان مشاعرہ کی
ارروائی صدا بند اور فلم بند کرنے کے لئے اپنے اپنے انتظامات
مکمل کئے ہوئے ہیں۔ اسٹیج پر شعرائے کرام اور کچھ معززین

تشریف فرما ہیں۔ راہی صاحب مائیک پر فرما رہے ہیں کہ
انجمن دوستان ادب پٹھانکوٹ کا یہ تیرہواں سالانہ مشاعرہ
اہل پٹھانکوٹ کے تعاون سے ہو رہا ہے۔ راہی صاحب نے
بڑے اچھے الفاظ میں اُردو زبان کی مقبولیت اور اہل
پٹھانکوٹ کی ادب نوازی کا ذکر کرتے ہوئے انجمن کے سرپرست
جناب پریم اوبرائے صاحب سے استقبالیہ تقریر کرنے کی
گزارش کی ہے۔ اوبرائے صاحب نے فرمایا کہ پنجاب کے
وزیر تعلیم جناب اجنالہ صاحب نے تشریف لانا تھا مگر وہ
تشریف نہیں لا سکے بس یوں سمجھئے کہ ؎

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

اس لئے اس مشاعرہ کے افتتاح کے لئے شری ست مہاجن
جی ٹرانسپورٹ منسٹر ہماچل پردیش کو تکلیف دی گئی ہے
شری ست مہاجن جی کو ہمارے صوبہ کے نہیں بلکہ ہماچل پردیش
کے وزیر ٹرانسپورٹ ہیں مگر وہ ہمارے یہاں کے رہنے
والے ہیں اور ہمارے لوگ ... ان کی ... ہے۔ ان کے
بعد انجمن کے ... جناب بی۔ پی۔ نندا صاحب ایڈوکیٹ
مائیک پر تشریف لائے۔ نندا صاحب نے فرمایا کہ شری
ست مہاجن دیانت دار منسٹر سمجھے جاتے ہیں اور اگر اس
زمانہ میں کسی وزیر کے بارے میں عوام کی یہ رائے ہو کہ
وہ دیانت دار ہے تو اس سے زیادہ خدا کا کرم اس منسٹر پر
اور کیا ہو سکتا ہے۔ نندا صاحب نے اپنے علاقہ کے ایم۔ ایل۔
اے جناب رام سروپ باطی صاحب کا ذکر خیر بھی بہت
اچھے الفاظ میں فرمایا۔ نندا صاحب نے جناب ستیہ پال
راہی کو جان انجمن بتاتے ہوئے عوام کا شکریہ ادا کیا۔
جناب ستیہ پال راہی جیسا کچھ کہنے کے لئے مائیک پر تشریف
لائے ہی تھے کہ شانتی صبا صاحبہ اسٹیج پر تشریف لائیں
اور بجلی جاتی رہی۔ ہائے ظالم میر نے اسی وقت کے لئے
کہا تھا کہ ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ویسے میرؔ اس مشاعرہ میں ہوتے تو شانتی صبا کے لئے یہ شعر ہرگز نہ کہتے کیونکہ جب بجلی آئی تو اس کی روشنی میں شانتی صبا کو دیکھا "یقیناً وہ میرؔ کے اس شعر کی تفسیر نہیں ہو سکتی تھیں۔

راہی صاحب نے مائیک پر شری ست مہاجن کی مکمل تعریف کرتے ہوئے ان سے استدعا کی ہے کہ وہ مشاعرہ کا افتتاح فرمائیں۔ شری ست مہاجن نے ریشمی فیتہ کاٹ کر مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا "میں اُردو ادب سے زیادہ واقف نہیں ہوں اور نہ ہی محفلِ شعر و سخن کے آداب جانتا ہوں، تیسری جماعت تک پڑھا ہوا ہوں، اخبار پڑھ سکتا ہوں، کچھ اشعار بھی یاد ہیں، شاعر حضرات دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ شاعری اور غربت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے شاعر کا کلام اس کے احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کے بعد منسٹر صاحب نے چند بہت ہی اچھے اشعار سنائے جو مشہور شعراء کے ہیں۔ مہاجن جی کا حق ہے۔ وقت اس قدر ہے اور وہ قابلِ تعریف ہے کہ تیسری جماعت تک پڑھے ہوئے صاحب بڑے بڑے اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کئے ہوئے پروفیسروں اور لیکچراروں سے بہتر انداز میں اُردو بول رہے ہیں۔

مہاجن صاحب نے سیاست دانوں کی ادلی بدلی پر بہت اچھے اشعار سنا کر اپنا دلی اظہار دیا ہے کہ وہ سیاست کے اس ہرجائی پن اور موقع پرستی کو پسند نہیں کرتے۔ مہاجن صاحب فرما رہے ہیں کہ پٹھانکوٹ ٹوٹی ہوئی سڑکوں، ریڑھیوں اور ٹھیلوں کا شہر ہے اور اس سرزمین پر ہر سال دو پھول کھلتے ہیں۔ ایک تو یہ مشاعرہ اور دوسری شعری نشست۔ میں تہہ دل سے شعراء حضرات کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اب راہی صاحب نے جناب رام سروپ باغی ایم۔ ایل۔ اے سے چند الفاظ کہنے کی استدعا کرتے ہوئے فرمایا کہ رام سروپ جی ایم۔ ایل۔ اے بننے سے پہلے بھی باغی ہی تھے، ہم ہم جماعت رہے اور ایک ہی ماسٹر سے پڑھا کرتے رہے ہیں۔ باغی صاحب نے دلچسپ انداز میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مہاجن صاحب ہمارے ساتھ منسٹر ہیں۔ ان کے بچے کی شادی پر پنجاب کے چیف منسٹر معہ دیگر منسٹرز کے تشریف لائے تھے اور سردار دربارہ سنگھ نے فرمایا تھا کہ مہاجن صاحب ہم سب بجا رہے ہیں ہماچل اور پنجاب بھی تو بجا رہے ہیں۔ باغی صاحب نے فرمایا کہ ہم مشاعرہ اور نشست تو ہر سال کراتے ہی ہیں مگر ہمیں اپنا قصور ماننا چاہئے کہ ہم اپنے بچوں کو اُردو نہیں پڑھاتے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اُردو پڑھائیں اور اس کا انتظام کریں۔ پٹھانکوٹ ٹوٹی سڑکوں کا شہر ہے تو یہ کوئی بُری علامت نہیں کیونکہ ٹوٹی سڑکوں پہ چلنے سے ہی اچھے اشعار وجود میں آتے ہیں۔ اگرچہ یہ ریڑھیوں اور ٹھیلوں کا شہر ہے تو ہمیں اس پر فخر ہے کہ ریڑھیوں اور ٹھیلوں سے غریبوں کا پالن پوشن ہوتا ہے باغی صاحب نے اعلان کیا کہ مہاجن صاحب نے پانچ ہزار روپیہ حکومتِ پنجاب کی طرف سے انجمن دوستانِ ادب کو عطیہ دیا ہے۔ اب راہی صاحب نے جناب نندکمار پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی منڈی گوبند گڑھ سے شمع روشن کرنے کے لئے درخواست کی ہے۔ نندکمار صاحب تو اُردو کے عاشق ہیں فرمانے لگے کہ اُردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی ایک زبان ہو سکتی ہے۔ حب الوطنی جس قدر اُردو سکھاتی ہے اور کوئی دوسری زبان اس زمرہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ موصوف فرمانے لگے کہ سارے پنجاب میں میں نے پٹھانکوٹ سے بہتر اُردو ادب کے متوالے اور کہیں نہیں دیکھے آخر میں ہندو مسلم اتحاد کے متعلق نندکمار صاحب نے بہت ہی اچھے اشعار سنا کر شمع روشن فرمائی اور عوام نے پُرزور تالیوں سے ان کے غیر متعصبانہ خیالات پر اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔

دس بج کر باون منٹ پر انجمن دوستانِ ادب کے صدر جناب پی۔ پی۔ نندا صاحب ایڈووکیٹ مشاعرہ کی مسندِ صدارت پر تشریف فرما ہو گئے ہیں۔ راہی صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ روایت رہی ہے کہ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے برج کوشل جی اپنا کلام سنایا کرتے ہیں لہٰذا ان سے گزارش ہے کہ وہ اپنی روایت کا اعادہ فرمائیں۔ کوشل صاحب نے

پہاڑی میں ایک غزل اچھے ترنم سے سُنائی ہے۔ البتہ راہی صاحب نے پنجابی اشعار سُنا کر منگل کشور بخشی سے کہا ہے کہ پنجابی کلام سُنائیں۔ بخشی صاحب پنجابی کلام سُنا چکے تو راہی صاحب نے بڑے ہی احترام سے سردار ست پال سنگھ پال (ایم۔ اے۔ سنسکرت) سے پنجابی کو تا سُنانے کے لئے نویدن کیا ہے۔ راہی صاحب فرما رہے ہیں کہ پال صاحب ماہرِ موسیقی ہیں اور انہیں پنجاب کا محمد رفیع کہا جاتا ہے پنجاب کے سکھوں کو پال صاحب سے سبق لینا چاہئے کہ خالصتان کے دعوے دار ہیں کہ اس سکھ نوجوان نے سنسکرت میں ایم۔ اے امتیازی حیثیت سے کرکے مثال قائم کی ہے کہ علم علم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے کسی قوم یا فرقے کی مثال نہیں ہے۔

پال صاحب نے لحن داؤدی میں پنجابی کلام سُنا کر خوب خوب داد پائی ہے۔ لیجئے اب اُردو مشاعرہ شروع ہو رہا ہے نظامتِ مشاعرہ جناب پروفیسر وسیم بریلوی کے ہاتھوں میں دی گئی ہے۔ وسیم صاحب نے شعرا کے بہترین انتخاب پر منتظمین مشاعرہ کو مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ صدرِ مشاعرہ اور انجمن روستان ادب کے مجلد اراکین اُردو ادب اور پنجابی تہذیب و تمدن کے محافظ ہیں۔ وسیم صاحب نے سوامی نند کمار صاحب حال مقیم دنیا نگر کی بہت تعریف فرمائی اور کہا کہ پنجاب میں اُردو کی شمع روشن رکھنے والوں میں سوامی جی کا نام نامی صفِ اول میں آتا ہے۔ وسیم صاحب نے راہی صاحب کے بارے میں کہا کہ یہ مردِ مجاہد اس شعر کی تفسیر ہے ؎

ہوائیں کچھ کہیں لیکن مری ہمت یہ کہتی ہے
اکیلا چل پڑا ہوں پر اکیلا رہ نہیں سکتا

تمہیدی کلمات کے بعد وسیم صاحب نے ڈاکٹر آر۔ ڈی ضیا (پٹھانکوٹ) کو مائیک پر آنے کی دعوت دی ہے، سنئے روی ضیا صاحب قطعہ کے بعد غزل شروع کر رہے ہیں ؎

کب تک وہ تمنا کے تقاضوں سے بچے گا
ننھا سا یہ قطرہ کبھی دریا بھی بنے گا

یک لخت تو مٹتے نہیں برسوں کے مراسم
کچھ دن تو بچھڑ کر وہ مجھے یاد کرے گا

چھا جائے گھٹا صحن پہ اتنا ہی بہت ہے
برسے نہ سہی دھوپ میں سایہ تو ملے گا

اس شعر پر داد سُلجھے ہوئے انداز میں دی گئی تو اندازہ ہوا کہ پٹھانکوٹ محض ریڑھوں اور ٹھیلوں والوں کا ہی شہر نہیں سخن فہموں کا بھی ہے ؎

تم ساتھ لئے جاؤ مرا خواب ادھورا
ورنہ مری نیندوں کو یہ دشوار کرے گا

اس شعر پر بھی داد دینے والوں نے باذوق ہونے کا ثبوت دیا ہے، ڈاکٹر ضیا مقطع سُنا رہے ہیں ؎

ممکن ہے بکھر جائیں یہ پُر کیف مناظر
تا عمر ضیا یاد کا سایہ تو ملے گا

مقامی شاعر اور بہتر تحت میں پڑھنے والا، داد و ستائش سے یوں نوازا گیا کہ بیرونی شعرا کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں کہ انہیں تو مقامی شاعر کے مقابلے میں داد بہت زیادہ ملے گی۔ وسیم صاحب نے ضیا صاحب کا مقطع سناتے ہوئے بہت ہی عالمانہ انداز میں ڈاکٹر آر۔ ڈی ضیا کے کلام کو سراہا اور اعلان کیا کہ اب جناب سمدرشن منظر صاحب مائیک پر جلوہ افروز ہو رہے ہیں، منظر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جو ترا لمس پا کے مہکتے تھے کیا ہوتے
آنگن میں کچھ گلاب کے پودے تھے کیا ہوئے

ہندو ہے کوئی کوئی مسلماں ہے کوئی سکھ
دھرتی پہ تو نے آدمی بھیجے تھے کیا ہوئے

داد مظہر ہے اس امر کی کہ اہل پٹھانکوٹ "آدمی اور شیطان" کی پہچان رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء ایسے ہنگامہ خیز دور میں بھی پٹھانکوٹ فرقہ پرستی کی آگ سے کافی محفوظ رہا۔

وسیم صاحب جس قدر اچھے اور مقبول شاعر ہیں مشاعرہ کی اناؤنسنگ میں بھی اپنا جواب آپ ہیں۔ چنانچہ مادہ کی نسیم خوشگوار سے مست و سرشار ہو کے جناب نور اندوری کو دعوتِ سخن اس انداز سے دی ہے کہ نور صاحب کا نشہ اور بھی بڑھ گیا ہے، سنئے نور اپنے سحر انگیز ترنم سے

کیا قیامت برپا کر رہے ہیں ؎

کیا دُکھے دل کو اس کے سوا چاہیئے
غم شناس اور درد آشنا چاہیئے

داد کے شور میں سامعین کا پُر زور مطالبہ ہے کہ نورؔ صاحب کھڑے ہو کر کلام سُنائیں۔ اس پر وسیمؔ صاحب فرمانے لگے، بھائی کھڑے ہونے کی بات تو الیکشن تک رہتی ہے یہ تو مشاعرہ ہے مگر نورؔ صاحب کے لئے مائیک اونچا کر دیا گیا ہے اور وہ گنگناتے ہوئے عالمِ لحنِ داؤدی میں فرما رہے ہیں ؎

تجھ سے بچھڑوں تو پھر تجھ سے کیسے ملوں
زندگی مجھ کو تیرا پتا چاہیئے

پُرانی غزل۔ گو میں نے مُشاعروں کا آنکھوں دیکھا حال لکھنا پچھلے پندرہ سال سے قریب قریب ترک کر دیا ہے مگر نورؔ صاحب کی یہ غزل شانِ ہند میں کئی مشاعروں کی روداد میں شائع ہو چکی ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کہ اس وقت یہ پُرانی شراب ایسا لُطف دے رہی ہے کہ الفاظ میں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی اور داد کا یہ عالم ہے کہ جیسے پٹھانکوٹ میں زلزلہ آ گیا ہو۔ نورؔ صاحب سیاسی شخصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں ؎

اپنے چہرے سے واقف نہیں اب کوئی
آئینہ چاہیئے آئینہ چاہیئے

یہ شعر تین مرتبہ پڑھوایا گیا ہے۔ کاش کہ ہمارے سیاسی لیڈر اس کا احساس کریں کہ اب عوام ان کی فریب کاریوں اور بعض کی حرام کاریوں سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ عام آدمی اب سچ اور جھوٹ۔ خدمتِ خلق اور خود غرضی کے فرق کو بخوبی سمجھتا ہے اور خصوصاً کانگریس (آئی) کے ذمہ داروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، بابو راجندر پرشاد ایسے قومی جاں نثاروں کے نقشِ قدم پر چلیں۔ تاکہ واقعی ہماری محبوب وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کو کامیابی مل سکے اور عوام کانگریس (آئی) کے سائے میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں۔

معاف کیجئے شعر و سخن کی پاک و صاف فضا میں یہ کم بخت سیاست یوں ہی چلی آئی۔ سنیئے نور صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

عشق میں جان دے دینا آسان تو ہے
ہاں مگر اک ذرا حوصلہ چاہیئے

میرا گھر اُجڑے یا اُجڑے گھر آپ کا
آندھیوں کو تو بس راستا چاہیئے

وسیمؔ صاحب فرما رہے ہیں کہ نورؔ صاحب یہ شعر آج کے پنجاب کو نذر کر رہے ہیں۔ نورؔ صاحب نے یہ شعر دوبارہ پڑھا اور ہال کا خالصتان چاہنے والوں کے بے معنی نعروں سے کہیں بلند آوازوں میں دی جا رہی ہے اور نور مقطع سے داد کی آوازوں کو مدغم کر رہا ہے ؎

ہر دیئے کو ضرورت ہے نور کی
لیکن اب نورؔ کو بھی دیا چاہیئے

وسیمؔ صاحب فرما رہے ہیں کہ نورؔ صاحب نے ہنگامہ کیا ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں ایسے اہم وقت پر کسی نہ کسی خاتون کا سہارا لینا پڑا ہے، اس وقت بھی یہی تقاضا ہے۔ لہذا میں ایک خاتون کو ہی تکلیف دے رہا ہوں۔ دیکھا تو شانتی صباؔ صاحبہ مائیک پر جلوہ افروز ہیں۔ فرما رہی ہیں کہ میں مالوے سے آئی ہوں پہلے مالوے کا سلام قبول فرمایئے ؎

ہم محبت کا جام لائے ہیں ؛ جذبۂ احترام لائے ہیں
ہم صباؔ آپ سب کی خدمت میں ؛ مالوے کا سلام لائے ہیں

اس کے بعد غزل سرا ہوئی ہیں ؎

زندگی کی سزا بڑھا دے گا
تو مجھے اور کیا دُعا دے گا

پیار کے نام پر دغا دے گا
آدمی آدمی کو کیا دے گا

زندگی کا سوال تم سُن لو
یہ زمانہ جواب کیا دے گا

شامِ فرقت ہے اور تنہائی
دردِ دل کو بڑا مزہ دے گا

غم نہ کر غم مرا مقدر ہے
تو نہ دے گا تو دوسرا دے گا

کس سے حالِ دل کہیں اے صبا
جو سُنے گا وہ مُسکرا دے گا

اور واقعی باذوق حضرات بجز "تو نہ دے گا تو دوسرا دے گا" میں جو ذم کا پہلو ہے اس پر مُسکرا رہے ہیں۔ ویسے صبا صاحبہ اچھا پڑھ لیتی ہیں۔ وسیم صاحب فرمانے لگے، صبا صاحبہ غزل پڑھ رہی تھیں یا غزل انہیں پڑھ رہی تھی یہ فیصلہ تو آپ حضرات کیجئے۔ اور میں جناب رامیش کوسل امیر سے گزارش کر رہا ہوں کہ کلام عطا فرمائیں ——

امیر صاحب مائیک پہ آئے ہیں اور پٹھانکوٹ ایکسپریس کی طرح رواں دواں کلام سُنانا شروع کر دیا ہے۔ اشعار بہت اچھے تھے لہذا میں بھی سُننے میں محو رہا، اشعار کا نقل کرنا مشکل تھا۔ دو ایک اشعار ذہن میں رہ گئے ہیں آپ بھی سن لیجئے ؎

ہم بھی مانگ کر نہیں پیتے ؞ ہم بھکاری نہیں شراب میں
لاکھ مفلس سہی مگر پھر بھی ؞ آرزو مندِ باریابی ہیں

امیر صاحب خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے تو بشیر لکھنوی فاروقی مائیک پہ آکر قطعہ سُنا رہے ہیں ؎

میں نے شبنم کے چند قطروں کو ؞ پھول کے آس پاس دیکھا تھا
مجھ کو یاد آگیا وہ منظر جب ؞ تیرا چہرہ اُداس دیکھا تھا

قطعہ کے بعد تحت میں غزل شروع کی ہے دو اشعار سن لیجئے ؎

ابھی کِھل جائیں گلابوں کے چمن پانی میں
تم ڈبو دو جو کبھی اپنا بدن پانی میں

مچھلیاں چھوڑ گئیں جھیل کا آنگن جب سے
اب پرندوں کا نہیں لگتا ہے من پانی میں

اس کے بعد ترنم کا نمونہ دکھا رہے ہیں ؎

مہرباں اور میرے غم کو بڑھا دیتے ہیں
جب بھی ملتے ہیں کوئی زخم نیا دیتے ہیں

یہ ہم اہلِ محبت کا جگر ہے لوگو
زخم کھا کر بھی جو قاتل کو دُعا دیتے ہیں

فاصلے بھی ضروری ہیں محبت کے لئے . . .
خواب ہی آنکھوں سے نیندیں بھی اُڑا لیتے ہیں

میں نے ماہی صاحب سے پوچھا بھائی آپ کے ہاں تو مُلک بھر سے پسندیدہ شعرا کا انتخاب کیا جاتا ہے یہ بشیر فاروقی صاحب کس کی تلاش میں ہیں؟ فرمانے لگے کہ تلاش و لاش کسی کی نہیں ہے بلکہ وسیم صاحب کی فرمائش ہیں۔ دیکھا تو جناب کنول میر ٹھی مائیک پر ارشاد فرما رہے تھے ؎

ان سیہ پوش اندھیروں سے بچا لو مجھ کو
اپنے دامن کی پناہوں میں چھپا لو مجھ کو

چاہے جانے نہ مجھے دھول کسی رستے کی
اپنی اس بے جائی تنہائی میں سجا لو مجھ کو

جنابِ شہریار اپنے ہم عصر شعرا کی صفِ اول میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر فلم امراؤ جان ادا کی کامیابی نے شہریار کو شہریارِ غزل بنا دیا ہے۔ وسیم صاحب نے نہایت ہی اچھے ڈھنگ سے شہریار کا تعارف کرانے کے بعد ان سے کلام عنایت فرمانے کی گزارش کی ہے۔ شہریار صاحب بڑے ٹھہراؤ اور شاعرانہ وقار کے ساتھ غزل سرا ہیں ؎

یہ کیا ہے محبت میں تو ایسا نہیں ہوتا
میں تجھ سے جُدا ہو کے بھی تنہا نہیں ہوتا

اس موڑ سے آگے بھی کوئی موڑ ہے ورنہ
یوں میرے لئے تو کبھی ٹھہرا نہیں ہوتا

کیوں میرا مقدر ہے اُجالوں کی سیاہی
کیوں رات کے ڈھلنے پہ سویرا نہیں ہوتا

یا اتنی نہ تبدیل ہوئی ہوتی یہ دُنیا
یا میں نے اسے خواب میں دیکھا نہیں ہوتا

نہایت معقول داد پاتے ہوئے شہریار داد دینے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

دل ترکِ تعلق پہ آمادہ نہیں ہے
اور حق بھی ادا اُس سے وفا کا نہیں ہوتا

داد ہے کہ سامعین کے سخن فہم ہونے کی دلیل ہے۔ اور شہریار کہہ رہے ہیں ؎

سنتے ہیں کبھی غور سے آواز جرس کو
منزل کی طرف کوئی روانا نہیں ہوتا

سامعین نے ہم زبان ہو کر شہریار صاحب سے درخواست کی ہے کہ ایک غزل اور عنایت فرمائیں۔ لیجئے دوسری غزل سماعت فرمایئے ؎

کہاں تک وقت کے دریا کو یوں ٹھہرا ہوا دیکھیں
یہ حسرت ہے کہ ان آنکھوں سے کچھ ہوتا ہوا دیکھیں
سکوت شام سے پہلے کی منزل سخت ہوتی ہے
کہو لوگوں سے سورج کو نہ یوں ڈھلتا ہوا دیکھیں
ہماری بے حسی پہ رونے والا بھی نہیں کوئی
چلو جلدی چلو پھر اس شہر کو جلتا ہوا دیکھیں

شہریار واقعی شہریار غزل کی حیثیت سے مائیک سے ہٹے تو سب کے جانے پہچانے ہلال سیوہاروی سے کلام سننے کی درخواست کی گئی ہے۔ ہلال صاحب ہلال نہیں بنے مائیک پر آ گئے ہیں اور یوں گویا ہوئے ہیں ؎

غریبی کو مٹا دینے کی باتیں صرف باتیں ہیں
جو خود دولت کے بھوکے ہوں غریبی کیا مٹائیں گے
غریبوں کا لہو تو آپ کی کار دل کا ڈیزل ہے
غریبی مٹ گئی تو آپ کیا رکھنے چلائیں گے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیئے۔ یہ قطعہ دوبارہ پڑھنے کے بعد ہلال صاحب نے پنجاب کی موجودہ صورت حال پر پنجابیوں کو خبردار کیا ہے ؎

اس دیش کو تم نے بڑی قربانیاں دی ہیں
ممکن ہو تو اس نام کو بدنام نہ کرنا
پنجاب جلے گا تو یہاں کچھ نہ بچے گا
پنجاب کو اے دوستو آسام نہ کرنا

سنجیدہ حضرات اور بھی سنجیدہ ہو رہے ہیں اور ہلال صاحب فرما رہے ہیں کہ حال ہی میں بیروت کی افسوسناک حالت پر ایک مولانا نے فرمایا ہے کہ وہ بیروت کا سفر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ لہذا انہیں مشورہ دیا گیا ہے ؎

بیروت کی خبروں نے تری حس کو جگایا
اٹھ [illegible] جذبۂ اسلام چلا جا
لیکن یہ مناظر تو وطن میں بھی ملیں گے
بیروت بہت دور ہے آسام چلا جا

اہل پٹھانکوٹ بیروت ہو یا آسام، ظالموں پر لعنت بھیجتے ہیں اس لئے اس قطعہ پر مناسب داد دی گئی ہے اور ہلال صاحب وزراء کی ادلی بدلی پر روشنی ڈال رہے ہیں ؎

میدان سیاست کے کھلاڑی ہی اکثر
بے وقت تڑپ چال بھی چل دیتے ہیں
جب دیکھتے ہیں ہارتی بازی اپنی
یہ ہاتھ کے پتے بھی بدل دیتے ہیں

قطعات کے بعد ہلال صاحب نے "گٹھ جوڑ" عنوان سے ایک نظم سنائی ہے اور خوب داد پائی ہے۔

اب اعلان ہوا ہے کہ راج دلاری صاحبہ وائس پرنسپل گرلز سکول پٹھانکوٹ کلام سنائیں گی۔ یہ محترمہ ہندی اور کشمیری کی شاعرہ ہیں، اور اردو شاعری کا بھی دعوے کرتی ہیں بیاض ہندی رسم الخط میں ہے حالات حاضرہ پر نظم ترنم سے سنا رہی ہیں اور سامعین کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ واقعی پٹھانکوٹ کے سامعین تعریف کے قابل ہیں جو ان صبر آزما لمحات میں بھی خاموش بیٹھے رہے ہیں۔ تقریباً بیس منٹ ضائع کرنے کے بعد یہ محترمہ مائیک سے ہٹیں تو وسیم صاحب نے پریم باغی صاحب (دسوہہ) سے کلام سنانے کے لئے کہا ہے۔ پریم باغی کہہ رہے ہیں ؎

شہر چھوٹے تھے احترام بڑا تھا
شہر بڑے بننے لگے احترام گھٹنے لگا
آج کل کے شہر جنگل بن گئے ہیں
کھا رہا ہے آدمی کو آدمی

اب جناب شباب للت مائیک پر تشریف لائے ہیں غزل سرا ہیں ؎

نہ پوچھ کیسی بلا تھی مرے تعاقب میں
مری ہی اپنی صدا تھی مرے تعاقب میں
میں دھوپ اوڑھ کے سفر پہ نکلا تھا
وہ بن کے کالی گھٹا تھی مرے تعاقب میں

شباب للت پنجاب کے شعرا میں قابلِ ذکر مقام رکھتے ہیں مگر افسوس ہے کہ انہوں نے آج مشاعرہ کے مزاج کو نہیں سمجھا۔ ساری غزل کا لفظ "تعاقب" نے ستیا ناس کر دیا ہے کیوں کہ تعاقب ایسے بھاری بھر کم لفظ کے معنی سامعین میں سے نوے فیصد جانتے ہی نہیں تو وہ داد کیا دیں گے مشاعرے کے بعد رحمی صاحبہ نے بتایا کہ ان کے قریب بیٹھی ایک سکھ محترمہ کہہ رہی تھیں کہ اے تکب تکب کی کیا کیہ رہیا اے۔

شباب للت نے دوسری غزل بھی سُنائی مگر نقشِ اول جو اثر قائم کر چکا تھا اس نے دوسری غزل کو بھی اُبھرنے نہ دیا۔ اب وسیم صاحب نے جناب زبیر رضوی صاحب ڈائریکٹر آکاش وانی رام پور سے معاصرانہ دوستانہ اور شاعرانہ انداز میں کلام سُنانے کی التجا کی ہے اور زبیر رضوی صاحب نے مائیک پر آتے ہی فرمایا کہ ابھی ذکر ہو رہا تھا کہ پٹھانکوٹ ٹوٹی سڑکوں کا شہر ہے مگر میں آج شہر میں جب ہلال صاحب کے ساتھ گھومنے نکلا تو مجھے تو ایسا نظر آیا کہ ؎

سارا منظر ہے اجنتا کی گپھاؤں کی طرح
لڑکیاں شہر میں پھرتی ہیں گھٹاؤں کی طرح

اس شعر پہ داد پانے کے بعد زبیر صاحب نے ایک مختصر سی نظم سُنائی جس کا عنوان تھا "جب بچوں کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا"، اور پھر ایک اور نظم تحت میں ہی سنائی ہے اور خوب خوب داد پائی ہے۔ تیسری نظم ترنم سے سُنا کر بے حد داد پائی ہے اور اب مطالبہ ہو رہا ہے گیت کا، چنانچہ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں گیت شروع کیا اور یہ شعر پڑھا ؎

گہنا گجرا ہی لانا نہ گجرا لانا
میرے ویرے موسم کا پھل کوئی لانا

تو داد تالیوں سے دی گئی تو زبیر رضوی کہنے لگے "تالیاں والیاں نہ پیٹیے دگر نہ لوگ آپ کے پیشے سے واقف ہو جائیں گے"، اس پر قہقہہ لگا ہے۔ زبیر رضوی خوب خوب کلام سنا چکے اور داد بھی اسی حساب سے حاصل کر چکے تو بڑے دلچسپ انداز میں کئی گپ نما واقعات سنا کر حضرت وسیم بریلوی سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے، سُنئے وسیم صاحب متفرق اشعار سُنا رہے ہیں ؎

گُل دان میں لگا بھی لیا اس نے توڑ کر
میں پھول کو نگاہ سے چھوتا ہی رہ گیا

مَیں اس کو پوج تو سکتا ہوں چھو نہیں سکتا
جو فاصلوں کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے

کتنی گناہ گار ہے راتوں کی زندگی
دیکھو کسی چراغ کی آنکھوں میں جھانک کر

اس شعر پہ داد کا انداز غمازی کرتا ہے کہ سامعین واقعی سخن فہم ہیں۔ وسیم عطا فرما رہے ہیں ؎

کسی کا راز کسی سے کبھی نہیں کہتے
یہ احتیاط اندھیروں میں پائی جاتی ہے

اس شعر پہ بھی داد کا وہی عالم ہے اور وسیم صاحب ترنم سے غزل شروع کر رہے ہیں ؎

کوئی موسم نہیں خود کو دُہرائے گا
وہ گیا تو گیا پھر کہاں آئے گا

رات میری نہیں رات تیری نہیں
جس نے آنکھوں میں کاٹی وہی پائے گا

لوگ کچھ بھی کہیں اور میں چپ رہوں
یہ سلیقہ مجھے جانے کب آئے گا

اس شعر پہ داد اپنا حق وصول کر رہی ہے اور وسیم فرما رہے ہیں ؎

آسماں نے زمینوں کی قسمت لکھی
کوئی انصاف مانگے تو کیا پائے گا

اس کی آنکھوں میں کیا ڈھونڈتے ہم وسیم
جیسے کھویا ہوا وقت مل جائے گا

غزل پہ بہت اچھی داد پانے کے بعد وسیم صاحب عوام کے پُر زور مطالبے پر گیت شروع کر رہے ہیں، گیت اس دلکش انداز میں سنایا ہے کہ میں بھی سننے میں نقل کرنا

بھول گیا ہوں۔ رہا داد کا معاملہ تو میں الفاظ میں کیسے بیان کروں۔ گیت ختم ہونے کے بعد مشیر جھنجھانوی صاحب کو وسیم صاحب نے بڑے ہی احترام کے ساتھ کلام عطا فرمانے کی استدعا فرمائی ہے۔ مشیر صاحب واقعی اشعار عطا کر رہے ہیں۔ سنئے ؎

آ اور اُن کو پھر وہی رفتار بخش دے
لمحے ٹھہر گئے ہیں ترے انتظار میں

نقوش دھندلے ہو رہے ہیں
مری تصویر بنتی جا رہی ہے
یہ پتہ گر گیا وہ شاخ ٹوٹی
ہَوا شمشیر بنتی جا رہی ہے

میں اپنے شہر کے لوگوں سے خوب واقف ہوں
ہر ایک شخص کا پتھر مری نگاہ میں ہے

حادثوں کی تلاش کرتا تھا
زندگی تیرے در پہ لے آئی

چند زخموں کا چھپانا تو کوئی بات نہیں
پٹیاں جسم پہ باندھوں تو کہاں تک باندھوں

داد کا ذکر میں دیدہ دانستہ نہیں کر رہا۔ داد تو ان اشعار کا پیدائشی حق ہے۔ آپ خود جب ان مطبوعہ اشعار پر داد دینے پر مجبور ہو گئے ہوں گے تو پھر کلام شاعر بہ زبانِ شاعر کی صورت میں سامعین نے داد کس انداز میں دی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ سنئے قومی یکجہتی پر کس قدر اچھے اشعار مشیر صاحب عنایت فرما رہے ہیں ؎

ایک ہی خاک سے انسان ہوئے ہیں پیدا
ایک ہی خون ہے پھر خون بہاتے کیوں ہو
خشتِ بُت خانہ سے تعمیر ہوا ہے کعبہ
ایسے دیرینہ تعلق کو مٹاتے کیوں ہو
آگ مسجد میں لگے گی تو جلے گا مندر
یہ سمجھتے ہو تو پھر آگ لگاتے کیوں ہو

سنئے پھر متفرق اشعار عطا ہو رہے ہیں ؎

ٹوٹتے ٹوٹتے کچھ دیر تو لگ ہی جاتی
آئینہ ہونے سے بہتر تھا کہ پتھر ہوتا

تری گلی سے ہر اک بے قرار گزرے ہے
یہ بات مجھ کو بہت ناگوار گزرے ہے
ترا خیال تری طرح سے بے وفا تو نہیں
بڑے مزے سے شبِ انتظار گزری ہے

جب وہ مرے قریب سے ہنس کر گزر گئے
کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے اتر گئے
حالاں کہ ان کو دیکھے کے پل ہی کٹی نظر
محسوس یہ ہوا کہ زمانے گزر گئے

برق سے گلہ کیسا، آندھیوں سے کیا شکوہ
آشیاں بناتا ہوں شاخ ٹوٹ جاتی ہے
اے مشیر ہم بھی تھے آبروئے میخانہ
آدمی کو مجبوری پارسا بناتی ہے

جس ہاتھ سے اس شوخ کی زلفوں کو چھوا تھا
چھپ چھپ کے اسی ہاتھ کو ہم چوم رہے ہیں

داد کی نسبت آپ جان کر کیا کریں گے۔ آپ تو مشیر صاحب سے غزل سنئے ؎

اپنے چہرے جو بدل پاتے نہیں
وہ بلندی پر نظر آتے نہیں
ان کو ہم دانستہ سمجھاتے نہیں
آئینہ پتھر سے ٹکراتے نہیں
راستوں کے پیڑ آندھی لے گئی
اب مسافر بھی ادھر آتے نہیں
اپنے اندر شور ہے کچھ اس قدر
دوسروں کی بات سن پاتے نہیں
خود نگر کو اپنے چہرے کے عیوب
آئینے میں بھی نظر آتے نہیں
کاوشِ فکر و نظر بھی چاہئے
نقش خود کاغذ پہ بن جاتے نہیں
قاتلوں کے فن کا اندازہ کرو
لوگ اب مرنے سے گھبراتے نہیں
گریٔ ذوقِ نظر بھی کیا کرے
گھر میں چہرے نظر آتے نہیں

جلنے والوں کو سلام آخری
سب پرندے لوٹ کر آتے نہیں

زخم پر چلتے ہیں مزدوری ہیں مشیر
ان سے لیکن زخم بھر آتے نہیں

مشیر صاحب آج کے مشاعرے کو لوٹ کر اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور وسیم صاحب نے حضرت خمار بارہ بنکوی سے مائک پر تشریف لانے کی مودبانہ گزارش کی ہے، سنئے خمار صاحب نغمہ سرا ہیں ؎

حسن جب مہرباں ہو تو کیا کیجئے
عشق کی مغفرت کی دعا کیجئے

اس سلیقے سے اُن سے گلہ کیجئے
جب گلہ کیجئے ہنس دیا کیجئے..

دوسروں پر اگر تبصرہ کیجئے
سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے

آپ سکھ سے ہیں ترک تعلق کے بعد
اتنی جلدی نہ یہ فیصلہ کیجئے..

کوئی دھوکا نہ کھا جائے میری طرح
ایسے کھل کے نہ سب سے ملا کیجئے

زندگی کٹ رہی ہے بڑے چین سے
اور غم ہوں تو وہ بھی عطا کیجئے

آدمی آدمی ہے فرشتہ نہیں
حق سمجھ کر خطا پر خطا کیجئے

عقل و دل اپنی اپنی کہیں جب خمار
عقل کی سنئے دل کا کہا کیجئے

داد تو اس غزل کا بھی حق ہے اور یہ حق خمار صاحب کو وافر ملا ہے۔ اب جناب شہریار کی فرمائش پہ خمار صاحب غزل سنا رہے ہیں ؎

ہم سے انہیں وہ ہمیں بھلا بیٹھے
ذوق گناہ گار زہر کھا بیٹھے
حالِ غم کہہ کے غم بڑھا بیٹھے
تیر مارے تھے تیر کھا بیٹھے

آندھیو جاؤ اب آرام کرو
ہم خود اپنا دیا بجھا بیٹھے

بے سہاروں کا حوصلہ ہی کیا
گھر میں گھبرائے در پہ آ بیٹھے

جب سے بچھڑے وہ مسکرائے نہ ہم
سب نے چھیڑا تو لب ہلا بیٹھے

اٹھ کے اک بے وفا نے دے دی جان
رہ گئے سارے باوفا بیٹھے

جی تو ہلکا ہوا مگر یارو
رو کے ہم لطفِ غم گنوا بیٹھے

حشر کا دن ابھی ہے دور خمار
آپ کیوں زاہدوں میں جا بیٹھے

خمار صاحب کو اس غزل کے ہر شعر پر خوب سے خوب تر داد ملی ہے اس وقت صبح کے دو بجکر بیس منٹ ہوئے ہیں اور دورِ اوّل ختم ہوا ہے۔ اب دوسرا دور فرمائشی ہے اور میری صحت اجازت نہیں دیتی کہ میں مزید بیٹھ سکوں اور پھر یار، وشنو دیوی کی یاترا پر صبح سات بجے کی گاڑی سے جموں کو روانگی بھی تو ہے۔ ●●

(دھلک کا بقیہ)

کی جا سکتی ہے اور اس کی اطلاع محض ایک خط سے کر دینا ہی کافی ہے۔

ہم وزیر دفاع حکومت ہند سے درخواست کریں گے کہ وہ ڈیفینس سکریٹری صاحب اور منسٹری آف ڈیفینس کے ڈی۔پی آر کو ہدایات دیں کہ وہ سینک سماچار کی چھپائی وغیرہ کے انتظامات کا نئے سرے سے جائزہ لیں کیونکہ ایک ٹھیکیدار کو دس لاکھ روپئے [illegible] یا کہ جیب وغیرہ کا ٹھیکہ دے کے بجائے مخلص مسلم [illegible] کو یہ کام [illegible] ۔ مطلوبہ شدہ مطلب کے جائیں اور ٹینڈروں کا فیصلہ کرتے وقت ان کے جماعت کی خدمات بھی حاصل کی جائیں کیونکہ [illegible] آر ڈیفنس منسٹری یا ڈیفینس سکریٹری صاحب [illegible] سے واقفیت نہیں رکھتے

۱ [illegible]

[illegible]

(صفحہ ۳۲ کا بقیہ)

الاٹ کرا لئے تھے۔ چھوٹی ایک کالج میں پرنسپل لگ گئی ۔۔۔ ردا کا ڈاکٹر بن گیا۔

ایک دن بڑی بی نے صندوقچہ صاف کیا تو ۱۹۵۰ء کا اچھن کی ماں کا خط ملا...... لکھا تھا۔

"بیگم صاحب۔ آپ نے پہنچنے کی خبر دی تھی۔ پھر کوئی خط نہ لکھا ۔۔ میرا جی چلا ڈہے۔ کہا سُنا معاف کریں ۔۔ اور اللہ پاک سے دُعا کیجیو ۔۔ ساتھ ایمان کے انجام بخیر کرے۔

سب سے چھوٹی نواسی اُلفت نے ٹھنک کر اپنی ماں سے کہا "امّی آپ نے تو سخت بور کر کے رکھ دیا ہے ساری دُنیا میں کلر ٹی۔ وی آ گئے۔ اور ہم یہ بھوتوں کی پرچھائیاں دیکھ رہے ہیں ۔۔"

چھوٹی بیگم نے خط کو آنکھوں سے لگایا ۔۔ چوما اور آبدیدہ ہو کر بولیں "پٹھانی ۔۔ ایمان لے گئی ہو گی۔ یہاں تو اللہ ہی بیلی ہے ۔۔ اندر کے کُتّے جاگ اُٹھے ہیں ۔۔" دلشاد نے ناک پر اُنگلی رکھی اور بولی۔ "اے کیسے کُتّے، امّاں کیا کہہ رہی ہیں" بڑی بی نے کہا "بیٹا اچھن کی ماں کی کہاوت یاد کر رہی ہوں وہ کہتی ہیں تھیں "اندر کے کُتّے کی مونڈی مروڑ رہی ہوں"

دلشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ہاں بجھڑے کی روکھی روٹی کھاتے وقت نا" "ہاں ہاں بڑی قلندر بندی تھی۔ کاش آ جاتیں ہمارے ساتھ"۔۔

بڑی بی نے آہستہ سے کہا ۔

"ایمان گنوانے کو۔۔!"

●●

غزل

لکشمی نارائن فارغ
(دیجے پور)

صُبحِ بہار آ نہ سکی زندگی کو راس
دل بھی رہا اُداس نظر بھی رہی اُداس

کس درجہ خود پسند ہے انسان کا مزاج
ہے راہبر کا پاس نہ ہے راہزن کا پاس

ہنگامۂ نشاط کے عنواں بدل گئے
پھر بھی فضائے بزمِ تصوّر نہ آئی راس

شیرازۂ حیات ہوا منتشر مگر..
محفوظ ہے بیاضِ تمنّا کا اقتباس

ہے فکرِ ابتدا نہ اسے رنج انتہا
بزمِ تصوّرات ہے کتنی فضا شناس

کیوں سازگار آئے نہ دامانِ تر مجھے
اس میں رچی ہوئی ہے ابھی تک گلوں کی باس

فکرِ نشاطِ کار کی سرگرمیاں بجا
محرومیٔ حیات کا فارغ ہے دل کو پاس

غزل

نصیر افسر
(رانچی)

اپنے ہی مکان میں کیوں مہمان سے لگتے ہو
برسوں کے شناسا ہو انجان سے لگتے ہو

لوگوں نے تمہیں پرکھا دُنیا نے تمہیں مانا
اَخلاق کے پُتلے ہو انسان سے لگتے ہو

حیران فرشتے ہیں یاں جب سے کھڑے ہو تم
پتھر کے صنم ہو یا بے جان سے لگتے ہو

سو بار تمہیں دیکھا سو بار یہی سوچا
غالب کی غزل یا پھر دیوان سے لگتے ہو

افسر ہی نہیں ساری دُنیا یہ کہے گی اب
انسان کے پیکر میں شیطان سے لگتے ہو

غزل

محسن ہاشمی - بلاردی

پائے جنوں میں حلقۂ زنجیر دیکھنا
ہنس میرے خواب ناز کی تعبیر دیکھنا
وہ اتنے خوبرو ہیں اُلٹ دیں اگر نقاب
عالم تمام پیکرِ تصویر دیکھنا..
ہم بیکسیٔ عشق کا الزام کس کو دیں
تقدیر میں تھا گردشِ تقدیر دیکھنا
مدت ہوئی کہ دل میں کوئی آرزو نہیں
کیا کام کر گیا ہے ترا تیر! دیکھنا
دل ایسا گم ہوا ہے کہ ملتا نہیں نشان
تم تو جھٹک کے زلفِ گرہ گیر دیکھنا
مجھ سا بھی سخت جاں نہ ملے گا تجھے فلک
ترکش میں رہ نہ جائے کوئی تیر دیکھنا
محسن یہی ہے کاوشِ پیہم تو ایک دن
تدبیر کی گرفت میں تقدیر دیکھنا

غزل

مقبول عزیزی پانس واڑہ (حال مقیم کوٹہ)

دل بھرا اُن کے آنسو نکلنے لگے
کیا تماشہ ہے پتھر پگھلنے لگے
آئے گیسو بنا ہوں میں رُخسار کی
ناگ بھی آگ میں آج پلنے لگے
بندہ پرور بھلا میں نے کیا کہہ دیا
آپ کے کیوں یہ تیور بدلنے لگے
ان کی جانب سرِ بزم دیکھا تو بس
وہ بھی پہلو بہ پہلو بدلنے لگے
وہ اچانک نظر آئے مقبول کو
دل میں ارمان کیسے مچلنے لگے ..

قطعات

ڈاکٹر ستیہ پرکاش تفتہ (کوروکشیتر یونیورسٹی)

کشتۂ واردات ہے انسان
وقفِ مرگ و حیات ہے انسان
اور اگر غور سے اسے دیکھیں
پرتوِ نورِ ذات ہے انسان

ظلم کیا کیا کئے نہ دنیا نے
دردمندوں پہ کیا نہیں گزری
نکتہ چینی کا غم نہ کر اے دل
کس چمن سے ہوا نہیں گزری

رُباعیات

جذبات کی زد میں مجھے بہہ لینے دے
رودادِ غمِ ہستی کہہ لینے دے
صدماتِ خرد میں نے اُٹھائے ہیں بہت
اک وارِ جنوں کا بھی سہہ لینے دے

انسان بھی خود کو خدا سمجھتا ہے
نادان بھی خود کو خدا سمجھتا ہے
دنیا میں چلی ایسی ہوائے سرکشی
شیطان بھی خود کو خدا سمجھتا ہے

جنگل

کرشن موہن

شہر کیسا شہر ہے
کیا غضب ہے قہر ہے
شیر، چیتے، بھیڑیئے
پھر رہے ہیں آدمی کے روپ میں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں کسی جنگل میں ہوں

بابِ انتقاد

دردکے رشتے

مصنف میرجی انارائے۔ مترجم بلراج ورما۔ ضخامت $\frac{18 \times 23}{8}$ سائز کے ۲۲۵ صفحات۔ لکھائی چھپائی بہتر۔ کاغذ درمیانہ قسم کا۔ قیمت تین روپیہ۔ ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی۔

کنڑ ناول "سنرگ" کا یہ اردو ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ کی ہدایات کے مطابق شائع ہوا ہے۔ اگر بلراج ورما صاحب نے براہِ راست کنڑ زبان سے اس ناول کو اردو کا جامہ پہنایا ہے تو حکومتِ ہند کو انہیں انعام سے سرفراز کرنا چاہئے کہ انہوں نے پنجابی نژاد ہوتے ہوئے کنڑ زبان میں اتنی مہارت حاصل کی، اور اگر یہ اردو ترجمہ اس ناول کے ہندی یا انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے تو پھر یہ کوئی معرکہ نہیں ہے بلکہ یہ بھی اردو دوست نوازی کی ایک کڑی ہے جو نیشنل بک ٹرسٹ اور اردو ترقی بورڈ کے اشاعتی پروگرام کے سربراہ عام طور پر اپنے کرم فرماؤں کے لئے کرتے رہتے ہیں اور دوست نوازی یا کرم فرمائی ہمیشہ صحیح اور مناسب ترجمہ کردہ ناول کے انتخاب میں سدِ راہ رہا ہے، کیوں کہ ہم ذاتی طور پر اردو کے ایسے نام نہاد مصنفین کو بھی جانتے ہیں جنہیں اردو لکھنا پڑھنا نہیں آتی مگر ان کی اردو تصانیف پر حکومتِ ہند کی طرف سے انعامات ملے ہیں اور ہم ایسے مترجمین سے بھی بخوبی واقف ہیں جو کنڑ، تیلگو، ملیالم اور دیگر ایسی ہندوستانی زبانوں کے ابتدائی الفاظ سے بھی واقفیت نہیں رکھتے اور نیشنل بک ٹرسٹ نیز اردو [illegible] بورڈ سے شائع ہونے والی [illegible] کتابیں انہی مترجمین کے تراجم کی [illegible] ہیں۔

[illegible] سماج کے [illegible] رسم ورواج میں جکڑا ہے سماج میں ایک نام۔ محبت کی کہانی ہے جو برہمن سماج کی [illegible] ملبار [illegible] سے تعلق رکھنی والے جوان کے رسم ورواج

نیز عوام کے برتاؤ کو مصنف نے اپنے طرزِ تحریر سے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنے آپ میں زندگی بن گئے ہیں۔ اننت اور تارا اس ناول کے دو اہم کردار ہیں جو روایت اور سماجی پابندیوں کی وجہ سے زندگی کے المیے کا شکار بن جاتے ہیں۔

نیشنل بک ٹرسٹ کا کہنا ہے کہ میرجی انارائے جدید کنڑ ناول نگاروں میں بڑا اہم مقام رکھتے ہیں، حالانکہ یہ ناول ان کی پہلی تخلیق ہے۔ کہنا یوں چاہئے تھا کہ میرجی انارائے کا گو یہ پہلا ناول ہے مگر ان کی اس پہلی تخلیق سے ہی انہیں جدید کنڑ ناول نگاروں کی صف میں اہم مقام حاصل ہو گیا ہے۔

اس ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

"لڑکی کو مہینہ ہوئے چار پانچ سال ہو گئے۔ دیئے کی جلتی بتی کی طرح وہ چل رہی ہے۔ اسے ابھی تک پتی کے ساتھ سونے کے لئے نہیں بھیجا" یہ اقتباس غمازی کر رہا ہے کہ مصنف واقعی جدید یا ہے اور نیشنل بک ٹرسٹ مبارک باد کا مستحق ہے کہ وہ ایسی مجبور لڑکیوں کو پتی کے ساتھ سونے نہ دینے کے احتجاج میں ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ اگر آپ اس ناول کو پڑھنا چاہیں تو نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی یا دفتر شانِ ہند سے رجوع فرمایئے۔

عصری ملیالم کہانیاں

مرتب ایم مکندن۔ مترجم عبد الحق۔ ضخامت $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز کے ۱۱۰ صفحات، لکھائی چھپائی کاغذ بہتر۔ قیمت اٹھارہ روپیہ پچاس پیسے۔ ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی۔

ہندوستانی [illegible] کا ایک مجموعہ پہلے بھی نیشنل بک ٹرسٹ شائع کر چکا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ اٹھا

مالیاتلم افسانہ نگاروں (جن میں خود مرتب بھی شامل ہے) کے ایک ایک افسانے پر مشتمل ہے۔ ایم کمندن (جو دلی میں فرانسیسی سفارت خانہ کے ثقافتی شعبے سے متعلق ہیں)۔ ملیالم جدید کہانی کے ایک اہم ستون ہیں پیناچہ انہوں نے ملیالم جدید افسانوں کا بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شامل افسانہ "دلی" (جو جے دیون کا ایک اچھا افسانہ ہے) میں جے دیون کناٹ پلیس کے پارک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں " اوپر دیکھا تو چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ اور جامع مسجد کی سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی مینار یں چاندنی میں جگمگا رہی تھیں"، چاندنی رات تو درکنار سورج کی تیز روشنی میں بھی کناٹ پلیس کے اس حصہ سے جہاں کا مصنف نے ذکر کیا ہے مسجد کے مینار نظر نہیں آتے۔ تاہم سماجی سچائیوں کو نئے نئے ڈھنگوں سے آشکار کئے ہوئے افسانوں کے اس مجموعہ کو پڑھنے سے آپ خوش ہوں گے۔ ناشر یا دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے یہ مجموعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سطور سطور کا زیر نظر یک موضوعی خصوصی شمارہ جناب گوپال متل کی شخصیت اور ان کے شعری اور نثری کارناموں پر مشتمل ہے جسے شخصیت، نثر۔ شاعری۔ تاثرات اور تبصرہ نگاری پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ شخصیت میں جگن ناتھ آزاد۔ مخمور سعیدی اور آمنہ ابوالحسن کے مضامین گوپال متل صاحب کی ہشت پہلو شخصیت کو اپنے محاصرے میں لئے ہوئے ہیں۔ گوپال متل صاحب کی خود نوشت داستان حصہ شخصیت کا ایک ایسا اہم جزو ہے جس کے بغیر یہ باب ادھورا رہتا۔ دوسرا اور تیسرا حصہ گوپال متل صاحب کی نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ گوپال متل کی نثر کئی ادبی اور علمی جھگڑوں کو جنم دیتی رہی ہے۔ ان کی شاعری غزلوں، نظموں وغیرہ کی صورت میں بہت ہی محدود ہے۔ مگر جتنی بھی ہے اتنی کافی ہے۔ اور۔ اس سخن فہم یا نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا اور اسے داد دیئے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

"تاثرات" والا حصہ اس خصوصی شمارہ کی جان ہے۔ حیات اللہ انصاری۔ رشید حسن خاں۔ انور سدید۔ شین کاف نظام۔ آزاد گلاٹی۔ بسمل سعیدی۔ کرشن موہن۔ مخمور سعیدی۔ کمار پاشی۔ امیر قزلباش۔ ضیا فتح آبادی۔ رضا نقوی واہی اور عزیز تمنائی ایسے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے مضامین کی روشنی میں گوپال متل کے شخصی اور شعری کردار کو دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملتی ہے۔

تبصرہ نگاری ایک مشکل مسئلہ ہے اور اس مشکل مسئلہ کو گوپال متل نے ہمیشہ اس شعر ؎

ان میں خزاں کا رنگ بھی شامل ضرور ہے
گہری نظر سے نقش و نگارِ بہار دیکھ

کو پیش نظر رکھا اور یہی وجہ ہے کہ گوپال متل نے جس کتاب پر بھی گہری نظر ڈالی وہ تبصرہ نگاری کی ایک ایسی مثال بن گئی کہ جس کی روشنی میں تبصرہ نگار اپنی راہ متعین کر سکتے ہیں۔

اس خصوصی شمارہ کا تذکرہ یقیناً نامکمل رہ جائے گا اگر سطور کے مدیر محترم جناب کمار پاشی کے اداریے "حرفے چند" کا ذکر نہ کیا جائے۔ کمار پاشی نے گوپال متل سے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر جس عقیدت اور مسیحائی اور مدیرانہ دیانت داری سے کیا ہے وہ "این سعادت بزورِ بازو نیست" کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

یہ خصوصی شمارہ ہر لحاظ سے ایک ایسی ادبی علمی اور سوانحی دستاویز ہے جو اردو ادب میں یقیناً سرمائے کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ قابل مطالعہ اور یادگار خصوصی شمارہ سطور پرکاشن ۱۷۳۳، دہلی گیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے پندرہ روپیہ میں خریدا جا سکتا ہے نیز دفتر شانِ ہند میں بھی دستیاب ہے۔

گوتم بدھ نہرو بال پستکالیہ کی یہ پیش کش بچوں کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ گوتم بدھ کا تعارف اس انداز سے کرایا گیا ہے کہ بچے آسانی

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

بقیہ صفحہ ۲۷ پر

بیوہ کبوتری

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
بلاروی

کاپ [illegible] کی ایک شاخ اس [illegible] کو [illegible] تھی [illegible]
[illegible]
[illegible] بھائی [illegible] میں
[illegible] جانے [illegible] بیٹے [illegible] سامنے [illegible]
[illegible]
[illegible] میں مر گیا کا [illegible] کا بھی [illegible]
[illegible] دن اپنے باپ سے کہنے لگا۔
[illegible] دل [illegible] بھائی [illegible]
[illegible] چھوڑ دیتے [illegible] چھوٹے [illegible]
[illegible] اور [illegible] نہیں [illegible]!
بیٹے [illegible] سکتی [illegible]
[illegible] نسل [illegible] پودوں [illegible]
[illegible] بھی [illegible] نہیں [illegible]
موہن اپنے باپ [illegible]
[illegible] تھا [illegible] مشکل سمجھ [illegible]
اور موہن [illegible]۔
[illegible] جنگلی کبوتر [illegible]۔
[illegible] دیا [illegible]
[illegible] دونوں [illegible] کی
[illegible] انجام [illegible] گا
[illegible]
[illegible] پاس [illegible] اگر [illegible]
[illegible] اور اس [illegible]
[illegible] میں اس ٹہنی کی چیخ [illegible]
[illegible] سے بچے [illegible] کر کے [illegible]

[illegible] چلا گیا اور [illegible] کے لئے گھاس
[illegible] کی آواز آئی جیسے کسی نے
[illegible] ہوا ہو [illegible] ہوا ہو۔ سردیا نے بھاگتے
[illegible] آواز لگائی۔
"[illegible] جنگلی کبوتر کا شکار
کیا ہے۔ دیکھو [illegible] کتنا اچوک ہے ابھی تو دس
[illegible] بھیا [illegible] یقیناً بھارت
[illegible] سیتھانی نے اتراتے ہوئے
[illegible]۔
[illegible] ہوئی شاخ کی طرف دیکھا کبوتری دوسری
[illegible] ہوئے [illegible]
[illegible] زخمی کبوتر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ
[illegible] سوچ [illegible] کی زبان سے
[illegible] جیسے [illegible] کے
[illegible] کی آواز اور بھی بڑھ جاتی ہے۔
[illegible] سے باہر آیا اور جلدی جلدی زخمی کبوتر کا سر
[illegible] کا پیٹ چیر کر [illegible]
[illegible] پیٹ [illegible] میں [illegible] کبوتری
دوسرے پیڑ کی شاخ پر بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور آنسو
بہا [illegible] رہی تھی۔
[illegible] تب اٹھاتے
[illegible] معصوم اور بے قصور [illegible] تھے دوسروں کی
خاطر [illegible] آج وہ کتنا ظالم
ہو گیا ہے [illegible] بھرنے کے لئے جنگلوں نے بہت سی نعمتیں پیدا
[illegible] کس [illegible] کھاتے [illegible]
[illegible]؟ سرکار نے بھی تو [illegible] پابندی

ہنسی لگائی۔ غریب کو سبھی ستاتے ہیں" یہ سوچتے سوچتے کبوتری کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، کچھ دیر بعد کبوتری غمزدہ اور نڈھال پھر اپنے گھونسلہ میں انڈوں پہ اس طرح آ بیٹھی جیسے باڑھ اتر جانے پر گھر چھوڑ کر جانے والے پھر اپنے اپنے گھروں میں آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد مندر سے راماین کے اکھنڈ پاٹھ کی دھن سنائی دی۔

"یہ اسی رام چرت مانس کی کتھا ہے جس میں راون نے رام کی سیتا کا اپہرن کیا تھا۔ چھی چھی، یہ کیسے مہذب انسان ہیں اس سے تو ہم ہی اچھے ہیں کیوں کہ ہمارے یہاں جب سے دنیا وجود میں آئی ہے اس قسم کی مخرب اخلاق اور انسانیت سوز حرکت کسی سے بھی سرزد نہیں ہوئی۔ کبوتری انہیں خیالات میں گم پھٹی پھٹی آنکھوں سے کوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے اس کے کبوتر کے لئے پروانۂ اجل آیا تھا۔

مالی بھی غمزدہ کبوتری کو دیکھ کر دکھی ہو رہا تھا جس کے انڈوں کی حفاظت کے لئے اس نے ایک شاخ نہیں کاٹی تھی، سیٹھ کے لڑکے نے پل بھر میں انڈوں سے جنم لینے والے بچوں کے باپ ہی کو مار کھایا۔ مالی نے ہاتھ سے کھرپا پھینک دیا اور دنیا کی بے ثباتی اور مہذب انسان کی ظالمانہ ذہنیت پر اس طرح سوچنے لگا جیسے گولز وردی یہودیوں پر ہو رہے مظالم پر تڑپ رہا ہو۔ کبوتری نے کوٹھی کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے کسانوں کے کھیتوں کی طرف یوں دیکھا جیسے مصیبت میں انسان آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ کھیتوں میں بے شمار پرندے بالیوں میں سے دانے نکال نکال کر چگ رہے تھے، اتنے نقصان پر بھی کسان لوگ ان پرندوں کو مارنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے تھے صرف اڑا رہے تھے۔ چڑیاں کسانوں سے آنکھ مچولی سی کھیل رہی تھیں، جدھر سے کسان انہیں اڑاتے چڑیاں ادھر سے اڑ کر دوسرے حصے پر جا بیٹھتی تھیں، جب کسان دوسری طرف متوجہ ہوتے تو چڑیاں ادھر سے اڑ کر ادھر آ بیٹھتی تھیں۔ ہر کسان اپنی فصل کی حفاظت کرنے میں کوشاں تھا مگر کسی پرندے کو نقصان پہنچانے یا جان سے مارنے کی نیت ان کی نہیں تھی بلکہ کوئی کوئی کسان تو جھنجھلا کے یہ کہتے ہوئے کہ "کھا لینے دو ان کو بھی یہ بیچاری کون سی کھیتی کرتی ہیں، مینڈ پر بیٹھ کر چلم پینے لگتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کبوتری کو امیروں کی کوٹھیوں کے سبزہ زاروں میں کھڑے درختوں میں بسنے سے نفرت ہو گئی۔ اس نے اپنے انڈوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی تھی " بچو! اگر تم زندہ رہو تو غریب کسان اور مزدوروں کے جھونپڑوں کے صحن میں اُگے آم اور نیم کے پیڑوں پر گھونسلہ بنا لینا مگر کسی امیر کی کوٹھی میں کسی درخت کی طرف مت جھانکنا۔

دوسرے دن صبح مالی اپنا کام شروع کرنے سے پہلے بیوہ کبوتری کے گھونسلے کی طرف گیا۔ دیکھا تو کبوتری کل کی طرح آج بھی سیٹھ جی کی کوٹھی کی طرف ٹکٹکی لگائے نیم مُردہ سی اداس بیٹھی تھی۔ سرد یا اس کے بالکل قریب پہنچ گیا، مگر وہ اڑی نہیں جب کہ کوئی بھی پرندہ ذرا سی آہٹ سے پھُر ہو جاتا ہے۔ مالی نے ٹہنی کو جنبش دی تو وہ اڑ کر دوسرے پیڑ پر بیٹھ گئی۔ کبوتری اب ہر انسان سے بدظن ہو چکی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ ایک نے تو اس کے شوہر کو بندوق کا نشانہ بنایا اور اب یہ میرے شوہر کی آخری نشانی لے جانے کو آ گیا ہے۔ سردیا مالی ایک ہفتہ تک اس کبوتری کا جائزہ لیتا رہا۔ جو بدستور سابق غمگین اور افسردہ بیٹھی ہوئی ملتی، مالی اس بیوہ کبوتری کے غم سے مغموم تھا۔ آٹھویں دن منّا کو بلا کر جھکی ہوئی شاخ کے نزدیک لے گیا، صبح کا وقت تھا۔ کبوتری اب بھی سیٹھ جی کی کوٹھی کی طرف منہ کئے ہوئے غمگین بیٹھی تھی، مالی نے منّے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ منّا دیکھو آج نو دن پہلے تم نے اس کے کبوتر پہ گولی چلائی تھی نہ

"جی"، منّا نے قدرے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ تو مالی نے اپنے ہفتہ بھر کے مشاہدہ کو بیان کیا۔ کبوتری کے غم کی کہانی سن کر منّا کو دکھ ہوا اور اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں مالی منّا کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو از خود منّا کو کبوتری سے ایک لگاؤ سا ہو گیا اور وہ اس کے غم میں شریک ہونے لگا۔ اگلے دن منّا نے مور پنکھی جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر جھکی ہوئی ٹہنی کی طرف دیکھا

کبوتری آج بھی کوٹھی کی طرف منہ کئے ہوئے غمزدہ بیٹھی تھی مُنّا آہستہ آہستہ اس کے قریب آیا تو وہ اُڑی نہیں۔ مُنّا نے ٹہنی ہلائی تو اُڑ گئی اور قریب ہی کے درخت پر بیٹھ گئی۔ "ماں کی بات بالکل صحیح ہے، بیوہ کبوتری شوہر کے غم میں غمزدہ اور افسردہ ہے" مُنّا کے ہونٹوں پر یہ الفاظ کُلبلائے۔ اس منظر اور ذاتی تجربے نے مُنّا کے دل میں رحم اور ہمدردی کی لہر سی دوڑا دی جس کی وجہ سے اس کے خیالات میں ایک خاص تبدیلی آگئی تھی، وہ ہر روز کبوتری اور اس کے بچوں کو دیکھنے جاتا۔ کبوتری بدستور غم کی تصویر بنی خاموش نظر آتی۔ شام کے وقت جبکہ سب ٹی۔ وی پر فلم دیکھنے میں بے خبر تھے مُنّا ائرگن لئے بیٹھا تھا جسے وہ الماری میں بند کرنے کی سوچتا تھا اور کبھی بیچنے کی۔ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ بجلی کی چمک دکھائی دی، پھر بادل کڑکا اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا ہوا سنسنا رہی تھی بارش ہونے کے آثار نظر آرہے تھے وہ کمرے سے باہر آکر برآمدے میں کھڑا ہوگیا ہوا اس قدر تیز تھی کہ پیڑ پودے زمین کی طرف ایسے جُھک جُھک جاتے تھے جیسے نوابوں کے درباری فرشی سلام کررہے ہوں۔ مُنّا کے دل میں نہ معلوم کیا آیا وہ فوراً اس جھکی ہوئی ٹہنی کی طرف بڑھا اور جو خدشہ اس کے دل میں تھا وہی سامنے موجود تھا کبوتری کے دونوں بچے ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت نہ کر پاتے تھے اور گھونسلے سے نیچے گلاب کی جڑ میں اُلجھے پڑے تھے۔ کبوتری ان پر پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ نہ تو بچے خود اُڑ کر گھونسلے میں جا سکتے تھے اور نہ کبوتری ان کو کسی طرح اُٹھا کر گھونسلے میں لے جا سکتی تھی۔ مُنّا نے لمحہ بھر کبوتری اور اس کے بچوں کی بے کسی کو دیکھا اور پھر اس خیال سے بچوں اور کبوتری کی طرف بڑھا کہ ہوا کا جھونکا کہیں ان بچوں کو اُڑا کر نہ لے جائے۔ کبوتری مُنّا کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اُڑ گئی اور شاخ پر جا بیٹھی۔ مُنّا نے دونوں بچوں کو احتیاط سے دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا وہ دونوں مٹھیوں میں الگ الگ کانپ رہے تھے، کبوتری شاخ پر بیٹھی ہوئی بچوں کو مخاطب کرکے کہہ رہی تھی۔

"کمبختو تم اُڑ نہیں سکتے تھے تو پھدک پھدک کر اس ظالم کی نظروں سے اوجھل تو ہو سکتے تھے تم اتنے بُزدل نکلے کہ اپنی جان بچانے کی کوشش بھی نہ کرسکے شاید تم اس کو آدم کی اولاد سمجھ کر دھوکا کھا گئے۔ یہ شریف نہیں ہے۔ اسی نے تمہارے باپ کو مارا تھا اور آج یہ تم دونوں پر بھی ہاتھ صاف کرے گا۔ اگر مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ امیر کا پڑوس اتنا خطرناک ہوتا ہے تو میں اس باغ میں قدم بھی نہ رکھتی" کبوتری زور زور سے کہہ رہی تھی مگر ہوا اتنی تیز تھی کہ بچے کچھ بھی نہ سُن پا رہے تھے اب بڑی بڑی بوندیں بھی پڑنے لگی تھیں۔

مُنّا دونوں بچوں کو لئے ہوئے وہیں کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ انہیں لے کر کوٹھی میں چلا جائے اور ہوا بارش دونوں ختم ہوجائیں تو انہیں لاکر گھونسلے میں رکھ دے۔ مگر تبھی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ یہاں سے چلا گیا تو کبوتری اپنے بچوں کی جدائی برداشت نہ کرسکے گی اور دہشت زدہ ہوکر کہیں اور چلی جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ اپنی جان بھی دے دے اب وہ کبوتری کی نظروں میں مزید گرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اپنے آپ کو ظالم کہلوانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے طے کرلیا کہ بارش چاہے طوفان کا روپ دھارن کرے وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں کھڑا تھا کہ بارش اور آندھی نے زور پکڑ لیا۔ مُنّا نے اپنی کمر جھکالی اور دونوں بچے سینے سے لگالئے تاکہ بارش اور آندھی سے بچوں کو گزند نہ پہنچے۔ بچوں نے جب مُنّا کے سینے سے چمٹ کر امان پائی تو وہ اپنی توتلی زبان میں چہچہائے۔

"اماں تم وہاں کیوں بھیگ رہی ہو ہمارے پاس آجاؤ ہم یہاں بڑے مزے میں ہیں" کبوتری نے جب بچوں کی آواز سُنی تو اسے تعجب ہوا کہ یہ ظالم اتنا رحمدل ہوگیا کبوتری نے اپنی عقل و دانش کے مطابق خوب سوچا مگر کچھ نہ سمجھ سکی۔ تھوڑی دیر بعد جب طوفان باد و باراں تھما تو مُنّا نے کمر سیدھی کی ادھر اُدھر دیکھا مرکری بلب کی روشنی میں ایک شاخ پر بیٹھی کبوتری صاف دکھائی دے رہی تھی

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

رام پور نمائش کا آل انڈیا مشاعرہ

فضل شاہ فضل

ایک سال کے انقطاع کے بعد رام پور کا روایتی ہند مشاعرہ منعقد ہوا ہے۔ رات ۹ بجے سے ہی شہر [illegible] پرائیویٹ بسیں چلنا شروع ہو گئیں اور نمائش کے گیٹ پر عوام کی بھیڑ کو دیکھ کر گیٹ کے ٹکٹ کی قیمت تین پیسے سے بڑھ کر ۵۰ پیسے ہو گئی۔ مشاعرہ گاہ میں عوام کا اژدحام [illegible] اس وجہ سے بھی ہوا کہ مشاعرہ کے افتتاح کے لئے [illegible] ابراہیم انصاری کا اعلان کیا گیا تھا مگر وہ رام پور [illegible] اس لئے مشاعرہ کے انچارج مسٹر جیدر نرائن شرما [illegible] پولیس اور کمشنر ناظم علی خاں ضلع جج مسٹر [illegible] سے درخواست کی [illegible] مشاعرہ [illegible] جھیلا [illegible] اور [illegible] مشاعرہ کی نظامت آکاش وانی [illegible] مسٹر زبیر رضوی نے انجام دی۔

مشاعرہ کا آغاز [illegible] اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" [illegible] سنایا گیا اور جام رام پوری نے [illegible] نوجوان شعراء نے اپنا کلام سنا [illegible] تک کھینچ لیا۔ اب ناظم مشاعرہ [illegible] شاعر [illegible] کو دعوت [illegible]

جب [illegible] آگئی [illegible]
پتھر برس رہے ہیں [illegible]

ناظم مشاعرہ نے خوش گلو شاعرہ محترمہ ترنم انور کو کلام سنانے کے لئے آواز دی ہے۔

راستوں میں راہزن کرتے تھے پہلے رہزنی
کارواں شوق اب منزل پہ لوٹا جائے ہے

مشاعرہ کو جمتا دیکھ کر رامپور کے ہر دلعزیز اور ہندوستان کے منفرد لب و لہجہ کے نوجوان شاعر اظہر عنایتی کو بلایا گیا ہے مگر وہ [illegible] کہ میرا وقت کسی دوسرے بیرونی شاعر کو دے دیا جائے [illegible] مگر [illegible] وہ مائک پر آئے اور [illegible]

[illegible]

[illegible] تھا [illegible]
[illegible] یہ [illegible]
[illegible]
[illegible] کے وہ [illegible] آیا

[illegible]

[illegible]

[illegible] کس کا دیا بجھ گیا
[illegible]

[illegible] جھوم جھوم کر [illegible]

[illegible]

[illegible] پہنچے تو کالے ہو گئے
[illegible]
[illegible] نکلے تو ہم سب سے [illegible]

رام پور [illegible]

[illegible] سرخی [illegible]
وہ ہمارے عہد کے [illegible]

کلام سنانے کے لئے مائک پہ آئے اور ایک غزل ایک نظم پیش کی ؎

اُف وہ گھبرا کے چاروں طرف دیکھنا
نام لکھ لکھ کے میرا مٹانے کے بعد

لندن سے آئے ہوئے ایک اور شاعر نور اندوسی کو دعوت دی گئی ہے انہوں نے چند متفرق شعر کے بعد غزل سنائی ؎

ڈھونڈنے کا مزہ ختم ہو جائے گا
اپنے خط میں نہ اپنا پتہ چھوڑنا

مزاحیہ شاعر ساغر خیامی نے کئی قطعات اور ایک [illegible] سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا دیا اور اب [illegible] غزل کے شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کو دعوت سخن دی گئی وہ مائک پہ آئے ہی تھے کہ برصغیر کے مشہور شاعر احمد فراز آگئے اور ناظم مشاعرہ نے انہیں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور ان کا "موڈ" خراب ہو گیا۔ جس کی انہوں نے مائک پر شکایت کی۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہونٹوں پہ محبت کے فسانے نہیں آتے
ساحل پہ سمندر کے خزانے نہیں آتے
پلکیں بھی چمک [illegible]
[illegible] خواب چھپانے نہیں آتے

[illegible] غزل سرا ہیں ؎

[illegible] دیکھئے کیا ہو
[illegible] ہے ابھی

وہ بھی [illegible] آج [illegible]
یہ [illegible] مجھ سے [illegible]

[illegible] مزاحیہ شاعر [illegible] قطعات اور ایک نظم [illegible] کے بچھڑوں کو [illegible] میں [illegible] غزلیں [illegible] ؎

انہیں یہ خبر بھی [illegible]
میرا گھر [illegible] میرا گھر [illegible]
[illegible] بہار [illegible]
کبھی رو کے مسکرائے کبھی مسکرا کے [illegible]

لکھنؤ سے تشریف لانے والے والی آسی کو جب دعوت سخن دی گئی تو وہ کہتے ہیں ؎

دوستی کیا ہے وفا کیا ہے محبت کیا ہے
ان سوالات کو فرصت کے لئے رکھا ہے

اور اب نوجوان شاعر ساغر اعظمی غزل سرا ہیں انہوں نے دو غزلیں سنا کر مشاعرہ کو نئی زندگی دی ؎

جو بھی تم کو کہنا ہے اک بار کہہ ڈالو
میں بھی چاہتا ہوں روز کا گلا جائے

کانٹوں سے گزر جانا شعلوں سے نکل جانا
جب پھولوں کی بستی میں جانا تو سنبھل جانا

گوہر عثمانی مائک پر آئے ؎

یہ دل ہے شیشہ سمجھ کر نہ توڑیئے اس کو
یہ آئینہ تو نگاہوں سے ٹوٹ جاتا ہے

باوقار و سنجیدہ اور اپنے رنگ [illegible] مشہور [illegible] مہمانوں کو دعوت سخن دی گئی [illegible]

[illegible]
[illegible] گناہ میں ہے
[illegible]
[illegible] نگاہ میں ہے

[illegible] اور غزلوں کی فرمائش [illegible]

کچھ ہاتھوں کی سفید [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] جائیے
[illegible] کھائیے

اندر کا کتّا

فضل قدیر

اچھن کی ماں نے شٹیل کاک نما برقعہ اُتار کر تخت پر پھینکا، پاس رکھی گھڑونچی سے کٹورا پانی کا بھرا اور کنکھیوں سے انداز میں اس طرح پی گئیں جیسے کوئی بھری بالٹی کسی فلش میں انڈیل دے۔ انہوں نے بچی کھولی اور چلائیں "اری صابرہ، اختر کہاں ہو، لو لالہ نے ٹوپیوں کے پتے بھیجے ہیں۔

پھر وہ پاس بیٹھی ہوئی بیگم صاحب سے مخاطب ہوئیں "ارے بیگم صاحب بڑا اودھم پڑ رہا ہے۔ لالہ کے جو میں گئی تو کانپ کانپ گئی۔ اخبار پڑھے جا رہے ہیں کہو ہیں جیسے پٹھانوں نے عورتوں کا ننگا جلوس نکالا ہے۔ لالہ بنارسی داس کی آنکھیں بھی بدلی ہوئی تھیں۔ مراقی مجھے دیکھ کر بولا۔ کہو پٹھانی بی کب پاکستان جاری اوؔ (جا رہی ہو)

میں نے کہا "لالہ کیا ہیاں (یہاں) کیا ہوّاں (وہاں) ہمارے لئے تو مزدوری تقدیر میں لکھی دی اے۔۔ لو اور سنو مراقی کیتا کیا ہے "اری پٹھانی بی تمہارے پٹھانوں نے کیا کام کا ہے ہواں (وہاں) کو ہاٹ میں بڑی تباہی کی دی اے ارے کیا کیتے ہو جو ہندوؤں (عورتوں) تلک کو بے لباس کر دیا اب یہ تو بُرا ہوا بیگم صاحب۔ اب یہاں بھی مارا ماری سمجھو"

بیگم صاحبہ کا گھرانہ تمام محلے میں آسودہ تھا اس لئے کہ یہاں بمبا یعنی نلکا تھا۔ یہاں لنٹر کی چھتیں تھیں۔ سال میں دو مرتبہ گاؤں کی پٹی سے اناج کے ساتھ کچھ رقم بھی آجاتی تھی مگر یہ آسودگی بھی ایسی تھی کہ بجلی کی سہولت مہیا کرنے کی ان میں بھی سکت نہیں تھی۔ بیگم صاحبہ بیوہ تھیں محلہ بھر میں چھوٹی بیگم کے لقب سے پکاری جاتی تھیں، نہر والے ڈپٹی صاحب کی بیٹی تھیں، باپ ہی کے گھر میں بیوگی کاٹ رہی تھیں، محلے میں رنگریز، تندور والا اور رقی کوٹوں کے چند کنبے آباد تھے۔ ان ہی میں رام پوری پٹھانوں کا سسکتا بلبلاتا گرتا ڈھیتا کنبہ تھا جس میں کھٹیا سے لگے ایک ضعیف خان صاحب تھے ان کی دو بھتیجیاں، ایک بہن اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ سب عورتیں بیوہ تھیں۔ اچھن کی ماں بڑے خان صاحب کی بھتیجی تھیں، عمر اُن کی بھی پچاس سے متجاوز تھی۔

یہ تمام عورتیں دن بھر دہلی ٹوپیوں پر چکن دوزی کرتیں۔ ۲۰ ٹوپیوں کی ایک کوڑی شمار ہوتی اور ایک کوڑی کی اُجرت چھ آنے تھی۔ اچھن کی ماں اُجرت کا یہ کام لاتیں لے جاتیں اور دہی لالہ سے معاوضہ بھی لاتیں یہ سب عورتیں پچھواڑے ایک کچے احاطہ میں رہ رہی تھیں اس احاطہ کو کچی دیوار سے گھیر دیا گیا تھا اور بیگم صاحب کے مکان کی دیوار سے ٹیکن لگا کر ایک لمبا سا چھپر چڑھا دیا گیا تھا جو مٹی کے چھ کھمبوں پہ ٹکا ہوا تھا۔ اس لمبے چھپر کے درمیان ٹاٹ کی بوریوں کو سی کر دو پردے ٹانگ دئے گئے تھے جو لمبے چھپر میں تین خانے قائم کر رہے تھے اس میں تین خاندان بس رہے تھے، ایک خانے میں کھٹیا سے لگے خان صاحب اور ان کی بیوی ــــــ دوسرے خانے میں ان کی بیٹی صابرہ اپنے تین لڑکوں کے ساتھ، تیسرے خانے میں دوسری بیٹی اختر جن کے شوہر نے مدت ہوئی طلاق دے دی تھی اور بڑے خان صاحب کی بوڑھی پھوپس بہن۔ اچھن کی اماں بیگم صاحب کی ایک صحنچی میں پڑی رہتی تھیں۔ اچھن کی ماں نے دو مرغیاں پال رکھی تھیں جو معجزانہ طور پر باری باری انڈے دیتیں اور بنیادی طور پر ان کی گزر بسر ان مرغیوں کے انڈوں پر

تھی ایک انڈا چھ پیسے میں فروخت ہوتا تھا یہ جھڑے کا آٹا لے آتیں اور دو موٹی روٹیاں کسی کے چولھے پر تھوپ لیتیں۔ اکثر و بیشتر وہ نمک روٹی پر بُرک کر رگڑ جاتیں کبھی خالی پانی سے ایک روٹی پار اُتار لیتیں۔ اگر بیگم صاحب یا ان کی کسی لڑکی کی نظر پڑ جاتی تو وہ ان کے ہاں ہاں کرتے کرتے ایک دو چمچے دال کے یا کوئی ترکاری ایک طشتری میں دے جاتیں۔ غذا کھانے کے عمل کو وہ کتے کو روٹی ڈالنا کہتیں۔ اگر کوئی لڑکی کہتی "ارے اچھن کی ماں یہ کیا؟ سوکھی روٹی کیوں کھا رہی ہو؟" تو وہ بپھر کر کہتیں۔

"ارے بیٹا یہ نفس کتا ہے اسے سوکھی روٹی پر ٹرخا دینا بہتر ہے نہیں تو مراتی پھیلتا ہے، رہی کھانے کی بات تو یہ جان پر ایک جھگڑا ہے"۔

اچھن کی ماں صبح سے شام تک عبادات کے پیچھے دوڑتی پھرتیں صبح کی نماز ادا کی تو کلام مجید لے کر بیٹھ گئیں سطروں پر انگلی پھیر پھیر کر بسم اللہ پڑھتی رہتیں۔ عربی حروف اٹک اٹک کر پڑھتی تھیں۔ غلطی کرنے کے خوف سے انہوں نے بسم اللہ کا عمل شروع کر رکھا تھا۔ ایک آدھ پارے پر انگلی پھیر کر وہ مولود اکبر لے کر بیٹھ جاتیں اور اپنی پھٹی پھٹی آواز میں ـــــ

"میری بار کیوں دیری اتنی کیوں کری"

کا ورد ہاں ہاں کر کرتیں اس کے بعد تسبیح پڑھی جاتی پھر مختلف ٹکڑیاں جوڑ کر چار نماز کی تیاری میں دیر سے چوڑتی بیٹھیں۔ گیارہ بجے نہا کر ظہر کی تیاری شروع ہو جاتی ڈھائی تین بجے کتے کو راتب ڈال لیتیں۔ یعنی رات کا بچا کھچا کوئی ٹکڑا حلق کے پار اتار لیتیں اور پھر عصر، مغرب، عشا کی نمازیں ان کا پیچھا کرتیں۔ اس عسرت و تنگ دستی میں دل گرفتگی تو کجا وہ پھینمنا کر قوت پکڑ رہی تھیں۔ ہر جمعرات کو مولود کی محفل منعقد کرتیں تین آنے کی شکر ین بتاشوں پر آنگن میں لگی مالتی کی بیل کے پھولوں سے چوکی سجاتیں اور بڑے خاں صاحب کی بیوی اور بیٹیوں سے میلاد پڑھوا تیں بتاشے بانٹتیں ـــــ یہ سب کچھ بے انتہا زورِ ایمانی اور درویشی کے سہارے ہی ہو رہا تھا، کچھ عجب معجزہ تھا کہ ان کی دو مرغیاں مسلسل انڈے دیتیں یہ انڈے بنیادی طور پر ان کی کفالت کر رہے تھے ویسے وہ رضائی لحافوں میں ڈورے بھی ڈال لیتیں، اس کی اُجرت اچھی مل جاتی تھی انہیں رگ پٹھے کی بڑی پہچان تھی اور موچ نکال دینا، ناف بٹھانا، یہ سارے کام کارِ خیر کے طور پر انجام دیتی تھیں، اس کا کوئی پیسہ لینا ان کے نزدیک بڑا گناہ تھا۔ ایک بڑا سا تعویذ ان کے گلے میں لٹکتا رہتا تھا اس میں انہوں نے دس دس روپئے کے پانچ نوٹ لپیٹ رکھے تھے یہ کفن دفن کے لئے تھے اور اب پیسہ پیسہ جوڑنا ان کے نزدیک معصیت تھی۔ اکثر فضول خرچی پر کوئی ٹوک دیتا تو جھلا کر کہتیں "اندر کا کتا بھیل رہا تھا اس کی مُنڈیا مروڑ دی۔" پھر وہ قارون کا واقعہ یاد دلاتیں جو ہوس میں زمین میں دھانس دیا گیا تھا۔

اچھن کی ماں اس قلندر بستی کا اخبار بنی ہوئی تھیں روز روز نئی نئی خبریں لاتیں۔ آج جو انہوں نے کوہاٹ میں ہندو عورتوں کا ننگا جلوس نکالنے کی خبر دی تو بیگم صاحب سناٹے میں آگئیں۔ انہوں نے ماتھا ہاتھوں میں پکڑ لیا اور بولیں "تو یوں کہو کہ اب پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی یہاں بھی کوئی آفت جوتنا چاہتے ہیں دیکھ لینا پٹھانی بی یہ لکھنؤ بھی اب سلگنا چاہتا ہے۔"

اچھن کی ماں نے پنجی کو لوٹ پلٹ کر ایک مڑا تڑا پمفلٹ نکالا۔ "لو دیکھنا تو بیگم صاحب لالہ مراتی یہ ہی پڑھ رہا تھا میں سمیٹ لائی۔"

بیگم صاحب نے پمفلٹ کو دونوں ہاتھوں سے صاف کیا۔ واقعی اس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں برہنہ مظلوم عورتوں کی تصویریں۔

"ارے ارے! دیکھو تو کیا غضب ہے انہوں نے ماتھے کو چھوتے ہوئے کہا۔ یہ ساری ہاتھوں کی بنائی خیالی تصویریں ہیں"۔

"ارے جھوٹ سب جھوٹ"

اچھن کی ماں نے نعرہ مارا "شکر خدا کا شکر۔ کیا دودھ کا دودھ پانی کا پانی کیا ہے میرے مولیٰ نے۔ بھلا میں بھی تو کہتی تھی کہ یہ ولایتی پٹھانوں کا کیا خانہ لوٹا جو بنگالی عورتوں کو بے آبرو کرنے کھڑے ہوگئے، تو یہ ہے۔ کیا طوفان اٹھایا ہے۔ بھلا دیکھو تو بیگم صاحب ہماری قوم پر کیا کیا شندے رکھے ہیں۔"

بیگم صاحب نے پانی کا گھونٹ منہ میں ڈال کر کہا۔ "ہوا خدا ہی جانے، پر اتنا ضرور ہے کہ اب لکھنؤ بھی محفوظ نہیں۔" پھر انہیں اپنی تاکتھدا لڑکیوں کا خیال آگیا۔ "ارے اور تو مجھے کچھ ڈر نہیں۔ ان بچیوں کی وجہ سے دل ہولے کھاتا ہے۔"

مٹھانا دودھ والی دہی کا کونڈا سر پر رکھے داخل ہوئی "سنا بیگم صاحب، دلّی کی سبزی منڈی خالی ہوگئی۔ جیبا کا باپ کل ہی تو دلّی سے آیا ہے۔"

بیگم صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ "ارے اگر کوئی بندوبست ہو سکا تو ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

مٹھانا نے کہا۔ "ارے بیگم صاحب مولیٰ قسم ایک مسلمان نہیں رہ جائے گا سب پاکستان چلے جائیں گے یہاں دھرا ہی کیا ہے"

اچھن کی اماں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "ہاں ہاں سب چلے جائیں گے۔ بڑی بڑی دکانوں پر قبضہ کریں گے سیٹھ بن جائیں گے اور پھر خدا کو بھول جائیں گے۔"

"نا بوا ہم تو یہیں (یہیں) بہتیرے آرام سے ہیں کہ بیوی اللہ اللہ کا بول تو چٹا ہوا ہے۔"

دلشاد آرا نے کہا "اچھن کی اماں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، یہاں رہ کر کون اللہ اللہ کرنے دے گا۔"

اچھن کی اماں نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"ارے بیٹے۔ کانٹے بھرے ستو ہر کو تو پچ کر کوئی کھائے گا"

زندگی کے تھپیڑے پت جھڑ کے پتوں کی طرح انسان کو بہا لے گئے۔ چھوٹی بیگم کا مختصر کنبہ ایک لڑکا دو لڑکیوں پر مشتمل لاہور جا پہنچا۔

لاہور عرصے تک میدانِ حشر بنا رہا۔ مہاجروں کے غول سڑکوں کے کنارے اوندھے سیدھے پڑے رہے۔ والٹن میں لٹے پٹے قافلے جمع ہوتے رہے، منتشر ہوتے رہے۔ مکانوں دکانوں کی ریوڑیاں بٹتی رہیں پھر ایکلخت چھپے ہوئے فارم بٹنا شروع ہوئے اپنا اپنا نقصان بھروا رہے ہیں۔

چھوٹی بیگم نے کہا "دیکھو ایمانداری سے اندازہ لگا کر کے لکھوانا۔ مکان۔ اسے بھی دس نہیں پندرہ ہزار کا۔ سکندر گنج کے دو آموں کے باغ ۵۰ بیگھ زمین تیس ہزار مناسب ہوگا۔"

"بہن چھوٹی بیگم تم تو کچھ سٹھیا گئی ہو۔ تمہیں تو روشن ہو میں کرائے پر رہتا تھا۔ پانچ ہزار کی مالیت میں کھو بیٹھے"

"توبہ ہے بادی بھائی۔ یہ تو صریح بے ایمانی ہے۔ ہم تو یہاں ایمان بچانے آئے ہیں۔"

"اچھا بہنو تو اپنا ایمان لئے بیٹھی رہو۔ ارے میرے پڑوس میں ایک جو سیٹھ آبیٹھے ہیں انہوں نے پچیس لاکھ بھرا ہے۔ دلّی میں پبلک کی دو ملیں دکھائی ہیں۔ ارے سب اسی طرح بھر رہے ہیں میں نے تو پھونک پھونک قدم قدم چلایا ہے۔"

ننھی بیگم جو بھیونڈی سے لٹ لٹا کر آئی تھیں اور اب چھوٹی بیگم کے ساتھ آپڑی تھیں بولیں "ارے بہن تم سدا کی نفقتیں ہو۔ ارے غضب ہے ایک مکان دو باغ ۵۰ بیگھ زمین کے ہوئے تیس ہزار لگا رہی ہو کوئی سنے سچے گنتی نہیں آتی۔"

مکانوں دکانوں کارخانوں کا الاٹمنٹ جب سرد پڑا۔ تو دکانوں میں اندر بھرا ہوا مال دھڑا دھڑ بکنے لگا۔ پڑوس کے مستجاب علی جو لدھیانے کے مہاجر تھے۔ روز تین مکانوں کی ہینڈ بیگ لے کر گھر میں آتے اور گاجر مولی کی طرح ٹھسا ٹھس بھرے نوٹ بیوی کے آگے ڈھیر کر دیتے "تو بلا ہے تو پڑوس سے بچوں کو دیہاڑ پر لگیں" اور لڑ دس پیسے کے پیچھے دیہاڑ پہ لگ جاتے۔ دندان دن گڈیاں بن رہی ہیں اور مستجاب علی پانچ روپیہ کی مزدوری دے رہے ہیں۔

پھر نمک کی گاڑیوں کا دھندا چلا۔ اللہ اللہ۔ نہ معلوم کتنے ایکسپورٹر برسات کے حشرات کی طرح ابل پڑے۔ دلشاد کی شادی ہوگئی۔ زمیندار لوگ تھے ۱۲ مربعے

بڑا سوال

محمد منشا یاد

اس نے اپنے ذہن کی پیبار ٹری میں پہلے بھی بڑی بڑی باتیں دریافت کی تھیں مگر اس بار انکشاف کی جو نئی کونپل کھلی تھی وہ نہایت ہی غیر معمولی نوعیت کی تھی۔

ہر بار جب وہ کوئی نئی بات دریافت کرتا تھا اُسے بے پناہ خوشی ہوتی تھی مگر اس بار ایسا نہیں ہوا اس انکشاف نے اسے پریشان اور مضطرب کر دیا اسے لگا اس نے ایک بڑی چٹان کے نیچے سے مٹی کھود ڈالی ہے اور اب چٹان اسے ہاتھوں پر روکنا پڑ گئی ہے۔

اپنی حماقت پر اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا۔ آخر اسے ایسا تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چٹان اپنی جگہ سے سرک چکی تھی۔ بجلی کے ستے کوندے نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مستور منظر کی جھلک دکھا دی تھی تیر کمان سے نکل چکا تھا اور جو کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ واپس لاعلمی کے دریا میں نہیں پھینکا جا سکتا تھا۔

کچھ دن ملول اور پریشان رہنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر ایک نئی خواہش کا چھوٹا سا کلیا سر نکالنے لگا ہے کہ وہ حیرت انگیز منظر جس کو اس کی آنکھیں دیکھ چکی تھیں سب کو دکھائے اور داد پائے۔ مگر یہ آسان اور سہل نہیں تھا۔ لوگ نئے خیالات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے اسے تمام مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا مگر اس کے اندر یہ خواہش کہ وہ سب کو اس کی حیرت انگیز دریافت سے آگاہ کرے شدت اختیار کرتی گئی۔

ایک بار جب شہر میں ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا اس کا جی چاہا کہ وہ اچانک اسٹیج پر پہنچ کر ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دے مگر مقصد یہ تھا اس کا اسٹیج تک پہنچنا نا ممکن تھا دوم لوگوں کے مشتعل ہو جانے کا ڈر تھا۔

خطرات کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار تھا مگر اس طرح اس کا اصل مقصد ادھورا رہ جاتا۔

پھر ایک بار کسی رشتہ دار کی شادی کے موقع پر جب بہت سے لوگ ایک جگہ جمع تھے اس کا جی چاہا وہ اعلان کر دے۔ مگر پھر وہ یہ سوچ کر کہ رشتہ دار پہلے ہی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے وہ اس کی بات پر یقین کرنے کی بجائے اسے غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں گے خاموش رہا۔

آخر کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اس کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہئے اور اپنی بیوی کو اعتماد میں لینا چاہئے اس کی بیوی پڑھی لکھی اور ذہین عورت تھی اور اگرچہ وہ بھی اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتی ہوگی ——— مگر وہ ایک روایتی بیوی کی طرح اس کی وفادار ضرور تھی

اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی بات سن کر حیرت سے اچھل پڑے گی مگر اس نے نہایت اطمینان سے اس کی بات سنی اور جب وہ کہہ چکا تو وہ اسی اطمینان سے اٹھی اور باورچی خانے میں جا کر آٹا گوندھنے لگی۔

وہ پریشان ضرور ہوا مگر پھر اسے خیال آیا کہ اتنی بڑی بات سن کر اسے ہضم کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے کچھ تو وقت لگتا ہے۔ اس لیے اسے مہلت دینی چاہئے وہ اس پر غور کرے گی اور جلد ہی نہایت حوصلہ افزا ردِ عمل ظاہر کرے گی۔

مگر جب کئی روز گزر گئے تو اسے تشویش ہونے لگی کیا معلوم وہ اس کی بات سمجھی ہی نہ ہو؟

آخر ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔ میں نے تم سے

بات کی تھی اس کا تم نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا؟"
"کیا جواب دیتی" وہ بولی "آپ تو ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں سوچتے ہیں کچھ گھر کی بھی فکر ہے؟"
"کیا ہوا گھر کو؟"
"گھر میں آلو اور پیاز ختم ہو گئے ہیں۔ ڈپو سے آٹا منگانا ہے۔ ماموں جان کی نظر کا امتحان کرانا ہے، عبادت کو افسوس کا خط لکھنا ہے۔ کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ یونیفارم کا کپڑا لا دیں میں خود سی دوں گی لیکن آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب سے میری سینڈل ٹوٹ چکی ہے"
بیوی سے مایوس ہو کر اس نے اپنے قریبی دوست سے رجوع کیا۔ اس نے اس کی گفتگو نہایت دلچسپی سے سنی مگر کوئی جواب دینے کی بجائے اسے پکڑ کر نئی فلم دکھانے لے گیا۔ فلم کے دوران اس نے اس کو یاد دلایا کہ اس نے اس سے بہت ہی اہم بات کی تھی۔ اس پر اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا اور اس کا علاج کرائے گا۔
ایک ایک کر کے اس نے سبھی دوستوں سے بات کی کسی نے بھی اس کی بات توجہ اور سنجیدگی سے نہیں سنی۔
دوستوں سے مایوس ہو کر وہ گھر میں پناہ گزین ہوا اور کئی روز تک کتابیں پڑھتا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے تجربے کر کے وقت گزارتا رہا۔ ایک صبح اس کی بیوی چائے لے کر آئی تو وہ خلافِ معمول مہربان اور مطمئن نظر آتی تھی۔ اس کے دل میں امید کا پھول کھلا۔
"معلوم ہوتا ہے میری بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے؟"
"کون سی بات؟"
"وہی جو میں نے بہت دن پہلے تم سے کی تھی"
"حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا" وہ اطمینان سے بولی۔
"یہی تو میں کہتا ہوں" اس نے خوش ہو کر کہا۔
"حقیقت وہ نہیں جو آپ سوچتے ہیں"

اس پر اداسی سی پڑ گئی۔ دل بجھ گیا، درشت لہجے میں بولا۔
"تمہارے پاس اپنی بات کا کیا ثبوت ہے؟"
"میرے پاس اپنی کسی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ مجھے اپنی کوئی بات ثابت کرنے کی ضرورت ہے بس جو کچھ جیسا ہے، ٹھیک ہے"
"مجھے تمہاری ذہانت پر ہمیشہ فخر رہا" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا "اور میری یہ خواہش ہے کہ تم میری بات پر غور کرو — اس سے میرا حوصلہ بڑھے گا کہ کم از کم میری شریکِ حیات تو میری ہم خیال ہے"
"میں آپ کی بات پر کیسے یقین کر لوں" وہ رکھائی سے بولی "کیا میں آپ کو جانتی نہیں ہوں؟"
"تم مجھے ضرور جانتی ہو" اس نے کہا "میری اچھائیوں اور برائیوں سے واقف ہو۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن میں جس سلسلے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں وہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہے"
"آپ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے" وہ تنک کر بولی اور اٹھ کر چلی گئی۔ اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔
ایک دن اور گزر گیا وہ اس سے کھنچا کھنچا سا رہا مگر اس نے ذرا پرواہ نہیں کی۔ معمول کے مطابق گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ آخر تیسرے چوتھے روز اس نے خود ہی بات شروع کی۔
"پھر تم نے کچھ مزید سوچا؟"
"نہیں مجھے فرصت نہیں ہے"
پھر کچھ دیر کے بعد خود ہی کہنے لگی "میرا مشورہ ہے آپ ایسی باتیں سوچنا چھوڑ دیں — یہ نہایت اہم اور سنجیدہ مسئلہ ہے اس کے نتائج بہت خطرناک ہو سکتے ہیں"
"میں جانتا ہوں" اس نے کہا، "مگر میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہاں تم میرا ساتھ دو تو میرا کام آسان ہو سکتا ہے، گھر کی عورتیں تمہیں اچھا سمجھتی ہیں"

"جی نہیں مجھے تو معاف ہی رکھئے۔"

"اچھا مدد نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو ــــ مگر یہ تو بتاؤ کیا تم میری بات پر یقین کرتی ہو؟"

"نہیں"

"مگر کیوں"

"اس لیے کہ جس شخص کو اتنا یاد نہ رہتا ہو کہ اس نے رات کیا کھایا تھا اور جسے یہ یاد نہ ہو کہ اس کی بیوی نے جو ساڑھی پہنی ہوتی ہے وہ اُسے کسی اور نے تحفے میں نہیں دی بلکہ اس کے اپنے شوہر نے خود خرید کر دی تھی تو ایسے شخص کو اپنی بڑی اور دُور کی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے؟"

"بڑی بڑی باتیں سوچنے والوں سے ایسی چھوٹی چھوٹی فرد گزاشتیں ہو جاتی ہیں"

"لیکن میں نے دیکھا ہے" وہ بولی "آپ کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سوچتے ہیں۔"

"ہاں ــــ وہ بھی سوچ لیتا ہوں ــــ تم ہر بات میں میری ذات کو کیوں درمیان میں گھسیٹ لاتی ہو ــ آخر تم کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ میں گمنام اور عام سی موت نہیں مرنا چاہتا ــــ میں نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور میں اُسے دُنیا تک پہنچانا چاہتا ہوں خواہ اس کے لئے مجھے بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔"

"مجھے افسوس ہے" وہ دھیمے لہجے میں بولی "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں"

بیوی کی باتوں سے ایک بار پھر مایوس ہو کر ــــ وہ کئی روز تک اُداس رہا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا ــــ کہ اگر وہ اپنی شریکِ حیات اور قریبی دوستوں کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکا تو دوسرے لوگوں کو کیسے قائل کرے گا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے باپ سے بات کرے گا۔ اگرچہ اس کے باپ کے عقائد اور نظریات بہت پختہ تھے مگر وہ علمی باتوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ کم از کم وہ اُسے بہتر مشورہ ضرور دیں گے۔

اس نے اپنے باپ کی نظر کا معائنہ کرایا اور انہیں نئے نمبر کی عینک خرید کر دی۔ کئی روز اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور طرح طرح کے موضوعات پہ گفتگو کرتا پھر ایک روز ڈرتے ڈرتے اس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

وہ نہایت اطمینان سے سُنتے رہے، پھر بولے۔

"برخوردار ــــ جب تم ابتدائی جماعتوں میں پڑھتے تھے تو میں نے اس وقت سے لے کر آج تک کئی بار تمہیں اُلٹی سیدھی کتابیں پڑھنے اور بے معنی باتوں پر سوچتے رہنے سے منع کیا مگر تم باز نہ آئے ــــ اب ماشاءاللہ تم ایک ذمہ دار شوہر اور باپ ہو، اب تو تمہیں ایسی واہیات باتوں کے بارے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

"ابا جی" اس نے پریشان ہو کر کہا "یہ واہیات باتیں نہیں ہیں یہ اتنا اہم اور بڑا مسئلہ ہے کہ اگر سب لوگ میری طرح سوچنے لگ جائیں تو ایک بہت بڑی تبدیلی آ سکتی ہے۔"

"میرا مشورہ ہے" اس کے باپ نے کہا "تم ایسی باتوں پر سوچنا چھوڑ دو، آخر تمہیں اس سے کیا فائدہ حاصل ہوگا!"

"فائدہ"

"ہاں ــــ اُلٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور تمہارا سکون الگ چھن جائے گا"

"سکون تو اب بھی چھن گیا ہے ابا جی۔ اور میں اتنی بڑی بات کیسے چھپا سکتا ہوں، کیسے خاموش رہ سکتا ہوں میں انسانی تاریخ کو کیا منہ دکھاؤں گا"

"تم بالکل فکر نہ کرو ــــ انسانی تاریخ کو اپنے فطری ارتقاء کی منزلیں طے کرنی ہیں اور وہ کرتی رہے گی۔ تم کاروباری معاملات پر توجہ دیا کرو"

باپ کی گفتگو سے دل برداشتہ ہو کر اُس نے ایک عالمِ دین کا سہارا لیا اور اُسے اور زیادہ مایوسی ہوئی

جب انہوں نے بتایا کہ اس مسئلے کے بارے میں کتابوں میں کہیں ذکر نہیں آیا — اور یہ کہ ایسی باتوں پر سوچنا گناہ ہے۔

اب اُس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے خیالات کو مضمون کی شکل میں اخبار کو بھیج دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ لیکن ایک روز ڈاک سے اُسے اپنا مضمون واپس مل گیا۔ ایڈیٹر نے لکھا تھا۔

"قواعد ہمیں ایسے مضامین کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے ویسے بھی آپ کی تحریر میں پختگی نہیں ہے آپ مشق جاری رکھیں گے تو بہتر زبان لکھنے لگیں گے۔"

اس نے چاہا کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی خواہش کا گلا گھونٹ کر کوئی دوسرا کام جو اس کے گھریلو اور کاروباری معاملات کو بہتر بنانے میں مدد دے شروع کر دے اور اس نے ایسا ہی کیا مگر اس کے بعد اس کی اپنی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

اب وہ کئی برسوں سے مجذوبیت کی حالت میں شہر کی سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہے۔ کوئی کچھ دے دیتا ہے تو کھا لیتا ہے جہاں جی چاہتا ہے پڑ کر سو رہتا ہے۔

ہاں اسے اسکول کے بچوں سے بڑی دلچسپی ہے، چھٹی کے وقت وہ کسی نہ کسی سکول کے گیٹ پر پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک بچے کو غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ بچے اس پر آوازے کستے اور اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔

"سی اے ٹی؟"

"کیٹ"

"آر اے ٹی؟"

"ریٹ"

"چھ دونی؟"

"بارہ"۔

بچے اپنے سوالوں کے دُرست جواب سُن کر خوش ہوتے ہیں مگر وہ اُداس ہو جاتا ہے شاید وہ کسی بڑے سوال کے پوچھے جانے کا منتظر ہے۔

●●

(صفحہ ۲۹ کا بقیہ)

کشور آرا شبنم کو زحمتِ سخن دی گئی ہے ؎

پھر یہ دنیا کوئی رنگین کہانی مانگے
پھر زلیخائے غزل یوسفِ ثانی مانگے

دہلی سے آئے ہوئے مہمان شاعر اندر موہن نکہت نے ایک نظم اور ایک غزل سُنائی اور ان کے بعد استاد غزل گو شاعر قمر مراد آبادی کو دعوتِ سخن دی گئی ؎

جور و ستم حد سے گزر جانے دو
خود چھلک جائے گا پیمانہ تو بھر جانے دو
اپنے سر لے لیا الزامِ محبت تم نے
میں نے پہلے کہا تھا مجھے مر جانے دو

پاکستان سے آئے ہوئے مہمان شاعر احمد فراز نے تقریباً آدھے گھنٹے تک سامعین کو محظوظ کیا اور داد پائی ؎

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا
ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دیدوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا
زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والے
تیری بخشش تیری دہلیز پہ دھر جائے گا
ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

اس طرح یہ مشاعرہ صبح ۴ بجے اختتام پذیر ہوا۔

●●

(صفحہ ۸ کا بقیہ)

اشتہار دینے والی ایجنسیوں کو سرکلر بھجوا دیا ہے کہ پاکستان میں شمع کی ترسیل بند ہونے کے باعث اس کی تعدادِ اشاعت میں جو کمی آئی ہے ہم اسی لحاظ سے اُجرتِ اشتہار کے بل بھی کم اُجرت کے بھجوا رہے ہیں۔

آج شمع کی اس ایمانداری اور دیانتداری کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی مشتہر تعدادِ اشاعت دریافت ہی نہیں کرتا بلکہ یہ دریافت کرتا ہے کہ ہمیں اشتہار کے لئے جگہ مل سکتی ہے یا نہیں۔ ●●

مَن کہ مکتوبُ الیہ

محترم سَرور صاحب تسلیمات

"شانِ ہند" اپریل ۸۳ء پیشِ نظر ہے۔ آپ کے اڈیٹوریل نوٹ اور "بہ کوئے یار...." حرف حرف پڑھنے کے بعد باقی حصہ پر سرسری نظر ڈال لیتا ہوں مگر اس بار جناب مانک ٹالہ کے رطب و یابس سے نمٹنا پڑا۔ اسی سلسلے میں یہ مراسلہ حاضرِ خدمت ہے۔ مناسب سمجھیں تو "شانِ ہند" میں شائع فرمادیں کہ اس مضمون سے پیدا ہونے والی غلط فہمیاں دُور ہوں۔

میری ناقص رائے ہے کہ ادیب کو ادیب ہی رہنے دیا جائے۔ ایاسل نہ بنایا جائے اور یہ ایک مسلّمہ ادبی اصول ہے کہ ادیب کی ہر ادا ــــ اچھی ہو یا بری۔ زیرِ بحث لائی جاسکتی ہے اور یہ بھی ایک مسلّمہ عالمی حقیقت ہے کہ دُنیا کا کوئی بھی ادیب بخشا نہیں گیا۔ لوگوں نے مہاتما گاندھی۔ پنڈت نہرو اور ٹیگور جیسی شخصیتوں کو بھی معاف نہیں کیا پھر آپ پریم چند کو کیوں مستثنیٰ کریں۔ کیا پریم چند ادیب نہ تھے..؟

مَیں نے پریم چند کو فرقہ پرست کہا ہے اور انہیں کی تحریروں سے ثبوت بھی پیش کئے ہیں۔ آپ کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس اختلاف کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ مجھے وہ بات کہنے سے روکیں جسے میں نے پوری ایمانداری سے آج کے حالات کے تناظر میں محسوس کیا ہے۔ تاریخ اسی لئے لکھی جاتی ہے کہ قومیں اپنے عروج وزوال کے اسباب وعلل پر غور کرسکیں۔ وہ خوبیاں اپنائیں جو اگلے وقتوں کے لوگوں میں تھیں اور وہ غلطیاں نہ دُہرائیں جو اُن سے سرزد ہوتی تھیں۔ کم وبیش ادبی تحقیق وتنقید کا بھی یہی مقصد ہے۔

اگر آپ کو پریم چند پر میری تحقیق وتنقید سے اختلاف ہے تو آپ کو بھی حق حاصل ہے کہ اُن کی طرف سے صفائی پیش کریں اور اپنی صفائی میں اُنہیں کی تحریروں سے (جو زیرِ بحث ہوں) وہ ثبوت بھی پیش کریں جو میرے دلائل کو کاٹ سکیں ورنہ ماروں گھٹنا پھوٹے سر جیسے مضامین "شانِ ہند" کے شایان نہیں۔

بات "باکمالوں کے درشن" کی تھی لیکن جناب مانک ٹالہ نے اپنا۔ آپ کا۔ ہمارا اور قارئین کا وقت ضایع کیا۔ نیز "شانِ ہند" کے سارھے نو قیمتی صفحے برباد کئے پھر بھی یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی بات نہ کہہ سکے۔ آپ نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا ہوگا کہ میں نے "باکمالوں کے درشن" ۱۹۷۹ء کے اردو ایڈیشن کو سامنے رکھ کر مضمون لکھا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق اس کی وضاحت اپنے مضمون میں کرچکا ہوں لیکن جناب مانک ٹالا نے "قلم۔ تلوار اور تیاگ" ۱۹۸۲ء کے ہندی اڈیشن کی دو جلدوں کو سامنے رکھا ہے جو میری نظر سے نہیں گزریں۔ اس لئے مَیں یہ طے نہیں کرسکتا کہ مانک ٹالا صاحب کی تنقید کو کس باٹ سے تولا جائے؟ کیلو سے یا سیر سے یا پونڈ سے۔ اور یہ حقیقت بھی آپ سے چھپی نہ ہوگی کہ پریم چند کی اُردو اور ہندی تصانیف اور تراجم میں اکثر و بیشتر فرق رہا ہے اس لئے مناسب یہی تھا کہ مانک ٹالا صاحب "باکمالوں کے درشن" اُردو ایڈیشن ۱۹۷۹ء کو سامنے رکھ کر جواب دیتے۔ یہ کتاب اب بھی دستیاب ہے۔

بہرحال اس مراسلہ کے ذریعہ میں مانک ٹالا صاحب کی

مختلف حماقت آمیزیوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو غلط فہمی کا سبب بن سکتی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ۔

"پریم چند نے اگر راجپوتوں کی شجاعت، سرفروشی اور بہادری کی داستانیں بیان کی ہیں یا سوامی ویویکا نند اور ہندوؤں کی قابلِ احترام ہستیوں کے بارے میں لکھا ہے تو کون سا گناہ کیا ہے "

اس بیان میں سوامی ویویکا نند کا نام شرارتاً لایا گیا ہے ورنہ میں نے کہیں بھی ان کا نام اشارے کنائے میں بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ رہی راجپوتوں کی شجاعت، سرفروشی اور بہادری کی داستانیں تو اس حق سے پریم چند یا کسی ادیب کو روکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تو اس حق کے غلط استعمال کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے لکھا تھا ۔

منشی جی کے یہ الفاظ —— "وہ میانہ روی کے حامی نہ تھے کہ میں بھی رہوں اور تو بھی رہ۔ ان کے دعوے زیادہ تر مردانیت اور شجاعت کا پہلو لئے ہوئے تھے کہ رہیں تو ہم رہیں یا ہمارے ہم قوم مگر غیر قوم ہرگز قدم نہ جمانے پائے ان کے کارنامے اس قابل ہیں کہ مذہبی تصنیفات کا حصہ بنیں "——

آج تک ہندو مسلم فسادات کے بنیادی اسباب کی تہ تک پہونچاتے ہیں۔ منشی پریم چند اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کو مذہبی رنگ دے کر فرقہ واریت کی آگ کو مستقل طور پر بھڑکانے کے لئے رانا کے کارناموں کو مذہبی تصانیف کا حصہ ہی قرار نہیں دیتے بلکہ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے میں ان کے نام کے مندر اور شوالے بھی بنوانا چاہتے تھے "

(فروغِ اردو فروری ۱۹۸۳ء صٹ)

میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ مہارانہ پرتاپ

"جب میدانِ جنگ میں آیا تو اپنے مقابل والی قوم اکبر کی طرف سے اپنے ہی عزیز و اقارب کو پایا اور —— "جد حضرہ کی طرح پکار اٹھا، کیا میں اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑنے آیا ہوں "——؟

گویا ہلدی گھاٹی کی لڑائی جس کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھوں میں تھی مہابھارت کی دوسری جنگ تھی۔ منشی جی کو اس سے بحث نہیں کہ اس دوسری مہابھارت میں کون کورو تھے اور کون پانڈو تھے؟ حق کس کے ساتھ تھا؟ فتح حق کی ہوئی یا ناحق کی؟ وہ تو بس انگریزوں کے ہی جملو تھے ؎

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا

کا سبق پڑھنے کے بعد مذہب کے تقدس کو پس پشت ڈال کر ہوا و ہوس کے اسیر تھے "

(فروغِ اردو۔ فروری ۱۹۸۳ء ص۱۰)

مانک ٹالا صاحب کس طرح بھٹکتے اور غلط مبحث میں الجھتے اور الجھاتے ہیں اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے ۔

"پریم چند نے "باکمالوں کے درشن" میں راجپوت راجاؤں کے بارے میں مضامین کے علاوہ راجپوتوں کے بارے میں کئی کہانیاں بھی سپردِ قلم کی ہیں۔ ان میں راجپوتوں کی مردانگی شجاعت وغیرہ وغیرہ ..... "

اور "باکمالوں کے درشن" کے مضامین کو چھوڑ کر جو زیرِ بحث افسانوں سے اقتباس پیش کئے ہیں۔ بات جس کتاب کی تھی اس سے اقتباس دیتے اور اگر ضرورت ہوتی تو دوسرے اقتباسات تائید مزید کے لئے پیش کرتے تو پڑھے لکھوں جیسی بات ہوتی۔ مگر یہ مانک ٹالا صاحب کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو کچھ جھلا سے گئے ہیں اس لئے کبھی سوامی ویویکانند کا نام لے کر ہندوؤں کو ورغلاتے اور کبھی افسانوں میں الجھا کر اصل موضوع سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اگر جواب نہ بن پڑے تو کیا ضروری ہے کہ جواب دیا ہی جائے۔ بزرگوں نے فرار اختیار کرنے کے لئے بڑی ہی خوبصورت نصیحت کی ہے "جوابِ جاہلاں باشد خموشی" اس پردے میں مانک ٹالا صاحب تو بخوبی چھپے رہ سکتے تھے ۔

مانک ٹالا صاحب کا مجھ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ "ادھر ادھر سے کچھ الفاظ یا ایک آدھ پیرے کو سیاق وسباق سے الگ کرکے پریم چند پر اسلام دشمنی، مسلم دشمنی، اور اردو دشمنی کا الزام لگا کر مسلمان قارئین کے دماغ میں پریم چند اور ہندوؤں کے خلاف فرقہ پرستی کے زہر کا انجکشن لگا دیا۔"

مانک ٹالا صاحب "چور مچائے شور" کی تکنیک سے کام لیتے ہیں۔ خود اقتباسات میں ایسی کتر بیونت کرتے ہیں کہ مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اپنی تحریروں میں کردار کی بلندی اور پستی کو قوموں کے عروج اور زوال کا سبب بتاتا رہا ہوں۔ رب العالمین کی اپنے بندوں کو ہدایت ہے (اس میں ہندو مسلم کی تخصیص نہیں) کہ تم اگر اپنے مرتبے اور منصب سے گر جاؤ گے تو تم سے زیادہ بدتر لوگ تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ اسی اٹل قانون کے تحت قومیں عروج وزوال کی منزلوں سے گزرتی رہی ہیں اسی کے پیش نظر میں نے لکھا تھا۔

"ہم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بودھوں کے ساتھ یہی سلوک ہو رہا تھا جو آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے۔ اپنے ہی سماج میں ایسا خلفشار تھا کہ بھائی کی لڑکی بھائی کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی) تو غوری نے ترائن کی دوسری جنگ کی شکل میں قدرت کا فیصلہ نافذ کیا تھا۔ کیا یہ تاریخ کا زبردست المیہ نہیں کہ اسی ترائن میں ۱۱۹۱ء میں غوری ہار کر ہی نہیں بلکہ زخمی ہو کر جان بچا کر بھاگا تھا مگر صرف ایک سال بعد اسی ترائن میں پرتھوی راج چوہان کا خاتمہ ہو گیا! آج بھی لوگ اپنے قومی کردار کا محاسبہ کرنے کے بجائے جے چند پر تبرہ پڑھ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے ہیں۔

قانون قدرت کو دو بتائی دو قوموں کی اکثریت سے بدلا نہیں جا سکتا۔ پٹھانوں نے جب اپنے مرتبے اور منصب کو بھلا دیا تو مغلوں نے ان سے یہ رتبہ چھین لیا اور جب مغل بھول گئے تو انگریزوں نے شہزادوں سے دلی کے گلی کوچوں میں بھیک منگوا دیا اور شہزادیاں جو کبھی زینت محل بنتی تھیں چکلہ خانوں کی زینت بننے پر مجبور ہوئیں۔ اور یہ کام اس قوم نے کیا جس کو بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی پیشاب کرنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ یہ قومی بدنصیبی ہی کی بات ہے کہ منشی پریم چند جیسے دانش ور بھی اس خدائی قانون کو نہ سمجھ سکے سمجھا تو صرف یہ سمجھا کہ متحدہ قومیت کی کوشش فضول ہے اور ساری عمر اس متحدہ قومیت۔ مشترکہ تہذیب اور اس مشترکہ تہذیبی روایت کی جڑیں کھودتے رہے جسے مغلوں نے پروان چڑھایا تھا جس کا ذکر ڈاکٹر تارا چند کی زبان میں اوپر آچکا ہے"

اب میں آپ ہی سے انصاف چاہوں گا کہ اس پورے اقتباس سے کیا تاثر پیدا ہوتا ہے؟ لیکن مانک ٹالا صاحب نے "بھائی کی لڑکی بھی بھائی کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی" تک لکھ کر ہندوؤں کے سنجیدہ طبقے میں میرے خلاف اشتعال پیدا کرنے کی جو مذموم کوشش کی ہے اس کے لئے اگر میں انہیں شرارت پسند کہوں تو کیا غلط ہوگا؟ لطف کی بات یہ کہ انہوں نے پریم چند کی نگارشات سے کوئی ایسا اقتباس نہیں پیش کیا جسے میں نے سیاق وسباق سے الگ کرکے غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہو۔

مراسلہ طویل ہو گیا۔ بات کہنے کی بہت سی رہ گئی خاص طور پر محمود غزنوی کی بات۔ اس موضوع پر میں ایک مضمون "ادب اور تاریخ میں فرقہ واریت" کے زیر عنوان لکھ رہا ہوں۔ انشاءاللہ اگلے مہینے روانہ کردوں گا۔

میرے اس مکالمے مباحثے اور نشاندہی کا مقصد آپس میں تلخی پیدا کرنا نہیں بلکہ دعوت فکر دینا ہے کہ

آج ہمارا وطن جس عذاب میں گرفتار ہے ہم سب اس کے اسباب پر غور کریں۔ مرض کی تشخیص کے بعد ہی صحیح علاج ہو سکتا ہے۔ میں نے ۱۹۸۰ء ہی میں اپنے موقف کی وضاحت کر دی تھی۔

"منشی پریم چند نے اور ان جیسے نہ جانے کتنے ہی بزرگوں نے جو کچھ کیا ہے اس کے نتائج ہم سب کو بھگتنا ہیں اور بھگت رہے ہیں یہ نشاندہی ان کی عظمت کو مجروح کرنے کے لئے نہیں بلکہ اندھے کوئیں کے سامنے تختی لگا کر آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ دیکھو کر ہی نہ چلو بلکہ اپنے حسنِ عمل سے اسے پاٹنے کی بھی کوشش کرو تمہارے پیچھے آنے والے بے خیالی میں اس میں گر کر تباہ نہ ہو جائیں۔ اس کام کو میں وطن کی خدمت سمجھ کر انجام دے رہا ہوں"

(فروغِ اردو جنوری ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۱)

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خبر گرم ہے کہ رام لال صاحب یوپی اردو اکاڈمی کے چیئرمین مقرر ہو گئے ہیں۔ آپ کے اڈیٹوریل نوٹ بے اثر نہیں رہے۔ مبارک ہو۔

خیر اندیش

ابو محمد شبلی

معرفت دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۸

۱۳ مئی ۱۹۸۳ء

(صفحہ کا بقیہ)

کے ساتھ گوتم بدھ کے حالات پڑھنے ... ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی ذہن نشین کر لیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ کی اس قابلِ تعریف پیشکش کی مصنفہ لیلا بارج ہیں اور مترجم سید ضمیر حسن۔ تصاویر ڈی۔ ایس۔ برہما کے موئے قلم کا شاہکار ہیں قیمت دو روپیہ پچاس پیسے ناشر یا دفتر شانِ ہند سے طلب فرمایئے۔

جب ندی بولی تھی

بچوں کے لئے یہ بہت ہی بہتر کتاب بھی ہنر زبان پینتالیس کی ہیں حق سے بحبس کے مصنف کملا نائر ہیں اور مترجم سید اعجاز مصوری شنکر ... سے بچوں کی واقفیت میں اضافہ کرنے کے لئے یہ کتاب بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

(صفحہ ۳۹ کا بقیہ)

اس نے دونوں بچوں کو آہستہ سے گھونسلے میں رکھ دیا اور دور کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"بیوہ کبوتری محبت اور ہمدردی ایسی زبان ہے جس کو سب سمجھتے ہیں تم مجھے معاف کر دینا میں نے تمہارے شوہر کو ضرور مارا ہے لیکن اس کے خطا وار میرے ماں باپ ہیں جنہوں نے مجھے ماس کھانا سکھایا اور ائیر گن لا کر دی تاکہ میں شکاری بنوں، میرے اخلاق میں جو تبدیلی آئی ہے وہ ماں کی عملی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے۔ میں آج سے کسی کو بھی نہیں ماروں گا اور نہ ماس کھاؤں گا۔" منا ابھی تلافیٔ گناہ میں مشغول تھا کہ ماں نے پیچھے سے اچانک آ کر کہا۔

"تم یہاں بارش میں کیا کر رہے ہو؟ زکام ہو جائے گا بخار آ جائے گا"۔

"میں پیاری بیوہ کبوتری کی مدد کر رہا ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوگا"

یہ کہہ کر منا ماں کے آگے آگے ہو لیا گر ماں اس کی بات کا مطلب بالکل نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ کبوتری پہلے کی طرح اب بھی کوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن پہلے اور اب کے زاویۂ نظر میں فرق تھا۔

● ●

ے قیمت اس کی بھی اڑھائی روپیہ ہے، اور اسے بھی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

ٹوٹا ہوا پیڑ اور دوسری ایشیائی کہانیاں

پیلندر دھنوا کی ان کہانیوں کا ترجمہ سراج انور نے کیا ہے، کیونکہ سراج انور خود بچوں کے لئے بہترین کتابیں لکھ چکے ہیں اسلئے انہیں بخوبی علم ہے کہ بچوں کے لئے کس قدر آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا جانا ضروری ہے لہٰذا ترجمہ کے لحاظ سے یہ کتاب بچوں کی کتابوں میں واقعی ایک اچھا اضافہ ہے اس کتاب کو تصویروں سے سجایا ہے باؤ لین دھنوا نے قیمت اڑھائی روپیہ ناشر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی، بچوں کو اس کتاب کے پڑھنے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔

یہ دنیا پیاری پیاری: مصنف منوہر جنیتی منوکرن اور اردو ترجمہ سعدیہ رحمٰن کی ہے ہنر دیال ... کی یہ کتاب مصوری کا ایک اچھا نمونہ ہے ان تصاویر کو دیکھئے اور ان کے عنوانات سے بچوں کو کتاب بینی کا شوق پیدا ہو سکتا ہے قیمت ... ناشر نیشنل



چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بن گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے یا گرمی دانے خود بخود تو دور نہیں ہوں گے۔ انہیں دور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جلد جل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور یہ آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت: چھ روپے

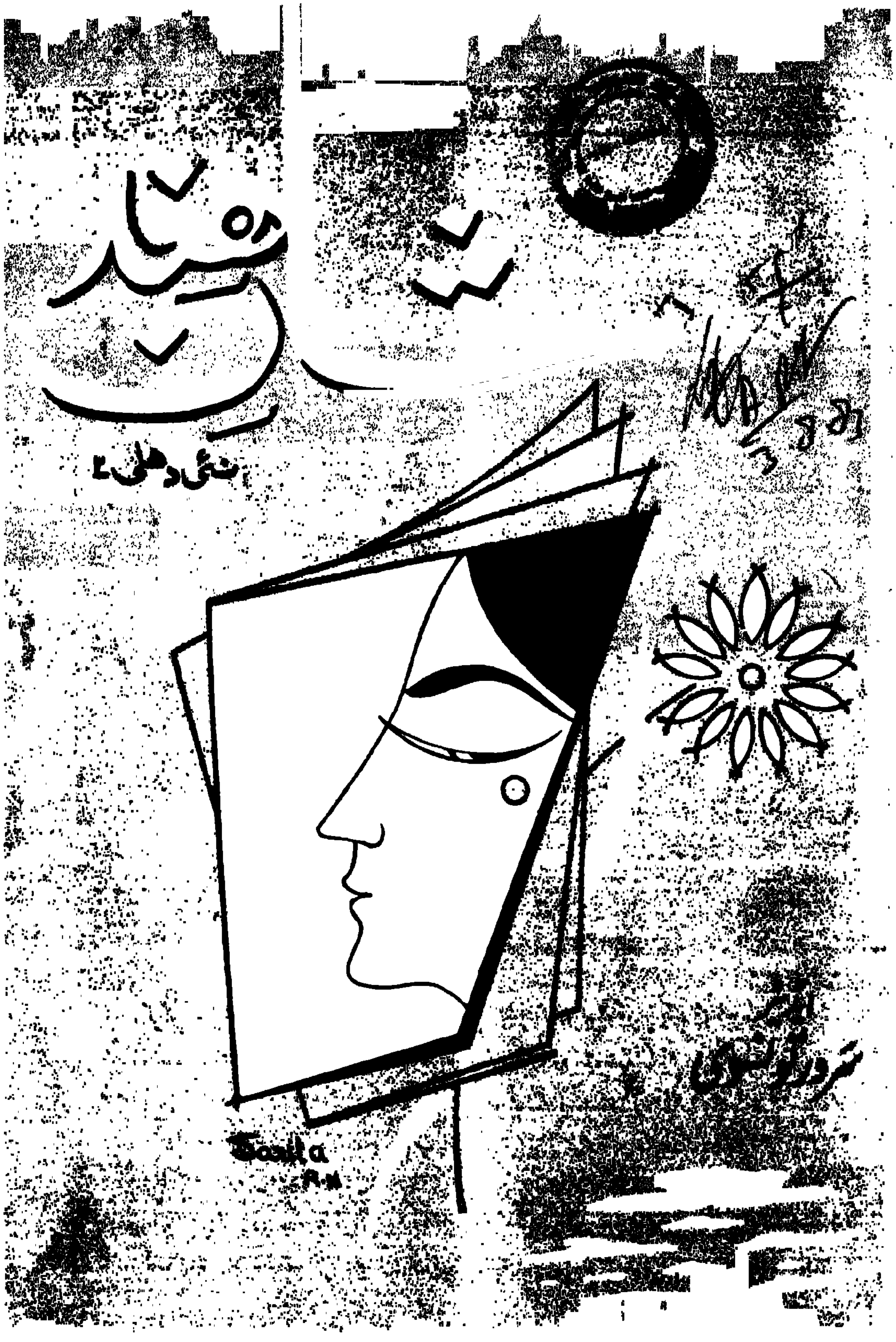
مشرق لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

JUNE 1983 Phone: 273602 Regd. No. D-(DN)270

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57




ذہن جدید
نئی دہلی ۲

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۹۳۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے نیاؔمنی مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
نیاؔمنی سے گوالیاری

ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زرِ سالانہ -/۲۴ روپے
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴ | جولائی ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۷

غزل

نہار علامی

ہر چند ہم نے مانگیں دعائیں اٹھا کے ہاتھ
آیا نہ مدعا کبھی دستِ دعا کے ہاتھ

پائے طلب کو توڑ کے بیٹھے ہوئے ہیں ہم
ممکن نہیں پساریں کسی در پہ جا کے ہاتھ

وہ اور التفات! تجھے کس نے کہہ دیا
دو ہاتھ روز بڑھتے ہیں اس کی جفا کے ہاتھ

آخر تھا کتنی دور دعا سے درِ اثر
ٹوٹے ہیں کس مقام پہ بختِ رسا کے ہاتھ

سو بار بزمِ ناز میں آئی چلی گئی
لیکن مزاجِ حسن نہ آیا صبا کے ہاتھ

فریاد کس سے کیجئے عالم انہیں کا ہے
اب تو ہمارا فیصلہ ہے اس خدا کے ہاتھ

ساقی کی چشمِ مست کا اللہ رے فسوں
زہرآب بادہ سے لیا ہم نے بڑھا کے ہاتھ

تکیہ کیا ہے تیری ہی رحمت پر اے کریم
پھیلے نہ آج تک کہیں تیرے گدا کے ہاتھ

ہر زخم ہے گلاب تو ہر داغ ہے چراغ
دل کی لگی نے دل کو لگا نے بلا کے ہاتھ

کچھ بھی تو خوف پرسشِ اعماں کا نہیں
میری خطا سے بڑھ کے ہیں اس کی عطا کے ہاتھ

در سے ترے اٹھائے گی اب تو قضا ہمیں
بیٹھے ہوئے ہیں جینے سے اپنے اٹھا کے ہاتھ

اے رازؔ ادئیہٴ عالمِ نخوت نہ پوچھیے
لیتے نہیں سلام بھی وہ تو اٹھا کے ہاتھ

دنیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد ... پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ ۳ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصَبا چہ کرد؟

ہندوستان میں اُردو غیر مسلم ادیبوں اور شعرا کے دم سے ہی زندہ ہے

جب کسی زبان کے دانشور محض سرکاری اعزاز، انعام واکرام، جاہ ومنصب، مالی منفعت، ذاتی مفاد اور ذاتی آسائشوں کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیتے ہیں تو پھر اُس زبان کو خدا بھی مٹنے سے نہیں بچا سکتا۔ آج کل ہندوستان میں اردو اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جہاں اُردو کا ہر مسلمان دانشور اسے اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھ کر سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ہر قسم کے مفاد حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے (گنتی کے کچھ مسلم اُردو دانشور واقعی اس چھینا جھپٹی کو لعنت سمجھتے ہیں)

اس ضمن میں اُردو کے ایک غیر مسلم اُردو دانشور جو چوتھائی صدی سے اُردو درس وتدریس کے سلسلے میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں اور کئی قابلِ قدر تصانیف کے مصنف ہیں، ایڈیٹر شانِ ہند کے نام اپنے مکتوبِ گرامی میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یقین مانئے کہ ہندوؤں کی ہماری نسل کے بعد اُردو کا سارا کاروبار ریت کی دیوار کی طرح دھڑام سے زمین گیر ہو جائے گا اور اس پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہ ہوگا کہ نئی نسل زبان وادب کے شعور سے محروم ہے۔ جن لوگوں کو اپنے ادب اور اپنی زبان کی عظمت کا احساس ہی نہ ہوگا وہ اس کے مٹنے کا کیا غم کریں گے۔ جن گنے چنے قسم کے لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں وہ کچھ شور مچاتے رہیں گے اور بس۔۔ یہ حشر دس پندرہ برس ہی میں ہونے والا ہے۔ اس عرصے میں بہت سے لوگ اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔"

ہندوستان کی کوئی بھی سیاسی پارٹی ایسی نہیں [illegible] اُردو کی ترقی تو ایک طرف اس کی بقا وحیات کی [illegible] دل سے خواہاں ہو۔ باقی سیاسی پارٹیوں کے بار[illegible] میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے اختیار میں ہی کیا [illegible] مگر کانگریس (آئی) تو برسرِ اقتدار ہے اس نے اردو کے لئے کیا کیا ہے؟ یہی نا کہ ہر سال اُردو اکادم[illegible] کتابوں کے مصنفین پر دو چار لاکھ روپیہ انعامات کی صورت میں لٹا دیتی ہیں۔ یا اُردو کی تعلیم اسکولوں [illegible] شروع کرنے کے احکامات جاری کر دئے جاتے ہیں (اور اس پر عمل نہیں کرایا جاتا) جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ سابق وزیرِ اعلیٰ یو۔پی نے اُردو کے لئے [illegible] عظیم وعدے کئے تھے۔ بے شک انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ اگر وہ اُردو کو یو۔پی کی دوسری زبان نہ بنا سکے تو وزارتِ اعلیٰ چھوڑ دیں گے۔ واقعی انہوں نے وزارتِ اعلیٰ چھوڑ دی۔ اس کی [illegible] خواہ کچھ بھی رہی ہوں مگر اس سے بیچاری اُردو [illegible] ہوا۔ ہاں وشوناتھ پرتاپ سنگھ وزارتِ اعلیٰ چھوڑ کر آئے تھے اور انہیں مرکزی وزارت مل[illegible] جناب جگن ناتھ مشرا وزیرِ اعلیٰ بہار نے لکھنؤ [illegible] غیر مسلم اُردو رائیٹرز کانفرنس کے موقع پر [illegible] چھ چھ انچ اُچھل اُچھل کر اُردو کے لئے بلند بانگ د[illegible] کئے تھے۔ مگر ہے کوئی ماں کا لعل جو سینے پر ہاتھ

ہو سکے کہ بہار میں اُردو کو بقائے دوام مل گئی ہے۔ عبدالمغنی اور اس قماش کے دوسرے حضرات کی لچّے دار تقاریر پر مت جایئے، حقیقت کیا ہے اسے دیکھیئے۔ جب بھی اور جہاں بھی مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر ہر پارٹی کے سربراہ اردو کو اپنی ماں کی زبان کہتے نہیں تھکتے۔ مگر الیکشن ختم ہوتے ہی اُردو بیچاری وہیں کی وہیں رہتی ہے اور یارلوگ حکومت کی کُرسیاں سنبھال لیتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ لطیفہ یا المیہ سُنتے چلیئے۔ جب راجستھان میں اُردو اکاڈمی بنی تو اس کے چیرمین کے لئے اس وقت کے وزیراعلیٰ جناب بھیرون سنگھ شیخاوٹ کسی موزوں شخص کے انتخاب کے لئے فکرمند تھے۔ بہت سی تجاویز ان کے سامنے مختلف حضرات اور وفود نے رکھیں۔ ایڈیٹر شان ہند۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی اور کچھ دیگر حضرات نے شیخاوٹ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر فلاں غیر مُسلم کو اکاڈمی کا چیرمین بنادیا جائے تو وہ اپنے فرائض بخوبی نبھا سکیں گے کیونکہ وہ راجستھان کے مُسلمانوں میں بھی مقبول ہیں اور ان کی ادبی۔ علمی اور تعلیمی خدمات ایسی ہیں کہ جن کو بُھلایا نہیں جا سکتا۔ بڑے غور و خوض اور ایڈیٹر شان ہند کی بھاگ دوڑ (اسی بھاگ دوڑ اور کئی بار کے دن رات کے سفر جے پور کے باعث ہی راقم الحروف ہارٹ اٹیک میں مُبتلا ہوا) کے بعد ایک رات صبح کے ایک بجے شیخاوٹ نے فرمایا کہ اگر شاہی امام صاحب جامع مسجد دہلی یہ لکھ دیں کہ یہ غیر مُسلم اُردو اکاڈمی راجستھان کے لئے موزوں چیرمین ہو سکتے ہیں تو میں آپ لوگوں کی بات مان لوں گا۔ دوسرے دن ایڈیٹر شان ہند اور دوسرے لوگ شاہی امام صاحب کے ہاں حاضر ہوئے اور انہیں سب باتیں تفصیل سے بتائیں اور مجوزہ اُمیدوار کی علمی، ادبی، تعلیمی تصانیف انہیں دکھائی گئیں تو انہوں نے یہ لکھ کر دیا کہ اگر راجستھان اُردو اکاڈمی کا چیرمین اس غیر مسلم کو نہیں بنایا جاتا تو پھر میری نظر میں حق اور انصاف کے کچھ بھی معنی نہ رہیں گے۔ وقت مقررہ پر ایڈیٹر شان ہند نے بھیرون سنگھ شیخاوٹ کو اسمبلی ہال جے پور میں شاہی امام صاحب کا مکتوب گرامی دیا جسے راقم سے ہی پڑھوا کر وزیراعلیٰ فرمانے لگے کچھ دن بعد آپ اکیلے مجھے ملئے گا تب تک میں اس معاملہ میں مزید سوچ سمجھ لوں گا۔ اگلی ملاقات میں شیخاوٹ صاحب نے انتہائی رازداری بلکہ صاف گوئی سے ایڈیٹر شان ہند سے کہا سرور صاحب کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں ایک ہندو کو اُردو اکاڈمی کا چیرمین بنا کر جنتا پارٹی (خیال رہے کہ شیخاوٹ صاحب ذاتی طور پر راشٹریہ جن سنگھ کے لیڈر ہیں) کو آئندہ کے لئے مسلمانوں کے ووٹوں سے محروم کردوں۔ وزیراعلیٰ کی اس دلیل کے سامنے راقم الحروف لاجواب تھا کیونکہ وزیراعلیٰ کی کرسی اور ان کی پارٹی کو مسلمانوں کے ووٹوں سے محروم کرنا اس کا نظریہ ہی نہ تھا۔ شیخاوٹ صاحب کی یہ حقیقت بیانی صاف اعلان کرتی ہے کہ ہر سیاسی پارٹی مسلمانوں کو اپنے ووٹوں کو متوازن رکھنے کے لئے پاسنگ کا درجہ دئے ہوئے ہے اور اُردو کی بقا و حیات یا اس کی ترقی کے لئے زبانی دعوے اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

شان ہند کی طرف سے ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی کی ایک قابل قدر اور یادگاری تصنیف "ہندی کے مُسلمان شعراء" شائع کی گئی ہے۔ جسے اُردو اکاڈمی اُتر پردیش نے انعام کے قابل محض اس لئے نہ سمجھا کہ اسے شان ہند نے شائع کیا ہے اور شان ہند میں اُردو اکاڈمی کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوتا رہا۔ اس لئے ذہنی طور پر اکثر و بیشتر انعامی فیصلہ کرنے والے ممبران اینٹی شان ہند تھے۔ مگر شبیہ الحسن نے اس کتاب کے خلاف جو دلائل دیئے اور رشید حسن خاں اور دیگر

مسلم ممبران نے اس کی تائید کی۔ وہ محض ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری کے مظہر ہیں۔ جناب محمود الٰہی چیرمین اور ڈاکٹر گیان چند نیر وائس چیرمین کتب کے انعامی سلسلے میں بالکل خاموش رہے کہ کمیٹی میں کون ڈھینا مارے۔ کیوں کر وہ دیکھ رہے تھے کہ یہی شبیہ الحسن فرما رہے تھے کہ فلاں فلاں شاعر تو ایک مصرعہ بھی نہیں کہہ سکتے ان کی تصانیف پر انعام دینا کیا معنی۔ مگر بقول شخصے سر بسجدہ ہے مسیحا کہ مری آن رہے۔ جناب رشید حسن خان چاہتے تھے کہ جس کتاب کا انہوں نے دیباچہ لکھا ہے اسے انعام ضرور دیا جائے۔ ایک صاحب نے آخری وقت پر بھی ایک کتاب کو انعام دلوا ہی دیا کیوں کہ اس کتاب کی اشاعت کے لئے امریکہ سے اس کے مصنف نے انہیں روپیہ بھجوایا تھا اور ظاہر ہے کہ انہیں حقِ محنت بھی ملا ہوگا۔ آخر حقِ محنت بھی حلال کرنا ہی تھا چنانچہ انعام دلوا کر یہ حق ادا کیا گیا۔ کس کس کا نام لیا جائے اور کس کس کا نہیں۔ جب انعامی فیصلہ کرنے والے بظاہر لئے دئے رہیں اور دل میں تنگ دلی اور تنگ نظری کا شاطرانہ جذبہ رکھتے ہوں تو وہ حق و انصاف کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں۔ "ہندی کے مسلمان شعراء" پر اُتر پردیش اکاڈمی نے انعام نہ دے کر مصنف یا پبلشر شانِ ہند کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مگر بقول "آپ کا ایمان تو گیا" والا معاملہ اپنی جگہ مسلّم ہے۔ رشید حسن خاں پرانے کھلاڑی ہیں اور غیر مسلم ادیبوں کے خلاف چوری چھپے لکھنا لکھانا ان کا پسندیدہ شغل ہے (جیسا کہ مالک رام کے خلاف ایک کتاب شائع کرنے میں ان کا نمایاں حصہ تھا) مگر ان سے یہ اُمید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ منصف کی حیثیت سے انعامی فیصلہ میں اپنے ذاتی عناد کو تسکین دینے کے لئے "ہند کے مسلمان شعراء" ایسی کتاب کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر یا ان کی حمایت کر کے اسے انعام سے محروم رکھتے۔ پچھلے دنوں جناب صلاح الدین عمر نے ٹیلی فون پر شکایت فرمائی تھی کہ شانِ ہند کے فروری کے شمارے میں انہیں اور رشید حسن خان صاحب کو تخریب پسند لکھا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی شکایت کا جواب مندرجہ بالا سطور ہیں۔

ہم نے بارہا لکھا ہے کہ غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں اور اُردو کے دانشوروں کو کسی ترقی اردو بورڈ، کسی ساہتیہ اکاڈمی، کسی اُردو اکاڈمی یا کسی انجمن ترقی اُردو پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان سے کسی حق و انصاف کی اُمید رکھیں۔ بلکہ اپنے طور پر جب تک وہ زندہ ہیں اُردو کی بقا و حیات کے لئے کوشاں رہیں کیوں کہ ہندوستان میں اس وقت اردو اگر زندہ ہے تو محض غیر مسلم ادیبوں، شعراء اور دانشوروں کے دم سے۔ یہ اُردو اکاڈمیاں وغیرہ تو سب حکومت کے ایسے پھیلائے ہوئے جال ہیں جن میں اُردو کے مسلم دانشور خود ہی محصور ہو کر اُردو کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔

راقم کا پچھلے دنوں چند بار اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لکھنؤ کا ہر مسلم ادیب و شاعر اُردو اکاڈمی کو مالِ غنیمت سمجھتا ہے اور ایک غانم کی حیثیت سے اس مالِ غنیمت کا وافر حصہ وصول کرنا چاہتا ہے۔ کیا غضب ہے کہ جو مسلم دانشور اُردو اکاڈمی کے خلاف اخبارات میں بیانات چھپواتے ہیں وہ بھی چیک وصول کر رہے تھے۔ کسی شاعر کے کلام کا انتخاب کرنے پر اگر پانچ صد روپیہ مل سکتا ہے تو پھر ایسا کون سا نام نہاد یا اچھا ادیب ہے جس کے منہ میں پانی نہ بھر آئے گا۔ کسی شاعر کے کلام میں سے اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب زیادہ سے زیادہ دو چار دن کا کام ہے اور اس کا معاوضہ پانچ صد روپیہ دینا اُردو اکاڈمی کی طرف سے ایک ایسا نعرہ تر تھا جس کے باعث کئی زبانوں کو تالے لگ گئے۔ کیوں کہ اس قسم کے ادارے محض اُردو کے مسلمان دانشوروں کو لقمۂ تر پھینکنے کے لئے بنائے گئے ہیں

لہٰذا قریباً تمام انتخابات مسلم ادیبوں سے ہی کرائے جا چکے ہیں کہ خیرات اور آسانی سے حاصل ہونے والا روپیہ ہی کو آرام پسند اور بے کار بنا دیتا ہے دوسرے الفاظ میں یہ روپیہ انسان کی ہڈیوں میں پانی اُتار دیتا ہے اور پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔ لہٰذا حکومت نے اُردو کے مسلمان شاعروں کی ہڈیوں میں پانی اتارنے کے لئے یہ انعام و اکرام کا سلسلہ شروع کیا تھا اور آج حالت یہ ہے کہ یوپی کا اور لکھنؤ کا خصوصاً ہر ادیب اور شاعر اُترپردیش اردو اکاڈمی کے ارد گرد یوں چکر لگا رہا ہے جیسے کسی جانور کی لاش پر دُور سے گدھ چلے آ رہے ہوں۔

یو۔پی کے اکثر مسلمان اُردو دانشوروں (جن میں بیشتر خود ساختہ دانشوروں کی ہے) کوشاں ہیں کہ کسی طرح اُردو اکاڈمی کے ممبر بن جائیں۔ اس وقت ۲۵ حضرات اس کے ممبران ہیں اب سفارش کی گئی ہے کہ تعداد ستر (۷۰) کر دی جائے تاکہ اور کچھ نہیں تو چند حضرات کی بک بک جھک جھک سے تو نجات ملے گی۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت کو دیگر معاملات سے ہی فرصت نہیں مل رہی وہ اُردو اکاڈمی کے نئے عہدہ داران کا انتخاب کے لئے وقت کہاں سے لائے۔ چنانچہ فروری سے اب تک یہ معاملہ لٹک رہا ہے اور سابقہ عہدہ داران ہی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وزیر متعلقہ کے ہاں ان حضرات کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے ان تک کسی نہ کسی عہدے کے حصول کے لئے سفارش نہ کرائی ہو اور پھر جناب عمار رضوی صاحب لکھنؤ کے ہی رہنے والے ہیں اور ویسے بھی مجلسی طور پر وہ ایک مقبول ترین شخصیت ہیں اس لئے ہر ادیب اور شاعر اُن کے ہاں جا کر اپنے آپ کو بڑے سے بڑے عہدے کے لئے موزوں قرار دلانے کی کوششیں کرتا ہے اور وہ پریشان ہیں کہ یک انار و صد بیمار والے معاملے کو کس طرح نپٹائیں اس لئے انہوں نے اسی میں ہی خیریت سمجھی ہے کہ سابقہ عہدہ داران ہی نئے انتخاب تک کام کرتے رہیں۔

مدھیہ پردیش کی اُردو اکاڈمی کے خلاف وہاں کے مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے پوسٹر شائع ہو رہے ہیں۔ چوں کہ یو۔پی اُردو اکاڈمی کی طرح مدھیہ پردیش اُردو اکاڈمی کو مالی سہولیت حاصل نہیں ہے اس لئے اس اکاڈمی کے سکریٹری اپنے احباب و اقارب کو ہی مطمئن نہیں کر پاتے تو وہ دوسروں کو کیا دیں لہٰذا وہاں معاملہ کافی حد تک دگرگوں ہے۔ مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کے مالی ذرائع بھی یو۔پی کے مقابلہ میں کم ہیں مگر وہاں کی حالت کافی سنبھلی ہوئی ہے۔ مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کے اراکین اگر مناسب خیال کریں تو انہیں کسی کتاب یا کسی ادیب کو عوام کے دوٹوں پر اعزاز نہیں دینا چاہئے کیونکہ ہمارے ہاں ادیب اور شعرا اس حد تک گر چکے ہیں کہ اپنی اور اپنی تصنیف کے بارے میں منصوبہ بند طریقے سے عوام سے تعریفی خطوط لکھواتے ہیں اور اس انتخابی مہم میں ظاہر ہے کہ شاعر اور جعلی رقم قسم کے ادیب و شاعر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ اکاڈمی کے ذمہ دار ممبران خود ہی حق و انصاف کے ترازو میں تول کر کسی کتاب یا ادیب کو اعزاز دیں۔

مہاراشٹر اُردو اکاڈمی خواجہ عبدالغفور کے رحم و کرم پر ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے مہاراشٹر اُردو اکاڈمی کی قائمی پر دیگر ممبران و عہدہ داران اکاڈمی سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ بھئی جب ہم سب نے ہی مل کر اس روپیہ کو کھانا ہے تو پھر انتظار کی کیا ضرورت ہے جو کام سال بھر میں کرنا ہے اسے ایک ہی مرتبہ کیوں نہ کر لیا جائے راجندر سنگھ بیدی کا یہ فرمان بظاہر ایک لطیفہ کی صورت میں تھا مگر اس لطیفہ میں ان اُردو اکاڈمیوں کی اصل حقیقت جس طرح نمایاں ہو کر اُبھرتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آندھرا پردیش اُردو اکاڈمی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک فعال ادارہ ہے خدا کرے کہ واقعی ایسا ہی ہو مگر کبھی کبھی کسی ادیب یا شاعر کی طرف سے مخالفانہ

آواز اس اکاڈمی کے بارے میں بھی سنائی دیتی ہے مگر موجودہ سکریٹری اکاڈمی نے اپنی سوجھ بوجھ سے اکاڈمی کو ووٹ کا اڈا نہیں بننے دیا۔

پرتاپ۔ ملاپ۔ تیج۔ ہند سماچار وغیرہ اُردو کے ایسے کثیر الاشاعت روزنامے ہیں جو کلیتہً ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں اور ہند سماچار۔ پرتاپ نیز ملاپ کی جو تعداد اشاعت ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی مسلم اُردو روزنامہ نہیں کر سکتا۔

ماہناموں میں "شمع" ایک ایسا ماہنامہ ہے جو اُردو میں سب سے زیادہ شائع ہوتا ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ "شمع" کے مالکان نے اسلام اپنی ذات۔ مسجد اور اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود رکھا ہے اور وہ پوری طرح سے اسلام کی جملہ مذہبی عقائد پر عمل پیرا ہیں مگر کاروباری طور پر انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص ہندوستانی سمجھ رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ شمع ہر مذہب کے عوام میں مقبول ہے۔ حال ہی میں "مودی شمارہ" ماہنامہ شائع ہوا ہے اور اسے بھی ایک ہندو ادارہ ہی چلا رہا ہے غرضیکہ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہندوستان میں اس وقت اگر اُردو زندہ ہے تو وہ محض غیر مسلموں کے دم سے ہے۔ ہم نہایت خلوص سے عام مسلمانوں سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ ہر ایسے مسلم ادیب و شاعر کا بائیکاٹ کریں جو کسی بھی طور اُردو کش پالیسی کا ساتھ دے رہا ہو اور اُردو کی بقا و حیات۔ کے لئے ایسے غیر مسلم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا ساتھ دیجئے جو اُردو کی بقا و حیات کے لئے کوشاں ہیں۔ اس ضمن میں جناب کالیداس گپتا رضاؔ کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ اس فرد واحد نے اُردو کو جس انداز سے زندہ رکھنے اور اسے فروغ دینے میں تن تنہا جو کام کیا ہے وہ کسی سرکاری اُردو ادارے سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُردو کے لئے جس طرح سینہ سپر ہیں اس کی گونج ہندوستان کے باہر بھی سنائی دیتی ہے اور آج ہندوستان میں ایک بھی ایسا اُردو مسلم دانشور نہیں ہے جو نارنگ صاحب کے انداز میں اُردو کے ہر موضوع پر لکھ سکے یا تقریر کر سکے رشید حسن خاں نے اُردو املا پر ایک ضخیم کتاب لکھ کر اُردو املا کی بنیاد ہی کمزور کر دی اور اس کے مقابلے میں نارنگ صاحب نے چند صفحات کا ایک کتابچہ اُردو املا پر لکھ کر اُردو املا کی روایات کو محفوظ کر دیا۔ حال ہی میں رتن پنڈوروی صاحب کی تصنیف "سرمایۂ بلاغت" شان ہند نے شائع کی ہے جو بحر الفصاحت سے بھی بہتر ہے۔ رتن صاحب کی ہی ایک اور تصنیف "فن تاریخ گوئی" بہت جلد شائع کی جا رہی ہے۔ اور ہمارا دعویٰ ہے کہ فن تاریخ گوئی پر آج تک ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی ہوگی ——

یہ ایک انتہائی مختصر سا خاکہ ہے کہ اُردو کے ہندو دانشور اس اُردو دشمن دور میں کس طرح اُردو کی بقا و حیات کے لئے کوشاں ہیں۔ اور اس پر بھی ہندوستان کے مسلمان اُردو دانشور اگر یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو ان کی میراث ہے اور اُردو کے نام پر نعرہ ہائے تیز کا رنے کا انہیں ہی حق پہنچتا ہے تو انہیں اس پر جس قدر بھی ناز ہو کم ہے۔ ••

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

بیس پچیس سال پہلے امریکی ایمبیسی کے اسٹاف کے کئی افراد دریا گنج کے نیلینس میں رہائش رکھتے تھے۔ ایک روز شام کے وقت ایک امریکی خاتون سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" کے مکان واقع پھاٹک مفتی والان پر تشریف لائیں کچھ وقت تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ سردار صاحب نے حسبِ عادت خود جائے بنا کر اس مہمان خاتون کو اور مجھے پلائی اور پھاٹک کے باہر سے منگوا کر دو دو پیسے والے مونگ کی دال والے سموسے کھلائے (یہ سموسہ اب تیس پیسے کا ملتا ہے اور سائز میں بھی چھوٹا ہے) یہ محترمہ بڑی اچھی رواں دواں اردو بولتی تھیں اور ساری گفتگو اردو میں ہی ہو رہی تھی۔ یکایک اس خاتون نے سوال کیا۔ سردار صاحب آپ کے کتنے لڑکے ہیں کیا وہ بھی جرنلزم میں ہیں یا کوئی بزنس کرتے ہیں؟ سردار صاحب کی چھٹی حس بیدار ہوئی اور انہوں نے جواب میں فرمایا۔ بڑا لڑکا سوائے شکار کھیلنے کے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اکثر دور دراز کے مستند شکاری اسے مدعو کرتے رہتے ہیں اور یہ کئی کئی دن شکار کے لئے ان کے ساتھ کبھی بھوپال تو کبھی سرگوجہ کبھی بلاسپور تو کبھی گوالیار کے پہاڑیوں پر مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ دوسرا لائیبیت رائے مارکیٹ میں ریڈیو ٹرانزسسٹر بنانے کی چھوٹی سی فیکٹری کھولے ہوئے ہے اور تیسرا کافی حد تک ہوش و حواس سے بیگانہ ہے۔ اس پر یہ صاحبہ کہنے لگیں آپ اپنے بڑے یا دوسرے لڑکے کو امریکہ بھجوا دیجئے اور ہم اس کے لئے سب انتظام کر دیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے ہونٹوں کو ایک خوشگوار گالی دیتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا کہ ان میں کون سی خوبیاں آپ کو نظر آگئیں جو آپ ان پر اتنی مہربان ہو گئی ہیں۔ محترمہ نے مقدوی حسن مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ فلاں اخبار کے مالک کے لڑکے کو ہم نے امریکہ بھجوایا اب وہ پرنٹنگ میں ٹریننگ حاصل کر کے ایک بہت بڑے پریس کا مالک ہے۔ فلاں اخبار کے مالک کے داماد کو امریکہ بھجوایا وہ جرنلزم میں ٹریننگ لے کر شہر کے اخبار کو کس قدر بہتر انداز میں چلانے لگا ہے۔ فلاں اخبار کے مالک کے لڑکے کو امریکہ بھجوایا وہ کلر پرنٹنگ کی ٹریننگ لے کر اپنے ساتھ ایسی مشین لا رہا ہے جو ایک ہی وقت میں دو رنگوں میں چھپائی کرتی ہے۔ اسی طرح آپ کا بیٹا بھی کوئی ٹریننگ لے کر یہاں واپس آ کر کوئی بزنس شروع کر سکتا ہے۔ سردار صاحب یہ ساری تفصیل بڑی خاموشی اور صبر سے سنتے رہے اور پھر جس طرح کوئی آتش فشاں پہاڑ اچانک لاوا اگلنے لگتا ہے، بڑے تلخ لہجے میں کہنے لگے میم صاحب، دیوان سنگھ اپنی ماں بہن سے PROSTITUTION تو کرا سکتا ہے مگر اپنے ملک، قوم یا قلم کو نہیں بیچ سکتا میرے لڑکے یہاں بے شک بھوکے مر جائیں مگر میں انہیں ملک سے غداری کرنے کے لئے امریکہ آپ لوگوں کے اخراجات پر نہیں بھیج سکتا میں ایسی ٹریننگ پر لعنت بھیجتا ہوں اور ایسے پریسوں پر تھوکتا ہوں۔ سردار صاحب کرسی سے اٹھے اور اچھا میم صاحب گڈ بائی کہتے ہوئے کمرے کے اندر چلے گئے اور میم صاحب بھی ٹھیٹھ خالص امریکن لہجے میں گڈ بائی کہتے ہوئے ٹپ ٹپ کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئیں۔

اکثر احباب ایڈیٹر شان ہند سے پوچھتے ہیں کہ قریباً نصف صدی سے شان ہند چلا رہے ہو نہ اپنا

[illegible]

ہے اور یہاں تک کہ تمہارے پاس سواری کے لئے سائیکل تک بھی نہیں اور نہ ہی کوئی ڈھنگ کا رہائشی مکان ہی ہے جب کہ تمہارے سامنے وہ لوگ جو صحافت کی الف بے سے بھی واقف نہیں۔ رسالے اور اخبار نکالنے کے کچھ ہی عرصے بعد کوٹھیوں۔ پریسوں اور کاروں کے مالک بن گئے ہیں اور ان کے بینک بیلنس بھی اچھے خاصے ہیں اور مزے میں رہ رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟۔

جس سرحد کا پٹھان (صوبہ سرحد کے ہندو بھی پٹھان ہی کہلاتے تھے) سے سردار دیوان سنگھ مفتون کی ساری خوبیاں سیدھی کی ہوں اس سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام کے لئے ایسی حرکتیں کرے کہ بھٹو کو تو حکومت پاکستان نے پھانسی کی سزا دی اور یار لوگوں نے اپنے اخبارات کی اشاعت بڑھانے کے لئے بھٹو کو زندہ اسلام بنا یا کہ شاید انہوں نے اپنے والد تو کیا شانِ اسلام حضرت حسینؓ کی شہادت پر بھی ایسا اظہارِ افسوس نہ کیا ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر اپنا بینک بیلنس بڑھایا۔ حالانکہ بھٹو کی پھانسی پر واویلا مچانے والے اخبارات کے مالکان بخوبی جانتے تھے کہ ان کی سات پشتیں بھی اس سلسلے میں جنرل ضیاء کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ مگر ان حضرات نے اپنے اخبارات کی اشاعت بڑھانے اور روپیہ بٹورنے کے لئے اپنے ملک میں افراتفری پھیلانے کے امکان پیدا کر دیئے۔ وہ رسائل جن کی لاگت فی پرچہ پانچ روپیہ سے کم نہیں ہو سکتی اور ان میں کوئی ڈھنگ کا اشتہار بھی نہیں وہ چالیس اور پچاس فیصدی کمیشن اپنے ایجنٹوں کو دینے کے باوجود اپنے رسائل کی قیمت دو تین روپیہ فی پرچہ رکھیں تو ہر کوئی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کے پاس روپیہ کسی جائز طریقہ سے نہیں آیا۔ اور جو شخص ناجائز روپیہ اور ناجائز بچے کو یکساں سمجھتا ہو وہ کوٹھی، کار اور پریس کا مالک کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر ایڈیٹر شانِ ہند چاہتا تو دوسرے خوشامدی ناشروں

سے نئے کمشنر صاحب کے ذریعہ سرکاری لائبریریوں سے ہزاروں روپیہ اکٹھا کر سکتا تھا اور جب کہ شانِ ہند کی شائع کردہ ان کتابوں سے ہزار بار درکار آمد اور یادگاری ہیں جن کی خریداری کمشنر صاحب دفتر نے کی ہے۔ مگر یہاں کتابوں کی نکاسی سے روپیہ وصول کرنے کی بجائے فرض شناسی کو ترجیح دی گئی ہے اور کمشنر صاحب کے اردو ادیب کا تار و پود بکھیر دیا گیا اور ان کی اس وقت تک اکلوتی اردو تصنیف "اردو کا آخری نقاد" کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہے جس سے انہیں خدشہ پیدا ہو گیا ہو سکتا ہے کہ وہ نقصان اٹھائیں۔

جب حالت یہ ہو کہ ایک اخبار نویس نائب تحصیلدار سے لے کر راشٹرپتی تک کو کسی کو باپ تو کسی کو چچا کسی کو تایا کسی کو بڑا بھائی تو کسی کو بزرگ کہہ کر اخبار میں اعلان کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ لفٹیننٹ گورنر اگر کہیں جا رہے ہوں تو انہیں راستے میں پر کار رکوا کر اور کار سے اتر کر اس اخبار نویس کی جا کر سلام بجا لاتے ہیں اور ایسی تحریروں سے وہ ہر دفتر کے سربراہوں پر دانستہ طور پر ایک غیر شعوری ڈال کر مطلب برآری کر رہا ہو تو آپ سردار تونسوی سے کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ جن لیفٹیننٹ گورنر کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہو ان کے چلے جانے پر یہ لکھے کہ اچھا ہوا لفٹیننٹ گورنر کو اندرا گاندھی نے دہلی سے کہیں اور بھجوا دیا کیونکہ لفٹیننٹ گورنر صاحب کے مزاج کچھ بگڑ گئے تھے۔ اور اتفاق سے وہی لفٹیننٹ گورنر پھر دہلی کے لفٹیننٹ گورنر بن کر آئیں تو پھر اسی لفٹیننٹ گورنر کی تعریف و توصیف میں وہ قصیدہ خوانی کی جائے کہ پچھلے قصیدے بھی حیرت زدہ رہ جائیں۔ جہاں سردار تونسوی نے کئی دکھ بہت سی باتیں سیکھی ہیں وہاں سردار دیوان سنگھ مفتون سے باتیں سیکھیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے جس کا ذکر شروع کیا گیا ہے ––

عقیل صدیقی

سرور تونسوی

کُل ہند مشاعرہ مسلم یوتھ کارنر پالی (راجستھان)

پالی راجستھان کا ایک ضلعی مقام ہے جو کپڑے کی تجارت کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہاں پر ہر روز بمبئی وغیرہ سے ہزاروں گانٹھیں کپڑا آتا ہے جسے دھلائی کرنے کے بعد مختلف مرحلوں سے گزار کر بہترین قسم کے ڈیزائنوں میں پرنٹ کرنے کے بعد ساڑھیوں، بستر کی چادروں اور شوٹوں کی شکل میں عوام کی ضروریات کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ اور یہ ساڑھیاں وغیرہ ملک بھر میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں کم قیمت اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ چنتا ساڑھیاں اپنا جواب آپ ہوتی ہیں۔ چوڑی سازی کی صنعت میں بھی پالی ایک خاص مقام ہے۔ کپڑے اور چوڑی کی صنعتوں کے باعث پالی راجستھان ہی نہیں سارے ہندوستان میں ایک ایسا قابلِ تعریف مقام ہے جہاں کوئی غریب نہیں ہے، کوئی بے کار نہیں ہے۔ جہاں آپ ہر بچے، جوان، بوڑھے یہاں تک کہ عورتوں کو بھی کسی نہ کسی کام میں مصروف پائیں گے۔ اس لئے ہر فرد مالی طور پر بے فکر ہے اور نہایت آرام اور اطمینان سے زندگی گزار رہا ہے۔ سارے شہر میں آپ کو کہیں بھی کوئی فقیر نظر نہیں آئے گا۔

پالی میں ہندو مسلم یگانگت بھی ایک مثالی شان رکھتی ہے۔ کاروباری ضروریات میں ہندو مسلم اس طرح یک جان ہو گئے ہیں کہ ہر کسی کو اپنے گھر کی چار دیواری میں آنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ جو لیڈر اپنی روزی روٹی کی خاطر قومی یک جہتی کا ورد کرتے نہیں تھکتے انہیں چاہئے کہ کچھ روز پالی میں رہ کر دیکھیں کہ قومی یک جہتی کس بہتی چڑیا کا نام ہے اور اسے کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پالی میں ایک فلاحی ادارہ ہے "مسلم یوتھ کارنر" جو ایک ایسی سماجی تنظیم ہے جو تعلیمی، سماجی، معاشی اور فلاحِ عوام میں دلچسپی رکھتی ہے۔ یہ ادارہ دو پولیو سینٹر چلا رہا ہے جس میں پولیو ٹیکسوں کے علاوہ DPT اور BCG نیز دیگر ادویات بھی دی جاتی ہیں۔ مہینہ میں ایک مرتبہ کسی ایک بیماری کے ماہر کو مدعو کیا جاتا ہے اور اس بیماری سے علیل عوام کو معاوضہ دیئے بغیر اس اسپیشلسٹ سے ہر قسم کا طبی مشورہ حاصل کرنے کی عام دعوت دی جاتی ہے اس بیماری سے متعلق مفید ادویات ریڈ کراس کی طرف سے مہیا کی جاتی ہیں۔ پالی اور گرد و نواح کے عوامی میلوں، عرسوں اور دیگر اجتماعات کے موقع پر یہ ادارہ بغیر کسی معاوضہ کے طبی خدمات انجام دیتا ہے نیز پیاؤ وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ گرمی کے موسم میں ریلوے اسٹیشن پر تمام آنے جانے والی گاڑیوں کے مسافروں کو پانی پلانے کا انتظام بھی اس تنظیم کے رضاکار کرتے ہیں۔ آفاتِ سماوی و ارضی کے وقت بلا تخصیص مذہب و ملت عوام کی خدمت کی جاتی ہے موروی گجرات کے طوفان اور راجستھان میں سابقہ دنوں آئی غضبناک باڑھ میں اس تنظیم نے اپنے والنٹیئر بھیجے اور امدادی سامان بھی بھجوایا۔ جب بھی پالی سیوا منڈلی کی طرف سے آئی کیمپ لگتا ہے تو تنظیم کے رضاکار آپریشن کرانے والے مریضوں کی خدمت کرتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق ادویات

غیرہ بھی مہیا کی جاتی ہیں۔ اس تنظیم کی طرف سے
وسال سے ایک مستقل پیاؤ ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ
ر جاری ہے۔ ہندو مسلم تہواروں کے دن سرکاری ڈسٹرکٹ
سپتال میں داخل جملہ مریضوں کو پھل یا لبسکٹ کے
یٹ تنظیم کی طرف سے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ گزشتہ
سال سے یہ تنظیم سردیوں کے دنوں میں چادریں اور
مل مستحق لوگوں میں مفت تقسیم کر رہی ہے۔ ضرورت مند
ب علموں کو تنظیم کی طرف سے تعلیم جاری رکھنے کے
ے کتابیں اور مالی امداد دی جاتی ہے۔ ایسے مسافر
واقعی مدد کے مستحق ہوتے ہیں تنظیم ان کی بھی خدمت
تی ہے۔ تنظیم ایسے سیمنار منعقد کراتی ہے جس میں
بوقت اور ہر مذہب کے بزرگوں کے بارے میں خیالات
ظہار کرنے کے لئے معززین کو مدعو کیا جاتا ہے۔
۲۶ر جنوری، ۱۵ر اگست اور عید میلاد النبی کے مبارک
قع پر مقامی شعرائے کرام کے تعاون سے تنظیم
شاعرے کراتی ہے۔ تنظیم سکولوں میں اردو پڑھانے
ے کے لئے موزوں انداز میں کوشاں ہے اور اس
سلے میں محکمہ تعلیم کے ذمہ دار افسران سے بات چیت
کی ہے۔ تنظیم کے دفتر میں مدرسہ شبینہ برائے بالغان
ی ہے جس میں اردو ہندی پڑھانے کے ساتھ
حساب کا طریقہ بھی سکھایا جاتا ہے۔
ماہ رمضان، عرس اور عیدین اور جملہ اسلامی
یبات پر تنظیم ہر ممکن خدمات انجام دیتی ہے
سیوا منڈل آئی ہسپتال میں وارڈ سنٹی
ن پلانٹ اور آپریشن تھیٹر کے لئے روم کو رکمی
کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ
لیس کلب نے جو فیز رد تھیٹر ہال بنوایا ہے
کی تعمیر میں بھی تنظیم نے کچھ مالی خدمت کی ہے۔
۱۹۸۱ء میں یہ طے کیا گیا کہ چونکہ خدمت، دوستی
بھائی چارہ کو بڑھا وا دینا اس تنظیم کا اصل مقصد
ہے اس لئے جو حضرات اس سلسلہ میں قوم کی نمایاں

خدمات انجام دیں انہیں تنظیم کی طرف سے عوامی اجتماع میں
سپاس نامے پیش کئے جایا کریں۔ لہذا اب تک مرحوم بابو
بھائی چوڑی گر۔ کریم جی گزدھر۔ محمد عمر صاحب سوداؔ۔ اور
عبدالستار صاحب سلاہٹ اس اعزاز سے نوازے جا چکے
ہیں۔ اس وقت تنظیم کے سرپرست ہیں جناب محمد شریف
ایڈوکیٹ اور صدر ہیں جناب رضوان اعجازی۔ ڈاکٹر
محمد اقبال صاحب چیرمین ہیں اور غلام رسول صاحب چھیپا
جنرل سکریٹری ہیں۔ عبدالوحید صاحب میوہ فروش خازن ہیں
اور نذر محمد صاحب میوہ فروش نائب خزانچی ہیں تنظیم کے
کل چالیس ممبران ہیں۔ اس مرتبہ تنظیم نے یہ طے کیا کہ پالی میں
ایک آل انڈیا مشاعرہ کرایا جائے۔ چنانچہ سردار احمد
سردارؔ مشاعرہ کمیٹی کے چیرمین بنائے گئے اور شیخ عبدالعزیز
خان اور محمد رفیق صاحب میوہ فروش دو وائس پریذیڈنٹ
چنے گئے اور جوائنٹ سکریٹری ہارون علی کاشف بنائے گئے۔
زمانہ قدیم میں جب پری ہار راجپوتوں کی حکومت تھی
تو یہاں پلّی وال برہمن رہا کرتے تھے۔ اسی لئے اس مقام کا
نام پالی ہو گیا۔ پلّی وال برہمنوں کی اس وقت یہاں
ایک لاکھ سے زائد آبادی تھی۔ اگر کسی دوسرے مقام سے
آیا ہوا پلّی برہمن یہاں آکر بس جاتا تو ہر پلّی وال برہمن اسے
ایک روپیہ اور ایک اینٹ دیتا جس سے اس کا رہائشی
مکان بھی بن جاتا اور کاروبار کے لئے روپیہ بھی حاصل
ہو جاتا۔ کسی پری ہار راجپوت حکمران نے ایک پلّی وال برہمن
لڑکی کی بے حرمتی کی تو اس واقعہ سے متاثر ہو کر تمام
پلّی وال برہمنوں نے اس مقام سے ہجرت کر لی۔ اور یہ
طے کیا گیا کہ اس نسل کا کوئی بھی فرد اب اس مقام پر
نہیں بسے گا۔ اگر اتفاقاً یہاں آنا ہو تو کوئی بھی پلّی وال
برہمن یہاں رات کو قیام نہیں کرے گا لہٰذا اس عہد پر آج
بھی پلّی وال برہمن قائم ہیں۔ اور اگر کوئی پلّی وال برہمن
پالی میں کسی کام کی غرض سے آبھی جاتا ہے تو وہ کسی بھی
قیمت پر پالی میں شب بسری نہیں کرتا۔ پلّی وال برہمن
خاندان کے پنڈت رادھا کرشن اب بھی یہاں مقیم ہیں

جو ایک مسلّم پاسٹ وِیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ پنڈت رادھا کرشن جی کا کہنا ہے کہ ان کا مکان اس وقت کی پالی کے حدود سے باہر ہے۔

اسی باغیرت اور باعزت سرزمین پر اُردو زبان کی عزت اور بقا و حیات کے لئے مسلم یوتھ کارنر پالی کی طرف سے ایک کُل ہند مشاعرہ ہو رہا ہے اور راجستھان کے مشہور شاعر جناب یوسف ثانی آف پالی کا عقیدت و خلوص کا مظہر مکتوب گرامی لے کر جناب رضوان اعجازی صاحب اور سردار احمد سردار صاحب، دفتر شان ہند میں تشریف لائے ہیں کہ آپ کا یہ نیا زمند ایڈیٹر شان ہند اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال سپُرد قلم کرے۔ حالاں کہ میری صحت اور مصروفیات اس دور دراز سفر کی اجازت نہیں دیتیں مگر اپنوں کی خواہش اور حکم کا احترام کرنا بھی تو اپنی جگہ مسلّم ہے۔ پالی ایسی باغیرت سرزمین پر ہو رہے اس پہلے آل انڈیا مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال پیش خدمت ہے۔

حی الاسلام اُردو پرائمری اسکول جس کا سنگِ بنیاد راجستھان کے مفتی اعظم الحاج اشفاق صاحب مہتمم دارالعلوم اسحاقیہ جودھ پور پچھلے دنوں فرما چکے ہیں۔ اس سکول کی بلڈنگ تعمیر کرانے کی غرض سے مسلم یوتھ کارنر پالی یہ مشاعرہ کرا رہی ہے تاکہ پالی کے مخیر حضرات سے عطیات حاصل کئے جا سکیں۔ اس ضمن میں پالی کی ایک ایسی مقبول ترین ہستی کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے جو اس تنظیم کے عام ممبر بھی نہیں ہیں مگر تنظیم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ہیں۔ ایس۔ ایف۔ کیو۔ انجینئرنگ ورکس کے مالک مستری قمرالدین صاحب۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے پالی کا کوئی باشندہ ہی ہوگا جو انہیں نہ جانتا ہو۔ ہر کارخانے کا مالک ان کا وجود اپنے لئے قدرت کا عطیہ سمجھتا ہے کیوں کہ قدرت نے انہیں ہر قسم کی مشینوں کے بارے میں وافر سوجھ بوجھ عطا کی ہے اور ان کی نسبت یہی مشہور ہے کہ کوئی مشین کیسی ہی کیوں نہ ہو اس کا ہر نقص اور عیب ان کا ہاتھ لگتے ہی دُور ہو جاتا ہے اور ہندوستان بھر میں اکثر و بیشتر کارخانوں اور ملوں میں مشینوں کی مرمت اور اُن کے نقائص دُور کرنے کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس مشاعرے کے انعقاد کے لئے جو مقدس مقصد تنظیم کا ہے اس کے لئے مستری قمرالدین صاحب نے بھرپور کوشش کی ہے اور عطیات فراہم کرنے میں جس لگن اور محنت کا مظاہرہ انہوں نے کیا ہے کاش اس کی پیروی کرنے کے لئے ہر جگہ کئی مستری قمرالدین پیدا ہوں جو اسی طرح قومی اور ملی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی سمجھیں۔

آج ۱۲ رمئی ۱۹۸۳ء سینچر وار ہے، پالی کا ٹاؤن ہال اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہیں سما رہا کیوں کہ پالی میں پہلا کُل ہند مشاعرہ اسی خوشنما ہال میں ہو رہا ہے۔ اس وقت رات کے دس بجے ہیں۔ جناب یوسف ثانی صاحب نے مائیک پر آ کر مشاعرے کے مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر ڈی۔ ڈی سولنکی صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ سٹیج پر تشریف لے آئیں۔ سولنکی صاحب سٹیج پر آئے تو سامعین نے تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا ہے یوسف ثانی صاحب نے مستری قمرالدین صاحب سے شمع روشن کرنے کی درخواست کی ہے۔ قمرالدین صاحب شمع روشن کر رہے ہیں اور ثانی صاحب یہ شعر پڑھ رہے ہیں

ہر رہ گزر پہ شمع جلانا ہے میرا کام
تیور ہیں کیا ہوا کے یہ میں دیکھتا نہیں

رضوان اعجازی صدر تنظیم نے مہمان خصوصی اور جملہ شعرائے کرام کی گُل پوشی کی ہے۔ حضرت ساغر نظامی (پدم وبھوشن) سے مودبانہ التماس کیا گیا ہے کہ وہ مسندِ صدارت پر تشریف لے آئیں۔ مجوزہ صدر صاحب مسندِ صدارت پر تشریف لائے تو جناب محمد شریف صاحب ایڈوکیٹ اور نثار احمد صاحب نے ان کی گُل پوشی کی ہے پالی کے معزز شاعر جناب غنی صاحب نے بھی صدر صاحب

اور دیگر شعرائے کرام کی گل پوشی کی ہے۔ ثانی صاحب نے تنظیم کے سرپرست جناب شریف صاحب ایڈوکیٹ سے عرض کیا ہے کہ وہ استقبالیہ تقریر فرمائیں۔ شریف صاحب اُردو، فارسی عربی اور انگریزی میں خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ ڈاکٹر ٹیگور کا فرمان ہے جو شخص خوبصورتی اور خوش کن آواز کو سُن کر خوش نہیں ہوتا وہ بیمار ہے۔ تقریر کیا ہے شریف صاحب کے وسیع مطالعہ اور فنِ خطابت کی آئینہ دار ہے۔ مختلف شعرا کے برمحل اشعار نے تقریر میں اور بھی لطف پیدا کر دیا ہے۔ اب حکم ہوا ہے کہ بدم دہبوش حضرت ساغر نظامی صدر مجوزہ اور جناب رفعت سروش جو اس مُشاعرہ کی نظامت فرمائیں گے کا تعارف ایڈیٹر شانِ ہند کرائیں۔ اور چونکہ اب مُشاعرہ باقاعدہ شروع ہو رہا ہے لہذا ایڈیٹر شانِ ہند ہی شمعِ مُشاعرہ روشن کریں۔ چونکہ جملہ بیرونی شعراء پالی میں پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں لہذا راقم الحروف نے صاحب صدر اور رفعت سروش صاحب کے بھرپور تعارف کے ساتھ ساتھ دیگر غیر مقامی شعراء کا بھی مختصر تعارف کرایا ہے اور مُشاعرہ کی شمع بھی روشن کر دی ہے۔ لیجئے رفعت سروش نے نظامتِ مشاعرہ کے لئے مائیک سنبھال لیا ہے اور اہل پالی کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد صاحب صدر سے خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے کی التجا کی ہے۔ ساغر صاحب نے نہایت موزون الفاظ میں سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے راجستھان سے اپنا تعلق اور اپنے بزرگوں کی راجستھان سے وابستگی کا ذکر فرماتے ہوئے اُردو شاعری کی ہمہ گیری پر خوشگوار تبصرہ فرماتے ہوئے شعراء کے کردار سے متعلق یہ فرماتے ہوئے تقریر ختم کی ہے ؎

انسانوں کو ہم درسِ بقا دیتے ہیں
سینوں میں نئی آگ لگا دیتے ہیں
وہ رزم ہو یا بزم ہو ہم اہلِ قلم
احساس کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

رفعت سروش صاحب نے موزوں انداز میں چند الفاظ کہنے کے بعد مُشاعرے کی بسم اللہ جناب بسمل نقشبندی کی نعت سے کی ہے۔ بسمل صاحب نے والہانہ انداز سے نعت سُنا کر مُشاعرہ کی ابتدا کی ہے اور نعت پر داد بھی خوب پائی ہے رفعت سروش نے یہ شعر ؎

دامن کو اپنے غیرتِ یوسف سنبھال لینا
پھر ہوگئی جوان زلیخا ترے لئے

سُنا کر یوسف پالوی سے کلام سُنانے کی فرمائش کی ہے۔ یوسف پالوی چار مصرعے سُنا رہے ہیں ؎

چار تنکوں نے بُلندی میں جگہ پائی ہے
برق بھی جن کی زیارت کو چلی آئی ہے
آپ کیا لائے ہوائے چاند پہ جانے والو
لاکھ اُلجھے ہو مگر ہاتھ میں خاک آئی ہے

اس کے بعد غزل شروع کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

قدرت کا کرشمہ دیکھا ہے کس نے یہ سنہرے پانی میں
آئینے کی طرح دیکھے ہیں انسان کے چہرے پانی میں
ہر بات سے اے ناداں نہ کھیل اک بات پہ ہو جا تو قائم
مچھلی کی طرح مت کھا غوطے تو شام و سحر پانی میں

غزل پر یوسف ثانی کو اچھی داد ملی ہے۔ رفعت سروش فرما رہے ہیں ؎

آب رنگیں ہے سادہ پانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

ایک یوسف صاحب تو پانی پانی ہوگئے حالانکہ ڈاکٹر اقبال فرما گئے ہیں ع پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات۔ لیجئے اب یوسف ثانی کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ یوسف ثانی صاحب پالی کے سنجیدہ۔ انتہائی شریف اور مقبول ترین شاعر ہیں۔ ثانی صاحب بھی تنظیم کے ابتدائی ممبر تک نہیں ہیں مگر ہمیشہ تنظیم کے لئے دستِ راست رہے ہیں۔ ثانی صاحب مختلف اشعار اور قطعات عنایت کر رہے ہیں ؎

مرے لئے بھی بہت ساری بددُعائیں تھیں
بچا ہوا ہوں کسی کی دُعا لگے ہے مجھے

پچھلے دنوں ثانی صاحب ایک عرصہ تک موت و زیست کی کشمکش میں رہے۔ واقعی یہ خدا کا کرم اور کسی کی دُعا ہی

ہے کہ آپ صحت یاب ہوئے (خدا اُنہیں عمر طویل دے)
رماتے ہیں ؎

دفعتاً میری یاد آئے گی ...
جب ہوا میں دیا جلائیں گے لوگ
اس قدر خوش ہیں گھر سے باہر سب
اب کبھی جیسے گھر نہ جائیں گے لوگ

صاحب صدر داد دیتے ہوئے اسے دوبارہ سُنانے کا ارشاد
رمارہے ہیں۔ ثانی صاحب تعمیل حکم کے بعد فرمارہے ہیں ؎

وہ جانتا ہے کرب چھپانے کا ہُنر خوب
ہر ایک سے کھُل مِل کے جو نہیں بول رہا ہے

سامعین اور شعرا سے داد پاتے ہوئے ثانی صاحب پالی
والوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں ؎

اپنے اس شہر کی ہر چیز سے ہے عشق ہمیں
جی نہیں کرتا یہاں سے کہیں جانے کے لئے
عقلمندوں کو اشارہ ہی بہت ہے ثانی
ہر کسی کو نہیں ہر بات بتانے کے لئے

پالی والوں سے جی بھر کر داد پاتے ہوئے ثانی صاحب کہہ
رہے ہیں ؎

ہے کبھی پھول کبھی کانٹا ہے
مہکتی چبھتی پہیلی ہے صنم
ناز اُٹھواتی ہے کیسے کیسے
زیست کیا تیری سہیلی ہے صنم

مست پُروا چلے کر لُو جھلسائے
دھیان ثانی کسی پہ دھرتے نہیں
ہم بکھرتے ہیں خوشبوؤں کی طرح
دوست پھولوں کی مثل مرتے ہیں

حوصلوں کو سلام کرتی ہیں
منزلیں خود کلام کرتی ہیں
جُرأت تمہارا رہرو کی اے ثانی
رہنمائی کا کام کرتی ہیں

داد پاتے ہوئے ثانی فرمارہے ہیں کہ دو شعروں میں اپنے
ہاں کی حالت بیان کی ہے ؎

خود نظر آنکھوں کو دیتی ہے فریب
باڑھ کھائے کھیت کیا رے گاؤں میں
باڑھ لے تا نڈو کیا پچھلے برس
اب کے ہے سوکھا ہمارے گاؤں میں

داد کا شور کم ہوا تو ثانی فرمارہے ہیں ؎

خوب رونق ہے ترے شہر میں دن رات مگر
چین لوگوں کا یہاں کس نے چُرا رکھا ہے

ثانی صاحب داد و تحسین سے یوسف ثانی بنے اپنی جگہ پر گئے
تو رفعت سروش فرمانے لگے ؎

اُس کی آنکھیں پیچھے ہیں چلتا ہے وہ اُلٹے پاؤں
نئے سفر پر نکلا تھا جا پہنچا پُرکھوں کے گاؤں

یہ سفر جو یوسف ثانی کا تھا یعنی پانی سے پالی تک کا ہے
جو ان کی وطن دوستی کا مظہر ہے۔ اب رفعت سروش نے
اچھے تعارف کے ساتھ مشاعرے کے ایک اہم رکن جناب
سردار پانوی سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ سردار
صاحب قطعہ سُنا رہے ہیں ؎

آنکھ بھی دل کی بات کہتی ہے
یہ زباں ہے کہے کہے نہ کہے
اشک سردار دل سے بہتے ہیں
آنکھ سے کیا بہے بہے نہ بہے

قطعہ پر صاحب صدر کا داد دینا تھا کہ ہال تالیوں سے گونج
اُٹھا ہے۔ رفعت سروش فرمانے لگے۔ ایک شعر یاد آیا ہے
آپ بھی سُن لیجئے ؎

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

سردار صاحب بڑے مسحورکن ترنم سے غزل شروع کر رہے ہیں

اے دل تجھے جینے کا ہم راز بتا دیں گے
پھولوں کی طرح رہنا کانٹوں میں سکھا دیں گے
اک روز وجود اپنا وہ خود ہی مٹا دیں گے
تہذیب کی دیواریں جو لوگ گرا دیں گے

داد ہے کہ سردار صاحب سردارِ مشاعرہ بنے نظر آرہے ہیں۔ اہلِ پالی داد کے قابل ہیں کہ وہ اپنے ہاں کے مقامی شعراء کو بھی داد فراخ دلی سے دے رہے ہیں حالاں کہ عام طور پہ مقامی شعراء کی اچھے اشعار پر بھی داد نہ دے کر دل شکنی کی جاتی ہے۔ ویسے بھی راجستھان میں یہ مشہور ہے کہ مشاعرہ میں داد دینے (داد دینے والے) پالی سے مدعو کرنے چاہئے کیوں کہ پالی والے اچھے شعر پہ خواہ وہ کسی کا ہو ضرور داد دیتے ہیں۔ سنئے سردار صاحب حالِ دل کس بے بسی سے بیان کر رہے ہیں ؎

اب زیست کا ہر لمحہ لگتا ہے پرایا..
کب تک وہ جُدائی کی اب اور سزا دیں گے
بے داغ نہیں ہے جب کوئی بھی یہاں دامن
کس کس کو خطاؤں کی اب آپ سزا دیں گے

لحن داؤد میں سردار صاحب کا مقطع بھی سماعت فرمائیے ؎

محرومِ ضیا خود ہیں سردار جو دُنیا میں
کیا خاک اندھیروں کو وہ لوگ ضیا دیں گے

سردار صاحب تعریف و توصیف کی آوازوں میں اپنی جگہ چلے آئے تو اعلان ہوا ہے کہ جناب چھیپا عثمان غنی صاحب غنی کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

ہے بانکپن ترے چہرے پہ میرے فن کی طرح
جبیں پہ تیری سمٹ کر رہوں شکن کی طرح

اُدھر نثار ہوئے جا رہے ہیں پروانے
میں جل رہا ہوں اِدھر شمعِ انجمن کی طرح

مری نگاہ میں دیر و حرم برابر ہیں...
مرا مزاج نہیں شیخ و برہمن کی طرح

داد غنی صاحب کے اس شعر کا حق ہے۔ سنئے غنی صاحب اُردو کی حالتِ زار پہ کیا طنز فرما رہے ہیں ؎

زبانِ اُردو ترا یہ نصیب کیا کہئے..
وطن میں اپنے ہی رہتی ہے بے وطن کی طرح

داد پاتے ہوئے غنی صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؎

خدا کرے نہ بسر زندگی ہو کانٹوں میں
رہوں صحنِ چمن میں غنی گلِ سمن کی طرح

غنی صاحب غزل پر بہت اچھی داد پانے کے بعد مائیک سے الگ ہوئے تو رفعت سروش نے یہ شعر ؎

رات کہتے ہیں تری زلفِ گرہ گیر کو لوگ
تو اگر اس کو اُلٹ دے تو اُجالا ہو جائے

سُنانے کے بعد جناب خوشدل صاحب خان پوری کو کلام سنانے کی تکلیف دی ہے۔ خوشدل صاحب نے مزاحیہ کلام سُنا کر مناسب داد پائی ہے۔ افسوس ہے کہ خوشدل صاحب کا کلام اس لئے نوٹ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ مشاعرے کے بعد ان سے کلام کی نقل لے لی جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اس لئے آپ ان کے کلام سے محروم رہے۔ ایک صاحب پنڈال میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ مختلف حضرات سے پرچے پر پرچے بھجوا رہے ہیں کہ انہیں پڑھوایا جائے اور مشاعرے میں خاصی بے لطفی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ تنگ آکر سردار صاحب نے انہیں سٹیج پر بُلا لیا۔ یہ صاحب ہیں منصف پالوی۔ مائیک پر جو اُن کی مرضی میں آرہا ہے کہہ رہے ہیں۔ پالی کے عوام انہیں دماغی طور پر قابلِ رحم سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے گھر والوں کا کھانا دوبھر کر دیا کہ وہ منتظمین مشاعرہ سے کہہ کر انہیں مشاعرے میں پڑھوائیں۔ مجبوراً ان کے گھر والوں نے منتظمین مشاعرہ سے استدعا کی کہ انہیں مشاعرہ میں پڑھوا دیجیے۔ تاکہ ہمارا کھانا پینا حرام نہ ہو۔ اب رفعت سروش فرما رہے ہیں کہ ایک مرتبہ نوچندی میرٹھ کے مشاعرہ میں ساغر صاحب نظامی نے ایک شعر سُنایا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ساغر صاحب شاعری کے آسمان پر نصف النہار بن کر چمک رہے تھے ؎

رند ہوں کب دوسرے کا آسرا رکھتا ہوں میں
آنکھ میں ساغر نظر میں میکدہ رکھتا ہوں میں

چنانچہ یہ شعر سُنتے ہی ساغر القادری جودھ پوری مائیک پر آ گئے ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں ؎

اِدھر کھُلی آنکھوں کا سپنا ہو گیا
حال بھی ماضی کا قصہ ہو گیا
درد و غم کی چلچلاتی دھوپ میں
ذہن سا دریا بھی صحرا ہو گیا

علم کی اک دو کتابیں پڑھ کے وہ
زعم میں اپنے اکیلا ہو گیا

ہر قدم پر زیست سے کھا کے فریب
خون کا اپنے ہی ، پیاسا ہو گیا

وقت پر جس کو چڑھایا دار پر
آج وہ ساغر مسیحا ہو گیا

ساغر القادری صاحب غزل پر خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ آ گئے تو جناب رفعت سروش فرمانے لگے۔ یوپی میں ایک کہاوت ہے کہ ایک نور نور ہزار نور کپڑا ۔ ہزار نور اداؤں کا نور نخرہ ۔

غزل کو اگر ترنم سے آراستہ کر کے پڑھا جائے تو اور بھی نور آ جاتا ہے ۔ اب بسمل نقشبندی سے ان کی غزل سنئے بسمل نقشبندی نے اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنا کر بہت اچھی داد پائی ہے ۔ افسوس ہے کہ منتظمین مشاعرہ کسی بات پر مجھ سے مشورہ کرتے رہے اور میں یہ غزل نوٹ نہ کر سکا۔ لیجئے اب راجستھان کا ہیرو ش۔ک ۔ نظام تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مائیک پر آیا ہے پہلے تو ان کی دو رباعیات سنئے ؎

وہ سوز وہ جذبات کہاں سے لاؤں
گم گشتہ کرامات کہاں سے لاؤں
اے رات کے بڑھتے ہوئے تیرہ سایو !
گزرے ہوئے لمحات کہاں سے لاؤں

ماضی کی ہر اک چوٹ ابھر آئی ہے
یہ درد مری جان کا تمنائی ہے
آ جاؤ کسی طرح کہ تا حدِّ نظر
تنہائی ہے تنہائی ہے تنہائی ہے

لگتا ہے کہ میونسپل ہال زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ میری دیواروں نے ایسی داد کا شور کبھی نہیں سنا ۔ اب ش۔ک نظام سے ایک غزل کے کچھ اشعار سنئے ؎

وہ راستے میں جو اکثر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک پھول پہ نشتر دکھائی دیتا ہے

خلوص و مہر کا پیکر دکھائی دیتا ہے
وہ ایک شخص جو پتھر دکھائی دیتا ہے

لحد کی خاک پہ سویا ہوں تو تعجب کیا
تھکے ہوئے کو تو بستر دکھائی دیتا ہے

تو ہی بتا دے کہ جاؤں تو پھر کہاں جاؤں
خدا کے بعد ترا گھر دکھائی دیتا ہے

داد تو خیر نظام کی قسمت میں ودیعت ہو چکی ہے ۔ اب نظام پُر زور مطالبہ پر ترنم سے غزل سنا رہے ہیں ؎

دریچہ راہ کوئی دیکھتا ہے
دیا دہلیز پر بجھتا ہوا ہے

نہ منزل ہے نہ کوئی نقشِ پا ہے
یہاں تو راستہ ہی راستہ ہے

ہمارے ساتھ کیا کیا ہو گیا ہے
ملاتم سے تو اندازہ ہوا ہے

زمانے بھر کو رسوا کرنے والا
مری خاطر بہت رسوا ہوا ہے

بتاؤں گا میں اس سے کیا بہانے
وہ میرے سب بہانے جانتا ہے

کسی کی زندگی ہم جی رہے ہیں
ہماری موت کوئی مر رہا ہے

داد ہے کہ نظام صاحب گویا اپنا حق حاصل کر رہے ہیں ۔ نظام صاحب مائیک سے الگ ہو کر اپنی جگہ آنے لگے تو سامعین نے تالیوں کی طویل جھنکار اور اونچی آواز میں مطالبہ کیا ہے کہ نظام صاحب ایک گیت بھی سنائیے ۔ اس پر رفعت سروش فرمانے لگے کہ نظام صاحب مجھ سے بیس سال چھوٹے ہیں ایک آواز آئی ہے کہ شاعری میں آپ سے بیس سال آگے ہیں مگر رفعت سروش صاحب نے اس آواز پر دھیان نہ دیتے ہوئے نظام صاحب سے گیت سنانے کی فرمائش کی ہے اور نظام صاحب نے برس رہا بادل ، چھلکدی چھاگل گیت اس والہانہ انداز سے سنایا ہے کہ سامعین نے متفقہ طور پر انہیں "مین آف دی مشاعرہ" قرار دیا ہے

ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ بشیر بدر، وسیم بریلوی اور زبیر رضوی کی جملہ شعری روایات اکیلے نظام صاحب میں اس طرح سمو گئی ہیں کہ یہ راجستھانی شاعر بڑے بڑوں کے چراغ گل کر دے گا۔ اللہ انہیں نظر بد سے بچائے۔ منتظمین مشاعرہ بلا خوف و خطر ش۔ک۔ نظام صاحب کو اپنے ہاں کے مشاعروں میں مدعو کر سکتے ہیں۔ اور یقیناً وہ نظام صاحب کی کامیابی سے اپنے ہاں کے مشاعرے کو جلا بخشیں گے۔ ۲۶/ جنوری کے مبارک موقع پر ہر سال جو مشاعرہ لال قلعہ میں ہوتا ہے اس مشاعرہ کے لئے ش۔ک۔ نظام ایک نہایت ہی موزوں شاعر ہوں گے۔ کاش لال قلعہ مشاعرہ کمیٹی کے ارکان ش۔ک۔ نظام ایسے مُلک کے اُبھرتے اور قابلِ قدر شعرا کو مدعو کیا کریں۔

نظام صاحب داد سے لدے پھندے اپنی جگہ تشریف لائے تو رفعت سروش صاحب نے نظام صاحب کی تعریف کرنے کے بعد بہت ہی اچھے انداز میں ہلال سیوہاروی سے درخواست کی ہے کہ کلام سُنائیں کیوں کہ ش۔ک۔ نظام نے مشاعرے کو جس بلندی پر پہنچا دیا ہے اسے برقرار رکھنے کے لئے ہلال صاحب کو ہی مائیک پر بُلایا جانا ضروری تھا۔ سُنئے ہلال صاحب بھی سُنتے ہوئے اشعار سُنا رہے ہیں۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ اہلِ ہالی کے لئے یہ کلام نیا ہے ؎

غریبی کو مٹا دینے کی باتیں صرف باتیں ہیں
جو خود دولت کے بھوکے ہوں غریبی کیا مٹائیں گے
غریبوں کا لہو تو آپ کی کاروں کا ڈیزل ہے
غریبی مٹ گئی تو آپ کیا رکشے چلائیں گے

ہلال صاحب نے چند قطعات سُنانے کے بعد ایک نظم سُنائی ہے بے شک انہیں داد ملی ہے مگر نظام صاحب کے کلام کا اثر ابھی تک سامعین کے دلوں پر ہے لہٰذا ہلال صاحب جس قدر داد کے مستحق تھے وہ داد انہیں نہ مل سکی۔

اب جناب اعجاز صدیقی مرحوم کے فرزند ارجمند اور حضرت علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کے پوتے جناب افتخار امام صدیقی شاعر کا بہت ہی اچھا تعارف کرانے کے بعد رفعت سروش نے انہیں کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ پُرزور استقبالی تالیوں کے شور میں افتخار امام صاحب مائیک پر تشریف لاتے ہیں اور بہت ہی اچھی تقریر کے بعد تحت میں ایک قطعہ اور کچھ متفرق اشعار سُنا رہے ہیں ؎

اچھا ہوا جو آپ نے وعدے بھلا دیئے
ہم نے اپنے نام کے سب خط جلا دیئے
ہم سے فقیر وقت سے لیتے نہیں ہیں کچھ
ہاں جو ملا اسی کے مقدر جگا دیئے
کیا جانے کس چیز کی چہروں میں کمی ہے
آئینے تو ہیں ان پہ مگر گرد جمی ہے

نغمے سے ساز ساز سے مضراب ہٹ نہ جائے
ویسے سُروں میں گاؤ کہ آواز پھٹ نہ جائے

اب ترنم سے غزل شروع کی ہے۔ ترنم کو تو میں الفاظ میں بند نہیں کر سکتا وہ تو کسی مُشاعرے میں خود افتخار امام صاحب کا کلام سُنتے وقت سماعت فرمایئے گا۔ یہاں غزل کے اشعار حاضر ہیں ؎

مجھے آنسوؤں میں سجا کے نہ جا تو
بہت غم زدہ ہوں رُلا کے نہ جا تو
مری وسعتوں میں کمی آ نہ جائے
سمندر کو دریا بنا کے نہ جا تو

داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اب جو شعر میں پیش کر رہا ہوں اسے سرور تونسوی ایڈیٹر شانِ ہند کی نذر کرتا ہوں ؎

مسلسل نوازش عنایت، توجہ
محبت یوں مجھ میں چھپا کے نہ جا تو

اس غزل کا ایک شعر اور پیشِ خدمت ہے ؎

ٹھہرنا مسافر کی قسمت نہیں ہے
کوئی قید مجھ پہ لگا کے نہ جا تو

داد کے شور میں افتخار امام مائیک سے ہٹنے لگے تو ایک اور اکیلا اور کا مطالبہ انہیں ٹھہرنا ہی پڑا، فرماتے ہیں ؎

حسرتوں نے دُکان سجالی ہے ⁂ لمحہ لمحہ مرا سوالی ہے
زندگی اب تو ایک گالی ہے ⁂ جی رہے ہیں کہ کچھ نہیں ممکن

داد ہے کہ اس شعر کا حق ہے اور افتخار امام صاحب اپنا یہ حق یوں وصول کر رہے ہیں ؎

پھونک دو ضبط کے نوشتے سب
کیا مصیبت گلے لگالی ہے
غم سے اس کا عجیب رشتہ ہے
ایک لڑکی جو بھولی بھالی ہے

اس شعر پر داد تو بھولی بھالی لڑکی کی وجہ سے دی جا رہی ہے تاہم شعر اچھا ہے ؎

زندوں میں اسیر ہوں پھر بھی
راہ جینے کی اک نکالی ہے

سامعین افتخار امام صاحب کو مائیک چھوڑنے کی اجازت ہی نہیں دے رہے ہیں ایک اور ایک اور کا مطالبہ ہے کہ ہال میں بڑے زوروں سے گونج رہا ہے۔ رفعت سروش فرماتے ہیں کہ دوسرے دَور میں جب تک آپ کہیں گے افتخار امام صاحب آپ کو کلام سُنائیں گے۔ اس پر آواز آئی ہے کہ صبح پانچ بجے تک۔ رفعت سروش نے ترکی بہ ترکی جواب دیا آپ نمازی معلوم ہوتے ہیں مشاعرے کے بعد مسجد کا رُخ کرنے کے لئے آپ نے ۵ بجے کا وقت فرمایا ہے تاہم ایسے ہی سہی صبح ۵ بجے تک ہی مشاعرہ چلے گا۔ لیجئے اب میں اپنی بھابھی صاحبہ محترمہ ذکیہ سلطانہ صاحبہ نیّرؔ سے مودبانہ التماس کر رہا ہوں کہ وہ کلام عنایت فرمائیں۔
محترمہ نیّرؔ صاحبہ پورے نسوانی وقار کے ساتھ ملک کی ایک قابلِ قدر شاعرہ کی حیثیت سے مائیک پر تشریف لائی ہیں اور غزل عنایت فرما رہی ہیں ؎

صدائے بُلبلِ آشفتہ کار آئی ہے
گُلوں کو خونِ جگر سے نکھار آئی ہے
ہر ایک پھول کی آشفتگی یہ کہتی ہے
کہ تیری بزم سے اُٹھ کر بہار آئی ہے
یہاں سے اُٹھ کے کہاں جائیں تیرے دیوانے
تری نگاہ کا [illegible] آئی ہے

حیاتِ ذکیؔ کو ہمیں سازگاریاں معلوم
کہ زندگی بھی بہت سازگار آئی ہے
الٰہی یہ نہ ہو نورِ سحر سے آلودہ
بہت دنوں میں شبِ انتظار آئی ہے

نیّرؔ صاحبہ کو غزل پر مناسب اور بہت اچھی داد ملی ہے۔ اور سامعین نے ایک غزل اور عطا فرمانے کی درخواست کی ہے، سنئے محترمہ ارشاد فرما رہی ہیں ؎

آؤ اس شہر کو تلاش کریں
دن نہ ہو جس میں رات نہ ہو
ایسی دُنیا بسائیں ہم کہ جہاں
ہم ہی ہم ہوں کائنات نہ ہو
اس تعلق کو عشق کہتے ہیں
جس میں شرطِ تعلقات نہ ہو
وہ جو آئیں تو ہم کو چُپ لگ جائے
ہم جو جائیں تو اُن سے بات نہ ہو
ایسے عہدِ وفا سے کیا حاصل
چار دن بھی جسے ثبات نہ ہو

محترمہ نیّرؔ صاحبہ بہت ہی معقول داد پانے کے بعد اپنی جگہ آگئی ہیں اور میں نے جناب رفعت سروش سے گزارش کی ہے کہ اب وہ کلام مرحمت فرمائیں۔ رفعت سروش نے میراث، ریت کا گھر، نوحہ، کفن عنوانات سے چھوٹی چھوٹی نظمیں سُنا کر خوب داد پانے کے بعد اپنے دیوان "وادیٔ غزل" سے ایک غزل سنا رہے ہیں۔ ان کی دو نظمیں ہی نوٹ کر سکا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

(میراث)

رات ڈھلنے لگی
نیند آنے لگی
موت آواز دینے لگی ہے مجھے
کوئی ہے اس قلم کو جو گرنے نہ دے
اس امانت کو جو نسلِ آدم کی میراث ہے
مجھ سے لے کر نئی نسل کو سونپ دے

(نوحہ)

نوحہ اُن کا نہیں، گزر گئے جو
زندگی کی اُداس راہوں سے
پھینک کر بوجھ اپنے کاندھوں کا
نوحہ اُن کا جواب بھی جیتے ہیں
درد کو زندگی بناتے ہوئے
مرنے والوں کا بوجھ اُٹھاتے ہوئے

اب رفعت سروش اپنے مطبوعہ دیوان "وادیٔ غزل" سے ایک غزل سُنا رہے ہیں ؎

اچھا یہ کرم ہم پہ تو صیاد کرے ہے
پر نوچ کے اب قید سے آزاد کرے ہے
چپ چاپ پڑا رہتا ہے بیمار تمہارا
نالہ ہی کرے ہے نہ وہ فریاد کرے ہے
اے بادِ صبا اُن سے یہ کہہ دیجیو جا کر
پردیس میں اک شخص تمہیں یاد کرے ہے

رفعت سروش صاحب خوب خوب داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں

فرزانہ اُجاڑے ہے بھرے شہر کو لیکن
دیوانہ تو صحرا کو بھی آباد کرے ہے
آوے ہے ترا نام تو ہنس دیوے ہے اکثر
دیوانہ ترا یوں بھی تجھے یاد کرے ہے

داد کے شور میں سروش صاحب مقطع سُنا رہے ہیں ؎

لکھ لکھ کے مٹا دیوے ہے تو نام یہ کس کا
سچ کہیو، سروش آج کسے یاد کرے ہے

رفعت سروش کلام سُنانے اور داد پانے کے بعد بڑے احترام کے ساتھ حضرت ساغر نظامی سے کلام بلاغت نظام عطا فرمانے کی مودبانہ گزارش کر رہے ہیں۔ لیجئے ساغر صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں میری ایک مشہور تخلیق "ساقی نامہ" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ساقیا بادۂ سرجوش کا پھر جام پلا
عشق بے سوز ہے اور عقلِ رسا خام پلا
ہر طرف تشنہ لبی، تشنہ لبی، تشنہ لبی
ساقیا جام پلا، جام پلا، جام پلا
چھُپ کے گوشوں میں کہیں اہلِ جنوں بیٹھے ہیں
ساقیا جام پلا اور سرِ عام پلا
بھر دے تریاق ہی تریاق مرے ساغر میں
پھر مجھے ڈسنے لگا ہے غمِ ایام پلا
ایک غم ہو تو گِنا دیں ترے پیاسے ساقی
غمِ دُنیا، غمِ عُقبیٰ، غمِ ایام پلا
دل پیمانۂ کیف میں پھر عشق کی مستی بھر دے
حاصلِ کفر پلا، حاصلِ اسلام پلا
جو بچے دَیر سے کعبے میں بہا دے ساقی
تشنہ ہیں منبر و محراب و در و بام پلا
جنہیں دعویٰ ہے یہاں مَے شکنی کا ساقی
آستیں میں ہیں چھپائے ہوئے اصنام پلا
جیسے کہتے ہیں اسیر دل کی زباں میں گیسو
اپنے شانوں پہ بکھیرے ہوئے وہ دام پلا
نغمہ جب نرت بنے جام کو مَے سے بھر دے
رقص جب سحر بنے بادۂ گلفام پلا
صبح کیا ہو گی نہیں شب کا بھروسہ ساقی
زندگی کیا ہے فقط خوابِ سرِ شام پلا
دَورِ ساغر سے چلا جرأت سبقت ہو لیے
کتنی گستاخ ہے یہ گردشِ ایام پلا

داد تو ان اشعار کی باندی ہے جو ہاتھ باندھے کورنش بجا لا رہی ہے۔ اہلِ پالی نے ان اشعار پر جھُوم جھُوم کر داد دی ہے۔ سامعین اور شعرائے کرام کا تقاضا ہے کہ صاحبِ صدر کچھ مزید کلام عنایت فرمائیں، سنئے ساغر صاحب غزل سنا رہے ہیں ؎

عشق نے ناخدا دیا حُسن نے رہنما دیا
شوق جدھر بھی مڑ گیا وقت نے راستہ دیا
شکوہ نہیں مگر مجھے یہ بھی دیا تو کیا دیا
اس بھری کائنات میں اک دلِ مبتلا دیا

تو نے ہمارے واسطے جن کو خزاں بنا دیا
ہم نے انھی بہار میں جی کے تجھے دکھا دیا

ہم نے تو تیرے حُسن کو سلسلۂ ادا دیا
تو نے جفا کے زعم میں نقشِ وفا مٹا دیا

صرف جنونِ بندگی عاشقوں کی خطا نہیں
یہ بھی ہمارا جرم ہے تم کو خدا بنا دیا

میری نشان دیکھ کے تیری نشاں دہی ہوئی
میں نے [illegible] تو نے مرا پتہ دیا

یہ بھی کسی غریب کے گھر کا دیا ہے زندگی
شام ہوئی جلا دیا رات ہوئی بجھا دیا

ساغر صاحب سے مودبانہ گزارش کی گئی ہے کہ ایک غزل اور عنایت فرمائیں چوں کہ سامعین اور شعرا حضرات نے کلام ساغر پر جی کھول کر داد دی ہے اس لئے ساغر صاحب بھی اس مطالبہ پر رضامند ہو گئے ہیں اور غزل مرحمت فرما رہے ہیں ؎

بزم میں چپکے کیوں بیٹھے ہو کچھ تو بیانِ حالات کرو
سننے والے دل رکھتے ہیں کھل کر دل کی بات کرو

ایک ہی پیڑ ہے پتوں کا میرے اُجڑے آنگن میں
جانِ بہاراں اک دن اس کے سائے میں بھی رات کرو

حُسن بھی تاجر عشق بھی تاجر دونوں ہی بازاری ہیں
ان دونوں کا نام نہ لو اب اور کسی کی بات کرو

ان کو یہ معلوم تو ہو پندارِ عشق بھی اک شے ہے
لاکھ وہ ہنس کر بات کریں خاموش رہو مت بات کرو

داد و ستائش ہے کہ سامعین سخن فہم ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں اور ساغر صاحب کیا اچھے شعر سنا رہے ہیں ؎

آئیں تو سر آنکھوں پر آ ئیں جائیں تو کچھ غم نہ کرو
ساری عمر کی ساتھی ہے تنہائی اس سے بات کرو

یہ وہ زہری کیڑے ہیں جو تن من کو کھا جاتے ہیں
کچھ دن اور بھی جینا ہے تو ترکِ محوِ ساعت کرو

وہ خوشبو اب ان میں کہاں ہے جو تھی کبھی صدیوں پہلے
پھول جو گردِ وقت میں مسلے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ کرو

داد کا شور بلند ہوا تو اس کے ساتھ ہی بادل اس زور سے گرجا ہے کہ بجلی جاتی رہی ہے اور طوفانِ باد و باراں کا یہ عالم ہے کہ سارا ہال گرد و غبار سے بھر گیا ہے منتظمین مشاعرہ نے جنریٹر کا بھی انتظام کر رکھا ہے چنانچہ اسے چلانے میں پانچ سات منٹ لگے ہیں اور ہال میں کچھ روشنی ہو گئی ہے۔ مگر مشاعرہ اکھڑ گیا ہے اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ ساغر صاحب یہ غزل مکمل کر کے اور اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں مگر پھر بھی سامعین کی خاصی تعداد بیٹھی ہے تاکہ شعرا سے دوسرے دور میں اپنی فرمائش سن سکیں۔ دوسرا دور بھی خوب رہا مگر میں نے پرویز کے بعد شعرا کا کلام محض سننے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

[illegible]

غزل

ڈاکٹر شمیم قدوائی بارہ بنکوی

یاد آپ کی تو مُفت میں بدنام ہو گئی
ہچکی کسی کی موت کا پیغام ہو گئی

دو ہستیوں نے چھپ کے کیا عہدِ دوستی
حیرت ہے کیسے بات یہ ہی عام ہو گئی

اک بے وفا کو بے وفا کہنا غضب ہوا
اتنی سی بات باعثِ الزام ہو گئی

ساقی کے التفات نے مجبور کر دیا
توبہ ہماری غرقِ مئے جام ہو گئی

گزرے مرے قریب سے وہ بے نیاز سے
دل پھر بھی خوش ہے دید سرِ عام ہو گئی

حرکت ہی کائنات کی ہے اصل زندگی
حرکت رُکی تو موت کا پیغام ہو گئی

اپنی نظر میں قابلِ توقیر ہے شمیم
وہ ذات جو کہ خوگرِ آلام ہو گئی

رازؔ لائل پوری ”آئینۂ راز“ میں

توصیف علوی عاصیؔ کیرانوی

جناب رازؔ لائل پوری سے مجھے پہلی بار نیاز حاصل کرنے کا شرف سحن سرحدی صاحب کی معیت میں گزشتہ سال ہوا۔ اگرچہ غائبانہ تعرف بہت پہلے سے تھا اس لئے کہ ان حضرت کا تخلص ضرور رازؔ ہے اور کلام بھی رمز وکنایات کا حامل ہے لیکن ان کی شخصیت اور ذاتِ گرامی اتنی ہمہ گیر اور شعر وادب کا ایک ایسا ”آئینہ“ ہے کہ جسے اس دور میں فکر وسخن سے ذرا سی بھی دلچسپی اور رشتہ ہے وہ رازؔ لائل پوری کے نام نامی سے ضرور واقف اور متعرف ہے۔

رازؔ صاحب سے ملاقات سے پیشتر میرے ذہن میں جو ان کا خاکہ اور تصور تھا اور ان کی شخصیت کے سلسلہ میں جو خطوط اور نقوش تھے ان سے شرفِ نیاز کے دوران وہ اُن سے کہیں زیادہ ثابت ہوئے۔ اس وقت اگرچہ ان کی طبیعت ناساز تھی اور وہ دردِ گردہ یا اسی قسم کی کسی شکایت میں مبتلا تھے۔ ویسے کسی شاعر کے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ اس لئے کہ صحیح معنوں میں ایک شاعر نہ جانے کتنے دردوں کا خلاصہ اور پیکر ہوتا ہے اسی لئے انہوں نے ملاقات کے دوران اپنے اس درد اور بے چینی کو ”صحبتِ یاراں“ میں بالکل حارج اور مخل نہیں ہونے دیا وہ نہایت خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ہم لوگوں سے محوِ گفتگو رہے اور اس دوران سخنورانہ لطیفہ سنجیوں کے ساتھ شعر سناتے رہے اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی، عرشؔ ملسیانی اور ساحرؔ ہوشیار پوری اور دوسرے استادانِ شعر کی صحبتوں اور شاعرانہ مذاق اور لطائف کے تذکروں سے محظوظ فرماتے رہے۔ فی الحقیقت یہ رازؔ لائل پوری صاحب کے خلوص ومحبت، انس ومروّت، احباب نوازی اور ہر دلعزیزی کی آئینہ داری تھی چنانچہ مجھے اسی وقت بجا طور سے یہ یقین ہو گیا کہ رازؔ صاحب ایک حقیقی شاعر مخلص دوست اور سچے ادب نواز ہیں۔

پچھلے دنوں ان کا مجموعۂ کلام، صحیفۂ سخن ”آئینۂ راز“ نظر نواز ہوا تو میں نے اس کا بڑے اشتیاق سے مطالعہ کیا اور بڑے شوق سے پڑھا۔ اس کے مطالعہ سے اس احساس ویقین کو تقویت ملی کہ رازؔ لائل پوری حقیقی معنوں میں ایک فطری شاعر، شاعرانہ روایات کے پورے حامل، جذبات کے مصور اور فکر وتخیل کے بہترین نقاش ہیں۔ ان کے آئینہ راز نے جو رمز وکنایات واضح کئے اور جو نقوش وخطوط میرے ذہن پر اُبھرے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

رازؔ لائل پوری اس دور کی ادبی دنیا کے ان روشن چمک دار ستاروں میں سے ہیں جو تقسیم وطن کے بعد ادھر کے افق پر نمودار ہوئے اور جنہوں نے اُردو ادب اور شعر وسخن کو نئی جلا دی اور نئی طرز سے نوازا، اور نئے نئے شہپاروں سے مالا مال کیا۔ رازؔ صاحب نے لائل پور میں آنکھیں کھولیں اور ایک اچھے علم دوست اور وطن پرست خاندان کے چشم وچراغ ہونے کے ناتے انہیں کچھ ایسی قوتیں اور صلاحیتیں ورثہ میں ملیں جنہوں نے ان کی شخصیت کو چار چاند لگائے اور انہیں شعر وسخن اور فکر وفن کا بہترین گوہر پارہ بنا دیا۔ انہیں اوائل عمری سے شعر وادب

دلچسپی اور شاعری سے میلان ایک فطری امر تھا۔ پھر خوش قسمتی سے اس منزل میں انہیں ایک دو نہیں بلکہ تین استادوں اور اہلِ قلم کی سرپرستی کا شرف حاصل ہوا۔ اس لئے ان کا کلام دو آتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ ہوگیا۔ شروع میں سرشار سیلانی کے تلمذ نے ان کے کلام کو ایک خاص قسم کے کیف و سرور سے سرشار کیا، بعد ازاں ساحرؔ ہوشیارپوری نے سحر آفرینی اور جادو بیانی بخشی۔ اور اس کے ساتھ پروفیسر بخشی اخترؔ نے اس میں گیرائی، گہرائی اور معنویت دے کر ایک "آئینۂ رازؔ" بنا دیا۔ اور چونکہ یہ سلسلہ فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی سے ملتا ہے اس لئے رازؔ لائل پوری کا کلام تمام تر معنوی اور فنی خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ نظر آتا ہے، جیسا کہ رازؔ کا خود اعتراف ہے۔

ساحرؔ کا سحر ہوں تو ہوں اخترؔ کی روشنی
کیا فیضیاب ساحرؔ و اخترؔ نہیں ہوں میں

حقیقت یہ ہے کہ رازؔ صاحب کا فطری میلانِ طبع خداداد صلاحیتیں، اچھے میلانِ فکر کی سرپرستی، زندگی کی جمالیات اور جام و سبو سے دلچسپی اور شعر و سخن اور ارباب کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ان کے کلام اور شاعری میں وہ تمام صفات اور کیفیات پیدا کردیں جو ایک اچھے شاعر میں ہونی چاہئیں۔

رازؔ لائل پوری صحیح معنوں میں غزل کے شاعر ہیں اور حضرت داغؔ دہلوی کے سلسلہ اور وراثت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پھر غزل اردو شاعری کا طرۂ امتیاز اور سرمایۂ ناز ہے۔ غزل ہی وہ صنفِ سخن ہے جس سے شاعر کے جذبات اور احساسات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے اور اس سے زندگی کی مختلف کیفیات کی حقیقی عکاسی کی جاتی ہے اس لئے ہر فطری شاعر غزل ہی کو اپنے فکر و فن کا آئینہ بناتا ہے۔

چنانچہ "آئینۂ رازؔ" بھی اسی شاعرانہ حقیقت کا آئینہ دار اور عکاس ہے۔ رازؔ کی غزلوں میں زبان و بیان کی شیرینی اور چاشنی کے ساتھ حسن و عشق کی کیفیات اور قلب و نظر کی واردات بھی ملتی ہیں اور چونکہ رازؔ کو ایک پُر آشوب دور سے گزرنا پڑا اس لئے ان کے کلام میں زمانہ کے انقلابات زندگی کے تغیرات کی بیانی بھی بڑے بے تکلف اور پُر تاثیر انداز میں موجود ہے۔

رازؔ کی شاعری کا نمایاں پہلو زندگی کی جمالیات فکر و تخیل کی شگفتگی اور تازگی، احساس کی نزاکت اور بیان کی ندرت ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں [illegible] غزلیں، کیف و مستی سے بھرپور رباعیات اور حیات افروز قطعات ملتے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں "آئینۂ رازؔ" کا ایک عکسِ جمیل کہا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ کے کچھ عکس دیکھئے ؎

تم ہوئے ہو جو مہرباں مجھ پر
اب کوئی مہرباں ملے نہ ملے
چشمِ ساقی سے پی کے مست ہیں ہم
اب مئے ارغواں ملے نہ ملے

تمہارا بھی تو اس میں ہاتھ ہوگا
خدا ہی نے دیئے ہیں درد و غم کیا
میں ساقی کی سخاوت جانتا ہوں
مجھے وہ بخش دے گا جامِ جم کیا

شعبدے، ناز، شوخیاں، غمزے
ان کی نظروں میں کیا نہیں ہوتا
اور سب کچھ تو ان سے ممکن ہے
صرف وعدہ وفا نہیں ہوتا

رازؔ کا انداز نہایت سادہ اور دلکش ہوتا ہے اور زبان بڑی بے ساختہ اور سحر آفریں ہوتی ہے۔ آپ مختصر بحر اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے پیارے اور دلکش شعر کہہ جاتے ہیں جو نہایت ہی سحر آفریں ہوتے ہیں

آپ میرا خیال کرتے ہیں
اور میرا خیال ہے کچھ اور

آن سے اپنا نباہ ناممکن
پھر بھی ان سے نباہ کرتے ہیں
اب ہماری عرض بھی سن لیجئے
آپ اپنا حکم تو فرما چکے

رازؔ کو زبان پر بڑی قدرت ہے آپ نہایت بہ ہی بامحاورہ اور بے تکلف زبان سے کلام میں ایک نئی ندرت اور دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ محاورہ بندی اور زبان دانی دیکھئے۔

کہیں دل والوں کے سر پھوڑ کے ٹوٹے تو نہیں
آپ بھی اپنے چلائے ہوتے پتھر دیکھیں
دیکھ کر جو صلے اس دور کے انسانوں کے
سر ندامت سے جھکے جاتے ہیں شیطانوں کے
ناخدا ڈوبنے والے بھی ابھر آتے ہیں
کوئی منجدھار ہی تنکے کا سہارا مانگے

رازؔ لائل پوری غزلیات میں بڑے لطیف انداز سے دور نو کی چٹکیاں لیتے ہیں اور زندگی کے کچھ تلخ تجربات کو بڑے پُر لطف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اس فصلِ بہاراں پر کیا تیکھا طنز ہے۔

گلہائے چمن اب بھی جو مُرجھائے ہوتے ہیں
اس فصلِ بہاراں سے وہ گھبرائے ہوئے ہیں
دل شاد تھا کہ پھول کھلیں گے بہار میں
مارا گیا غریب اسی اعتبار میں
دشمنوں کی اسے ضرورت کیا
جس کو حاصل ہو تلطف یاروں کا

ایک بات جو بہت کم شاعروں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ رازؔ صاحب بہت سادہ زبان اور ہلکے پھلکے الفاظ اور انداز سے بڑے عمیق اور گہرے مضامین اور تصوف کے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے باندھ جاتے ہیں

عشق صادق کی حقیقت سامنے آجائے ہے
آدمی جب خود ہی کھو جائے خدا پا جائے ہے
ہو وہ ایک جزو ترے برابر نہیں ہوں میں
ذرہ ہوں آفتاب سے منکر نہیں ہوں میں

لیکن یہی نہیں کہ رازؔ صاحب نے اپنی شاعری کو غزل کی رنگینیوں تک ہی محدود رکھا ہو اور اس کے محض روایتی پہلوؤں سے کام لیا ہو، بلکہ ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک سچے وطن پرست ہیں جو جہد آزادی کے میدان میں بھی آگے رہے۔ خود رازؔ صاحب امر شہید سردار بھگت سنگھ کے ساتھی شہید سکھدیو آزاد کے چچا زاد بھائی ہیں اس لئے ان کی شاعری میں وطن پرستی کا سچا جذبہ، ملک و قوم کے عروج کی تمنا اور دیش سے سچا پیار ملتا ہے۔ ان کی نظمیات خاص طور سے اسی جذبہ سے مامور اور سرشار نظر آتی ہیں۔

بھارت کی زمین جان سے پیاری ہے ہمیں
خاک اس کی جو ہے راج دلاری ہے ہمیں
ہم اس سے کبھی دور نہیں رہ سکتے
ایک ایک گھڑی ہجر کی بھاری ہے ہمیں

پُرجوش ہیں جانباز ہیں بھارت کے جواں
ہر دیش میں ممتاز ہیں بھارت کے جواں
اے رازؔ جوانمردی میں یکتا ہیں یہ
ہاں باعثِ صد ناز ہیں بھارت کے جواں

بہرحال رازؔ لائل پوری اس دور کے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اردو شاعری کی ادبی روایات اور اس کی فنی علامات کو بھی زندہ و تابندہ رکھا ہے اور اس میں وقت اور زندگی کی نئی گہرائیوں سے تنوع بھی پیدا کیا ہے اور ندرت بیان اور سحر آفریں زبان سے ہماری شاعری اور غزل کو نئی جلا اور نیا نکھار دیا ہے۔ ان کا صحیفۂ سخن آئینہ رازؔ صحیح معنوں میں شعر و ادب کا ایک حسین اور دلکش تحفہ ہے۔ مختصراً یہ کہئے کہ —

شعر و فن کے لئے فخر اور ناز ہے
زندگی کی حقیقت میں آواز ہے
سچ تو یہ ہے کہ عاصی بس اس دور میں
رازؔ اک "آئینۂ رازؔ" ہے

غزلیات

اختر شاہجہاں پوری

اپنی بے جا خواہشوں کو جو انا لکھتے رہے
ہم تو ایسے دوستوں کا مرثیا لکھتے رہے

برسرِ پیکار تھے ہم جن دِنوں افلاس سے
مشفقانِ چارہ جو خط میں دُعا لکھتے رہے

ان دِنوں وہ بھی حریفِ عیش و عشرت ہوگئے
جو قناعت کو بشر کا مرتبا لکھتے رہے

ہم قلمکارانِ سادہ دل نہ جانے کس لئے
سوچ کچھ بھی سازشوں کو حادثا لکھتے رہے

ہم تو اپنی بے گناہی پر بہت کچھ کہہ گئے
منصفانِ وقت ۔ کچھ بھی سزا لکھتے رہے

آج دل کے ٹوٹ جانے کا ہوا احساس انکو بھی
چاند چہرے کو جو زلفوں کی گھٹا لکھتے رہے

بڑھ گیا ہوش و خرد سے جب جنونِ عاشقی
ہم کسی کا نام اختر جا بجا لکھتے رہے

یوسف ثانی پالی (راجستھان)

راہرو دینے لگے اپنا حوالا مجھ کو
رہنماؤں نے یہ کس راہ پہ ڈالا مجھ کو

اپنے معیار پہ مشتاق ہی پرکھے گا کوئی
خاک سمجھے گا کوئی ناز کا پالا مجھ کو

اے سیہ بخت کہاں تک تو چھپائے گی مجھے
صبح ہوتے ہی نہ آئے گا اُجالا مجھ کو

چاہ میں ڈالنے والے مرے بھائی ہی تھے
بیچ ہی دے نہ کوئی بیچنے والا مجھ کو

چلیئے ہم عصروں کو مرے شعراءِ جدید
دے رہے ہیں سبق احساس کا پیالا مجھ کو

ایک سا وا زمیں سب بول پڑے اہلِ نظر
امتحان دے کے گیا جانچنے والا مجھ کو

کام تو کچھ بھی نہیں تھا مرا ثانی ایسا
نام سے میرے زمانے نے اچھالا مجھ کو

اُمِّ ھانی
اقبال منزل ۔ لکھنؤ

موت کب آئے گی خبر کچھ بھی نہیں
زیست سے واقف مگر کچھ بھی نہیں

اے جنونِ شوق تیرے واسطے!
دشت و صحرا، بام و در کچھ بھی نہیں

تیرے اغراض و مقاصد سے الگ
معنیٔ نورِ نظر کچھ بھی نہیں

اے تغافل کی ادا تیرے لئے!
یہ دل و جان و جگر کچھ بھی نہیں

نفرت و جنگ و جدل کے سامنے
امن کی رنگیں سحر کچھ بھی نہیں

کیوں ہے باقی آج تک رنگِ وفا؟
رازِ الفت کا اگر کچھ بھی نہیں

دولتِ احساس کے ہوتے ہوئے
قیمتِ لعل و گہر کچھ بھی نہیں

آتی ہے گورِ غریباں سے صدا
یہ تماشائے نظر کچھ بھی نہیں

عرصۂ ہستی ہے کچھ لمحوں کا نام
ھانی! یہ فانی بشر کچھ بھی نہیں

عبدالرب نشتر فتح پوری

پیغام یہ ملا مجھے جانِ شباب کا
ہے انتظار اس کو بھی خط کے جواب کا

آجائے نیند ہی نہ کہیں انتظار میں
ہاتھوں میں سوکھ جائے نہ گجرا گلاب کا

سب ساتھ چھوڑ کر مرے ہمدم چلے گئے
ہاتھوں میں میرے رہ گیا کانٹا گلاب کا

رنج و الم نے گھیر لیا چاروں سمت سے
لینا پڑا ہے مجھ کو سہارا شراب کا

کچھ لوگ دیکھ کر، نشتر کو جل گئے
کم ظرف کو تو زہر ہے نشہ شراب کا

غزل

ڈاکٹر کے۔کے رِشی۔ کوروکشیتر

زیست کیا ہو گئی ہے اب دیکھو
مجھ سے یہ بدگماں ہے جب دیکھو

ہر کوئی ہے کٹا کٹا سا کیوں
کیا ہے اس روگ کا سبب دیکھو

عشق تھا یا کوئی قیامت تھی
حال کیا ہو گیا ہے عجب دیکھو

اہلِ باطل کا دَور دَورہ ہے
کوئی سُنتا ہے اپنی کب دیکھو

امنِ عالم کی فکر ہے جن کو
اُن کے چہرے ہیں پُرغضب دیکھو

عقل کے تیر چل گئے آخر
آرزوئیں ہیں جاں بہ لب دیکھو

جن کو دعوےٰ ہے عشق و اُلفت کا
بات کرنے کا اُن کا ڈھب دیکھو

قابلِ قدر حسن ہے ہر حال
جب بھی دیکھو تو با ادب دیکھو

آئے جب وہ چمن میں آج رِشی
کھِل گئے پھول سب کے سب دیکھو

(صلا کا بقیہ)

مشاعرے کے اختتام پر تسلیم کی طرف سے جملہ بیرونی شعرائے کرام کو جناب موتی والا صاحب ایڈوکیٹ نے ایک ایک پرنشڈ بیڈ شیٹ کا جوڑا اور جودھ پور کی مشہور صنعت "ایلومنیم سینچو" کا ایک بہترین نمونہ عقاب کا سینچو تحفۃً پیش کیا ہے۔ بالی میں موتی والا خاندان بھی اپنی ایک جُداگانہ اور قابلِ قدر حیثیت رکھتا ہے اسی خاندان کے چشم و چراغ جناب محمد صابر صاحب موتی والا بھی سوشل کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں اور تنظیم کی سرپرستی فرمانے میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ●●

(ایک گجراتی افسانے سے ماخوذ)

کفارہ

ایشور پے تلیکار

از:- سلمان سعید

ریل گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُک گئی ـ

"قلی!" جوں ہی میں نے آواز دی دو قلی میری طرف لپکے۔ ان میں سے ایک بڑی تیزی سے دوڑ کر میرے قریب پہنچ گیا۔

"اندر ایک گھی کا کنستر ہے"۔ میں نے ڈبے میں سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اُس پر قلی کنستر اٹھالایا اور بولا "کوئی اور چیز سرکار؟"

"نہیں" میں پلیٹ فارم سے باہر آنے کے لئے چل پڑا قلی میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ جوں ہی ہم اسٹیشن سے باہر آئے اس نے پوچھا۔

"صاحب آپ ٹانگہ کریں گے یا رکشہ؟"

میرے قریب تین چار کوچوان چلا رہے تھے ــــ یہ وہ ٹانگے والے تھے جو پہلے تو گاہک کو ٹانگے کا کرایہ پندرہ بیس روپے بتاتے لیکن گاہک کے انکار کرنے پر لے دے کر آٹھ دس روپے پر ہی راضی ہو جاتے، لیکن میں چوں کہ ان کی اس عادت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے میں نے قلی کو ایک ٹانگے میں کنستر رکھنے کو کہا۔ میں نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن اس میں اتفاق سے بچنے ہوئے صرف تین روپے ہی تھے۔ میں کوچوان کے مقررہ معاوضے کی طرح قلی کو بھی پلیٹ فارم سے ٹانگہ سٹینڈ تک سامان اُٹھانے کے دو تین روپے ہی دیا کرتا تھا۔ ایک ڈیڑھ ماہ قبل یا شاید اس سے بھی کچھ روز پہلے جب میں گاؤں سے گھی کا کنستر لایا تھا تو میں نے اس وقت بھی معمول کے مطابق قلی کو تین روپے ہی دیئے تھے۔

"لو بھئی اپنے پیسے"۔ میں نے قلی کے ہاتھ پر تین روپے رکھ کر ٹانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا ـــ شاید قلی یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں نے اس کی ہتھیلی پر اس کی محنت کا جو معاوضہ رکھا تھا وہ اس معاوضے سے کم تھا جس کی اُسے مجھ سے توقع تھی۔

"یہ کیا صاحب؟" اس نے قدرے توقف کے بعد متحیر ہوتے ہوئے کہا۔

"صاحب جی میں آپ کا کنستر لمبے راستے سے چل کر لایا ہوں اور نہیں تو کم از کم دو روپے ہی اور دے دیں"۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں نے تم سے بہت زیادہ کام لیا ہے؟" میں نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"صاحب جی ناراض کیوں ہوتے ہیں، میں نے بھلا کب کہا ہے کہ آپ نے مجھ سے زیادہ کام لیا ہے۔ لیکن صاحب جی یہ تو گھی کا کنستر ہے، اصلی گھی کا ــ اسے اٹھانے کے پانچ روپے کوئی زیادہ رقم تو نہیں سرکار"۔

"گھی ہو یا تیل، سونا ہو یا لوہا، تمہیں اتنے ہی پیسے ملنے چاہئیں جتنا تمہارا حق بنتا ہے"۔

"مگر صاحب جی پانچ روپے کوئی زیادہ تو نہیں"۔

"تم مجھے سبق نہ پڑھاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے تمہیں بالکل مناسب دیئے ہیں"۔

"یار جھگڑا کیوں کرتے ہو، صاحب جو دیتے ہیں چپ کر کے لے لو، میرا ٹیم (TIME) ضائع ہو رہا ہے"۔

"تم بیچ میں نہ بولو" قلی نے کوچوان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "جاؤ بابو جی میری طرف سے ان تین روپوں کی خیرات دے دینا"۔

اس نے پیسے میری گود میں پھینکتے ہوئے کہا ـــ

"تم میری بے عزتی ——" میں نے غصّے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"بے عزتی نہیں کر رہا صاحب جی، اپنا حق مانگ رہا ہوں۔"

"سنو۔ یہ پیسے لینے ہیں کہ نہیں؟" میرے لئے اپنے غصّے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"یہ نہیں لوں گا۔ پورے پانچ روپے لوں گا۔"

اب مجھے بھی ضد آ گئی۔

"اگر یوں ہی تو یوں ہی سہی۔ چلو تانگے والے۔"

کوچوان نے تانگہ چلانا شروع کر دیا۔ اس پر قلی نے پہلے تو مجھ پہ ایک عجیب سی نگاہ ڈالی، پھر سر جھکائے ایک طرف کو چل دیا۔ میں تانگے میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے اور قلی کے مابین اس مختصر سی جھڑپ کو اپنے ذہن میں دہرانے لگا۔ حتّیٰ کہ اس دوران میں گھر پہنچ گیا۔

اب میرا غصّہ کسی حد تک رفع ہو چکا تھا، لیکن اس قلی کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس کی میری طرف تکتی ہوئی آخری نگاہیں، میں باوجود کوشش کے بھلا نہیں سکا تھا —— وہ ایک جوان قلی تھا۔ اس کا چہرہ قوی دیہاتی زندگی کا آئینہ دار تھا۔ میں نے سوچا ہو نہ ہو — وہ گاؤں میں کوئی کام نہ ملنے کے سبب تلاشِ روزگار کے لئے شہر آیا ہوگا۔ اور شہر آنے پر اس غریب نے یقیناً یہ تصوّر کیا ہوگا کہ شہر میں متمول لوگ بڑی فراخ دلی سے روپیہ خرچ کرتے ہیں اور اس نے دوسرے درجے کے ڈبے کے باہر مجھی کے ایک کنستر والا سفید پوش بابو کھڑا دیکھ کر سوچا ہوگا کہ وہ اسے یہ کنستر اٹھانے کے بخوشی پانچ روپے دے دے گا۔ بقول اس کے اس کی محنت کا صحیح معاوضہ! لیکن اس نے اس وقت کیا سوچا ہوگا جب اسے اس کی محنت کے تین روپے دئے گئے تھے ——

اب میں بھی پچھتا رہا تھا —— کاش میں نے اسے اس کی محنت کا صحیح معاوضہ دیا ہوتا! —— وہ غریب میرے آگے اس لئے کچھ نہ بول سکا تھا کہ میں اس کی نظروں میں "بابو" ہونے کے ناتے ایک قابلِ عزت شخص تھا اور وہ اسی لئے جھگڑا مزید آگے بڑھانے کی بجائے پیسے لئے بغیر اپنا مغرور مگر چہرہ ایک طرف پھیر کر واپس ریلوے اسٹیشن کی طرف پڑا تھا لیکن اس نے اپنے دل میں میرے متعلق کیا سوچا ہوگا؟ اس کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟ —— اگر میں اس کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتا تھا تو مجھے کم از کم اسے تین روپے واپس دے دینے چاہئے تھے۔ اگر اس نے یہ پیسے لینے انکار کر دیا تھا تو مجھے یہ پیسے سڑک پر ہی پھینک دینے چاہئے تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اگر اس کا ضمیر اسے میری موجودگی میں سڑک پر سے پیسے اٹھانے کی اجازت نہ دیتا لیکن میرے چلے جانے کے بعد وہ یہ پیسے ضرور اٹھا لیتا —— بالفرض اگر وہ میرے چلے جانے کے بعد انہیں نہ بھی اٹھاتا تو مجھے کم از کم اس بات کا تو اطمینان ہو جاتا کہ میں نے اسے اس کی محنت کی اجرت اٹھانے کا موقع دیا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے مجھ پر پچھتاوے اور غم و یاس کی ملی جلی کیفیت طاری ہو گئی۔

میں نے غسل کرنے کے بعد کافی کا ایک پیالہ پیا لیکن میں اپنے آپ کو اب پہلے سے زیادہ افسردہ اور بے چین محسوس کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک خیال آیا کہ مجھے واپس ریلوے اسٹیشن جا کر اس قلی کو تلاش کرنے کے بعد اسے اس کی محنت کا جائز معاوضہ ادا کرنا چاہئے۔ میں نے کلاک پر نگاہ ڈالی۔ میرے پاس آفس جانے کے لئے مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ جوں ہی اسٹیشن جانے کے لئے اٹھا میری بیوی نے مجھ سے دریافت کیا۔

"اب کہاں جا رہے ہیں؟"

میں چونکہ واپسی پر اسے یہ تمام کہانی سنانا چاہتا تھا اس لئے میں نے اسے صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔

"میں زیادہ دور نہیں جا رہا۔ جلد واپس آ جاؤں گا۔"

جب میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو مجھے وہاں دور تک سرخ پگڑیاں باندھے بے شمار قلی دکھائی دے

جو سامان اٹھائے تیزی کے ساتھ آجا رہے تھے۔ میں اس قلی کی تلاش میں بڑی دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا جس کی شکل و صورت اب تک میری نظروں کے سامنے تھی ــــــ لیکن میں اُسے تلاش نہ کر پایا۔ سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سوچا مجھے اب واپس گھر چلے جانا چاہیے۔ میں عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔

میں دوسری گاڑی کی آمد تک سٹیشن پر ہی رہا۔ اس سے قبل کہ میں اپنے ارادے کے مطابق کسی دوسرے پلیٹ فارم کی طرف جانے کے لیے قدم اٹھاتا۔ مجھے پیچھے سے ایک آواز سُنائی دی۔

"صاحب جی"

میں نے یک دم پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ایک دس بارہ سالہ لڑکا میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر میرے اندر کی کسی شئی نے مجھ سے کہا۔

"تم کسی کا اُدھار چکانے کی غرض سے یہاں آئے ہو نا؟ پھر تم ــــ تم واجب الادا رقم اس لڑکے کو دے دو ــــ میری نظروں میں ایسا کرنا قرض اُتارنے سے کم نہیں ہے!"

اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں شہر کی گلیوں میں پھرتے ہوئے کسی بھکاری سے بات تک نہ کی تھی، لیکن اس روز ــــــــ

"بیٹے، تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔ لڑکا میرے سامنے خاموش کھڑا تھا اور اس کی یہ خاموشی اس بات کا صاف ثبوت تھی کہ وہ میرا ان گا اگری بیٹا نو وارد ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہو۔ جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کی زبان گنگ کر دی ہو لیکن جب میں اس سے بڑے پیار اور شفقت سے پیش آیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے میں دوسری ریل گاڑی کی آمد کا اعلان ہو گیا۔ میں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا!۔

"آؤ بیٹا ــ باہر چلیں"

"لیکن ــ لیکن" اس نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کسی قدر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"میں نے تو اپنا ٹکٹ بھی نہیں خریدا"۔ (غالباً ٹکٹ سے اس کی مُراد پلیٹ فارم ٹکٹ تھا)

"تم اس کی فکر نہ کرو بیٹا ــ تم مجھے یہ بتاؤ تم آئے کہاں سے ہو" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"جی مجھے گاؤں سے شہر آئے آج چار دن ہو گئے ہیں"

اس نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نوکری ڈھونڈ رہا ہوں صاحب جی لیکن! لیکن" وہ پھر سے ہچکیاں لینے لگا ــ "نوکری نہیں مل رہی ــــ میں یہاں قلی کا کام کرنے آیا تھا لیکن جب میں ایک بابو کا سامان اٹھا کر سٹیشن کے اندر آیا تو وہ جو دوسرے قلی ہیں نا ــ لال پگڑیوں والے۔ انہوں نے مجھے بہت جھڑکیاں دیں۔ وہ کہتے ہیں، اگر میں نے کسی کا سامان اٹھایا تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں بیٹا ــــ باہر کا کوئی آدمی سٹیشن پر کام نہیں کر سکتا۔"

"صاحب جی۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ سٹیشن سے باہر جانے کے لیے ٹکٹ دکھانا پڑتا ہے، لیکن میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ بابو جی! کیا وہ مجھے باہر نہیں جانے دیں گے؟"

"تم فکر نہ کرو ــ بیٹا!"

گیٹ کے قریب پہنچ کر نہ تو میں نے جیب میں سے پلیٹ فارم ٹکٹ نکالا اور نہ ہی وہاں پر کھڑے گیٹ کیپر نے مجھ سے یہ مانگا۔ جب ہم باہر آئے تو میں نے لڑکے کے چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار دیکھے۔ میں لڑکے کی مدد کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ مجھے دو تین روز سے بھوکا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اسے ڈھیر سارے پیسے دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک پانچ روپے کا نوٹ برآمد ہوا۔ لیکن پھر اگلے ہی لمحے میں نے سوچا کہ میرا ایسا کرنا اپنے کو سزا دینے کے مترادف ہوگا۔ میں اسے خیرات کے طور پر پیسے دینا نہیں چاہتا تھا۔

"بیٹا! یہ لو ......" اس سے پہلے کہ میں اسے پیسے

دینے کے لئے کوئی مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اس نے فوراً کہا۔

"صاحب جی نہیں ۔ میں بھکاری نہیں ہوں۔" لڑکے کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی جب میں نے محسوس کیا کہ مجبوری اور بیچارگی کے باوجود لڑکے کی خودی اسے بھیک مانگنے کا پیشہ اپنانے سے مانع ہے تو میرے دل میں اس کے لئے مزید ہمدردی نے جگہ پالی۔

"اگر تم یہ پیسے لینا نہیں چاہتے تو پھر تم نے مجھے بلایا کیوں؟"

میرے اس اچانک سوال پر اس نے قدرے چونکتے ہوئے کہا۔

"جناب میں تو یہ خود بھی نہیں جانتا کہ میں نے آپ کو کیوں بلایا ۔۔ آپ میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ اگر کسی نے مجھ سے ٹکٹ کا پوچھ لیا تو میں کیا کروں گا تو جب میں نے آپ کو دیکھا تو میں نے صرف اتنا کہا صاحب!"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تم مجھے سچ سچ یہ بتاؤ کہ کیا تم نے مجھے کچھ مانگنے کے ارادے سے تو آواز نہیں دی تھی؟"

"میں پچھلے چار روز سے نوکری تلاش کر رہا ہوں۔ ہر کوئی مجھے یہی کہتا ہے کہ ہم کسی اجنبی آدمی کو نوکری نہیں دیتے وہ کہتے ہیں جب تک کوئی تمہاری ضمانت نہیں دے گا ہم تمہیں نوکری نہیں دے سکتے۔"

"لیکن تم کس قسم کی نوکری کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ جو بھی کام دلا دیں، میں کرنے کو تیار ہوں، ویسے سچی بات ہے صاحب جی، میں نے کھیتی باڑی کے علاوہ آج تک اور کوئی کام نہیں کیا۔"

"تم اپنے گاؤں سے یہاں کیوں آئے؟ کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟"

لڑکے نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے رونا شروع کر دیا۔ اس پر میں نے سوچا کہ وہ مجھے سچی بات بتانا نہیں چاہتا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی کوئی صریح جھوٹ بولے گا، لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ اس کی آہوں اور سسکیوں نے مجھ پر غم و افسردگی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میں نے اس سے مزید کچھ دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"بیٹے تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں کام دلوا دوں گا!"

میرے یہ الفاظ سن کر اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

جب میں اسے اپنے گھر کے برآمدے میں کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر باورچی خانے میں گیا تو میری بیوی گویا پھٹ پڑی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے۔ ادھر گاؤں سے آئے اور غائب ۔۔"

اس پر میں نے بیگم کی بات تمام کہانی سنا ڈالی ۔۔

"اس دنیا میں مصیبت زدہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں آپ کس کس کی مدد کریں گے"۔ لیکن جب میں نے بیگم کے سامنے تمام صورت حال کھول کر بیان کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "گو کہ ہمیں ملازم کی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو اسے رکھ لیتے ہیں"۔ اور پھر اسے جیسے یکدم کچھ یاد آ گیا۔ "ایک بات تو میں پوچھنا بھول ہی گئی ۔ ذرا یہ تو بتائیں ہم اس سے کام کیا لیں گے؟"

"بیگم یہ کام لینے یا دینے کا سوال نہیں ہے۔ اگر ہم اسے کچھ عرصہ تربیت دے دیں تو اسے کسی جگہ آسانی سے ملازمت مل سکتی ہے۔"

"بہت سے لوگ صرف اوپر کا کام کروانے کے لئے ملازم رکھنا چاہتے ہیں مگر آپ یہ تو بتائیں آپ اس اجنبی لڑکے پر کیسے بھروسہ کر سکتے ہیں؟ آپ خود ہی سوچیں ہم آخر کس بل بوتے پر اس کی گارنٹی دے سکتے ہیں!"

"بیگم، میں نے کہا نا کہ یہ کچھ روز ہمارے ہاں کام کرے گا جب ہمیں اس کی دیانت داری پر مکمل بھروسہ ہو جائے گا، تو ہم اسے کسی اور جگہ لگوا دیں گے ہم نے اگر اسے ایک ڈیڑھ ماہ اپنے پاس رکھ بھی لیا تو وہ ہم پر بوجھ تو نہیں بن جائے گا"۔

"میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن آپ فرض کریں کہ اگر وہ کسی روز اچانک بھاگ جائے اور اپنے ساتھ کچھ"۔

"وہ شکل سے تو ایسا نہیں لگتا۔ میرے خیال میں وہ اپنے گھر سے کسی خاص وجہ کے تحت بھاگ کر یہاں آیا ہے۔"

چند ہی روز میں دیمو نے اپنی شاندار کارکردگی کی وجہ سے میری بیوی کا دل جیت لیا۔ اس کی عمر بمشکل دس بارہ برس ہی ہوگی۔ وہ ایک محنتی، ایماندار اور جفاکش لڑکا تھا۔ ہر چند کہ اُسے ہمارے ہاں آنے سے قبل کسی بھی جگہ گھریلو کام کا تجربہ نہیں تھا تاہم اُسے ہمارا کام کرنا مشکل محسوس نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے پہلے کھیتی باڑی جیسا مشکل کام کرتا رہا تھا۔ مزید برآں ہمارے پاس ایک پُرانا نوکر بھی تھا جسے دیمو کی موجودگی میں زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔

میری بیوی دیمو کے کام سے بیحد متاثر ہوئی تھی۔ دیمو نے بہت ہی قلیل مدّت میں خانہ داری کے بہت سے کام سیکھ لئے تھے اور اب وہ مزید کام سیکھنے کا مشتاق تھا۔ میں اب یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری بیوی کی اس کے بارے میں مجموعی طور پر کیا رائے ہے!

"تمہارے خیال میں کیا دیمو اس ماہ کے آخر تک کافی کچھ سیکھ جائے گا۔ وہ کسی جگہ کام کرنے کے قابل ہو جائے گا نا؟" میں نے اپنی بیگم سے پوچھا۔

"اب ہم اسے اپنے پاس ہی رکھیں گے!"

یہ سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔

"لیکن تم خود ہی سوچو بیگم،" میں نے اپنی اندرونی مسرّت کو چھپاتے ہوئے قصداً بیگم سے بحث کرتے ہوئے کہا، "کہ دو نوکروں سے ہمارا خرچ کیسے چلے گا؟"

"ہم دوسرے کو نکال دیں گے۔"

بیگم کے اس جواب نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

"لیکن یہ تو ایک شخص کی روزی مارنے ——"

"ہم پُرانے ملازم کو کسی اور جگہ لگوا دیں گے۔ میری سہیلی رضیہ نے ہمیشہ مجھ سے اپنے نوکروں کے متعلق شکایت کی ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔ وہ یقیناً افضل کو رکھ لے گی۔"

دیمو کو ہمارے ہاں کام کرتے ایک ماہ ہو چکا تھا لیکن میں اس کے آبا و اجداد کے متعلق اب تک کچھ نہ جان سکا تھا چنانچہ ایک روز میں نے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے قصداً موقع محل پیدا کیا۔

"دیمو — یہ لو — تمہاری آدھے مہینے کی تنخواہ۔ کیا تم اسے کسی جگہ بھیجنا پسند کروگے یا اسے اپنے پاس ہم جمع کر دیں گے؟" اس پر دیمو کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے دل میں جو کچھ بھی ہے آج وہ صاف طور پر اس کا اظہار کر دے۔ لیکن وہ خاموش تھا اور ہچکیوں کے ساتھ روئے جا رہا تھا۔

"دیمو بیٹا،" میں نے پیار سے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا، "تمہارے خیال میں کیا میں نے تمہیں کم تنخواہ دی ہے۔" اس پر دیمو نفی میں سر ہلاتے ہوئے وفورِ جذبات سے اور زیادہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ میں نے اُسے رونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جی بھر کر اپنے دل کا غبار نکال لے۔ چند لمحوں بعد وہ آہستگی سے میرے قدموں پر سر رکھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

"آپ بڑے مہربان ہیں۔ آپ نے پہلے نوکر کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں کام پر رکھ لیا۔ بغیر ضمانت کے مجھے کام دے دیا..... میں یہ روپیہ کیسے لے سکتا ہوں۔"

"دیمو بیٹا،" میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا، "کیا تم مجھ سے اپنا جیب خرچ بھی لینا نہیں چاہتے؟"

"وہ کس لئے صاحب، کیا میں کھانا نہیں کھاتا، کپڑے نہیں پہنتا؟ بیڑی نہیں پیتا؟" اس کے منہ سے جیسے اچانک پھسل گیا، "نہیں نہیں میں اب بیڑی نہیں پیتا۔ پہلے پیتا تھا۔" اس نے رونا بند کر دیا اور صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہنے لگا، "خدا کی قسم بابوجی جب سے میں آپ کے گھر آیا ہوں میں نے ایک بھی بیڑی نہیں پی۔ آپ یقین کریں میں نے اب یہ عادت چھوڑ دی ہے۔"

"وہ کیوں بیٹا؟"

"میں نے سوچا کہ جب آپ بڑے لوگ بیڑی نہیں پیتے تو مجھے بھی نہیں پینی چاہئے۔"

"تم نے بہت اچھا کیا۔ لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کیا تم سینما دیکھتے ہو۔"

"نہیں میں سینما نہیں دیکھتا، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ

میں سینما دیکھوں تو آپ مہربانی فرما کر مجھے ہر مہینے صرف پانچ روپے دے دیا کریں۔ میرے باپ کو ہر مہینے افیم خریدنے کے لئے پچاس روپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ شروع شروع میں اس سے زیادہ پیسوں کی پیا کرتا تھا لیکن اب وہ کم پیتا ہے افیم خریدنے کے لئے شہر آنے اور واپس گاؤں جانے پہ اس کا پانچ روپے کرایہ لگتا ہے اور یوں ہر مہینے اس کے پچپن ساٹھ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اگر میں اپنے ابا کو پچپن ساٹھ روپے بھیج دوں تو وہ بہت خوش ہوگا۔"

وہ جیسے خلاؤں میں گھورتے ہوئے مسلسل بولے چلا جا رہا تھا۔

"تمہارا باپ کام کیا کرتا ہے؟"

میں نے ایک دم سوال کیا۔

"وہ افیم پیتا ہے جی۔" اس نے کسی قدر معصومیت سے کہا پھر وہ جیسے یک دم چونک پڑا۔

"وہ سرکاری زمین کی رکھوالی کرتا ہے جی۔ اس کام کے بدلے میں اُسے تھوڑی سی زمین ملی ہوئی ہے جسے وہ کاشت کرتا ہے۔"

"کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟"

"ماں!" دیمو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"صاحب جی اگر میری ماں زندہ ہوتی تو میں گھر سے کیوں بھاگتا، وہ میری ماں ہی تھی جس نے محنت مزدوری کر کے مجھے جوان کیا۔ میری دو بڑی بہنیں بھی ہیں۔ ان کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ میری ماں پچھلے سال مر گئی تھی اور بابو جی — اس کی آواز رُندھ گئی۔

"اور تم اپنے باپ کو گھر اکیلا چھوڑ آئے ہو کہ ...؟"

"صاحب میں نے مجبور ہو کر گھر چھوڑا ہے۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے میری سوتیلی ماں اپنے ساتھ دو بچے لائی ہے وہ مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ میرے باپ کا اس پر کچھ بس نہیں چلتا اس لئے میں ایک دن گاؤں چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ میرے لئے یہ ایک نیا شہر تھا مجھے پیار (؟) سڑک کے کنارے سونا پڑا، مجھے فاقے کرنے پڑے

ایک دفعہ میں نے سوچا کہ یہ مشکل برداشت کرنا گھر کی مصیبت جھیلنے سے بہتر ہے۔ میں گھر جانا نہیں چاہتا تھا اور ایک دن مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور مجھے آپ کے پاس لے آیا۔ میں اپنی مرحومہ والدہ اور سوتیلی ماں کے بارے میں اکثر سوچتا ہوں۔ سوتیلی ماں اس سے کتنی مختلف لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔"

اور پھر دیمو نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔ لیکن اسے رونے سے نہ روکا۔ قدرے توقف کے بعد اس دوبارہ بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اکثر آدھی رات کو اچانک جاگ پڑتا ہوا فکر کرتا رہتا ہوں کہ آیا میرے باپ کے پاس افیم خریدنے کے لئے پیسے ہوں گے یا نہیں۔"

"اگر تمہیں اپنے باپ کا بہت زیادہ خیال ہے اسے یہ تنخواہ کے پیسے بھیج کیوں نہیں دیتے؟"

"اگر میں نے اُسے یہ پیسے بھیج دئے تو میری سوتیلی اس سے یہ چھین لے گی۔"

اُس پر اب تک شدید غم کی کیفیت طاری تھی۔ جب میں نے معاملہ یوں ختم کیا۔

میں نے اس کے باپ کو بذریعہ ڈاک سو روپے کر دیئے۔ میں نے اُسے یہ بھی لکھا کہ اگر وہ اپنے بیٹے سے ملنے کا خواہش مند ہو تو وہ بخوشی آ سکتا ہے۔

اگلے ہفتے جب میں ایک روز دفتر سے واپس آیا دیمو کا باپ میرے گھر پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ وہ قلی تھا جسے میں ریلوے سٹیشن پر بڑی دیر تک تلاش کرتا رہا اور میں اپنی کوشش میں ناکام رہا تھا۔ جب قلی نے ... طرف بغور دیکھا تو میں نے احساسِ گناہ کے تحت اس سے نظریں چرا لیں۔ اتنے میں دیمو کے بوڑھے باپ نے یک دم میرے قدموں میں گرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارے گاؤں سے یہاں شہر میں نوکری تلاش کرنے آیا تھا لیکن جلد ہی مایوس ہو کر لوٹ گیا یہ کہتا ہے شہر کے لوگ دوسروں کی محنت پر زندہ ہیں۔ وہ کام کرتا

(بقیہ ص ۳۶ پر)

[تحریر یحییٰ الاحسانی]

مشاعرہ جشنِ فطرت انصاری سکندرآباد

۱۰ رجون ۸۳ء کی یہ بزم جمیم اور مُشَرِّح شب ہے پرچہ رکبھی اس میدان میں چرچ تھا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے اسکے وسیع میدان میں جو کہ محلہ انصاریان میں واقع ہے، نہایت وسیع پنڈال بنایا گیاہے اسٹیج کے ہردوجانب کرسیوں کا انتظام کردیا گیاہے مستورات کے بیٹھنے کے لئے پنڈال کے ساتھ والے مکان میں بندوبست کیا گیاہے ادھر ہلکی ہلکی پھوار جاری ہے ادھر منتظمین مشاعرہ اس علم میں فوری طور پر کوئی متبادل جگہ کا انتظام نہیں کر سکتے!

۱۰½ بجے مشاعرہ شروع کرایا جارہاہے۔ اظہر کمالی نے مجوزہ صدر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری وزیر ٹرانسپورٹ مرکزی حکومت کا نام نامی صدارت کے لئے پیش کیاہے۔ تالیوں سے خیرمقدم کیا جارہاہے دیر سے بجلی بھی غائب ہے لہٰذا روشنی کا معقول انتظام بھی کیا ہواہے۔ شعرائے کرام سامعین ہی کی صف میں تشریف فرماہیں یہ طریقہ اچھا ہی ہے اس لئے کہ اسٹیج پہ بیٹھ کر شعراء گپ شپ میں مشغول رہتے ہیں۔ کرسیوں پر افسران اعلیٰ اور معززین شہر براجمان ہیں۔ صدر صاحب کو طلائی ہار پہنایا جارہاہے اور عشرت کرتپوری کی بچی گلپوشی کی جارہی ہے۔ عشرت صاحب ڈاکٹر فطرت کے استاد ہیں اور ساتھ ہی فطرت انصاری صاحب کی کتاب محرابِ تمنا کا اجرا بھی ضیاء الرحمٰن انصاری کے دستِ مبارک سے ہورہاہے کیمرہ بھی حرکت میں آگیاہے شمشاد احمد صدر کانگریس (ا) خطبۂ صدارت پیش کررہے ہیں اس مشاعرہ کا آغاز تلاوتِ قرآن پاک سے کیا جارہاہے محمود مرسلین نے ایک رکوع سُناکر مشاعرہ کا آغاز کیاہے۔ اظہر کمالی نے دعوتِ نعت شریف دلانے دہلی کے مشہور مترنم شاعر جمیل تاباں کو۔ جمیل صاحب نعت کی کا مظاہرہ کررہے ہیں ؎

حسن کرم سے مژدۂ خلد وصال دے
اے بے نیاز جرأت حرف سوال دے
ذکر بلیغ ذہن رسا فہم حال دے
صدقہ رسولِ پاک کا اے ذوالجلال دے
مستی بھی میری نازشِ فکر بلند ہو
یارب مری نگاہوں کو اوجِ کمال دے
طولِ شبِ فراق سے گھبرا گیا ہوں میں
بے تابیوں کو میری پناہ جمال دے

تاباں صاحب محفل کو تابندگی دے کر جارہے ہیں اور اب ڈاکٹر فطرت کی نعت شریف عشرت حسین سُنارہے ہیں ؎

زمیں کا ذکر ہی کیا ہفت آسماں روشن
ترے جمال کے پرتو سے لامکاں روشن
تری نگاہِ کرم نے بنائے کون ومکاں
ہمارا دل بھی سیاہ تیرا آستاں روشن
ہمارے خام ارادوں کے مرحلے تاریک
تمہارے پائے مبارک کا ہر نشاں روشن

نعت شریف کے بعد فطرت صاحب، ڈاکٹر مدن لال ہوش، شاہد ایوبی، شاکر انصاری، عبدالمجید کوثر، عشرت حسین فطرت، پنڈت رام چندر دیاس، بھگوت پرشاد اسیر، عاشق دہلوی، داعی القادری وغیرہ نے اپنے خراجِ عقیدت پیش کیاہے اور اب صدر محترم فرمارہے ہیں ؎

جناب فطرت صاحب، شعرائے کرام، سامعین حضرات یہ میری خوش قسمتی ہے اور اس کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ شعروادب کی اس محفل میں شرکت کررہاہوں شعروادب کی دنیا میں ایک کتاب کا اضافہ ہوا محرابِ تمنا

جناب فطرت کے ادبی محاسن کو بیان کرنا، نہ میرا مقام ہے نہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا ہوں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ شعر کے اُفق پر ایک اور ستارا چمکا اس کا اندازہ کل ہوگا وہ حسنِ مستور جو پردوں میں چھپا ہوا تھا وہ سامنے آیا۔

فطرت غزل کے شاعر ہیں، شعرائے کرام مجھے معاف فرمائیں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، غزل شاعری کی جان ہے غزل کی زبان خالص عشق کی زبان ہے اگر دُنیا کے کارخانے سے عشق کو نکال دیں تو یہ دنیا دیوانوں کی دنیا رہ جائے گی۔

سچ پوچھو تو شاعری نام ہے اس دل کی دھڑکن کا جو کبھی شعر کا جامہ پہن لیتی ہے غزل کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ رمز و کنایہ میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ غزل کے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں تمام دُنیا کا درد بھر دیا جاتا ہے غزل میں سو برس پہلے کا کہا ہوا شعر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج کے لئے کہا گیا ہے یہ آفاقیت غزل ہی کے شعر میں ہوتی ہے غزل کا شعر آبِ حیات پی کر آتا ہے کبھی مرتا ہی نہیں نہ شاعر مرتا ہے اس کی غزل اس کو کبھی فنا نہیں ہونے دیتی ہے تالیوں کی جھنکار میں صدر محترم اپنی جگہ تشریف لا رہے ہیں اور ذکی طارق باغپتی نے مائک سنبھالا کہ سلطان نظامی سے درخواستِ کلام کی ہے قبلہ سلطان صاحب غزل سرا ہیں ؎

عزتِ عشق تجھے ٹھیس لگاؤں کیسے
اُن سے اُلفت ہے مجھے ان کو جتاؤں کیسے
جز اندھیروں کے مرے پاس نہ سورج نہ چراغ
راہ بھٹک جائے تو راہی کو بتاؤں کیسے

سلطان صاحب دادِ ترنم لئے پلٹ رہے ہیں پھر جمیل تاباں دہلوی ایک پُرانی غزل لے کر آ رہے ہیں سُنئے ؎

کیا اہلِ گلستاں نے یہ بات بھلا دی ہے
ہم نے ہی لہو دے کر گلشن کو جِلا دی ہے
اب خود وہ تماشہ ہے دُنیا ہے تماشائی
دیوانہ کو اُلفت کی کیا خوب سزا دی ہے
یوں تو نہیں بھڑکی یہ آگ محبت کی
تم نے بھی تو کچھ اپنے دامن کی ہوا دی ہے

تاباں صاحب بھی داد لُوٹ کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور ذکی طارق صاحب فرما رہے ہیں ؎

ثمر سے خدا مری آہوں کو پُر اثر کر دے
تو معتبر ہے مجھے بھی تو معتبر کر دے

رہے ہیں بزم میں ہم بھی رفاقتوں کے بغیر
تمام عمر گزاری شکایتوں کے بغیر
قدم قدم پہ زمانہ اسے پکارے گا
جو سانس لے نہ سکے گا روایتوں کے بغیر
خموشیاں ہیں بہت مدرسوں کے آنگن میں
ذہین ہو گئے بچے شرارتوں کے بغیر

ذکی صاحب داد وصول کئے اپنی جگہ آ کر شہباز ندیم کو یاد فرما رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

چھتیں نہیں ہیں اگر آسمان تو ہے
برائے نام سہی سر پہ سائبان تو ہے

داد وصول کرتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

یہ غم نہیں ہے کہ قرض دار ہیں کتنے
خوشی یہ ہے کہ قائم ہماری شان تو ہے

پھر داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے اور آپ اسی دل کشی سے فرما رہے ہیں ؎

جو تو نہیں تو ان زخم خوردہ آنکھوں میں،
بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کی داستان تو ہے

ندیم صاحب داد پا کر پلٹ رہے ہیں اور اب ایک نوعمر شاعر راحت افروز فیروز آبادی آ کر مشاعرہ کو چونکانے چلا ہے سُنئے ؎

دل میں لے کر جو ترے غم کا اثر جاتا ہے
مُسکرا کر وہ ہر اک غم سے گزر جاتا ہے
اشک کو زینتِ مژگاں ہی بنے رہنے دو
یہ وہ موتی ہے جو چھونے سے بکھر جاتا ہے
اس طرف ہم ہیں ادھر شیخ ہیں ساقی کے قریب
دیکھنا یہ ہے کہ پیمانہ کدھر جاتا ہے

لیجئے اب داد دینے والے ہُلڑ بازی پر اُتر آئے ہیں اور آپ کئی بار دُہرا کر گھبرا کر پلٹ رہے ہیں اور اب ظہیر برنی

سُنا رہے ہیں ؎

تم نے تو نامہ ہائے محبت جلا دیئے
ہم نے بھی خود چراغِ محبت بجھا دیئے

احباب مرے رونے پہ یوں مسکرائے
اس دور میں خلوص کے معنی بتا دیئے

تاکید یہ بھی ہے کہ میں رہبر کہوں انہیں
جن رہبروں نے راہ میں کانٹے بچھا دیئے

طبیر صاحب بھی داد لئے جا رہے ہیں اور اسرار شکوہ آبادی غزل سرا ہیں ؎

بس یہی دل کو غم رہ گیا ⁂ درد کم اور کم رہ گیا

داد اس مطلع کا حق ہے لہٰذا خوب خوب داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

بڑھ گئے جانبِ میکدہ ⁂ راستے میں حرم رہ گیا
آیئے آپ آ جایئے ⁂ اب تو آنکھوں میں دم رہ گیا

اسرار صاحب بھی داد وصول کئے چلتے بنے۔ ادھر رام پور اسکول کے ایک اُبھرتے غزل گو مترنم شاعر سعید رامش آکر عنایت کر رہے ہیں ؎

بے ہُنر ہو تو سمندر میں اُترنا کیسا
مدتوں تک بھی نہ پہنچو گے اُبھرنا کیسا

میں اگر حال سُنا دوں تو لرز اُٹھو گے
میری مانند مراحل سے گزرنا کیسا

لوگ اپنے ہیں گھر اپنا ہے مسیحا اپنا
سب جب اپنے ہیں تو پھر ربط کا مرنا کیسا

رامش صاحب خوب خوب داد و تحسین پا کر کامراں پلٹ رہے ہیں اور عرفان انصاری علیگ فرما رہے ہیں ؎

چپ رہنا غم چھپانا کسی سے نہ بولنا
خود زہر اپنے ذہن کے ساغر میں گھولنا

یوں مجھ کو دور کر کے تمہیں غم ہے یا خوشی
فرصت کبھی ملے تو ذرا دل ٹٹولنا

اس شرط پر تو ترکِ تعلق بھی ہے قبول
ہم سے نہ بولنا تو کسی سے نہ بولنا

عرفان صاحب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور سراج متین فرما رہے ہیں ؎

دن سے زیادہ رات کی قیمت ہوتی ہے زرداروں میں
جسموں کے سودے ہوتے ہیں لوگوں میں دنیاداروں میں

ہم کو مجرم کہنے والو سوچو کیسے جرم کریں
جب ہم تو مصروف ہیں بیحد اپنے ہی گھر باروں میں

متین صاحب بھی گرجنے کی داد لئے چلتے بنے ادھر حبیب عالم دہلوی غزل سرا ہیں ؎

نظر سے آج کچھ ایسی شرافتیں گزریں
کیا جو غور تو کیا کیا حقیقتیں گزریں

قلم کو چھین لو یا مجھ کو قتل کر ڈالو
نہیں تو سُنتے رہو جو قیامتیں گزریں

جلا تھا گھر بھی مرا خون بھی بہا میرا
مرے خلاف ہی کیا کیا شہادتیں گزریں

اب داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور عاصم صاحب اسی سج دھج سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

معززینِ شہر ہو کے رہ گئے مفلوج
ہمارے شہر سے کچھ ایسی شرارتیں گزریں

عاصم صاحب داد کی جھولیاں بھرے ایک گیت ایک گیت کے شور کو سُنا ان سُنا کرتے کامراں پلٹ رہے ہیں اور قاضی بدرالدین فرما رہے ہیں ؎

جذبات میں ہلچل سی ادھر بھی ہے ادھر بھی
بہکے ہوئے الفاظ ہیں بہکی سی نظر بھی

ہے ذہن جواں دل بھی جواں اپنی نظر بھی
ڈر کیا ہے ہو دشوار کوئی راہگزر بھی

قاضی صاحب مناسب داد وصول کئے چلتے بنے اور دہلی کے مترنم خوبرو، خوش گلو زلف بردوش نئے محسن رعنائی آ کر نہک رہے ہیں ؎

عرضِ غم پر جو مری اس نے کہا ہے شاید
کچھ نہ کچھ اس کو بھی احساس ہوا ہے شاید

میرے غم خانے پہ کیوں ہے سحر کا پرتو
ان کے گھر کا کوئی دروازہ کھلا ہے شاید

سارے میکش جو مجھے دیکھ رہے ہیں مختار
دستِ ساقی سے کوئی جام گرا ہے شاید

مختار صاحب دادِ ترنم لوٹتے جا رہے ہیں اور اب ایک نوجوان غزل گو شاعر شفیق برنی سنجیدگی سے فرما رہے ہیں ؎

جانے والے جب مسافر چشمِ تر آنے لگے
پتھروں کے شہر سے آئینہ گر آنے لگے

ختم کر کے قوتِ پرواز وہ تھا مطمئن
پیکر پریشاں ہے کہ میرے بال و پر آنے لگے

کتنا خوش قسمت ہوں میں ان کے تعلق سے شفیق
اب تو سارے شہر کے الزام سر آنے لگے

شفیق صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور افضل کرتپوری نے غزل چھیڑی ہے

مری بربادی کے نوحے ان کے ہونٹوں پر ملے
آستینیں نم ملیں جن کی نہ دامن تر ملے

ہم نے سیکھا ہی نہیں یار و مصائب سے فرار
جب کسی آفت نے دستک دی ہم اپنے گھر ملے

اب داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر ارشاد ہوا ہے ؎

بے سبب ترکِ تعلق کا اثر بھی دیکھنا
ہم ہی گھبرا کر ملے یا تم ہی پچھتا کر ملے

افضل صاحب داد لوٹتے چلتے بنے اور آذر سیانوی فرما رہے ہیں ؎

تم کتابوں میں کبھی نام نہ لکھنا میرا
ورنہ ہر شخص کتابوں کا حوالہ دے گا
مرے آنگن میں کوئی چاند اتر تو آئے
مرے گھر بھی ترے گھر جیسا اجالا ہوگا

داد کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

پھر فضا ہے مطمئن پھر کوئی ہنگامہ کرو
اس طرح خاموش کیوں بیٹھے ہو شوریدہ سرو
چند جھونکے منتشر کر دیں گے شیرازۂ وجود
آندھیوں کے شہر کی جانب نہ دیکھو چیتھڑو

آذر صاحب فنِ آذری دکھا کر جا رہے ہیں اور اب رنگِ محفل بدلنے کے لئے عاشق دہلوی یوں صحت افزا رہے ہیں ؎

ریل پر کل ملی جو اک مہوش
رہ گیا میں نصیب کا ہیٹا
پاس آئی تو ہنس کے یہ پوچھا
ریل دلی کی چھٹ گئی بیٹا

ایک ہنگامہ سا ہنگامہ اور رغل غپاڑہ ہے اور بے تحاشا رواں دواں سنا کر یہ جا اور وہ جا۔ ساجد مشرقی سے بھی سنئے گا ؎

ناکامیٔ حیات تجھے کچھ پتا بھی ہے
دل جس کو دیا ہے وہ اہلِ وفا بھی ہے
اڑتی سی کچھ خبر بھی ہے اور کچھ سنا بھی ہے
کل فیصلہ اسیروں کا شاید کیا بھی ہے

ساجد صاحب واجبی سی داد پا کر جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر فطرت انصاری عطا کر رہے ہیں۔

نگاہِ عشق کی تفسیر بن گیا شاید
خیال و ذہن میں زنجیر بن گیا شاید
وہ ایک جرم جو تم نے مٹا دیا۔
جبینِ وقت پہ تحریر بن گیا
مری نگاہ میں نامعتبر تھا جس کا وجود
وہ فاصلہ مری تقدیر بن گیا شاید

ڈاکٹر فطرت صاحب رسمی طور پر سنا کر جا رہے ہیں۔ حافظ صدیق صاحب فرما رہے ہیں ؎

دیکھ تدبیر کے پہلو میں ہے ایثار و عمل
عزمِ محکم تری تقدیر کی انگڑائی ہے
ہم تو دیوانہ سمجھتے تھے تجھے اے
تیری تخلیق میں لیکن بڑی دانا

حافظ صاحب گلو خلاصی کر کے چلتے بنے اور اب سکندر آبادی رواں دواں سنا رہے ہیں ؎

خدا نہیں ہوں مگر مظہرِ خدا ہوں میں
مجھے سمجھ تو مشیت کا آئینہ ہوں میں

حادثاتِ زمانہ سے کب ڈرا ہوں میں
وقارِ عہدِ گزشتہ کا دبدبہ ہوں میں

شاقل صاحب بھی چلتی چلاتی داد پا کر مائک سے کھسک آئے ہیں اب اس جمود کو توڑنے کے لئے دہلی کے مشہور رمانی شاعر نیر حیدری بھیرویں میں الاپ رہے ہیں ؎

تخصیصِ غم کی بات کہیں ہے کہیں نہیں
یہ رونقِ حیات کہیں ہے کہیں نہیں
ہر ایک کو نصیب نہیں مرگِ عاشقی
پابندیٔ حیات کہیں ہے کہیں نہیں
لہراسکی نہ زلف تری سب کے دوش پر
یہ کہکشاں کی رات کہیں ہے کہیں نہیں

نیر صاحب پنڈال میں جان ڈال کر کامران جا رہے ہیں اور نظمی سکندرآبادی فرما رہے ہیں ؎

نبض چلتی ہے لہو میں بھی حرارت ہے ابھی
عمر باقی ہے تو ہر لمحہ کی قیمت ہے ابھی
شکریہ آج کے انسان سے ملانے والے
ہم سمجھتے تھے بہت دور قیامت ہے ابھی
بارشِ سنگِ ملامت ہے اسی کی خاطر
وہ جو اک آئینہ پہلو میں سلامت ہے ابھی

نظمی صاحب کو ان کے شایانِ شان داد و تحسین دی گئی اب کریمی الاحسانی سے بھی سنئے گا ؎

تعزیت کا و بار کا یہ جو سلسلہ بھی ہے
اس عہد کا یہ سب سے بڑا سانحہ بھی ہے
شوکیس میں سجائیں کتابیں کچھ اس طرح
جیسے ہمیں شعور الف آشنا بھی ہے
یہ رہزنی کا دھندہ تو درشہر پا یا ہے
ورنہ یقین کیجئے یہ رہنما بھی ہے

آیئے پھر غزل کی محفل میں چلئے اور بدایوں کے ایک استاد شاعر میکش صاحب سے بھی سُن لیجئے گا ؎

ترے حسنِ بیکراں کی ہیں اداشناس آنکھیں
نہ بجھا سکیں گی لیکن مرے دل کی پیاس آنکھیں
مرے درد کا فسانہ کبھی تم نہ پڑھ سکو گے
نہ تمہارے پاس دل ہے نہ تمہارے پاس آنکھیں

میکش صاحب خوب خوب داد پا کر عنایت کر رہے ہیں ؎

کبھی آئینہ کے اندر کبھی آئینہ کے باہر
وہی اک اداس چہرہ وہی اک اداس آنکھیں

میکش صاحب داد و تحسین وصول کئے شاداں جا رہے ہیں پھر اس عالم میں ایک بزرگ شاعر واحد القادری رامپوری عطا کر رہے ہیں ؎

اب تک اس تعلقِ خاطر کی زد میں ہوں
یہ زد ہٹی تو جسم کا گھر چھوڑ جاؤں گا
اندھیرا روشنی سے لپٹ جائے میرے بعد
ایسا رفاقتوں کا تہ شہر چھوڑ جاؤں گا
گزرو گے جس کے پاس سے چپ چپ اداس اداس
اس راہ میں اک ایسا شجر چھوڑ جاؤں گا

قبلہ واحد صاحب بھی داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور ایک معتبر شاعر ڈاکٹر ظہیر صدیقی آ کر عنایت کر رہے ہیں ؎

ہم نے مانا کہ بہاروں کے پیام آئیں گے
کون جانے کہ اسیروں کے بھی نام آئیں گے
جذبۂ ترک و طلب بھی نہ رہے گا باقی
منزلِ عشق میں ایسے بھی مقام آئیں گے
صبح کی دھن میں چلے تھے تو یہ سوچا بھی نہ تھا
اپنے دامن میں لئے ظلمتِ شام آئیں گے

ڈاکٹر ظہیر بھی کامران پلٹ رہے ہیں اور اب حضرت احسان دانش مرحوم کے ایک خاموش شاگرد جو آج خود استاد ہیں جناب عشرت کرتپوری عطا کر رہے ہیں ؎

سیلابِ غم کو اس کی خبر کر رہے ہیں ہم
کاغذ کی کشتیوں پہ سفر کر رہے ہیں ہم
جیسے کبھی نہ لوٹ سکیں گے مکان میں
دیوار و در پہ ایسے نظر کر رہے ہیں ہم
لکھو کہ تیرے ہجر کی چادر کو اوڑھ کر
تنہائیوں میں عمر بسر کر رہے ہیں ہم

داد کا شور پر خوشگوار کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

تم ترکِ تعلق کو کیوں چہرے پہ لکھ لائے
تم نے تو کہا یہ تھا یہ راز نہ کھولو گے

پھر داد نقطۂ عروج سے سوا ہے اور آپ رواں دواں شناکر مائک سے جُدا ہو رہے ہیں اور ایک کہنہ مشق شاعر اظہر کمالی بدایونی عطا کر رہے ہیں ؎

ہم تو فقط دو گام ہی چل کر کھو گئے پیچ و خم میں یار و
سوچا یہ تھا شہر وفا کے سیدھے سادے رستے ہوں گے
بے سوچے ہر اک روِش کو کتنا پانی دے ڈالا ہے
خود مالی جب جاتے ہوں گے پاؤں زمیں میں دھنستے ہوں گے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

رات اندھیری بادل گہرے ہم ہیں اور پتوار
لیکن خواہش تو وہ بھی نہ ہوں گے پہونچے جو اس پار

پھر داد نے پنڈال میں آہ اور واہ کی حرارت پیدا کی ہے اور آپ بڑا اعتماد لہجہ سے فرما رہے ہیں ؎

صدق و صفا کی مہر و وفا کی کون کرے گا قدر
ہم یہ کھوٹے سکے لے کر کیوں آئے بازار

آپ خوب خوب داد و تحسین پا کر کامران جا رہے ہیں اور اب ایک بزرگ صورت شاعر نظر برنی نے مائک پر آکر ایک عجیب مسخرگی کا مظاہرہ شروع کیا ہے قبلہ محترم اشعار سنانے سے پہلے پس منظر بتلا کر کر ج کر کہتے ہیں غالب نے یہ کیا کہا، میں نے یہ کہا، شکیل نے یہ کیا جھک ماری میں نے اس کی اس طرح اصلاح کی۔ اقبال نے گیا شکوہ کہا میں نے اس میں اس طرح اضافہ کیا ہے یار لوگ تفریح کے موڈ میں ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کیا نظر کے ہم قافیہ شاعر ان کے ہموطن مزاح گو ہی کیوں ہوتے ہیں جیسے فقر برنی قبلہ۔ نظر برنی۔ بڑے میاں اس سے بے نیاز کر ان کو بنایا جا رہا ہے بس سُنائے جا رہے ہیں آخر میں ان کی تاریخی اور دھماکہ خیز نظم مسجد اقصیٰ کی فرمائش نے ہلڑ بازی اور غل غپاڑہ کو جنم دے دیا۔ چند نوجوان بے قابو نظر آتے ہیں لیکن یہ نظم و نظم کچھ بھی نہیں ہے صرف ایک مصرعہ ہے جسے وہ بار بار دُہراتے ہیں اور اس کے بعد محفل میں قہقہے۔ تالیاں۔ ہاؤ، ہو، ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ ملک کے ہر مشاعرہ میں نظر صاحب کو یاد کیا جاتے تاکہ وہ اپنی یاوہ گوئی سے صحت میں اضافہ کرتے رہیں۔ ہاں تو وہ مصرعہ سماعت فرمایئے

مسجد اقصیٰ۔ الاقصیٰ۔ الاقصیٰ۔ الا قصیٰ۔!

لیجئے تماشہ ختم۔ اب تو محترم نظر صاحب فلمی گانے بھی لکھنے جا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں تھے بمبئی والے چھوڑتے ہی نہیں کیا کہنا ہے

اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی

کہیں کہا گیا تھا آج سمجھ میں آیا۔ اس تضییع اوقات کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آیئے پھر غزل کی اسی سنجیدہ محفل میں چلیئے اور صدرِ محترم ضیاء الرحمٰن صاحب سے عالم جوانی میں کہے ہوئے صرف دو شعر سن لیجئے گا ؎

تھا تمہارا رنجشِ باہم کا بزم میں اظہار
اکیلے ملتے ہمیں تم تو گفتگو کرتے
سبب ہوا مری ہی بیچارگی کا بیتابی
جگر کے چاک کو بنتا نہیں رفو کرتے

آپ کے ساتھ ہی یہ شستہ اور یادگاری محفلِ شعر و سخن ۳ بجے علی الصبح ختم ہو رہی ہے بزم ادب سکندر آباد کے اراکین اور شہر کے ادب نواز حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں کہ سبھی نے اس مشاعرہ کو کامیاب کرنے میں اپنا قیمتی وقت دیا اور نذرانۂ عقیدت میں زرِ خلوص بھی اچھا اب اجازت دیجئے۔ ؎

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

(صفحہ۳ کا بقیہ)

اور محنت کا جائز حق ادا نہیں کرتے لیکن بابو جی جب میں نے اپنے بیٹے کو آپ کی دعائیں دیتے سنا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس شہر میں آپ جیسے بڑے لوگ بھی بستے ہیں۔

نیاز احمد صدیقی

چھرسنڈ جون پور کا کُل ہند مشاعرہ

جونپور کے کُل ہند مشاعرہ کی صدارت حضرت وامق
ن پوری نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض عمر قریشی نے انجام دیے
مہمانِ خصوصی کے طور پر جناب جنگی سنگھ (ایس۔ پی)
ہنچ پر رونق افروز تھے۔
مشاعرہ کا آغاز ماجد دیوبندی نے اپنی غزل سے کیا ؎

لے آئی ہے اس موڑ پہ اب گردشِ دوراں
غم جس نے دئے ہیں وہی غم خوار لگے ہے

ن کے بعد مائک پر ہیں جناب عشرت صدیقی ؎

احساس تھا تو پھول سے نازک بھی تھے ہمیں
احساس مٹ گیا تو پتھر کے ہو گئے

اب آفاق فاخری ؎

پھول سی دونوں آنکھیں جدھر اُٹھ گئیں
اس طرف کی فضا نرگسی ہو گئی

ب مائک پر تشریف لائے ہیں جناب ساغر خیامی اور
ہوں نے طنز و مزاح سے بھرپور نظم شعراء اور شاعرات
ے درمیان کرکٹ پیش کی جو بے حد پسند کی گئی۔
جناب منظر بھوپالی ؎

انقلاب آئے گا، آئے گا ضرور آئے گا
ہم نہیں کہتے مگر لوگ کہا کرتے ہیں

ترمہ نیتا نکہت ؎

پہلے دیدار کا مشتاق بنا دیتے ہیں
پھر نگاہوں کو ترسنا بھی سکھا دیتے ہیں

لن بھارتی نے قومی یک جہتی پر ایک نظم پیش کی جو بہت
پسند کی گئی۔
نور اندوری ؎

تجھ سے بچھڑوں تو پھر تجھ سے کیسے ملوں
زندگی مجھ کو تیرا پتہ چاہیئے

رئیس انصاری ؎

یہ کہہ دو شہر کے لوگوں سے جا کر
میں ٹوٹا ہوں ابھی بکھرا نہیں ہوں

جناب ہلال سیوہاروی نے چند طنزیہ قطعات اور ایک نظم "کتوں کی کانفرنس" سُنا کر ماحول کو قہقہہ زار بنا دیا
اس کے بعد محترمہ ریحانہ انجم غزل سرا ہوئیں ؎

ہر طرف بجلیوں نے گھیرا ہے
ہم نشیمن بنا کے پچھتائے

جناب معراج فیض آبادی نے مائک پر آ کر ماحول کو ایک بار پھر سنجیدہ کر دیا ؎

جلا دیا ہے سرِ رہ گزر تو جلنے دے
پھر ایک رات کی مہلت ہوا سے مانگیں گے

معراج فیض آبادی کے بعد جناب راحت اندوری نے اپنے مخصوص انداز میں غزل چھیڑی ؎

ہے شرابی کہ نمازی یہ کوئی شرط نہیں
وہ جسے چاہے مُقدّر کا سکندر کر دے

جیب عاصم نے ایک گیت "برہن" اور ایک غزل سے سامعین کو محظوظ کیا۔

یہ کیا کہا کہ بہت زخم کھائے ہیں دل پر
اگر یہ دل ہے تو بس ایک زخم کافی ہے

محترمہ نسیم نکہت ؎

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ہمدرد ہزاروں
شاید مری بستی میں اداکار بہت ہیں

تمنّا جمالی ؎

میں تو مٹ جانے کو مٹ جاؤں گا میرا کیا ہے
تم پہ الزام نہ آئے وہ طریقہ کیا ہے

جناب کامل شفیقی نے "خون کی لہریں" نظم پیش کی جو بہت پسند کی گئی۔

شمیم جے پوری ؎

مرتے مرتے بھی ہم مسکراتے رہے
رکھ لیا ہم نے تیرا بھرم زندگی

نفیس غازی پوری ؎

میں جدا تیرے تصور سے نہیں ہو سکتا
آئینہ میں بھی مری شکل دکھائی دے گی

اظہر عنایتی ؎

اس راستے میں جب کوئی سایہ نہ پائے گا
یہ آخری درخت بہت یاد آئے گا

شاعر جمالی ؎

کیسے کیسے تیرنے والوں کو دریا کھا گیا
بچ گیا وہ جس کی مٹھی میں کوئی تنکا نہ تھا

ڈاکٹر بشیر بدر ؎

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

حبیب ہاشمی ؎

تیرا قصہ، تیرا غم، تیری کہانی لے گیا
شہر کی سب رونقیں دریا کا پانی لے گیا

صدرِ مشاعرہ جناب وامق جون پوری نے چند کلمات کے بعد اپنی غزل سے سامعین کو محظوظ فرمایا ؎

ایک تہذیب ہے فنکار کی آشفتہ سری
اے جنوں میرے لئے اور بہک اور بہک

مشاعرہ صبح ۵ بجے بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

●●

(صفحہ ۳۱ کا بقیہ)

جو دیکھتے ہو تو کیوں پوچھتے ہو اے لوگو!
ہمارا حال تو چہرے سے آشکارا ہے
ہم اپنے سر کو ہتھیلی پہ رکھ کے نکلے ہیں
تلاش یہ ہے کہ قاتل کہاں ہمارا ہے

محترمہ کملا انجم کے بعد صدرِ مشاعرہ جناب نریش چندر جین نے ڈاکٹر بشیر بدر کو یہ کہہ کر کلام سنانے کی درخواست کی کہ میں ایک ایسے شاعر کو زحمت دے رہا ہوں جس کے بغیر مشاعرہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ بدر صاحب نے کئی غزلیں سامعین کو سنائیں اور خوب خوب داد لوٹی۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ شعر بہت پسند کئے گئے

یوں ہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ڈاکٹر بشیر بدر کے بعد اس مشاعرہ کے سب سے کم عمر شاعر جناب نفیس کو دعوتِ سخن دی گئی۔ نفیس صاحب مائک پر تشریف لا کر غزل سرا ہوئے ؎

ہر غم میں ایک تازہ خوشی پا رہے ہیں ہم
شاید کسی کو یاد بھی آ رہے ہیں ہم
سن جاؤ آ کے آخری پیغامِ آرزو
خاموش عمر بھر کو ہوئے جا رہے ہیں ہم

اس مشاعرہ کے اختتام پر ڈاکٹر بشیر بدر نے ہندستان کے غزل و گیت کے اکیلے شاعر جناب بیکل اتساہی کو احترام کے ساتھ دعوتِ سخن دی۔ ان کے مائک پر کھڑے ہوتے ہی فرمائشوں کا سلسلہ شروع ہونے لگا۔ سامعین میں سے کوئی کچھ سننا چاہتا تھا کوئی کچھ۔ فرمائشی کلام سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے بیکل صاحب نے کچھ شعر تحت میں سنائے ؎

کوئی تھا ہندو نہ مسلم گناہ کس نے کیا
بتاؤ پیار سے گھر کو تباہ کس نے کیا

اس کے بعد بیکل صاحب نے سامعین کے اصرار پر گیت اور کئی غزلیں ترنم سے پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا۔

●●●●

کرتپور میں کُل ہند مشاعرہ

ظہیر ربانی

ہر سال کی طرح اس سال بھی کرتپور مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے گڑ منڈی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ کا افتتاح حکیم صاحب نے کیا صدارت جناب سریش چند جین نے کی اور نظامت کے فرائض جناب ڈاکٹر بشیر بدر نے بخوبی انجام دئے۔

اس مرتبہ بعض مدعو شعرا شرکت نہیں کر سکے پھر بھی مشاعرہ بہت کامیاب رہا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشاعرہ صبح ساڑھے چار بجے ختم ہوا۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے مشاعرہ کا آغاز مراد آباد سے آئے ہوئے نوجوان شاعر رنگین مراد آبادی کے کلام سے کیا۔ رنگین مراد آبادی نے مترنم آواز میں یہ غزل پڑھ کر فضا کو رنگین بنا دیا ؎

یوں نہ مجھ سے نظر پھیر دشمن کی طرح
یہ زمانہ بھی گزر جائے گا بچپن کی طرح

رنگین مراد آبادی کے بعد ڈاکٹر بشیر بدر نے مقامی شاعر حیدر کرتپوری کو آواز دی جن کو اس شعر پر خوب داد ملی ؎

حسن امیر والے ان کے دکھاتے رہے دل
مفلسوں کی آہیں بد دعا دے گئیں

غزل کے اس ماحول میں حیدر کرتپوری کے بعد مائل راہبر چاند پوری کو بلایا گیا انہوں نے غزل پر خاصی داد حاصل کی۔ ان کے بعد آواز دی گئی جناب راشد عارفی کو انہوں نے تحت میں کئی شعر سنائے اور ہر شعر پہ داد پائی ؎

چرچہ تھا شہر شہر ہماری کتاب کا
لوگوں نے صفحہ پھاڑ دیا انکشاف کا

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر بشیر بدر نے نور اندوری کو دعوتِ سخن دی نور صاحب نے سامعین کی فرمائش پر ایک کے بعد ایک تین غزلیں پڑھیں اور داد حاصل کی۔ نور صاحب کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا ؎

تجھ سے بچھڑوں تو پھر تجھ سے کیسے ملوں
زندگی مجھ کو تیرا پتہ چاہیئے

نور صاحب کے بعد جناب رضوان سنبھلی جناب عزیز نہٹوری جناب شاکر کرتپوری باری باری اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے بعد رشید نجیب آبادی نے ترنم سے غزل پڑھی ؎

غم سے جو کانپ جائے مجھے وہ خوشی نہ دے
جو حادثوں سے دور ہو وہ زندگی نہ دے

رشید نجیب آبادی کے بعد کاشی والی نجیب آباد سے آئے جناب راجیش گوڑ نے ترنم سے ایک خوبصورت گیت پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ مشاعرہ کو کامیابی کی حد تک پہونچانے کے لیے ڈاکٹر بشیر بدر نے راحت اندوری کو یہ کہہ کر دعوت دی کہ میں ایک ایسے شاعر کو زحمت دے رہا ہوں جسے مشاعرہ جادوگر کہا جاتا ہے جن کو مشاعرہ کی ضرورت نہیں لیکن مشاعرہ کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تالیوں کے استقبال میں راحت اندوری اسٹیج پر آئے اور اپنے مخصوص انداز میں شعر پڑھے

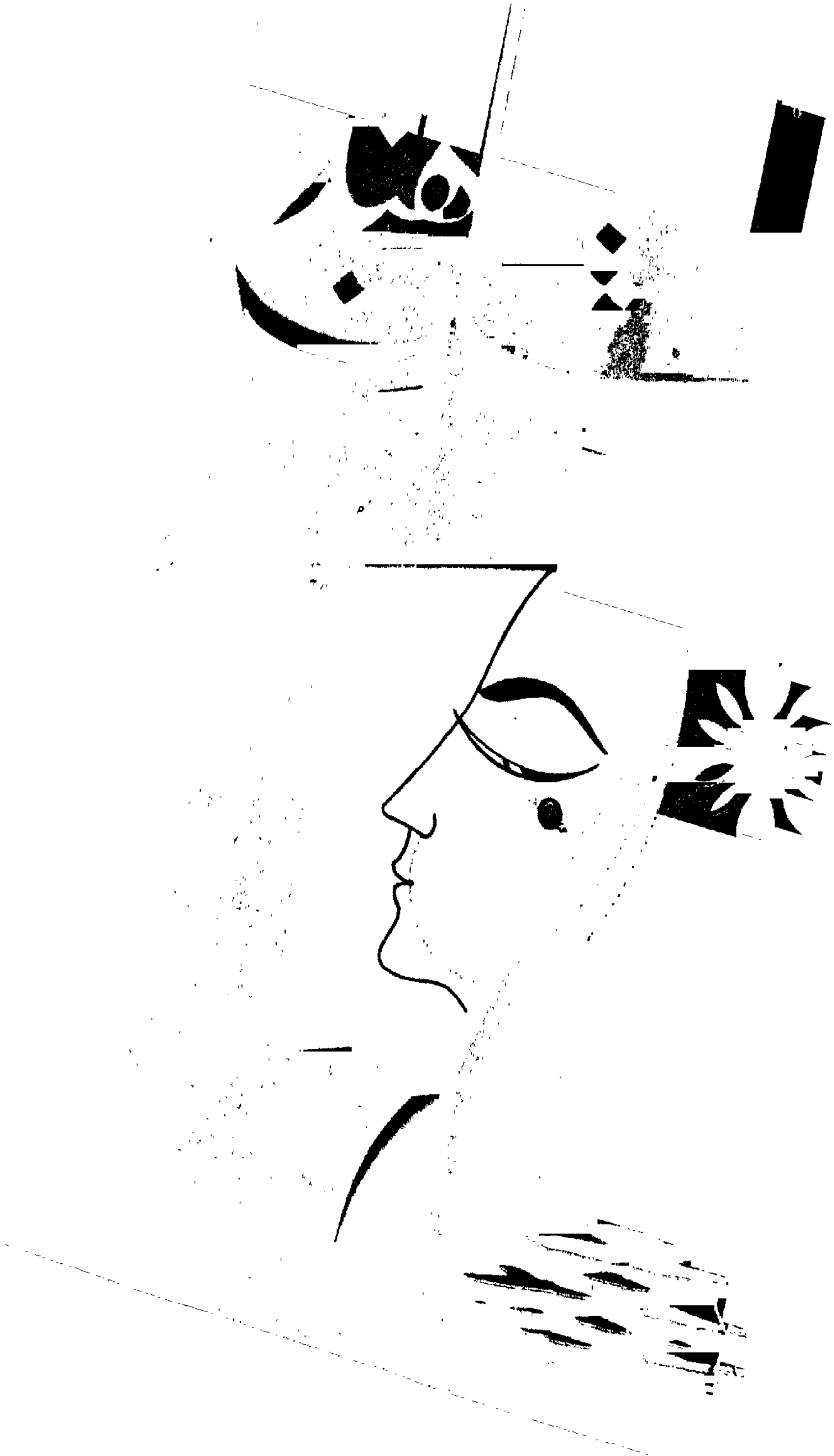
تیرے ہاتھوں میں تلوار میرے لب پہ دعا
سورما آ مجھے میدان سے باہر کر دے
میرے بوڑھے سورج دھوپ اپنے چھاؤں کے مالک
میرے سائے کو مرے قد کے برابر کر دے

سامعین کی ایک اور ایک اور کی آواز میں راحت اندوری منچ سے چلے گئے۔ ان کے بعد دعوتِ سخن دی گئی ہے محترمہ کملا کو جنہوں نے یہ غزل پڑھ کر سامعین کو محظوظ کیا ؎

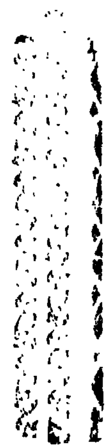
(بقیہ ص ۴۳ پر)

JULY 1983 Phone : 275602 Regd. No. D-(DN)370
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57






ذرا ٹھہریئے!



ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۳۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۷۰/DN

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی
(یومِ آزادی ایڈیشن)

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاضؔ گوالیاری)

زرِ سالانہ ۲۴/۰ روپے
فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
(یہ شمارہ ۳/۵۰ روپے

جلد نمبر ۴۴ | اگست سنہ ۱۹۸۳ء | شمارہ نمبر ۸

فرزندانِ وطن کیلئے

پندرہ اگست کا پیغام

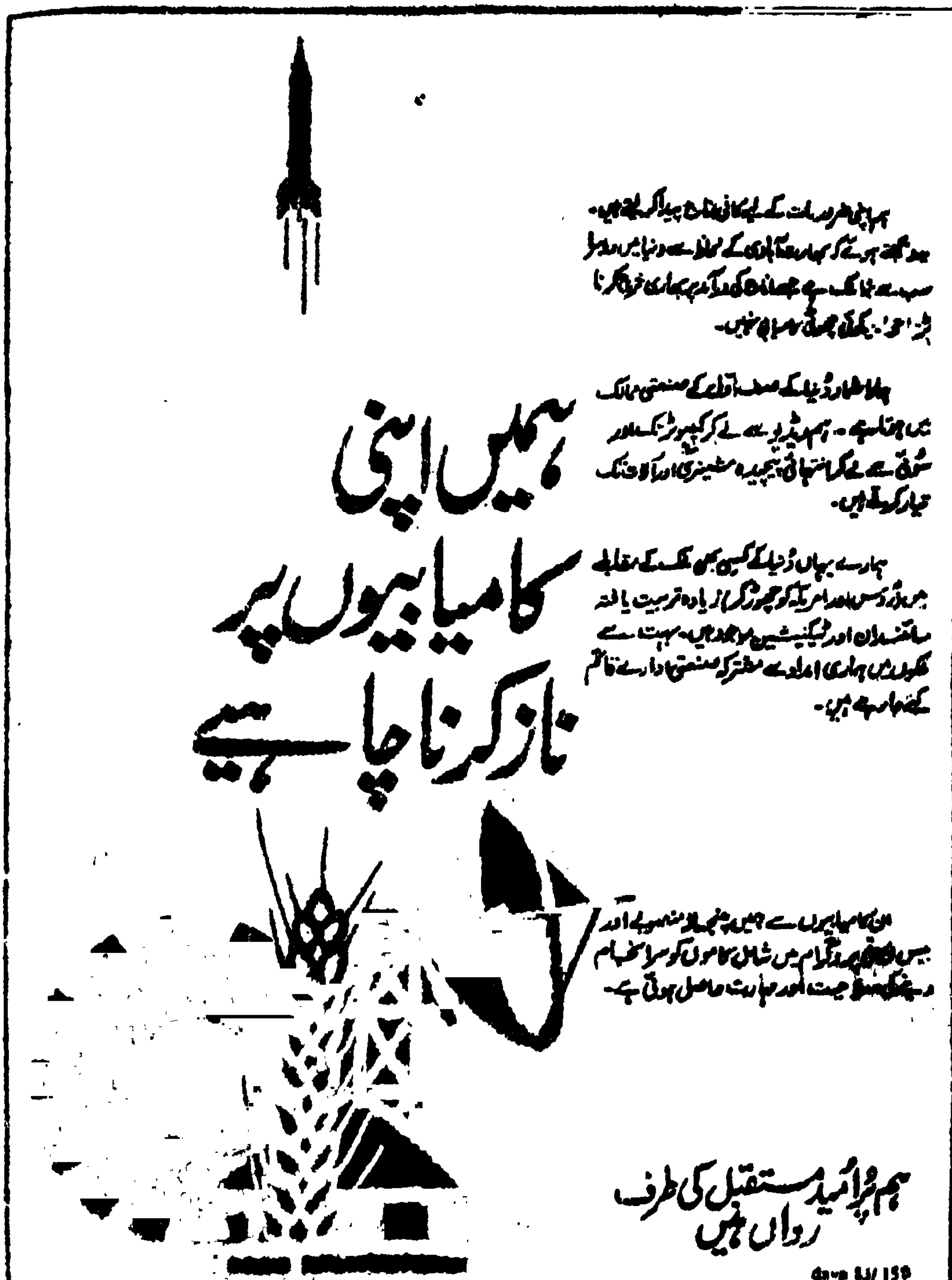
۱۵

توصیف علوی عاصیؔ بی۔ اے۔ کیرانوی

عزم و یقیں پیدا کرو۔ فکر و نظر پیدا کرو ۔۔۔ زندگی کی آرزو ہے تو جگر پیدا کرو
ہر طرف چھائی ہوئی ہے شامِ غم کی تیرگی ۔۔۔ ان اندھیروں میں نیا نورِ سحر پیدا کرو
جس نے ڈھائے تھے کبھی جبر و تشدد کے ستوں ۔۔۔ نعرۂ قومی میں پھر وہ ہی اثر پیدا کرو
جن کی خوشبو سے مہک اٹھے فضائے کائنات ۔۔۔ گلشنِ ہستی میں وہ گلہائے تر پیدا کرو
بزمِ گیتی کے چراغوں کو اگر دینی ہے لو ۔۔۔ سوزِ دل پیدا کرو، سوزِ جگر پیدا کرو
دامنِ امید کو دینے ہیں شہپارے اگر ۔۔۔ دیدۂ گریاں کے اشکوں سے گہر پیدا کرو
ڈالنی ہے گر زمانے کے ستاروں پر کمند ۔۔۔ عزمِ محکم کے نئے کچھ بام و در پیدا کرو
خود ہی ہے کرنا ہے تمہیں شاداب نخلِ آرزو ۔۔۔ خود ہی ہر شاخِ تمنا پر ثمر پیدا کرو
گردشِ دوراں کو دینا ہے تمہیں ہی رخ نیا ۔۔۔ تم ہی ہر اک شام سے نورِ سحر پیدا کرو
گر بنانی ہے تمہیں رنگین تصویرِ حیات ۔۔۔ اس میں رنگ بھرنے کو کچھ خونِ جگر پیدا کرو
جن سے خوابوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں سدا ۔۔۔ زندگی کے وہ نئے فکر و نظر پیدا کرو
منزلِ ذوقِ طلب میں کیوں ستاروں کی ہے فکر ۔۔۔ خود ستے جو روشن ہوں وہ داغِ جگر پیدا کرو

کیوں دلوں میں ہے یہ عاصیؔ امتیازِ رنگ و نسل
گر ہو تم انساں، تو انساں کی نظر پیدا کرو

دو یار پرکاش سرورؔ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق بائیلٹ پریس سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲ سے شائع کیا۔


ہمیں اپنی کامیابیوں پر ناز کرنا چاہیے
ہم اپنی ضروریات کے لیے کافی اناج پیدا کر لیتے ہیں۔
ہمارا شمار دنیا کے صف اوّل کے صنعتی ممالک میں ہوتا ہے۔ ہم ہیئر پن سے لے کر کمپیوٹر تک اور سُوئی سے لے کر انتہائی پیچیدہ مشینری اور آلات تک تیار کر رہے ہیں۔
ہمارے یہاں دنیا کے کسی بھی ملک کے مقابلے جس میں روس اور امریکہ کو چھوڑ کر زیادہ تربیت یافتہ سائنسداں اور ٹیکنیشین موجود ہیں۔ بہت سے ملکوں میں ہماری امداد سے مشترکہ صنعتی ادارے قائم کئے جا رہے ہیں۔
ان کامیابیوں سے ہمیں پنج سالہ منصوبے اور بیس نکاتی پروگرام میں شامل کاموں کو سر انجام دینے کے لیے ہمت اور مہارت حاصل ہوتی ہے۔
ہم پُر اُمید مستقبل کی طرف رواں ہیں
davp 81/159

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

دلی دُور درشن

اگر آپ میں جوڑ توڑ کرنے کا جوہر موجود ہے۔ یا افسران اور پروگرام دینے والے حضرات کی خوشامد کرتے سے آپ کی اَنا مجروح نہیں ہوتی تو "دلی دُور درشن" سے آپ اپنی بھدی سے بھدّی آواز اور بکروہ شکل سے ٹی۔ وی دیکھنے والوں کی قوتِ سامعہ اور قوتِ باصرہ کو کھلے عام نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یعنی بقول ایک پاکستانی کالم نویس ناظرین کو آشوبِ چشم و گوش میں مبتلا کر سکتے ہیں۔

ہمارے دلی دُور درشن والوں کو ہلدی کی ایک گانٹھ نشری جے۔ پی۔ بھٹناگر کی شکل میں دستیاب ہوگئی ہے۔ پولس کمشنر۔ میونسپل کمشنر۔ ڈپٹی کمشنر۔ چاٹ بیچنے والے۔ پیاز فروخت کرنے والے۔ حتیٰ کہ جی۔ بی روڈ کی طوائفوں سے انٹرویو لیتے وقت اسی ہلدی کی گانٹھ کو چٹخارا لانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دُور درشن والوں کی بلا سے کہ بھٹناگر صاحب کا غلط تلفظ پڑھے لکھے حضرات اور خصوصاً دلی والوں کیلئے کس قدر سوہانِ روح ہوتا ہے جس ذمہ دار افسر یا خصوصی شخصیت سے استفسارات کئے جاتے ہیں۔ بھٹناگر صاحب کا اُن کے تئیں رویہ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے یہ خود تو کوئی ہائی پاور ہیں اور ان کے سوالات کا جواب دینے والا کوئی ایسا ملزم ہے جس پر جرح کی جا رہی ہو۔ دُور درشن والوں کے پاس سابق پولس کمشنر سردار بھنڈر سے انٹرویو والی فلم تو ہوگی ذرا اُسے دوبارہ دیکھیں کہ بھٹناگر صاحب کس جارحانہ انداز سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اگر ان کی گفتگو انداز ٹی۔ وی سٹوڈیو سے باہر ہوتا تو بھنڈر صاحب کی ایک نگاہِ خشمگیں سے بھٹناگر صاحب کا پیشاب خطا ہو جاتا۔ میونسپل کمشنر نے تو انٹرویو کے وقت بھٹناگر صاحب کے بے تُکے پن پر بار بار پورے وقار کے ساتھ کہا کہ پہلے میری بات پوری طرح سنیئے۔ انٹرویو لینے اور بھاوڑا مارنے میں یقیناً فرق ہے مگر ہمارے دُور درشن والے کسی خاص وجوہات کے باعث مجبور ہیں کہ وہ ناظرین کی سر دردی کے لئے اس ہلدی کی گانٹھ کا لیپ ضروری سمجھتے ہیں۔

نیشنل پروگرام ایک اہم اور قابلِ ذکر پروگرام ہے مگر یہ پروگرام دیکھتے وقت اکثر اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ یا تو ہم دہلی میں نہیں لندن میں رہ رہے ہیں یا پھر انگریزی ہماری قومی زبان ہے۔ ہفتے میں دو دن تو ہندی سماچار کے علاوہ سارے کا سارا پروگرام ہی انگریزی میں ہوتا ہے۔ اور باقی دنوں میں ہندی سماچار کے علاوہ دوسرا پروگرام پچاس سے پچھتر فی صد انگریزی میں ہی ہوتا ہے۔ دُور درشن والے کہہ سکتے ہیں کہ نیشنل پروگرام سارے ملک کے لئے ہے اور ملک بھر میں انگریزی ہی ایک زبان ہے جو سمجھی جا سکتی ہے۔ اس لئے عوام کی سہولت کے لئے انگریزی پروگراموں کو وافر مقدار میں پیش کرنا ضروری ہے۔ مگر ہمارا یہ دعویٰ کہاں گیا کہ ہندی ہماری قومی زبان ہے۔ ملک کی دوسری زبانیں۔ بنگالی۔ پنجابی تلگو۔ تامل۔ اڑیا۔ بھوجپوری وغیرہ بھی ہماری ہی سرزمین پر رہنے والوں کی زبانیں ہیں۔ کیوں نہ ان زبانوں کا حصہ رسدی اس پروگرام میں کیا جائے۔ انگریزی سے ہمیں کوئی کد نہیں ہے بلکہ انگریزی کے صدقے تو ہم برٹش گورنمنٹ سے کام نکالنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انگریزی کے پروگرام ضرور دکھلائے جائیں مگر ان کو فوقیت دینا زبانِ حال سے یہ تسلیم کرنا ہے کہ ہندی ہماری قومی زبان نہیں ہے۔

مہینے میں ایک بار دُور درشن والے اُردو پر احسانِ عظیم فرماتے ہیں اور نصف گھنٹے کا پروگرام "بزم" پیش کیا جاتا ہے۔ پچھلے ماہ "بزم" پروگرام میں جناب مہیش چندر نقش اور ایک اور صاحب کو دکھایا گیا۔ کچھ منٹ تو یہ دونوں حضرات علیک سلیک اور ایک دوسرے کو متعارف کراتے رہے یہاں تک کہ نقش صاحب دوسرے شاعر صاحب سے کہنے لگے بھائی ہاں مجھے علم ہے کہ سوجان سنگھ مارکیٹ میں آپ کی موٹر مکینک کی دوکان ہے۔ ہم دُور درشن کے کسی باذوق ذمہ دار افسر سے گزارش کریں گے کہ وہ اس بزم پروگرام کی فلم دیکھیں تو انھیں پتہ چلے گا کہ جیسے مہیش چندر نقش ایسے نامور اور مستعلیق شاعر کو کسی بھینسے سے ٹکرا دیا گیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب آجکل کسی مقتدر ہستی کی اعزازی موٹر ڈرائیوری کر رہے ہیں۔ اسی لئے اُن موٹر نشین کی سفارش سے انھیں "بزم" میں جوہر دکھانے کا موقع دیا گیا۔

حال ہی میں مودی مِل والوں کا مشاعرہ ہوا جس کے کچھ اقتباس دلی دُور درشن پر بھی دکھائے گئے۔ ایاز جھانسوی کا نام جب ہندی اور اُردو میں لکھا ہوا دکھایا گیا تو عیاز جھانسوی لکھا ہوا تھا۔ ایاز صاحب کو دُور درشن والوں کا ممنون ہونا چاہیے کہ عیاز کی بجائے "عیار" نہیں لکھ دیا گیا۔ ورنہ دُور درشن کا وہ کیا بگاڑ سکتے تھے۔

ہندی تلفظ کی بوالعجبیوں پر ہم اس لئے کچھ لکھنا نہیں چاہتے کہ یہ ہماری قومی زبان ہے۔ بھلا ہو دور درشن والوں کا کہ جہاں ایک ہندی خبریں سُنانے والی محترم خاتون سلمیٰ سلطان بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنے صحیح ہندی تلفظ سے ہندی کی عزت کو محفوظ رکھا ہے۔ ورنہ عام طور پر ظلم کو ضُلم، ذلیل کو جلیل اور جلیل کو ذلیل ہی بولا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دِلی دُور درشن پر پیش کئے جانے والے کچھ ناٹک بہت ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ہندی کوی سمیلن غنیمت ہوتے ہیں اور قانونی صلاح۔ ایسے عوامی ضروریات کے پروگرام قابل تعریف ہیں۔ مگر دُور درشن والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسی ستر لاکھ آبادی والی دلی میں ہزاروں ہستیاں ایسی ہیں اگر ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو دُور درشن کے پروگرام میں اور بھی تازگی، بہتری اور مقبولیت لائی جا سکتی ہے۔ دُور درشن والوں نے مسٹر بھٹناگر کو پٹا لکھ کر نہیں دیا ہوا کہ ضرور انھیں ہی انٹرویو کیلئے مدعو کیا جائے گا۔ اہلِ دلی اب بھٹناگر صاحب کی شکل و صورت اور بے تکے پن سے اُوب چکے ہیں اور دہلی کے عوام بھٹناگر صاحب کی آنریری مجسٹریٹی کے زمانے کی روایات کو ابھی تک بھولے نہیں ہیں جن میں انھوں نے نام پانے کیلئے کیسے کیسے پاپڑ بیلے تھے۔

وزیر نشریات و اطلاعات جنھیں سردار دیوان سنگھ مفتون مرحوم کے قول کے مطابق "وزیر جمالیات" بھی کہا جا سکتا ہے۔ سے ہماری گذارش ہے کہ آپ دہلی کے قدیم باشندے ہیں اور اہلِ دلی کے ووٹوں سے ہی آپ منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ تک رسائی رکھنے والے حضرات شاید آپ کو صحیح حالات سے آگاہ نہ کر سکیں کیونکہ انھیں اپنی سفارشوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ مگر ہم آپ سے بالکل صاف الفاظ میں گزارش کر رہے ہیں کہ دور درشن اور آکاش وانی کو سفارشیوں سے بچایئے اور ان دونوں قومی سروسوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کیجئے تاکہ ملک کی ستر فیصدی آبادی تک آکاش وانی اور دُور درشن کے بہترین اور کارآمد پروگرام پہنچائے جا سکیں۔

نصیر خان صاحب کی پچاس فیصد سچائی

۲۰ر جولائی ۱۹۸۳ء کے قومی آواز کے دہلی ایڈیشن میں نصیر خان صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں اُنہوں نے شکایت کی ہے کہ آزادی سے لیکر اب تک فراق گورکھپوری کے علاوہ کسی فرد یا جماعت نے اُردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ لکھا ہے کہ کچھ افراد نے اگر اُردو کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہا یا صوبائی حکومت یا مرکزی حکومت کے خلاف احتجاج کیا تو صرف ذاتی مفاد کے لئے۔ خان صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ آج تک کسی ادارے نے اُردو کے حق میں آواز بلند نہیں کی۔ جناب نصیر خان صاحب نے جن سچی باتوں کا اظہار کیا ہے اگر ان سب کے ساتھ "مسلمان" کا اضافہ کر دیتے تو ان کا یہ فرمان سو فیصد

سمجھا تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند۔ اُردو اکادمیاں اور دیگر اردو پرستی کا دعویٰ کرنے والے مسلم ادارے اُس جُرم کے واقعی مرتکب ہیں جنکا ذکر نصیر خان صاحب نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو کے مسلمان دانشوروں نے بھی اپنے عمل سے نصیر خان صاحب کے ان فرمودات کو تقویت دی ہے۔

ہم ادب کے ساتھ نصیر خان صاحب سے گزارش کریں گے کہ کیا انھیں یہ شکایت غیر مسلم اُردو اداروں یا کسی غیر مسلم اُردو دانشور سے بھی ہے؟ اگر ہاں تو کیا وہ اُن کی نشاندہی کر سکیں گے؟ ویسے انھوں نے فراق گورکھپوری کے نام نامی اسم گرامی سے یہ نشاندہی فرمادی ہے کہ ان کا [illegible] بعد مسلمان اداروں اور مسلمان اُردو دانشوروں کی بے عملی کا ہی آئینہ دار ہے۔

غالباً غیر مسلم اُردو رائیٹرز کانفرنس لکھنؤ (جن کے کنوینر مشہور اور نامور افسانہ نگار جناب رام لعل صاحب تھے) میں نصیر خان صاحب نے مہمان اُردو پرست کی حیثیت سے شرکت نہیں فرمائی ورنہ وہ بچشم خود ملاحظہ فرما لیتے۔ اس کانفرنس میں اُردو کے حق میں اور اُردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کے خلاف کس قدر شدید احتجاج کیا گیا تھا۔ مگر کیا کیا جائے اس احتجاج کو اُن مسلمان اُردو دانشوروں نے بے کار کر دیا جنھوں نے محض ذاتی مفاد کے لئے حکومت کو یہ یقین دلایا کہ یہ واویلا محض ہوائی ہے اس سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ حکومت کو چاہئے کہ وہ مسلمان اُردو دانشوروں کو انعامات اور اعزازات کے ٹکڑے پھینکتی رہے اور اردو کو ختم کرنے کے لئے سلو پوائیزن کا استعمال جاری رکھے۔

رہی غیر مسلم اُردو دانش وروں کی فردِ واحد کی حیثیت سے اُردو کی خدمت کی بات تو اس سلسلے میں ہم "شانِ ہند" کی مثال پیش کر سکتے ہیں جو کہ محض "فردِ واحد" پر منحصر ہے اور آزادی کے بعد جو اُردو کی خدمت شانِ ہند نے کی ہے اس کا مقابلہ کوئی بھی بڑے سے بڑا مسلمان اُردو پرست ادارہ نہیں کر سکتا۔ شانِ ہند کے مطالعے سے درجنوں ہندی ادیبوں اور مصنفوں نے اُردو ادب پر درجنوں کتابیں ہندی میں تالیف و تصنیف کیں۔ یہ فخر صرف اردو شانِ ہند کو ہی حاصل ہے کہ بلا خوف و خطر حکومت کی اُردو دشمن پالیسیوں کا پردہ بالکل صاف طور پر چاک کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اُردو شاعری کی تاریخ آپ کو ماہنامہ شانِ ہند کے بیشمار صفحات پر پھیلی ہوئی ملے گی۔ اور اگر یہ خود ستائی نہ سمجھی جائے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی مسلمان اُردو دانش ور ہماری ان معروضات کی تردید کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اور اس کا انعام مسلمان اردو اداروں اور مسلمان اُردو دانش وروں کی طرف سے شانِ ہند کو یہ دیا گیا ہے کہ یہ ادارے ہر ممکن طور پر شانِ ہند اور اس کے ایڈیٹر کی مخالفت اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ کیونکہ شانِ ہند کے اداریے اور آراء اس قدر ٹھوس سچائیوں کو لئے ہوتے ہیں کہ جن کی تردید کرنا اُن کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اگر وہ اسے کھلے عام تسلیم کرتے ہیں تو پھر اُن کی اُردو پرستی اور اردو دانشوری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ شانِ ہند اور اس کے ایڈیٹر کے ساتھ اُردو مسلم اداروں اور اُردو کے مسلم دانشوروں نے جو ناانصافیاں کی ہیں یا اُسکے نقصان پہنچانے کے جو فنکارانہ حربے استعمال کئے ہیں اُن کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کم رہے گی۔

ہم اس سلسلے میں نصیر خان صاحب سے گزارش کریں گے کہ اگر آئندہ وہ اس قسم کا مقالہ لکھیں تو اُردو دشمن تحریکوں کا جائزہ محض مسلمانوں کی حرکتوں تک ہی محدود رکھیں اور اُنکی کی نشاندہی صاف لفظوں میں فرمایا کریں۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرورؔ تونسوی

بیس بائیس سال ہوئے کہ اُردو بازار (جامع مسجد) میں سربراہ مولانا ابرؔ احسنی گنوری سے ملاقات ہوئی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد ابرؔ صاحب نے اپنے ساتھی عنوانؔ چشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا سرورؔ صاحب ان سے ملیئے عرض کیا کہ میں انھیں زمانۂ طالب علمی سے جانتا ہوں حسبِ عادت ابرؔ صاحب نے میری تعریف و توصیف میں فراخ دلی کی تمام حدیں پار کرنے کے بعد (حالانکہ یہ تعریف و توصیف قطعاً جھوٹی تھی) فرمایا کہ کہیں بیٹھ کر بات چیت کریں کیونکہ عنوانؔ چشتی صاحب بڑی مصیبت میں ہیں اور میں نے انھیں یقین دلایا کہ سرورؔ تونسوی صاحب اس مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دیں گے۔ قریب ہی چائے خانہ تھا چنانچہ میں نے گزارش کی کہ آیئے ایک ایک کپ چائے بھی پی لی جائے اور یہیں بیٹھ کر بات چیت بھی ہو جائے گی۔

ابرؔ صاحب فرمانے لگے کہ عنوانؔ چشتی اور ان کے والد صاحب پر کسی نے بیکانیر میں جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا ہے اور سمن حاضری جاری کرانے کے بعد انھیں عدم تعمیل کے باعث ضمانتی وارنٹ عدالت سے جاری کرا دیئے ہیں۔ کہاں منگلور ٹاؤن ضلع سہارن پور یو پی اور کہاں بیکانیر۔ یعنی راجستھان کا آخری کونہ۔ اب یہ وہاں جانے سے گھبرا رہے ہیں کیونکہ وہاں نہ تو ان کی کوئی واقفیت ہے اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ مقدمہ کی نوعیت کیا ہے۔ ضمانت حاضری وغیرہ کا انتظام تو بہت دور کی بات ہے۔ چونکہ آپ کی راجستھان میں بہت زیادہ واقفیت ہے اس لئے میں نے ان سے کہا کہ سرورؔ ہی کوئی سبیل نکال سکے گا کہ یہ مرحلہ بخیر و عافیت طے ہو جائے۔

ابرؔ صاحب علمی۔ ادبی اور تعلیمی طور پر جیسے درسگاہ ہو سکتے تھے اس لئے میرے دل میں ان کا احترام تھا اور میں نے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام کا پوسٹ مارٹم کرنے میں ان سے کئی بار مدد لی تھی۔ لہٰذا ہمیشہ ان کا احسان مند تھا۔ چنانچہ ابرؔ صاحب کا یہ فرمان سنکر عرض کیا کہ عنوانؔ صاحب کل میرے ہاں آجائیں میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ خدا کے فضل سے ان کا کچھ بھی نہ بگڑے گا اور پہلی ہی پیشی میں یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔

ان دنوں شانِ ہند کا دفتر کرشن نگر میں تھا دوسرے دن صبح ہی عنوانؔ چشتی صاحب تشریف لے آئے اور میں نے انہیں جناب محمد عثمان عارفؔ نقش بندی ایڈووکیٹ بیکانیر کے نام ایک خط لکھ دیا۔ (جناب محمد عثمان عارفؔ صاحب نقش بندی آجکل حکومت ہند میں ہاؤسنگ اینڈ ورکس کے ڈپٹی منسٹر ہیں) عارفؔ صاحب کا بیکانیر میں بڑا اثر و رسوخ تھا ان کے والد صاحب قبلہ بیدلؔ بیکانیری سیشن جج رہ چکے تھے۔ راجستھان کے مہذب با اخلاق اور عوام میں مقبول شخصیتوں میں قبلہ بیدلؔ صاحب اور عثمان عارفؔ صاحب کا شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ تاریخ مقررہ سے ایک دن پہلے عنوانؔ چشتی نے اپنے والد صاحب کے ساتھ بیکانیر پہنچ کر میرا عریضہ جناب محمد عثمان عارفؔ صاحب کو دیا تو انہوں نے انھیں اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اور دوسرے دن تعمیل عدالتِ متعلقہ میں پیش کر کے مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں تمام قصہ گوش گزار کیا۔ مقدمہ واقعی جھوٹا تھا لہٰذا مجسٹریٹ صاحب نے بغیر کسی کارروائی کے مقدمہ خارج کر دیا اور دوسرے ہی دن یہ باپ بیٹا گلو خلاصی کرانے کے بعد اپنے گھر واپس آگئے۔ مگر اس سلسلے میں میں قطعاً بے خبر رہا۔ جناب عارفؔ صاحب نے تو اس خیال سے مجھے اطلاع نہ دی کہ میں اس کے لئے ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ اور کسی کا کام کر کے شکریہ کی امید رکھنا اس خاندان کی روایات کے خلاف تھا۔ اور عنوانؔ چشتی نے اس وجہ سے اطلاع دینی مناسب نہ سمجھی کہ کام تو ہو ہی گیا اب کیا ضرورت ہے کہ سرورؔ تونسوی کو اس کی بابت لکھا جائے اور ویسے بھی انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر کسی نے بیکانیر میں آئندہ بھی ان کے والد صاحب پر مقدمہ دائر کیا

تو اب اُنھیں سرور تونسوی کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ وہ خود ہی عارف صاحب سے یہ الفاظ خود بیانہ کا شکر کئے تھے۔

اندازاً چھ ماہ بعد بھیجہ پور میں خواجہ شاہ سلیمان تونسوی رح کے عرس کے مشاعرہ میں جناب محمد عثمان عارف صاحب سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں میں نے عنوان چشتی اور ان کے والد صاحب کے مقدمہ کے بارے میں دریافت کیا تو عارف صاحب فرمانے لگے سرور صاحب آپ کا حکم نامہ لے کر آئے تھے۔ تو ان کا کام تو ہونا ہی تھا کیا عنوان صاحب نے آپ کو اسکی اطلاع اور میرا پیغام نہیں دیا۔ میں نے عارف صاحب کا ہزار ہزار شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری عرضداشت پر عنوان صاحب کا کام کر دیا۔ مگر مجھے دل میں اس امر کی سخت شکایت کا احساس ہوا کہ عنوان صاحب نے مجھے اگر بتا دیا ہوتا تو میں اسی وقت عارف صاحب کو شکریہ کا خط لکھتا۔ اس طرح عنوان صاحب نے مجھے عارف صاحب کی نظروں میں احسان فراموش بنانے کی کوشش کی ہے۔

کچھ سالوں کے بعد ایک مشاعرہ میں عنوان صاحب سے آگرہ میں ملاقات ہوئی اُن دنوں عنوان صاحب آگرہ میں کسی پرائمری یا مڈل سکول میں ٹیچر تھے۔ حسبِ عادت عنوان صاحب نے میری تعریف میں بہت کچھ کہا تو میں نے حیرت سے مذاقاً پوچھا عنوان صاحب کہیں پھر سے تو آپ پر یا آپ کے والد صاحب پر کوئی مقدمہ دائر نہیں ہو گیا۔ تو عنوان صاحب کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوا۔ اور فوراً کہنے لگے ارے ہاں آپ کو تو میں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ بیکانیر میں عارف صاحب نے ہمارا کام کر دیا تھا۔ معاف کیجئے سرور صاحب میں آگرے چلا آیا اور آپ کے ہاں حاضری نہ دے سکا۔

اُس کے بعد عنوان صاحب دہلی آ گئے اور عنوان چشتی سے ڈاکٹر عنوان چشتی بن گئے۔ پھر مصنف ہوئے۔ ناشر بنے اور جامعہ ملیہ میں اُردو ڈیپارٹمنٹ کے رُکن کی حیثیت سے نمایاں شہرت پائی۔ ایک دن اخبارات میں ایک فوٹو گراف نظر پڑا غور سے دیکھا تو ڈاکٹر عنوان چشتی صاحب خرقہ پہنے عالیجناب گیانی ذیل سنگھ کے ساتھ کھڑے ایک مزار پر دُعا مانگ رہے ہیں (ان دنوں گیانی جب

صدر جمہوریہ ہند نہیں تھے۔) تصویر سے ملحقہ خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ منگلور نامی گاؤں میں کسی بزرگ کا مزار ہے اور ڈاکٹر عنوان چشتی اس درگاہ کے متولی ہیں۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کسی فقیر روشن ضمیر کی اولاد میں سے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کسی درگاہ کا متولی۔ گوردوارے کا گرنتھی اور مندر کا پجاری فراغ دل نہیں ہوتا کیونکہ جس نے سدا ہاتھ پھیلا کر لینا ہی سیکھا ہو وہ کسی کو کیا دے گا۔ اس پیشے کے لوگ خوشامد اور جھوٹی تعریف کرنے میں اپنا جواب آپ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں اور بھی کئی وصف ہوتے ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت مقصود نہیں ہے۔

خدا کے کرم سے ہمارے عنوان چشتی میں پیرزادوں کے جملہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کے خلاف کئی پوسٹر اور اخبارات کے تراشے ہمارے ہاں موصول ہوئے جن میں ان کی پیرزادگی اور دوسری کئی لن ترانیوں کو چیلنج کیا گیا تھا۔ مگر ہم نے ان شکایات کا ذکر شانِ ہند میں کرنے کی بجائے شکایات بھیجنے والوں کو یہی جواب دیا کہ ہم آپ کے اعتراضات اور مخالفت کو اسلئے صحیح نہیں مان سکتے کہ عنوان چشتی میں وہ جملہ صفات بہترین انداز میں موجود ہیں جو کبھی بھی متولی درگاہ یا آلِ فقرا میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے ہمارا یقین ہے کہ عنوان چشتی ہی جائز طور پر اس درگاہ کے متولی ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں دہلی کے میٹروپولیٹن کونسل میں حکومت کی طرف سے کچھ حضرات کو نامزد کیا جانا تھا۔ چنانچہ دہلی میٹروپولیٹن کونسل میں منگلور ضلع سہارنپور کے یہ متولی درگاہ حضرت عنوان چشتی دہلی کے مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر نامزدگی کے اُمیدوار تھے اور ایک چشم دید قابلِ تعظیم حضرت کا کہنا ہے کہ عنوان چشتی نے اس نامزدگی کیلئے محترمہ اندرا گاندھی کے پاؤں تک پکڑ لئے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور محترمہ وزیرِ اعظم صاحبہ نے جناب انور دہلوی صاحب کو نامزد فرما دیا۔ کیونکہ ان کی نظر دلی میں دہلی کے حالات اور خصوصاً دہلی کے مسلمانوں کے حالات و معاملات سے جس قدر انور دہلوی صاحب واقف ہیں اور کوئی نہیں۔ اگر عنوان چشتی صاحب کو یہ یقین ہو جاتا کہ اندرا جی کو سجدہ کرنے سے یہ نامزدگی ہو سکتی ہے تو یہ اُن کے پاؤں پکڑنے کے بجائے سجدہ ریز بھی ہو جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ عنوان چشتی نے محترمہ اندرا گاندھی کی تعریف میں جو کچھ کہا۔ حضرت ذوق کے وہ قصیدے بھی ماند نظر آتے تھے۔

(باقی صفحہ ۳۲ کا لمحہ ۱ پر)

مرسلۂ عقیل صدیقی

مودی کا کُل ہند مشاعرہ

شمس تبریزی

رائے بہادر گوجر مل مودی کا مشاعرہ جو ہندوستان کے چند اہم مشاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کل تلکی آڈیٹوریم میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سامعین نے سُنا۔ پاسوں کی تقسیم سے معلوم ہوا کہ بغیر پاس کے حضرات ہال میں تھے اور صاحبِ پاس باہر۔ بہر حال مشاعرہ ہندوستانی وقت پر جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے آدھ گھنٹے تاخیر سے یعنی ۸½ بجے شروع ہوا۔ دلّی کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر جگموہن کو مشاعرے کی صدارت سونپی گئی۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ مشاعرے ہماری زبان اور ہماری تہذیب کے ضامن ہیں اور ان سے اردو زبان و ادب کی ترقی ہوتی ہے۔ بہار کے وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر شمائل نبی سے بھی تقریر کے لیے کہا گیا انھوں نے کہا کہ اردو زبان مشترک تہذیب کی علامت ہے۔ اور اردو زبان ایک ایسی اعلیٰ زبان ہے جس نے دلوں کے رشتے توڑے نہیں بلکہ جوڑے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے قومی یک جہتی کو مضبوط اور استوار کرتے ہیں۔ بعد ازاں ناظمِ مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد نے شعراء کرام کے مختصر تعارف کے بعد مشاعرے کا آغاز بیکل اُتساہی سے کیا اور انھوں نے غزل کے شعر پڑھے ؎

کتابِ صحرا میں ذکر آئے جب سمندر کا
مری حیات کسی کی نگاہ لکھ لیجئے

بیکل اُتساہی کے بعد مغربی بنگال کے نوجوان شاعر منوّر رعنا کو دعوتِ سخن دی گئی اور ان کے یہ اشعار سامعین نے پسند کئے ؎

ہم سایہ دار پیڑ زمانے کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو جلانے کے کام آئے

تلواروں کی نیام کبھی پھینکنا نہیں
ممکن ہے دشمنوں کو ڈرانے کے کام آئے

منور رعنا کے شمعِ سخن بشیر بدر کے سامنے لائی گئی اور وہ اس طرح گویا ہوئے ؎

آنکھوں میں رہا دل میں اُتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مُسافر نے سمندر نہیں دیکھا
بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

بشیر بدر کے بعد ناظمِ مشاعرہ نے ایک دہلی کے گمنام شاعر ڈاکٹر حامی کے نام کا اعلان کیا اور انھوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت آمیز ہندی میں گیت پڑھا جو سامعین نے سخت برہمی کے عالم میں سُنا بعد ازاں حامی صاحب نے ایک غزل ترنم میں بھی پیش کی ڈاکٹر حامی کے کلام سے ماحول اتنا اُکھڑ گیا کہ ناظمِ مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد کو مشاعرہ دوبارہ جمانے میں بڑی محنت کرنی پڑی۔ مہاراشٹر کی ایک مہمان شاعرہ محترمہ شاہین ظفر کو دعوتِ کلام دی گئی ؎

دشتِ تنہائی جب جینے کے سہارے جل گئے
تم کو دیکھا تو کئی خواب ہمارے جاگے

محترمہ شاہین ظفر کے بعد دہلی کے رفعت سروش کا کلام سُنا گیا۔ سروش صاحب کے بعد رام پور سے آئے ہوئے مزاحیہ شاعر ہلال رضوی کا نام پکارا گیا اور انھوں نے اپنی نظموں اور قطعوں سے ماحول کو زعفران زار بنایا ایک طرح تھی دہلی کے ہی شاعر امیر قزلباش کی ؎

سجا تو لیے ہم نے دیوار و در
اُداسی ابھی تک مکانوں میں ہے

امیر قزلباش کے بعد نام لیا گیا لکھنؤ کے مشہور
شاعر نازش پرتاب گڑھی کا اور انھوں نے ایک طویل
نظم سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نازش صاحب کے بعد
دہلی کی ہی خاتون شاعرہ محترمہ جمیلہ بانو کو دعوتِ سخن
دی گئی اور ان کا یہ شعر پسند کیا گیا ؎

تیری نظر میں سموئے ہوئے حیات لگے
ترا وجود مجھے ساری کائنات لگے

جمیلہ بانو کے بعد حیات لکھنوی نے اپنی غزل پڑھی
اور ان کے بعد پھر ایک خاتون کو زحمتِ کلام دی گئی اور
یہ تھیں برکھا رانی ؎

دیکھا یہ باغباں نے تماشا لگا کے آگ
برسا رہے ہیں باغ میں جھونکے ہوا کے آگ

برکھا رانی کے بعد مزاحیہ شاعر آفتاب لکھنوی
نے اپنے کلام سے سامعین کو مزاح سے لطف اندوز کرایا
اور اب نام پکارا گیا بنگال کے ہی ایک دوسرے شاعر
حبیب ہاشمی کا جن کے یہ اشعار سامعین نے پسند کیے ؎

بے ضمیری کا تیرے سجدوں کے گنہگار نہ تھے
اس لئے شہر میں ہم صاحبِ کردار نہ تھے
دور رکھے گئے خود ساختہ تحریروں سے
اپنے اشعار شب و روز کے اخبار نہ تھے

حبیب ہاشمی کے بعد حیدرآباد کے شاعر شاذ تمکنت
کو زحمتِ سخن دی گئی اور ان کا یہ شعر سامعین نے کئی بار سنا ؎

میکدے والوں سے ملتے ہیں تو سب سے پہلے
اب بھی ہم خیریتِ بنتِ عنب پوچھتے ہیں

اب باری تھی راجستھان کی شاعرہ محترمہ ایکتا شبنم
کی اور وہ غزل سرا ہوئیں ؎

کچھ اُن کی نگاہوں کی ادا یاد نہیں
دل کیسے لٹا کیسے مٹا یاد نہیں
اک بار ملی تھیں نگاہوں سے نگاہیں
اب اور مجھے اس کے سوا یاد نہیں

اب باری تھی بزرگ شاعر آباز جھانسوی کی اور انھوں نے
غزل پڑھی کہ ؎

کچھ وہ بھی آشنائے رموزِ وفا نہ تھا
کچھ میں بھی چاہنے کی طرح چاہتا نہ تھا
کیسا شریکِ غم تھا کہ روتا تھا ساتھ ساتھ
لیکن ہمارے غم کا سبب پوچھتا نہ تھا

آباز جھانسوی کے بعد اب نام پکارا گیا ترقی پسند شاعر
علی سردار جعفری کا اور انھوں نے ایک نظم کے بعد ایک
غزل پڑھی ؎

تیغ منصف ہو جہاں دار و رسن ہوں شاہد
بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا

اب بمبئی کی مینا قاضی مائک پر آئیں اور غزل سرا....
ہوئیں ؎

دل کو جب تیری یاد آتی ہے
چاندنی جھیل میں نہاتی ہے
مرنے والوں کا سوگ مت کیجئے
زندگی کس کو راس آتی ہے

مینا قاضی کے بعد اب دعوتِ کلام دی گئی ساغر اعظمی
کو اور انھوں نے شعر پڑھے ؎

کوئی اس اندھیرے میں اک دیا جلائے
تاکہ ہر چھپا چہرہ روشنی میں آجائے

اب باری ہے وسیم بریلوی کی اور وہ غزل سرا ہیں۔

کتنی گناہگار ہے راتوں کی زندگی
دیکھو کسی چراغ کی آنکھوں میں جھانک کر

اب ناظمِ مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد نے موقع غنیمت
جان کر دو شعر پڑھے ؎

کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں دونوں میری ذات کے نام
ایک غزل منسوب ہے تجھ سے ایک غزل حالات کے نام

اب باری تھی پاکستان کی شاعرہ فہمیدہ ریاض کی اور
انھوں نے ایک طویل نظم پڑھی۔ پھر نام پکارا گیا مزاحیہ
شاعر ہلال سیوہاروی کا اور انھوں نے اپنی مشہور نظم "جوتا"
اور "غریبی ہٹاؤ" پڑھیں اور ایک مرتبہ پھر ماحول میں

تازگی پیدا کر دی۔ ہلال سیوہاروی کے بعد دہلی کی ممتاز مرزا کا نام لیا گیا اور وہ مائک پر آئیں اور غزل سرا ہوئیں ؎

کتنے طویل سلسلے وہم و گماں کے ہیں
نازک ہے دل کا آئینہ ہم دو جہاں کے ہیں

ممتاز مرزا کے بعد اب شمع سخن پہنچائی گئی شمیم جے پوری کے سامنے اور انہوں نے سامعین کے اصرار پر اپنی غزل پڑھی دو شعر آپ بھی ملاحظہ کیجئے ؎

سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ غم زندگی
اصل میں اب ہوئی ہے اہم زندگی
ڈھا رہی ہے ستم پر ستم زندگی
پھر بھی نظروں میں ہے محترم زندگی

شمیم جے پوری کی مترنم غزل کے بعد اب بزرگ شاعر تنا نظامی کان پوری کو زحمتِ سخن دی گئی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں غزل سرا ہوئے ؎

یوں انتقام تجھ سے فصلِ بہار لیں گے
پھولوں کے سامنے ہم کانٹوں کے پیار لیں گے
جانے دو ہم کو تنہا طوفانِ آرزو میں
جب ڈوبنے لگیں گے تم کو پکاریں گے

تنا نظامی کانپوری کے بعد اب مشاعرہ اپنے مقطع پر پہنچ چکا تھا اور صرف غلام ربانی تاباں باقی تھے — بہر حال ان کا نام پکارا گیا اور انھوں نے عصری حسیت سے ہمکنار غزل سنائی۔ دو شعر آپ کی خدمت میں ؎

دریا تھا یا سراب دھندلکوں میں کھو گیا
اک آسرا تھا وہ بھی سرِ شام سو گیا
پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس
ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہو گیا

رات کے تقریباً ڈیڑھ بج چکے تھے اور سامعین سے بھرا ہوا ہال اس بات کا غماز تھا کہ مشاعرہ ابھی جاری رہے۔ لیکن مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ گزشتہ دنوں کے مقابلہ میں مودی کا یہ مشاعرہ بلاشبہ ایک کامیاب مشاعرہ کہا جا سکتا ہے اور مشاعرے کرانے والی وہ دوسری انجمنیں اور تنظیمیں اس مشاعرے سے سیکھ سکتی ہیں کہ مشاعرے ہماری تہذیب اور زبان و ادب کا ورثہ ہیں اور دہلی میں جو اردو زبان کا خود ایک اسکول اور سرچشمہ ہے۔ مشاعروں کی روایت کو کس طرح بحال رکھا جا سکتا ہے۔

غزل

— ڈاکٹر شفیقہ پروین، سرینگر —

چشمۂ مہتاب سے نکلی ہے رات
چاندنی سے کیا نکھر آئی ہے رات
جلنے والی ہیں قفس کی تیلیاں
آگ کی صورت بھڑک اٹھی ہے رات
دیکھ آئی ہے نہ جانے کس کا نور
آفتاب و ماہ سے اجلی ہے رات
صبح ہونے تک عجب عالم رہا
جانے کتنے پیرہن بدلی ہے رات
دیدِ کا پروین کے مانند سُرخ
آپ نے ایسی کبھی دیکھی ہے رات

اعلیٰ تعلیم کی نصابی کتابیں

ترقی اُردو بیورو نے آندھرا پردیش کے اُردو میڈیم کے طالب علموں کے لئے انٹر/اعلیٰ ثانوی اور گریجویٹ سطح کی نصابی کتابیں تیار کروائی ہیں ان میں مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں - یہ نصابی کتابیں دوسری ریاستوں کے طلباء کے لئے بھی مفید اور کارآمد ثابت ہو رہی ہیں :-

(الف) انٹرمیڈیٹ/اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے لئے :

(۱)	ابتدائی سماجیات	محمد عبدالقادر عمادی	۱۶۴	۶-۲۵
(۲)	احصا (تفرقی اور تکملی)	محمد خواجہ محی الدین	۳۱۲	۱۱-۶۰
(۳)	الجبرا	محمد احسن اور رئیس احمد	۴۳۹	۱۵-۶۰
(۴)	اصول معاشیات	رضیہ نظامی	۳۰۰	۱۰-۰۰
(۵)	خالص جیومیٹری و تحلیلی جیومیٹری	محمد خواجہ محی الدین	۳۰۰	۴-۰۰
(۶)	طبیعیات (حصہ اول)	سدرشن راج و محمد منیر الدین	۲۵۴	۶-۶۵
(۷)	طبیعیات (حصہ دوم)	" "	۳۵۱	۸-۵۰
(۸)	علم شہریت	سلطان عمر	۲۴۷	۹-۰۰
(۹)	علم مثلث مستوی (حصہ اول)	اے۔ کے دنیش مکھ اور مسز نور حلیم	۳۳۱	۱۱-۶۰
(۱۰)	عملی جغرافیہ	محمد انعام اللہ	۱۵۲	۴-۵۰
(۱۱)	کاروباری تنظیم	مرزا صغیر احمد	۲۳۹	۸-۲۵
(۱۲)	ہندوستان کے سماجی مسائل	محمد عبدالقادر عمادی	۱۴۲	۵-۵۰

(ب) بی۔اے/ بی۔ایس۔سی/ بی۔کام کے لئے :-

(۱)	تاریخ دستور انگلستان	سید علی محسن	۳۳۲	۶-۰۰
(۲)	سکونیات	محمد خواجہ محی الدین	۲۲۸	۸-۲۵
(۳)	سماجی انسانیات	محمد عبدالقادر عمادی	۲۸۸	۹-۲۵
(۴)	سماجیات کے اصول	فاطمہ شجاعت	۲۳۲	۸-۰۰
(۵)	علم مثلث مستوی (حصہ دوم)	ایس۔ ایل۔ لونے/ ابرار حسین	۲۴۸	۸-۷۵

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ :-

شعبۂ فروخت و نمائش ترقی اُردو بیورو ویسٹ بلاک ۸، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

پہلی جنگِ آزادی کے ایک گمنام مجاہد.

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

(توصیف علوی عاصی بی ۔ اے کیرانوی)

ہماری آزادی کی جدو جہد ویسے تو بہت طویل ہے. درصدیوں میں پھیلی ہوئی ہے . تاہم آزادی کی تاریخ میں پہلی جنگ آزادی کا نام ۱۸۵۷ء کی جنگ اور تحریک کو دیا گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کے "معرکے" عوامی نہیں کہے جا سکتے. کیونکہ وہ انگریزوں کی اس وقت کی بڑھتی طاقت اور ہندوستانی حکمرانوں کے درمیان ایک کشمکش اور ٹکراؤ کی حیثیت رکھتے ہیں . حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے آزادی کی انقلابی تحریک جو فوجی اور عوامی سطح پر سامنے آئی وہ دراصل ۱۸۵۷ء کی جنگ اور معرکہ آرائی تھی . اسی لئے اسے پہلی جنگِ آزادی کے نام سے موسوم کیا گیا .

سب سے پہلے فوجی سطح پر یہ تحریک میرٹھ چھاؤنی سے شروع ہوئی جس کے سب سے بڑے محرک اور سربراہ ... منگل پانڈے نامی ایک فوجی تھے اور پھر یہ بہت جلد آگ کے شعلوں کی طرح دہلی اور دور دراز تک پھیل گئی اور لکھنؤ جھانسی اور کانپور وغیرہ بڑے شہر بھی اس کے سینٹر اور سرچشمہ بن گئے اور اس کی باگ ڈور بہادر شاہ ظفر، بیگم حضرت محل، جھانسی کی رانی اور تانتیا ٹوپے وغیرہ حکمرانوں کے ہاتھوں میں آگئی . رفتہ رفتہ اس کی جڑیں عوامی اور قومی سطح تک پہونچ گئیں اور بے شمار آزادی کے دیوانے اور حریت کے پرستار و سرفروشانِ وطن اس آگ میں کود پڑے اور اب اس دھارے نے فوجی روپ کے ساتھ "عوامی روپ" بھی لے لیا . اور طوفان بڑے بڑے شہروں کے علاوہ اندرونِ ملک چھوٹے بڑے قصبوں اور علاقوں تک پھیل گیا . جہاں آزادی کے پروانوں نے اس شمع کو اپنی اپنی " بزمِ اجتہاد " میں خونِ دل اور خونِ جگر سے روشن کیا اور بہت سے چھوٹے بڑے محاذوں پر انگریزی حکومت اور طاقت سے لوہا لیا . آزادی کی جنگ اور جدو جہد کے یہ اندرونی محاذ اور مورچے اگرچہ اس دور میں باقاعدہ لیڈرشپ کے فقدان رسل و رسائل کی کمی اور تنظیمی تحریکات عدم یکجہتی کی وجہ سے منظم اور متحد نہیں ہوسکے جو اس تحریک کی ناکامی کی.. بڑی وجہ رہی تاہم ان کے سربراہوں ، قافلہ سالاروں اور مجاہدین کی خدمات . قربانیوں اور ان کے کارناموں کی الگ سے بڑی اہمیت ہے . جسے کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا خاص طور سے دہلی کے آس پاس اور دہلی اور سہارنپور کے درمیان والے حلقہ میں بہت سے محاذوں کے سربراہوں اور مجاہدین کی جانبازیاں اور کارنامے اگرچہ نہایت ہی قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش ہیں تاہم وقت کی ستم ظریفیوں اور زمانہ کی ناقدر دانی نے ان پر گمنامی کا ایک پردہ ڈالے رکھا ہے اور انھیں بھول بھلیاں کی نذر کر رکھا ہے .

آزادی کی اس پہلی جدو جہد اور معرکہ آرائی میں جن مجاہدین کے کارنامے اور خدمات ابھی گمنامی کے پردوں کا شکار رہیں ان میں حضرت مولوی رحمت اللہ کیرانوی جیسے مجاہدِ اعظم اور " بانیِ حرمین " بھی ہیں ، جن کا کردار دہلی کے معرکوں سے لیکر شاملی اور کیرانہ کے محاذوں تک نہایت اہم اور کلیدی حیثیت کا حامل ہے . لیکن پوری طرح اور کما حقہٗ اس کو نمایاں اور آشکارا نہیں کیا گیا اور نہ مجاہدینِ آزادی میں مولانا کو پورا مقام

اور مرتب دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ہماری آزادی کی تاریخ کو حضرت مولانا امداد صابری کا شکرگزار ہونا چاہیئے جنھوں نے اپنی تصنیف "آثارِ رحمت" میں حضرت مولانا موصوف کی سوانحیات اور مجاہدانہ کارناموں کو پہلی بار روشنی میں لاکر ایک بڑا قومی فریضہ ادا کیا ہے۔

مولوی رحمت اللہ کیرانوی یوپی کے ایک دور افتادہ اور ہریانہ کی سرحد پر واقع قصبہ کیرانہ ضلع مظفرنگر کی ایک مایۂ ناز ہستی تھے۔ کیرانہ اپنی کئی تاریخی اور علمی قدروں کا حامل ہے۔ اسے پرتھوی راج چوہان کے زمانہ میں ایک چھوٹے سے راجہ کرن پال دت نے بسایا تھا اسی کے نام پر یہ موسوم ہے۔ بعد ازاں مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں یہ قصبہ نواب مقرب علی خاں جن کا شاہی دربار سے تعلق تھا ان کی جاگیر رہا ہے۔ ان کے زمانہ کی کئی تاریخی عمارتیں ایک تالاب اور کچھ عالیشان دروازے اب تک اس حقیقت کی نشان دہی کررہے ہیں۔ اسی تاریخی خاندان میں یہاں محلہ دربار میں مولوی رحمت اللہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے ان کا اپنا اور خاندان کے مکانات ابھی تک کیرانہ میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ ایک جید عالم۔ اور قادر الکلام محقق ایک عظیم مردِ مجاہد تھے انھوں نے انگریزی سامراجیت کے خلاف اپنے دور میں "جہاد بالسیف" ہی نہیں بلکہ عیسائی مشنریوں اور مسیحیت کے بڑھتے ہوئے اس زمانہ میں طوفان کے خلاف "جہاد باللسان" اور "جہاد بالقلم" بھی کیا۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائی مشنریوں اور ان کا سب سے بڑا سربراہ پادری فنڈر سے مسیحیت کی اشاعت اور پروپیگنڈہ کا بے پناہ طوفان اٹھا رکھا تھا اور اس کی چرب زبانی اور مناظرہ بازی کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے مذہبی اور فکری بحثوں اور مناظروں میں... ہندو مسلمانوں کے بڑے بڑے عالم اور پنڈت نہیں ٹھہرتے تھے اور مسیحیت کے اس بے پناہ سیلاب میں ہندوستانی عوام بہے جارہے تھے۔ تاہم مولانا رحمت اللہ اس کے خلاف

صف آرا ہوئے اور پادری فنڈر کے اس چیلنج کو قبول کیا اور اس شرط پر مناظرہ کرنے کے لیئے تیار ہوئے کہ جو فریق ہار جائیگا اسے اعترافِ شکست کے طور پر فریقِ ثانی کے مذہب کو قبول کرنا پڑے گا۔ یہ شرط مولانا کی تجویز کردہ تھی اس شرط کے ساتھ مولانا رحمت اللہ نے ایک باقاعدہ ججوں کی جیوری کے سامنے ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں مناظرہ کیا جو ان کا ردِّ نصاریٰ میں ایک عظیم معرکہ اور "جہاد باللسان" تھا۔ اس میں مسیحیت کے اس دور کے ستون پادری فنڈر کو شرمناک شکست ہوئی اور وہ معینہ شرط اور خجالت سے راہِ فرار کے طور پر ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا انگریزی سامراجیت اور مسیحیت کے خلاف یہ سب سے پہلا بڑا علمی اور لسانی معرکہ تھا جس کے وہ واحد "مجاہد" اور "فاتح" تھے۔ اس کے بعد مولانا نے انگریزوں کے خلاف "جہاد بالقلم" شروع کیا اور ردِّ نصاریٰ میں کئی معرکۃ الآرا تصانیف "ازالۃ الاوہام" "ازالۃ الشکوک" اور... اظہار الحق وغیرہ سپردِ قلم کیں۔

اس عظیم تاریخی مناظرہ اور مجاہدہ کی کامیابی اور مولانا کی علمی اور تحقیقی تصانیف نے دہلی کے علمی حلقوں اور خصوصاً لال قلعہ کے شہزادوں پر ان کی علمی قابلیت اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا سکہ بٹھا دیا اور لال قلعہ میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ گیا چنانچہ ۱۸۵۷ء میں جب میرٹھ کے مجاہدین نے جنگ آزادی کا بگل بجایا تو چونکہ مولانا کے اثرات اور تعلقات لال قلعہ اور علمی حلقوں میں پہلے ہی بڑھ چکے تھے اس لیئے اس وقت بہادر شاہ ظفر اور دوسرے مجاہدین اور اربابِ فکر و دانش کے ساتھ مولانا نے بھی جنگ آزادی کے نقشے اور حکمتِ عملی تیار کرنے میں حصہ لیا اور جنگی محاذوں میں شرکت کی ان کے دستِ راست ڈاکٹر محمد وزیر خاں اور مولوی فیض احمد بدایونی بھی آپ کے شانہ بشانہ تھے۔ چونکہ مولوی رحمت اللہ صاحب ایک دور اندیش ہستی تھے۔ انھوں نے بہت پہلے محسوس کرلیا تھا کہ جب تک انگریزی حکومت قائم رہے گی ہندوستانی عوام کا مذہب تمدن اور معاشرت برباد ہوتے رہیں گے۔ اس لیئے انھوں نے

..... پہلے ہی قلمی، فکری اور علمی محاذوں پر انگریزوں سے لوہا لینا شروع کر دیا تھا اور اب جنگی میدان میں بھی آزادی کی تحریک کے سلسلے میں بھرپور اور بطور جہاد حصہ لیا جسکی تصدیق و تائید روزنامچہ عبداللطیف سے ہوتی ہے جو اس زمانہ کی ایک خاص دستاویز ہے وہ لکھتے ہیں۔

"۳۰ر جون کو کچھ دن چڑھے نصیر آباد کے لشکر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سپہ گری کا حق ادا کیا۔ لیکن شکست کھائی اور آج ہی دن ڈھلے دو سو اہل نجیب آباد مولوی رحمت اللہ کیرانوی کی قیادت میں پہونچے اور آمادۂ پیکار ہوتے لیکن پھر واپسی اختیار کی۔ (صـ۲۲ آثارِ رحمت از مولانا امداد صابری)

مولانا رحمت اللہ صاحب کے نبیرہ اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ناظم مولانا محمد سلیم مرحوم کے پاس حضرت مولانا موصوف کے دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے زمانہ کے تحریر کردہ دو کاغذ تھے جس میں دہلی کے فوجی سپاہیوں، جمعداران اور رسالداروں کی تعداد اور ان کی تنخواہ کا ذکر ہے جو آپ کے ساتھ معرکہ آزادی میں شریک تھے۔

پہلے کاغذ میں سپاہیان ۸۶۸ تنخواہ فی کس تین روپیہ جمعدار ۱۰۰ تنخواہ فی کس ساڑھے بارہ روپیہ۔ نائب صوبیدار ۲۰ تنخواہ فی کس ۲۵ روپیہ۔ صوبیدار ۱۰ تنخواہ فی کس پچاس روپیہ اور صوبیدار بہادر ۲ تنخواہ فی کس ایک صد روپیہ دکھائی گئی ہے دوسرے کاغذ میں سواران ۸۶۸ تنخواہ فی کس دس روپیہ جمعدار ۱۰۰ تنخواہ فی کس دس روپیہ۔ نائب رسالدار ۲۰ تنخواہ فی کس ایک صد رسالدار اعلیٰ ۲ تنخواہ فی کس دو صد روپیہ کا ذکر ہے۔ (صـ۲۳ "آثار رحمت" مولانا امداد صابری)

جب دہلی کے حالات کا رخ بدلا تو جنگی حکمت عملی اور وقت کے تقاضوں کے تحت دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں مجاہدین آزادی پھیل گئے اور مختلف علاقوں اور قصبوں میں انھوں نے محاذ اور مورچے قائم کر لئے۔ چنانچہ تھانہ بھون اور شاملی، کیرانہ کے محاذوں کے سربراہ حاجی امداد اللہ صاحب اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی تھے شاملی کی تحصیل جو اب کیرانہ میں ہے اسے لوٹا گیا اور دشمن کی فوج کو کئی معرکوں میں سخت ہزیمت دی گئی اور نقصان پہونچایا گیا کیرانہ کے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد بھی اس معرکہ میں مولانا کی سربراہی میں تھی۔ شاملی کے محاذ کے بعد مولانا رحمت اللہ نے کیرانہ کو ہی اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ یہاں بھی انگریزی فوج سے ان کے معرکے ہوئے جس میں چودھری عظیم الدین۔ مولانا کے بھائی حکیم، اکبر علی۔ شیخ فرید الدین اور شیخ حمید الدین۔ نمایاں مجاہدین میں تھے۔ اس زمانہ میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم اور تربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا اور یہ اعلان ہوتا تھا کہ "ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا"

تاہم جب ہماری آزادی کی اس پہلی جنگ کا پانسہ پلٹا تو دہلی اور دوسرے بڑے مرکزوں کے ساتھ ساتھ علاقائی مورچوں کے حالات نے بھی پلٹا کھایا اور ان کے رخ بھی بدلنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ کیرانہ میں بھی انگریزی فوج اور توپ خانہ داخل ہو گیا۔ محلہ دربار کے دروازہ کے سامنے توپ خانہ نصب کیا گیا اور فوج نے محلہ دربار کا محاصرہ کر کے قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا ہر گھر کی تلاشی لی گئی عورتوں اور معصوم بچوں تک پر ظلم ڈھائے گئے۔ اصل نشانہ مولانا رحمت اللہ تھے وہ اس وقت دربار والی مسجد کے ایک حجرہ میں روپوش تھے جب انھیں فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ نے اس حجرہ کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کیرانہ کے ایک قریبی گاؤں پنجیٹھ میں پہونچ گئے یہاں بھی آپ کی تلاش میں کثیر تعداد میں فوج پہونچ گئی اور اس نے چاروں طرف سے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اس گاؤں کے مکھیا ہی چودھری عظیم الدین تھے جو مولانا کے ساتھ معرکوں میں شریک رہ چکے تھے۔ انھوں نے مولانا کو گاؤں کے کچھ دوسرے دیہاتیوں

کے ساتھ "دیہاتی جوٹ" باندھکر اور کھرپا لے کر گھاس کھودنے بھیجدیا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیئے کہ انگریز فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑنے والی کنکریاں مولانا کے جسم پر لگیں مگر مولانا پر کسی کی توجہ اور نظر نہیں گئی۔ جب مولانا گرفتار نہ ہوسکے تو انگریز فوج نے گاؤں کے دوسرے چودہ اشخاص کو گرفتار کرلیا۔ مولانا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کی جان بچانے کے لیۓ خود کو پیش کرنے کا ارادہ کیا مگر ان کے فدائی چودہری عظیم الدین نے کہا کہ چودہ آدمی کیا اگر پورا گاؤں بھی پھانسی پر لٹکادیا جائے تو بھی آپ کو فوج کے حوالے نہیں کیا جاسکتا بعد میں مولانا کی پیشین گوئی کے مطابق وہ لوگ بھی کچھ دنوں کے بعد رہا ہوگئے۔ اس طرح حضرت مولانا نے اس معرکہ میں بھی.. کامیابی حاصل کی اور انگریز کے چنگل سے بچ گئے۔ چونکہ قدرتِ خداوندی کو ابھی مولانا سے اور کام لینا تھا اس لیۓ وہ شدہ شدہ ہجرت کرکے "سورت" کے راستہ مکہ معظمہ پہونچ گئے۔

حضرت مولانا کی ہجرت کے بعد آپ کی اور آپ کے خاندان کی بہت بڑی جائیداد جس میں وسیع قطعات زمین۔ سرائیں اور مکانات وغیرہ لاکھوں روپیہ کی ملکیت تھی۔ ضبط کرکے چند سِکّوں میں نیلام کردی گئی — مزروعہ زمینیں اور زراعتی قطعات اس سکنائی جائداد کے علاوہ تھیں جو بحق سرکار ضبط ہوئیں۔

مولانا کے عرب پہونچنے سے پہلے پادری فنڈر اپنی شکست کے بعد بھاگ کر اتفاق سے وہیں پہونچا تھا۔ اور وہاں بھی وہی مسیحیت کا چیلنج اور اپنی جادو بیانی کا طلسم جگا رکھا تھا اور عرب علمار بھی اس کی جادوگری سے پریشان تھے۔ آخر کار خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز کو اس حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ علم و تحقیق کے مجتہد اور مردِ مجاہد جس نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مناظرہ میں اسے شکستِ فاش دے رکھی ہے ہجرت کرکے مکہ معظمہ میں آگئے ہیں۔ تو اس نے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کو شاہی مہمان کی حیثیت سے بلایا اور پادری فنڈر کے "چیلنج" کو ایک بار پھر قبول کرنے کی درخواست کی لیکن فنڈر مولانا کی آمد کی اطلاع پر پہلے ہی وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ بہرحال خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالعزیز مولانا کی بے مثال علمی قابلیت اور ان کے مجاہدانہ عزم و عمل سے بہت متاثر ہوا اور ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور....

"پایۂ حرمین" کے خطاب سے نوازا۔ نیز شاہی کتب خانہ کا مہتمم بنادیا۔ مگر مولانا جیسے مردِ مجاہد اور خادمِ علم و فکر کو شاہی ملازمت کیسے پسند ہوسکتی تھی چنانچہ یہ منصب اپنے ایک عزیز مولوی عبدالجلیل کے سپرد کرکے مکہ معظمہ لوٹ آئے اور خود کو "پاسبانی حرم" کے لیے وقف کردیا اور مکہ شریف میں ہی علم و تحقیق کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جو آگے چل کر "مدرسہ صولتیہ" کے نام سے مشہور ہوا اور آج بھی عرب دنیا کا ایک بڑا علمی مرکز اور دار العلوم ہے اور جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ایک عظیم الشان یادگار ہے۔ یہ ادارہ حجاز مقدس میں ایک بڑا بلند پایہ علمی اور دینی چشمۂ فیض ہے۔ اور چونکہ مولانا کو ہندوستان سے گہری اور پیدائشی نسبت ہے اور ہماری جہدِ آزادی میں ان کا ایک بڑا حصہ اور مقام ہے اس لئے اس ادارہ پر ہمیں بھی بجا طور پر فخر و ناز ہے۔ اس ادارہ کا انتظام آج تک بھی مولانا کے خاندانی افراد کے ہاتھوں میں چلا آرہا ہے آج کل اس کے مہتمم اعلیٰ اور سربراہ حضرت مولانا شمیم ہیں جو علمی دنیا کی بڑی جلیل القدر ہستی ہیں۔

اس مجاہدِ اعظم اور ہماری پہلی جنگِ آزادی کے ایک عظیم کاروانِ سالار نے مکہ معظمہ میں ہی وفات پائی۔ اور وہیں جنت المعلیٰ میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کی معرکہ آرائیوں،

اس مرد مجاہد کا بڑا گرانقدر اور ناقابل فراموش کردار رہا ہے اور صحیح معنوں میں ان کی خدمات اور قربانیاں ہماری تاریخ آزادی کا ایک اہم جزو ہیں۔ مگر وقت کی ستم ظریفی اور زمانہ دوراں کی اس بے توجہی پر بڑا افسوس ہے کہ ان پر ایک مدت مدید تک پردہ پڑا رہا اور زمانہ ان کی خدمات سے ناآشنا رہا تقریباً ایک صدی کے بعد جناب مولانا امداد صابری نے ۱۹۶۶ء میں اپنی تصنیف "آثار رحمت" کے ذریعہ ان کو جلا اور روشنی دی اور مولانا رحمت اللہ کے مجاہدانہ اور انقلاب پسندانہ کارناموں سے علمی دنیا کو روشناس کرایا لیکن پھر بھی مولانا کی ذات گرامی اور ان کی خدمات پر ارباب دور اندیش کما حقہ توجہ نہیں دی۔ ضرورت ہے کہ ان کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور ان کی شایان شان یادگار قائم کی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بہتر رہے گا کہ ان کا...... "کاشانۂ رحمت" جو کسی نہ کسی صورت میں ابھی تک موجود ہے وہ ہمارے لئے ایک تاریخی اور بابرکت شے ہے۔ اُسے "آثار الصنادید" قرار دے کر اس میں علم و تحقیق کا کوئی ادارہ قائم کیا جائے اور دہلی، سہارنپور رود جو مولانا کی سربراہی میں ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے موقع پر پرچم بلند ہوئے اُس کا نام بلا تکلف "رحمت اللہ شاہ راہ" رکھا جائے۔ جیسا کہ اپریل ۱۹۸۰ء میں دہلی مولانا موصوف کا یادگار سیمینار منعقد ہوا تھا۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کے دانشور اور ارباب فکر و نظر کے بھاری اجتماع میں یہ تجاویز اور قرار دادیں پاس بھی کی گئی تھیں۔

غزل

اُمّ ہانی
اقبال منزل لکھنؤ

زندگی سے جو پیار کرتے ہیں
موت کو ہمکنار کرتے ہیں

تیری جنت میں آ گئے لیکن
معصیت ہی کو پیار کرتے ہیں

مجھ سے نظریں ملا کے کہتے ہیں
یوں حیا آشکار کرتے ہیں

ہم کسی زلف و رخ کی نسبت پا کر
شرح لیل و نہار کرتے ہیں

شوق سے کیجئے برباد ہمیں
ہم تباہی سے پیار کرتے ہیں

دل کو ملتا نہیں سکون و کیف
تذکرہ ہم ہزار کرتے ہیں

وہ ہمیں معتبر نہیں کہتے
جن پہ ہم اعتبار کرتے ہیں

ان کی معصوم بے وفائی پر
پیار آتا ہے پیار کرتے ہیں

گل کی زینت کلی کی شوخی پر
ہر خوشی کو نثار کرتے ہیں

وہ نگاہیں کبھی تو بدلیں گی!
وقت کا انتظار کرتے ہیں

دکھ کے چہرے پہ آج کل ہم لوگ
سکھ کی شکنیں شمار کرتے ہیں

اپنے کرتے ہیں جب کبھی اپنوں پر
کتنا بھرپور وار کرتے ہیں

کون بتلائے عشق میں ہانی
جبر کیوں اختیار کرتے ہیں

نظم ـــ وزن ـ عروض

ڈاکٹر زار علامی

نظم اور نثر میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ نظم کا آہنگ کسی نہ کسی دُھن یا لَے کے نظامِ ترتیب کا پابند ہوتا ہے اور نثر اس خصوصیت سے مبّرا۔

کسی دُھن یا لَے کا صوتی نظامِ ترتیب ایک خاص قاعدہ کے زیرِ اثر ہے اور یہ صوتی نظام صوتی کیفیت کے اعتبار سے ایک خاص آہنگ رکھتا ہے۔ اسی آہنگ کو وزن کہا جاتا ہے۔

بعض اوزان بہ اعتبارِ صوتی نظام ایک دوسرے سے اتنی مشابہت رکھتے ہیں کہ ایک آہنگ کو دوسرے آہنگ سے پہچاننا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔

مثلاً :- دل ایک ہی فتنہ ہے لیکن بیدار نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہاتھ میں کس بل لاکھ سہی تلوار نہیں تو کچھ بھی نہیں

بظاہر دونوں مصرعوں کا آہنگ ملتا جلتا ہے۔ مگر دونوں مصرعے مختلف بحروں میں تخلیق ہوئے ہیں۔ پہلا مصرع بحرِ متدارک میں ہے، جب کہ دوسرا مصرع بحرِ متقارب میں بگڑ دو بتا ہے۔

جملوں کی طرزِ ادائیگی اور مختلف مقامات پر وقفہ کا دیا جانا وزنِ شعر کے تعین میں ایک خاص اور اہم رول ادا کرتا ہے۔

ذیل میں دیکھئے :-

ع چند پھولوں میں ابھی بوئے وفا ہے تو سہی

وقفہ وقفہ وقفہ

پہلی صورت - چند پھولوں | میں ابھی بو | ئے وفا ہے | تو سہی

دوسری صورت - چند پھو | لوں میں [illegible] | [illegible] وفا | ہے تو سہی

دونوں صورتوں میں مختلف مقامات پر دیئے گئے وقفوں اور طرزِ ادائیگی کے سبب وزن میں فرق پڑ گیا۔ جس کے سبب یہ مصرع دو مختلف بحروں میں موزوں ہو گیا۔

الفاظ کو کھینچ کر پڑھنے اور نہ پڑھنے سے بھی وزن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر ہم مذکورہ مصرع کی پہلی صورت میں "میں" کے عوض (م ابھی بو) اور "ہے" کے عوض (ءِ وفا ہے) اور (تو) کے عوض (ت سہی) پڑھیں گے تو وزن میں تبدیلی آجائے گی۔

اسی طرح اگر دوسری صورت میں بھی انھیں مقامات پر تخفیف سے کام لیا گیا تو وزن میں فرق آجائے گا۔

طرزِ ادائیگی اور اضافی تبدیلیوں کو کسی قاعدہ کے بغیر ذہن میں رکھنا سخت مشکل تھا۔

لہٰذا اسی ضرورت کے پیشِ نظر عروض ایجاد کیا گیا۔ اور صوتیاتی تموّج کو ارکان کی گرفت میں لے لیا گیا۔ بالفاظِ دیگر ہمارے سامنے افاعیل یعنی ارکانِ عشرہ کی شکل میں ایک ایسا پیمانہ ہے جس کے ذریعہ دو مصرعوں کے صوتیاتی تموّج کا آپس میں مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ تال سم سے بھی ضرورت پوری ہو سکتی [illegible]۔ [illegible] شعر میں تال [illegible] کا تعداد نہیں مگر [illegible] دونوں مصرع مختلف بحروں میں تخلیق [illegible]۔ [illegible]

موزونی طبع [illegible] اور اس کی اہمیت اپنی [illegible] کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ عروض کو [illegible] فضول چیز سمجھ لیا جائے۔

استاذی حضرت [illegible] آبادی ... آپ نے فرمایا کرتے

تھے کہ عروض سے واقفیت ایک اچھے شاعر کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ وہ حقیقی وزن کا تعین کر سکے اور ہر وزن سے بحسن و خوبی کام لے سکے۔ جو لوگ اس سے نا واقف ہیں ان کے کلام میں ہمیشہ نہ سہی لیکن کسی وقت بھی بے راہ روی کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ اُن کا یہ فرمانا کہ موسیقی یعنی "ترنم برائے شعر ہے اور شعر بر بنائے عروض برائے ترنم ہے" ایک جامع قول ہے۔

عروض وزن شعر اور تناسب اجزائے صوت کا ایک ایسا آئین ہے جس میں ہر لفظ کی ایک اہمیت ہے۔ اس علم سے حاصل وزن ہوتا ہے اور باہمی تناسب و تخالف اور تصرفات پسندیدہ و ناپسندیدہ دریافت ہوتے ہیں۔ لہذا عروض اُسی شعر کو موزوں قرار دیتا ہے جس کے دونوں مصرع بہ اعتبار کیفیت اور کمیت برابر کے ہوں۔ اس فن میں حروف متحرک و ساکن کا نظام ترتیب خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس علم کا موجد ابو عبد الرحمٰن الخلیل بن احمد بصری ہو چکا ہے۔

حرفِ متحرک :- وہ حرف ہے جس پر اعراب (زبر۔ زیر۔ پیش) میں سے کوئی ایک ہو۔ مثلاً۔ دِل۔ سَر۔ دِل کی دال پر زیر ہے اور سَر کے سین پر زبر ہے۔ زبر والے حروف کو مفتوح۔ زیر والے حروف کو مکسور اور پیش والے حروف کو مضموم کہتے ہیں۔"

نوٹ :- یاد رکھئے کہ (آ) میں دو الف ہوتے ہیں۔ پہلا الف متحرک ہوتا ہے اور دوسرا الف ساکن۔ مشدّد میں پہلا حرف ساکن اور دوسرا حرف متحرک ہوتا ہے۔ مثلاً عِزّت۔ عِ ز ْ زَ ت۔

حرفِ ساکن :- حرفِ متحرک سے مختلف یعنی جس پر زیر۔ زبر۔ پیش۔ میں سے کوئی بھی نہ ہو۔

صوتیاتی توجہ کو گرفت میں لینے کے لئے صوتی اکائیاں کی گئیں۔ ان صوتی اکائیوں کی ترتیب سے ارکان قائم کئے گئے اور ان ارکان کو مستقل طور پر فرض کر لیا گیا۔

ان ارکان کی تکرار یا تکرار و ترتیب سے دائرے وضع کئے گئے جن سے مختلف بحور کا اخراج کیا گیا اور حقیقی بحر اُسی بحر کو تسلیم کیا گیا جو کسی دائرے سے نکلی ہو۔

نوٹ :- آئندہ مضمون میں صوتی اکائیوں اور ارکان پر روشنی ڈالی جائے گی۔ /

غزل

ڈاکٹر گوپال کرشن شفق

یہ کس گلشن میں میرا آشیاں ہے
اِک اِک پتّا فنا کی داستاں ہے

نگاہوں سے مری سب کچھ عیاں ہے
خموشی میں نہاں سب داستاں ہے

ازل ہی سے بھٹکتا پھر رہا ہوں
بتاؤں کیا میری منزل کہاں ہے

ہمارے دل کی نہ گلشن کی تمنّا
ہمارا دل قفس میں شادماں ہے

یہ کس کا نور پھیلا ہے زمیں پر
پئے تسلیم خم کیوں آسماں ہے

کرشمہ کیا کیا اہلِ جنوں نے
گریبانِ خرد کیوں دھجیاں ہے

شفق ... ہے جس کو خونِ دل سے
میری محبوب وہ اردو زباں ہے

(بقیہ صفحہ کالم ۲ سے آگے)

جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں کہے تھے۔ مگر اندرا گاندھی صاحبہ دل کی آواز اور خوشامد کی جھنکار کا فرق بخوبی سمجھتی ہیں۔

اسلئے عنوان چشتی صاحب کیخلاف پوسٹر اور اخبارات کے تراشے اوپر اسلئے بھجوانے والے حضرات سے دوبارہ التماس ہے کہ وہ عنوان صاحب کی روزی روٹی میں کیوں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

ہندوستان کی مقبول وزیر اعظم

محترمہ اندرا گاندھی

کے بیس نکاتی پروگرام کی کامیابی ہی ملک۔ ملک کے عوام اور ملک کی آزادی کے تحفظ کی ضامن ہے۔

آئیے

ہم سب آزادی کے مبارک دن یہ عہد کریں کہ ہم سب وزیر اعظم صاحبہ کے بیس نکاتی پروگرام کو دل وجان سے کامیاب بنائیں گے۔

ایس چند پیارے لال

APEE JAYPLACE

پرگتی بھون۔ جے سنگھ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

فون 311728 — 311706

سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں

دہلی کے فروغ کے لئے ۲۵۰ کروڑ روپے

غریبوں کی خوشحالی کی اسکیموں کے عمل درآمد پر خصوصی توجہ

دہلی انتظامیہ نے باشندگان دہلی، خاص کر گندی اور باز آباد کاری بستیوں، شہری گاؤں اور دیہاتی علاقوں وغیرہ میں رہنے والوں کی زندگی میں ہر جہت بہتری لانے کیلئے جامع اسکیمیں بنائی ہیں ان سہولیات عامہ اور سماجی خدمات کے مہیا کئے جانے پر خاص دھیان دیا گیا ہے۔

اہم خصوصیات

بیس نکاتی پروگرام کے تحت اسکیموں کیلئے ۹۵٫۷۳ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ۶۸٫۴۴ کروڑ روپے صرف درج فہرست ذاتوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوں گے یعنی اس طرح سالانہ بجٹ کا ۳۸ فیصد حصہ غریب تر اور سماجی و اقتصادی طور سے پچھڑے لوگوں کی حالت سدھارنے کے لئے خرچ کیا جائے گا۔

اہمیت کے اعتبار سے اہم سیکٹروں کے مصارف اس طرح ہیں :-

- رہائشی تعمیرات و شہری فروغ پر ۴۷۴۲ لاکھ روپے
- بجلی پر۔ ۳۷۴۳ لاکھ روپے
- ٹرانسپورٹ و مواصلات پر۔ ۳۶۴۰ لاکھ روپے
- پانی کی فراہمی پر۔ ۳۳۷۵ لاکھ روپے
- تعلیم پر۔ ۳۲۷۰ لاکھ روپے
- طبی سہولیات و صحت عامہ پر۔ ۲۵۹۸ لاکھ روپے
- سیلاب کنٹرول پر۔ ۱۰۹۰ لاکھ روپے
- صنعتوں کے فروغ پر۔ ۸۱۴ لاکھ روپے

کچھ اہم اسکیمیں :-

- نئے پل : ایک بین صوبائی بس اڈا کشمیری گیٹ کے نزدیک نئے جمنا پر ایک ذخیرہ کے پاس ریلوے لائن پر۔
- کناٹ پلیس میں زمین دوز گزرگاہیں اور راستے۔
- ایک انجینئرنگ کالج اور تین پالی ٹیکنکوں کا قیام۔
- دس نئے ماڈل اسکولوں کا قیام و ۳۲ اسکولوں کا درجہ بلند۔
- دیہی علاقوں کی طالبات کیلئے ٹرانسپورٹ کی سہولیات مفت
- گیارہ لاکھ ۵۰ ہزار روپے کی لاگت سے اسکولی عمارات کی تعمیر کا زوردار پروگرام۔
- مہارانی باغ میں خواتین کیلئے پالی ٹیکنک کے دوسرے مرحلے کی تعمیر۔
- موٹر ڈرائیونگ اسکول کا قیام۔
- شاہدرہ اور ہری نگر میں ۵۰۰ بستروں والے اسپتالوں کی تعمیر۔
- منگول پوری اور کھچڑی پور میں ۱۰۰ بستروں والے دو اسپتال زیر تعمیر۔
- اسکولی طبی جانچ اسکیم کے تحت بیس نئے کلینک۔
- اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے لوگوں کو آسان قسطوں پر بیس ہزار مکانات الاٹ۔
- ایک نئی خوردنی اشیاء کی جانچ کی لیبوریٹری۔
- شمالی شاہدرہ میں ۱۰۰ ایم جی ڈی صلاحیت والا پانی صاف کرنے کا پلانٹ
- سیلاب کنٹرول اقدامات میں اضافہ۔
- پٹ پڑ گنج میں ۹ فنکشنل صنعتی بستیاں۔
- رانی جھانسی روڈ پر ۵۸۹ فلیٹڈ فیکٹریوں کا کثیر منزلہ کمپلیکس
- نریلا میں ایک بڑا صنعتی کمپلیکس۔

چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ اور سبزی کی پیداوار پر خاص توجہ دی جا رہی ہے

دہلی انتظامیہ غریبوں کی بہبودی اور ملک کی سالمیت و اتحاد کے لیے سرگرم عمل ہے
آیئے، ہم سب اس قومی کام کی تکمیل اور تعمیر میں حصہ لیں۔

جاری کردہ۔ محکمہ اطلاعات و اشاعت، دہلی انتظامیہ دہلی

ڈی۔آئی پی/پبلسٹی ۸۳/۱۲

پروین شاکر کی غزل

قمر الزماں

"کچھ کم گو سش کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں (سوائے) بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ چڑیوں کے گیتوں اور اس کے اپنی سرگوشیوں کے سوا اور کچھ نہیں"
مگر یہ ہے کون؟ میں نے اپنے دوست سے پوچھا جن کا پیشہ سپہ گری ہے اور مشغلہ ادب دوستی انہوں نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پروین شاکر کا مجموعہ کلام "خوشبو" ہے اور یہ اقتباس وہ اسی سے پڑھ کر سنا رہے تھے، اگلے روز انہوں نے کتاب مجھے دے دی۔

جوں جوں اس کی ورق گردانی کرتا گیا میرا یہ خیال توی تر ہوتا گیا۔ کہ اردو غزل میں جو آئین دلی دکن سے لے کر آج تک نافذ تھا اور جس کے نمایاں خد و خال مرد کا عاشق اور عورت کا محبوب ہونا تھا۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے وہ آئین یکسر منقلب ہو گیا ہے کیونکہ ہماری کلاسیکی روایت کے خلاف پروین شاکر نے مرد کو محبوب بنا لیا۔ اساتذہ غزل کے ہاں رقیب روسیاہ جو ہمیشہ مرد ہوتا تھا یہاں ایک عورت ہے۔ یہ انقلابی کارنامہ اردو غزل میں "سنگ میل" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اظہار عشق مرد کی بجائے عورت کی طرف سے ہونا گو ان کی نئی یہ روایت ہندی شاعری کی ہے۔ اردو شاعری اس قسم کے جذبات سے نابلد تھی یا پھر ہمارے شعراء نے اس مملکت پر کچھ اس طرح سے اپنا سکہ جمایا ہوا تھا کہ مردانہ جذبات و احساسات کے سوا کوئی دوسرا احساس اس میں جگہ نہ پاسکتا تھا

اردو زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانوں میں بھی نسوانی جذبات و احساسات کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا۔ چونکہ ہماری یہ روایت نہیں ہے لہذا اس کا سامان کیجیے۔ یہ آئین نسوانی تقدیر بن کر نافذ رہا کہ جذبات صرف مردوں کے سینے میں ہی موجزن ہو سکتے ہیں۔
فارسی میں قرۃ العین طاہرہ اور انگریزی میں EMILY BRONTE نے کم و بیش نسوانی جذبات کا اظہار کیا لیکن وہ صرف ذاتی احساسات تک ہی محدود رہے اور ہمہ گیر حیثیت کے حامل نہ بن سکے۔ مگر.....
پروین شاکر جن نسوانی جذبات کا اظہار کرتی ہیں جس طرح اپنے محبوب کی جدائی اور اس کی بے رخی پر مغموم ہیں اس سے پہلے اردو شاعری میں نہیں دیکھا گیا تو باور کیا جانا چاہیئے کہ وہ جذبات جو صدیوں سے دل و دماغ میں موجزن تھے اب بے اختیار پھوٹ رہے ہیں۔
ہماری کلاسیکی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت صرف چاہے جانے و محبت کیے جانے کی خوگر ہے۔ وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو ہر طرح کے لطیف جذبات سے عاری ہے۔ ہمارے شعراء اور ادباء کا یہ رجحان۔ یہ طرز فکر غیر حقیقی بھی تھا اور غیر منطقی بھی۔ لیکن عورت اپنی اس حق تلفی پر بھی صابر و شاکر رہی تا آنکہ اسے پروین شاکر کی زبان مل گئی۔ جذبات پروین شاکر کے نہیں، بلکہ پوری نسوانی دنیا کے ہیں جو اس کی زبان اس کے دل و دماغ اور اس کے قلم کے توسط سے اپنے ایک راہِ اظہار تلاش کر سکے۔
یوں تو ہماری شاعری میں ریختی بھی لکھی گئی مگر شاعری نسوانی جذبات کا اظہار ہوتے ہوئے بھی "دو زن" سے گزر کر "بیوا پن" کی غماز ہے۔ بلکہ زیادہ تر بیہودہ استعمال کرتے ہوئے اخلاق سے عاری عورتوں کی بازیگر

جن میں سفلی جذبات کا بھرپور اظہار ہے جو زبان، طرزِ ادا اور نفسِ مضمون ہر لحاظ سے ثقہ طبائع پر گراں گزرتا ہے، اردو شاعری کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔

پروین شاکر کی معطر مغفی اور مرصع غزل کو ان کے رو برو کرنا مقصود نہیں بلکہ تعفن اور "خوشبو" کا تفاوت بدرو اور کوثر و تسنیم کا بُعد سفلی جذبات اور اعلیٰ و ارفع محسوسات کا فرق واضح کرنا مقصود ہے۔

ادب میں ایک رجحان نرگسیت کے نام سے موسوم ہے جسے غالباً فرائڈ نے ادب میں رواج دیا۔ نرگسیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ فرد کا جذبہ محرکہ "لبیڈو" اپنی انا پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ یہ خود پرستی اسے اپنی ذات کا عاشق بنا دیتی ہے، دیوانہ وار اپنا ہی عاشق بن کر اور اپنے نفس کا آئینہ بنا کر اس میں اپنے جلوہ سے محظوظ ہوتا رہتا ہے اپنی اعلیٰ و ارتفاع یافتہ صورت میں اس کے زیر اثر فن و ادب کے لازوال شاہکار تخلیق کئے گئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں سودا اور شبلی دونوں کے ہاں نرگسیت کا رجحان کارفرما ہے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا ابوالکلام کو اور سلیم اختر نے منٹو کو نرگسیت کا مریض قرار دیا ہے۔ یہی رجحان ہمیں پروین شاکر کے ہاں بھی نظر آتا ہے ؎

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے
میں اُس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی
کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ باپ، بیٹی، ماں، بیٹے اور بہن بھائی کی محبت کبھی غزل کا موضوع نہیں رہی۔ بلکہ غزل کا موضوع ہمیشہ سے وہ محبت رہی ہے جس کے تقاضے جنسی اور جسمانی ہیں مگر غزل کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جنسی جذبات حسن جذباتی تہذیب سے بیان ہوتے ہیں، یہاں جنس پسِ منظر میں چلی جاتی ہے۔ پروین شاکر کے بعض اشعار کے خوردبینی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے ایک بے چین جسم کی فطری خواہشیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ لیکن ان کا اظہار حسن جذباتی ترفع سے ہوا ہے وہ بارِ خاطر نہیں ہوتا بلکہ باعثِ فرحت و انبساط ہے ؎

خوشبو ہے چاندنی ہے لب جو ہے اور میں
کس بے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے

خوشبو، چاندرات اور لبِ جو لطیف جذبات کے شدید محرک مانے جاتے ہیں۔ تو اگر پروین شاکر ان کا ذکر کر بیٹھے تو اس میں خلاف فطرت تو کوئی بات نہیں ہے ؎

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب اُن کو ہم آئے

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

برسات کا موسم مشرقی ممالک میں ہمیشہ سے خوش فعلیوں کا محرک رہا ہے ؎

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا اس سے نہ بولوں

جہاں ساری جذباتی کیفیات ختم ہو جاتی ہیں وہاں اظہارِ حقیقت کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ اس میں یہ نکتہ بھی پنہاں ہے کہ پروین شاکر کی شاعری تخیل کی کارفرمائی ہوتے ہوئے بھی زندگی سے بہت قریب ہے اور اس کے قدم ہمیشہ زمین پر جمے رہتے ہیں۔ زندگی سے قریب کا اظہار جا بجا اس کے اشعار میں موجود ہے ؎

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اُس گھر کا دروازہ ہوا
ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اُس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہوا

تیرا خیال کر کے میں خاموش ہو گئی
ورنہ زبانِ خلق سے کیا کیا نہیں سُنا

وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہو گئی
کیا عمر تھی کہ رات ہوئی اور سو گئے

رقیبِ روسیاہ کا ذکر ایک نئے پہلو سے ملاحظہ ہو ؎

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کسی سے روٹھ سکوں گی کیسے مناؤں گی
جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کو بھول جاؤں گی

"ECSTACY" کے عنوان سے جو چند شعر لکھے گئے ہیں ہر چند وہ غزل نہیں مگر رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہے، غزل کی اساس بھی تو وہی انتہائی شدید جذباتی کیفیات ہیں جو جسمانی تقاضوں سے ہر طرح ہم آہنگ ہیں مگر بڑی وضعداری کے ساتھ بازوؤں کے سخت حلقے میں مسلے جانے کی آرزو، نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ۔ ریشمیں بانہوں میں چوڑیوں کی مدھم کھنک اور ان لمحوں کے منجمد ہو جانیکی آرزو بڑی معصوم آرزو ہے مگر بڑی ہیجانی کیفیت کی غماز، کبھی کبھی تو اس میں مادام بواری کی بے چین انگڑائیاں صاف جھلکتی معلوم ہوتی ہیں ؎

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر، آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہوا
گرمیٔ رخسار سے دہکتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم انگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سُرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں بانہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دُعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں ٹھہر جائیں ذرا!

پروین شاکر جس روایت کی بنا ڈال رہی ہیں اس کی قدر کیا جانا چاہئے کیونکہ ادب ایک سماجی فعل (CTIVITY) ہے جس میں استمرار پایا جاتا ہے اور اس کا انقطاع باوجود کوشش کے ممکن نہیں لیکن اس روایت کا تواتر بھی پروین شاکر کے وسیع مطالعہ سے ہی ممکن ہے ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور شاید اسی بات کا اثر ہے کہ انہوں نے غزل کے مقطعوں میں کہیں بھی اپنا تخلص استعمال نہیں کیا۔

پروین شاکر کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ ان کے بے شمار اشعار میں "قوتِ لامسہ" کا احساس ہے۔ شاید اس کی نفسیاتی توجیہہ ہم یہ کر سکیں کہ جذبات نے جب وسیلۂ اظہار تلاش کر لیا تو پھر اس میں لذتیت شعوری یا غیر شعوری طور پر راہ پا گئی ؎

اُن انگلیوں کا لمس تھا اور میری زلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

یا رب میرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہنر کو حوصلۂ لب کشائی دے
رگ رگ میں اُس کا لمس اترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے انتہائی دے

پروین کو انتہائی شدید جسمانی اور جذباتی کیفیات سے لگاؤ ہے اس سے صاف جھلکتا ہے کہ یہ ایک انتہا تک دبے رہنے کے بعد (WORLD سے کم از کم وقت میں لینا چاہتی ہیں ؎

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

دل اُسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے
جی یہ چاہے کوئی پھر توڑ کے رکھ دے
لذتیں ایسی کہاں ہوں گی تھکن میں اب

غالب نے جہاں دل و دیدہ کی رقابت کا ذکر کیا تھا وہاں پروین شاکر ذہن و بدن کی خانہ جنگی کی بات کرتی ہیں اور جہاں وہ سوزِ غمہائے نہانی کا ذکر اٹھاتا تھا اس کی جگہ یہاں بدن کو توڑ کر رکھ دینے کی خواہش ہے۔ چونکہ قوتِ لامسہ کسی قسم کی شدت کی حامل نہیں لہٰذا یہاں صاف صاف بات ہو رہی ہے " MAROCHISM " کی تو یہاں بھی صدیوں سے بوجھ کا حساب چکایا جا رہا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی زیورِ کلام اور محاسنِ شعری شمار ہوتے ہیں یہاں صرف حسنِ تشبیہ کا ذکر کیا جاتا ہے ؎

پھر مرے شہر سے گزرا ہے وہ بادل کی طرح
دستِ گل پھیلا ہوا ہے مرے آنچل کی طرح
بل کے اُس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اُٹھتی ہے نظر پاؤں کی چھاگل کی طرح
پاس جب تک وہ رہے درد تھما رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح

مرے ماتھے پہ ترے پیار کا ہاتھ
روح پر دستِ صبا ہو جیسے
سَر چھپا ئیں تو بدن کھلتا ہے
زیست مفلس کی ردا ہو جیسے

زندگی کے تضادات ہر فنکار کی نظر میں رہتے ہیں جن پر اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔ پروین شاکر کا ایک عجیب ستم ظریفی کے ساتھ نشتر زنی کی ہے ؎

وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیر فصلِ گل رہی
دے گئے سوکھے ہوئے پتوں کا نذرانہ ہمیں

میں شہرِ گل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

عشق کی راتیں اختر شماری میں گزرتی تھیں اور آستینوں سے بھی آنسوؤں کے سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکتے تھے۔

اب بھی عشق پیشہ لوگ پروین شاکر کی ننھی سی دُنیا میں بھگولا بنے بیٹھے ہیں اور یہ رونا دھونا مرد کے بجائے عورت کے حصے میں آیا ہے ؎

کیا دُکھ تھا کون جان سکے گا نگارِ شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

بس یہ ہُوا اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لئے

سب سے بڑی چیز جو اس کی شاعری میں پائی جاتی ہے وہ ندرت (ORGINALITY) ہے یعنی ایک تو اس نے FENALE WORLD تخلیق کی پھر اس میں پوری IMAGERY بدل گئی ہے۔ جہاں تک میرا حافظہ مساعدت کرتا ہے۔ اس کے ہاں بلبل، پروانہ، شمع، آتش و حق، برق و خرمن۔ صید و صیاد، دانہ و دام وغیرہ کے مضامین سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ خمریات کا باب ہمیشہ سے غزل کا سرمایۂ افتخار رہا ہے۔ اس کے مجموعہ کلام میں ناپید ہے تصوف اور تفکر، طبیعات و مابعد الطبیعات بھی اس کے کلام میں موجود نہیں، فکر ذاعنصر اول تو موجود ہی نہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو بے انتہا کمزور۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اہم مضامین جو اساتذہ غزل نے غزل کے لئے لازمی قرار دیئے اور جن کے ادا کئے بغیر کسی شخص کے شاعر ہونے میں کلام ہو، ان کی عدم موجودگی میں کوئی غزل کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس دعوے کی دلیل کے طور پر پروین شاکر کا مجموعۂ کلام " خوشبو " پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں پورا نگار خانہ نئی طرز پر سجایا گیا ہے حسن و عشق کی ازلی تثلیت تو موجود ہے مگر ایک انقلابی اقدام کے ساتھ جیسی قدرتِ بیان ہر جگہ موجود ہے ؎

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے
لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

وہ میرے پاؤں چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی
شہادتیں میرے حق میں تمام جاتی تھیں
مگر خموش تھے منصف نظیر ایسی تھی

"خوشبو" کا لفظ پورے کلام میں بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے غالباً اسی بنا پر مجموعے کا نام بھی "خوشبو" رکھا گیا ہے۔ بعض اوقات تو اس کی معنویت بالکل بدلی ہوئی نظر آتی ہے ؎

کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
ہجر کی شب، میری تنہائی پہ دستک دے گی
تیری خوشبو مرے کھوئے ہوئے خوابوں کی طرح

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو ہے کہ ذرا زلف کھولئے

بات خوشبو کی طرح پھیل گئی
پیراہن میرا شکن تیری تھی

باور کیا جانا چاہئے کہ پروین شاکر کی شاعری میں بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کے گیت اور اس کی اپنی سرگوشیوں کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں بلبل اور پروانے کے مقابلے میں جو چیزیں انھوں نے شاعری کو دیں وہ شفق اور قوس و قزح کے دھبے اور شوخ رنگ جگنوؤں کی سبک تابی اور تتلیوں کی سیماب پائی کے ساتھ بعض نئی تراکیب ہیں جن میں تاریخی تشکول، ساعت دید کے عارض، گلنار حجاب سخن کاری، شبنم بدست لوگ، بانجھ مناظر، جاگی نیندوں کے سلسلے، شبنم دشتی کے سلیقے، التفات کا زہراب، خوابوں کی چاندنی، جیتی شامیں، نیند کے سیلاب دستکیں دینے کا فن اندر بحری تہید شمال ہیں اور ان سب سے بڑھ کر انگریزی ادب کے مطالعے سے ترکیب پایا ہوا وہ شعور ہے جو پورے کلام میں "خوشبو" کی طرح پھیل گیا ہے۔



ذلتیں ہیں عظمتوں کا تاج پہنے آج کل
اس حقیقت کو جہاں میں کون دیکھے آج کل

ہے تو یہ بے اثر ترکِ تعلق بھی فریب
انقلاب انگیز ہیں سارے قرینے آج کل

ہم بکیفِ بے خودی مصروف ہیں دیدار میں
لوگ سمجھے ہیں کہ اُن کو بھول بیٹھے آج کل

ہم ہیں پامالِ خزاں اس حال کی کس کو خبر
اُنکی نظروں پر بہاروں کے ہیں پردے آج کل

اک نقاب بے حجابی تھم گئے چہرے پہ ہے
بے جھجک آسودہ ہوتے ہیں نظارے آج کل

جس کو حاصل ہو قبولِ عام اُس کی ہے سند
یوں تو شاعر ہیں بہت مقبول جیسے آجکل

پشتو افسانہ

سوال پیدا نہیں ہوتا

عبدالکافی ادیب

یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی کہانی ہے۔ اس گاؤں میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک چھوٹی سی گلی ہے۔ جس کے کچے مکانوں کی بیشتر دیواریں اور پلوں سے اٹی رہتی ہیں۔ خو بُو کے لحاظ سے اس گلی کے باسی منفرد اور نرالے قسم کے لوگ ہیں۔ اس گلی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ نمازی یہاں دیکھنے میں آتا ہے البتہ بدری گل ماما اس مسجد کا مستقل باسی ہے۔ بیچارا رنڈوا ہے جب سے اس کی گھر والی نے اس جہاں سے کوچ کیا ہے۔ تب سے بدری گل کو اپنی عاقبت سنوارنے کا شدت سے خیال رہنے لگا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے گھر اس کی کوئی وقعت نہیں ہے اس نے اکلوتے بیٹے نصیب گل کا گھر اس خیال سے آباد کرایا تھا۔ کہ گھر والی کے موت کے بعد اس گھر میں خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ مگر ایسا ہرگز نہ ہوا۔ خوشیاں ملیں تو اس کے بیٹے نصیب گل کو جسے تو اپنے نصیب ہو بیٹے دونوں کی جانب سے طعنے ملے۔ اور اس نے اسی میں اپنی خیریت دیکھی بیکے سے محلے کی اس ویران مسجد میں منتقل ہو جائے۔ اس کے بیٹے نصیب گل نے لوگوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے اور محض دکھاوے کی خاطر باپ کو گھر واپس آنے کے لئے بہت منت سماجت کی۔ مگر یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کہ بدری گل ماما اپنے زن مرید بیٹے کے کہنے میں آ سکے۔ ماسی بختو اس گلی کی مجلت خالہ ہے۔ لگائی بجھائی میں ماہر ہے فتنے فساد کرانے میں اسے خوب مہارت حاصل ہے خوشحال گھرانوں کو اجاڑنے میں اسے ید طولیٰ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محلے کے شریف لوگ اس کے منہ نہیں لگتے۔ یہاں تک کہ بختو کا سادہ سا شوہر بھی اس سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ ایک دن بچارے شوہر نے اپنی بیوی بختو کو کسی بات پر ڈانٹا۔ اس پر بختو نے ہاؤ مچائی۔ کہ شوہر کو کان منہ لپیٹ کر گھر سے بھاگ نکلنے میں عافیت دکھائی دی۔ اور اس روز سے شوہر نے وہ گاؤں ہی چھوڑ دیا اور دریا پار ایک بستی میں ایک ہٹی کھولی۔ اور بھول کر اپنی بیوی کا نام نہیں لیا۔ ماسی بختو نے محلے کے لوگوں کو اپنی مظلومیت کی داستان سنا سنا کر اپنے بیٹے فتح الدین کے روٹھے ہوئے ابا کو منا کر لانے کے لئے منت سماجت شروع کی۔ مگر شریف لوگ ماسی بختو کے کہنے میں نہیں آئے۔ آخر جب ساہو کر ماسی بختو نے اپنے بیٹے فتح الدین کے ساتھ اپنی باقی زندگی گذارنے کا تہیہ کیا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر اس نے بیٹے کی شادی اپنی بھانجی سے کرا دی، چند روز تک ماسی بختو اپنی بہو کے سگھڑپن کی تعریفیں کرتی رہی بالآخر ایک روز وہ پٹڑی سے اتر گئی اور واویلا مچایا کہ اس کا بیٹا فتح الدین اپنی بیوی کا غلام بے دام ہو گیا ہے۔ اور بہو اس کو اپنے منہ لگنے نہیں دیتی۔ چنانچہ اپنا کپڑا لتا سمیٹ کر اپنے ایک منہ بولے بھتیجے کے ہاں جا کر فروکش ہو گئی۔ فتح الدین نے بھول کر بھی ماں کی خبر نہیں لی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ دانا و بینا ہوتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو روگ لگا بیٹھے۔

سخی جان کو ماں باپ نے لاڈ پیار سے "بابو" کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ اور جب سخی جان کا باپ مرا، اس کی قدر و منزلت خوب بڑھ گئی۔ بہنوں نے اپنے "بابو" بھیا کو خوب لاڈ و پیار سے پالا۔ ماں تو بات بات صدقے واری ہونے لگی۔ یہاں تک بابو جوان ہو گیا۔ مگر پرائمری سکول کی شکل تک نہیں دیکھی مبادا استاد اسے پیٹ ڈالے۔ چنانچہ ان پڑھ "بابو" ناز و نعم سے پل کر جوان ہوا۔ ماموں نے افسروں کی منت سماجت کر کے اسے گاؤں ہی کے ایک پرائمری سکول میں بطور چوکیدار بھرتی کرا دیا۔ مگر سخی جان بدستور "بابو" کہلوانے پر مصر رہا ہو۔ ماں کپڑوں کی گٹھڑی لئے گلی گلی بیچا کرتی تھی۔

نہیں گھر پر گوٹے کناری کا کام کرکے دو چار پیسے کما لیتی تھیں
فرمایا۔ بابو نے معمول کر بھی تنخواہ گھر میں ماں یا بہنوں کو نہیں
دی وہ شہر جا کر گلچھرے اڑایا کرتا تھا۔ ہفتے میں وہ ایک
بار فلم ضرور دیکھتا تھا ٹیرکس کے کپڑے پہنتا تھا اور جب
تنخواہ کے پیسے ختم ہو جاتے تو گھر میں ماں بہنوں سے پیسے
اینٹھتا اور شہر جا کر انھیں ٹھکانے لگا آتا۔ سوال پیدا
نہیں ہوتا کہ "بابو" اپنی عادتوں سے باز آ جائے۔

اس گلی میں آئے دن بچوں کے مابین شور شرابہ رہتا
ہے۔ بچوں کی مائیں گھروں کے دروازے میں کھڑی
ہو کر ایک دوسرے کو صلواتیں سناتی رہتی تھیں اور شام
کو اپنے تھکے ماندے شوہروں کو اکسا کر انھیں اشتعال
دلاتی۔ بعض تحمل مزاج شوہر خاموشی سادھ لیتے
تھے۔ البتہ عاقبت نا اندیش قسم کے شوہر اپنی آستین
چڑھا کر مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ گلی کے بڑے بوڑھے
بیچ بچاؤ کرا دیتے ہیں جب کہ اُن کے بچے واقعات و نتائج
سے بے نیاز آپس میں پھر کھیلنا شروع کر دیتے ہیں یہ اس
گلی کا روز کا معمول ہے۔

اس سال گرمی خوب زوروں پر تھی۔ سورج کا سرخ
تھال گویا سوا نیزہ نیچے اُتر کر اہلِ دنیا پر اپنا قہر برسا
رہا تھا۔ فضا میں گھٹن تھی۔ جسے دیکھو گرمی کی شدت کا
احساس دوگنا ہو رہا تھا۔ تیز دھوپ میں لوگوں نے
گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ گلی سنسان ہو گئی۔ آسمان پر بادل
کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لوگوں نے برملا کہنا شروع
کیا۔ کہ یہ سب ہماری نیتوں کا فتور ہے۔ ایک دوسرے
کے لئے دل میں کھوٹ بغض و کینہ ہے۔ جبھی تو اللہ
نے انھیں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ یہ قربِ قیامت
کی نشانی ہے۔ لوگ سہم گئے اور خدا کے حضور گڑگڑانے
لگے۔ گلی کی ویران مسجد آباد ہونے لگی بدری گل ماما نے
اذانیں دینا شروع کیں، کہیں سے ایک مولوی صاحب کو
پکڑ لے آئے اور مسجد میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا شروع
کی۔ بدری گل ماما کا دل بھر آیا اور بیٹے کے لئے صاف ہونے

لگا۔ نصیب گل اور اُس کی بیوی نے بدری گل ماما کو بالآخر منا ہی
لیا اور راتوں اپنے گھر لے آئے۔ ماسی بختو کا روٹھا ہوا شوہر
اور فتح الدین کا باپ بھی خوفِ خدا سے واپس اپنے گھر
آ گیا۔ ماسی بختو نے شوہر سے معافی مانگ لی۔ پرائمری
سکول کے چوکیدار اور بیوہ کے اکلوتے بیٹے "بابو" نے
بھی خدا کے خوف سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ اس نے
شہر جا کر فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں اور مسجد جا کر نمازیں پڑھنے
لگا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ کی پہلی رقم ماں کے ہاتھ میں دے
دی۔ بیویوں نے اپنے سادہ لوح شوہروں کو اشتعال
میں لا کر مرنے مارنے سے توبہ کر لی۔ غرضیکہ اس گلی کا چھوٹا
بڑا فرشتہ صفت بن گیا۔ ہر روز فجر کی نماز کے بعد
بارش کے لئے نمازِ استسقاء ادا کی جانے لگی۔ بالآخر ایک
روز رحمتِ خداوندی جوش میں آ گیا۔ اُفق پر سیاہ
بادلوں کی چادروں نے دیکھتے دیکھتے پورے آسمان کو ڈھانپ
لیا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور پھر تھوڑی دیر میں چھما چھم
بارش برسنے لگی۔ لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بچوں
نے ننگ دھڑنگ ہو کر برستی بارش میں نہانا شروع
کیا۔ بیویاں چہک اُٹھیں۔ شوہر لہک اُٹھے۔ بچوں نے
کلکاریاں شروع کیں۔ بوڑھوں نے اطمینان کا سانس
لیا۔ بارش برسی اور خوب برسی۔ گلی کوچے پانی سے بھر گئے
نالیاں بہہ نکلیں۔ پرنالے ٹوٹ پڑے۔ ماسی بختو کے
گھر کا آنگن پانی سے بھر گیا۔ اُس نے سیڑھی لگا کر پڑوس
کے گھر کا وہ پرنالہ بند کر دیا جس کا پانی اُس کے گھر میں
آ رہا تھا۔ پانی رکا تو چھت ٹپکنے لگی۔ پڑوسن حالات کا جائزہ
لینے کے لئے اپنے کوٹھے کی چھت پر چڑھی۔ اس نے ماسی
بختو کو پرنالہ بند کرتے دیکھ لیا تو دیوانہ وار اُس پر جھپٹ
پڑی۔ گالی گلوچ ہونے لگی۔ شوہر والے نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا
تو ماسی بختو نے شوہر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور اُسے خوب
سنائیں۔ بارش بند ہو گئی۔ بیٹے نے بیچ میں مداخلت
کرنا چاہی تو اُسے بھی دو چار سننا پڑیں۔ بہو نے منہ کھولا تو
وہ بھی میدان چھوڑ گئی

محمد الدین کا سادہ لوح باپ سب کے سامنے بے عزت ہو کر محلے سے باہر نکل گیا۔ فتح الدین اور اُس کی بیوی نے ماسی بختو کو دو چار سُنائیں تو ماسی بختو بھی روتی پیٹتی صلواتیں سُناتی اپنے منہ بولے بھتیجے کے گھر جا پہنچی جو بدری گل ماما کا تھا۔ وہ کسی بات پر اپنے بیٹے اور بہو سے اُلجھ پڑا۔ بارش کے قطروں نے جوان جسموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ انہوں نے مل کر بوڑھے بدری گل کو دو چار سُنائیں۔ بدری گل ماما... دوبارہ مسجد میں جا آباد ہوا۔ مولوی صاحب کو اپنا کام یاد آ گیا اُس نے بھی مسجد کو خیر باد کہہ دی۔

بابو ... کا بھی جی مچل اُٹھا۔ اُس نے مالک سے زبردستی اپنی پوری تنخواہ واپس لے لی۔ اور شہر کا رُخ کیا۔ اُسے نئی انگریزی فلم دیکھنے کا شوق ہوا۔ گلی میں بچوں نے کھیل کھیل میں لڑنا شروع کیا۔ مائیں ایک دوسرے کو کوستی ہوئی باہر نکل آئیں۔ بھلے مانس قسم کے شوہر بھی بیویوں کی حمایت میں نکل آئے۔ غرضیکہ شام ہوتے ہوتے لوگوں کی محبت، اُن کا خلوص جذبۂ ایمانی سب کا سب بارش کے پانی کے ساتھ بہہ نکلا تھا۔

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہمارے گاؤں کے لوگوں کی فطرت بدل جائے

غزل

اختر سعید

جب بھی وہ مجھ سے ملا زخم تو اک دے گیا
اُن وفاؤں کا صلہ دردِ غم آہ و بُکا
کس کو اس کا ہوش تھا کون کس جانب گیا
دھوپ کی تیزی بڑھی غرض دل جل گیا
غم نہ کر اختر کبھی
اب اُسے تو بھول جا

ڈی۔ شیرلین قیس بالنے

قومی زندگی میں اردو کا حصہ

اردو زبان نے ملک کو بہت سی اعلیٰ قدریں دی ہیں ان میں ایک نہایت اعلیٰ و قابلِ قدر دین ہے ..... قومی زندگی یا قومی یک جہتی۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی زندگی کا احساس سب سے غائب تھا۔ دورِ قدیم سے ملک ریاستوں اور جاگیروں میں بٹا ہوا تھا۔ والیانِ ریاست اپنے تحفظ اور وسعت کے لئے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے ان کے سامنے ایک ملک و ایک قوم کا نظریہ کبھی نہیں ابھر سکا۔ دورِ مغلیہ میں ایک ہندوستان کے تخیل نے جنم تو لیا لیکن ایک قوم ہونے کا خیال وجود میں نہ آسکا۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے اس نظریے پر غور کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے دینِ الٰہی کو ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ مذہبی اختلافات کو ختم کرکے سب کو ایک قومی رشتہ میں باندھ دیا جائے لیکن اس کی یہ کوشش پروان نہ چڑھ سکی۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی کی ناکامیابی کا سب سے بڑا سبب بھی قومی ایکتا یا قومی یک جہتی کی عدم موجودگی تھا۔

اس جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ملک میں ہر طرف انحطاط اور کم ہمتی چھا گئی۔ عوام پر مُردنی سی طاری ہوگئی۔ ہر طرف مایوسی اور ناامیدی نے ڈیرے ڈال دیئے اس حالت سے فیض اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے جی بھر کر مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا ہے

کرتے ہیں وہ بتدریج اب ظلموں میں اضافہ
تجھ پر اگر ان کا ہے کچھ احسان بجا ہے

کیونکہ ؎

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب (اقبال)

ایسے تاریک اور نازک وقت میں چند بیدار مغز مدبر لوگوں نے نیم مُردہ دلوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا جذبہ جگانے کی کوشش کی۔ اس دشوار کام کے لئے انھوں نے قلم کا استعمال بہترین ذریعہ سمجھا۔ اس سلسلے کے اولین گروپ جو اردو کا عناصرِ خمسہ کہلاتا ہے میں سرسید۔ حالی۔ شبلی۔ محمد حسین آزاد۔ اور ڈاکٹر نذیر احمد کے نام سرِ فہرست ہیں۔ انھوں نے ایرانی روش کی شاعری سے قطع نظر کرکے جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی چونکہ اس وقت بالخصوص مسلمانوں کی حالت بہت ابتر تھی اسلئے ابتدا میں انھوں نے قوم سے صرف برادرانِ اسلام کو خطاب کیا۔ حالی کی مثنوی اور ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اور جوابِ شکوہ اس کی مثالیں ہیں۔ سرسید کے مضامین اور اکبر الہ آبادی کے بعض اشعار بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں، مثلاً ؎

اب نظر آتی ہے کم وہ مسجدوں کی فرش پر
قوم نے اتنی ترقی کی کہ پہنچی عرش پر (اکبر)

ان تحریروں کے زیرِ اثر جب مسلمانوں کی حالتِ زار میں کچھ سدھار نظر آیا تو ان دانشورانِ ملک نے قوم سے ہندوستان کے تمام لوگ مراد لینا شروع کر دیا۔ حب الوطنی، ملک کی قدیم عظمت و شوکت، ملک کے اوپر برکاتِ رحمانی اور صاحبِ مردانگی و شجاعت، اخلاق و بلند کرداری، مذہبیت و روحانیت، یک جہتی اور اتحاد کی تعلیم موثر اور دلچسپ انداز میں شروع کر دی۔ یعنی ادب

شاعری برائے تفریحِ طبع یا تضیعِ اوقات کے لئے نہیں بلکہ برائے زندگی ہو گیا اور ایک مقصد کو لے کر آگے بڑھنا ملاحظہ ہوں یہ اشعار ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

پھر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یک جہتی
اس کی دنیا سے یہ سمجھو کہ گئی عزت و جاہ

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا (حالی)

انھوں نے عوام کے سامنے ملک و قوم کی عظمت و شوکت کے گیت سنا کر دلوں میں جذبۂ حب الوطن پیدا کرنے کی کوشش کی ؎

وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی
تم نے سنا بھی اس پہ کیا گذری انجمن میں (حالی)

اے وطن اے میرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں (حالی)

اے صورِ حب قومی اس قوم کو جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے (چکبست)

مل مل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں (سرور جہاں آبادی)

اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" نظم ہمالیہ۔ گنگا۔ قومی گیت۔ وغیرہ اسی طرز کی نظمیں ہیں۔

یہ جذبہ ابھارنے کے بعد قوم کو انگریزوں کی سیاسی شاطرانہ چالوں سے آگاہ کر کے انھیں ہوشیار رہنے کو کہا۔ تفرقہ بازی اور آپسی جھگڑوں سے خبردار رہنے کی تلقین کی ؎

تدبیر یہ کھنچی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو (حالی)

کٹی رگِ اتحاد و ملت رواں ہوئیں خونِ دل کی لہریں
ہم اسکو سمجھے ہیں آب معانی نہار ہے ہیں نکھر رہے ہیں (اکبر)

کہاں وہ لطفِ باہمی ہے محبتوں میں بہت کمی ہے
چلی ہے کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے

تمہیں لے دیکھئے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا (شبلی)

ہے جنون خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا
قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا (حالی)

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

پائیں بانٹ بھی اب ملتی نہیں ہے جا
روزن میں ہے وہ گلبن، بھولا تھا جو چمن میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں (اقبال)

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

تفرقہ بازی کا سبب اور اس سے گریز کی نصیحت کی جاتی ہے۔ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے (اقبال)

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے (چکبست)

اس کے علاوہ اقبال۔ نظیر اکبرآبادی اور چند ایک دیگر شعراء نے ہندو بزرگوں کی توصیف و ثنا کی رام۔ کرشنا۔ مہا بیر سوامی۔ گرونانک۔ ہولی۔ دیوالی وغیرہ پر بڑی خوبصورت نظمیں کہیں۔

سرسید نے کہا مسلمان میری ایک آنکھ ہے تو دوسری ہندو۔ سرسید قوم کو نئی تہذیب، نئی تعلیم اور نئی روشنی سے روشناس

کرانا چاہتے تھے وہ ایک مضبوط قوم کی تشکیل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ عورتوں کی تعلیم۔ عزت و غیرت۔ ضبط اوقات۔ انسدادِ غلامی۔ ترقیِ زراعت و تجارت چاہتے تھے

کھلی آخرش وجہ پستی حالت
جہالت جہالت جہالت (نذیر احمد)

عزتِ قوم چاہتے ہو اگر
جاکے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر (حالی)

حقیقت یہ ہے کہ مہاتما گاندھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نیتاجی سبھاش بوس وغیرہ نے اسی قسم کی تعلیم کے اثر سے آزادی کی مشعل روشن کی۔

(ا) حبِ وطن: شعرا نے صریح الفاظ میں ملک و قوم کی محبت کا کس قدر صحیح مطلب سمجھایا ہے ؎

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے (حالی)
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو
اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
ہر حال میں رہیں اسے اہلِ وطن عزیز (آزاد)
اور ہو ویں نیک و بد روشِ جان و تن عزیز

ایک قوم کا تصور پیدا کرکے انھوں نے وہ اوصاف سمجھائے جس سے دنیا کی قومیں ترقی کرتی ہیں۔ یعنی ہمت و حوصلہ۔ کوشش و محنت، ایمان و یقیں۔ محبت۔ وغیرہ ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگی میں ہیں یہ ہی مردوں کی شمشیریں
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی (اقبال)
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی
محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے
بے غوطہ زنی گنجِ گہر کس کو ملا ہے (اسمٰعیل میرٹھی)

یہ لوگ مذہب اور روحانیت کو بھی انسان کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے جو بہت درست اور حقیقت ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک ملک و قوم کے اندر روحانی اقدار خوفِ خدا سچائی ایمانداری جیسے اوصاف پیدا نہیں ہوں گے وہ ترقی نہیں کرسکتی ؎

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
اکبر۔ ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے ہم
صبر خودداری دلیری حق پرستی اب کہاں
رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے
طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا
ذہن کو تب آگہی مذہب کو فالج ہو گیا

قومی جذبہ بیدار کرنے کے بعد یہ محسنِ قوم و ملک آمادۂ عمل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ وہ غلامی کی لعنت اور آزادی کی برکتوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اقبال۔ اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
ایک کالا پٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائیے
حالی۔ آئے بابا اس کی بیماری کا کیسے اعتبار

اس کے علاوہ پرندے کی فریاد۔ اکبر الٰہ آبادی کے اشعار۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ چکبست وغیرہ کی نظمیں بخوفِ طوالت اشعار لکھنے سے گریز کیا ہے۔

قومی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ سیاسی۔ معاشی۔ سماجی۔ تعلیمی، تہذیبی۔ مالی وغیرہ چنانچہ ان قلمکاروں نے قومی زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ اس وقت سے لیکر اس وقت تک اہلِ قلم اپنی نگارشات سے ملک میں قومی یکجہتی پیدا کرنے میں کوشاں ہیں۔ اشعار سے، طنزیہ کلام سے۔ اشاروں اور کنایوں سے افسانوں اور مقالات سے وہ قوم کو برائیوں اور کوتاہیوں کی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ جوش۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔

(باقی [illegible])

مشاعرہ سکوٹو (شمالی نائجیریا)

حامد سعید

سکوٹو شمالی نائجیریا میں ایک اہم شہر ہے۔ اسکی بنیاد ۱۸۰۹ء عیسوی میں شیخ عثمان بن فودی نے ڈالی تھی اور اس کو اپنی خلافت کا مرکز بنایا تھا۔ پچھلی صدی سے آج تک سکوٹو مغربی افریقہ میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت اور اسلامی علوم کا مرکز رہا ہے۔ گو اس کی دونوں خصوصیتیں آج بھی برقرار ہیں۔ لیکن مغربی تہذیب و تعلیم نے جہاں پورے ملک کو متاثر کیا ہے۔ سکوٹو شہر بھی الگ نہ رہ سکا۔ مغربی تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ یہاں کثیر تعداد میں ہندوستانی، پاکستانی، سیلونی بنگلہ دیشی، مصری اور سوڈانی اساتذہ، ڈاکٹر اور انجینئر آ گئے۔ ان میں خاصی تعداد نہ صرف اردو داں حضرات کی ہے بلکہ ان میں بھی وہ لوگ زیادہ تعداد میں ہیں جو شعر و شاعری کا ذوق رکھتے ہیں اور جنہیں ادب سے لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اکثر مشاعرے اور شعری نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں ایک طرحی نشست یہاں منعقد ہوئی۔

پہلی طرح مولانا حالی کا مشہور مصرع ہے

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اور دوسری طرح فانی کا مصرعہ تھی ہے

کیا کروگے اگر یاد آیا

مشاعرہ کو کنڈکٹ کرنے کی ذمہ داری انعام الحق علمی کے سر تھی۔ اب تقریباً یہ روایت ہو چلی ہے کہ نائجیریا بھر میں سبھی مشاعرے علمی ہی کنڈکٹ کرتے ہیں۔ انکے کنڈکٹ کرنے کا ڈھنگ کچھ ایسا نرالا اور دلفریب ہے کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ نائجیریا میں ملک زادہ منظور احمد یا کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ مشاعرہ کا آدھا لطف یا کہئے کہ مشاعرہ کی جان ان کا شاعروں کو بلانے کا انداز برجستہ فقرے اور برمحل اشعار ہیں۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ کھلے آسمان کے نیچے۔ قناتوں سے گھرے ایک احاطہ میں، سامعین ایک دوسرے سے ملے بیٹھے تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ مشاعرہ کے آغاز میں سلیم اللہ خان نے اپنی غزل کا ایک شعر ہے

یہ دل ہے خستہ جان تو یہ جسم ہے نیم جان
گر کھنچ گئی کمان تو جائے کا شعر کہاں

اس کے بعد شیخ محمد یعقوب کی باری آئی جنہوں نے اپنے ترنم سے ایک سماں باندھ دیا۔ ان کے منتخب اشعار ہیں ہے

سوچا تھا ہوگا ساتھ سے ان کو سفر کہاں
دیتے ہیں لوگ ساتھ مگر عمر بھر کہاں
نظروں میں ہے تمہاری ہی تصویر رات دن
تھا تم سے مجھ کو پیار مگر اس قدر کہاں
پی ہے شراب چشم و لب یار تم نے شیخ
اترے گا یہ خمار بھلا عمر بھر کہاں

اس کے بعد جعفر رضا جعفری نے جو سکوٹو ہی کے ایک کالج میں سائنس کے لیکچرر ہیں۔ اپنی غزل پڑھی۔

اہلِ نظر کے واسطے حدِ نظر کہاں
یہ میرا سر کہاں وہ ترا سنگِ در کہاں
اوراقِ زندگی کو جمع کر رہا تھا
شیرازۂ حیات ہوا منتشر کہاں

اب محفل رنگ پہ آنی شروع ہوئی تو محمد سلیم صاحب کو دعوت دی گئی۔ گو آبپاشی میں انجینئر ہیں لیکن ادب کا ذوق کسی استاد سے کم نہیں۔ محمد سلیم نے اپنی نعت سے سامعین کو خاصا متاثر کیا۔ ؎

اس داستانِ خلق میں ان سا بشر کہاں
یعنی بشر کو نبیؐ سا عالی نظر کہاں
جو خوش نصیب لٹ گیا ان کے حضور میں
اس کے خیال و ہوش میں نفع و ضرر کہاں

محمد سلیم کے بعد غلام اختر خاں اسٹیج پر آئے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کی سرزمین سے ہے۔ مزاحیہ اشعار خوب کہتے ہیں ؎

اپنی طرف اٹھی ہے ابھی وہ نظر کہاں
ترکیب ہو رہی ہے کوئی کارگر کہاں
اس کا حدودِ اربعہ بھی ناپا ہے آپ نے
کمرہ ہے یہ حضور بھلا یہ کمر کہاں

غلام اختر خاں سامعین کو ہنسا چکے تو ایک سنجیدہ شاعر [illegible]ظر صابری کی باری آئی۔ گورکھپور کی مردم خیز زمین سے [illegible] ہوئے اس شاعر نے کہا ؎

جلووں کے اژدہام میں ٹھہری نظر کہاں
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
نظروں میں جس کی جذب ہیں افلاک و کائنات
اس کے جنوں کو پائیں گے یہ بحر و بر کہاں

اب سیکریٹری مشاعرہ انعام الحق علوی کی باری تھی۔ ان کی غزل کے چند منتخب اشعار ؎

جو سر و بالِ دوش نہ ہو میرا سر کہاں
دیوار و در ہو جس میں وہ گھر میرا گھر کہاں
تیری نظر نے بھر دیئے کچھ زندگی میں رنگ
قاسم کو خود سے پیار مگر اس قدر کہاں

اب نمبر تھا مسز سیما خاں کا۔ گو یہ علیگڑھ کی تعلیم یافتہ ہیں لیکن تعلق لکھنؤ سے ہے۔ یہاں گرلز کالج میں پرنسپل ہیں۔ ایک تو خود غزل اپنی جگہ بہت خوب تھی دوسرے ترنم کا جادو۔ محفل پر ایک بے خودی طاری ہو گئی۔ ؎

بیمارِ ہجر کو ہے امیدِ سحر کہاں
تسکینِ دل کہاں ہے سکونِ نظر کہاں
ساقی ابھی تو مینا و ساغر ہیں نوش کیں
خالی ابھی ہوئی ہے مری چشمِ تر کہاں
کوئی تو وعدہ کر کے کسی سے چلا گیا
پل بھر تو سو سکا ہے کوئی رات بھر کہاں

مسز سیما خاں جب محفل کو لوٹ کر چلی گئیں تو محمد احمد نقوی بلائے گئے۔ یہ بلند شہر کے سادات میں سے ہیں۔ لیکن علیگڑھ کے پروردہ انھیں بھی محفل کو لوٹنے کا فن آتا ہے ؎

تپتا ہے رات دن یونہی صحرائے آگہی
اس دشتِ بے پناہ میں برگ و شجر کہاں
پائیں کہاں پناہ گناہوں کی دھوپ سے
ڈھونڈیں قبائے اطہر خیر البشر کہاں
کاندھے تھکے ہیں نئے ہیں صلیبیں نئی نئی
ہوتی ہے ختم کشمکش خیر و شر کہاں

محمد علی صدیقی مضطر ایک کہنہ مشق اور پختہ گو شاعر ہیں۔ عرصے تک بلند شہر کے مسلم اسکول کے پرنسپل رہ چکے ہیں انھوں نے اپنی غزل پیش کی ہے ؎

دل ہے کہاں خیال کہاں ہے نظر کہاں
محوِ جمالِ یار ہوں مجھ کو خبر کہاں
رہنے دے میرے پاس کوئی یادگارِ غم
صیاد لے چلا ہے مرے بال و پر کہاں

اس کے بعد دعوت دی گئی ہے محمد اسماعیل اعظمی کو جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے فیضیاب۔ خلیل الرحمان اعظمی۔ معین احسن جذبی اور مجنوں گورکھپوری کے شاگرد۔ ان کا منفرد انداز ہے منفرد کلام۔

اب اسے تلاشِ ذات پھروں در بدر کہاں
آئینہ بن بھی جاؤں تو آئینہ گر کہاں

اب ہم ہیں اور بے سروسامانیٔ جنوں
سو دلسے ئیسر ملا ہے تو دیوار و در کہاں

اعظمی صاحب کے بعد محترمہ شمع صدیقی کو زحمت دی گئی۔ ان کا تعلق میرٹھ سے ہے۔ ان کے کلام میں جتنا درد ہے۔ ترنم بھی اتنا ہی پرسوز ہے۔

وہ سوز وہ تڑپ وہ دعا میں اثر کہاں
آنکھوں سے اب ٹپکتا ہے خونِ جگر کہاں
کوئی حسیں خیال، شریکِ سفر کہاں
صحرائے غم میں سایۂ دیوار و در کہاں
مر مر کے تیرے واسطے جیتے رہے ہیں ہم
اے زندگی چلی ہے ہمیں چھوڑ کر کہاں

ان کے بعد ڈاکٹر مظہر صاحب صدیقی آئے جو بدایوں کے ہیں اور بدایوں ہی کے انداز میں پڑھتے ہیں ؎

جذبوں میں تازگیٔ نسیمِ سحر کہاں
اب حوصلوں میں گرمیٔ ذوقِ سفر کہاں
مشکوک اب کسی کی صداقت نہیں رہی
اپنی نظر میں ہم ہی رہے معتبر کہاں

اب آخری منزل آگئی تھی۔ ایک بزرگ شاعر سمیع خاں ظاہر کو دعوت دی گئی انھوں نے بچپن اور جوانی علی گڑھ کی گلیوں میں گنوائی اب ایک عرصہ سے باہر ہیں۔

تیرا کوچہ ترا در یاد آیا
سنگ یاد آگئے سر یاد آیا
اب نخوت نہ تکبر نہ غرور
کیا کوئی کاسۂ سر یاد آیا
چل پڑے حسرت و ارمان لئے
بس یہی زادِ سفر یاد آیا

سمیع خاں ظاہر کی غزل کے بعد اس طرحی نشست کا اختتام ہوا اور اس طرح یہ محفل ایک یادگار بن کر ختم ہوئی۔

غزل

یوسف ثانی - ریالی

ارماں جو دل میں ہیں وہ ستاروں سے کم نہیں
اس گلستاں کے پھول شراروں سے کم نہیں

واقف ہوں دوست! وقت کے بدلے مزاج سے
نرگس کے پھول بھی مجھے خاروں سے کم نہیں

رہ کر بھی تیرہ شب میں کریں صبح کو سلام
اپنی جگہ پہ ہم بھی ستاروں سے کم نہیں

چپ چاپ رنگ لانے لگیں چہ میگوئیاں
دشمن کا یہ سلوک تو یاروں سے کم نہیں

محصور ایک ایک ہے اپنی جگہ یہاں
حلقے یہ دوستوں کے حصاروں سے کم نہیں

سینوں میں حسرتوں کے ہیں لاشے دبے ہوئے
ہم لوگ چلتے پھرتے مزاروں سے کم نہیں

ثانی ندامتوں سے گرے اس کے روبرو
وہ اشک رحمتوں کی پھواروں سے کم نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۵۹ کالم ۲ سے آگے)

حسرت موہانی۔ عظمت اللہ خاں۔ اختر۔ ساغر۔ حفیظ۔ منشی پریم چند۔ کرشن چندر۔ سردار جعفری۔ مجاز۔ فیض وغیرہ نے اپنی زندگی اسی کارِ عظیم کو سرانجام دینے میں صرف کردی تھی اور ایسے محسنانِ قوم کی کوششوں کا ثمرہ ہے جو ہم چین اور پاکستان کی جنگ کے دوران دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت قوم ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

مرے مکتوب الیہ

بمبئی

برادرِ محترم سَرَوَر صاحب ـــ سادر نمسکار

آج یعنی ۸ جولائی کو جون ۱۹۸۳ء کا "شانِ ہند" موصول ہوا۔ اس میں اپریل ۱۹۸۳ء میں میرے شائع شدہ مضمون کے جواب میں شبلی صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد ابھی پوری طرح لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں ہوسکا۔ آپریشن والی آنکھ میں اب بھی STRAIN پڑتی ہے۔ اس لئے یہ خط خواہش کے باوجود طویل نہیں ہوگا اور شاید مختصر ہونے کے باعث زیرِ ترتیب شمارے میں جگہ نکل آئے۔

شبلی صاحب نے اس خط میں فرمایا ہے "...... جوابِ جاہلاں باشد خاموشی، اس پردے میں مانک ٹالا صاحب ڈھکے چھپے رہ سکتے تھے"۔ میں فارسی داں نہیں ہوں۔ اُردو کی وساطت سے اس فارسی محاورے کا میں جو مطلب سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ "جاہلوں (کی بات) کے جواب میں خاموشی اختیار کر لینی چاہیئے"۔

شبلی صاحب نے منشی پریم چند کے خلاف لکھنا شروع کیا تھا تو شروع شروع میں میں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا تھا۔ لیکن جب احساس ہوا کہ شبلی صاحب نے پریم چند کے خلاف باقاعدہ ایک مہم جاری کر رکھی ہے تو خاموش نہ رہ سکا۔ اور شبلی صاحب کے جھوٹ۔ افترا پردازی اور استعمالِ انگیزی کو بے نقاب کرنے کے لئے قلم اُٹھانا پڑا۔ ورنہ مجھے محقق یا ناقد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ یہ دعوے شبلی صاحب کو مبارک ہو کہ انھوں نے اپنی "تحقیق" میں۔

(۱) پریم چند کی چار سطروں کی ایک تحریر (نم خرما و ہم ثواب) کو صرف دو ڈھائی سطروں میں پیش کر کے انہیں اردو دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی حالانکہ پوری تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی بے بسی بیچارگی اور کم مائگی کا رونا رویا گیا تھا۔ میں نے پوری تحریر پیش کی تھی۔ شبلی صاحب کو کوئی جواب نہ سوجھا۔

(۲) پریم چند کے ایک خط میں بریکٹ میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے اُن کی پوری تحریر کے معنی ہی بدل ڈالے۔ شبلی صاحب کی اس ایمانداری کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھوڑ چکا ہوں۔

(۳) پریم چند نے اپنے خطوط میں بیسیوں جگہوں پر افسانہ۔ قصّہ اور مضمون کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ یعنی قصّے، کہانی کو بھی مضمون کہا ہے۔ لیکن شبلی صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پریم چند کی کتاب .... "سوزِ وطن" ضبط (باقاعدہ یا بے قاعدہ) نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اُن کے ایک مضمون "یو۔پی میں ابتدائی تعلیم" کے سلسلے میں کلکٹر نے اُن کے کان کھینچے تھے۔ اس کی تفصیل بھی پیش کر چکا ہوں۔

(۴) شبلی صاحب کی ایک "تحقیق" یہ بھی ہے کہ پریم چند کے اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے.....۔ فروغِ اُردو کے ایک شمارے میں اُنھوں نے "پریم چند کی اُپنیاس یاترا......"۔ اور اپنی تحریر کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ انھوں نے خود کیا کہا ہے اور اُپنیاس یاترا کے یاتری سپلیش زیدی نے کیا کہا ہے

(۵) شبلی صاحب کی "تحقیق" کا ایک اور زبردست ثبوت ان ہی کی تحریر میں ایک مرتبہ پھر پیش کر رہا ہوں۔

" ہم لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بدھوں کے ساتھ یہی سلوک ہو رہا تھا جو آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے تھے ...."

شبلی صاحب نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف جو اشتعال انگیزی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اُسے فی الحال طوالت کے ڈر سے نظر انداز کر رہا ہوں اور شبلی صاحب سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی تاریخ ہے جس سے انھوں نے اتنی زبردست تحقیق فرمائی ہے۔ محمود غزنوی اپنے آپ کو بُت فروش نہیں بلکہ بُت شکن کہلانا پسند کرتا تھا۔ اسی لئے اس نے تھانیسر اور سومناتھ کے مندروں کے بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے غزنی۔ مکّے۔ مدینے اور بغداد کی گلیوں میں پاؤں تلے روندنے کے لئے ارسال کئے تھے۔ بُدھ مت محمود کی پیدائش سے دو صدیاں پہلے زوال پذیر ہو چکا تھا۔ محمود غزنوی کو اگر بُدھ مت کے احیا کا اتنا ہی شوق تھا تو اُس نے غزنی۔ افغانستان اور اردگرد کے علاقوں میں بُدھ مت کے احیا کی کوشش کیوں نہیں کی۔ جہاں مسلمان حملہ آوروں نے بدھ مت کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق کے مطابق محمود خلیفہ وقت کی مملکت بھی ہڑپ کرنا چاہتا تھا کہ اُس کا انتقال ہو گیا۔ غالباً یہ "نیک کام" بھی وہ بدھ مت کے احیا کے لئے کرنا چاہتا تھا۔

اب شبلی صاحب نے پریم چند کے بعد بنکم چندر چیٹرجی پر "تحقیق" فرمانا شروع کر دی ہے۔ دو تین ماہ پہلے انھوں نے ایسا ہی ایک زہریلا مضمون "فروغ اُردو" میں بنکم چندر کے "آنند مٹھ" کے خلاف لکھا ہے۔

شبلی صاحب کیا آپ کو صرف ہندو ادیب ہی فرقہ پرست نظر آتے ہیں۔ اگر آپ "ایماندار محقق" ہوتے تو آپ کو کچھ مسلمان ادیبوں وغیرہ کی تحریروں میں بھی فرقہ پرستی کے جراثیم نظر آ جاتے۔ تب ہم سمجھتے کہ آپ دونوں قوموں کے ...

"عروج و زوال کے اسباب و علل پر غور" فرما رہے ہیں۔

چلئے مان لیجئے کہ پریم چند اور بنکم چندر نے مسلمانوں کے خلاف لکھ کر ہندوؤں کو ماضی ہی میں نہیں بلکہ آج بھی مسلمانوں کے خلاف اُکسا رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہر سال جو دو تین شیعہ اور سُنّی فساد ہو جاتے ہیں۔ اور حال ہی میں پاکستان میں زبردست شیعہ اور سُنّی فساد ہوئے ہیں کیا اُن کے لئے بھی پریم چند اور بنکم چندر ہی ذمے دار ہیں۔ اور ہندوستان میں جب کہ ہندو۔ مسلمان فسادات کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اُس زمانے میں بھی اودھ کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں کم سے کم تین شیعہ اور سُنّی فسادات کی تاریخ گواہ ہے۔ تفصیل چاہئے تو صحت یاب ہونے کے بعد پیش کروں گا۔

میں اگرچہ تحقیق و تنقید میں مُبتدی ہوں لیکن آپ کو یہ گُر سمجھا سکتا ہوں کہ کسی بھی ادیب کی تحریر کا جائزہ لیں تو اُسے پورے تناظر میں دیکھئے اپنے مطلب کے ٹکڑے کاٹ کر پیش کرنا ٹھیک نہیں۔ لیکن سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی آپ نہیں سمجھیں گے کیونکہ آپ کی نیت میں ہی فتور نہیں بلکہ آپ مذہبی جنونی بھی ہیں۔ اسی لئے میں نے باکمالوں کے درشن میں آپ کی تحریروں کے حوالے نہیں دیئے۔ آپ اپنے حوالوں کے ساتھ پوری تحریریں پڑھئے اور باکمالوں کے درشن کے ساتھ پریم چند کی باقی وہ کہانیاں پڑھنا بھی ضروری ہیں جو آپ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یعنی راجپوتوں کی دوسری کہانیاں اور اُن کے ساتھ ساتھ پریم چند کی وہ کہانیاں اور مضامین پڑھنے بھی ضروری ہیں جو انھوں نے حضرت محمدؐ۔ حضرت علیؓ۔ مولانا راشد الخیری اور سرسید وغیرہ مسلمان اکابر کے میں لکھے ہیں۔ اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ کون فرقہ پرست ہے۔

"باکمالوں کے درشن" کی جگہ اگر میں نے قلم تیاگ و تلوار سے حوالے دیئے ہیں تو کیا قباحت ہے۔ آپ ثابت کیجئے کہ یہ حوالے "باکمالوں کے درشن" میں نہیں ہیں! اگر باکمالوں کے درشن ابھی بھی دستیاب ہے تو شبلی صاحب مجھے حاصل کرکے لے دیں۔ اس کے ساتھ ہی "پریم چند کا پچیاس یاترا ..." "آنند مٹھ" اور

درگا داس بھی حاصل کردیجئے ۔ ان کی قیمت ارسال کردوں گا ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کا ممنون بھی ہونگا کوشش کے باوجود خط طویل ہو گیا ہے ۔ اس لئے شبلی صاحب کے خط کا مفصّل جواب پھر کبھی حاضر کروں گا ۔

بمبئی ۵ ر جولائی ماٹنگ مالا

برادرم سرور صاحب آداب

میں تو ۵ ار جون کے بعد صبح و شام آپ کی راہ دیکھ رہا تھا اور اُدھر آپ دو ہڈیاں توڑ کر بیٹھے تھے " وہ بھی اپنی "
حافظ محمد یوسف صاحب آپ کے دیرینہ کرمفرما ہیں ۔
آپ نے ان کی شفقت کا جواب یوں دیا کہ وہ رکشا سے ٹکرائے اور آپ اپنے آپ سے
" قسم کھانے کے قابل ہے تیرے غم کی وفاداری "
ارے بھئی جلدی اچھے ہو جاؤ ورنہ بمبئی کی برسات آپ کی آمد میں رُکی رہے گی ۔
اپنی خیریت سے مطلع کرو ۔
ادھر سب آپ کی صحت یابی کے لئے دعاگو ہیں ۔

آپ کا بھائی
راجندر کرشن

ریاض (سعودی عرب)

بہت اچھے سرور تونسوی صاحب
السلام علیکم

خدا سے دعا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ عزّت دے ۔ آپ کا خط ملا ۔ پتہ نہیں کیوں اتنے بہت سارے دنوں بعد مجھ تک پہونچا ۔ رسالہ تو ہر ماہ مل جاتا ہے لیکن آپ کا طویل خط ۱۵ ر مارچ کو ملا ۔ آپ مجھے جانے کیا سمجھ رہے ہیں ۔ امید ہے کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا سے اب آپ معاف کر دیں گے ۔ آپ کے لفظوں نے دل کو چھو لیا ۔ ہندوستان سے مجھے عشق ہے اور اس کے ہر گوشہ سے اور وہیں کی مٹی میں میں سارے جہان کو دیکھ لیتا ہوں آپ نے رسالوں اور اسکینڈل کے بارے میں لکھا ہے جو لوگ میرے بارے میں لکھتے ہیں اور اُچھالتے ہیں تو ان کو

یہ کرنا ہے ۔
ایک بار ایک صحابی حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا محمد فلاں آپ کے لئے بُرے کلمات ادا کرتا ہے تو انھوں نے کچھ توقف کیا اور پھر بولے ۔ " میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ کون سا احسان کیا تھا ــــــ "
اور کیا لکھوں ۔ بہت جلد دہلی میں ملاقات ہو رہی ہے ۔

آپ کا اپنا
صلاح الدین پرویز

حیدر آباد

برادر محترم پہلے تو میری جانب سے
عید کی مبارکباد قبول فرمائیے
آپ نے جناب کھدّر صاحب کی قابلیت کا کچا چٹھا کھولا ہے وہ قابلِ تحسین ہے ۔ ورنہ دوسرے اس طرح کی جرأت نہیں کر سکتے تھے ۔
مقامی کثیر الاشاعت روزنامہ " سیاست " کے ۱۰ ر جولائی ۱۹۸۳ء کے شمارے کی ایک سُرخی اور خبر کی طرف آپ کی توجّہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ سُرخی اور خبر ملاحظہ فرمائیے ۔

حضرت امیر خسرو کا مقام پیدائش دہلی
مسٹر کھدر کی نئی کتاب میں انکشاف

نئی دہلی ۹ ر جولائی (پی ۔ ٹی ۔ آئی) ہندی کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو اتر پردیش میں پٹیالی کے مقام پر پیدا نہیں ہوئے بلکہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے ۔ یہ انکشاف مشہور مورخ مسٹر کھدر نے اپنی نئی کتاب " امیر خسرو اور ہماری مخلوط تہذیب " میں کیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ پٹیالی ایک گھنا جنگل تھا جہاں ڈاکو اور لٹیرے پناہ لیتے تھے اسکو شہنشاہ بلبن نے صاف کرایا اور بعد میں ایک قلعہ تعمیر کرا دیا جسے مورخین اس قلعہ کو حضرت امیر خسرو کی پیدائش کی شہادت سمجھنے لگے ۔ حالانکہ جب یہ قلعہ تعمیر ہوا تو امیر خسرو نوجوان تھے ۔ چنانچہ منہاج سراج کی کتاب " طبقات نصیری " میں پٹیالی کے بارے میں کچھ بھی تحریر نہیں ہے ۔ مسٹر کھدر کی اس اردو کتاب میں حضرت امیر خسرو کی تحریریں شامل ہیں جو بغیر کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کے بلکہ بجنسہٖ نقل کر دی ہے ۔

بقیہ سرمست

تبصرے

۱۔ سرمایۂ بلاغت۔
مصنف۔ رتن پنڈوری۔
ناشر۔ ماہنامہ شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ، دریا گنج۔ نئی دلی ۱۱۰۰۰۲
سالِ اشاعت۔ ۱۹۸۳ء قیمت چالیس روپے، صفحات ۴۰۰

۲۔ کلید عروض۔
مصنف و ناشر، ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال زار علامی
اشاعت، ۱۹۸۱ء صفحات ۲۰۸، قیمت بیس روپے
ملنے کا پتہ ۱۔ شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

چونکہ شانِ ہند میں شائع ہونے والے تبصرے بالعموم مدیر جناب سرور تونسوی صاحب خود ہی لکھتے ہیں لہٰذا درج بالا کتب پر کچھ لکھنے کے پیشتر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتب ہٰذا میری درخواست پر عنایت کی گئیں۔ ساہتیہ اکادمی انگریزی میں ہندوستانی ادبیات پر جو انسائکلوپیڈیا (انسائکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر) تیار کروا رہی ہے۔ مجھے بشمول اردو عروض آٹھ موضوعات لکھنے کیلئے دیئے گئے تھے۔ اردو عروض پر نجم الغنی کی بحر الفصاحت اخلاق دہلوی کی فن شاعری، عشرت لکھنوی کی شاعری کی کتاب، حباب اکبرآبادی، ابر گنوری و حسرت موہانی کی تصنیفات وغیرہ میری نظر سے گذر چکی تھیں ان تصنیفات میں سے کچھ تو اب دستیاب ہی نہیں ہیں اور کچھ پرانے طرز و مذاق میں لکھی ہونے کے باعث افادیت و اہمیت سے عاری ہو چکی ہیں۔ ایک ہزار الفاظ پر مشتمل اندراج لکھنے کے لئے حرد مند سے متعلق نئی تصنیفات کی ورق گردانی کرنا ناگزیر ہو گئی۔ سرمایۂ بلاغت، کلید عروض سے متعلق شانِ ہند میں وقتاً فوقتاً اشتہارات نظر سے گذرے تھے۔ نیز سرور تونسوی صاحب کے توسط سے جناب علام مشتی بلالی مرحوم سے دفتر شانِ ہند میں نیاز بھی حاصل ہوا تھا اور رتن پنڈوری صاحب سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اس پس منظر میں جب سرور تونسوی صاحب کو لکھا گیا کہ وہ میری مدد کریں۔ مشفقانہ طور پر سرور صاحب نے مجھے نوازا۔ کتب مذکورہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان پر کچھ نہ کہنا ناشکر گذاری ہوگی

فرشتہ صفت سنت سادھو جناب رتن پنڈوری صاحب نے جو مشہور و معروف شاعر و مصنف ہیں سرمایۂ بلاغت کو لکھ کر اردو ادب پر احسان کیا ہے اور شانِ ہند نے اس کو شائع کر کے اردو خدمت گزاری کا ثبوت دیا ہے۔ رتن صاحب حالانکہ وہ گیتا درشن (فلسفہ جو علم و عرفان، عمل برائے ادائیگی فرائض ظاہر و باطن سے بے نیازی وغیرہ پر بسیط و محیط ہے) پر عمل پیرا ہیں اردو کی خدمات کرنے کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہے ہیں۔ یہی بات سرور تونسوی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے نامساعد حالات میں اردو کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ آجکل اردو کتابوں کی نکاسی بہت دشوار ہے مگر پھر بھی انہوں نے رتن صاحب کی "ہندی کے مسلمان شعراء" "گیتا" منظوم ترجمہ وغیرہ کا بار اشاعت اٹھایا ہے۔ سرمایۂ بلاغت میں وہ سب کچھ ہے جو شعراء نیز اردو ادباء کو جاننا چاہئے

مجاز و کنایہ، صنائع لفظی و معنوی، اصناف سخن، نکاتِ فصاحت و بلاغت، وغیرہ پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جدید تقلیبات کو بھی پردۂ خفا میں نہیں چھوڑا ہے۔ ہائیکو، آزاد نظم، سانیٹ، دوہے، پیروڈی، منظوم ڈرامہ نگاری جیسی اصناف کو درخورِ اعتنا سمجھا ہے۔ مزید براں، علمِ عروض کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آج کل کتنے ادیب و شاعر شترگربہ، شکستِ ناروا، اخلال وغیرہ اصلاحات سے آشنا ہیں۔ لُبِ لباب یہ ہے کہ سرمایۂ بلاغت میں اردو شاعری کی مکمل فنکاری کو پیش کیا ہے۔ ایسی تصنیف کو شاملِ نصابات بھی رہنا چاہیے اور شائقین اردو ادب اور اردو اکیڈمیوں کو مصنف و ناشر دونوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے تاکہ صالح ادب پروان چڑھتا رہے۔

دوسری کتاب کلیدِ عروض ڈاکٹر اوم پرکاش اگروال صاحب نے تصنیف فرمایا ہے۔ موصوف کامیاب و معروف معالج بھی ہیں اور اچھے شاعر بھی ہیں۔ نیز علمِ عروض پر قادر بھی ہیں۔ علمِ عروض سے ناواقفیت کے اس دور میں فنِ عروض پر ایک جامع اور قابلِ فہم کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ بحور، علمِ قافیہ وغیرہ جیسے ادق موضوعات پر نہایت صاف اور ستھری زبان میں لکھا گیا ہے۔ توجہ سے مطالعہ ہونے پر ہر نکتہ ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے ...

جناب بھگوان سروپ بھٹناگر متخلص سحر عشق آبادی کو فی الواقع خاتم العروض سمجھا جا سکتا ہے۔ مرحوم کو عروض پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ڈاکٹر صاحب یوں کہ دبستانِ سحر سے وابستہ ہیں۔ عروض پر اپنے استاد جیسی ہی نظر رکھتے ہیں۔ علامہ سحر عشق آبادی کو شانِ ہند سے اسی محبت و قربت تھی کیونکہ سرور تونسوی صاحب بھی ماہرینِ ادبیات میں منفرد و ممتاز مرتبہ و مقام حاصل ہیں۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر سرور صاحب شانِ ہند کے ہر شمارے میں عروضیات کے لیے چند صفحات مسلسل کے رشحاتِ قلم کے لئے مخصوص کر دیئے تھے۔ لہٰذا کلیدِ عروض کی تصنیف میں بالواسطہ طور پر سرور تونسوی صاحب ضرور محرک رہے ہونگے۔ کلیدِ عروض شائقین ادب کے لیے کارآمد ہے اور طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ حاصل خیر ثابت ہوگا۔ لہٰذا اس کو شاملِ نصابات ہونا چاہیے۔

سرمایۂ بلاغت اور کلیدِ عروض دونوں نہایت قابلِ قدر و توصیف تصنیفات ہیں۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

۴- رباعیاتِ رتن۔

جناب رتن پنڈوروی کا شمار صفِ اول کے اساتذہ میں ہے۔ ابو البلاغت کا خطاب آپ کو ماہرینِ ادب نے عطا فرمایا ہے اور آپ جناب دل شاہجہان پوری کے جانشین بھی ہیں۔

جس پہلو سے بھی دیکھا جائے جناب پنڈت رتن ممتاز ہی نظر آتے ہیں۔ بحیثیت ایک انسان کے نوعِ انسان کے لئے باعثِ فخر۔ پرانے رشیوں کی یادگار۔ دنیا میں رہ کر دنیا سے اس طرح الگ جیسے پانی میں رہتے ہوئے کنول۔ فاضل اجل ہوتے ہوئے نہایت منکسر مزاج۔ اس زمانے میں جب کہ دو چار مصرعے موزوں کر لینے والے سر ابھار کر اور سینہ تان کر بڑے بڑے اساتذہ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جناب رتن کا یہ عالم ہے کہ نومشقوں کو بھی جی کھول کر داد دیتے ہیں اور ان کا دل بڑھاتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں ایک سچے ایشور بھگت ہوتے ہوئے ہر مذہب کے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ الغرض ان کی زندگی قابلِ تقلید ہے۔

مہارتِ سخن کا یہ عالم ہے کہ جملہ اصنافِ نظم پر قادر ہیں۔ عروض کے ایسے ماہر کہ بایدو شاید۔ اب تک نظم و نثر میں ان کی ۱۵ تصانیف و تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور کم و بیش اتنی ہی غیر مطبوعہ ہیں۔

رباعیاتِ رتن جناب رتن کی ۲۰۸ رباعیات کا مجموعہ ہے۔ رباعیات سے قبل رباعی پر ایک فاضلانہ تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ رباعی پر اتنا مفصل مقالہ ایک جگہ کسی عروض کی کتاب میں نہیں ملتا۔ یہ مضمون ان کی مہارت اور وسیع مطالعے پر دال ہے۔ رباعی کی ابتدا اس کے اوزان اور عہد بعہد ترقی پر ایسی غائر نظر ڈالی ہے کہ بیساختہ زبان سے سبحان اللہ نکلتا ہے، غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گور کی تقطیع بھی کردی ہے۔ دس ارکان رباعی کی بھی وضاحت کردی ہے۔ یہ مضمون نہ صرف مبتدی کے لئے مفید ہے بلکہ اچھے شعر کہنے والے بھی اس سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جملہ اوزان رباعی جو رائج ہیں لکھ دیئے ہیں۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ماہرِ فن کتنی کاوش کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرات پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

برائے پاکیِ لفظے شبے بہ روز آرد
کہ مرغ و ماہی بود خفتہ او بود بیدار

مشہور مصرعہ کی جس کو رباعی کی بنا قرار دیا جاتا ہے

غلطاں	ہمی	رود تا لب	گور
مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعل

دس ارکان جو رباعی میں مستعمل ہیں تفصیل کے ساتھ مندرج ہیں۔ الغرض یہ مضمون رباعی پر ایک جامع اور بصیرت افروز سند ہے۔

رباعیات رتن میں ۲۰۸ رباعیاں ہیں جن میں ۱۰ رباعیاں فارسی زبان میں ہیں۔ ایک فارسی کی رباعی ملاحظہ ہو:۔

تصویرِ نشاطِ زندگانی دیدم
یعنی کہ علامتِ جوانی دیدم
چوں رفت شباب عہدِ پیری آمد
انجام فریبِ عمرِ فانی دیدم

(ف۔ صحیح لفظ مصالحہ ہے مگر علامہ کیفی دہلوی مرحوم مواد کے معنی میں مسالہ کو بہتر سمجھتے تھے)

اردو کی بیشتر رباعیات کو موضوع کے اعتبار سے الگ الگ سرخیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ رباعیاں

یعنی ۷۶ رباعیاں حقائق اور معارف کے عنوان سے جمع کی گئی ہیں۔ جو لوگ جناب رتن کی زندگی سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہ ایک صوفی باصفا ہیں ان کے کلام میں جو معارف ہیں وہ محض دماغی مساعی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی دل کی آواز ہیں۔ مدتوں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ برہم گیان (علم لدنی) ان کی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ اسی کے پیشِ نظر ان کے کلام میں بالعموم اور رباعیات میں بالخصوص ان کے دل کی آئینہ داری قدرتی ہے۔ ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے۔ رباعی:

قطرہ جسے سمجھے تھے سمندر نکلا
ذرہ جسے جانا شہِ خاور نکلا
ہر جز و حقیقت میں ہے کل کی تصویر
ناچیز بشر خدا کا مظہر نکلا

مشہور مصرع ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

اس خیال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو جناب رتن کے یہاں مساوات اور اتحاد کا پیغام بکثرت ملتا ہے۔ ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے۔

دنیا میں رہو شانِ محبت بن کر
محفل میں رہو عینِ صداقت بن کر
راحت کی تمنا ہے اگر دل میں رتن
چھا جاؤ مصیبت پہ مصیبت بن کر

ایک اور رباعی پڑھیئے:۔

دولت کی ترقی ہے سخاوت میں نہاں
ہے ملک کی بہبود تجارت میں نہاں
جینا ہے اگر دہر میں جینے کی طرح
یہ وصف ہے آپس کی محبت میں نہاں

کچھ رباعیاں فی البدیع کہی گئی ہیں جن سے جناب رتن کی فطری موزونیٔ طبع کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ذیل میں ایک رباعی درج ہے ۔ جو پٹھان کوٹ کے ایک مشاعرہ میں موزوں کی گئی ۔

آداب کا نذرانہ لئے آیا ہوں
تہذیب کا پروانہ لئے آیا ہوں
اے جام و سبو تھام کے پینے والو
اشعار کا میخانہ لئے آیا ہوں

جناب رتن کے کلام میں پند و نصیحت بکثرت ہے مگر ناصحانہ شستہ گفتار کی طرح نہیں ۔ شعریت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ برہمن قوم کو نصیحت دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

منزل کے لئے گر کے ابھرنا سیکھو
طوفان سے بے کھٹکے گزرنا سیکھو
پستی کو بلندی سے بدلنا ہے اگر
سو جان سے تم قوم پہ مرنا سیکھو

متفرق رباعیات میں سے ایک رباعی اور پیشِ خدمت ہے :-

بے عرض تمنا کی تمنا دل میں
مواج ہے جذبات کا دریا دل میں
کھولی ہے زباں کشفِ حقیقت کیلئے
جو سر میں تھا اب ہے وہی سودا دل میں

المختصر رباعیات رتن ۔ رباعیات کے خزانے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ۔ اردو زبان کو ایسے پاکیزہ اور سنجیدہ ادب کی ضرورت ہے ۔ کاش پروردگارِ عالم جناب رتن کو عمر دراز عطا کرے تاکہ وہ اپنے ادبی علمیات سے ادب اور خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں ۔ آمین

کفش بردار اہلِ کمال
ادیب لکھنوی

غبارِ خاطر	ابوالکلام آزاد	۴۰/-
عصری ملیالم کہانیاں	مرتب ایم مکندن	۱۸/۵۰
درد کے رشتے	میرکی انارائے	۲۰/-
اردو میں تاریخی ناول کا ارتقاء	نزہت سمیع الزماں	۵۰/-
سب رس جدید اردو میں	قاضی انیس الحق	۵۰/-
تذکرہ شعرائے اتر پردیش جلد پنجم	عرفان عباسی	۴۰/-
جلد ششم	"	۴۰/-
فنیق جونپوری شخصیت اور فن	ایس۔ ایم عباس	۱۸/-
سرمایۂ بلاغت	ابوالبلاغت رتن پنڈوری	۴۰/-
رباعیاتِ رتن	"	۱۰/-
خواجہ حیدر علی آتش (مقالہ)	ڈاکٹر شعیب راہی	۷۰/-
کتاب غزل	نذیر بنارسی	۲۵/-
مثنوی بہار سیرت	شاہین اشرف	۲۵/-
تذکرہ شعرائے ہریانہ	ڈاکٹر رانا گنوری	۴۰/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسین	۲۵/-
گلشن نمبر	آہنگ گیا	۳۵/-
احتشام نمبر	"	۳۰/-
بے نام گلیاں	کلام حیدری	۱۰/-
بابا لوگ	غیاث احمد گدی	۸/-
انتخاب کلام جمیل	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۷/-
یہ لوگ (خاکے)	"	۱۸/-
تعلیمات	کلام حیدری	۲۰/-
نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	مہدی جعفری	۳۰/-
ارتقاء (۱۹۷۶ سے ۱۹۸۰ تک اہم مختصر افسانوں کا انتخاب)		۱۵/-
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/-
اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	۳۰/-
الف لام میم (افسانے)	کلام حیدری	۱۵/-
زاویۂ نگاہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۰/-
انتخاب کلیات ریاض خیرآبادی	خلیل اللہ خاں	۱۶/-
ابی نقوش	ڈاکٹر زرینہ عقیل	۱۰/-
اردو کی بین الاقوامی حیثیت	نعیم اللہ خیالی	۲۰/۵۰

تخلیقی نقوش	مصطفیٰ حسن فطرت	۱۰/-
شرح دیوانِ غالب	بیخود موہانی	۳۰/-
انیس کی مرثیہ نگاری	اثر لکھنوی	۱۰/-
بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو	ڈاکٹر محمد اسلام	۳/۵۰
مکاتیب مہدی افادی	مرتبہ مہدی بیگم	۱۳/-
اردو تنقید کی تاریخ	مسیح الزماں	۶/-
خطبات آزادی حصہ اول	تحریک آزادی کا ادب	۱۸/-
" " حصہ دوم	" "	زیر طبع
انتخاب سخن حصہ اول	حسرت موہانی	۱۰/-
" " حصہ دوم	"	۱۰/-
" " حصہ سوم	"	۱۰/-
" " حصہ چہارم	"	۱۰/-
" " حصہ پنجم	"	۹/-
" " حصہ ششم	"	۱۰/-
" " حصہ ہفتم	"	۹/-
" " حصہ ہشتم	"	۱۵/-
" " حصہ نہم	"	۱۸/-
" " حصہ دہم	"	۱۰/-
" " حصہ یازدہم	"	۱۶/-
" " مکمل سٹ		۱۲۷/-
تذکرہ گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر	۱۸/۶۰
دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ	مفتی محمد انوار الحق	۱۴/-
پریم چند صدی کے افسانے	اردو اکادمی لکھنؤ	۷/-
طبقات الشعرائے ہند	مولفہ کریم الدین	۴۲/-
افادات علم عروض پر نادر کتاب	خورشید لکھنوی	۷۰/-
دستاویز (خود نوشت خاکے)		۱۲/-
انتخاب قلق	امجد علی خاں	۷۵/-
انتخاب یادگار	امیر مینائی	۲۳/-
انتخاب بیخود موہانی	سید سکندر آغا	۵۰/-
انتخاب آسی غازیپوری	ڈاکٹر طیب ابدالی	[illegible]
انتخاب شاد بہیرو میر	ڈاکٹر محمود الحسن	۵۰/-

انتخاب حسرت موہانی	محمد رضا انصاری	۳/-
انتخاب فراق گورکھپوری	ڈاکٹر افغان اللہ خاں	۴/-
انتخاب جوش ملیح آبادی	عصمت ملیح آبادی	۴/-
انتخاب مومن	ظفر احمد صدیقی	۴/-
انتخاب شاد عظیم آبادی	نجم الدین انصاری	۴/-
انتخاب غزلیات نظیر اکبرآبادی	اردو اکادمی لکھنؤ	۵/-
انتخاب غزلیات حالی	"	۳/۶۰
انتخاب رشک	"	۳/-
انتخاب مرزا شوق	"	۳/۵۰
انتخاب ذکاء اللہ	"	۵/-
انتخاب میر ناصر علی	"	۴/-
انتخاب مستقل	"	۴/-
انتخاب رشید احمد صدیقی	مضامین کا انتخاب	۶/-
پنجاب میں اردو	محمود شیرانی	۱۲/۵۰
زندگی اے زندگی	خلیل الرحمن اعظمی	۶/-
اردو میں قومی شاعری کے سو سال	علی جواد زیدی	۱۷/-
مشاعرۂ زنداں		۴/۵۰
تذکرہ گلشن بے خار	شیفتہ	۱۰/۹۰
تذکرہ گلستانِ بے خزاں	قطب الدین باطن	۱۲/۲۵
ضلع جگت	سر کشن پرشاد شاد	۴/۵۰
ناٹک ساگر	نور الٰہی	۱۹/-
بہت دیر کر دی	علیم مسرور	۹/-
سخن شعرا	عبد الغفور نساخ	۱۲/۵۰
اصلاح مع ایضاح	تعشق بنوی	۲/۸۰
جدید ادب منظر پس منظر	احتشام حسین	۱۱/-
بیسوی صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	۱۳/-
اسلام اور اس کا مطالعہ	حیات وارثی	۱۵/-
نور و نکہت (نعتیہ کلام)	"	۴/-
حاجی وارث علی شاہ	"	۵/-
اسیر لمحے	"	۱۵/-

اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء	ڈاکٹر اکبر حیدری	۷۵/-
تلاش و توازن	قمر رئیس	۱۵/-
ساتواں در	شہریار	۵/۵۰
مطالعۂ داغ	ڈاکٹر محمود زیدی	۴۰/-
اترن	واجدہ تبسم	۳۰/-
دیوی کے پرستار	الیاس سیتاپوری	۲۰/-
حرم سرا کا محبوب	"	۱۵/-
نیلی دنیا	سراج انور	۱۵/-
کالی دنیا	"	۱۵/-
اٹھتی لہریں	گلزار چودھری	۱۴/-
روحِ رواں	حکمت موہن لال رواں	۹/-
غالب ببلیوگرافی	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	۱۶/۵۰
غالب کا فن	اسلوب احمد انصاری	۲/-
عرفانِ غالب	آل احمد سرور	۸/-
عکسِ غالب	"	۸/-
خطوط وقار الملک	منظر عباس نقوی	۲۵/-
رقعات رشید احمد صدیقی	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۲۰/-
کلیات جرأت	نور الحسن ہاشمی	۲۰/-
زبان و مسائل زبان	عبد الغفار شکیل	۷/۵۰
لسانی و تحقیقی مطالعے	"	۱۰/-
عاشور نامہ	مسعود حسین خاں	۱۰/-
اردو شاعری میں قنوطیت	قاضی عبد الستار	۶/۲۵
انتخاب کلام شعرا نمبر	علیگڑھ میگزین	۱۰/-
وحید الدین سلیم	منظر عباس نقوی	۹/-
برگزیدہ شعر فارسی I	منیب الرحمن	۱۰/-
برگزیدہ شعر فارسی II	"	۱۰/-
جدید فارسی شاعری	"	۴/۵۰
ادبی تاثرات	ل احمد اکبرآبادی	۱۸/۷۵
صبح و شام (افسانے)	"	۱۲/۵۰
زندگی کے کھیل (")	"	۱۲/۵۰
ملاحظات نفسی (")	"	۷/۵۰

بال و پر	کنہیا لال کپور	12/=
دیوانِ غالب	نسخۂ عرشی	98/-
اردو ہندی ڈکشنری	انجمن ترقی اردو	50/=
اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبدالحق	6/=
حسرت موہانی نمبر	اردو ادب	20/=
حسرت موہانی قید فرنگ میں	عتیق صدیقی	15/=
آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	30/=
اردو شاعری میں خودداری	ڈاکٹر اسلام سندیلوی	6/=
اقبال کچھ مضامین	انجمن ترقی اردو ہند	15/=
الایام (خود نوشت)	ڈاکٹر طہٰ حسین	6/=
انجم کدہ	عزیز لکھنوی	4/=
انتخاب و شرح دیوانِ مومن	حامد حسن قادری	10/=
انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق	10/=
انواعِ فلسفہ	ظفر حسین خاں	5/50
آئینہ حقیقت	پنڈت حبیب الرحمٰن شائستہ	2/=
اردو ساہتیہ کا اتہاس ہند	احتشام حسین	7/25
اردو صرف و نحو	مولوی عبدالحق	8/=
اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	عنوان چشتی	14/=
اسلامی فن تعمیر	سید مبارزالدین رفعت	7/=
ایک مشرقی کتب خانہ		3/=
اقبال کے نثری افکار	عبدالغفار شکیل	10/50
اردو میں تمثیل نگاری	ڈاکٹر منظر اعظمی	30/=
انتخاب سکندر علی وجد	سکندر علی وجد	10/=
انتخاب سعید مشہدی	سعید مشہدی	2/=
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	10/=
بازدید	حبیب الرحمٰن	3/50
تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین شاغل	15/=
تذکرہ گلشنِ سخن	پروفیسر مسعود حسین رضوی	8/=
تاریخ ادبیات تاشقند	کبیر احمد جائسی	13/=

تقویم ہجری و عیسوی	محمد اسعد خاں	6/50
خسرو کا ذہنی سفر	ظ انصاری	10/=
خواب شیریں	جے کشن چودھری	2/=
دھمپد (منظوم ترجمہ)	منور لکھنوی	-/-
دیمک کی کہانی	ڈاکٹر عبدالبصیر خاں	2/=
دیوانِ ذکی	ڈاکٹر کامل قریشی	18/=
دلی کے اردو مخطوطات	صلاح الدین	12/=
روزگار شہرت سودا اور زر	ابو سالم	10/=
سبد رنگ	محمود سعیدی	5/=
سر سید کی صحافت	انور عباس	18/=
سخن محقق	معین احسن جذبی	2/=
سیر افلاک (عالم افلاک پر)	حکیم احمد	5/=
سوگوار یاد (مارڈ پیٹنی سن)	رحم علی الہاشمی	2/25
شادی کہانی شادی کی زبانی	محمد مسلم	-/-
شعور پنہاں	مجنوں گورکھپوری	1/50
صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	عتیق صدیقی	11/=
ظاہر و باطن (رشید ڈیش)	قیس الرحمٰن	1/25
فرانسیسی ادب	یوسف حسین خاں	30/=
غالب	خورشید الاسلام	6/=
فن شاعری (از یوسفی)	عزیز احمد	1/50
قومی یکجہتی اور سیکولرزم	شمیم حنفی	3/50
کلام سودا	خورشید الاسلام	6/=
کچھ زبان کی بات	ابو مسلم	2/50
کلیات شاہی	مبارزالدین رفعت	7/50
گاندھی اور ان کی راہ	سید عابد حسین	5/50
گل کرسٹ اور اس کا عہد	عتیق صدیقی	3/=
مذہب اور دھرم	قاضی عبدالغفار	3/=
مرزا محمد رفیع سودا	خلیق انجم	15/=
مقالات حالی حصہ اول	خواجہ الطاف حسین حالی	2/=
مرقع افغان	زہرا حسین فاروقی	-

مسافتِ شب	زبیر رضوی	۱۰/-
مطالعہ حضرت غمگین	محمد یونس خالدی	۲/-
صدا راحتش	منور لکھنوی	۳/۵۰
نقشِ صدا	رفعت سروش	۵/-
نفسیات اور جنسی حکایات	محشر عابدی	۴/۵۰
نسیمِ مغرب	امیر چند بہار	۳/۵۰
نیاز فتحپوری	امیر عارفی	۱۵/-
نفسیاتِ افواہ	ولی الرحمٰن	۱/۷۵
ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	عتیق صدیقی	۳۰/-
ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول	ایتور ٹوپا	۲/۲۵
ہجر کے موسم	شہریار	۱۰/-
نیم برہم	مظفر حنفی	۱۰/-
سموم و صبا	جوش ملیح آبادی	۳۰/-
اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم	حنیف کیفی	۲۰/-
مضمون نگاری	علامہ اخلاق دہلوی	۹/-
میزانِ سخن	"	۲/۵۰
روحِ بلاغت	"	۲/-
تفہیم بلاغت	"	۲/-
فنِ شاعری	علامہ اخلاق دہلوی	۹/-
علم بدیع	محترمہ ممتاز الرشید	۱/-
علم قافیہ	"	۱/-
اسبابِ بغاوتِ ہند	فوق کریمی	۵/-
محاوراتِ غالب	نریش کمار شاد	۳/-
سوزِ اقبال	منور لکھنوی	۳/-
ایک زندگی ایک صدی	تاجور سامری	۶/-
تین ہندوستانی زبانیں	کے۔ ایس بیدی	۱۲/-
وزنِ فن	ابوالبیان تشنہ	۵/-
اصنافِ سخن		۱/-
معاونِ اردو		۲/۵۰
عرفانِ حافظ	تیج ناتھ زار	۲/۵۰

مفتاح التواریخ	سردار گوبند پال سنگھ	۱۲/-
اسلام تلوار سے نہیں پھیلا (غیر مسلموں کی شہادتیں)	عبد [illegible]	۲/-
صحیفۂ کوکب	سنتوش کمار گھوروندی	۲/۵۰
اساسِ اردو		۶/-
صحتِ الفاظ	سید عابد الحسن	۵/-
اقبال کی زبانی / کچھ ان کی کچھ میری زبانی	ڈاکٹر ظہیرالدین ہاشمی	۱۰/-
فیروز اللغات		۲۴/-
باغ و بہار۔ تحقیق و تنقید کے آئینے میں	نسیم اختر	۶/۵۰
منٹو کا فن	سید وقار عظیم	۵/-
مرزا رسوا اور تہذیبی ناول	پروفیسر عبدالسلام	۴/-
قرۃ العین حیدر اور ناول کا جدید فن		۱۲/-
باغ و بہار مصور ایڈیشن	سلیم اختر	۱۵/-
آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ	سید سجاد	۸/-
جمیل	پریم چندر	۴/-
تنقید و تبصرہ۔ امراؤ جان ادا	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۴/-
مقدمہ آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۶/۵۰
تنقیدی دبستان	سلیم اختر	۲۰/-
علمی نقوش	ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	۲۰/-
اردو ادب میں طنز و مزاح	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۵/-
ہماری داستانیں	وقار عظیم	۲۵/-
مقدمات عبدالحق	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۵۰/-
اقبال اور [illegible]	ظفر اقبال	۱۰/-
فرہنگِ عامرہ	عبداللہ خویشگی	۳۰/-
جاوید نامہ مع شرح	یوسف سلیم چشتی	۵۰/-
زبورِ عجم کامل مع شرح	"	۹۰/-
مثنوی پس چہ باید کرد مع شرح	"	۵۵/-
پیامِ مشرق مع شرح	"	۴۵/-
اسرارِ خودی مع شرح	"	۶۵/-
رموزِ بیخودی مع شرح	"	۳۰/-

بانگِ درا	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۳۰/=
شرح بالِ جبریل	"	۲۰/=
شرح ضربِ کلیم	"	۱۶/=
ارمغانِ حجاز مع شرح	"	۱۲/=
شرح دیوانِ غالب	"	۵۰/=
عرفانِ اقبال	بشیر نقوی	۲۰/=
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	۳۰/=
مقاماتِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰/=
سرسید احمد اور نامور رفقاء	"	۲۵/=
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	۱۲/-
اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۳۰/=
اردو کیسے پڑھائیں	سلیم عبداللہ	۱۰/=
نادراتِ مرزا دبیر	سید صفدر حسین	۱۰/=
مقالاتِ آزاد	ابوالکلام آزاد	۱۰/-
انسانیت موت کے دروازے پر	"	۷/۵۰
انتخابِ معانی	اسلم رفیق	۶/=
اشاراتِ تنقید	سید عبداللہ	۲۵/=
اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری	۲۵/=
مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین	۲۰/-
مضامینِ اقبال	بہار [illegible]	۵۰/=
طنز نگاری کا فن	پروفیسر اسلم قریشی	۳۵/=
میرے دل میرے مسافر	فیض احمد فیض	۱۵/=
صدِ برگ	پروین شاکر	۱۵/=

آئینۂ ملفوظات

علامہ اخلاق حسین دہلوی ۱۴/=

سرسید اور علی گڑھ تحریک	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۴۵/-
روشنی کی رفتار	قرۃ العین حیدر	۳۰/=
اقبال کی اردو نثر	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰/=
چوٹیں	عصمت چغتائی	۲۶/=
اقبال معاصرین کی نظر میں	وقار عظیم	
اردو تنقید نگاری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۰/=
اقبال شاعر اور فلسفی	وقار عظیم	۲۰/=
چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	۳۰/-
ہمارے پسندیدہ افسانے	اطہر پرویز	۱۵/=
چوٹیں	عصمت چغتائی	۱۲/=
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۱۵/-
فکرِ اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	۱۰/=
اقبال فن اور فلسفہ	نورالحسن ہاشمی	۷/۵۰
غالب تقلید اور اجتہاد	خورشید الاسلام	۱۰/=
لطائفِ غالب	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰/=
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۱۵/-
خطوطِ غالب فنی تجزیہ	حامد مسعود	۲۰/=
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۷/۵۰
تصوراتِ اقبال	صلاح الدین احمد	۱۵/=
مضامینِ نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۵/=
تنقیدیں	خورشید الاسلام	۳۰/=
ہنستا سا چہرہ	ڈاکٹر محمد حسین	۱۵/=
ادبی تحقیق مسائل و تجزیہ	رشید حسن خاں	[illegible]
تنقیدی تناظر	ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/=
انیس شناسی	ڈاکٹر فضل امام	۱۶/-
احساس و ادراک	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۲/-
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۲۰/=
چہرہ پس چہرہ	ڈاکٹر ابن فرید	۲۵/=
میں ہم اور ادب	"	۲۰/=
ناول کا فن	ابوالکلام قاسمی	۱۵/=
شعر نظم اور شعر	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	۷/۵۰
اردو قصیدہ نگاری	ڈاکٹر ام ہانی اشرف	۳۵/=
کلاسیکیت و رومانیت	"	۱۲/=
سرسید اور علی گڑھ تحریک	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۴۵/-
سرسید ایک تعارف		۲/=
سرسید اور ہندوستانی مسلمان	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۲۰/=
انتخابِ مضامینِ سرسید	آلِ احمد سرور	۶/=

غزل کا نیا منظر نامہ	ڈاکٹر شمیم حنفی	۱۰/-
غزل اور درسِ غزل	اختر انصاری	۸/-
آج کا اردو ادب	ابواللیث صدیقی	۱۶/-
جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۲۵/-
غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۳۰/-
شہرت کی خاطر	نظیر صدیقی	۱۵/-
تنقید اور احتساب	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۵/-
ستارہ یا بادبان	محمد حسن عسکری	۱۵/-
انسان اور آدمی	"	۱۰/-
اسلوب	عابد علی عابد	۲۰/-
آغا حشر اور اردو ڈرامہ	انجمن آرا	۳۶/-
یونانی ڈرامہ	عتیق صدیقی	۲۰/-
اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۴۰/-
اردو ڈرامہ کا ارتقا	عشرت رحمانی	۳۰/-
پریم چند کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر قمر رئیس	۱۲/-
منٹو کے نمائندہ افسانے	ڈاکٹر اطہر پرویز	۱۲/-
اردو کے تیرہ افسانے	"	۱۲/-
نمائندہ مختصر افسانے	طاہر فاروقی	۶/-
کرشن چندر کے نمائندہ افسانے	اطہر پرویز	۱۲/-
چار ناولٹ	قرۃ العین حیدر	۳۶/-
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے		۲۶/-
نیا افسانہ	وقار عظیم	۲۰/-
مثنوی گلزار نسیم	مقدمہ ظہیر احمد صدیقی	۶/-
مثنوی سحر البیان	"	۵/-
مجموعۂ نظم حالی	"	۷/۵۰
انارکلی	مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن	۹/-
امراؤ جان ادا	مقدمہ تمکین کاظمی	۱۲/-
موازنۂ انیس و دبیر	مقدمہ فضل امام	۱۲/-
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ وحید قریشی	۱۲/-
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۱۲/-
ادب میں جمالیاتی اقدار	ظہیر صدیقی	۱۰/-

کلیاتِ اقبال (عکسی)	بہ تصحیح غلام رسول مہر	۳۵/-
دیوانِ غالب (عکسی)	نور الحسن ہاشمی	۱۸/-
کلامِ فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۲۰/-
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۴/-
نشانِ منزل	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۴۴/-
طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ	خواجہ عبد الغفور	۴۰/-
اے پیارے لوگو	پروفیسر وارث علوی	۴۰/-
اردو شاعری میں اشاریت	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	۴۶/-
ادب کی پرکھ	ڈاکٹر [illegible]	۳۰/-
نکاتِ زباندانی	ہیمنت رائے شرما	[illegible]
میرے خیال میں	پروفیسر نظیر صدیقی	۲۸/-
تلاش و تعبیر	ڈاکٹر منظر اعظمی	۳۶/-
زندگی کی حقیقتیں	شمس الدین	۲۶/-
قصۂ جدید و قدیم	مخمور سعیدی	۱۸/-
راجستھانی زبان و ادب	فضل امام	۱۸/-
محاورۂ غالب	پریم پال اشک	۴۰/-
نسوانی محاورے	وحیدہ نسیم	۱۸/-
افکارِ عبد الحق	آمنہ صدیقی	۳۵/-
مذہب اور سائنس	عبد الحق	۱۱/-
لاہور کا جو ذکر کیا	گوپال متل	۱۵/-
مکاتیبِ احسن اول	ڈاکٹر عنوان چشتی	۲۵/-
مکاتیبِ احسن دوم	"	۲۵/-
اقبال: ایک ادبی سوانح حیات	جگن ناتھ آزاد	۲۵/-
حرفِ راز اقبال کا مطالعہ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	[illegible]
گوپال متل شخصیت اور فن	ک۔ ر۔ ہاشمی	۵۰/-
ن۔ م۔ راشد "	شہریار	۴۶/-
منٹو "	پریم گوپال متل	۴۰/-
میراجی "	کمار پاشی	۴۰/-
شاعرِ آخر الزماں جوش ملیح آبادی	فضل امام	۳۰/-
ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	۳۰/-
ڈاکٹر فضل امام ایک مطالعہ	خوشتر گرامی	۴۰/-

کالی داس گپتا رضا شخصیت اور فن	ظفر ادیب	۳۰/-
آنکھیں ترستیاں ہیں	جگن آزاد	۳۶/-
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	۳۰/-
ڈاکٹر ذاکر حسین	عبداللطیف اعظمی	۹/-
بسمل سعیدی شخص و شاعر	پریم گوپال متل	۱۸/-
گوپال متل ایک مطالعہ	عبدالحکیم	۱۵/-
جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں	عزیز احمد	۱۲/-
گریز	"	۳۵/-
تمہارے کوچے سے ہم نکلے	عطیہ پروین	۳۵/-
دل کے دروازے	"	۲۵/-
جاتی ہوئی رت	کشمیری لال ذاکر	۳۰/-
کرماں والی	"	۲۰/-
واپسی	آمنہ ابوالحسن	۱۸/-
عداوت	مالا دوبے	۲۵/-
نگارینہ	ثریا محمود زرست	۲۵/-
ناطرہ	ہاجرہ نازلی	۲۵/-
سپنے کب اپنے	فرخندہ شمیم	۲۴/-
زرد چاندنی	عقیلہ ہما	۳۰/-
غم کے سائے	بیگم محمودہ	۳۵/-
سلمٰی سے دل لگا کر	اختر شیرانی	۱۸/-
سو کینڈل پاور کا بلب	منٹو	۱۸/-
ایک ٹانگ کی گڑیا	کنور سین	۳۰/-
برف پر مکالمہ	سریندر پرکاش	۱۸/-
سترہ افسانے	انتظار حسین	۱۸/-
ہندوستان	ہمت رائے شرما	۱۰/-
نیا اردو افسانہ	کمار پاشی	۱۸/-
اداس شام کے آخری لمحے	کشمیری لال ذاکر	۱۲/-
یادل گر ہیں جمنا پار	سدرشن شرما	۱۸/-
پھول کھلے ویرانے میں	حسن نجمی	۱۰/-
خالی خانے	اتل ٹھکر	۱۸/-
چاند سے پیاری تنگ	ودیا آنند	۱۸/-

تین چہرے ایک سوال	کشمیری لال ذاکر	/۵۰
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۶/-
ملک کا ریوق	عبدالسلام خاں	۱۰/-
افسانے کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۷/۵۰
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغرٰی	[illegible]
امیر خسرو حیات اور شاعری	پروفیسر ممتاز حسین	-/-
مطالعہ غبار خاطر	عبدالقوی دسنوی	۳/-
واردات	پریم چند	۴/۵۰
گئودان	"	۲۰/-
میدانِ عمل	"	۲۰/-
بیوہ	"	۶/-
فراق شاعر اور شخص	شمیم حنفی	۳۵/-
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/-
سر سید احمد ایک سیاسی مطالعہ	عتیق صدیقی	۲۰/-
اردو گیت	ڈاکٹر قیصر جہاں	۱۲/-
اقبال دانائے راز	عبداللطیف اعظمی	۱۵/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین	۱۳/۷۵
اردو میں رپورتاژ نگاری	عبدالعزیز	۳۰/-
بوڑھا درخت	(مطالعہ ضیا فتح آبادی) زیر ثانی	۱۵/-
اردو ادب میں سکھوں کا حصہ	امام مرتضیٰ نقوی	۲۵/-
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں	۲۰/-
پچھا پچھان	اتیا علی عرشی	۱۰/-
بہو کی تلاش	آنسہ نورالحسن صدیقی	۱۲/-
شیشہ کیا سوچتا ہوگا	سید رفیق حسین	۲۰/-
زرد سنولال	غلام عباس	۹/-
غم نشاط	شوکت تھانوی	

اور دیگر ادبی کتب کا مرکز

ماہنامہ **شان ہند**

فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ

دریا گنج نئی دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۲

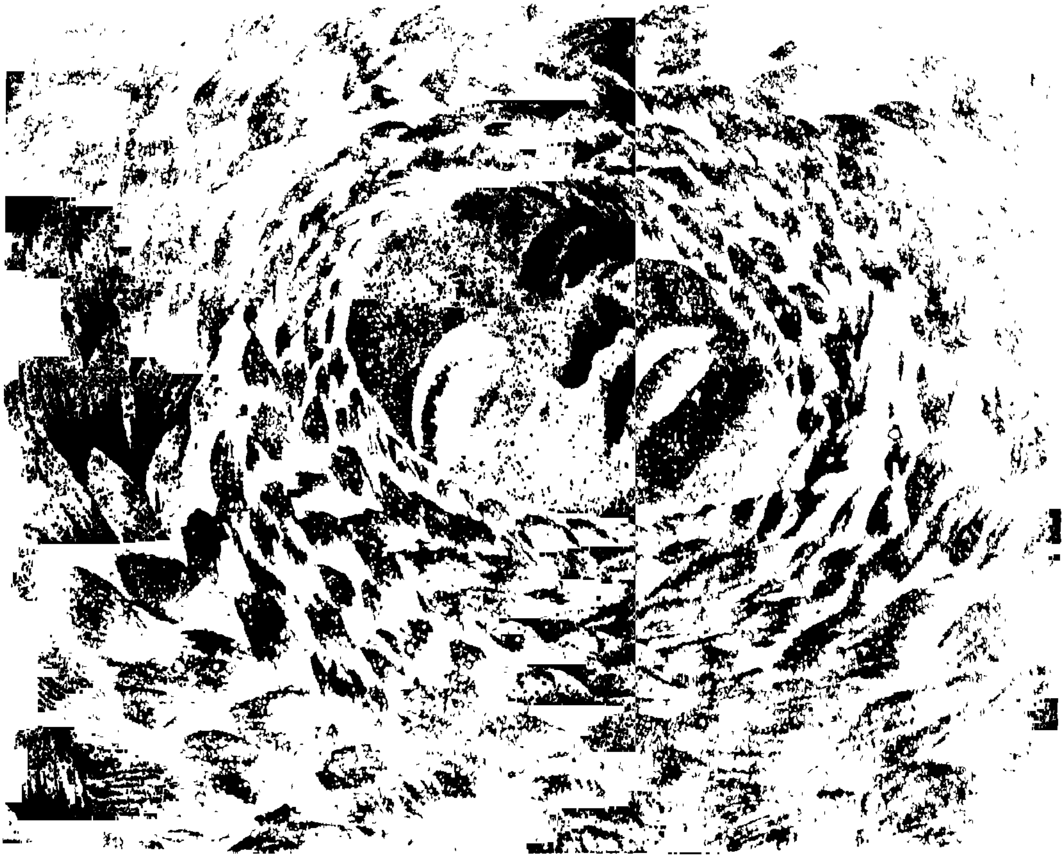


چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھتے ہی گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے یا گرمی دانے خود بخود تو دور نہیں ہوں گے۔ انہیں دور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیہ۔ یہ ایک یونانی دوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جلد جل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سیہ تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنانے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور نتیجہ آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیہ کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت: چھ روپے

شمع لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ١١٠٠٠٦

AUGUST 1- 5 ... 1-27302
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-1100..
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/5.




12-11-83


ذرا ٹھہریئے!

ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ — رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
— یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

شمارہ نمبر ۱۰	اکتوبر ۱۹۸۳ء	جلد نمبر ۴۴

[illegible]

حق و صداقت کا امین

توصیف علوی عاصی
کیرانوی

وہ کہ دشرتھ کا دلارا دن صداقت کا امیں
وہ کہ جو آیا تھا بنکر حاملِ عزم و یقیں

وہ کہ تھا اُنس و محبت کا جہاں میں دیوتا
وہ کہ تھا جو درحقیقت پیکرِ صدق و صفا

وہ کہ جس کی زندگی آئینۂ کردار ہے
وہ کہ جس کا درس ہر اک آدمی سے پیار ہے

وہ کہ جو آیا تھا لے کر "ربطِ باہم" کا پیام
وہ کہ جس نے دونوں ہاتھوں سے دئے الفت کے جام

وہ کہ دُنیا کو دیا جس نے کہ اک درسِ حیات
وہ کہ جس کے پاس تھی اخلاصِ دل کی کائنات

وہ کہ جس کو "قول" کی پابندیوں کا پاس تھا
وہ کہ خوابوں کا محل جس کے لئے بن باس تھا

وہ کہ جس نے توڑ ڈالی "ہر تکبر" کی کماں
وہ کہ جس کی زندگی تھی حق پرستی کا بیاں

وہ کہ "مخفی قوتوں" کا جو حقیقی راز تھا
وہ صحیح معنوں میں جو فطرت کا اک غمّاز تھا

وہ کہ جس نے ڈھا دئے باطل کی طاقت کے ستوں
وہ کہ جس نے کر دئے راون کے پرچم سرنگوں

وہ کہ جس نے "بھیلنی" کی کر کے مہمانی قبول
زندگانی کے سکھائے ہیں زمانے کو اصول

وہ کہ جس کا ہر قدم تھا منزلوں کا رازداں
وہ کہ جس کی زندگی تھی اک مسلسل داستاں

وہ روایاتِ مجلّیٰ کا زمانے میں امیں
وہ کہ تھا انسانیت کا ایک پیکر بالیقیں

وہ کہ جس کی زندگی تھی اک نئی شرحِ وفا
وہ کہ جو اقدارِ روحانی کا تھا اک آئینہ

وہ کہ جس نے دی اندھیروں کو نئی تابندگی
وہ کہ روشن کر دئے جس نے چراغِ زندگی

وہ کہ دُنیا کو دیا جس نے محبت کا پیام
وہ کہ کندہ ہے ہر اک انساں کے دل پہ جس کا نام

دوبارہ کاتب مفتی سرورؔ تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس [illegible] سے چھپوا کر [illegible] سے شائع کیا

چند قابلِ مطالعہ کتابیں

دیوانِ غالب	نسخۂ حمیدیہ	۱۴/-
افادات (علم العروض)	خورشید لکھنوی	۵/۷۰
اردو تنقید کی تاریخ	مسیح الزماں	۶/-
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	پروفیسر احتشام حسین	۱۴/۷۵
کلیاتِ میر	ظلِ عباس عباسی	۵۲/-
کلیات سراج اورنگ آبادی	ترقی اردو بیورو	۴۴/-
قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	۲۷/-
بہت دیر کر دی (ناول)	علیم مسرور	۹/-
آبِ حیات	محمد حسین آزاد	۹/-

انتخابِ سخن	مرتب حسرت موہانی	
جلد اوّل	سلسلۂ شاہ حاتم	۱۰/-
جلد دوم	سلسلۂ ذوق	۱۰/-
جلد سوم	سلسلۂ مومن	۱۰/-
جلد چہارم	سلسلۂ مظہر جان جاناں	۱۰/-
جلد پنجم	سلسلۂ جرأت	۹/-
جلد ششم	سلسلۂ مصحفی	۱۰/-
جلد ہفتم	سلسلۂ آتش	۹/-
جلد ہشتم	سلسلۂ امیر داغ	۱۵/-
جلد نہم	سلسلۂ ناسخ	۱۸/-
جلد دہم	سلسلۂ غالب	۱۰/-
جلد یازدہم	سلسلۂ اساتذہ متفرق	۱۶/-
قیمت مکمل سیٹ		۱۲۷/-

تذکرہ گلستانِ سخن	مرزا قادر بخش صابر	۱۸/۶۰
گلشن بے خار	مصطفیٰ خاں شیفتہ	۱۰/۹۰
تذکرہ گلستانِ بے خزاں	قطب الدین باطن	۱۲/۲۵
مکاتیب مہدی افادی	بیگم مہدی	۱۳/-
طبقات شعرائے ہند	کریم الدین	۲۴/-
قدیم مغربی تنقید	کلیم الدین احمد	۶/-

اردو مثنوی کا ارتقاء شمالی ہند میں	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۱۵/-
ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	۵/-
بنات النعش	"	۵/-
توبۃ النصوح	"	۶/-
مرأۃ العروس	"	۶/-
پنجاب میں اردو	پروفیسر محمود شیرانی	۱۲/۷۵
یادگارِ غالب	الطاف حسین حالی	۸/-
حیاتِ سعدی	"	۱۰/-
ناٹک ساگر	محمد عمر و نور الٰہی	۱۹/-
روحِ رواں	جگت موہن لال رواں	۹/-
مقدمۂ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	۵/-
زرد پتوں کی بہار	رام لعل	۱۱/۸۰
کلیاتِ ذوق	تنویر احمد علوی	۲۰/۵۰
اردو ہندی ڈکشنری	انجمن ترقی اردو	۵۰/-
صرف و نحو	مولوی عبدالحق	۸/-
اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	"	۶/-
انتخابِ کلامِ میر	"	۱۰/-
عروض آہنگ اور بیان	شمس الرحمٰن فاروقی	۳۰/-
الف لام میم (افسانے)	کلام حیدری	۱۵/-
بے نام گلیاں (")	"	۱۰/-
بابا لوگ (")	غیاث احمد گدی	۸/-
نئے افسانے کا سلسلہ عمل	مہدی جعفر	۳۰/-
زاویۂ نگاہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	۲۶/-
اپنی تلاش میں	کلیم الدین احمد	۲۰/-
شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری	ڈاکٹر وہاب اشرفی	۴۰/-
ارتقاء افسانوی سیریز سلسلہ نمبر ۱		۱۵/-

دفتر شانِ ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بُلبُل چہ گُفت؟ گُل چہ شُنید؟ وصبا چہ کرد؟

شاہد پرویز — "خود را میاں فضیحت"

"بیسویں صدی" میں مالک رام صاحب کے خلاف "ہز ماسٹرز وائس" شاہد پرویز کی بکواس کو جس اہتمام سے شائع کیا گیا اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے جو گھٹیا طریقے استعمال کئے گئے "بیسویں صدی" کے مالک و مدیر جناب رحمٰن نیّر سے اس قسم کی امید نہیں تھی، ہمارے لئے یہ انکشاف واقعی حیران کن ہے کہ رحمٰن نیّر صاحب نے بہ نفس نفیس مضمون نگاروں اور اردو کے دانشوروں سے یہ درخواست کی کہ وہ مالک رام صاحب کے خلاف لکھیں۔ خوشتر گرامی صاحب کی ملکیت و ادارت میں "بیسویں صدی" کو اردو کا ایک صاف ستھرا ماہنامہ تسلیم کیا جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ رحمٰن نیّر صاحب نے "بیسویں صدی" کو اب اردو زبان کو نقصان پہنچانے کی راہ پر لگا دیا ہے۔

"شان ہند" نے اس سلسلے میں شاہد پرویز اور ان کے حواریوں کا جو محاسبہ کیا ہے اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ "بیسویں صدی" کی حالیہ اشاعت میں مالک رام صاحب کے خلاف اس گندی تحریک کو متحرک نہیں رکھا گیا۔ خدا کرے کہ رحمٰن نیّر صاحب کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا ہو کہ "بیسویں صدی" کی اس حرکت سے اردو کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔

ویسے "بیسویں صدی" کے مدیر محترم جناب رحمٰن نیّر اور عام قارئین کی واقفیت کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مالک رام اور ان کی چوریوں کو گنوانے والے "ہز ماسٹرز وائس" شاہد پرویز خود ادبی حیثیت سے ایک پیشہ ور چور ہیں۔ ابن صفی پاکستانی مشہور ناول نگار کے ناول انہوں نے حرف حرف اپنے نام سے "شمع گرد پ" کے ماہنامہ "مجرم" میں شائع کرائے اور معقول معاوضہ حاصل کیا۔ مجرم کے قارئین نے سینکڑوں خطوط سے مالکانِ شمع کو اس چوری کے بارے میں خطوط لکھے تو انہوں نے آئندہ کے لئے شاہد پرویز پر لعنت بھیج دی۔

اس سلسلے میں ہمارے ہاں درجنوں خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں جناب ابو محمد شبلی لکھنؤ کا مکتوب گرامی خاصی اہمیت رکھتا ہے جس میں انہوں نے انکشاف فرمایا ہے کہ "اردو تحقیق اور مالک رام" کتاب کو شان ہند نے حرامی اولاد کیونکر لکھ دیا جب کہ اسے فلاں صاحب نے مرتب کیا اور فلاں ادارے کی طرف سے فلاں پریس میں چھپوایا گیا اور یہ کتاب ملک بھر میں کتب فروشوں نے فروخت کی۔

اس سلسلے میں ابو محمد شبلی صاحب کی واقفیت کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ آپ نے جن ناموں کی وثوق سے نشاندہی فرمائی ہے یہ سب حلفیہ بیان دے چکے ہیں کہ ایسا کہنا انہیں بدنام کرنا ہے اور یہ ایک بدترین بہتان ہے جو ان پر لگایا گیا ہے۔ ابو محمد شبلی صاحب نے جس مفروضہ یا اصلی مرتب کا نام اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے انہیں مدیر شان ہند نے فون پر مطلع کیا تو وہ فرمانے لگے کہ آپ یہ خط شان ہند میں شائع کیجئے تاکہ میں ابو محمد شبلی پر مقدمہ دائر کر سکوں کہ وہ میرا نام اس "حرامی اولاد" کتاب کے مرتب کے طور پر لیسے رہے ہیں — شبلی صاحب کو غالباً یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کتاب کی فروختگی میں دہلی کے کسی کتب فروش نے بھی کسی کو کمیشن میمو نہیں دیا۔ اگر شبلی صاحب بذریعہ شان ہند ملک بھر کے کسی ایسے کتب فروش کی نشاندہی فرمائیں کہ جس نے اس کتاب کی فروختگی پر کمیشن میمو جاری کیا ہو تو شان ہند کی جانب سے اب بھی

عدالتی طور پر اس کتب فروش سے محاسبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ کتاب کہاں سے لے کر فروخت کی۔ جن حضرات کے مضامین اس کتاب میں شائع کئے گئے ہیں، ہمیں ان کے بارے میں کوئی شکایت نہیں، اور نہ ہی ہمیں اس سے بحث ہے کہ مالک رام صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ ہمارا کہنا تو صرف یہ ہے کہ "اردو تحقیق اور مالک رام" کتاب کی اشاعت بھی کوئی گناہ یا قانونی خلاف ورزی نہیں ہے، مگر اسے جس خفیہ انداز میں "ناجائز اولاد" کی طرح جن کر گھورے پر پھینک دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جن مخالفین مالک رام کے تعاون سے یہ "ناجائز اولاد" ظہور پذیر ہوئی وہ خود اس کی غمازی کرتے ہیں کہ محض مالک رام صاحب کو بدنام کرنے اور ان کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کمینہ حرکتیں ہیں، اور کمینہ حرکتوں کے وہی لوگ مرتکب ہوتے ہیں جنہیں اپنی پیدائش کے بارے میں یہ شک ہوتا ہے کہ وہ کسی شریف کی اولاد ہیں یا محض مانگے کا اُجالا۔

اگر رحمٰن نیر صاحب "بیسویں صدی" میں اتنی وسعت نکال سکیں کہ ہمارے ہاں شاہد پرویز صاحب کے سلسلے میں موصول ہونے والے خطوط کو شائع کر سکیں تو یقیناً ان کا ان کے ذہن پر احساس ہوگا تاکہ بیسویں صدی کے قارئین بھی باخبر ہو سکیں کہ رحمٰن نیر صاحب کیسی کیسی اردو دشمنا د چالوں میں اپنی سادہ لوحی سے پھنس کر اپنی معقول شخصیت کو مجروح کر لیتے ہیں۔

دلہنوں کو جلانے کی وبا مسلمانوں میں بھی پھیل رہی ہے

آئے دن جہیز کی کمی یا مزید جہیز اور روپیہ کا مطالبہ پورا نہ ہونے پر ہندو گھرانوں میں نوجوان دلہنوں کو جلانے یا بہو رونہ کے سسرالی مطالبے اور مارپیٹ نیز بدسلوکی سے تنگ آکر خودکشی کے واقعات کی تفصیلات اخبارات میں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ چونکہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اس لئے مسلم معاشرہ میں بھی یہ بدعت پھیل رہی ہے چنانچہ اخباروں میں مسلم گھرانوں میں دلہنوں کو جلائے جانے کے واقعات بھی شائع ہو رہے ہیں۔

پچھلے دنوں بھنڈی بازار بمبئی کے مشہور نور محمدی ہوٹل کے مالک جناب عبد الحکیم کی صاحبزادی زرین کے افسوسناک انتقال کی خبر "اخبار عالم" بمبئی میں جس تفصیل سے شائع ہوئی ہے اسے ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ ہم بمبئی کے پولیس کمشنر سے گزارش کریں گے کہ وہ اس معاملہ میں ذاتی طور پر توجہ دیں۔

اسٹو سے جلنے اور پھر اسپتال میں انتقال کر جانے والی زرین کے والد جناب عبد الحکیم ابراہیم، مالک نور محمدی ہوٹل واقع وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار کا ڈونگری پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر آف پولس کے نام شکایت نامہ یوں ہے۔

میری بیٹی زرین کے جلنے کی خبر میرے داماد اقبال شاہد نے رات ۲ بجے دی جب کہ یہ واقعہ ۱۰ بجے رات میں ہی ہو چکا تھا۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ میرے داماد کا گھر پانڈا بلڈنگ میں ہے جو میری ہوٹل کے سامنے سڑک کے پار ہی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ میرے داماد اقبال شاہد نے رات ۲ بجے اس واقعہ سے مطلع کرنے کی زحمت کیوں کی؟ تاکہ اس کے دل میں کوئی "پاپ" نہ چھپا ہو۔

مجھے اپنی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ میری بیٹی زرین کے جل جانے کے بعد سے میرے داماد اقبال رشاہد نے پانڈا بلڈنگ سے اپنے والد کے گھر واقع بی آئی ٹی بلاک تک پیدل جانے پر مجبور کیا۔ میری بیٹی زرین نے کہا بھی کہ اس بی آئی ٹی بلاک میں واقع اپنے خسر اقبال کے والد کے تیسری منزل پر واقع گھر تک جانے کی تاب نہیں ہے لیکن اسے مجبور کر کے لے جایا گیا۔ واضح ہو کہ میرے داماد اقبال کا گھر پانڈا بلڈنگ کے چوتھے منزل پر ہے۔

اس کے بعد میری بیٹی زرین کو ان کے فیملی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تاکہ کسی طرح مرہم پٹی کر کے معاملہ کو دبا دیا جائے لیکن فیملی ڈاکٹر نے انکار کر دیا کیونکہ اسے شبہ ہو گیا کہ "معاملہ کچھ گڑبڑ ہے" اس نے زرین کو جے جے اسپتال میں داخل کروانے کو کہا اور ایک چٹھی بھی دی

زرین کو جے جے اسپتال لیجایا گیا۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ میری بیٹی زرین کے جل جانے کے واقعے سے پڑوسی قطعی لاعلم تھے۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میری بیٹی زرین نے پولیس میں جو بیان دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بتی والے اسٹو سے جل گئی ہے لیکن یہ قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ بتی والا اسٹو خطرناک نہیں ہوتا۔ میں آپ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی کا شوہر اقبال (شاہد) واقعہ کے وقت گھر میں موجود تھا۔ اگر میری بیٹی حادثاتی طور پر آگ کی لپیٹ میں آگئی تھی تو ۴-۵ فٹ کے فاصلہ پر موجود شوہر کے لئے اس کو بچانے کی کوشش میں کون سی چیز حائل تھی؟ مگر چوں کہ اقبال (شاہد) کا منشا ہی میری بیٹی کو مار ڈالنے کا تھا اس لئے اس نے کوشش نہیں کی۔ یوں بھی اقبال (شاہد) اور اس کی ماں کے میری بیٹی زرین سے تعلقات اچھے نہ تھے اور ان کی بدسلوکی اور تعلقات میں کشیدگی کی ابتدا شادی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے ہو چکی تھی۔ میری بیٹی زرین کی شادی ۱۶ ماہ پہلے ہوئی تھی۔

میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی زرین سات ماہ کے حمل سے تھی۔ ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ماں بنے اور کوئی عورت حمل کے ایام میں خودکشی نہیں کر سکتی میری بیٹی کے بدن کا ۹۰ فیصد حصہ آگ نے چاٹ لیا تھا اور رحم مادر میں وہ بچہ جو عالم وجود میں نہ آسکا اس طرح اینٹھ گیا تھا جیسے کوئی پرندہ آگ پر چڑھی ہوئی ہانڈی میں بھن جائے۔

میں مزید کہنا چاہتا ہوں کہ پہلے میں نے اور میری بیوی نے جو بیان دیا تھا وہ دباؤ اور ذہنی انتشار و پریشانی کے عالم میں دیا تھا چنانچہ میری بیوی کا پہلا بیان کالعدم سمجھا جائے۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر پورے وثوق کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ چوں کہ میری بیٹی زرین اور اس کے شوہر اور اس کی ساس یعنی اقبال (شاہد) کی ماں میں ناچاقی تھی اس لئے میری بیٹی کے جلنے کا واقعہ اقبال (شاہد) اور اس کی ماں کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔

ان حالات کے پس منظر میں، میرا کہنا یہ ہے کہ یہ قتل عمد کا معاملہ ہے اور برائے کرم اپنے محکمہ کے ذریعے اس سارے معاملہ کی تحقیقات کروائیے۔ میں آپ کی جانب سے فوری اقدام کا منتظر ہوں۔

(**نوٹ**) پولیس میں درج شکایت کی انگریزی زبان کی کاپی کے ساتھ زرین کے والد جناب عبدالحکیم ابراہیم سے منسوب ایک بیان اردو میں بھی (زیروکس کاپی) ہمیں موصول ہوا ہے۔ اسے بھی ہم بجنسہٖ شائع کر رہے ہیں۔

لڑکی نے آخر دم تک یہی بیان دیا کہ میں دودھ گرم کرتے ہوئے جلی ہوں۔ اسٹو میں سے پچکاری نکل کر کپڑوں میں آگ لگ گئی جب کہ پنچ نامہ میں پمپ کا اسٹو نہیں ملا ہے بلکہ بتی والا چولہا ملا ہے دودھ بھی وہاں پر موجود نہیں تھا دودھ فریج میں تھا۔ لڑکی نے یہ بیان صرف اس لئے دیا ہوگا کہ پہلی بات تو یہ کہ اس غلط فہمی میں رہی کہ میں اچھی ہو کر اپنے گھر چلی جاؤں گی دوسری یہ کہ اگر ساس کا یا شوہر کا اس معاملے میں نام لے دیا تو میرے میکے والوں اور سسرال والوں میں جھگڑا نہ ہو جائے۔ اپنی بہنوں اور عزیزوں سے یہی کہتی رہی کہ میں اچھی ہو جاؤں گی تو بتا دوں گی اور آخر اچھی نہ ہوئی اور مر گئی۔

تعجب اس بات پر ہے کہ لڑکی کے برابر میں اس کی نند شوہر کی بہن فوزیہ اور بہنوئی رہتے ہیں اس حادثے کا نہ انہیں علم ہوا اور نہ ہی کسی پڑوسی کو اور جس روم میں یہ لوگ رہتے ہیں 15 × 2 اکا ہوگا۔ یہ ناممکن بات ہے کہ اتنا روم میں کوئی جلے اور شوہر بھی موجود ہو تو ۹۰ فیصد جل جائے ممکن ہے ویسے بھی فوراً بچایا جا سکتا تھا اس کے شوہر کا بایاں ہاتھ وہ بھی نیچے سے تھوڑا پہونچا جلا ہے جو کہ جلنے والے کو بچانے میں اس طرح نہیں جل سکتا۔ اب سے چھ مہینے پیشتر جب زرین سسرال کے ہمراہ رہتی تھی تو ایک مرتبہ اس کو گھر سے نکال دیا تھا دو روز کے بعد ہم اپنی بیوی کے ہمراہ اپنی لڑکی کو اس کے سسرال لے گئے اور بحث و مباحثہ کر کے اپنی لڑکی سے معافی منگوادی تھی اور وہاں پر چھوڑ دیا تھا یہ سمجھ کر کہ گھر

بتاسکے اور نہ بھلائے جب ہم نے معافی منگوائی تھی اس وقت لڑکی کے شوہر کی دو بہنیں عذرا اور نسرین کے علاوہ ان کے یہاں کام کرنے والی بُوا اور ان کے والدین بھی موجود تھے شادی کے تھوڑے سے عرصہ بعد سے لڑکی کی ساس اور لڑکی میں کشیدگی شروع ہوگئی تھی ہمارے یہاں کسی کو ان کے یہاں جانے کی اجازت نہیں تھی سابھی تینوں بھیوں سے دونوں میاں بیوی اپنے الگ گھر میں رہا کرتے تھے مگر لڑکی کی ساس روزانہ وہاں جاتی تھی اور حادثہ والے دن شام کو بھی وہاں گئی تھیں۔

کشیدگی کی وجہ یہ تھی کہ آج تک ہم نے اپنی لڑکی کا گھر تک نہیں دیکھا تھا لڑکی کی ساس کا باربار یہ بھی کہنا تھا کہ تمہارے ماں باپ کے دو ہوٹل ہیں انہوں نے تمہیں کیا دیا ان تمام باتوں کے باوجود بھی لڑکی جب جلی تھی ہم نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے یہی سوچا تھا کہ دو تین دن میں اچھی ہو کر اپنے گھر چلی جائے گی۔

ہم سے جو بھی ہو سکا علاج میں کمی نہیں کی اور ۲۹ راگست کو ہم نے ڈونگری پولیس میں شکایت کر دی کہ ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے ہمیں انصاف دلایا جائے اور آخرکار ۳۰ راگست دوپہر ایک بجے ہماری لڑکی کا انتقال ہوگیا۔

ٹی۔وی۔اناؤنسر

ریڈیو اناؤنسر کی خصوصیت صرف اس کی دلپذیر اور قوتِ سامعہ کو راحت بخشنے والی آواز تک محدود ہوتی ہے کیونکہ ریڈیو سننے والوں کو صرف صوتی اقدار سے ہی واسطہ ہوتا ہے ان کی بلا سے اناؤنسر کیسی شکل و صورت کا مالک ہے مگر ٹیلی ویژن کے اناؤنسر خواہ خواتین ہوں یا مرد انہیں بھرتی کرتے وقت اس امر کا خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ آواز کی دلکشی کے ساتھ ساتھ ان کی شکل و صورت بھی قبولِ نظر ہو کیونکہ ٹی۔وی دیکھتے وقت معاملہ صوتی اور صوری دونوں اقدار سے دیکھنے والوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں سفارشوں کے باعث وزیروں اور ان کے چہیتے امیدواروں کو ہر ملازمت کے انتخاب میں اولیت نصیب ہوجاتی ہے خواہ وہ اس آسامی کے قابل ہوں یا نہ۔ یہی حال دوردرشن میں بھی کارفرما ہے چنانچہ ایسے ایسے اناؤنسرز (خواتین اور مرد) ٹی وی پر نمودار ہوتے ہیں جن کی نہ تو آواز کی ہی تعریف کی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان کی ظاہری شکل و صورت پر نظر ٹھہرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوردرشن پر کچھ خواتین اور مرد اناؤنسرز واقعی قابلِ تعریف حد تک صوتی اور صوری اقدار پر پورے اُترتے ہیں مگر زیادہ تر اناؤنسرز دوردرشن کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اور کلر ٹی وی پر تو اس قسم کے اناؤنسرز کی حالت اور بھی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے ہم یہ نہیں کر سکتے کہ وزیروں یا صاحبِ اقتدار لوگوں کی سفارشوں پر کوئی قید لگا سکیں مگر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو ٹی وی اناؤنسرز کی بجائے کسی ٹیبل ورک آسامی پر لگایا جا سکتا ہے مگر ٹی وی کے ذریعے عوام کو بھرپور لطف اٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کم از کم اناؤنسرز کے بارے میں خوش ذوقی اور خوش نظری کا ثبوت دیں گھٹیا قسم کے پروگرام پر تو ٹی۔وی بند کیا جا سکتا ہے مگر اہم اعلانات یا خبریں وغیرہ سنتے وقت تو ٹی وی بند نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے وزیرِ متعلقہ جناب بھگت صاحب اگر عوام کے اس مطالبہ کو بھی ٹی۔وی کی مقبولیت کے لئے ضروری سمجھیں تو یہ ان کی خوش ذوقی اور خوش نظری کی دلیل ہوگی۔ ••

(صـ کا بقیہ)

غیر متوازن ہونے کا ایک ثبوت بھی پیشِ خدمت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کثرتِ شراب نوشی یا بڑھاپے کے باعث ہی ہو لیکن یہ بات ایک اونچے درجے کے ادیب کے کسی بھی حالت میں شانِ شایاں نہیں ہے۔ ابھی صورت یہ ہے کچھ سال پہلے فراق صاحب نے کہیں یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ بیان دیا تھا کہ "ہندی کا رسم الخط ایسا ہے جیسے کسی سجے سجائے ڈرائنگ روم میں گوبر رکھ دیا جائے"۔ آج سے پندرہ سال پیشتر اردو کے خلاف ناگری رسم الخط کی وکالت کرنے والا ایک مہان ادیب اور شاعر ناگری کے رسم الخط کو گوبر سے تشبیہ دے رہا ہے۔ خدا خیر کرے اردو کو ہمیشہ ہی ایسے دوست نما دشمن ملے ہیں۔

مخلص
بھاگیہ کلالا ••

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

یادوں کا جشن

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کو برصغیر ہند و پاک میں قومی یک جہتی اور اُردو کی بقا و حیات کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ حال ہی میں پاک اور نیشنل پبلی کیشنز کراچی پاکستان نے کنور مہندر سنگھ بیدی کی ہمہ گیر دل پذیر اور پُر تاثیر زندگی کے دلچسپ سوانح کا گلدستہ "یادوں کا جشن" انتہائی خوبصورت اور قابلِ تعریف حد تک کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ آیئے آج بکوئے یار . . . . . میں کنور صاحب کی اس تصنیفِ لطیف کے کچھ اقتباسات سے محظوظ ہوجیئے

—————— سرور تونسوی

آلۂ واردات

تقسیمِ وطن سے پہلے کی بات ہے جالندھر میں ایک صاحب اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر ٹریننگ حاصل کرنے آئے۔ اُن کا اپنا محکمہ فوج کا تھا لیکن وہ پولیٹیکل سروس میں نامزد ہو گئے اور جالندھر ٹریننگ کے لئے تعینات ہوئے ان کے فرائض میں سے ایک فرض فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرنا بھی تھا چنانچہ جب ان کے پاس ایک زنا بالجبر کا مقدمہ آیا تو انہوں نے اس کی سماعت شروع کی۔ یہ صاحب بہت بھولے تھے اور ساتھ ہی بھولے بھی تھے۔ ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ پولیس والے بہت ہوشیار ہوتے ہیں ان سے محتاط رہنا جس مقدمہ میں یہ ملزم کی رعایت کرنا چاہیں تو کوئی اُلٹی سیدھی چال چل کر اس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے آپ اُن پر زور ڈالنا کہ وہ اس مقدمہ میں آلۂ واردات عدالت میں پیش کریں حالانکہ ان کو آلۂ واردات کے معنی بھی معلوم نہیں تھے۔ اب ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی چنانچہ جب اگلی تاریخ پر مقدمہ پیش ہوا تو ان صاحب نے گرجدار آواز میں حکم دیا کہ گواہوں کے بیانات قلم بند کرنے سے پہلے آلۂ واردات عدالت میں پیش کیا جائے۔ تھانیدار نے کہا کہ صاحب اس میں آلۂ واردات پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے زیادہ سختی سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ تم ملزم کی رعایت کرنا چاہتے ہو میری عدالت میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی انصاف ہوگا۔ آلۂ واردات فوراً پیش کیا جائے۔ تھانیدار نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور ریٹائرنگ روم میں چلیں۔ چنانچہ جب وہ ریٹائرنگ روم میں آئے تو تھانیدار نے ملزم کو بھی ریٹائرنگ روم میں بلا کر برہنہ کر دیا اور اسسٹنٹ کمشنر صاحب سے کہا کہ اب جی بھر کے آلۂ واردات ملاحظہ کر لیجئے اور اگر زیادہ تفصیل سے ملاحظہ فرمانا ہے تو میں فیتہ منگا لیتا ہوں حضور اس کی پیمائش بھی کر لیں۔ اِس پر اُس وقت تو وہ خاموش رہے لیکن شام کے وقت وہ اُن دوستوں کے پاس پہنچے جنہوں نے انہیں آلۂ واردات ملاحظہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اُن سے خوب گلہ گزاری ہوئی۔ ان دوستوں میں سے ایک میاں غلام معین الدین صاحب بھی تھے جو ہندوستان اور پاکستان کی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں وہ اسسٹنٹ کمشنر صاحب بعد میں کئی ملکوں میں پاکستان کے سفیر رہے۔ یہ قصہ مجھے میرے بڑے بھائی جسٹس بیدی نے سنایا ہے۔

گوشۂ تنہائی

ہمارے علاقے کے ایک سرکردہ زمیندار تھے اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ اپنے بھتیجے کو متبنّیٰ بنا کر ساری جائداد اس کے حوالے کر دی اور اپنی وصیت میں خاص طور پر یہ لکھا کہ چونکہ میری کوئی اولاد نہیں اور چونکہ میں نے اپنی تمام جائداد اپنے بھتیجے کے حوالے کر دی ہے اور چونکہ اب میرا دُنیا سے دل بھر گیا ہے میں تارک الدُنیا ہونا چاہتا ہوں اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر صرف رام نام کا جاپ کرنا چاہتا

ہوں۔ اس لئے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے خاص طور پر یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ مجھے دُنیا دی جھگڑوں میں اُلجھانے کی کوشش نہ کریں ورنہ میری عبادت اور یکسوئی میں خلل پڑے گا اس وصیت کے دو تین دن کے بعد ہی یہ صاحب جو گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر پرماتما کو یاد کرنا چاہتے تھے اسی گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے۔ اس کے بعد اس علاقہ میں جب بھی کوئی اغوا کی واردات ہوتی تو سب کی زبان پر یہی بات آتی کہ فلاں صاحب نے اغوا نہیں کیا وہ تو صرف پرماتما سے لَو لگانے کے لئے گوشہ تنہائی میں چلے گئے ہیں۔ یہ مذاق آج تک چل رہا ہے۔

لینے کے دینے

دہلی میں ایک لیڈی مجسٹریٹ ہوتی تھیں۔ انہیں اپنی پاکدامنی اور دیانت داری کا جا بے جا مظاہرہ کرنے کا خبط تھا لیکن دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت۔ ہوتا یوں کہ ایک بار ان کی موٹر گاڑی سے کسی اور گاڑی کی ٹکر ہو گئی جس میں ان کے جسم پر چند خراشیں آئیں مگر وہ چاہتی تھیں کہ دوسری موٹر گاڑی والے سے اچھا خاصا ہرجانہ وصول کیا جائے معمولی خراشوں سے تو ایسا کیس بن نہیں سکتا تھا کئی برس پہلے لاہور میں ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں ان کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں ان کے پاس وہ ایکسرے پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اُن پرانے ایکسریز کی بنا پر کئی ہزار روپے کے ہرجانہ کا دعویٰ کر دیا۔ عدالت نے فریقِ ثانی کو نوٹس کی نقل بھیج دی اور حاضری کے لئے تاریخ دے دی۔ فریقِ ثانی نے جوابِ دعویٰ پیش کیا۔ دعوے میں شہادتیں پیش کرنے کی تاریخ طے ہو گئی اس سے پیشتر کہ کوئی شہادت ادھر یا اُدھر سے پیش ہوتی فریقِ ثانی کو پتہ چل گیا کہ جو ایکسرے دعوے کے ساتھ بطور ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ اس حادثہ کے نہیں بلکہ کئی برس پہلے کے حادثہ کے ہیں جن میں لیڈی مجسٹریٹ صاحبہ نے اچھا خاصا ہرجانہ وصول کر رکھا ہے چنانچہ فریقِ ثانی نے عدالت میں اس امر کی درخواست دی کہ اس معاملہ کی چھان بین کی جائے۔ اب لیڈی مجسٹریٹ صاحبہ کو جیل دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ وہ اور ان کے خاوند جو خود بھی ایک اونچے عہدہ پر تھے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے کہ کسی طرح اس کیس میں راضی نامہ ہو جائے۔ فریقِ ثانی اکڑ گیا۔ کئی لوگوں نے درمیان میں آ کر راضی نامہ کرانا چاہا مگر فریقِ ثانی نے کہا کہ جتنا ہرجانہ اس محترمہ نے ہم سے طلب کیا ہے اتنا ہی وہ اب ہمیں دے اور آخر فیصلہ بھی یہی ہوا اور اس لیڈی مجسٹریٹ نے جو اپنی دیانتداری کا ہر جگہ چرچہ کرتی تھی اتنا ہرجانہ دے کر اپنی جان بخشی کروائی۔

جعفر شریف

ہمارے ایک دوست نے ایک پُرتکلّف دعوت کی۔ اس میں شہر کے مُعززین کے علاوہ حکومت کے کچھ وزراء بھی شریک ہوئے۔ کھانے سے پہلے رقص و موسیقی کا پروگرام بھی تھا۔ رقاصہ نے جب رقص شروع کیا تو اس نے حاضرین کی توجہ طلب کی۔ کچھ دیر جب وہ ناچ چکی تو کسی نے اس کو اشارہ کیا کہ جعفر شریف منسٹر ریلوے کو اپنی توجہ کا مرکز بنا چنانچہ وہ جعفر شریف صاحب کے سامنے آ کر بصد ناز و ادا رقص کرنے لگی۔ جعفر شریف صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ رقاصہ بیچاری مایوس نظر آنے لگی تو میں نے کہا کہ جس طرح تونسہ شریف، بہار شریف، دیوا شریف، پاکپتن شریف اور اجمیر شریف ہیں اسی طرح یہ صاحب بھی جعفر شریف ہیں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں اس پر ایک قہقہہ برپا ہوا جس میں جعفر شریف خود بھی شریک ہوئے۔

اسی محفل میں فائنانس منسٹر بھی بیٹھے ہوئے تھے رقاصہ کو سو سو کے نوٹ حاضرینِ محفل نے پیش کئے جو وہ اپنی انگیا میں رکھتی رہی۔ جب سو سو کے تیس چالیس نوٹ اس نے وہاں رکھ لئے تو میں نے فائنانس منسٹر صاحب سے کہا کہ صاحب دیکھئے اس رقاصہ نے ایسی محفوظ جگہ پر یہ کالے دھن کا روپیہ رکھا ہے جہاں آپ بھی چھاپا ماریں تو خود گرفت میں آ جائیں گے۔ اس پر وہ خوب ہنسے اور کہنے لگے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ ••

انجمن عروجِ ادب دہلی کا سلور جوبلی مشاعرہ

سرور تونسوی

(دوسری قسط)

دوسری غزل نکہت صاحبہ ترنم سے سنا رہی ہیں۔ نغمہ سرا ہیں؀

بھیگی ہوئی آنکھوں سے جو بے زار بہت ہیں
وہ ہنستے ہوئے لوگ بھی بیمار بہت ہیں

غم ہائے زمانہ، غمِ دل اور غمِ جاناں
سنتی ہوں کہ میرے بھی پرستار بہت ہیں

اے گردِ سفر پاؤں کے چھالوں سے الجھ مت
ہم اہلِ جنوں جو بھی ہوں خود دار بہت ہیں

ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں ہمدرد ہزاروں
شاید مری بستی میں اداکار بہت ہیں

حسن، شعر اور غمزدوں کی تبلیغ کو اس شعر پر داد دل کھول کر ملی ہے۔ نکہت کہہ رہی ہیں ؀

کیوں آپ پڑھیں ٹوٹتے چہروں کی کہانی
پڑھنے کے لئے آپ کو اخبار بہت ہیں

نکہت صاحبہ کہہ رہی ہیں دلّی غالب کی ہے یا میر کی، مگر میں یہ شعر دلّی والوں کی نذر کر رہی ہوں۔ ایک آواز آئی ہے کہ دلّی والوں کے بجائے صرف میری نذر کیجئے۔ بھو نپو صاحب جو ادھر ادھر ٹہلتے پھر رہے ہیں اچانک کھڑے ہو کر کہنے لگے یہ شعر میری نذر ہے۔ اس پر پہلے والے صاحب نے سامعین میں سے دلّی کی خالص کرخندار آواز میں کہا چپ رہ بے۔ اس پر ایک قہقہہ لگا ہے اور نکہت صاحبہ دلی والوں کی نذر یہ شعر کہہ رہی ہیں ؀

اس شہر میں فن کے بھلا آئیں ہیں نکہت
جس شہر میں غالب کے طرفدار بہت ہیں

بھونپو صاحب اردو مشاعروں کے مزاج سے قطعاً ناواقف ہیں اس لئے وہ ایسی بے راہ روی اختیار کئے ہوئے ہیں جیسے مشاعرہ کی بجائے نوٹنکی میں آئے ہوئے ہوں۔

سامعین کے پُر زور مطالبہ پر نکہت صاحبہ اگلی غزل سنا رہی ہیں۔ کچھ اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؀

حوصلہ اپنا مقدر اپنا آئینہ اس کا ہے پتھر اپنا
نگہ تکتی رہی شہروں شہروں نہ ملا مجھ کو کہیں گھر اپنا

نکہت صاحبہ فرما رہی ہیں۔ حضرات میں بخار میں اشعار سنا رہی ہوں آپ تھوڑی سی بھی توجہ دیں تو ممنون ہوں گی۔ اس پر بھونپو صاحب کہنے لگے ڈاکٹر کو بلایا جائے۔ سامعین اور اسٹیج پر بیٹھے جملہ حضرات بھونپو صاحب کی خرمستیوں یا حماقتوں سے پریشان ہیں۔ نکہت صاحبہ ان سُنی کئے ارشاد فرما رہی ہیں ؀

پھول ہی پھول ہے تری دنیا زخم ہی زخم ہے مقدر اپنا
نیند کے پر بھی جھلس جائیں گے آگ ہی آگ ہے بستر اپنا
کوئی منزل نہیں اپنی نکہت چلتے رہنا ہے مقدر اپنا

جوں ہی نکہت صاحبہ نے غزل ختم کی صاحبِ صدر مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ مشاعرہ میں دخل دوں کیونکہ مشاعرہ خوب چل رہا تھا مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن میں داد دینے کے طریقوں میں فرق ہوتا ہے۔ بھونپو صاحب داد کچھ اس انداز سے دے رہے ہیں کہ کچھ سامعین نے ان کا ساتھ دے کر مشاعرہ کو نوٹنکی بنا دیا ہے۔ انصاری صاحب نے بھونپو صاحب اور دیگران کے ہم نوا حضرات کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور زوردار طریقے سے سرزنش کی ہے۔ صاحبِ صدر مسندِ صدارت پر تشریف لے گئے تو ملکزادہ صاحب فرمانے لگے آیئے مشاعرہ کو ہم ادبی شعاروں سے بھی سرفراز کریں لہٰذا اب میں اردو تہذیب کے پروردہ

جناب رام کرشن مضطر سے دوبارہ گزارش کروں گا کہ وہ کلام عنایت فرمائیں۔ مضطر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ایک غزل کے دو شعر سنئے ؂

انعام کی طلب ہے نہ خیرات چاہیئے
بس اک نگاہ پیرِ خرابات چاہیئے
وہ دن ملے جو ان کے تبسم سے کھل اٹھے
مہکے جو اُن کی زلف سے وہ رات چاہیئے

بہت اچھی داد پاتے ہوئے دوسری غزل کے دو اشعار عنایت فرما رہے ہیں ؂

اب حسینوں کی نزاکت پہ نظر رہتی ہے
یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں ہے اے دل
آہ یہ خستگیِ طبع کا احساس کہ اب
التفاتِ نگہِ ناز گراں ہے اے دل

یہ اشعار داد کے مستحق ہیں اور مناسب داد مل رہی ہے۔ مضطر صاحب دو اشعار اور عطا فرما رہے ہیں ؂

وہ رہ و رسم نہ وہ ربطِ نہاں باقی ہے
اب تو نفرت پہ محبت کا گماں باقی ہے
اب بھی لوگوں کی زباں پہ ہیں کئی افسانے
اپنا قصہ اب سرِ بزمِ دگراں باقی ہے

اب مضطر صاحب غزل شروع کر رہے ہیں مطلع ملاحظہ فرمائیے ؂

نگاہِ دوست میں جب دیکھ لی کمی ہم نے
کسی سے پھر زمانے کی شکایت ہی نہ کی ہم نے

مطلع پر خوب خوب داد پانے کے بعد نغمہ سرا ہیں ؂

نظر آنے لگیں ماضی کی درد انگیز تصویریں
کبھی دنیائے مستقبل کو جب آواز دی ہم نے
ہمارے آنسوؤں کو مسکرا کے دیکھنے والے
تبسم ریز آنکھوں میں بھی دیکھی ہے نمی ہم نے

داد ہے کہ سامعین کے باذوق ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔

محبت کس قدر ناعاقبت اندیش ہوتی ہے
مآلِ شوق کیا ہوگی نہ یہ سوچا کبھی ہم نے

مضطر صاحب فارسی دانی میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے ناعاقبت اندیش جیسی خالص فارسی ترکیب کو ناعاقبت اندیشی لکھا ہے۔ مضطر صاحب کا ایک شعر اور سن لیجئے ؂

تغافل بھی توجہ ہے توجہ بھی تغافل ہے
کسی کی یہ ادائے پردہ داری جان لی ہم نے

مضطر صاحب اپنی جگہ تشریف لے گئے تو ملک زادہ صاحب نے ناگ پور کے ناظم انصاری سے کلام عنایت فرمانے کی درخواست کی ہے۔ سنئے ناظم صاحب اپنی بے کسی کا اظہار یوں فرما رہے ہیں ؂

تم اپنے باپ سے پٹواؤ یا کہ انکل سے
ہم اہلِ عشق کو عادت ہے مار کھانے کی
سمجھ رہا ہوں دُرِ یتیم اپنے آپ کو میں
ملی ہے جب سے صدارت یتیم خانے کی

اس کے بعد فلم نکاح کی ایک مشہور غزل "دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے" کی پیروڈی اسی دھن میں ترنم سے شروع کی ہے ؂

شیخ جی فیشن کی رَو میں بہہ گئے
ہم پنچر تھے پنچر رہ گئے
عشق کی دنیا کے وہ ہیرو بنے
پیار میں جو لات جوتے سہہ گئے
بام پر وہ آئے اور چلتے بنے
لوگ عینک صاف کرتے رہ گئے
آج اک لڑکی سے ٹیلی فون پر
جو نہیں کہنا تھا وہ بھی کہہ گئے
جوں تلک رینگی نہ اُن کے کان پر
من چلے سیٹی بجاتے رہ گئے

داد یا ہنسی مذاق کا خاصا ہنگامہ ہوا تو ناظم صاحب بیکل اتساہی کے مشہور گیت "اے مری جانِ غزل" کی گت بنائی ہے ؂

اے مرے خوابوں کی ملکہ اے مری جانِ غزل
چل کہیں بھاگ چلیں بھاگ چلیں
شہر میں کرفیو نافذ ہے بہت اچھا
گو نکلنے کا چانس ہے سناٹا ہی سناٹا۔

بادل کا دامن لئے تو ہوا بھی ہے ساتھ ساتھ
چل کہیں بھاگ چلیں بھاگ چلیں

اب ناظمِ مشاعرہ ڈاکٹر ملک زادہ صاحب خود مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور اپنی مختلف غزلوں کے مختلف اشعار ارشاد فرمارہے ہیں ؎

ضیائے صبح بھی ہے دامنِ ضیا بھی ہے
سوال یہ ہے کہ غنچہ کوئی کھلا بھی ہے
تمازتِ غمِ دوراں سے وہ بھی بچ نہ سکے
وہ جن کے شانوں پہ زلفوں کی اک گھٹا بھی ہے

اب برق کا کیا ذکر کہ خود شعلۂ گل سے
جلتا ہے نشیمن تو چراغاں سا لگے ہے
تعبیر کو کیا روئیں کہ اس دورِ خرد میں
جو خواب ہے وہ خوابِ پریشاں سا لگے ہے

کیوں تشنہ کام اب بھی ہیں رندانِ باصفا
سیراب جب ہے پیرِ مغاں کچھ جواب دو
چارہ گرانِ دہر مسیحا نفس ہیں جب
کیوں ڈوبتی ہے نبضِ جہاں کچھ جواب دو
باقی ہے کتنی رات ستارو تمہیں کہو
کب تک جلے گا قلبِ تپاں کچھ جواب دو

بڑا ہی پُرسکون چہرہ بہت تھا
میں اپنے آپ میں بکھرا بہت تھا
بہت تھی تشنگی دریا بہت تھا
سرابوں سے ڈھکا صحرا بہت تھا
انہیں اک شہر سے سمندر نے ڈبو دیا
جنہیں طوفاں کا اندازہ بہت تھا

اس شعر پر داد سے جھولیاں بھرتے ہوئے ملک زادہ صاحب اپنی جگہ پر چلے آئے ہیں اور جناب محمود سعیدی سے گزارش کی ہے کہ کلام عنایت فرمائیں۔ محمود سعیدی اپنی ایک مرصع غزل عطا فرمارہے ہیں ؎

منتظر اس کا کوئی خود اس کے گھر میں رہ گیا
وہ مسافر تھا کسی لمبے سفر میں رہ گیا
یوں تو جو پایا سفر میں سب سفر میں رہ گیا
راستے کا آخری منظر نظر میں رہ گیا
آسماں پیما ارادہ بال و پر میں رہ گیا
ہر پرندہ کچھ زمینوں کے اثر میں رہ گیا

مطلع اول اور مطلع ثانی کی طرح داد تیسرے مطلع پر بھی مشاعرے میں نئی زندگی پیدا کررہی ہے اور مخمور صاحب کے اشعار ہیں کہ داد کا یہ سلسلہ ختم ہونے ہی نہیں دے رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

ہجر کے طوفاں سے تنہا کس طرح گزروں گا میں
تیری یادوں کا سفینہ کس بھنور میں رہ گیا
زندگی میرے لئے در اپنے وا کرتی رہی
اور میں گھٹ کر حصارِ خیر و شر میں رہ گیا
تو نہیں لیکن ترا پرتو اس اجڑے دل میں ہے
جلتا بجھتا اک دیا سونے کھنڈر میں رہ گیا
رنگ سب اس کی نظر کے آنسوؤں میں بہہ گئے
لیکن اک خوشبو کا چہرہ چشمِ تر میں رہ گیا

داد ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے اور مخمور ہیں کہ لفظِ مخمور کی لغوی تشریح بنے داد و ستائش سے بے خبر فرمارہے ہیں ؎

تھا کوئی ایسی شہر میں سب کی خبر رکھتا تھا جو
وہ بھی گم ہو کر ہجومِ بے خبر میں رہ گیا

مخمور صاحب کی مخموری میں داد و ستائش کے مخمورانہ انداز نے کچھ اصلاح کی تو انہیں مقطع سنانے کے بعد غزل کا چوتھا مطلع بھی یاد آگیا ہے فرماتے ہیں ؎

ایک آسیب بے خلا دیوار و در میں رہ گیا
اور تو اب کیا اثاثہ اپنے گھر میں رہ گیا

اعلان ہوا ہے کہ جناب رفعت سروش مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ رفعت صاحب کا یہ قطعہ سماعت فرمائیے ؎

کب اہلِ نظر جنسِ ہنر بیچتے ہیں
بے وجہ کہیں رختِ سفر بیچتے ہیں

اس دَور میں افلاس کے مارے ہوئے لوگ
افکار نہیں خونِ جگر بیچتے ہیں

قطعہ کے بعد نظم بعنوان "شاعرِ انقلاب" سنائی ہے جو مضمون کے اعتبار سے صحت مند رُجحان کی آئینہ دار ہے۔ نظم کے دو اشعار آپ بھی سُن لیجئے ؎

نام پہ مزہبی کے چل گئی دُکان تیری
اور آج محلوں میں دادِ عیش دیتا ہے
پلا کے جام نخوت کے
بھوک اور بغاوت پر شعر ڈھال دیتا ہے

اب مُرادآباد کے بزرگ اور اُستاد شاعر قمر مرادآبادی کو ہندوستان میں شاعری کی عزت و توقیر کے ضامن ہیں کو زحمتِ سخن دی گئی ہے۔ قبلہ ایوانِ غالب میں غالب کی ہی زمین میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی مظہر مرصع و مسجع غزل ترنم سے عطا فرما رہے ہیں ؎

ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا
بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا
عقل و ادراک سے گزرے تو جنوں تک پہنچے
کوئی آساں نہ تھا چاکِ گریباں ہونا
ہائے آغازِ محبت کی وہ پیہم اُلجھن ...
کچھ نہ ہونا تو خیالوں سے پریشاں ہونا

قبلہ قمر فرما رہے ہیں کہ بے تو گستاخی میں اس شعر کی داد غالب کی رُوح سے چاہوں گا۔ ارشاد ہوا ہے ؎

مستقل طنز ہے آئینِ چمن بندی پر
اپنے ماحول سے خوشبو کا پریشاں ہونا

واہ ہے کہ حضرتِ غالب کی رُوح کی داد بھی اس شور میں دب کر رہ گئی ہے۔ سنئے قمر صاحب ثابت کر رہے ہیں کہ سرزمینِ مرادآباد میں فنِ شاعری کے سوتے حضرت جگر مرادآبادی کے بعد خشک نہیں ہوئے بلکہ ان کی روانی میں تیزی و تندی عود کر آئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زندگی میں مجھے محرومِ کرم رہنے دو
تم مرے بعد مرے غم کے نگہباں ہونا

میں بہارِ گُل و گلزار میں سما جاؤں گا
تم جمالِ مہ و انجم سے نمایاں ہونا
دردِ فرقت نے بہت ساتھ دیا میرا قمر
ورنہ اس دَور میں مشکل تھا غزل خواں ہونا

قمر صاحب داد سے لدے پھندے اپنی جگہ پر آنے لگے تو سامعین نے یک زبان ہو کر مطالبہ کیا ہے کہ قمر صاحب ایک غزل اور مرحمت فرمائیں۔ قمر صاحب مجبوراً پھر مائیک پر آ گئے ہیں فرما رہے ہیں کہ پہلے ڈاکٹر ملک زادہ صاحب کی فرمائش پر غزل پیش کی گئی تھی اب جناب مظفر صاحب کی فرمائش کی تعمیل کر رہا ہوں۔ سنئے کرم فرما رہے ہیں ؎

ساقیا طنز نہ کر چشمِ کرم رہنے دے
میرے ساغر میں اگر کم ہے تو کم رہنے دے
عشقِ آوارہ کو محرومِ کرم رہنے دے
اپنے ماتھے کے شکن زلف میں خم رہنے دے
غم کی توہین نہ کر غم کی شکایت کر کے
دل رہے یا نہ رہے عظمتِ غم رہنے دے

کون ہے جو ان اشعار کی داد نہ دے کر اپنے آپ کو بد ذوق کہلوائے گا بہر داد کا شور ہے کہ شاید اسی لئے کہا گیا تھا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسی شورِ داد و ستائش میں قمر صاحب مرحمت فرما رہے ہیں ؎

تو زمانے کو مٹا تا ہے مٹا دے لیکن
عشق کی راہ میں کچھ نقشِ قدم رہنے دے
زندگی غم سے سنورتی ہے نکھرتی ہے قمر
زندگی کو یوں ہی آلودۂ غم رہنے دے

قمر صاحب مشاعرے کو چاند کی بلندی پر پہنچاتے ہوئے مائیک سے الگ ہوئے تو جناب عالم فتحپوری سے کلامِ بلاغت نظام عطا فرمانے کی استدعا کی گئی ہے۔ عالم صاحب فرما رہے ہیں کہ قمر صاحب نے جو محبت کی زبان میں گفتگو کی مگر نہ تو وہ اپنی ذات سے بے خبر تھے اور نہ دنیا کے حالات سے ہیں کیوں کہ اس وقت غزل کی رومانی کیفیت مشاعرہ پر چھائی ہوئی ہے تو مجھے بھی پہلے کچھ اشعار

دل کے یہ کا شعر سنئے ؎

دل نے کھائے ہیں مرے ظرفوں کے پتھر برسوں
تب کہیں جا کے یہ آئینہ بنا ہے یار و
نہیں پھیلیں گے مرے ہاتھ کسی کے آگے
میرے ہاتھوں کی لکیروں نے کہا ہے یار و

قاتل ایسا ہاتھ میں جس کے شاخِ گل تلوار لگے
ایسا مسیحا جس کی آنکھیں دیکھو تو بیمار لگے
عرضِ طلب پر کتنا معنی خیز ہے یار و اس کا جواب
بے سمجھے اقرار لگے ہے سمجھو تو انکار لگے

اگر بجلی نے رُخ بدلا تو عکسِ شعلۂ گل سے
سُلگ اٹھتا ہے اکثر آشیاں ایسا بھی ہوتا ہے
اگر چاہیں تو کم ظرفوں کو جامِ جم عطا کر دیں
یہ دیوانوں کی محفل ہے یہاں ایسا بھی ہوتا ہے

یہ اشعار کئی مرتبہ سُننے میں آ چکے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ اب بھی سُننے والا داد دئے بغیر نہ رہ پائے گا چنانچہ ان اشعار نے آج بھی بھرپور داد پائی ہے۔ اب جناب عالم صاحب ایک نظم سُنا رہے ہیں جو نوجوانوں کی بے راہ روی پر ہے اور عالم صاحب یہ کہہ کر نظم پیش کر رہے ہیں کہ یہ نظم بیس سال پہلے کی کہی ہوئی ہے مگر آج حالات اس وقت سے بھی بدتر ہیں جب کہ یہ نظم کہی گئی تھی لہٰذا اس نظم کی ضرورت اب زیادہ ہے۔ پہلے دو اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

عصمتِ مریم و سیتا کے محافظ ہو کر
نوجواں ہو گئے اس دور میں رہزن کیسے
رام و لچھمن کے پرستار ہنومان کے بھگت
دیکھتے دیکھتے ہی بن گئے راون کیسے

نظم بہت اچھی ہے لہٰذا کامیاب رہی اور اب تشریف لائے صدرِ انجمن عزدج اور بعد کے صدر جناب ساحر ہوشیارپوری۔ جناب شمس تبریزی صاحب نے "قومی آواز" میں اس مشاعرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھتے وقت ساحر صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک پُرانی غزل جو اس سے قبل بھی مشاعروں میں سُنا چکے ہیں پیش کی۔ کیا شمس تبریزی صاحب نشان دہی فرما سکیں گے کہ اب تک اس مشاعرہ میں کس شاعر نے تازہ کلام سُنایا تو پھر ساحر صاحب کو ہی کیوں نشانے پر رکھا گیا ہے۔ محض اس لئے کہ شمس تبریزی صاحب کو ساحر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ مشاعرے کے پاس تبریزی صاحب کو نہیں بھجوائے گئے۔ شمس تبریزی صاحب کے لئے جناب ساحر ہوشیارپوری کا یہ سندیسہ ہے کہ آپ اپنا پتہ بھجوا دیجئے آئندہ مشاعرے کے پاس آپ کو گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک پیش کر دئے جائیں گے۔ ہاں تو سنئے ساحر صاحب کی پُرانی غزل جو آج بھی کئی شعراء کے تازہ ترین دواوین پر بھاری ہے۔ اس غزل پر جو داد ملی اس کا ذکر کر کے شمس تبریزی صاحب کے دل کو ٹھیس لگانا مقصود نہیں۔ آپ تو غزل سماعت فرما لیجئے اور اگر آپ کا دل ہر شعر پر داد دینے پر مجبور ہو جائے تو اس کا کیا قصور۔

بے گناہی کی سزا دی جائے
عمر کی میعاد بڑھا دی جائے

ترکِ الفت کی قسم کھا کر بھی
پھر اسی در پہ صدا دی جائے

بے نیازی تراشیوہ ہی سہی
رسمِ دُنیا تو نباہ دی جائے

چہرے بے رنگ ہوئے جاتے ہیں
کیوں نہ قندیل بجھا دی جائے

آگ کا صرف یہی مصرف ہے
خشک پتوں میں دبا دی جائے

فرش جب بڑھنے لگے چھت کی طرف
گھر کی دیوار گرا دی جائے

سرد لمحوں کی سسکتی شب کو
گرم سانسوں کی ہوا دی جائے

آسمانوں کے مکینوں کے لیئے
اک زمیں اور بنا دی جائے
زخم شرمندۂ مرہم نہ ہوا
دستِ قاتل کو دعا دی جائے
نام اخبار میں چھپ جائے گا
کوئی افواہ اڑا دی جائے
آگ پانی میں لگا کر ساحر
پیاس دریا کی بجھا دی جائے

ساحر صاحب داد میں نہاتے اپنی جگہ تشریف لے گئے تو ملک زادہ صاحب نے بڑے اچھے تعارف کے ساتھ جناب ہلال سیوہاروی کو مائیک پر آنے کی دعوت دی ہے سنئے ہلال صاحب قطعہ پیش کر رہے ہیں ؎

اب کے ہو جائے گا بے کاری کا شاید خاتمہ
ریڈیو پر سن لیا اور پڑھ لیا اخبار میں
کیسے دل مانے کہ سب کو مل سکے گا روزگار
سیونگاری تک نہیں ملتی بھرے بازار میں

اس کے بعد فرماتے ہیں ؎

لوگ رشوت کے مخالف ہیں مگر دل سے نہیں
کچھ نہیں چلتا یہاں پیسے کی طاقت کے بغیر
کیسے مل جاتی ہے لوگوں کو یہ اونچی کرسی
ریل میں سیٹ بھی ملتی نہیں رشوت کے بغیر

مزاح کے بعد اب خالص سیاسی قطعہ سنئے ؎

دیکھو کہ کہاں رکتا ہے سیلابِ تعصب
آغاز کو روتا ہوں انجام سے پہلے
ہمسائے کے گھر میں بھی تو محفوظ نہیں ہم
لنکا کی مجھے فکر ہے آسام سے پہلے

اس کے بعد ہلال صاحب نے نظم "غالب شفا خانے میں" سنا کر حسب سابق داد پائی ہے اور ان کے بعد ملک زادہ صاحب نے جناب ڈاکٹر بشیر بدر صاحب سے مائیک پر آنے کی تکلیف دی ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر صاحب تحت میں غزل کے کچھ اشعار فرما رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

سنوار نوک پلک ابروؤں میں خم کر دے
گرے پڑے ہوئے لفظوں کو محترم کر دے
غرور اس پہ بہت سجتا ہے مگر کہہ دو
اسی میں اس کا بھلا ہے غرور کم کر دے
یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑے دے شراب کم کر دے
میں اپنے آپ کو تیری طرح سمجھتا ہوں
میری نظر میں میرا اعتبار کم کر دے

ان اشعار پر داد تو ملی مگر سامعین کا مطالبہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ترنم سے کلام سنائیں۔ لیجئے دوسری غزل ترنم سے عطا ہو رہی ہے ؎

تلوار سے کاٹا ہے پھولوں بھری ڈالی کو
دنیا نے نہیں چاہا ہم چاہنے والوں کو
اخلاق، وفا، چاہت سب قیمتی کپڑے ہیں
ہر روز نہ اوڑھا کر ان ریشمی شالوں کو
میں آگ تھا پھولوں میں تبدیل ہوا کیسے
بچوں کی طرح اس نے چوما مرے گالوں کو
الفاظ کے سوداگر اب راکھ بٹوریں گے
میں آگ پہ رکھ دوں گا نایاب رسالوں کو
برسات کا موسم تو لہرانے کا موسم ہے
اڑنے دو ہواؤں میں بکھرے ہوئے بالوں کو
مولا مجھے پانی دے میں نے نہیں مانگا
چاندی کی صراحی کو سونے کے پیالوں کو

اس غزل پر داد اتنے زوروں پر ملی کہ ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کو ایک غزل سنائے بغیر چھٹکارا نہ مل سکا۔ یہ غزل ہے آپ کیوں محروم رہیں، لیجئے حاضر ہے ؎

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا
جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

محبوب کا گھر ہو کہ بزرگوں کی زمیں
جو چھوڑ دیا پھر اسے مڑ کر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
اس نے کبھی مجھ کو مجھے چھو کر نہیں دیکھا

ڈاکٹر بشیر بدر نے ہر غزل سنانے سے پہلے فرمایا کہ بالکل تازہ غزل سنئے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ غزلیں شانِ ہند میں بھی اکثر مشاعروں کی روداد میں درجنوں بار شائع ہو چکی ہیں۔

اب جناب وسیم بریلوی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سرا ہیں ؎

آتے آتے مرا نام سا رہ گیا
اس کے ہونٹوں پہ کچھ کانپتا رہ گیا

رات مجرم تھی دامن بچا لے گئی
دن گواہوں کی صف میں کھڑا رہ گیا

وہ مرے سامنے ہی گیا اور میں
راستے کی طرح دیکھتا رہ گیا

آندھیوں کے ارادے تو اچھے نہ تھے
یہ دیا کیسے جلتا ہوا رہ گیا

اس کو کاندھوں پہ لے جا رہے ہیں وسیم
اور وہ جینے کا حق مانگتا رہ گیا

مفکر صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ شعر ہندوستانی مزدوروں سے متعلق ہے۔ وسیم صاحب کی غزل کے ہر شعر پر سامعین نے جی جان سے داد دی ہے۔ اگر ہر شعر کے بعد داد کے عالم کا ذکر کیا جاتا تو قارئین کرام اس غزل سے کما حقہٗ لطف اندوز نہ ہو سکتے۔ سامعین کا معاملہ قارئین سے الگ ہوتا ہے۔

ناظمِ مشاعرہ فرما رہے ہیں کہ ناؤ نیم شبی اور دعائے سحر میں اثر ہوتا ہے اس لئے نصف شب کے بعد حضرت فنا نظامی کانپوری کو تکلیف دے رہا ہوں کہ مائیک پر تشریف لائیں اور کلام فصاحت التیام مرحمت فرمائیں۔

فنا صاحب نے تحت میں غزل شروع کی ہے ؎

خلوت میں بھی ساتھ نہ چھوڑا محفل کی رسوائی نے
مجھ کو تنہا چھوڑ دیا ہے گھبرا کر تنہائی نے

موجوں میں وہ شور نہیں ہے دھاروں میں زور نہیں
پانی کو ٹھہراؤ دیا ہے دریا کی گہرائی نے

واعظ ناداں تو کیا جانے ہستی ہے کس چیز کا نام
خالی ساغر چھلکائے ہیں ساقی کی انگڑائی نے

میرے گھر کے دیوار و در ہر دم تپتے رہتے ہیں
کتنی دھوپ سمیٹ کے رکھ لی چھوٹی سی انگنائی نے

غالب کو کیا فائدہ پہنچا غالب تو غالب ہی رہا
اپنا ادب پر صرف کیا ہے اپنا فن چغتائی نے

میں تو پرانی چوٹ لئے ہوں آج بھی اپنے سینے میں
اپنی ریت بدل ڈالی ہے یادوں کی پروائی نے

جب کوئی ترنم سے پڑھنے والا شاعر تحت میں کلام سناتا ہے تو یہ حقیقت اعلان کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ شاعر بوڑھا ہو گیا ہے اور اس سچائی کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ تحت میں پڑھنے والے شعراء اپنی شہرت کو مترنم شعراء کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک قائم رکھتے ہیں۔ فنا صاحب ایک اور غزل تحت میں ہی سنا رہے ہیں ؎

پتھر گراں تھا ایک ہی ٹھوکر سے ہٹ گیا
کچھ لوگ کہہ رہے تھے مقدر سے ہٹ گیا

مفکر صاحب کہہ رہے ہیں کہ انگریز کے جانے پر یہ شعر کہا ہوگا۔ اور فنا صاحب فرما رہے ہیں ؎

دو گام پر ہی منزلِ مقصود رہ گئی
جب میرا ذہن رہبر [illegible] سے ہٹ گیا

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور فنا کہہ رہے ہیں ؎

واعظ سے کیا غرض کہ میری توبہ میں
خود میرا جی بھی بادہ و ساغر سے ہٹ گیا

آج اک فقیر آیا بڑی آن بان سے
پہلی صدا لگا کے جو مڑ کے در سے ہٹ گیا

اب سامعین کا تقاضا ہے کہ فنا صاحب ترنم سے غزل سنائیں

ایک غزل کے بارے میں فرمائشی آوازیں آرہی ہیں اور فنا صاحب کہہ رہے ہیں کہ تیس سال پرانی غزل کو سُن کر آپ کیا کریں گے مگر فرمائشیں تو فرمائشیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا فنا صاحب یہ تیس سالہ پرانی غزل شروع کر رہے ہیں مطلع ہے ؎

جب میرے راستے میں کوئی میکدہ پڑا
اک بار اپنے غم کی طرف دیکھنا پڑا

یہ غزل شانِ ہند میں ان تیس سالوں میں مشاعروں کی روداد میں کم و بیش ایک سو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مگر صاحب خواہ کتنی بار چھپی ہو یہ غزل ہے ایسی ہی کہ آج بھی سن لیجئے یقیناً آپ داد دینے پر مجبور ہوں گے۔

ترکِ تعلقات کو اک لمحہ چاہیئے
لیکن تمام عمر مجھے سوچنا پڑا

اک تیرے دیکھنے کے لئے بزم میں مجھے
اوروں کی سمت مصلحتاً دیکھنا پڑا

رودادِ فصلِ گُل نہ سُنا تو حساب دے
اے باغباں بتا مرے حصے میں کیا پڑا

اک تشنہ لب نے چھین لیا بڑھ کے جام سے
ساقی سمجھ رہا تھا سبھی کو گرا پڑا

دل کو ہوئی ہے اب تیری بیگانگی کی قدر
دنیا کے التفات سے جب واسطہ پڑا

یوں جگمگا رہا ہے مرا نقشِ پا فنا
جیسے ہر راستے میں کوئی آئینا پڑا

سفید داڑھی پر ترنم کچھ زیب تو نہیں دیتا مگر فنا صاحب داد لے ہی لیتے ہیں اب جناب کیف بھوپالی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور رواں دواں غزل شروع کر دی ہے اس تیزی سے پڑھ رہے ہیں کہ اشعار نقل کرنا دشوار ہو رہا ہے مگر کچھ اشعار تو آپ بھی سُن ہی لیجئے ؎

مت کسی سے کیجئے یاری بہت — آبیاری کم ہے عیاری بہت
چل بجانب دیکھ کر پیچ بو لئے — آدمی پھرتے ہیں سرکاری بہت

غالباً کیف صاحب نے یہ شعر تب کہا ہوگا جب بھوپال میں نواب صاحب کی حکومت تھی کیونکہ ریاستوں میں یہ حال ہوتا تھا کہ نہ معلوم سرکار کا مخبر کون ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

وہ ہمارے ہیں نہ ہم ان کے لئے — دونوں جانب ہے اداکاری
کیف صاحب کوئی مسجد دیکھئے — میکدے میں ہو چکی خواری
ابھی داد پانے کے بعد کیف صاحب دوسری غزل سُنانے فرماتے ہیں کہ اس غزل کا تعلق بھوپال سے ہے۔ بھوپال قارئین اس غزل پر خصوصی توجہ فرمائیں۔ ارشاد ہوا ہے

گم ہے نگاہِ شوق حجابوں کے شہر میں
پردوں کے چلمنوں کے نقابوں کے شہر میں
ہر پیکرِ جمال ہے اک پیکرِ بہار
چمپوں کے موگروں کے گلابوں کے شہر میں
ملتا ہے ہر قدم پہ ایک لیلیٰ سماں
عشقوں کے ناولوں کے کتابوں کے شہر میں
اے محتسب نہ روک مرے محتسب نہ روک
نشوں کے مستیوں کے گنا ہوں کے شہر میں

اس غزل پر داد تو خاصی نہیں ملی مگر سامعین کی فرمائشیں کم اپنی مرضی زیادہ کے تحت کیف صاحب نے دو تین غزلیں اور سُنائی ہیں مگر وہ ان دونوں غزلوں سے کمزور تھیں جو آپ نے ملا

اب ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ صاحبِ صدر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری سے کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ انصاری صاحب مائیک پر تشریف فرما ہیں اور رواں دواں آبِ کوثر سے دُھلی اردو میں سامعین، شعراء اور منتظمینِ مشاعرہ کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرما رہے ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں اور مجھے بھی معلوم نہیں کہ آخر کس طرح مجھے شاعر سمجھ لیا گیا ہے میں تو شعر و ادب کی محفل میں صرف اور صرف لطف اندوز ہونے کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ میں تو سامعین میں بیٹھ کر شعرائے کرام کا کلام سُننا چاہتا تھا تاکہ دل کھول کر داد دے سکوں مگر صدارت کی مسند پر پابندیاں رہتی ہیں اور ان کی پابندیاں کرنی ہوتی ہیں۔ تاہم میں آپ کو کچھ شعراء کے شعر سُناتا ہوں اور اُن کے بعد یہ محفلِ مشاعرہ ختم سمجھئے انصاری صاحب فرما رہے ہیں کسی پاکستانی کا شعر ہے ؎

ہاتھ سب کے شل ہیں پھر اک دست قاتل سکتہ
رقص اب کوئی نہ ہوگا رقصِ بسمل کے سوا

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا فارمولا
سر سید احمد خاں صاحب کی دین

مانک ٹالا

شان ہند اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع شدہ میرے مضمون "باکمالوں کے درشن ہو۔۔۔" کے جواب میں شبلی صاحب کا ایک خط جون ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ آنکھوں کی تکلیف کے باعث میں اس کا مفصل جواب نہیں لکھ سکا تھا۔ بہرحال میرا مختصر جواب اگست ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور بتایا تھا کہ وہ کس قدر۔۔۔ "ایمانداری سے آج کے حالات کے تناظر میں" اپنی "ادبی تحقیق اور تنقید کا حق ادا کر رہے ہیں۔ بے ایمانی اور بددیانتی جس شخص کی گھٹی میں پڑی ہو وہ شخص "تحقیق و تنقید" کا حق ادا کرنے کی بجائے گھٹنا مار کر آنکھ ہی پھوڑ سکتا ہے۔

اپنے اسی خط میں شبلی صاحب فرماتے ہیں "تاریخ اس لئے لکھی جاتی ہے کہ قومیں اپنے عروج و زوال کے اسباب و علل پر غور کر سکیں۔ وہ خوبیاں اپنائیں جو اگلے وقتوں کے لوگوں میں تھیں اور وہ غلطیاں نہ دہرائیں جو اُن سے سرزد ہوئیں۔ کم و بیش ادبی تحقیق و تنقید کا بھی یہی مقصد ہے۔"

شبلی صاحب نے اپنے اس پیمانے سے صرف پریم چند اور بنکم چٹرجی ہی کو کیوں ناپتے ہیں۔ سر سید احمد خاں، علامہ اقبال اور مسلمانوں کے دوسرے اکابر کی طرف ان کی نظر کیوں نہیں جاتی جنہوں نے بہت حد تک قومی یک جہتی کی مخالفت کی تھی۔ "اسباب و علل" صرف ہندو ادیبوں کے لئے رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ سے مثالیں دے کر میں یہ بتا چکا ہوں کہ ان میں بہت سے شعر یقیناً بہت اشتعال انگیز تھے۔ تاریخ سے بھی یہ ثابت کر چکا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے مندروں کو توڑا۔ لوٹا۔ جلایا۔ بتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں مکے۔ مدینے۔ بغداد اور غزنی کے گلی کوچوں میں پاؤں تلے روندنے کے لئے بھجوایا (ابن بطوطہ کا سفرنامہ، تاریخ رشیدیہ، تاریخ پنجاب از سید عبداللطیف وغیرہ) "عروج و زوال کے اسباب و علل" پر غور فرمانے کے لئے آپ کو صرف ہندو نام ہی نظر کیوں آتے ہیں۔ مسلمان نام کیوں نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کیا ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ نہ آپ کو "قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل" پر غور فرمانے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی تحقیق و تنقید سے دلچسپی ہے۔ "اسباب و علل اور تحقیق و تنقید" کے نام پر آپ اپنی گندی فرقہ وارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں تو اب انہیں GONE CASE سمجھ کر ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن سوچا کہ قارئین کو تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھا کر گمراہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہیں دوسرا رخ بھی دکھانا چاہئے۔

سر سید احمد خاں صاحب بہت قابل احترام ہستی ہیں۔ مسلمانوں کو عصر حاضر کی تعلیم سے روشناس کروانے کے لئے انہوں نے جو [illegible] انہیں بھلایا نہیں جا سکتا۔

لیکن شبلیا نامو دیوں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ وہ بھی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال اسے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں سمجھتا۔

اب میں شبلی صاحب کے گھڑے ہوئے پیمانوں ہی سے سرسیداحمد خاں صاحب کی محترم ہستی کا تھوڑا بہت جائزہ لینے کی جسارت کرتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد مسلمان انگریزوں کے غیظ و غضب کا خصوصاً نشانہ بنے تھے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں پر لگائی ہوئی اس "تہمت" کا داغ دھونے کے لئے ایک کتاب لکھ کر برطانیہ بھجوائی تھی۔ اس کا نام تھا "اسبابِ بغاوتِ ہند"۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بمعہ مقدمہ از فوق کریمی ایم۔ اے (علیگ) کتب خانہ انجمن ترقیِ اُردو دہلی سے نومبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد خاں صاحب نے انگریزوں کو "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) کا پہلی مرتبہ سبق پڑھایا تھا۔ سرسید کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخلوط کر کے پلٹنوں میں نوکر رکھنا

یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلما دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا۔ مگر بسبب مخلوط ہو جانے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بسبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد اور ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا ایک پلٹن کے سپاہی اپنے آپ کو ایک برادری سمجھتے تھے۔ اور اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں۔ اس پلٹن کے آدمی جو کچھ کرتے تھے سب اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایک دوسرے کے حامی اور مددگار ہو جاتے تھے۔

(اصل پنجم ــ ص ۱۵۰ و ۱۵۱)

اس باب کی ابتدا "بدانتظامی اور بے اہتمامیِ فوج" کے عنوان کے تحت اس طرح کرتے ہیں۔

"ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابلِ اعتراض تھا۔ فوج انگلشیہ کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی۔ جب کہ نادر شاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران اور افغانستان دو مختلف ملک اس کے قبضے میں آئے اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں۔ ایک ایرانی قزلباشی۔ دوسری افغانی۔ جب ایرانی فوج کچھ عدول حکمی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباشی اس کے تدارک کو موجود رہتی" (ایضاً۔ ص ۱۵۰)

کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سرسید احمد خاں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"، کے بارود پر سب سے پہلے چنگاری پھینکی تھی۔ اس کے بعد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رجمنٹیں الگ الگ ہوئی تھیں۔ ہندو مسلمان اور سکھ الگ الگ رجمنٹوں کے علاوہ پنجاب۔ مدراس۔ بلوچ اور گورکھا رجمنٹیں عالم وجود میں آئیں تاکہ پنجابی مدراسی۔ بلوچی۔ گورکھے وغیرہ بھی ساتھ ساتھ نہ رہنے پائیں۔

شبلی صاحب ذرا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے سبق کے "اسباب و علل" پر بھی غور فرمائیے۔ کیوں کہ آپ "پوری ایمانداری سے آج کے حالات کے تناظر میں ہر بات "محسوس کرتے ہیں"۔

ہندوؤں کو تنگ نظر، متعصب اور "جارحانہ فرقہ واریت" کا شکار کہنے والے شبلی صاحب اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۲ پر سرسید احمد خاں صاحب کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

"ان سب باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و

رواج کے ادا کرتے تھے۔ نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد اور وہ دلی اور اعتقادی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برتاؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں نہایت سُست اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے جس کا دل میں اعتقاد چاہیے برخلاف ہوا کریں۔ ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا۔ برخلاف مسلمانوں کے۔ وہ اپنے مذہب کے عقائد بموجب جو باتیں کہ ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سبب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض تھے اور ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تر فساد میں ان کا شریک ہونا قرینِ قیاس تھا ...."

عتیق صدیقی صاحب نے "سرسید احمد خاں ــــ ایک سیاسی مطالعہ" (مکتبہ جامعہ پہلا ایڈیشن ۱۹۷۷ء) میں سرسید اور ان کے دور پر ایک سیر حاصل مطالعہ پیش کیا ہے۔ سرسید اور ان کے برطانیہ نواز ہندو "دوستوں" نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت میں "یونائیٹڈ انڈیا پیٹریاٹک اسوسی ایشن" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ لیکن آخر میں یہ انجمن سرسید کے ہاتھ میں ہندوؤں کی مخالفت کا ایک حربہ بن کر رہ گئی تھی۔ صفحہ ۲۸۸ پر صدیقی صاحب نے ان کا ایک خط (۲۵ اگست ۱۸۸۸ء) نقل کیا ہے۔ یہ خط انہوں نے اپنے ہم وطن دوست سید محمد بخاری (پیش امام۔ جامع مسجد دہلی) کے نام تھا۔ بقول عتیق صدیقی پیش امام صاحب "مسلمانوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور سرکاری حلقوں میں بھی خاص اہمیت رکھتے تھے"

(یہی خط نقوش کے خطوط نمبر یا مکاتیب نمبر میں بھی ہو بہو شامل ہے)

برادر صاحب۔ عزیز و شفیق من امام المسلمین۔

"جو اسوسی ایشن برخلاف ہندوؤں کے ہم نے قائم کی ہے۔ اس میں تمہارا شریک ہونا نہایت ضروری اور مناسب ہے ....

"علاوہ اس کے تم خود جناب مولوی نذیر حسین صاحب (محدث) کے پاس جاؤ۔ میری طرف سے بعد سلام علیک یہ پیغام دو کہ مسلمانوں کی دینی بھلائی کو تو بلاشبہ جناب مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں مگر مسلمانوں کی دنیاوی بھلائی کو جناب ممدوح سے بہت زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اور بہ نظر مسلمانوں کی بھلائی کے نہایت ضرور اور مناسب سمجھتا ہوں کہ جناب ممدوح کا نام نامی اس اسوسی ایشن کے ممبروں میں داخل کیا جائے ...."

۱۸۹۹ء میں کانگریس کے پانچویں سالانہ اجلاس میں "مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کی شرکت اور اس کی کارروائیوں میں ان کا ہندوؤں کے مساوی حصہ لینا یہ وہ باتیں تھیں جنہوں نے سرسید کو حد درجہ متوحش کیا۔ اس نئی صورت حال کو انہوں نے خطرے کی گھنٹی سمجھا...... بالآخر مسٹر بیک آڑے آئے چنانچہ ان ہی کے مشورے پر طے پایا کہ کانگریس کے مطالبات کے خلاف ایک عرض داشت مسلمانوں کی طرف سے پارلیمنٹ میں پیش کی جائے جس پر ہر طبقے کے مسلمانوں سے دستخط کروائے جائیں .... یہ دستخط کیوں کر اور کیسے حاصل کیے گئے؟ ایک عینی شاہد کا مندرجہ ذیل بیان اسی کی بہت اچھی مثال ہے۔

کالج کے لڑکوں کی ٹولیاں اس عرض داشت پر دستخط کرانے کے لئے باہر بھیجی گئیں۔ ایک ٹولی خود مسٹر بیک دلّی لے کر گئے، جامع مسجد کے دروازے پر خود بیٹھ گئے۔ اور طلبا نے آنے جانے والے نمازیوں سے مسٹر بیک کی ہدایت کے مطابق یہ کہہ کر دستخط کرائے کہ ہندو گاؤکشی بند کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے خلاف یہ درخواست گورنمنٹ میں بھیجی جائیگی۔"

(ایضاً۔ صفحہ ۲۹۳)

سرسید احمد خاں نے کانگریس کے مطالبات (۱) کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی اور (۲) سول سروس کے امتحان ہندوستان میں ہونے کی نہایت زور شور سے مخالفت کی۔ ایسی مخالفت بڑے سے بڑا برطانیہ نواز بھی کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے ہندوؤں کو بنگالیوں (ہندو بنگالیوں) کے خلاف بھی اکسایا۔ کیونکہ ہندو بنگالی عام ہندوؤں سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ چنانچہ عام ہندوؤں کے دل میں بنگالی ہندوؤں کا ہوّا بٹھانے کی کوشش کی گئی۔ سرسید خاں صاحب کا استدلال پڑھئے (اوپر بریکیٹ میں "ہندو بنگالی" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ مسلمان بنگالیوں سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ اسی لئے ان کا اشارہ اس طرف ہے)

"اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور انگلش لٹریچر میں ان کا علم جو گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے لئے ضروری ہے اس درجے تک پہنچ گیا ہے کہ ہندوؤں کے مساوی ہو؟ ہرگز نہیں۔ اب میں مسلمانوں اور اپنے ملک کے ہندوؤں کو اکٹھا کر کے پوچھتا ہوں کہ بنگالیوں سے وہ برابری کر سکتے ہیں..... اگر یہ امتحان مقابلے کا جاری ہو گیا تو غور کرنا چاہیئے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تمام قومیں، نہ صرف مسلمان، بلکہ تمام ہندو اس ملک کے معزز رئیس اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلواریں یاد ہیں ایک بنگالی کو جو چھری دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑے گا، اپنے اوپر حاکم دیکھیں گے؟ ملک کے انتظام کا کیا حال ہوگا؟ کیا آپ کے نزدیک راجپوت اور پُر جوش پٹھان، جو پھانسی یا پولیس کی تلوار یا فوج کی سنگین سے نہیں ڈرتے وہ بنگالیوں کے نیچے امن میں رہ سکتے ہیں.....؟ پس اگر کسی شریف آدمی کو، رئیس کو، اوسط درجے کے آدمی کو، اچھے خاندان والے آدمی کو جس کو خدا نے عزت دی ہے، اگر اس کو قبول کرے گا کہ بنگالیوں کی حکومت سہے، جوتیاں کھائے۔ تو بسم اللہ ریل پر سوار ہو تو چلے مدراس! چلے مدراس..."

(مدراس کا اشارہ اس لئے ہے کہ یہ کانگریس اجلاس مدراس میں ہوا تھا) (سرسید احمد خاں۔ از عتیق صدیقی صہ ۲۴۱)

صفحہ ۲۴۳ پر کونسلوں کی مخالفت میں بھی سرسید کا ایک دلچسپ استدلال ملاحظہ ہو:

"گورنمنٹ نے ایک کونسل رکھی ہے جو قانون بناتی ہے..... اس میں چند تنخواہ دار ممبر ہیں۔ علاوہ ان کے..... گورنمنٹ ہندوستانی رئیسوں میں سے جن کو وہ اس کرسی کے قابل سمجھتی ہے ان کو بلاتی ہے۔ باعتبار لیاقت کیوں نہیں بلاتی!.... آپ خیال کریں کہ وائسرائے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لئے واجبات سے ہے کہ ایک معزز شخص ملک کے معزز شخصوں میں سے ہو۔ کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کا آدمی خواہ اس نے بی۔ اے۔ کی ڈگری لی ہو یا ایم۔ اے کی اور وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے؟ ان کے مال جائداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا.........

سول سروس کے بارے میں بھی سرسید کا دلچسپ استدلال

پڑھئے (ص ۲۳۹ ـ ۲۴۰)

سب سے پہلا جو اعتراض حال کی شورش کا ہے وہ یہی ہے کہ جو امتحان (سول سروسکا) ولایت میں ہوتا ہے وہ موقوف ہو اور ہندوستان میں اس کی جگہ امتحان ہو۔ ولایت میں ہر شخص اعلیٰ وادنیٰ، ڈیوک اور ایل یا کسی جنٹلمین اور شریف خاندان کا بیٹا ہو اور ایک درزی یا اور کسی ادنیٰ درجے کے خاندان کا بیٹا ہو برابر امتحان دے سکتا ہے ..... لیکن انگلستان سے جو آتے ہیں وہ ہماری آنکھ سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ لارڈ کے بیٹے ہیں ... یا ایک درزی کے اور اس پر امر کہ ہم پر ایک ادنیٰ آدمی حکومت کرتا ہے ہماری آنکھ سے چھپا ہوا رہتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ خیال نہیں ہے۔ ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجے کے شخص کا، جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں، اپنی جان ومال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گی۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے سرسید احمد خاں صاحب کی تحریروں اور تقریروں کے اور بھی بیسیوں حوالے دیکر ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ آزادی بلکہ اصلاحات کے بھی زبردست مخالف تھے۔ برطانوی حکومت کو خدا کا سایہ سمجھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے مخالف تھے اور یہ اس وقت ہو رہا تھا جب کہ پریم چند ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور یا پھر ابھی گھٹنوں گھٹنوں چلنا سیکھ رہے تھے میں طوالت کے ڈر سے تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ اگر شبلی صاحب کو اسباب وعلل کے جاننے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ مذکورہ بالا دونوں کتابیں پڑھ ڈالیں اور اس کے بعد "تحقیق وتنقید" کا حق ادا فرمائیں۔

اپنے مضمون میں میں نے سوامی ویویکا نند کا نام ایک بات کی وضاحت کے لئے لیا تھا نہ کہ شرارتاً۔ دراصل شرارتی ذہن کا انسان دوسروں کو بھی شرارتی سمجھتا ہے۔ میرے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمان قارئین جو شبلی صاحب سے کم پڑھے لکھے ہیں انہیں بتاؤں کہ پریم چند نے آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی سوامی دیانند کے بارے میں اپنے ہزارہا صفحات کی تحریروں میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا (غالباً اس لئے کہ سوامی جی نے مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے مذاہب کے خلاف لکھا اور سبھی مذاہب کو دعوت دی کہ وہ سچے ویدک دھرم میں شامل ہو جائیں۔ تبلیغ والے بھی اپنے مذہب کو سچا اور دوسرے مذاہب کو جھوٹا کہتے ہیں) بلکہ انہوں نے سوامی ویویکانند کے متعلق لکھا جو سبھی مذہبوں کی برابر تعظیم و احترام کرتے تھے۔

شبلی صاحب نے "بلکماؤں کے درشن" ہی سے نہیں بلکہ پریم چند کی "درگا داس" سے بھی پریم چند کی تحریروں کو پورے تناظر سے کاٹ کر پیش کیا ہے (اسی طرح تقریباً ایک درجن کہانیوں کا بھی پوسٹ مارٹم کیا ہے حالاں کہ ان کہانیوں میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی) درگا داس میں پریم چند نے جہاں جہاں سچے مسلمانوں کی تصویر کشی کی ہے اسے شبلی صاحب شیرِ مادر سمجھ کر پی گئے ہیں (شبلی صاحب شیرِ مادر کے محاورے کے استعمال پر بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا کروں اس سے اچھا اور حسب حال محاورہ مجھے سوجھتا ہی نہیں افسوس کہ میں شبلی صاحب سے تھوڑا سا زیادہ پڑھا لکھا ہوتا!)

اب میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو جو کہ نہ صرف عالمِ اسلام میں نہایت توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ اعلیٰ درجے کے انشا پرداز بھی تھے۔ پریم چند کے بارے میں ان کے خیالات پیش کرکے اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔ ماجد صاحب بقول خود اسلام کے بارے میں اپنے آپ کو FANTIC کہتے تھے۔ پریم چند کی تحریروں کے وہ والا وشیدا تھے۔ انہیں زندگی بھر پریم چند کی تحریروں میں کہیں فرقہ پرستی کی بو نہ آئی لیکن شبلی صاحب کو دودھ کے دانت ٹوٹتے ہی آدم بو۔ آدم بو پکارنے لگے۔ بہرحال مولانا کے الفاظ پڑھئے۔

"...اور ہندوستان میں تحریکِ وطنیت کے آئندہ مورخ کو جس طرح گاندھی، نہرو، ابوالکلام کی تحریروں کی ایک ایک سطر کی چھان بین ناگزیر ہوگی اسی طرح پریم چند کے بھی افسانوں کو بھی الٹ پلٹ کئے بغیر کام نہ چلے گا" (انشائے ماجد حصہ دوم۔ بار دوم اگست ۱۹۶۸ء صفحہ ۹۸)

دیارِ غیر میں

ڈاکٹر اُدے سرن ارمان
(بلاری)

آئی۔ دی۔ سی۔ ایس انگلینڈ کے چیرمین کی طرف سے مشاعرے کی صدارت کی پیش کش کے لئے میں انکار نہ کرسکا۔ چنانچہ اس ادارے کی طرف سے افغان ایرلائینز کا آمد و رفت کا ٹکٹ موصول ہوا تو میں نے انٹرنیشنل پاسپورٹ کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ شروع کی۔ قریباً ایک ماہ بعد پاسپورٹ تب میسر آسکا جب کہ متعلقہ کاغذات کو کرنسی نوٹوں کے پہیے لگائے گئے۔ ورنہ یہ مرحلہ طے ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ ۳۰ رجولائی کو روانگی تھی اور ۲۸ رجولائی کو پاسپورٹ دستیاب ہوا۔ اب صرف ۲۹ رجولائی کا ایک ہی دن درمیان میں تھا۔ انکم ٹیکس کلیرنس سرٹیفکیٹ۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ اور زرِ مبادلہ کا حصول ایسے سخت ترین مراحل کے علاوہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی او۔ کے کرانا تھا۔ بہرکیف یہ تمام مراحل کسی نہ کسی طرح خدا کے فضل و کرم سے طے ہوگئے اور ۳۰ رجولائی ہفتہ کے روز تین بجے دوپہر بلاری سے دہلی کو بذریعہ کار روانہ ہونے ہی لگا تھا کہ ہسپتال میں کسی نے زور سے چھینکا۔ ہمارے ہاں ایسے وقت کسی کا چھینکنا اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی چنانچہ گھر کے ممبران اور رخصت کرنے والے احباب میں اس چھینکنے کے باعث دبی دبی سی تشویش ہوئی تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ چھینکنے والے نے تو "آچھی" کہا ہے۔ یعنی اس نے تو یہ کہا ہے کہ سب اچھا ہوگا آپ لوگ کیوں فکرمند ہیں۔ ویسے بھی آج سنیچروار ہے اور قدرتی طور پر سنیچر کا دن میرے لئے ہمیشہ مبارک ثابت ہوا ہے۔ میں نے زمین کا سودا کیا تو اس روز بھی سنیچر کا ہی دن تھا۔ اپنے نرسنگ ہوم اور ہسپتال کا سنگِ بنیاد رکھا تو بھی سنیچروار ہی تھا کار۔ موٹر سائیکل۔ ٹرک۔ بندوق۔ رائفل بھی اتفاق سے سنیچر کے دن ہی خریدے گئے۔ حالاں کہ عام طور پر سنیچر کے دن لوہے کا گھر لانا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اور آج بھی سنیچر ہی ہے لہٰذا خدا کے فضل سے آج بھی سفر کامیابی سے کرے گا لہٰذا میں نے سب حضرات کو مطمئن کرتے ہوئے کہا کہ بس آپ تو دعا فرمایئے باقی سب بھگوان پر چھوڑ دیجئے۔ چنانچہ میرے کرم فرماؤں نے ہنسی خوشی رخصت کیا۔ میری بیوی اور گھر کے کچھ عزیز میرے ساتھ کار میں سوار تھے۔ ۳۱ رجولائی کو صبح کے چھ بجے کی فلائٹ تھی اور ۴ بجے صبح پالم ایرپورٹ پر پہنچنا ضروری تھا۔ بلاری سے روانہ ہوکر رات کے قریباً ۹ بجے اپنے بھائی سرور تونسوی کے ہاں پہنچا۔ ان کا اور بھاوج کا آشیرواد لیا اور ½۹ بجے شالی مار باغ اپنے ایک عزیز کے ہاں روانہ ہوگیا کیوں کہ انہوں نے زرِ مبادلہ کا انتظام کرکے رکھا ہوا تھا اور وہاں سے پالم ایرپورٹ قدرے نزدیک بھی تھا لہٰذا رات کا کچھ حصہ شالی مار باغ پر گزارا اور صبح تین بجے پالم ہوائی اڈہ کی طرف روانہ ہوئے۔ غرضیکہ ۳۰ رجولائی کا سارا دن اور رات آنکھوں آنکھوں میں کٹے۔ ہوائی اڈے پر زرِ مبادلہ کے لئے لائن پر کھڑا ہوا۔ مجھ سے آگے مسٹر بعدوریا ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر بجنور لائن میں تھے وہ بھی ایک سیمینار میں شرکت کرنے لندن کے لئے میرے ہم سفر ہیں۔ جب مسٹر بعدوریا کو فارن کرنسی مل گئی تو میں نے کاغذات متعلقہ افسر کے سامنے رکھے۔ ملک سے باہر جانے کا میرا پہلا موقع تھا اس لئے میں اندر ہی اندر کافی پریشان تھا گو بظاہر میں اپنی اس اندرونی پریشانی کو دبائے ہوئے تھا۔ افسر متعلقہ نے کاغذات پر مہریں وغیرہ لگا کر کاغذات مجھے واپس دے دئے اور کرنسی دینی کچھ نہ دی تو میں نے دریافت کیا کہ کیا پاؤنڈ جہاز میں ملیں گے۔ اس پر وہ چونکا اور کہنے

"سوری" میں دینا بھول گیا۔ میں نے قدرے خفگی سے کہا کہ آپ دینا ہی بھول سکتے ہیں کبھی لینا بھی بھولے ہیں۔ اس پر یہ متعلقہ شخص قدرے نادم سا ہو کر دوسرے کام میں لگ گیا مجھے صرف بارہ پاؤنڈ دئے گئے ہیں لہذا میں نے اپنی شریک حیات آوشارانی شرما سے کہا کہ لیجئے یہ انڈین کرنسی اپنے پاس رکھئے سرکار نے صرف بارہ پاؤنڈ ہی دئے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ اگر ٹکٹ بھارت میں خریدا جاتا تو پانچ سو ڈالر تک زرمبادلہ مل سکتا تھا۔ لیکن اگر ٹکٹ انگلینڈ سے آئے تو صرف بارہ پاؤنڈ ہی دئے جاتے ہیں مسٹر بھدوریا کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ کو فارن کرنسی کتنی ملی ہے تو میں نے انہیں بارہ پاؤنڈ دکھلائے۔ بڑی حیرانی سے کہنے لگے تجھے تو گیارہ پاؤنڈ ہی دئے ہیں۔ بھدوریا صاحب جلدی سے کاؤنٹر پر گئے اور اپنی افسری کی دھونس سے متعلقہ افسر کے حلق میں سے ایک پاؤنڈ اور نکال لائے۔ جے ہندوستانیوں کے ضمیر کی۔

کابل۔ ماسکو۔ پراگ اور ہیتھرو (لندن) ہر جگہ بہت بری طرح سے تلاشی لی گئی۔ کسی کی اولاد کے بارے میں پوچھا گیا۔ آمدنی وغیرہ سب کچھ پوچھا تو خیر کوئی بات نہ تھی مگر تلاشی لیتے وقت متعلقہ حضرات بدتمیزی کی حدوں کو بھی پار کر گئے۔ فیملی پلاننگ کا عملہ کسٹم آفیسرز اور انکم ٹیکس آفیسرز بے شک قانونی حدود میں ایسا کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ نفرت انگیز انداز میں ہوتا ہے۔ لندن پہنچکر سب سے پہلے یہ احساس ہوا کہ غریب و نادار کس طرح دل مسوس کر جیتے ہیں کیونکہ میری جیب اس کی کبھی اجازت نہ دیتی تھی کہ میں ایک گلاس جوس بھی پی سکوں۔ چیرمین آئی۔ وی۔ سی۔ ایس جناب مکٹ سنگھ اور ان کے اہل و عیال کا بھلا ہو کہ فوری طور پر جنہوں نے میری جیب میں اڑھائی ہزار پاؤنڈ کے کرنسی نوٹ ڈال دئے۔ اور بے زری کا احساس میرے دل و دماغ سے قدرے دور ہوا۔

وہاں ایلنگ میں ایک زیر تعمیر مکان میں ایک معمار اور دو مزدور کام کر رہے تھے میں نے ٹھیکیدار سے دریافت کیا کہ یہاں اینٹوں کا کیا بھاؤ ہے فرمانے لگے کہ سوا سو اور ڈیڑھ سو پاؤنڈ میں ایک ہزار یعنی چوبیس سو روپے فی ہزار۔ وہاں اینٹیں بجلی سے پکائی جاتی ہیں۔ ایک مزدور بارہ پاؤنڈ (۱۹۲ روپیہ) اور دوسرے کو پندرہ پاؤنڈ یعنی (۲۴۰ روپے) روزانہ ملتی تھی۔ میں نے مزدوری کے اس فرق کے بارے میں دریافت کیا تو ٹھیکیدار کہنے لگا ڈاکٹر صاحب یہ ہیں مسٹر اینڈریوز براؤن جو ایک ڈاکٹر کے صاحبزادے ہیں اور کیمبرج کے اسٹوڈنٹ ہیں چھٹیوں میں مزدوری کر کے اچھا کما لیتے ہیں مگر یہ کام میں ہوشیار نہیں ہیں اس لئے دوسرے مزدور کے مقابلہ میں تین پاؤنڈ کم اجرت کے حق دار ہیں۔ جب یہ کام بہتر طور پر کرنے لگیں گے تو یہ بھی اتنی ہی اجرت پائیں گے جتنا کہ دوسرا مزدور لے رہا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کا یہ سٹوڈنٹ ہماری باتیں سنتا رہا اور بغیر کسی جھجک کے اپنے کام میں مصروف رہا۔ ہمارے نوجوانوں کو اس کیمبرج سٹوڈنٹ سے سبق سیکھنا چاہئے۔ معمار کی مزدوری تیس پاؤنڈ (۴۰۰ روپے) یومیہ ہے۔

سارے انگلینڈ میں لاؤڈ سپیکر کا استعمال ممنوع ہے۔ پولیس۔ فائر بریگیڈ اور ایمبولینس گاڑیوں کے علاوہ کسی بھی وہیکل کے ہارن بجنے کی آواز میں نے نہیں سنی۔ کوئی شخص زور سے نہیں بولتا۔ ہر آدمی صفائی پسند ہے۔ کیا مجال کہ کہیں بھی کوڑا نظر آئے۔ کالے رنگ کے پولیتھین بیگ ہر گھر میں رکھا ہوتا ہے جس میں کوڑا کرکٹ وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں اور انہیں رات کو سڑک کے کنارے یا مکان کے صحن میں ان کا منہ باندھ کر رکھ دیا جاتا ہے میونسپل کارپوریشن کی گاڑی آتی ہے اور ان بیگوں کو لے جاتی ہے اور تمام کوڑا کسی پہاڑی کی تلہٹی میں پھینکنے کے بعد کوئی کیمیکل چھڑک کر کمپوسٹ بنا دی جاتی ہے۔ آپ کسی کو بازار میں تھوکتے ہوئے نہیں پائیں گے۔ راستوں میں جہاں تہاں ڈسٹ بن رکھے ہوئے ہیں اگر کسی کو کوئی ردی کاغذ وغیرہ

پھینکنا ہوتا ہے تو وہ انہیں استعمال کرتا ہے۔ عوام میں ڈسپلن دیکھنے کی چیز ہے۔ سبزی کی دکانوں پر بھی لائن لگی ہوتی ہے عورتوں کی بہت زیادہ عزت کی جاتی ہے۔ میں نے ہوائی جہاز میں دیکھا ایک انگریز بیت الخلا کے سامنے کسی کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کئی منٹ کے بعد اندر والا شخص نکلا تو ایک ہندوستانی خاتون شلوار قمیض اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بیت الخلا کے پاس جا پہنچی۔ انگریز جو کافی پریشانی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہاں پر منتظر تھا اس نے اس ہندوستانی خاتون کو دیکھتے ہی اشارہ کیا کہ آپ پہلے چلی جائیں۔

لندن سے دو سو میل کے فاصلے پر ٹلی بونٹ نام کے ایک گاؤں میں بونو تر فارم کے مالک ایک کسان مسٹر سوتی نی کے ہاں ایک دن رات مہمان رہا۔ اس ۶۵ سالہ انگریز کسان نے اپنا تمام فارم دکھایا گائے بھیڑ ولا کے لئے چراگاہ مرغی پالن اور سوروں کے باڑے الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ دو ٹریکٹر۔ کار۔ ورکشاپ۔ لائبریری۔ بہت ہی خوبصورت باغیچہ جس میں ہر قسم کی سبزیوں اور پھلوں کی بہتات تھی۔ شہد کی مکھیاں پالنے کے لئے پانچ بکس ایک طرف رکھے ہوئے تھے۔ تین گھوڑے اور تین کتے بھی اس انگریز کسان نے پال رکھے تھے۔ رہائشی مکان قابلِ دید تھا۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اس بڑے فارم کو سنبھالنے والے خود مسٹر سوتی نی تھے۔ ایک بھی ملازم یا مددگار نہیں تھا جو کسی بھی کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا ہو۔ میں نے کئی گاؤں دیکھے اور وہاں کے کسانوں اور ان کے رہن سہن کا بغور جائزہ لیا۔ ہر مکان پختہ اور صاف ستھرا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں امیر گاؤں میں بستے ہیں اور غریب شہروں میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انگلستان پہاڑی اور پٹھاری ملک ہے کہیں بھی دو بیگھے زمین بھی ہموار نظر نہیں آتی۔ سو سوا سو ہارس پاور کے ٹریکٹروں اور مشینوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مزدور ملتے نہیں ہیں اس لئے چھوٹے کاشتکار جو ٹریکٹر اور مشینوں کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اپنی زمین بڑے کسانوں کو فروخت کر کے شہر میں جا بستے ہیں۔

انگلینڈ میں ہر بے روزگار کو ہر پندرہ روز کے بعد پچاس پاونڈ یعنی سولہ سو روپیہ ماہانہ ڈول منی سرکار کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ سرکار محسوس کرتی ہے کہ ہمارے شہری نکمے یا کام چور نہیں ہیں بلکہ انہیں روزگار ملتا ہی نہیں لہٰذا ان کی گزر اوقات کی ضرورت کو پورا کرنا سرکار کا کام ہے۔

انگلینڈ کے باشندوں کو بیماری کی حالت میں جملہ ادویات انجکشن وغیرہ سب سرکاری طور پر مفت دئے جاتے ہیں۔ اکثر جگہوں پر کنسل ٹینٹ بہ آسانی میسر ہیں ان کے کمروں کے سامنے "سرجری" لکھا ہوتا ہے۔ مریض وہاں جاتے ہیں معائنہ کراتے ہیں اور ڈاکٹر کو فیس ادا کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹر مریض کو نسخہ لکھ کر دے دیتا ہے مریض یا اس کے وارث نسخہ دکھا کر کسی بھی کیمسٹ کے ہاں سے دوا مفت لے سکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی گراں قیمت کی کیوں نہ ہو۔ اور کیمسٹ ان نسخوں کو پیش کر کے سرکاری خزانے سے ادویات وغیرہ کی قیمت وصول کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے لکھے بغیر کوئی بھی کیمسٹ کسی کو سر درد تک کی گولی بھی نہیں دے سکتا۔ اگر مریض کی حالت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر نیشنل ہاسپٹل (سرکاری شفاخانہ) کو ریفر کر دیتا ہے جہاں زمانے بھر کی سہولتیں مریض کو حاصل ہوتی ہیں۔ کوئی بھی ڈاکٹر کسی مریض کو انجکشن نہیں لگا سکتا۔ اگر کسی مریض کو انجکشن دینا ضروری ہو تو بھی مریض کو نیشنل ہاسپٹل سے ہی رجوع کرنا ہوگا جہاں ایک ڈاکٹر ٹیسٹ کرتا ہے پھر انجکشن لگاتا ہے

سولہ سال تک کی عمر کے ہر لڑکے اور لڑکی کا اسکول جانا لازمی ہے اگر کوئی طالب علم سکول سے غیر حاضر رہتا ہے تو دوسرے ہی دن پولیس کا آدمی اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اسے جبراً اسکول لے جاتا ہے۔ اسکول سے غیر حاضر رہنے کی وجہ اگر موزوں ہوگی تو اس کی ہر پرنسپل

حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ سولہ سال تک کی عمر کے لڑکے یا لڑکیاں اسکول سے باہر رہ سکیں۔ میرے ایک دوست نے حجام کے ہاں بال کٹوائے تو اسے اٹھائیس ۲۸ روپے دینے پڑے۔ میرے دوست کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ بھی بال کٹوا لیجئے۔ میں نے عرض کیا کہ پردیس میں حجامت کرانے نہیں آیا۔

انگلینڈ میں چار ماہ گرمی کا موسم ہوتا ہے اور وہاں کی گرمی ایسی ہوتی ہے جیسے ہمارے اکتوبر، نومبر، دسمبر، جنوری کا موسم ہوتا ہے۔ باقی آٹھ مہینے انتہائی سرد ہوتے ہیں۔ برف باری ہوتی ہے۔ اگست ستمبر میں گیہوں کی فصل ایک سال بعد کاٹی جاتی ہے۔ کیونکہ انتہائی سردی کے باعث گیہوں کی فصل کو بڑھنے اور پھولنے پھلنے اور پکنے میں سال بھر لگ جاتا ہے، دھان اور گنا وغیرہ نہیں بویا جاتا۔ ہر مکان کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ ہوگا اور گھر کے ممبران ہر روز صبح شام اس باغیچہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ گھروں کے اندر بھی پلاسٹک کے گملوں میں پودے وغیرہ اگائے جاتے ہیں۔

ویلس کے لوگ انگریزی بولتے ہیں لیکن ان کی اپنی الگ زبان ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یوروپ میں رہتے تھے اور انگلستان جا کر آباد ہو گئے۔ ایک جگہ بورڈ پر اوپر لکھا تھا HYS BY SR MYDD اور اس کے نیچے لکھا تھا INFORMATION اوپر لکھے الفاظ کوئی بھی انگریزی داں صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ اس کا تلفظ ہے "ہسبر داس" ایک گاؤں کا نام تھا کھیاں ( ) بورڈ پر لکھوا تھا LLAN فارم کا نام تھا برنوئر (BRYNOYRE (جس کے معنی ہیں ٹھنڈا پہاڑ۔

ہمارے ملک میں جب شراب کھلے عام پینے کی اجازت تھی یعنی باقاعدہ شراب خانے ہوتے تھے اور ان شراب خانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہوتی تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ میں شراب قطعاً نہیں پیتا مگر میں نے ایک دوست کے توسط وہاں کا میکدہ بھی دیکھا۔ میکدہ میں ہم دونوں ایک الگ میز پہ بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے بیر منگائی اور میرے لئے کوکا کولا منگایا۔ پینے والوں میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ ایک لائن میں جس طرح قصائی کی دوکان پر کٹے ہوئے بکرے الٹے لٹکے ہوتے ہیں اسی طرح مختلف برانڈ کی شراب کی بوتلیں الٹی لٹکی ہوئی تھیں اور ہر بوتل کے منہ پر اس قسم کی ڈاٹ لگی ہوئی تھی کہ جس کو جس قدر ضرورت ہوتی بٹن دبا دیا جاتا اور مطلوبہ مقدار میں شراب گلاس میں آ ٹپکتی۔ سکاچ وسکی کی مختلف قسمیں تھیں گھٹیا شراب کا وہاں نام و نشان تک نہیں تھا۔ شیشے کی الماریوں میں ہر قسم کی کھانے کی اشیاء نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہر کوئی انتہائی مہذب انداز میں پی رہا تھا۔ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں تھی۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہیں تھا اپنی ہی جگہ بیٹھے تمام پینے والے مے نوشی کا حقیقی لطف لے رہے تھے۔ ہمارے ہاں پی کر نالیوں میں گرتے پڑتے ہیں اور انگلینڈ والے پی کر دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔

ٹرنیفا لگر اسکوائر ایسا مقام ہے جہاں سرِ شام مرد عورتیں اکٹھی ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور جیسے ہی رات کے بارہ بجتے ہیں ایک دوسرے کا بوسہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کی تمیز نہیں ہوتی کہ کون کس کی بیوی یا کسی کی بیٹی یا کس کی بہن۔ خوب ناچنا گانا اور کھانا پینا ہوتا ہے۔ وہاں ہر شہر میں ایک ایسا کلب ہے جس میں ایک لڑکی ناچتی ہے اور دھیرے دھیرے ناچتے ہوئے اپنا تمام لباس اتار پھینکتی ہے اور بالکل برہنہ ناچ جاری رہتا ہے ایسے ٹیزلیشنر کلب میں کسی بھی رنگ و نسل کا انسان جا سکتا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ برہنہ ناچنے والی لڑکی کو کوئی چھو بھی لے۔ نظروں سے چاہے آپ جیسی بھی ذہنی عیاشی چاہیں کرتے رہیے۔

انگلینڈ میں جب کسی کی موت ہو جاتی ہے تو فیونرل ڈائرکٹیشن آفس کو فون کر دیا جاتا ہے۔ اس آفس سے فوری طور پر متعلقہ ستھانی خاص قسم کی کار

جس میں تابوت وغیرہ رکھا ہوتا ہے فون کرنے والے کے ہاں پہنچ جاتا ہے اور مُردے کو تابوت میں رکھ کر قبرستان لے جاتے ہیں۔ اور مذہبی رسومات ادا کرنے کے بعد مُردے کو دفنا دیا جاتا ہے۔ قبرستان میں قبریں پہلے ہی سے کھُدی تیار ہوتی ہیں۔ چند منٹوں میں سب کام سرانجام دے دیا جاتا ہے۔ مرنے والوں کو اس خدمت کے لئے طے شدہ اُجرت اس آفس کو ادا کرنی ہوتی ہے۔

وہاں کے لوگوں کی نیت خراب نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ ایماندار ہیں۔ مہذب ہیں اور تعلیم یافتہ بھی۔ قومیت اور حب الوطنی کا جذبہ ہر ایک کے دل و دماغ پر مسلط ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان خوش حالی اور فارغ البالی سے ہم کنار ہے۔ ••

(مشاعرہ کا بقیہ)

کسی دوسرے شاعر کا یہ شعر بھی سنئے ؎

رات معصوم ہے راز دل کو چھپا لیتی ہے
دن جفا پیشہ ہے را کو اُگل دیتا ہے

انصاری صاحب جناب جگت موہن لال رواں انصاری۔ مرحوم کے دو اشعار سنا رہے ہیں ؎

قابلِ رشک ہیں دیوانوں کے آپس کے سلوک
ان کو زنجیر سے زنجیر بدلتے دیکھا
کانٹے کا قلق ہے ترے دیوانے کو
رکھ دیا دل میں جو تلوے سے نکلتے دیکھا

انصاری صاحب کی طرف سے جملہ حضرات کے شکریہ کے بعد یہ محفلِ شعر دو بج کر بیس منٹ پر ختم ہو گئی۔ ••

"یہ کتّے ...... اور ؟"

عبدالہادی خاں
شاہجہاں پور

گورنمنٹ انٹر گرلس کالج کے گیٹ سے عظمیٰ اور شہناز باہر نکلیں۔ عظمیٰ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں سڑک پر ایک ہجوم تھا۔ لڑکیاں، رکشے، سائیکلیں، پیدل مگر اس کے رکشے کا ابھی تک کہیں پتہ نہیں تھا وہ دونوں ایک طرف کھڑی ہو کر انتظار کرنے لگیں۔

عظمیٰ نے دیکھا اور کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا شہناز ذرا گن تو، ان کم بختوں کی تعداد میں تو روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے

چولہے میں جائیں۔ شہناز بولی۔ یہ رکشے والا جانے کہاں مر گیا۔

اری دیکھ تو، اے ہے: یہ تو پورے آدھے درجن ہو گئے۔ عظمیٰ نے بظاہر پریشانی کے سے انداز میں کہا۔

کم بخت جانے کہاں سے ایک دم بلبلا کر نکل پڑے۔ جھاڑو پھیروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ شہناز زیرِ لب مسکرائی۔

یہ بے چارے مسکین تجھے چھوڑ کر اور جائیں بھی کہاں؟

ہاں ہمیشہ نشیب ہی میں تو مرتا ہے۔ عظمیٰ نے چٹکی لی۔

تو ہی رکھ لے اپنے کلیجے میں شہناز غرائی، موؤں کی ذرا شکلیں تو دیکھ کیسی خوفناک ہیں وہ دم کٹا جبرا تو مجھے کسی ذلیل ذات کا بھوٹیا معلوم ہوتا ہے۔ زبان لٹکائے، دانت نکالے ہانپ کیسا رہا ہے۔

اچھا تو تجھے یہ نیا دُم کٹا جبرا پسند نہیں، خیر وہ تیرا اعلیٰ ذات، سفید رنگ، ملائم بال، چوڑی پیشانی، پتلی تھوتھنی اور حسب نسب والا ٹامی جسے شاید انگریز جاتے وقت ہندوستان ہی میں چھوڑ گئے وہ بھی تو اس گروہ شیدائی میں موجود ہے ذرا اس غریب سے ہی آنکھیں ملا لے، کتنا شریف و سنجیدہ نظر آ رہا ہے بے چارہ۔

چل رہنے دے، شہناز بولی، وہ کچھ بھی سہی لیکن سنجیدہ ہے، مہذب و شائستہ تو ہے، تو تو ان نگوڑے کالے کھیرے پینڈیوں پر ہی مری جا رہی ہے۔ اری چڑیل: آخر کتنے پال لے گی، نہ جانے تجھے اس بڑھی دُم والے کھیرے کی کون سی ادا بھا گئی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے تو وہ دردوفرو الا کالو ہی بہتر ہے، دیکھ تو حرام کا کھاکھا کر پلا کیسا ہے ذرا اس کا انداز تو دیکھو، تھوتھنی اٹھائے دُم اٹھائے سوں سوں کر رہا ہے جیسے بو سونگھ رہا ہو۔

دو حسرت بھیجتی ہوں میں اس کلموہے کی شکل پہ اس سے تو وہ دونوں مینی ذلت کے پلّے ہی اچھے ہیں۔ تیرے ٹامی جیسا رنگ نہیں تو کیا، کھلتی ہوئی رنگت تو ہے۔ بیچاروں نے پیدا ہوتے ہی عاشقوں کی فہرست میں نام لکھوا لیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ ان دونوں کو گود لے لوں۔ کس طرح خود کلمہے دُمیں ہلا ہلا کر کوں کوں کر رہے ہیں۔

شہناز و عظمیٰ نے ان سب کی حرکات، حلیہ اور دلچسپی کی مناسبت سے شناخت کے لئے ان کے نام رکھ چھوڑے تھے جو اُن پر بالکل فٹ تھے۔

اتنی دیر کیوں کر دی؟ رکشے کو دیکھ کر شہناز نے غصہ سے کہا۔

جی راستے میں پنکچر ہو گیا تھا۔

روز تمہارا کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے یہ کیوں نہیں کہتے کہ سواریاں ڈھوتے رہتے ہو۔

رکشہ چلا اور ساتھ ہی ساتھ چھ سائیکلیں بھی مناسب فاصلہ دے کر کچھ رکشے کے آگے، کوئی پیچھے اور کوئی سب پیچھے روانہ ہوئیں۔

مر دار یہ سب تیری ہی لائی ہوئی آفت ہے، شہناز گھبرائی، گھر قریب آ رہا ہے اور یہ کم بخت پیچھا ہی نہیں چھوڑتے

آخر تو مری کیوں جا رہی ہے، مجھے تو ان کو ستانے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ دیکھتی نہیں کس خاکساری سے دُم ہلا رہے ہیں اگر ذرا سا بھی موقع مل جائے تو ابھی جوتیاں چاٹنے لگیں۔ غریب بڑ بیچارے۔

تیرے تو دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے، شہناز نے نقاب کو ٹھیک کیا۔

اُوہ بی بتّوں! یہ دادی اماں کیوں بنی جا رہی ہو، ان شامی صاحب کو میں نے ہی تو لاسے پر لگایا۔ ویسے نچا نچا کر، مسکرا مسکرا کر تم نے ہی تو غریب کے دل پر بجلیاں گرائیں ہیں۔ میں ہی تو اسے دیکھ کر سرد آہیں بھرتی ہوں تو سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔ اب تم نصیحت نہیں کروگی تو اور کون کرے گا۔ خوب سمجھتی ہوں میں بھی۔ موقعہ پاتے ہی تو اس غریب کو بھی ہڑپ کر جائے گی۔ اور میں تو یہ سب تیرے ہی لئے پال رہی ہوں۔

چپ رہ مُردار۔ وہ دیکھ تیرا جھبرا قریب آ رہا ہے۔

سائیکل رکشے سے قریب ہوگئی۔ برائے نام نقاب کی باریک جالی سے جھانکتی ہوئی آنکھیں چار ہوئیں۔ جھبرا دُم کُتا گنگنا رہا تھا، "کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار...!"

مُوا بے حیا۔ شہناز بڑبڑائی اور پھر کھی کھی کھی۔

سڑک پر آمد و رفت کا ہجوم زیادہ تھا۔ رکشا رکا اور ادھیڑ عمر رکشے والے نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے سر اٹھا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پیچھے آتے ہوئے ٹینی پلّوں کی رینگتی سائیکلیں قریب ہی ایک گلی میں مُڑ گئیں۔ داروغہ والے کالو کی سائیکل اندازِ لاپرواہی سے رکشے کے پاس سے آگے بڑھ گئی جیسے محض راستہ صاف ہونے کے انتظار میں وہ رکشے کے پاس رُکا تھا۔ شامی کی سائیکل کافی فاصلے پر تھی۔ ایک ہی نظر میں سارا شیرازہ بکھر گیا جیسے رکشے والے کی نظروں نے کہہ دیا ہو "خبردار، قریب نہ آنا، یہ بڑے صاحبوں کی اصل نسل کی...... ہیں! سالوں ساری عمر جیل کاٹتے گزرے گی!" رکشے والے نے سر جھکا کر پیڈل پر زور لگایا اور رکشہ آگے بڑھا۔ اس کی نظر میں یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ تو روز کا معمول تھا۔ [illegible] والا شامی اب بھی رکشے کے ساتھ ساتھ رال ٹپکاتا چل رہا تھا۔

کچھ دور اور چل کر رکشا رک گیا یکے بعد دیگرے دو سیاہ برقعے بادی النظر میں نقابوں کو ٹھیک کرتے مگر حقیقت پر کسے ہوئے اپنے جواں سینوں کے قیامت خیز اُبھار اور پھول دار سِلک کے چمکدار چکنے چہروں کی بہار دکھاتے ہوئے اُترے۔ نقابوں کو دُرست کرنے کی کشمکش میں کئی بار دونوں کے عارضِ تاباں کی جھلک اور مسکراتے ہوئے لبوں سے سفید موتی سے دانتوں کی چمک نمایاں طور پر نظر آئی، کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر ایک بار نظرِ بازگشت ڈالی گئی۔

سامنے کچھ فاصلے پر سنجیدہ و پژمردہ شامی کی سائیکل آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی اُس طرف آ رہی تھی سمتِ مخالف میں دونوں ٹینی ذات کے پلّے جو گلی میں سے گھوم کر پھر اسی سڑک پر آ گئے تھے نظر آئے، کالو کچھ فاصلے پر کھڑا بظاہر سائیکل کی چین ٹھیک کر رہا تھا جھبرا ایک گلی کے سرے پر کھڑا گردن نکالے ان دونوں کی طرف گھور گھور کر ہانپ رہا تھا اور شامی بالکل ان کے نزدیک ایک راہ گیر سے کسی فرضی شخص کا پتہ دریافت کر رہا تھا۔

دونوں برقعے کچھ دُور کھسر پھسر اور کھی کھی کرتے اٹھلاتے ہوئے چل کر آمنے سامنے دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے نقابیں اُلٹ کر ایک بار پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں اور مسکرا کر غائب ہوگئے۔ یہ سب کچھ چند سکنڈ میں ہوگیا اور بڑے صاحبوں کی اصل نسل کی..... بڑے دروازوں پر پہنچ کر محفوظ ہوگئیں۔

شامی کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ کُتّے! وہ بڑبڑایا سب کُتّے ہیں اور وہ دونوں نقابوں کو اپنے ابھرے ہوئے سینوں کے درمیان دبائے کھیسیں نکالے کھی کھی کرتی ہوئی.....؟ اور پھر جیسے کسی نے اس کے دل میں چپکے سے چٹکی لی ـــ اور صاحبزادے تم خود؟ وہ تلملا گیا۔ کُتّا! اور اسے خود سے ایک شدید نفرت کا احساس پیدا ہوا۔

دن بھر اس کا دماغ عجیب سی اُلجھنوں، پریشانیوں اور سب سے نفرتوں کے احساس میں مُبتلا رہا۔

اور پھر ایک دن ہیٹری گُتوں میں ایک خوفناک جنگ ہو گئی ـــــ سفید کاغذ کی ایک گولی، بُرقعے سے ہاتھ نکال کر جب کہ دُم کٹا جھبرا گنگناتا ہوا رکشے کے قریب آیا۔ علی نے گولا پھینکی ..... بات غیر متوقع تھی، گھبراہٹ میں اچانک اگلے پہیے کا بریک لگا اور جھبرا لڑکھڑاتا نیچے آ رہا۔ ایک ہاتھ سے سائیکل کے گھوسے ہوئے ہینڈل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے، سڑک پر قریب قریب گھسٹتے ہوئے جھبرے کا دوسرا ہاتھ کاغذ کی گولی پر پڑا۔ اور ابھی وہ سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ کئی سائیکلیں اس کے پاس آ کر رُک گئیں۔

ٹامی کی آواز گونجی، کیوں بے یہ کیا حرکت تھی؟ سالے بدمعاش شریف بچیوں کو چھیڑتا ہے اور زناٹے کا ایک ہاتھ اس کی گدی پر پڑا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا، پھر ایک شور بلند ہوا۔ راہ گیر کھڑے ہو کر واقعہ کے متعلق ایک دوسرے سے استفسار کرنے لگے ایک ہجوم لگ گیا ٹینی پیلے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ان ہی شریف غنڈوں نے آج کل مُلک و قوم کو بدنام کر رکھا ہے ـــ ذرا جرأت تو دیکھئے ان حضرات کی۔ کاغذ کی گولی بنا کر رکشے میں پھینکنے کی کوشش فرمائی تھی مگر اتفاق سے وہ سڑک پر گر گئی ـــ کوئی چیخ رہا تھا سالے لفنگے تجھے شرم نہیں آتی پرچے بازیاں کرنے کے لئے تیری ماں بہنیں نہیں ہیں جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کو تاکتا پھرتا ہے۔ تھانے لے چلو سالے کو۔ کسی نے ترغیب دی اور پھر موٹی موٹی گالیاں، مغلظات، دونوں طرف سے گھونسے، لات، تھپڑ، چیخ و پکار، کچھ دیر بعد بیچ بچاؤ ہوا۔

ٹامی کو جھبرے پر رحم آ گیا اس وقت صرف وہ ہی اکیلا آوارہ تھا، بدمعاش و غنڈہ تھا، کتا و بے حیا تھا۔ باقی اور سب شریف و پارسا تھے غیرت دار تھے ملک کے ماں بہنوں کی عصمتوں پر خود کو قربان کر دینے والے خادم تھے۔ ان کے دلوں میں خلوص تھا۔ درد تھا، ہمدردی تھی اور جھبرے جیسے شریف بدمعاشوں سے شدید نفرت کا احساس تھا۔ ٹینی پیلے اور کھیرا ٹامی خوب بڑھ بڑھ کر اپنی شرافت اور بہادری کا رنگ جما رہے تھے۔ اور جھبرے کی آوارگی، بے حیائی اور غنڈے پن کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ داروغہ والا کا جھبرے کی طرف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ سب جھوٹے ہیں، کاغذ رکشے میں سے پھینکا گیا۔ اس دست بدست کی جنگ کے نتائج پانچوں کے چہروں، پھٹے ہوئے بش شرٹوں اور قمیصوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔

مُنہ لٹکائے دل میں ایک کسک، ایک درد لئے تنہا ایک طرف کھڑا ٹامی ان شریفوں اور نیکی کے پُتلوں کی بابت سوچتا رہا۔ یہ مکار و عیار شریف! اس ہجوم میں کوئی ایک فرد بھی تو ایسا نہیں تھا جس نے للچائی ہوئی نظر رکشے میں بیٹھی لڑکیوں پر نہ ڈالی ہو۔ جھبرے کو ذلیل و مطعون کرنے اور بُرا کہنے کے سلسلے میں اپنی آواز دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واضح اور صاف کر کے بلند نہ کی ہو۔ شاید لڑکیاں کچھ متاثر ہو جائیں۔ دونوں ٹینی پیلے اور کھیرا ٹامی وہ تینوں تو شریفوں اور نیکوں کے ہیرو تھے۔ سب کے سب زاہد و پارسا۔ فرشتہ صفت! اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا، ہم ہندوستانی ہیں شریف ہندوستانی جن کی روحانی طاقتیں دُنیا بھر سے خراج حاصل کرتی ہیں۔ ہمارا مُلک دُنیا کے لئے روحانیت کا ایک مرکز ہے ہم جو مادہ پرستی کی لعنت سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ہمارے بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کا کون ہے جو مقابلہ کر سکے۔ اس کی بھری ہوئی آنکھیں جھک پڑیں ساتھ ہی اسے اپنی صنف کی بے بسی اور مجبوری اور صنفِ لطیف کی برتری و پاکبازی کا بھی احساس ہوا اس نے سوچا یہ تو بہرحال شریف زادیاں ہیں۔ اگر کوئی بدچلن و آوارہ عورت حتیٰ کہ ایک طوائف بھی سڑک پر کھڑے کسی شریف سے شریف مرد پر الزام لگا دے

تو آنِ واحد میں اس سے بھی زیادہ خوفناک حادثہ پیش آسکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر رضا کاروں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ دل میں پھر کسی نے چٹکی لی ـــ اور تم؟ یہ آدھے دو جن کتے! اور ہر وہ نگاہ جو ذرا سا موقع ملتے ادھر اٹھا؟ پاتے ہی کتا بن جانے کے لئے بے چین و بے قرار نظر آتی ہے؟ ایسے کتے جن کے لئے وقت اور موسم کی بھی کوئی قید نہیں۔ اس کا دماغ تھک گیا اور وہ اس ختم نہ ہونے والی الجھنوں سے جھنجھلا اٹھا۔

تو ڈین ٹین کو پھر بڑھتا دیکھ کر اس نے کچھ اونچی آواز میں کہا۔ یہ پرچے کو پڑھ لیا جائے سب کچھ معلوم ہو جائے گا جھگڑے سے کیا فائدہ؟ اور پھر اس کا اپنا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا ـــ کہیں اس کی شہناز نے تو نہیں؟

یہ پرچہ جھبرے سے زبردستی چھین لیا گیا ـــــ مگر؟ کاغذ بالکل سادہ تھا۔ ایک حرف بھی تو نہیں لکھا تھا اس پر!

معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کچھ لوگ معنی خیز نظروں سے اشارہ کرتے اور مسکراتے ہوئے چل دئے، کچھ اب بھی جھبرے پر تبرا توڑ رہے تھے۔ دو دو لپکے کچھ لوگوں کے ساتھ کہتے جا رہے تھے "یہ وہ کاغذ ہی نہیں پرچہ بدل لیا سالے نے" ایک نوجوان کی آواز آئی۔ "مگر دوست وہ اکیلا ہی تم سب پر بھاری پڑا ہے" کالو اور جھبرا بھی کسی طرف کو نکل گئے۔

ٹامی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دور و نزدیک رکشے کا کہیں پتہ نہیں تھا ●●

قطعات

سوہن راہی ادارۂ ادب لندن

جسے کو سمجھا تھا پیار کے ساتھی
دل کا آزار بن کے ملتے ہیں
ان بہاروں کا رنگ کیا کہیے
پھول بھی خار بن کے ملتے ہیں

گردشِ دوراں میں اُلجھی جان ہے
طائرِ دل بے سروسامان ہے
زندہ رہنا بھی جو ہے مشکل یہاں
جان دینا بھی کہاں آسان ہے

بحرِ غمِ حیات کا ساحل نہ مل سکا
جاں نہ سنبھل سکی مرا دل نہ سنبھل سکا
کتنے ڈھلے ہیں چاند اور تارے نگاہ سے
اک تیرے انتظار کا موسم نہ ڈھل سکا

کوئی جینے کے لئے اپنا بنا لے نہ تجھے
جاگتے رہنا کوئی خواب چرا لے نہ تجھے
تم حسیں چاند کا ٹکڑا ہو یا سورج کی نظر
کوئی بادل کا جزیرہ ہی اُڑا لے نہ تجھے

زخم کھا کر بھی مجھے جینا تو ہے
مسکرا کر زہرِ غم پینا تو ہے
چاک دامانی کا قصہ چھوڑیئے
دیکھئے قائم مرا سینا تو ہے

حُسنِ تصویرِ گلستاں کو تو رسوا نہ کرو
رنگ اور تڑپ کے اوراق پہ شعلے نہ دھرو
پھر نہ فصلِ بہاراں کو خزاں چارہ کرو
اپنے کردار کے آئین کے ٹکڑے نہ کرو

ثلاثیات

محسن ہاشمی بلاروی

ہر مسرت حسین دھوکا ہے
آہ اندوہ اشک غم نالے
زندگی حادثوں کی دُنیا ہے

سرفروشانہ خواب پلتے ہیں
ذہنِ مفلس میں کیا خبر تم کو
کس قدر انقلاب پلتے ہیں

موسلا دھار غم کی بارش ہے
یہ کرم غیر کا نہیں مجھ پر
میرے احباب کی نوازش ہے

یوں شبِ غم کو جگمگاتا ہوں
یاد کے نقرئی چراغوں میں
حسرتوں کا لہو جلاتا ہوں

میں نے دونوں کو خوب پرکھا ہے
اعتبارِ خوشی نہیں لیکن
تیرے غم پر بڑا بھروسہ ہے

کارِ ذلت ہے ننگِ عزت ہے
کیا کیا جائے چاپلوسی بھی
وقت کی اک اہم ضرورت ہے

یاد کر کر کے میری حق گوئی
جب میں دُنیا سے چل دیا محسن
زندگی پھوٹ پھوٹ کر روئی

گلہائے رنگ رنگ

مہربان بندہ جناب سرور صاحب۔ تسلیم۔
ماہِ اگست کے شمارہ شانِ ہند میں جناب ڈاکٹر گوپال کرشن شفق کی غزل صفحہ ۳۰ پر چھپی ہے اسی زمین میں اب سے قریب ۲۵ سال قبل کہی ہوئی میری ایک غزل ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ غزل کسی رسالے میں شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ البتہ دو تین مشاعروں میں پڑھی جا چکی ہے۔ خدانخواستہ سرقہ کا سوال نہیں ہے ہم طرح غزلوں میں سرِ مشاعرہ بھی توارد ہو جاتا ہے چوں کہ جناب شفق کی اور میری غزل میں کئی شعر ملتے جلتے ہیں اس لئے میں اپنی غزل آپ کو بھیج رہا ہوں۔

کرشن لال ادیب

بشر کا جسم اک چھوٹا جہاں ہے
جو دنیا میں ہے وہ اس میں نہاں ہے
جو دل میں ہے وہ چہرے سے عیاں ہے
خموشی ہی مرے دل کی زباں ہے
قفس میں میں ہوں دل میں آشیاں ہے
چمن میں بھی نہیں ہے جو یہاں ہے
یہاں تنکے وہاں دو چار تنکے
چمن میں آشیاں ہی آشیاں ہے
نشانِ رفتگاں ہیں کیسے کیسے
وطن کی خاک میں کیا کیا نہاں ہے
چلو ٹوٹی ہوئی قبروں سے پوچھیں
وطن کی عظمتِ رفتہ کہاں ہے
قدم راہِ محبت میں نہ رکھئے
جسے اندیشۂ سود و زیاں ہے
معاذ اللہ عدو کی ناخدائی
بھنور میں کشتیٔ عمرِ رواں ہے
سکونِ دل کے مٹنے کا ہے کیا خوف
سکونِ دل میسّر ہی کہاں ہے
پسِ مُردن بھی جن کا نام رہ جائے
حیات اُن کی حیاتِ جاوداں ہے
زبانیں یوں تو دنیا میں بہت ہیں
مگر پیاری مجھے اردو زباں ہے
ممالک ہیں بہت دُنیا میں لیکن
مرا ہندوستاں ہندوستاں ہے
ادیبؔ ان کو لکھوں رُوداد اپنی
تو کہتے ہیں کہ میری داستاں ہے

گوہر عثمانی۔ مُرادآبادی

آپ تو اب آئے ہیں ان مرحلوں کے درمیاں
ہم نے صدیاں کاٹ دی ہیں زلزلوں کے درمیاں
فکرِ دُنیا، فکرِ عقبیٰ، فکرِ ہستی، فکرِ موت
ایک انساں اور اتنے مسئلوں کے درمیاں
دائرے تک ہی ذرا پرواز کو محدود رکھو
موت بھی ملتی ہے اکثر بادلوں کے درمیاں
آپ سنجیدہ مزاجی سے ذرا سوچیں اگر
ایک قربت آج بھی ہے فاصلوں کے درمیاں
کس طرح سمجھے کوئی آنکھوں سے دل کی گفتگو
قربتیں جب تک نہ ہوں کچھ فاصلوں کے درمیاں
روز گوہرؔ اپنی تاریخِ جنوں پڑھتے رہو
سرد مہری آ نہ جائے حوصلوں کے درمیاں

نثار چنگیزی ۔ ہیرا چندن پور

الزام محبت کا لگا کیوں نہیں دیتے
مجرم ہوں میں مجرم کو سزا کیوں نہیں دیتے

تم ایک جھلک اپنی دکھا کیوں نہیں دیتے
جذبات میں ہلچل سی مچا کیوں نہیں دیتے

ہمدرد آپ تو دیتے ہیں دوا کیوں نہیں دیتے
کچھ راز ہے اس میں تو بتا کیوں نہیں دیتے

بیداد سے شے کوئی بھی حاصل نہیں ہوتی
دنیا کو بھی یہ درس پڑھا کیوں نہیں دیتے

خوابوں کے جزیرے میں ہیں سوئے ہوئے ارماں
اب خواب کے ماروں کو جگا کیوں نہیں دیتے

گر آپ کی عظمت کا بھرم اس میں ہے مضمر
محفل سے ہمیں آپ اٹھا کیوں نہیں دیتے

بنتا ہے اگر جنبشِ ابرو سے مقدر
دنیا پہ نظر اپنی اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہر بات نثار آپ بھی کہتے ہیں ادھوری
جو بات ہو وہ صاف بتا کیوں نہیں دیتے

ڈاکٹر ستیہ پرکاش شرما شگفتہ

کس کی آواز آ رہی ہے ابھی
مجھ میں شاید کوئی کمی ہے ابھی

ہو در وقت ہو چکا رخصت
دل کی دلی میں کھلبلی ہے ابھی

انقلابات کیا نہیں آئے
آدمی پھر بھی آدمی ہے ابھی

فائدہ کچھ نہیں چراغوں سے
شمع دل کی بجھی بجھی ہے ابھی

کتنے جنموں سے ایک پرچھائیں
آہ جو دہی کو ڈھونڈتی ہے ابھی

آندھیاں غم کی تھم گئیں لیکن
شکلِ انساں اُڑی اُڑی ہے ابھی

لاکھ صیقل کیا، مگر پھر بھی
تشنگی ہے کہ کھُردری ہے ابھی

نہ وہ عیسیٰ نہ وہ صلیب مگر
زیست میدانِ کربلا ہے ابھی

آپ اپنے کو جیتنے والا
کون ایسا مہارتھی ہے ابھی

جسمِ شگفتہ میں سر بہ سر زندہ
عہدِ ماضی کا بھیرتری ہے ابھی

[illegible]

ڈاکٹر شمیم قدوائی

مجھ کو تسلیم کہ حالات بدل سکتے ہیں
حادثے کب مری تقدیر کے ٹل سکتے ہیں

ذہنِ انساں تو اگر چاہے بدل سکتے ہیں
امن کی راہ پہ یہ امن سے چل سکتے ہیں

ہم کو لازم ہے کہ باہوش ہمہ وقت رہیں
آج حالات جو ہیں کل یہ بدل سکتے ہیں

چھیڑ کے دیکھئے مضرابِ محبت سے اسے
سازِ دل سے مرے نغمات نکل سکتے ہیں

عالمِ نزع سہی آپ اگر آ جائیں
ہے یقیں موت کے لمحات بھی ٹل سکتے ہیں

کر کے پیمانِ وفا ہم تو ہیں پابندِ وفا
آپ آزاد ہیں، ہر لمحہ بدل سکتے ہیں

کتنے دیرینہ ہیں دستورِ محبت کے شمیم
یہ نہ بدلے ہیں کبھی اور نہ بدل سکتے ہیں

اخلاق سہسوانی

یہ انتہائے جنونِ دل ونظر تو نہیں؟
یہ دردِ عشق ہے مرہونِ چارہ گر تو نہیں
نہ کارواں کی خبر ہے نہ منزلوں کی تلاش
فسانہ سن کے مرا آپ کیوں برا مانے!
کلی تو نام نہ لے بھول کر بھی ہنسنے کا
ہر ایک گل کے تبسم میں زخم پنہاں ہیں
اب اُن کی یاد بھی دل پر گراں گزرتی ہے
زمانہ میری تباہی پہ خندہ زن ہے تو ہو

ہم اُن کو دیکھتے ہیں گو وہ جلوہ گر تو نہیں!
جو یوں بھی ہو تو پھر اس سے کوئی مفر تو نہیں
یہ راہبر ہیں ہمارے، یہ راہبر تو نہیں!
میرے مٹانے کا الزام آپ پر تو نہیں؟
مآلِ خندۂ گل پر ابھی نظر تو نہیں؟
مرے چمن میں مگر کوئی دیدہ ور تو نہیں!
فزوں تھی وحشتِ دل، لیکن اس قدر تو نہیں!
کسی کو عشق کے انجام کی خبر تو نہیں؟

یہ اور بات ہے خود ہی خبر نہ لے اخلاق
ہمارے حال سے وہ اتنا بے خبر تو نہیں

ڈاکٹر [illegible]

تلاش کرتا ہوں یوں دل میں سرخوشی کا سراغ
سمٹ کے مستیاں بیٹھی ہیں چشمِ ساقی میں
قریب آیا مرے وہ تو یوں ہوا محسوس
وہ میرا دوست تھا لیکن بڑا اداس ہوا
یہ وہ سفر ہے جہاں آندھیاں بگولے ہیں
وہ کون تھا جو پرایا تھا پھر بھی اپنا تھا
کسی کی یادِ نہاں یوں ہے خانۂ دل میں

کہ جیسے شہرِ خموشاں میں زندگی کا سراغ
نہ ڈھونڈ بادہ وساغر میں بے خودی کا سراغ
کہ ڈھونڈتا ہے وہ مجھ میں کسی کمی کا سراغ
ملا نہ دل میں مرے جب شکستگی کا سراغ
رہِ وفا میں بچا ہی نہیں کسی کا سراغ
ہے دل کے پاس ابھی تک اُس اجنبی کا سراغ
اندھیرے گھر میں ملے جیسے روشنی کا سراغ

ہراساں شہر سے گزرا ہوں آج میں بھی رشی
بہت تھی بھیڑ مگر تھا نہ آدمی کا سراغ

ڈاکٹر منظر بنگلور

ہم آرزوئے یار میں کیا کیا نہ کر گئے
ہستی سے چل بسے دل وجاں سے گزر گئے

اس غم کدہ میں کس کو میسر ہوئی خوشی
باچشمِ تر ہم آئے تھے، باچشمِ تر گئے

دل ہے کہیں، خیال کہیں، ہے نظر کہیں
اجزائے زندگی مرے سارے بکھر گئے

الفت میں امتیازِ نشیب وفراز کیا
ہر غم کو ہم خوشی ہی سمجھ کر گزر گئے

رہزن کا ڈر نہ حاجتِ رہبر ہی کچھ رہی
ہم نقشِ پائے یار پہ رکھ کر نظر گئے

پابندیٔ حیات میں منظر جئیں تو کیا
دو دن کی زندگی میں جو سو بار مر گئے

نکہت شاہجہاں پوری

دل میں اک درد اُٹھا ہو جیسے
اُس نے پھر یاد کیا ہو جیسے

اُس سے بچھڑے تو ہوا یوں محسوس
دل میں کچھ ٹوٹ گیا ہو جیسے

جتنے الزام ہیں میرے سر ہیں
اُس کی کوئی نہ خطا ہو جیسے

شام ہے درد ہے تنہائی ہے
اپنا سایہ بھی جدا ہو جیسے

ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے
زندگی ایک سزا ہو جیسے

گلؔ علیقی جے پوری

ہم دل کو تری یاد سے بہلائیں گے کب تک
تصویرِ غم و یاس نظر آئیں گے کب تک
کب تک تری گلیوں میں اٹھیں گے یونہی فتنے
الزامِ وفا یوں مرے سر آئیں گے کب تک
دم توڑتی موجوں کی طرح ہم لبِ ساحل
طوفانِ غم و یاس سے ٹکرائیں گے کب تک
پیغام سنا کر انہیں یہ پوچھنا قاصد...
مہمان وہ بن کر مرے گھر آئیں گے کب تک
اے جانِ وفا عالمِ وحشت میں نصیبِ غم
زلفِ غم و آلام کو سلجھائیں گے کب تک
وہ چل دئے ہوں گے وہ ابھی آتے ہی ہوں گے
یوں ہی دلِ بے تاب کو سمجھائیں گے کب تک
بن کر کبھی فرہاد کبھی قیس کبھی گلؔ
رودادِ غمِ عشق کو دوہرائیں گے کب تک

اُمِّ ہانی لکھنؤ

آج کا دستور بالکل عام ہے
نیک خو کو بد ہی کہنا کام ہے
جو صداقت پر چلا مارا گیا
آج ابن الوقت کا ہی نام ہے
کوئی دامانِ وفا کیسے بچائے
کس قدر پُرخار راہِ عام ہے
ہوش میں! بیگانۂ ہوش و خرد
تاک میں پھر گردشِ ایام ہے
راہ کی ہمواریوں سے منہ نہ پھیر
حادثہ بیٹھا ہوا ہر گام ہے
زندگی آماجگاہِ رنج و غم
موت بس آرام ہی آرام ہے
دیکھ دامن تر نہ ہو ہانیؔ کہیں
زندگی چھلکا ہوا اک جام ہے

انجم لاشاری - احمد پور شرقیہ (پاکستان)

مرا جنم تو مجھے بے نشان چھوڑ گیا
سہاگ رات بھی آئی تو "خان" چھوڑ گیا
وہ ایک جھونکا ہوا کا کچھ اس طرح آیا
کہ ہر دریچہ پہ نئی داستان چھوڑ گیا
نہ جانے کیسا مسافر تھا راستے میں بھلا
تو میرے ذہن پہ اپنی تھکان چھوڑ گیا
وہ مجھ کو ڈھونڈنے نکلا تھا ہر گلی گھوما
مری گلی میں پتہ میرا مکان چھوڑ گیا
اب اس کی قدر فقط ایک سنگ پارہ ہے
وہ اک ستارہ جو کل آسمان چھوڑ گیا
وہ مہربانِ سمندر جو لہر میں آیا
تو ساحلوں پہ بھیگے بادبان چھوڑ گیا
ہمارے شہر پہ بادل کچھ اس قدر برسا
کہ چھت کے نام سے بس آسمان چھوڑ گیا
وہ ایک شخص کہ جس کی صدائیں چھینی گئیں
ہر ایک ہاتھ پہ اپنی زبان چھوڑ گیا

نفیس احمد سراج ڈبائی

کل رات بزمِ یار میں ہر دل اُداس تھا
تسکین دور دور تھی غم پاس پاس تھا
میں تو اُداس ہی تھا ترے شہر میں مگر
میرا رقیب مجھ سے بھی زیادہ اُداس تھا
جس کی تمام عمر کٹی دشمنوں کے ساتھ
وہ دوستوں کا مارا ہوا بدحواس تھا
لوٹے تھے جس نے قافلے چھپ چھپ کے روز و شب
ہر شخص کی نگاہ میں دیوتا کا داس تھا
جس کو امیرِ شہر نے پہنا تھا مدتوں
میرے بدن سے اُترا ہوا وہ لباس تھا
تو کتنا مہربان رہا مجھ پہ اے سراجؔ
دشمن تھا لاکھ پھر بھی مرے آس پاس تھا

محشر افغانی بالنس واڑہ

ہم اپنی اپنی وفاؤں کا امتحاں کریں
تم آہ سرد بھرو اور ہم فغاں کریں
زیاں کو سُود کریں سُود کو زیاں کریں
بہار ہے تو چلو سیرِ گلستاں کریں
بدل کے آؤ لباسِ حسد، جسد داو
ہر ایک دل میں محبت کو جاوداں کریں
اگر قبول نہیں ہے جو اختلافِ عمل
تو سجدہ دیر و حرم ہی کے درمیاں کریں
ہمارے قدموں پہ خود سر جھکائے گی منزل
ہم اپنے عزم کو محشرؔ جو پھر جواں کریں

اندرجیت آرزوؔ۔ گلاسگو (سکاٹ لینڈ)

جو پہلے سُرخ رُو اے زندگی ظالم نہ تو ہوگی
نہ ارماں سُرخ رُو ہوگا نہ حسرت سُرخ رُو ہوگی
کبھی رو رو کے ہنستا ہے کبھی ہنس ہنس کے روتا ہے
کسی دن تیرے دیوانے کی شہرت سُو بہ سُو ہوگی
مسلسل جستجو پر اب نشانِ منزل کا عنقا ہے
وہ دن بھی آئے گا منزل کو میری جستجو ہوگی
اجازت ہو تو افسانہ سُنادیں ہم دو اشکوں میں
خموشی کی خموشی گفتگو کی گفتگو ہوگی
جنابِ شیخ مے خانے کو کیوں حسرت سے تکتے ہیں
کسی دن غرقِ جامِ مے حرم کی آبرو ہوگی
ضرور اُس گل بدن اُس لالہ رُخ کا ذکر آئے گا
گلستاں میں کبھی جب گفتگوئے رنگ و بُو ہوگی
یہ مانا تم کو پانا تو ہے جُوئے شیر کا لانا
مگر پھر بھی تمہاری جستجو ہے، جستجو ہوگی
ابھی تو چاک کرنا ہے گریباں ہو کہ دامن ہو
جیسے فکرِ رفو ہوگی اُسے فکرِ رفو ہوگی
ترے قدموں میں نکلے جاں ترے در پہ دم توڑوں
یہی اک آرزو تھی۔ آرزو ہے۔ آرزو ہوگی

یاسر چغتائی۔ احمد پور شرقیہ پاکستان

اندھیری شب میں اُجالا نظر سے گزرا ہے
وہ ایک چاند سا چہرہ اِدھر سے گزرا ہے
مرے دماغ پہ چھایا ہُوا عذاب کا دور
یہ کیسے آج اچانک سفر سے گزرا ہے
مرے نگر، مری بستی میں اور گھر بھی تھے
دُکھوں کا قافلہ میرے ہی گھر سے گزرا ہے
جھلس گئے ہیں شگوفوں کے نرم و نازک جسم
تپی ہواؤں کا جھونکا اِدھر سے گزرا ہے
مجھے وہ چھوڑ گیا ہے تو دُکھ نہیں یاسرؔ
یہ حادثہ تو کئی بار سر سے گزرا ہے

زیدہ۔ اے۔ ہلالؔ ایڈوکیٹ سنادد

تمہید لکھو، دوستو، تاریخِ ستم کی
اب زندگی محتاج ہے ظالم کے کرم کی
انسان دوست نام ستمگر نے رکھ لیا
بے ساختہ یاد آگئی چنگیزی ستم کی
آئینۂ احساس پہ اُبھری ہیں تصاویر
کچھ آپ کے غم کی ہیں تو کچھ اپنے اَلم کی
پیوست ہے اب تک دلِ بسمل میں مرے دوست
خنجر نہیں تحریر ہے اک نوکِ قلم کی
مانندِ نباتات کھڑا ہے یہ زمانہ
رُوداد سُنے کون ہلالؔ آپ کے غم کی

عرفان پربھنی

زندگی نور بھی، خوشبو بھی ہے، نغمہ بھی ہے
زندگی دھوپ بھی، تپتا ہوا صحرا بھی ہے
باتیں ہمدردی کی کرتے ہیں یہاں سب لیکن
بانٹ لے دُکھ جو کسی کا کوئی ایسا بھی ہے؟
یوں تو شیشے کئی ٹوٹے ہوں دیکھے ہوں گے
دل کسی کا کبھی ٹوٹا ہوا دیکھا بھی ہے؟
اس کو نزدیک سے دیکھا ہے سبھی نے لیکن
زندگی کیا ہے؟ کسی نے اسے سمجھا بھی ہے؟
چاند کی مٹی پرکھنے کو چلے ہو عرفانؔ ؛ اپنی مٹی کو کبھی آپ نے پرکھا بھی ہے؟

من کہ مکتوب الیہ

محترم سرور صاحب — تسلیمات

"شان ہند" جولائی ۸۳ء بذریعہ رجسٹری ملا تھا۔ بطور رسید ایک پوسٹ کارڈ لکھ چکا ہوں۔ اس وقت میری صحت ٹھیک نہیں تھی اس لئے میں نے صرف یہ لکھا تھا کہ آپ کے اڈیٹوریل سے جزوی اختلاف تو ہے مگر کلیتاً میں آپ کے جذبات و خیالات کا احترام کرتا ہوں۔ اسی لئے میں نے مولانا "فروغ اردو" سے درخواست کی ہے کہ وہ آپکا اڈیٹوریل "فروغ اردو" میں شائع فرمائیں۔

جزوی اختلاف کے سلسلے میں عرض ہے کہ اب تک مسلمان اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں کہ اردو ان کے باپ دادا کی جاگیر ہے۔ اس طرح کی باتیں وہ سوچ بھی نہیں سکتے اس لئے کہ اردو میں بیشتر مذاہب کی بنیادی کتابیں موجود ہیں۔ نیز ہندوستان میں اسلام کے خلاف جتنی بنیادی تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ حصہ اردو کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندی زبان میں بھی اسلام کے خلاف اتنی کتابیں نہیں ہوں گی جتنی اردو میں ہیں لیکن ہمارے ہندو دانشور اپنے اعمال سے اور حکومتیں جن میں اکثریت ہندوؤں کی ہوتی ہے اپنی سیاسی چالوں اور احکامات سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ اردو "مشترکہ میراث" نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے ورنہ کوئی یہ بتائے کہ اردو اکادمیوں کا چیرمین یا صدر نامزد کرنے میں ان حکومتوں کو صرف مسلم ووٹ کا خیال کیوں آتا ہے؟ اردو کے ہندو دانشوروں سے ہندو اکثریت والی حکومتیں خوفزدہ کیوں نہیں ہوتیں؟ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد۔ ڈاکٹر حکم چند نیّر اور ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ان کے ذہن میں کیوں نہیں آتے؟

میں اپنی روایتی صاف گوئی کے لئے معافی چاہوں گا کہ یہ نام نہاد اردو کے ہندو ادیب اور دانشور اردو کیمپ میں ففتھ کالمسٹ کی حیثیت سے آئے اور جس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھا کر ہندی کیمپ میں واپس چلے جاتے ہیں اس لئے حکومتیں چاہے کسی پارٹی کی ہوں ہندو دانشوروں اور ادیبوں سے نہیں ڈرتیں صرف مسلمانوں سے ڈرتی ہیں اپنی کرسی بچانے کے لئے ان کی خوشامد کرتی ہیں اور بے وقوف بناتی ہیں۔ میری یہ بات بُری لگی ہوگی مگر میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ "پرتاپ" "ملاپ" "تیج" اور "ہند سماچار" وغیرہ جن کی اشاعتیں بقول آپ کے بہت زیادہ ہیں کے حلقہ اشاعت میں تازہ مردم شماری کے مطابق اردو کی کیا پوزیشن ہے؟ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ سابق مشرقی پنجاب (موجودہ پنجاب ہریانہ اور ہماچل کا کچھ حصہ) کے ہندو بولتے پنجابی پڑھتے اور لکھتے اردو میں ہیں مگر مردم شماری میں اپنی مادری زبان ہندی لکھواتے ہیں۔ یہی رویّہ سارے ہندوستان میں اردو کے ہندو دانشوروں کا ہے۔ پھر یہ حکومتیں ان کا لحاظ کیوں کریں؟ وہ جانتی ہیں کہ جہاں تک زبان کا سوال ہے یہ تو اپنے ہیں ہی۔ اس لئے سیاسی پارٹیاں بنیوں کی طرح پاسنگ کا فائدہ اٹھانے کے لئے اردو اکاڈمی۔ ترقی اردو بورڈ۔ انجمن ترقی اردو۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی جیسے جھنجھنے بجا کر مسلمانوں کو رجھایا

کرتی ہیں۔

اصل جھگڑا بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا ہے اس میں کچھ ڈی مورلائزڈ مسلمان اور اپنے کو مشترکہ "میراث" کا وارث سمجھنے والے ہندو دست بہ گریباں ہیں ورنہ سچ پوچھئے تو کوئی بھی اُردو کے دوست نہیں۔

یو پی کی عدالتوں میں ہندی سنہ ۱۹۰۱ء میں نافذ ہوئی تھی اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اس کی مخالفت کی تھی بلکہ ہندو پیش پیش تھے۔ ۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء تک ہندی مخالفین کی وہ نسل ہندوؤں میں موجود تھی۔ شاید اس کے آخری فرد رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری تھے۔ میں پھر معذرت چاہوں گا کہ آج کے غیر مسلم ادیب یا شاعر اُردو صرف اس لئے اپنائے ہوئے ہیں کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں ورنہ ان میں سے بعض کھلے ہوئے اُردو دشمن ہیں۔ اس وقت میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ جناب کمار پاشی اُردو کے مشہور دانشور ادیب شاعر اور نہ جانے کیا کیا ہیں انہوں نے سنہ ۱۹۷۳ء میں "ٹائمز ویکلی" میں لکھا تھا۔

"میں اپنے خیالات کا اظہار اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں نہیں کر پاتا اس طرح میں مجبور ہوں ایسی زبان لکھنے کے لئے جس کے لئے میرے دل میں کوئی محبت نہیں ہے اور جس کا ادبی سرمایہ معمولی ہے اردو کا فارسی زبان اور تہذیب سے قریب کا تعلق ہے اور اس وجہ سے اُردو الفاظ ہندوستانیت کی ترجمانی صحیح طور پر نہیں کر پاتے۔ سنسکرت ہندوستانی تہذیب کا اصل سرچشمہ ہے اور اس لئے ہر ہندوستانی مصنف کو سنسکرت سے تحریک حاصل کرنا چاہئے۔"

میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا تفصیل میں جانا ہو تو ڈاکٹر ذکی کاکوروی کی مرتب کردہ "یو پی اُردو اکادمی کا انعام نامہ" دیکھیئے جو مئی سنہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں یہ صرف یہ عرض کروں گا کہ ان ہندو دانشور کو یو پی اُردو اکاڈمی نے ان کی کتاب "ولاس یاترا" پر ایک ہزار روپے کا انعام اسی سن ۱۹۷۴ء میں دیا تھا۔ اس وقت جناب آنند نرائن ملا یو۔ پی اُردو اکادمی کے چیرمین تھے۔

"ولاس یاترا" میں کیا تھا یہ نہ پوچھئے۔ ماں سے زنا تک کی بات تھی۔ ڈاکٹر ذکی کاکوروی لکھتے ہیں۔

"ولاس یاترا" میں زندگی کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی شعوری پامالی کے سوا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ پوری کتاب فحشیات اور خرافات کا بدترین نمونہ ہے جس کو اصولاً ضبط ہوجانا چاہئے تھا مگر ہماری اُردو اکاڈمی نے اسے انعام سے نوازا ہے۔" (انعام نامہ از ذکی کاکوروی ص ۶۵)

بات ملا صاحب کی آئی ہے تو یہ بھی واضح کردوں کہ انہیں ملا صاحب نے "نوراللغات" کو اکبر علی خاں صاحب سابق گورنر اتر پردیش کی سفارش کے باوجود چھپوانے میں امداد نہیں دی تھی نہ ہی اُردو اکادمی کی طرف سے شائع کرنے کے لئے تیار ہوئے تھے۔ انہیں ملا صاحب نے فخر الدین علی احمد مرحوم کے اس الزام کی تردید برسرِ ممبر کی تھی کہ یو پی اسمبلی میں اُردو میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں ہے حالاں کہ ڈاکٹر فریدی مرحوم اسی بنیاد پر اسمبلی سے باہر آگئے تھے کہ جب تک مجھے اُردو میں تقریر کی اجازت نہ ہوگی میں اسمبلی میں نہیں جاؤں گا اور پھر گئے بھی نہیں۔ یہ کارنامے ہیں اُردو کے خادم ہندو دانشوروں کے جو بطورِ نمونہ پیش کئے گئے ہیں میرے پاس ایسے ہندو دانشوروں اور ادیبوں کی ایک طویل فہرست مع ان کے کارناموں کے محفوظ ہے جن میں اونچی کرسیوں والے "پردہ نشینوں" کے نام بھی آتے ہیں۔ فی الحال میں اپنی معروضات یہیں ختم کرتا

ہوں۔ یقین ہے آپ میری ان معروضات کو اپنے موقر جریدے میں شایع فرمائیں گے اور آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں ایک موثر رول ادا کریں گے۔

نیازمند

ابو محمد شبلی، معرفت دانش محل

امین الدولہ پارک لکھنؤ ۱۸، ۲۲-۱۰-۸۶

برادرم سرور صاحب

تسلیم

کافی روز ہوئے اگست ۸۳ء کا شمارہ نظر نواز ہوا تھا۔ اس میں آپ نے اپنے ایڈیٹوریل کے صفحے پر "نصیر خاں صاحب کی نصف سچائی"، کے عنوان کے تحت ۳ر جولائی ۸۳ء کے قومی آواز کے دہلی ایڈیشن میں نصیر خاں صاحب کے مقالے کا حوالہ دیا ہے جس میں خان صاحب نے شکایت کی ہے کہ "آزادی سے لے کر اب تک فراق گورکھپوری کے علاوہ کسی فرد یا جماعت نے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا"۔

اس سلسلہ میں ایک نصف سچائی کا اظہار میں بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ فراق صاحب نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی ہے اور اردو کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ لیکن ایک زمانے میں انہوں نے "ترقی پسند" ادیبوں (اردو کے) چلائی ہوئی تحریک سے متاثر ہو کر اردو کا رسم الخط بدل ڈالنے کی حمایت یا حماقت بھی کی تھی۔ اس حماقت کی وکالت میں اردو کے سارے "مسلمان" "ترقی پسند" ادیب پیش پیش تھے۔ غالباً فراق صاحب کے علاوہ اردو کے کسی دوسرے ہندو ادیب نے اس تحریک کی حمایت نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں "ترقی پسندوں" کی چلائی ہوئی اس تحریک کے لئے اوپر سے اشارا ہوا تھا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ایک ذیلی ادارہ ہے) یہ اشارا غالباً اس لئے تھا کہ اس انجمن میں اکثریت اردو کے ادیبوں کی ہے۔ باقی زبانوں کے ادیب اسے گھانس ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہندی کے قومی زبان بن جانے کے بعد "اوپر والوں" نے یہ ضروری سمجھا ہوگا کہ "ترقی پسندوں" کو ہندی کے ادیبوں میں نفوذ حاصل کرنا چاہئے اور اس کے لئے صرف ایک ہی حربہ تھا کہ ہندی کے ادیبوں کی دکھتی رگ کو پکڑا جائے۔ چنانچہ "ترقی پسندوں" نے اردو کے رسم الخط کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی اور اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے کی وکالت شروع کر دی لیکن جب اردو پڑھنے والوں نے اس تحریک کے خلاف زبردست غم و غصے کا اظہار کیا تو یہ لوگ پچھلی ٹانگوں میں دم دبا کر بیٹھ گئے۔

لیکن جہاں اردو کے "مسلمان" ادیبوں نے اپنی روایتی کوتاہ اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی یہ تحریک اردو میں چلائی وہاں فراق صاحب نے اپنی "ہندو وانہ" شاطری کا ثبوت دیتے ہوئے اس تحریک کو انگریزی میں ہوا دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے دوسری چالاکی یہ کی کہ پہلے تو اردو کی حمایت اور وکالت میں دھواں دھار مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس میں اردو کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں کی تفصیل بیان کی۔ اردو زبان کی شیریں بیانی اور عوام پسندی کے گن گائے، نتیجے میں واہ واہ کے ڈونگرے سمیٹے اور اس سلسلہ کے آخری مضمون کی آخری سطروں میں اردو کے رسم الخط کو ناگری یعنی ہندی رسم الخط میں تبدیل کر دینے کی وکالت کی۔ یہ سلسلہ مضامین انڈین ایکسپریس میں چھٹی دہائی کے آخری سالوں میں یا ساتویں دہائی کے ابتدائی سالوں میں شائع ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عام اردو داں پبلک کو یہ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ فراق صاحب نے کبھی اردو رسم الخط کی مخالفت بھی کی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ نصیر خاں صاحب فراق صاحب کے فنا فی الاردو ہونے کے گن گا رہے ہیں۔

فراق صاحب کے ذہنی خلل اور دماغی طور پر

(باقی صلا پر)



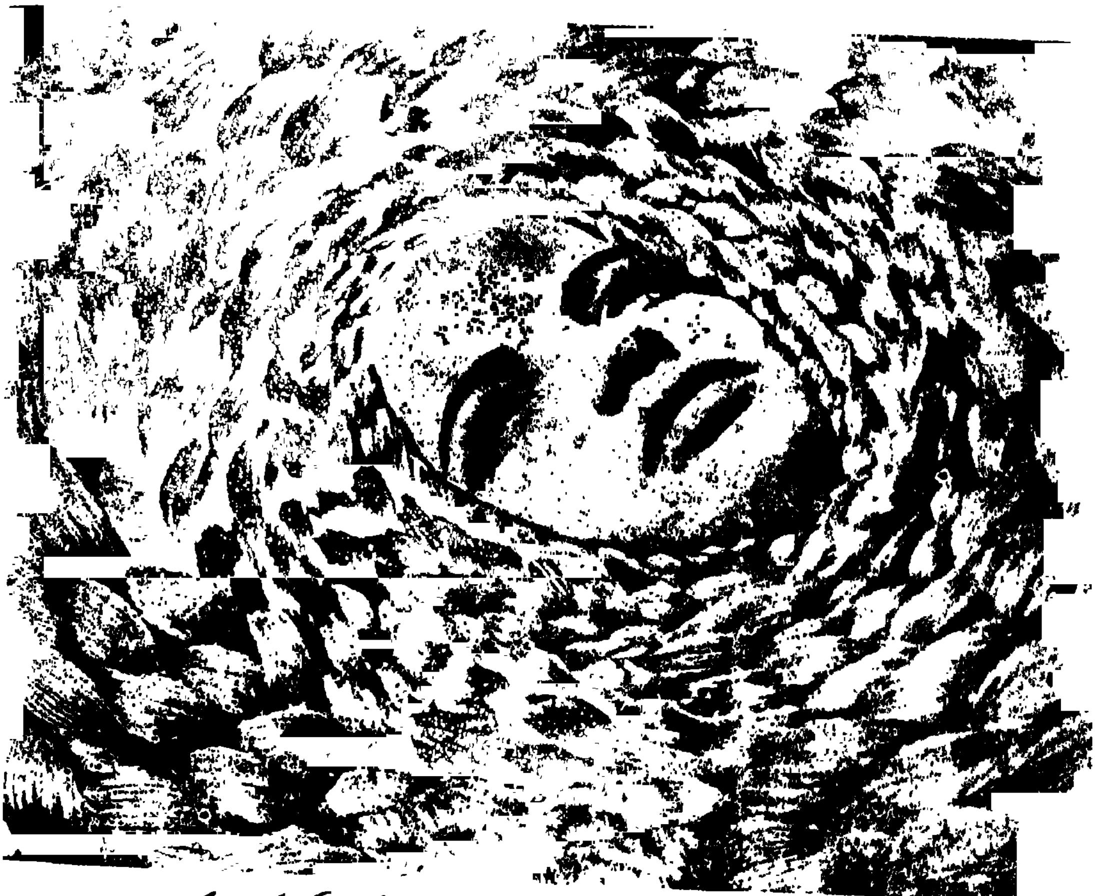
OCTOBER 1983

Phone : 275602

Rego No D-L N)370

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57










ذرا ٹھہریئے!

سچے واقعات پر مبنی افسانوی مجموعے "مان سروور" کے مصنف

ڈاکٹر اودے سرن ارمان کی انگلینڈ کے ادبی دورے کے بعد واپسی

انگلینڈ کے ادبی اداروں کی طرف سے جنہیں کچھ ادبی اداروں کی طرف سے انگلینڈ کے ادبی
جناب ڈاکٹر اودے سرن ارمان مصنف "مان سروور"، جنہیں کچھ ادبی اداروں کی طرف سے انگلینڈ کے ادبی
دورے پر مدعو کیا گیا تھا۔ اپنے پروگرام کے مطابق ایک ماہ بعد ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کو افغانا ایر لائنز کے طیارے
سے واپس وطن تشریف لے آئے۔ پالم ہوائی اڈے پر ان کے عزیزوں، مداحوں، نیز علمی ادبی شخصیتوں
نے ڈاکٹر ارمان صاحب کا دلی خیر مقدم کیا اور اردو کے لئے ان کی عملی خدمات کو سراہا۔
ڈاکٹر ارمان کے خطبۂ صدارت نے تو لندن اور مضافات کے اردو پرست حضرات کے دلوں پر ایک
ایسی انمٹ چھاپ چھوڑی کہ مدتوں یہ خطبۂ صدارت سراہا جاتا رہے گا اور ڈاکٹر ارمان کی اردو دوستی اور اردو
ادب میں ان کی شعری اور افسانوی تخلیقات سے قابلِ تعریف اضافے پر اظہارِ مسرت کیا جاتا رہے گا۔ مشاعرے اور شعری
نشستوں میں ارمان صاحب کے کلام کو جو مقبولیت ملی اس کے نتیجے میں سیکڑوں علم دوست اور اردو پرست حضرات
نے انہیں اپنے ہاں مدعو کرنے کی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی طویل فہرست کے
راہ ہونے کے باوجود ڈاکٹر ارمان صاحب چند دعوتوں کو قبول کرنے کے لئے مجبور ہو گئے اور ان گھریلو
دعوتوں میں جو شعری نشستیں جمیں ان کی تفصیل خاصی طویل ہے تاہم ان خالص گھریلو دعوتوں میں میزبان
اور دوسرے مدعو حضرات نے ارمان صاحب کے کلام کو ٹیپ کر لیا۔ اور ارمان صاحب کو میزبانوں نے تحائف
پیش کر کے اپنی دلی عقیدت کا اظہار فرمایا۔ ارمان صاحب کے کچھ قطعات کو انگریزی شاعری میں ٹرانسلیٹ
بھی کیا گیا۔

ارمان صاحب کے شعری مجموعوں کے علاوہ ان کا افسانوی مجموعے "مان سروور" کو خوب سراہا گیا۔ مان سروور کے
اردو اور ہندی ایڈیشن تو شائع ہو چکے ہیں اب اس کا انگریزی کا ایڈیشن بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہا ہے۔
ارمان صاحب "مان سروور" کے انگریزی ایڈیشن کا مسودہ اپنے ہمراہ لندن لے گئے تھے اور جسے انگلینڈ کے ایک مشہور انگریز
افسانہ نگار نے حرف حرف پڑھنے کے بعد بے حد تعریف کی اور اس کے لئے کچھ مفید مشورے بھی دئے۔ "مان سروور"
کا انگریزی ایڈیشن بھی غالباً اس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گا اور ہندوستان میں یہ اولین مثال ہوگی کہ کسی
افسانہ نگار کی تخلیق اپنے وطن میں اردو اور ہندی کے علاوہ انگریزی میں بھی شائع ہو۔

ڈاکٹر اودے سرن ارمان اردو کے لئے یہاں پر جو دامے، درمے اور قلمے خدمات انجام دے رہے ہیں اسے
تو دشمنانِ اردو نے بھی تسلیم کیا ہے اور بیرونِ ملک سے باہر ڈاکٹر ارمان صاحب نے اردو کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کی
جو کامیاب کوشش کی ہے اس کے لئے وہ یقیناً دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

دعا ہے کہ خدائے عظیم ڈاکٹر اودے سرن ارمان کو اردو کی بقا و ترقی کے لئے عمرِ طویل عطا فرمائیں۔

دعا گو
ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مشتاق احمد وجد دہلوی

بُلبل چہ گُفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

مالک رام کے خلاف بکواس

انجمن ترقی اُردو ہند کے حالیہ صدر جناب مالک رام صاحب کے خلاف ماہنامہ "بیسویں صدی" کے کسی گزشتہ شمارے میں شاہد پرویز صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔

شاہد پرویز صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے زیادہ تر ماہنامہ "تحریک" اور "اُردو تحقیق اور مالک رام" میں مدتوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شاہد پرویز نے جناب گوپال متل صاحب اور دوسرے مخالفین مالک رام کے اُگلے ہوئے نوالوں کو پھر سے نقرئی ورق لگا کر "بیسویں صدی" کی طشتری میں پیش کیا ہے، حالانکہ ماہنامہ "بیسویں صدی" کی سابقہ روایات میں نہ تو کبھی اُگلے ہوئے نوالوں کو پھر سے کھانے کا مذاق رہا ہے اور نہ ہی اس قسم کے متنازعہ اور ذاتی واقعات کو زیر بحث لانا اس کا مشرب رہا ہے۔

ہمیں نہ تو جناب مالک رام صاحب پر لگائے گئے ان الزامات کے بارے میں کچھ کہنا ہے اور نہ ہی ان کی وکالت ہمارا فرض ہے۔ ہمارا نظریہ تو یہ ہے کہ مالک رام صاحب کے خلاف لکھنے کے لئے کسی ایسی ہستی کو سامنے آنا چاہئے تھا جن کا اپنا دامن ہر طرح سے پاک ہو اور علمی ادبی لحاظ سے نہ سہی اخلاقی اور مجلسی طور پر ہی مالک رام کا ہم پلہ ہو۔ گوپال متل صاحب نے مالک رام صاحب کے خلاف لکھا تو اُردو دُنیا جانتی تھی کہ پنجاب سے تقسیم ملک کے بعد دو ہی جینئس ادیب ہندوستان آئے ہیں جن میں اوریجنیلیٹی ہے اور کسی موضوع پر لکھنے کے لئے کما حقہ طور پر اس کے اہل ہیں اور وہ ہیں جناب گوپال متل اور جناب فکر تونسوی۔ لہٰذا جب گوپال متل صاحب نے مالک رام کے خلاف "تحریک" کو متحرک کیا تو ان کی تحریروں پر دانش وروں نے دھیان دیا۔ مگر کیا غضب ہے کہ شاہد پرویز ایسے اخلاقی اور مجلسی طور پر دیوالیہ ادیب مالک رام کے خلاف لکھیں۔ مالک رام کی ادبی اور علمی چوریوں کی نشان دہی کرنے والے شاہد پرویز یہ بھول گئے کہ وہ ماہنامہ "بیسویں صدی" کے دفتر سے چرائی ہوئی سیکڑوں روپیہ کی کتابیں دفتر شانِ ہند میں فروخت کرنے آئے تھے۔ اور انہیں غالباً یہ بھی یاد ہوگا کہ جودھ پور کے مشاعرے میں جاتے وقت انہوں نے اور مرحوم صبا افغانی نے ایک محترمہ سے ایک قیمتی تاش بلو کھیلنے کے لئے مستعار لی تھی جو انہوں نے باوجود کئی بار یاد دہانی کرانے کے واپس نہیں کی اور وہ محترمہ خاموش ہو گئیں۔ اگر شاہد پرویز صاحب ان دونوں الزامات کو بُہتان سمجھتے ہوں تو وہ خدا کے فضل سے مسلمان ہیں لہٰذا جامع مسجد میں کھڑے ہو کر قرآن کریم پر حلف لے کر کہیں کہ کیا یہ غلط ہے؟

بیسویں صدی کے حالیہ شمارے میں شاہد پرویز صاحب نے مہک رام کے عنوان سے ان چند خطوط کے اقتباسات شائع کئے ہیں جو انہیں (بقول ان کے) ان کے سابقہ مضمون مطبوعہ "بیسویں صدی" کو پڑھنے کے بعد موصول ہوئے ہیں۔ باقی حضرات سے تو ہم ذاتی طور پر واقف نہیں ہیں مگر ایک مکتوب کے نویسندہ جناب عبدالمتین نیاز۔ موتیا پارک بھوپال سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ صاحب کتب فروشی کے ٹریولنگ ایجنٹ تھے۔ اور تو ہم کچھ لکھنے سے پہلو تہی کرنا ہی بہتر سمجھتے ہیں مگر یہ صاحب دفتر شانِ ہند سے صرف بیس تیس روپیہ کی کتب نصف قیمت پر اس شرط پر لے گئے تھے کہ ان کتابوں کو دکھا کر آرڈر فراہم کریں گے مگر آج تک انہوں نے ان کتب کی نصف قیمت بھی ادا نہیں کی حالانکہ انہیں بارہا اس

فعل پر ندامت دلائی گئی اور انہوں نے بھوپال کے ایک آدھ صحافی سے بھی ضمانتی خط لکھوایا تھا مگر معاملہ اب بھی وہیں کا وہیں ہے یعنی جیسے فرشتے ویسی روح۔ یا آپ قدرے مہذب انداز میں کہہ سکتے ہیں کہ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔ ایک دوسرا خط جناب شجاع۔ نیو فرینڈز کالونی نئی دہلی کا بھی شائع کیا گیا ہے۔ جناب شجاع کی واقفیت کے لئے عرض کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے مکتوب گرامی میں جس کتاب "اردو تحقیق اور مالک رام" کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی حرامی اولاد تھی جس کے حلالی باپ کا آج تک پتہ نہ چل سکا یعنی اس کتاب پر پریس کا نام غلط، پبلشرز کا نام اور پتہ غلط اور تو اور پریس ایکٹ کے مطابق اس کتاب کی دو جلدیں پریس آفیسر کو بھی نہ بھجوائی گئیں۔ اب آپ ہمیں بتائیے کہ جب اس کتاب کے شائع کرنے والوں کے اخلاقی حوصلے اتنے "بلند" تھے کہ وہ اپنا نام تک ظاہر کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے تو اس کتاب کو یقیناً حرامی اولاد ہی کہا جائے گا اور اس حرامی اولاد کے حلالی باپ ہونے کا شک کئی حضرات پر کیا جاتا ہے مگر اس کے لئے تو دل گردے کی ضرورت ہے کہ کوئی مائی کا لعل یہ کہنے کی جرأت کرے کہ وہ اس حرامی اولاد کا حقیقی باپ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اکثر و بیشتر مسلمان دانشوروں نے یہ خفیہ پلان بنا رکھا ہے کہ اردو کے غیر مسلم ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور افسانہ نگاروں کے خلاف سچا جھوٹا لکھا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ ہر غیر مسلم ادیب متعصب ہے اور تھا۔ اردو پرست اور اردو کی بقا و حیات کا ضامن نہیں تھا بلکہ اس کا دشمن تھا۔ لہٰذا منشی پریم چند کے خلاف انتہائی بے بنیاد طور پر ان کے متعصب اور اردو دشمن ہونے کے بارے میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے گئے۔ اسی طرح کچھ اور غیر مسلم ادیبوں پر بھی حملے شروع ہو چکے ہیں۔ لہٰذا مالک رام صاحب کی مخالفت بھی اسی پلان کی ایک کڑی ہے۔ آج سے کئی برس پہلے یہ سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب اس کا اعادہ محض شرارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ جناب مالک رام صاحب کے خلاف ایسے اخلاقی اور سماجی طور پر دیوالیئے لکھنے لگے ہیں جو اس ٹب میں منہ دھونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتے جس میں کہ مالک رام صاحب پیشاب کرتے ہیں۔

"بیسویں صدی" کے مدیر جناب رحمٰن نیّر ہمارے کرم فرما ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ انہیں یہ دوستانہ مشورہ دیں کہ وہ بیسویں صدی کو غیر مسلم اردو دانشوروں کے خلاف واہی تباہی بکنے کے لئے استعمال نہ ہونے دیں۔

کل ہند اردو کانفرنس برائے قومی یکجہتی

آل انڈیا اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹ فورم (برائے قومی یکجہتی) پٹنہ (بہار) کی جانب سے ۶،۷ ستمبر ۸۳ء کو ایوانِ غالب نئی دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس برائے قومی یکجہتی منعقد کی گئی جس کا افتتاح ہماری محبوب وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ نے فرمایا۔ اس کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال اور کانوں سنا حال لکھنے کا ارادہ تھا مگر راقم الحروف اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کانفرنس کی ضرورت کیا تھی؟ ملک بھر سے دو صد کے قریب ڈیلی گیٹ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے دور دراز کا سفر طے کر کے آئے اور ان کی آؤ بھگت کا جو حسرت ناک انجام ہوا اس کا اندازہ "قومی آواز" میں مورخہ ۱۲ ستمبر میں چھپے اس مراسلہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

اردو کانفرنس

مکرمی ۷ ستمبر کو ایوانِ غالب نئی دہلی میں کل ہند کانفرنس برائے قومی یکجہتی کا اجلاس وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ہاتھوں ہوا جس میں ادیبوں کو ہندوستان کے مختلف شہروں سے بلایا گیا۔ ہم لوگ آئے مگر ہم لوگوں کی کوئی عزت نہیں کی گئی رائٹروں اور صحافیوں کو افتتاحی اجلاس کے بعد دوپہر کا کھانا اردو گھر نئی دہلی میں بہار کے وزیر اعلیٰ چندر شیکھر سنگھ کی طرف سے دیا گیا تھا جب ہم لوگ اردو گھر پہنچے تو وہاں ڈیڑھ بجے تک کوئی انتظام نہ تھا۔ رات کا کھانا ڈائریکٹر اطلاعات و نشریات مسٹر

اپنج کھانا بھگت کے یہاں تھا وہاں بھی چھینا جھپٹی اس طرح ہوئی کہ بہت سے لوگ بنا کھائے بھوکے رہ گئے۔

۷ ستمبر کو صبح ۱۰ بجے دوسرا اجلاس ہونا تھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں پہنچا۔ ایک بجے کے قریب لوگ آنا شروع ہوئے۔ اعلان کیا گیا تھا دوپہر کا کھانا شری شوشنکر کے گھر پر ہے مگر بعد میں یہ اعلان ہوا کہ کھانا اکبر ہوٹل نئی دہلی میں ہے بس بھر کر ہم سب صحافی اکبر ہوٹل پہنچے، وہاں شیش محل میں داخل ہوئے تو دیکھا کھانا لگا ہوا ہے ہم لوگ فوراً کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے کبھی نہ کھایا ہو۔ جب ہوٹل کے منیجر نے کہا آپ لوگ یہ کھانا کس طرح سے کھا رہے ہیں ہمارے پاس کوئی آرڈر نہیں ہے مگر کسی نے ایک نہ سُنی اور یہ کہتے رہے کہ شوشنکر جی کا آرڈر ہے جب ہوٹل کے منیجر کے کہنے پر نہ رُکے تو اس نے اپنی سیکورٹی بلائی اور یہ کہا کہ جس نے کھانا کھایا ہے سب سے سو روپے لیا جائے گا کچھ لوگ کھا کر منہ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئے جس میں ۲۶ یا ۲۷ صحافیوں کو ان سیکورٹی والوں نے بٹھا لیا۔ کسی طرح بہار کے سابق وزیر شمائل نبی کو بلایا گیا اور انہوں نے قریب گیارہ سو اسّی روپے کا بل ادا کیا۔

یہ کانفرنس کیوں کر منعقد کی گئی اور اس کا کوئی مقصد مجھے تو نظر نہیں آیا سوائے اس کے ادیبوں اور صحافیوں کو بلا کر ان کی بے عزتی کی گئی۔

چند ادیب و صحافی

حقیقت یہ ہے کہ حالت اس سے کہیں زیادہ بُری تھی جس کا ذکر اس مراسلہ میں کیا گیا ہے۔ کانفرنس کے منتظمین کا عندیہ یہ تھا کہ کسی طرح شمائل نبی اور دوسرے کارکنوں کو وزیر اعظم صاحبہ کی نظروں میں لایا جائے۔ شمائل نبی صاحب کو بہار کے وزیر اعلیٰ جناب چندر شیکھر سنگھ صاحب نے اپنی وزارت میں شامل نہیں کیا۔ اور وزارت کا چسکا اتنا بُرا ہوتا ہے کہ جسے ایک بار لگ جائے پھر وہ مرتے دم تک اسے بھول نہیں سکتا۔ شمائل نبی صاحب اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور بڑے اچھے انداز میں وزیر اعظم صاحبہ اور راجیو گاندھی صاحب کی نظروں میں آئے۔ دوسرے الفاظ میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس (جس میں وزیر اعظم صاحبہ تشریف لائیں) اور اختتامی اجلاس (جس میں راجیو گاندھی صاحب تشریف لائے) انتہائی کامیاب تھے اور باقی کے اجلاس زبانِ حال سے پُکار پُکار کر کہہ رہے تھے کہ یار لوگوں نے محض اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے اس کانفرنس کا ڈھونگ رچا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح وزیر اعظم صاحبہ اور راجیو گاندھی صاحب کی نظروں میں آسکیں۔ وگرنہ اگر کوئی صاحب یہ بتانے کی تکلیف گوارا کریں کہ اس کانفرنس سے اُردو یا قومی یکجہتی کو کونسی طاقت نصیب ہوئی ہے تو ہم ان کے ممنونِ احسان ہوں گے۔

ایڈیٹر شانِ ہند محض ایک ممبر کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک ہوا تھا مگر جنرل سکریٹری فورم کی درخواست پر ڈیلی گیٹ کی فیس دس روپیہ ادا کر دیئے گئے۔ دوسرے دن صبح کے اجلاس میں جناب چندر شیکھر سنگھ وزیر اعلیٰ بہار کی طرف سے ایک نہایت اعلیٰ قسم کا فائل کور ڈیلی گیٹوں کو تحفۃً پیش کیا گیا۔ اس فائل کور پر اصل لاگت کسی طرح بھی پندرہ روپیہ سے کم نہ آئی ہوگی لہٰذا اس فائل کور کو حاصل کرنے کے لئے یار لوگوں نے دھڑا دھڑ دس دس روپیہ ادا کر کے ڈیلی گیٹ بننے کا بلا حاصل کر لیا اور اس پر یہ مستزاد کہ جناب شوشنکر صاحب وزیر توانائی کے ہاں کھانا بھی ملے گا۔ جناب وشوا ناتھ طاؤس نے ۶ ستمبر کی دوپہر اور پھر رات کو ڈیلی گیٹوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لئے راقم الحروف سے پُرزور الفاظ میں کہا مگر ایڈیٹر شانِ ہند اس قسم کی دعوتوں سے بخوبی واقف تھا لہٰذا مجبوری ظاہر کی گئی اور ہوا یہ کہ انجمن ترقی اُردو ہند کے صدر دفتر اُردو گھر میں بہار کے وزیر اعلیٰ کی طرف سے ۶ ستمبر کے دوپہر کے کھانے کا انتظام مہمانوں کے لئے کیا گیا تھا مگر وہاں کھانا تو تھا لیکن برتن نہیں تھے۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد دو سو بتائی گئی تھی اور کھانے والے تھے چار سو سے بھی زائد۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کھانا کافی کیسے ہوتا یار لوگوں نے انجمن کی مرکزی لائبریری کی الماریوں سے کتابیں نکالیں اور ان پر ہی چپاتیاں، سبزیاں وغیرہ رکھ کر

کھانا شروع کردیا۔ ممکن ہے کہ لائبریری کی کچھ کتابیں بھی اِدھر اُدھر ہو گئی ہوں۔ اُردو گھر ایسی جگہ واقع ہے کہ جہاں ہوٹل وغیرہ کافی فاصلے پر ہیں لہٰذا مزید کھانا بھی فوری طور پر منگایا نہ جا سکتا تھا لہٰذا اکثر حضرات بھوکے ہی رہے رات کا کھانا جناب بھگت صاحب انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹر کے ہاں تھا۔ وہاں اور پھر دوسرے دن اکبر ہوٹل میں جو کچھ ہوا اس کی ایک جھلک مراسلہ مطبوعہ قومی آواز سے مترشح ہے۔ حالاں کہ بتانے والوں نے ایڈیٹر شانِ ہند کو بتایا کہ حالت بہت ہی بُری تھی۔ اُردو گھر میں کھانے کا نظارہ بھی ایک معزز ڈیلی گیٹ نے ہی سُنایا۔

وزیر اعظم صاحب کی تقریر اُردو زبان میں ہندی یا رومن رسم الخط میں ٹائپ شدہ تھی چوں کہ تقریر میں اُردو کے اکثر و بیشتر مشکل الفاظ (مثلاً وحدت الوجود" "انعقاد" اور اس قسم کے کئی الفاظ) تھے جن کی ادائیگی اُن کے لئے کافی مشکل پیدا کر رہی تھی۔ پہلی صف میں میری بائیں جانب جناب عثمان عارف صاحب ڈپٹی منسٹر ہاؤسنگ اینڈ ورکس تشریف فرما تھے اور دائیں جانب ایک اور صاحب تشریف فرما تھے جوں ہی وزیر اعظم صاحب کسی مشکل لفظ پر اٹکتیں تو یہ صاحب جھٹ سے وہ لفظ ذرا اونچی آواز میں بولتے اور بڑے فخریہ انداز میں مجھے اور اپنے آس پاس بیٹھے حضرات سے بار بار کہتے رہے کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے مذکورہ صاحب نے بتایا کہ وہ ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔

ہمارے ایک دوست جناب رام غلام سابق وزیر اعظم ماریشش کے کلچرل سیکریٹری تھے اور ان کی تقاریر وغیرہ ہمارے دوست ہی لکھتے تھے مگر انہیں یہ ہدایت تھی کہ جس جلسے یا تقریب میں وزیر اعظم صاحب تقریر پڑھیں گے آپ وہاں موجود نہیں ہوں گے۔

ہم وزیر اعظم صاحبہ سے مودبانہ طور پر التماس کریں گے کہ وہ زبانی طور پر جو تقریر فرماتی ہیں وہ ہماری زبان ہے اور اسے ہی ہم اُردو کہتے ہیں "وحدت الوجود" اور "انعقاد" اُردو کے نہیں عربی زبان کے الفاظ ہیں انہیں ایسی تقریبات میں کسی قسم کی لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ عوام ان کی زبان [illegible] کے دل سے نکلے ہوئے الفاظ کو سُننے میں راحت اور دلی خوشی محسوس کرتے ہیں ہمارا دعوےٰ ہے کہ اگر وزیر اعظم صاحبہ اس روز اگر اس لکھی ہوئی عربی آمیز اُردو تقریر نہ پڑھتیں بلکہ زبانی طور پر ہی اپنے خیالات و جذبات کا اظہار فرماتیں تو وہ اس لکھی ہوئی تقریر سے کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ اختتامی اجلاس میں راجیو گاندھی صاحب نے زبانی تقریر فرمائی اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کچھ حوالے لکھ کر لائے تھے مگر انہوں نے تقریر رواں دواں زبانی تھا فرمائی اور ان کی تقریر ہر لحاظ سے قابلِ تعریف تھی اور جو کچھ انہوں نے بولا وہی اُردو زبان ہے۔

باقی کے اجلاسوں کا ذکر اگر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ کاش "اُردو" اور "قومی یک جہتی" کو اپنی ذاتی مطلب براری کے حصول کے لئے استعمال کرنے والے حضرات اگر یہ تماشا نہ کرتے تو اچھا ہوتا۔ ●●

غزل

اختر رشید اختر سعیدی
رانچی

تو ہے میرا مجھے یہ کہنے دے
بزم میں اس بھرم کو رہنے دے

باہری آگ کو بجھا دے مگر
میرا دل جل رہا ہے جلنے دے

شاخ سے کر جدا نہ کلیوں کو
پھول بن کر انہیں بھی کھلنے دے

پھر سجے گی فراق کی محفل
دن کے سورج کو اور ڈھلنے دے

آبگینے ہیں اشک کے اختر
ان کو باہر نہ تو نکلنے دے

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

شکیل بدایونی فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت کے مالک تھے مگر ان کی شہرت میں زیادہ تر حصہ خمار بارہ بنکوی اور صبا افغانی کا تھا۔ شکیل صاحب کو جب بھی کسی فلم کے گانے لکھنے کا کنٹریکٹ ملتا تو وہ "پنچ گنی" جانے کے لئے رختِ سفر باندھتے اور خمار بارہ بنکوی یا صبا افغانی ان کے ہم سفر ہوتے۔ پنچ گنی پہنچنے کے بعد شکیل صاحب تو اپنے دلِ بے قرار کو قرار دینے کی دھن میں لگ جاتے اور خمار صاحب یا صبا افغانی جی بھر کر شراب نوشی کرتے اور شکیل صاحب کی ہدایات کے مطابق گانے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ شکیل صاحب فلم بنانے والوں سے جو بھی معاوضہ لیتے ہوں وہ تو خیر انہیں کو پتہ ہو گا مگر وہ خمار صاحب کو زیادہ سے زیادہ پانچ صد روپے اور صبا افغانی کو تین صد روپیہ فی گانا دیتے تھے۔ کھانا، شراب اور پنچ گنی میں ہوٹل کے اخراجات وغیرہ سب شکیل صاحب ادا کرتے تھے شکیل صاحب نے تو خیر اس حقیقت سے کبھی اتفاق نہیں کیا مگر صبا افغانی جب اپنے کوٹے سے زیادہ شراب پی لیتے تھے تو اس امر کا انکشاف کھلے الفاظ میں کرتے تھے۔ خمار بارہ بنکوی صبا افغانی کے مقابلے زیادہ مہذب اور رکھ رکھاؤ کے مالک ہیں انہوں نے اس راز کو اپنے احباب پر بھی نہیں کھولا۔ مگر یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا جھٹلانا خمار صاحب کے بس کی بھی بات نہیں۔

شکیل صاحب میں ایک عادت یہ بھی تھی کہ جہاں کہیں انہوں نے کسی شگفتہ زمین میں کوئی اچھی غزل سُنی تو کسی نہ کسی فلمی گانے میں اسی انداز میں غزل کہتے اور یہاں تک کہ بعض اشعار تو معمولی لفظی توڑ جوڑ کے باوجود ویسے ہی رہتے جیسے کہ انہوں نے کسی شاعر سے سُنے تھے۔ قبلہ صولت ٹونکی مرحوم ایڈیٹر شان ہند کے ہمراہ بمبئی گئے۔ جانی واکر صاحب نے صولت صاحب کے اعزاز میں دعوت کی اس دعوت میں رات کے ایک بجے تک شعر و شاعری کا سلسلہ جاری رہا۔ قبلہ صولت صاحب نے اپنی مشہور غزل جس کا مطلع ہے

بام و درِ مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
اُن کے آنے کے آثار نظر آتے ہیں

سُنائی تو شکیل صاحب نے دوسرے شرکاء کے ساتھ خوب خوب داد دی۔ صولت صاحب کے قیامِ بمبئی کے دوران کئی شعری نشستیں ہوئیں اور ہر ایسی نشست میں شکیل صاحب نے یہی غزل فرمائش کے ساتھ سُنی۔ چند ماہ بعد ایک فلم ریلیز ہوئی جس کے گانے شکیل صاحب نے لکھے تھے تو اسی زمین اور اسی ردیف نیز انہی قافیوں کے ساتھ شکیل صاحب کی غزل فلم میں موجود تھی اور اکثر شعروں کا مفہوم بھی وہی تھا۔

شکیل صاحب اکثر بیرونی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے مگر انہیں ہرگز یہ گوارہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا شاعر ان سے زیادہ مقبولیت یا داد پائے۔ ایک مرتبہ شکیل صاحب یو۔ پی کے ایک دور دراز مقام کے مشاعرہ میں تشریف لے گئے تو وہاں انہیں معلوم ہوا کہ ایک مقامی شاعر ایسا ہے جس کا ترنم داؤد کے روایتی اور مثالی ترنم کو بھی شرماتا ہے تو شکیل صاحب نے اس شاعر کو اپنی رہائش گاہ پہ بلوایا۔ شاعر صاحب نے اسے عزت افزائی سمجھا کہ بمبئی کے ایک مشہور فلمی شاعر نے انہیں از خود یاد فرمایا ہے۔ لہٰذا شاعر صاحب خوشی خوشی تشریف لائے اور شکیل صاحب نے ان شاعر صاحب کی تعریف اور آؤ بھگت میں نہایت فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے ان سے کلام سُنانے کی فرمائش کی۔ شاعر صاحب شکیل کی اس پہنگ سے اس قدر پھولے کہ از خود فرمانے لگے ایک غزل اور سُنیئے۔ بس پھر کیا تھا ایک کے بعد دوسری غزل کی فرمائش ہوتی رہی۔ چائے کے کئی

دَور چل گئے اور شاعر صاحب ہیں کہ غزلیں سُنائے جا رہے ہیں اور شکیل صاحب ہیں کہ داد پر داد دیتے جا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک شاعر صاحب کا گلا بیٹھ چکا تھا اور وہ بات بھی کرنا چاہتے تو انہیں مشکل در پیش آتی۔ مشاعرہ میں یہ شاعر صاحب بھی موجود تھے مگر ان کے نام کا اعلان ہوا تو وہ غزل تو کیا یہ کہنے کی بھی سکت نہیں رکھتے تھے کہ میرا گلا بیٹھ گیا ہے کلام نہ سُنا سکوں گا۔ اور مشاعرہ میں شکیل صاحب حاصلِ مشاعرہ شاعر قرار دیے گئے۔

اسی طرح ایک بار شکیل صاحب بہار کے کسی مقام پر ایک مشاعرے میں تشریف لے گئے تو وہاں جاتے ہی انہوں نے اپنے حواریوں سے پوچھا کہ کون کون سے شعرا مدعو ہیں۔ شعرائے مدعوئین کی فہرست سُننے کے بعد شکیل صاحب نے فوری اندازہ لگا لیا کہ اگر فلاں شاعر مشاعرہ میں شرکت نہ کریں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ پلان بنانے میں شکیل صاحب بڑے تیز تھے۔ لہٰذا جوں ہی وہ شاعر اسٹیشن سے شاعروں کی قیام گاہ پر آئے تو انہیں شکیل صاحب کا جو کہ کسی دوسری جگہ اپنے کسی مداح کے ہاں فروکش تھے پیغام ملا کہ شکیل صاحب نے اسی وقت بُلایا ہے۔ جُوں ہی یہ شاعر شکیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو چھُوٹتے ہی کہنے لگے میاں تمہیں فلاں فلم کے گانے لکھنے کے لیے میوزک ڈائریکٹر او۔پی۔ نیر صاحب نے ٹیلی گرام دے کر بمبئی بُلایا تھا اور تم ہو کہ دو سو روپلی کے لیے مشاعرے میں بھاگے چلے آئے اور وہاں جو تمہاری قسمت چمکنے والی ہے اُسے دو سو روپوں پر قربان کر دیا۔ اب شاعر صاحب ہیں کہ ہراساں و پریشاں حلف اُٹھا رہے ہیں کہ انہیں تار ملا ہی نہیں ورنہ وہ مشاعرہ پر لعنت بھیجتے اور سیدھے بمبئی جاتے۔ یہ سُنتے ہی شکیل صاحب نے بڑے ڈرامائی انداز میں جیب سے سو سو روپے کے نوٹوں کی خاصی تعداد نکالی اور سو سو کے دو نوٹ ان شاعر صاحب کو بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلی ٹرین سے بمبئی چلے جائیے کیوں کہ کل تک اگر آپ وہاں نہیں گئے تو نیر صاحب کسی دوسرے شاعر سے معاملہ کر لیں گے۔ شاعر صاحب کو جو معاوضہ مشاعرہ والوں سے ملنا تھا وہ تو شکیل صاحب نے ادا کر ہی دیا تھا لہٰذا شاعر صاحب شاعروں کی قیام گاہ پر پہنچے اور جلدی جلدی اپنا تھیلا اُٹھاتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی راہ لی۔ رات کو مشاعرہ میں شکیل صاحب کا بول بالا رہا اور وہ شاعر بمبئی پہنچ کر او۔پی۔ نیر سے دو تین دن کی تلاش کے باوجود نہ مل سکے۔

اسی طرح ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے شکیل صاحب پہنچے تو انہوں نے مدعو کئے گئے شعرائے کرام کی فہرست پر نظر دوڑائی تو ایک دو نہیں نصف درجن سے بھی زیادہ ایسے شاعر موجود تھے جو شکیل صاحب کی مقبولیت اور ترنم کو بڑے اچھے ڈھنگ سے چیلنج کر سکتے تھے۔ دو گھنٹے سوچنے کے بعد جب کوئی ترکیب شکیل صاحب کے ذہن میں نہ آئی تو چپکے سے ہوٹل چھوڑ کر ریلوے اسٹیشن پر آ گئے اور بمبئی جانے والی گاڑی سے واپس چلے آئے۔ ہوٹل کے مالک نے مشاعرے کے منتظمین کو شام کو اطلاع دی کہ شکیل صاحب کہہ گئے ہیں کہ بمبئی سے ایک ضروری ٹیلی فون آنے پر وہ فوری طور پر واپس چلے گئے ہیں۔ انشاء اللہ اگلے سال آپ کے مشاعرے میں شریک ہوں گے۔

شکیل صاحب کو اپنی شہرت کروانے کا شوق تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے حواریوں کے وسیلے سے بمبئی اور دیگر کئی شہروں میں "بزمِ شکیل" قائم کروا رکھی تھی جن کے جملہ اخراجات شکیل خود ادا کرتے تھے۔ بمبئی میں ڈاک یارڈ میں بزمِ شکیل کا مشاعرہ تھا۔ راقم الحروف بھی ان دنوں بمبئی ہی میں مقیم تھا لہٰذا شکیل صاحب مجھے بھی اپنے ہمراہ مشاعرہ میں لے گئے۔ مشاعرہ کے بعد جناب مجروح سلطان پوری نے چٹکی لی کہ یار اس قسم کی بزم وغیرہ تو کسی شاعر یا ادیب کے انتقال کے بعد قائم ہوتی ہے اور تمہاری زندگی میں ہی لوگوں نے بزمِ شکیل بنا ڈالی ہیں۔ مجروح سلطان پوری کی اس لطیف چٹکی کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب تھا کہ لوگوں نے تمہیں زندگی میں ہی مرحوم سمجھ لیا ہے۔ بس پھر کیا تھا شکیل صاحب غصے سے کانپنے لگے اور معاملہ خاصا تُو تُو مَیں مَیں تک جا پہنچا۔ بیگم مجروح اور رُدمی دہلوی نے شکیل صاحب کو سمجھا بُجھا کر معاملہ ٹھنڈا کیا اور شکیل صاحب اور رُدمی صاحبہ کو گاڑی میں بٹھا کر ہوٹل چھوڑنے کے لیے روانہ ہوئے مگر راستہ بھر اُن کا موڈ آف رہا۔

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

عقیل صدیقی

سرور تونسوی

انجمن عروجِ ادب دہلی کا سلور جوبلی مشاعرہ

انجمن عروجِ ادب دہلی ایک ایسی معتبر اور فعال انجمن ہے جس کے قول و فعل میں کبھی تضاد دیکھنے میں نہیں آیا۔ گزشتہ ۲۵ سالوں سے یہ انجمن جشنِ آزادی پر ایک یادگاری مشاعرہ کراتی ہے اور سال کے دوران ایک ثقافتی پروگرام۔ اس انجمن کے جملہ عہدہ داران اور ممبران خدا کے فضل سے سیر چشم اور کھاتے پیتے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس ادارے میں ایک بھی ایسا رکن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا جو ذاتی اغراض کے تحت انجمن کے مفاد کو نقصان پہنچاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انجمن دہلی کے جملہ ادبی اور ثقافتی اداروں میں سر فہرست ہے۔

راقم الحروف نے شروع شروع میں اس انجمن کے چند مشاعروں کی رُوداد سپردِ قلم کی تھی مگر گزشتہ کئی برسوں سے دہلی کے مشاعروں میں شرکت دانستہ طور پر ترک کرنے کی وجہ سے انجمن عروجِ ادب کے سالانہ مشاعروں میں بھی شریک نہ ہونے کے باعث شانِ ہند کے مداحوں کی یہ دلی خواہش تھی کہ کم از کم انجمن کے اس مشاعرے کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا حال شانِ ہند میں شائع کیا جائے۔ جناب ساحر ہوشیارپوری اس انجمن کے صدر ہیں اور ان کا حکم ہے کہ اس بار انجمن عروجِ ادب کا پچیسواں سالانہ مشاعرہ ہو رہا ہے لہٰذا اس سلور جوبلی مشاعرہ کی رُوداد راقم الحروف سپردِ قلم کرے۔ لہٰذا الحکم حاکم کی تعمیل کی جا رہی ہے۔

سرور تونسوی

انجمن عروجِ ادب کا یہ سالانہ مشاعرہ ہر سال جشنِ آزادی کے موقع پر ۱۴ اگست کو ہی منعقد ہوتا ہے۔ چونکہ اس بار صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ صاحب نے اس مشاعرہ کا افتتاح فرمانا تھا اس لئے مجبوراً صدر جمہوریہ کی مصروفیات کے باعث مشاعرہ ۲۲ اگست ۱۹۸۳ء کو ہو رہا ہے۔ دہلی میں ایوانِ غالب ہی ایک ایسا ہال ہے جہاں بلوغت اور سلیقے کے ساتھ کوئی اچھی تقریب منعقد ہو سکتی ہے۔

مشاعرہ سے عین پہلے زوردار بارش شروع ہو گئی ہے جس کے باعث اکثر سامعینِ مشاعرہ بُری طرح سے بھیگتے ہوئے ہال میں داخل ہو رہے ہیں اسی باعث صدر جمہوریہ ہند بھی دس منٹ لیٹ تشریف لائے ہیں۔

انجمن کے صدر جناب ساحر ہوشیارپوری نے صدر جمہوریہ ہند کو طلائی ہار پہنایا ہے اور جناب پریم نارائن نائب صدر انجمن ہذا نے مشاعرے کے مجوزہ صدر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری وزیر مملکت حکومت ہند کو ہار پہنایا ہے۔ ساحر صاحب نے انجمن کا تعارف کراتے ہوئے انجمن کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد صدر جمہوریہ ہند اور انصاری صاحب کا دلی شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ انہوں نے صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ صاحب سے متعلق ایک نظم صنفِ توشیح میں شروع کر رکھی ہے جو ابھی نامکمل ہے۔ تاہم جو اشعار اب تک ہو سکے ہیں پیشِ خدمت ہیں۔

گ گلشن ہے اپنا دیش صباحت ہیں ذیل سنگھ
خوشبو، سرور، کیف، لطافت ہیں ذیل سنگھ

ی یاور نصیب کے ہیں مقدر کے ہیں دھنی
خوش بختی بشر کی بشارت ہیں ذیل سنگھ

ا انسانیت نواز ہے ان کا شعار زیست
اک پیکر خلوص و مروت ہیں ذیل سنگھ

نی نانک کا نور ان کی جبیں سے ہے آشکار
تاریکیوں میں شمع ہدایت ہیں ذیل سنگھ

ی یارب ترے کرم سے ملے ان کو عمر خضر
سالار اہل جرأت و ہمت ہیں ذیل سنگھ

ذ ذی فہم و ذی شعور ہیں، ذی شان و ذی وقار
مجموعۂ ذہانت و عظمت ہیں ذیل سنگھ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساحر صاحب نے ان اشعار میں اپنے مقام شاعری کو بہ طریق احسن قائم رکھا ہے اور ان کا جو ایک خاص انداز شاعری ادب میں قرار پاچکا ہے وہ ان توصیفی اشعار میں بھی صاف جھلک رہا ہے۔

اب ساحر صاحب نے صدر جمہوریۂ ہند سے مشاعرہ کا افتتاح فرمانے کی نیازمندانہ گزارش کی ہے اور صدر جمہوریہ ہند تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مائیک پر ارشاد فرما رہے ہیں۔

اردو زبان ہمارے ملک کی قومی زبان ہے۔ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس لئے اسے کسی مذہب یا فرقے سے جوڑنا مناسب نہیں ہے کیونکہ ایسی باتوں سے زبان اپنی عوامی مقبولیت کھو بیٹھتی ہے۔ اردو کے ارتقاء کا ذکر فرماتے ہوئے کہا کہ یہ زبان دکن سے چلی (اس ضمن میں انہوں نے ولی دکنی وغیرہ کا بھی ذکر فرمایا) اور لکھنؤ میں سلجھا پڑھی یہ کسی غیر ملک سے چل کر یہاں نہیں آئی ہے یہیں پیدا ہوئی اور ہماری زبان ہے۔ اردو زبان جو ہماری زبان ہے محبت کی زبان ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اردو کے شاعروں کی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے صدر جمہوریۂ ہند نے فرمایا کہ شاعروں کی سرپرستی سرکاری طور پر ہونی چاہئے۔ صدر جمہوریہ ہند بہت اچھی طرح سے اردو لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں مگر پنجابی نژاد ہونے کے باعث ان کے پنجابی تلفظ پہ معترض ہونے والے حضرات کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے کہ خدا کا شکر کرو کہ ہمیں ایسا صدر ملا ہے جو اردو کا قدردان ہے جسے اردو لکھنا پڑھنا آتا ہے اور جسے اردو کے متعدد اشعار یاد ہیں۔ موصوف اپنی تقریر اردو میں لکھ کر لائے ہیں جسے سامعین نے بہت زیادہ پسند کیا۔ صدر جمہوریہ نے آخر میں فرمایا ساحر ہوشیارپوری صاحب، صدر بننے سے پہلے میں ہوشیارپوری تھا۔ اس پر ساحر صاحب کہنے لگے کہ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ ہوشیارپور کو بھولے نہیں ہیں۔

صدر جمہوریۂ ہند کی افتتاحی تقریر کے بعد مشاعرے کے صدر محترم جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب وزیر مملکت برائے ٹرانسپورٹ نے اپنی صدارتی تقریر میں فصاحت و بلاغت کے وہ بیش بہا نمونے پیش کئے کہ ہر لفظ پر سامعین نے پرزور تالیوں سے اظہار خوشنودی فرمایا۔

انجمن عروج ادب کے گزشتہ پانچ سالوں کے مشاعروں میں جو کلام شعرائے کرام نے سنایا اسے گلدستہ نام سے اردو اور ہندی میں الگ الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے جناب نفیس احمد صاحب نے اردو ایڈیشن اور جناب مہیش چندر جین نے ہندی ایڈیشن کے جملہ اخراجات ادا کئے ہیں۔ صدر جمہوریۂ ہند نے ان اردو و ہندی گلدستوں کو ریلیز فرمایا ہے۔ سلور جوبلی کے سلسلے میں یادگاری تمغے بنوائے گئے ہیں۔ سب سے پہلے صدر جمہوریہ ہند کو یہ تحفہ پیش کیا گیا اور اس کے بعد جناب انصاری صاحب کو یہ تحفہ پیش کیا گیا مابعد مجلہ موجود شعرائے کرام کو بھی یہ تحفے دئے گئے۔ انجمن عروج ادب کے وائس پریذیڈنٹ جناب بھٹناگر صاحب کو ان کی قابل تعریف کارکردگی پہ یادگاری ٹرافی صدر جمہوریۂ ہند کے مبارک ہاتھوں سے دی گئی ہے۔

جناب ساحر صاحب نے صدر مشاعرہ جناب انصاری صاحب سے التماس کیا ہے کہ وہ صدر جمہوریۂ ہند، شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا فرمائیں۔ انصاری صاحب مائیک پہ تشریف لا کر نہایت رواں دواں فرما رہے ہیں۔ آپ کا گرامی

نہیں میں نہ تو شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں کیوں کہ شکریہ تو آخری چیز ہے اور نہ ہی اس لئے کہ آپ اور شعرائے کرام کے درمیان دیوار بنوں۔ بلکہ یہ خوشگوار فریضہ ادا کرنے آیا ہوں جو آپ کی انجمن نے میرے سپرد کیا ہے۔ میں باقاعدہ مشاعرہ شروع کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ مشاعرہ ایک خصوصیت کا حامل ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے جشنِ آزادی سے متعلق ہے اور پھر اس کا افتتاح کرنے کے لئے ملک کی سب سے بڑی شخصیت بہ نفسِ نفیس تشریف فرما ہے۔ جس انجمن کی طرف سے یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے اسکی سلور جوبلی کا سال ہے۔ صدر انجمن نے ہم لوگوں کو بھی نوازا ہے جس کے لئے میں ان کا مشکور و گزار ہوں۔ کچھ روایات کو پیدا کرنے کے لئے ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صدر جمہوریہ ہند نے صحیح فرمایا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے یہ یہاں پیدا ہوئی اور جب تک ہندوستان ہے اس کے چپہ چپہ پر اردو کا پرتو رہے گا۔ یہ کسی ایک فرقہ یا مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں ہے۔ صاحبِ صدر نے دکھ کے ساتھ فرمایا کہ اردو کو وہ مقام نہیں ملا جو اس کا حق ہے۔ جب ہندوستان کی عظیم ترین ہستی کا یہ فرمان ہو تو پھر کون سا ہندوستانی ہے جو ان کی آواز میں آواز نہ ملائے گا۔ آج یہ بات پورے ہندوستان کی ہے۔ صدرِ جمہوریہ نے فرمایا ہے کہ اردو سے کسی زبان کو خطرہ نہیں ہے بلکہ اس نے سب زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمویا ہے۔

انصاری صاحب فرمانے لگے کہ صدر جمہوریہ کی کچھ مجبوریاں ہیں اس لئے وہ کچھ دیر بعد تشریف لے جائیں گے۔ بقول۔ اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے والا معاملہ ہے۔ اور یہ اجازت ہمیں بے دلی کے ساتھ دینی ہوگی۔ صاحب صدر کی تشریف آوری سے مشاعرہ کی شان بڑھ گئی لہذا میں ان کا شکریہ دل کی گہرائیوں سے کرتا ہوں اور ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے گزارش کر رہا ہوں کہ وہ مشاعرہ کی نظامت سنبھالتے ہوئے مشاعرے کی کارروائی شروع کریں۔ باقی حضرات کا شکریہ سننے اور سنانے کے بعد کروں گا۔ ساحر

حشمت یار پوری نے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب کی مناسب اور موزوں تعریف کرتے ہوئے انہیں مشاعرہ شروع کرانے کے لئے کہا ہے۔

ساڑھے نو بجے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد صاحب نے مشاعرہ کا آغاز سلیم کھاتولوی سے کیا ہے۔ سنئے سلیم صاحب مائیک پر کیا فرما رہے ہیں ؎

ذرا پہلے نہ پہچانی نگاہِ باغباں ہم نے
بہاروں کی خوشی میں پھونک ڈالا آشیاں ہم نے
سمجھنا چاہتے ہیں رہبروں کا ظرف کتنا ہے
ابھی خود کو بنا رکھا ہے گردِ کارواں ہم نے
زمانے بھر کی تاریکیوں کا قتلِ عام فرما کر
بڑی مشکل سے رنگیں کی ہے اپنی داستاں ہم نے
نہ جانے کب انہیں اپنی غرض دشمن بنا ڈالے
بہت کچھ کھو کے سمجھا ہے مزاجِ دوستاں ہم نے
چلی بادِ مخالف اور گل چینوں کی بن آئی
اگرچہ خون سے سینچا تھا سارا گلستاں ہم نے
تری خاطر ہمیں پاسِ وفا ملحوظ رکھنا تھا
ترے جورِ مسلسل پر نہ کی آہ و فغاں ہم نے
تمہاری آستینوں سے ہمارا خون پکارے گا
ابھی کیا ہے ابھی تو کاٹ رکھی ہے زباں ہم نے
جو تاریکی میں بھی پہچانتا ہو کوئے منزل کو
سلیم اس کو بنا رکھا ہے میرِ کارواں ہم نے

سلیم کھاتولوی کے کلام سے مشاعرہ کا آغاز خوشگوار انداز میں ہوا ہے۔ سلیم صاحب کو بہت ہی مناسب داد ملی ہے۔

اب اعلان ہوا ہے کہ نیدر لینڈ سے تشریف لائے ہوئے جناب شمیم جہانسوی سے کلام سنئے شمیم صاحب نے ایک قطعہ سنانے کے بعد غزل شروع کی ہے فرماتے ہیں ؎

پہلے زخموں سے مجھ کو سجا دیجئے
پھر مرے ہاتھ میں آئینہ دیجئے

میرے ہمراہ کھو جایئے آپ بھی
یا مجھے میرے گھر کا پتہ دیجئے

حال پوچھے مرا گر کوئی آپ سے
کچھ لکیریں بنا کر مٹا دیجئے

اب تو ہم آ گئے آپ کی قید میں
اب تو پنجرے کے پنچھی اُڑا دیجئے

پیکرِ غم کی جبیں پہ خراشیں نہ ہوں
کوئی چہرہ تو ایسا دکھا دیجئے

اس شعر پہ ہال داد و ستائش سے گونج اٹھا ہے اور شمیم صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ ملک زادہ صاحب فرما رہے ہیں کہ عقلمند آدمی جہاں جانے سے گھبراتا ہے احمق آدمی وہاں بے دھڑک گھس جاتا ہے لہٰذا مزاحیہ شاعر وہ بات بڑی آسانی سے کہہ جاتے ہیں جو عام شعرا نہیں کہہ سکتے جناب بھو نپو مظفر نگری اپنے کلام سے یہ بات ثابت کرنے کے لئے مائیک پر تشریف لا رہے ہیں۔ بھو نپو صاحب کا مزاح ملاحظہ فرمائیے ؎

ایک سانپ نے ایک نیتا کو ڈسا
نیتا کا کچھ بھی نہیں بگڑا اور سانپ چل بسا

ہنسی کا ایک ریلا ہے کہ جس میں ہمارے راشٹرپتی بھی بہہ گئے ہیں۔ بھو نپو نے دو تین بار یہی کچھ دہرانے کے بعد فرمایا ؎

جب اس کا کارن کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا

- - - - - - - - - - -

سانپ کے صرف پھن اور پونچھ میں زہر ہوتا ہے
مگر نیتا کے ہر حصۂ جسم میں زہر ہوتا ہے

اس میں شک نہیں کہ یہاں تک تو بھو نپو صاحب نے ایوانِ غالب کو قہقہوں میں ڈبو دیا ہے مگر اس کے بعد وہ لائن سے اُتر گئے ہیں اور واہی تباہی بکنے لگے ہیں۔ بھو نپو ہندی کے کوی ہیں اس لئے وہ اُردو مشاعرے کے رکھ رکھاؤ سے ناواقف ہیں ملک زادہ صاحب نے بہت بڑی غلطی کی کہ راشٹرپتی صاحب کی موجودگی میں بھو نپو کو پڑھوایا۔ انجمن عروجِ ادب کی مشاعرہ کمیٹی کو چاہیے کہ آئندہ اس قسم کے شعرا کو نہ بلائیں۔

دس بجے راشٹرپتی جی تشریف لے جا رہے ہیں لہٰذا جملہ منتظمین مشاعرہ کسی طرح سے راشٹرپتی کے ساتھ تصویر کھینچوانے والے شائقین، راشٹرپتی سے مصافحہ کی عزت حاصل کرنے والے حضرات وغیرہ راشٹرپتی کو رخصت کرنے گئے ہیں اور اسٹیج قریب قریب خالی ہو گیا ہے سامعین کی اگلی دو صفیں بھی خالی ہو گئی ہیں۔ قریباً دس منٹ کے بعد باہر جانے والوں کی اکثریت واپس ہال میں آ گئی ہے اور ملک زادہ صاحب پھر سے مشاعرہ کا ماحول پیدا کرنے میں منہمک ہیں۔ راشٹرپتی صاحب کے تشریف لے جانے کے باعث یہ جو دس بارہ منٹ کا گیپ آ گیا ہے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ بھو نپو صاحب نے مشاعرہ کی فضا میں جو "ارتعاش" پیدا کر دیا تھا وہ جاتا رہا ہے جناب ملک زادہ صاحب نے حبیب عاصم دہلوی کو مائیک پر تشریف لانے کی دعوت دی ہے۔ عاصم صاحب نے ایک قطعہ سنانے کے بعد غزل شروع کی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ اور بات ہے کہ مدت سے سامنا نہ ہوا
مگر خیال تمہارا کبھی جدا نہ ہوا

وہ کیا بتائے کہ مفہوم زندگی کیا ہے
جو شخص دردِ محبت سے آشنا نہ ہوا

ہماری یاد میں بیٹھا نہ ہو اداس کوئی
یہ سوچ کر کبھی ہنسنے کا حوصلہ نہ ہوا

اس شعر پہ داد سخن فہمی کے انداز والی تھی۔ عاصم فرما رہے ہیں ؎

چلے ہیں شہر میں سڑکوں کو اپنا خون دے کر
وہ دن بتاؤ کہ جب کوئی حادثہ نہ ہوا

یوں ہی اداس گزارو گے زندگی عاصم

ایک آواز آئی ہے انشاءاللہ جس پر قہقہہ پڑا ہے۔ ملک زادہ فرما رہے ہیں کہ عربی سے انہیں واقفیت ہے خطرہ تھا کہ کہیں آمین نہ کہہ دیں، عاصم صاحب نغمہ سرا ہیں

؎ یوں ہی اداس گزارو گے زندگی عاصم
کہیں جو ختم ہے یادوں کا سلسلہ نہ ہوا

اب نظر ایٹوی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ وہ اگ پہاڑی میں فنکارانہ مظاہرہ فرما رہے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

تیرے لئے زحمت ہے میرے لئے نذرانہ
جگنو کی طرح آنا خوشبو کی طرح جانا

موسم نے پرندوں کو یہ بات بتا دی ہے
اس جھیل پہ خطرہ ہے اس جھیل پہ مت جانا

اس شعر پر مناسب انداز میں داد دی گئی ہے اور نظر صاحب یوں نغمہ سرا ہیں ؎

چہرے کے نقوش اتنے صدموں نے بدل ڈالے
لوگوں نے مجھے میری آواز سے پہچانا

داد ہے کہ اس شعر کا حق ہے اس کے بعد نظر صاحب نے دو اشعار اور سُنائے ہیں جنہیں اگر آپ سُن لیں گے تو اس شعر کا مزہ بھی کرکرا ہو جائے گا۔ اس بار منتظمین نے مُلک کے کچھ ایسے اُبھرتے ہوئے شعراء کو بھی مدعو کیا ہے جنہوں نے اپنا مقام خود بنایا ہے مگر افسوس ہے کہ ملک زادہ صاحب کو ایسے شعرا کے بارے میں پوری واقفیت بہم نہیں پہنچائی گئی ہے لہٰذا اس ضمن میں انہوں نے مُلک کے مشہور نوجوان شاعر جناب ش۔ ک۔ نظام کو کلام سُنانے کی دعوت یہ کہتے ہوئے دی ہے کہ رفعت سروش صاحب کا یہ کہنا ہے کہ نظام صاحب اُردو شاعری کے لئے ایک نیک فال ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام صاحب کا کلام "اوراق" اور اس قسم کے دیگر پاکستانی جریدوں میں ایک مدت سے شائع ہو رہا ہے۔ نظام صاحب دہلی کے مشاعرہ میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا سامعین بھی ان سے ناواقف اور اناؤنسر بھی بیگانہ۔ بہرکیف نظام صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں انہوں نے کچھ متفرق اشعار سُنائے جن پر انہیں داد بھی ملی اور سامعین کو یہ احساس بھی ہوا کہ یہ شاعر واقعی اپنا مقام بنا چکا ہے۔ نظام صاحب نے ایک نظم سُنائی ہے جو قدرے جدیدیت کی آئینہ دار تھی اور دہلی کے باذوق حضرات ہمیشہ غزل کے دلدادہ رہے ہیں۔ اب ملک زادہ فرما رہے ہیں کہ مشاعرہ میں دو شاعرات بھی موجود ہیں جنہیں آپ کو داد دینی ہوگی کیوں کہ اہل دہلی نے ہمیشہ شاعرات کی عزت کی ہے اور انہیں داد سے نوازا ہے۔ یقین ہے کہ آپ حضرات داد میں کمی نہ آنے دیں گے اس پر انشاءاللہ کا آوازہ کسنے والے صاحب بول اٹھے داد نہ ہوگی کھجلی ہوگی۔ اس بے تُکے پن پر کچھ حضرات نے قہقہے لگائے، مگر ذوقِ سلیم دم سادھے خاموش تھا کہ ملک زادہ صاحب خشمگیں انداز میں ان صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ پہلے جملے پر تو آپ کو دلچسپ فقرہ کسنے پر داد دی گئی تھی مگر اب کی مرتبہ آپ نے اپنی خاندانی پہچان کرائی ہے اور اپنے اس جملے سے آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ کیا ہیں اور کس ماحول میں آپ کی پرورش ہوئی ہے۔ ملک زادہ کی اس صاف گوئی پر ان صاحب کی اور ان کے حواریوں کی اخلاقی موت کا سا یہ ان حضرات پر ایسے مہیب انداز میں اثر انداز ہوا کہ پھر اس طائفہ کی آواز نہیں سُنائی دی۔

ملک زادہ صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ ہمارا شہر تشریف لانے والی محترمہ شاہین ظفر اورنگ آبادی مائیک پر تشریف فرما ہو رہی ہیں۔ سنئے شاہین ظفر بڑے اچھے ترنم میں مطلع ارشاد فرما رہی ہیں ؎

گم ہو رہا ہوں میں ہوتے پھر انہیں پانا کیسا
جن کی منزل ہی نہ ہو ان کا ٹھکانا کیسا

مطلع داد کا حق دار ہے اور یہ حق اسے مناسب طور پر عطا اب عطا ہوا ہے ؎

راز دل کا یونہی کھلتا ہے تو کھل جانے دو
اشک آنکھوں میں جب آئیں تو چھپانا کیسا

یہ شعر بھی داد کا مستحق ہے اور سامعین نے جی کھول کر داد دی ہے۔

نکہت لکھنوی صاحبہ میرے قریب ہی تشریف فرما ہیں میں نے ان سے کہا کہ اس شاعرہ کو میں نے پہلی بار سُنا ہے اچھا کہتی ہیں۔ فرمانے لگیں واہ سرور صاحب واہ آپ بھی اچھے ایڈیٹر ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ اس شاعرہ کو آپ نے پہلی مرتبہ سُنا۔ ابھی پچھلے ہی ہفتہ تو یہ مودی والے مشاعرہ میں بھی آئیں تھیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ ملک زادہ جس مشاعرہ کے اناؤنسر ہوں گے اس مشاعرہ میں شاہین ظفر ضرور ہوں گی۔ دیکھا تو شاہین ظفر نغمہ سرا تھیں ؎

ساتھ کچھ دُور چلیں راہ میں پھر چھوڑ گئیں
زندگی نے بھی کیا ہم سے بہانا کیسا

یہ شعر خاصا کمزور ہے ہو سکتا ہے کہ پہلا مصرع یوں ہو
ع ساتھ کچھ دُور چلی راہ میں پھر چھوڑ گئی۔ مگر محترمہ نے دُور
چلیں اور چھوڑ گئیں پڑھا ہے ہو سکتا ہے دکنی لب و لہجہ
کے باعث ایسا سُنا گیا ہو مگر ٹیپ سُننے پر بھی یہی سُنا گیا
ع ساتھ کچھ دُور چلیں راہ میں پھر چھوڑ گئیں۔ اب فرما
رہی ہیں ؎

آگ کو پھول سمجھ بیٹھے تھے نادانی سے
اب سُلگ جلنے دو دامن کو بچا نا کیسا

یہ شعر بھی خاصی داد پا گیا۔ مقطع بھی سُن لیجئے ؎

ہم تو شاہین سُنا دیتے ہیں اپنے دل کی
کیا پتہ گیت ہے کیا اور ترانا کیسا

سامعین نے ایک غزل اور سُنانے کا مُطالبہ کیا ہے تو عقیل
ناروی صاحب نے بہ آوازِ بلند ایک مخصوص گیت کی فرمائش
کی ہے۔ لیجئے شاہین صاحبہ یہ گیت مرحمت فرما رہی ہیں
صرف پہلے دو اشعار ہی پر اکتفا فرمائیے کیوں کہ گیت
عام طور پر سُننے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ فرماتی ہیں ؎

ہم بنجارے شام سکارے چلتے چلتے ہارے
جیوں جیسے پھول بھلیاں اس کے رستے سارے
اُڑتا بادل بہتا پانی چیز نہیں آنی جانی
بن کر رہ جاتی ہیں یادیں کچھ سُہانی

ہم تو عقیل ناروی کو سخن فہم اور سخن شناس سمجھتے ہیں مگر
نہ معلوم انہوں نے اس معمولی سے گیت کی فرمائش کیسے کر دی
اگر محترمہ کی خوشنودی حاصل کرنا مقصد تھا تو دوسری بات
ہے ورنہ یہ گیت ایسا نہ تھا کہ جس کے لئے خصوصی فرمائش
کی جاتی۔ ملک زادہ صاحب فرما رہے ہیں کہ ارضِ دکن سے
سلسلہ شروع ہوا ہے تو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ حیدر آباد
کے ایک معتبر شاعر جناب بوگس حیدر آبادی مائیک پر
تشریف لائیں اور اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں۔ بوگس
حیدر آبادی مائیک پر تشریف لائے تو انہوں نے حسبِ سابق
غالب کی غزل کی پیروڈی سنائی ہے۔ پہلا مصرع ان کا
اپنا ہوتا ہے جسے یہ تحت میں پڑھتے ہیں اور دوسرا مصرع
حضرت غالب کا ہوتا ہے جسے یہ ترنم سے پڑھتے ہیں۔ اچھا خاصا
سماں باندھ دیتے ہیں۔ داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ ایک
غزل کے بعد دوسری غزل سُنانے کا بڑا پُرزور مطالبہ
ہوا ہے۔ چنانچہ دوسری غزل بھی غالب کی پیروڈی میں
سُنائی ہے۔ بوگس صاحب کا کلام سُننے میں اس قدر محو رہا
کہ ایک بھی شعر نقل نہ کیا جا سکا۔ ویسے بوگس صاحب
نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ دفتر شانِ ہند میں تشریف لائیں
گے اور وہ اپنے کلام کی نقل دے جائیں گے۔ مگر اب یہ وبا
حیدر آباد کے شعراء میں بھی پھیل گئی ہے کہ وعدہ ایفائی
شعراء کے لئے جُرم ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بوگس
صاحب نے پیروڈی میں غالب کا احترام ہر انداز میں
روا رکھا ہے۔ اعلان ہوا ہے کہ اب جناب حق کانپوری
مائیک پر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ سُنئے حق صاحب
نغمہ ریز ہیں ؎

کیوں مرے مُقدر پہ آپ ہاتھ ملتے ہیں
کچھ چراغ ایسے ہیں بجھتے ہیں نہ جلتے ہیں
حسن و عشق دونوں ہی ساتھ ساتھ چلتے ہیں
پتھروں کی نگری میں آئینے بھی ڈھلتے ہیں
ہم نے اب یہ سوچا ہے ذہنیت کو بدلیں گے
وقت کب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں

ترنم ہے کہ ہر سر اس کے زیر و بم پر ہل رہا ہے مگر داد ہے کہ
دُور دُور تک نظر نہیں آ رہی اور حق صاحب ہیں کہ داد
حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں ؎

دلبری توجہ سے مطمئن تو ہے لیکن
یہ ہماری فطرت ہے ڈھونڈنے نکلتے ہیں
آئینوں کی محفل میں قدر کیا نگاہوں کی
ریشمی اشاروں کے رُخ کہیں بدلتے ہیں

غضب ہے اتنا اچھا فنکارانہ ترنم اور سامعین ہیں کہ
داد دینے میں بخل سے کام لے رہے ہیں اس بے اعتنا
پر حق صاحب فرمانے لگے آپ سامعین کی طرف سے ڈاکٹر
بشیر بدر کی نذر مقطع کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

ہم تو خود بھی پریشاں ہیں ان حسین چہروں سے
آپ کچھ بھی کر گزریں یہ کہیں پگھلتے ہیں

اس پر ملک زادہ صاحب نے چٹکی لی ہے کہ ڈاکٹر بشیر بدر لٹریچر کے ڈاکٹر ہیں۔ میڈیکل ڈاکٹر نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر بشیر بدر کے پاس اس کا علاج نہیں حق صاحب کو کسی اور سے رجوع کرنا ہوگا۔

مجھ سے ملحق ایک صاحب تشریف فرما ہیں ان کا سفاری سوٹ بارش میں شرابور ہو چکا ہے اور وہ مجھ سے بارہا ہم کلام ہو چکے ہیں مگر افسوس ہے کہ میں انہیں پہچانتا نہیں مگر وہ مجھ سے جس انداز سے گفتگو فرما رہے ہیں وہ غمازی کر رہا ہے کہ وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اب جو ملک زادہ صاحب نے اعلان فرمایا کہ مرادآباد کے جناب گوہر عثمانی مائیک پر آ رہے ہیں تو یہ بری طرح سے بھیگے ہوئے لباس والے صاحب اٹھے اور مائیک کے سامنے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اپنی یادداشت پر افسوس ہوا کہ گوہر صاحب کو نہ پہچان سکا۔ ویسے انہیں دیکھے بھی پندرہ سولہ سال ہو گئے ہیں۔ سنئے گوہر عثمانی فرما رہے ہیں کہ ایک شعر سنئے ؎

یہ جہاں ہے اک تماشا کوئی دوست ہے نہ دشمن
وہی آگ روشنی دے وہی آشیاں جلا دے

گوہر عثمانی صاحب دہلی کے کسی مشاعرے میں نہیں تو اس انجمن کے مشاعرے میں یقیناً پہلی بار شریک ہو رہے ہیں فرما رہے ایک تنہا شعر عرض کر رہا ہوں ؎

یہ یقیناً کسی معصوم کا قاتل ہوگا
ہم نے اس شخص کو ہنستے ہوئے کم دیکھا ہے

داد ہے کہ اس شعر کا حق بھی ہے اور سننے والوں کے ذوقِ سلیم کا تقاضا بھی۔ گوہر صاحب کہنے لگے کہ اب دو شعر اور سنئے ؎

یوں بھی پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے
ٹھوکر لگی کسی کو سنبھلنا پڑا مجھے
وہ دوست جن میں بوئے وفا نام کو نہ تھی
کچھ دور ان کے ساتھ بھی چلنا پڑا مجھے

داد کی آوازیں بدستور آ رہی ہیں اور گوہر صاحب ایک اور شعر عنایت فرما رہے ہیں ؎

ترا خیال بھی پرچھائیں ہے تری شاید
نہ مجھ سے دور رہے ہے نہ میرے پاس آئے ہے

ان کا ایک شعر اور سنئے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ دل ہے سنگ سمجھ کر نہ توڑیئے اس کو
یہ آئینہ تو نگاہوں کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے

گوہر صاحب اپنے گوہر یکتا ہونے کا سکہ بٹھا چکے ہیں لہٰذا اب غزل شروع کر رہے ہیں۔ مطلع عطا ہوا ہے ؎

عظمتِ اہلِ وفا اور بڑھا دیتا ہے
غم مسلسل ہو تو پھر غم بھی مزا دیتا ہے

داد تو اس مطلع کے سامنے ہاتھ باندھے کورنش بجا لائی ہے سنئے گوہر صاحب کیا غضب ڈھا رہے ہیں۔ داد کی تفصیل میں جاؤں گا تو اشعار کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔ اس لئے غزل کے باقی اشعار سماعت فرمایئے داد تو آپ خود بھی دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دل دھڑکتا ہے تو پہروں نہیں سونے دیتا
نیند آتی ہے تو احساس جگا دیتا ہے
تم نے شاید کبھی اس بات کو سوچا ہوگا
وقت ہاتھوں کی لکیریں بھی مٹا دیتا ہے
اپنے کردار پہ موجوں کو بھی شرم آتی ہے
جب کوئی ڈوب کے ساحل کا پتا دیتا ہے
غم کی توفیق بھی سب کو نہیں ملتی گوہر
یہ وہ نعمت ہے جو مشکل سے خدا دیتا ہے

اس داد کا کیا جواب ہے کہ جملہ سامعین کھڑے ہو گئے ہیں اور پرزور مطالبہ کر رہے ہیں کہ گوہر عثمانی کو ابھی مائیک سے ہٹنے نہ دیا جاتے۔ گوہر عثمانی صاحب سے ملک زادہ صاحب نے پھر التجا کی ہے کہ وہ دوبارہ مائیک پر تشریف لائیں۔ گوہر عثمانی مائیک پر دوبارہ تشریف لے آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہ مشاعرہ جشنِ آزادی کے سلسلے میں ہے لہٰذا اس موضوع پر ایک نظم پیش کر رہا ہوں۔ آپ نے میرے متفرق اشعار اور غزل پر جس کرم فرمائی کا

ثبوت دیا ہے یقین فرمایئے یہ نظم سن کر آپ مایوس نہ ہوں گے۔

واقعی اعتراف کرنا پڑا کہ گوہر عثمانی کی نظم اپنا جواب آپ تھی۔ میں نے خود نظم کو سننے پر ہی اکتفا کیا ہے کیوں کہ ایک تو گوہر عثمانی رواں دواں نظم پڑھ رہے ہیں اس پر یہ عالم کہ ہر مصرع اور ہر شعر سامعین کی سخن فہمانہ داد کے شور میں گم ہو جاتا ہے لہذا نظم کو نقل کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ جشن آزادی کے عنوان سے ہم آہنگ ہو کر گوہر صاحب نے نظم سنائی ہے اور آج کے مشاعرہ میں اب تک سنے گئے کلام میں گوہر عثمانی کا کلام یقیناً حاصل مشاعرہ کہا جا سکتا ہے۔

ملک زادہ صاحب اعلان فرما رہے ہیں کہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ساغر خیامی مائیک پر آ رہے ہیں۔ ساغر خیامی فرما رہے ہیں ؎

خالص غذا ہے اور نہ اصلی شراب ہے
خالص ہے حسن اور نہ اصلی شباب ہے
ہمدردیوں میں بھی تو ملاوٹ جناب ہے
یہ زندگی نہیں ہے مسلسل عذاب ہے

داد کا فقدان پایا تو مزاح بازاری پن پر اتر آیا سنیئے ساغر خیامی اپنے "خالص پن" کا کیا اچھا ثبوت دے رہے ہیں ؎

گھوڑے کی لید دھنیئے میں بیچے ملائیں گے
وہ دن نہیں ہے دور کہ ہم ہنہنائیں گے

میاں جب گھر میں ہنہناؤ گے تو گھر کی بیبیوں پر کیا گزرے گی ابھی تو ساغر خیامی صاحب جواہر لعل یونیورسٹی میں رہتے تھا تو ان کا یہ حال ہے اگر ان کی رہائش کہیں جی۔ بی روڈ کے آس پاس ہوتی تو نہ معلوم کیا کر گزرتے۔ ساغر خیامی اگلا شعر بھول گئے ہیں اس لئے بار بار گھوڑے کی لید اور ہنہنانے والا شعر دہرا رہے ہیں اس پر ملک زادہ فرمانے لگے ملاوٹ کی غذا کھانے پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد ساغر صاحب فرمانے لگے ؎

یوں پھنس گیا ہے آدمی ڈسکو کے دام میں
ڈسکو کی شے ہے حفظِ مراتب کے نام میں
تبدیلیاں یہ آئیں گی اک روز دوستو
ڈسکو کریں گے باپ کو بیٹے سلام میں

"ایشیاڈ" پر کرم فرمائی کی ہے ؎

کنٹرول کر رہی ہیں ٹریفک کا لڑکیاں
تعداد حادثات کی کچھ اور بڑھ گئی
حالت خراب ہو گئی ہر راہ گیر کی
اک بس سنا ہے تیسری منزل پہ چڑھ گئی

اس کے بعد ساغر خیامی نے "دلی کی بس" نظم سنائی ہے جن حضرات نے پاکستان کے سید جعفری (مرحوم) کی کراچی کی بس نظم سن یا پڑھ رکھی ہے وہ ساغر خیامی کی اس نقل پر سوائے یہ کہنے کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ نقل را باید چہ عقل۔ مگر ساغر خیامی نے تو نقل کرنے میں بھی بھدے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ قبلہ حضرت ساغر نظامی صاحب نے فرمایا تھا کہ ساغر خیامی ایک اچھے مزاحیہ شاعر ہیں لہذا اگر کہیں موقع ہو تو انہیں ضرور بلوایا کیجئے لہذا پالی راجستھان کے مشاعرہ کے لئے انہیں تلاش بھی کیا گیا مگر افسوس ہے کہ ساغر نظامی نے نہ معلوم ساغر خیامی کی بابت ایسی اچھی رائے کیوں کر قائم کر لی۔ جب کہ ان کے نزدیک ہنہنانا "مزاح" ہے۔

جناب ملک زادہ صاحب فرما رہے ہیں کہ جو شاعرات یہاں آئی ہیں وہ اپنے اشعار سناتی ہیں اور اس کے ساتھ نسیم نکہت لکھنوی کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ نسیم نکہت لکھنوی مائیک پر آ گئی ہیں اور تحت میں غزل سنا رہی ہیں

زندگی اب نئے افکار تک آ پہنچی ہے
کشتی چھوڑ کے تلوار تک آ پہنچی ہے
وہ جو مریم تھی کبھی سر بھی نہ کھولا جس نے
آج پازیب کی جھنکار تک آ پہنچی ہے
یا خدا چھین لے مجھ سے مری شہرت ورنہ
بات بڑھ کر مرے کردار تک آ پہنچی ہے
آج یوسف ہے خریداروں کی صف میں نکہت
اور زلیخا ہے کہ بازار تک آ پہنچی ہے

توصیف علوی عاصی کیرانوی

آتشؔ بہاولپوری اور "نذرِ اقبال"

آتشؔ صاحب کی سب سے نمایاں اور امتیازی خصوصیت ان کی شاعرانہ بلند خیالی وسعتِ نظری، نادر الکلامی اور آتش بیانی ہے ان کے کلام میں بے پناہ ہمہ گیری، بلاغت اور بلا کا جوش اور جذبہ موجود ہے۔ ان کا شمار آج کے بہترین بلیغ اور خوش فکر شعراء میں ہوتا ہے ان کو اردو زبان و ادب سے بے حد دلی محبت اور رغبت ہے۔ انہوں نے اردو ادب اور شعر و فن کی "شمع" کو ہریانہ پنجاب اور دہلی کے ادبی اور علمی حلقوں میں نہایت ذوق شوق سے روشن کر رکھا ہے۔ آپ ہریانہ انجمن ترقی اردو کی روحِ رواں اور اس کے پُرجوش سالار کارواں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان ہی کے دَم سے یہ ادارہ اس ریاست میں نہایت کلیدی اور فعال کردار ادا کر رہا ہے اور بجا طور پر اس کی سرگرمیاں دوسری ریاستوں کے لئے قابلِ تقلید اور مشعلِ راہ ہیں۔

آتشؔ بہاولپوری کی ادبی خدمات اور کارناموں کے سلسلہ میں حال ہی میں ان کی ایک گراں قدر اور بیش بہا تخلیق "نذرِ اقبال" سامنے آئی ہے یہ ان کا وہ ادبی اور فکری شاہکار ہے اور اردو ادب کے لئے وہ بیش قیمت عطیہ ہے جس پر اردو حلقے اور علمی دنیا بجا طور پر ہمیشہ ہمیشہ فخر کریں گے اور خراجِ تحسین ادا کرتے رہیں گے۔ "نذرِ اقبال" میں آتشؔ نے علامہ اقبال کے کچھ اعلیٰ اور چیدہ شعری گوہر پاروں کو تضمین کیا ہے ان میں ۶۶ شعر ان کی کلیات سے منتخب کئے ہیں اور ۹ شعر ان کے قومی "ترانۂ ہندی" کے وہ مایۂ ناز ترانے ہیں جنہیں ہماری قومی نظمیات کے گوہر پارے کہا جا سکتا ہے اس طرح آتشؔ صاحب کی یہ کاوش علامہ اقبال کے پچھتر شعروں کی بہترین تضمین اور اعلیٰ فکری تخلیق ہے۔

جہاں تک تضمین کا تعلق ہے وہ ہماری اردو شاعری کی ایک اہم "صنف" اور نہایت ہی سخت اور سنگلاخ زمین ہے۔ اس میں ایک شاعر کو کسی دوسرے شاعر کے بلند پایہ شعروں اور مصرعوں پر مصرعے لگانا اور شاعرانہ گلکاری کرنا پڑتا ہے بظاہر یہ کام آسان اور بچوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ دیکھا جائے تو یہ ایک "سہل ممتنع" ہے۔ تضمین کا مطلب کسی دوسرے شاعر کے شعروں اور مصرعوں پر پیوند یا قلم لگانا اور مصرعے ٹانکنا نہیں ہے بلکہ کچھ مفکرین اسے نئی اصطلاح میں شاعرانہ ویلڈنگ کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس موجودہ اصطلاح سے بھی تضمین کی پوری تشریح و تعریف نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ "ویلڈنگ" کے عمل میں بھی کسی نہ کسی حد تک نشان اور ایک جوڑ کی علامت باقی رہتی ہے جو تضمین کی صحت و صفائی کے منافی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تضمین شعر و سخن اور فکر و فن کی ایک ایسی یکجہتی اور ہم رنگی ہے کہ جس کے ذریعہ ایک شاعر اصل شاعر کے اسلوبِ فکر اندازِ بیاں، تخیل کی پرواز، جذبات اور احساسات میں پوری طرح ڈوب کر اس کے شعروں پر اپنے مصرعے اس طرح پیوست کرتا ہے کہ "اصل و نقل" اور "حقیقت و مجاز" میں کوئی فرق اور امتیاز باقی نہیں رہتا اور پورا تضمینی شعر اور بند "یکجان اور یک رنگ" ہو جاتا ہے۔

تضمین کا مقصد دراصل "جوڑ بندی" یا "ٹانکہ بندی" نہیں۔ اس کے کئی دوسرے ادبی اور علمی مقاصد بھی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ تضمین سے اصل شاعر کے مفہوم اور مضمون کو مزید بلاغت اور وسعت ملتی ہے اور اس سے اصل شعر کا مفہوم کہیں زیادہ وسیع اور بلیغ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تضمین سے اصل شعر کے وہ گوشے اور پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جو اصل شاعر کے یہاں تشنہ اور وضاحت طلب سے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی تضمین اصل شعر کے لئے "تتمہ اور تکملہ" کا کام بھی کرتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ تراشے ہوئے مصرعے کچھ مزید شاعرانہ "رمز و کنایات" سے "اوریجنل شعر" کو مکمل اور مجلی بنا دیتے ہیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تضمین سے اصل شعر کا حسن اور جمال مزید نکھر جاتا ہے اور اس میں ایک نئی جاذبیت اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

بہرحال آتش بہادر پوری صاحب نے علامہ اقبال کے منتخب شعروں کو "نذر اقبال" میں تضمین کرکے ادبی دنیا میں ایک نہایت قابل داد اور لائق ستائش معرکہ انجام دیا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ علامہ اقبال ایک بہت بڑے مفکر، فلسفی اور اہل قلم شاعر ہیں ان کے شعروں کو گویا "ہما کارے دارد" ہے کجا یہ کہ ان کو تضمین کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے شعروں پر تضمین بجا طور پر وادیٔ فکر و سخن میں جوئے شیر لانے اور ستاروں پر کمند ڈالنے سے کم نہیں۔ لیکن آتش کا ذوقِ سخن اور مذاقِ فکر واقعی قابل ستائش و تحسین ہے کہ وہ اس فکری معرکہ اور علمی مجاہدہ میں پورے اترتے ہیں اور انہوں نے اس سخت ترین منزل و مرحلہ کو نہایت حسن و خوبی اور فاتحانہ انداز سے سر کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے اصل شعروں پر تضمین کے تین تین مصرعے تراشے ہیں جو لفظی، معنوی اور فکری اعتبارات اور ہر پہلو سے اقبال کے رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے اور ڈوبے ہوتے ہیں۔ تضمین کے سبھی مصرعے ہر اصل شعر سے کچھ اس طرح پیوست اور ہم رنگ نظر آتے ہیں کہ کہیں کسی "جھول" اور "جوڑ" کا احساس تک نہیں ہوتا اور یہی تضمین کی اصل خوبی ہے۔ مزید برآں ہر بند سے تضمین کی دوسری خوبیاں اور صفات بھی صاف صاف واضح ہوتی ہیں کہیں تضمینی تراشوں سے اصل شعر کا حسن و جمال نکھر رہا ہے تو کہیں تضمین کے مصرعے اصل شعر کی تکمیل و وضاحت کر رہے کسی بند میں تضمین کے مصرعوں سے اصل شعر کو مزید وسعت اور بلاغت ملا ہے تو کسی بند میں تضمین سے اصل شعر کے کچھ چھپے ہوئے گوشے اور پہلو نمایاں اور روشن ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں "نذر اقبال" کا ہر بند ان حقائق کا بجا طور پر شاہد اور نمونہ ہے اس ضمن میں چند گوہر پارے پیش ہیں۔

"نذر اقبال" کے اس بند کو دیکھئے کہ اس میں اقبال کے اصل شعر سے تضمین کے تینوں مصرعے کتنے ہم رنگ اور ہم فکر ہیں اور ساتھ ہی ان سے اصل شعر کو مزید وسعت اور بلاغت مل رہی ہے اور ایک نیا حسن و نکھار پیدا ہو گیا ہے۔

فلک اساس بنا کر خود آگہی دے کر
نگاہِ شوق کو تنویرِ عاشقی دے کر
تمام عالمِ امکاں پہ برتری دے کر
عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

اسی طرح اس بند میں تضمین کے تراشے اور مصرعے اوریجنل شعر کے کچھ پوشیدہ طور پر چھپے ہوئے گوشوں کو نہایت ہی حسن و خوبی کے ساتھ نمایاں کر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مفہوم کی وضاحت اور تصریح کے لئے ان گوشوں اور پہلوؤں کی صراحت ضروری ہے۔

زمیں کے ذرہ ذرہ کو تیری تنویر ضو بخشے
فلک پہ بھی ہوں تیری عظمت و توقیر کے چرچے
وقارِ آدمی ہو اور بھی اونچا تیرے دم سے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ترانۂ ہندی کا یہ شعر جس میں اقبال نے مذہبی رواداری

اور باہمی اخوت کا ایک عظیم پیغام دیا ہے کچھ ایسے گوشوں
اور واضح قدروں کے لئے تشنہ سا معلوم ہوتا ہے جو اصل
مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زندگی میں عملی طور سے ضروری
ہیں ان کی تکمیل اور تشریح آتش نے اس طرح کی ہے۔

نفرت کی وادیوں میں ہرگز نہ پیر رکھنا
دل میں نہ امتیازِ کعبہ و دیر رکھنا
ہر دین کا ہے مسلک بنیادِ خیر رکھنا
"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

"نذرِ اقبال" کا یہ بند بھی تضمین کی وہ بیش بہا شان ہے جس میں تضمین کے مصرعوں نے اصل شعر کے حسن و جاذبیت کو مزید چار چاند لگائے اور اس میں ایک نئی دلکشی اور خوبی پیدا کی ہے جو کہ صحیح معنوں میں تضمین کی اصل خوبی اور صفت ہے۔

دیکھ لے غافل نہ کر پامال باغِ زندگی
کیف سے خالی نہ ہونے دے ایاغِ زندگی
اپنے خونِ دل سے روشن کر چراغِ زندگی
"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن"

بہرحال آتش بہاولپوری کی یہ تخلیق اور فکری کاوش ان کے ذوقِ شعر و سخن اور مذاقِ فکر و فن کا ایک بہترین شاہکار ہے جو صحیح معنوں میں اردو ادب کے لئے ایک "بے بہا تحفہ" اور اردو دنیا اور علمی حلقوں کو ایک گرانقدر اور عظیم فکری دین ہے جسے ہمیشہ ہمیشہ قدر اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اور تشنگانِ علم و ادب اس سے رہتی دنیا تک سیراب و فیضیاب ہوتے رہیں گے میرا یہ بند بھی خراجِ عقیدت کے طور پر ایک قلمی نذرانہ ہے۔

ذوقِ آتش کی بلند شوخ بیانی کہئے
شعر اور فن کی گراں قدر نشانی کہئے
"نذرِ اقبال"۔۔۔۔ عاصی ہے وہ تخیل کا کمال
فکرِ اقبال کی جس کو ترجمانی کہئے

• • • • • • • • • • •

ڈرائیور

ذکیہ صدیقی

اُف — سات بج گئے۔ بہت دیر ہوگئی۔ آج آنکھ ہی نہیں کھلی، بچوں کو اسکول کالج چھوڑنے جانا ہے، تھکن سے چور چور ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی کچھ دیر بستر ہی پر آرام کیا جائے مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے بچوں کو دیر ہو جائے گی۔
میں ایک ڈرائیور ہوں۔ جسم کی تھکن ہو یا دماغ کی لیکن مجھے مستعد رہنا ہے اگر میں نے کسی دن آرام کر لیا تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پہلے بڑی بیٹی کو کالج چھوڑنا ہے پھر دوسری بیٹی کو دوسرے کالج پھر بقیہ دو کو اسکول۔ وقت پر گاڑی گھر لے جانی ہے ورنہ صاحب کو آفس میں دیر ہو جائے گی ان کو آفس چھوڑ کر بینک جانا ہے کپڑے ڈرائی کلین کے لئے دینا ہے چھوٹی بیٹی کا دوپٹہ ڈائی کروانے کو دینا ہے صاحب کی دوا لینی ہے ساڑھے بارہ بجے ایک کالج جانا ہے ڈیڑھ بجے اسکول پھر صاحب کھانا کھانے گھر آئیں گے کھانے کے بعد صاحب کو ڈھائی بجے آفس چھوڑنا اور ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ساڑھے تین بجے نیلما بیٹی کو کالج سے لینا ساڑھے چار بجے صاحب کو گھر لانا چھ بجے صاحب کے ساتھ باہر جانا۔
یہ ایک دن کی ہی بات نہیں ہے روز ہی ڈیوٹی ہے۔
یوں ہی صبح شام گزرتے ہیں اور آج کیا ہوا صبح بڑی بیٹی شبنم کے کالج کے پاس انتشار تھا کہ ٹریفک رک گیا سب گاڑیاں ایک دوسرے کو دھکا دے کر نکل جانا چاہتی تھیں اور اسی چکر میں ایک گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا گئی گو کہ ایکسیڈنٹ بڑا نہیں تھا کسی کو چوٹ نہیں آئی لیکن گاڑی ضرور پچک گئی لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا بات رفع دفع ہونے میں کچھ دیر لگی اور بھاگم بھاگ دوسری بچیوں کو ان کے کالج اسکول چھوڑا لیکن وہ لیٹ ہی ہوگئیں ان پر ضرو ڈانٹ پڑی ہوگی گھر آ کر دیکھا تو صاحب انتظار میں ٹہل ٹہل کر ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے ان کو آفس چھوڑ کر ورکشاپ کا رخ کیا وہ تین گھنٹے تو گاڑی کی مرمت میں لگے ورکشاپ والے نے ایک طرف مرمت کی دوسر طرف ہاتھ کی صفائی دکھا دی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا جہاں تک گاڑی چلانے کا تعلق ہے وہ تو ٹھیک ہے مگر سب چکر اپنے بس کے نہیں ہیں پھر بچوں اور صاحب کو ... کا وقت ہوگیا اور وہی روز والا سبق دہرایا۔ ساڑھے بارہ بجے ایک کالج ڈیڑھ بجے اسکول اور صاحب کو آف لینا پھر آفس چھوڑنا ساڑھے تین بجے نیلما کو لینا ساڑ چار بجے صاحب کو اور ہو سکتا ہے شام کو صاحب کے س کہیں جانا پڑے ممکن ہے صاحب گھر پر ہی رہیں یا اکی جائیں۔ اف تھکن ...... مگر یہ لفظ میری لغت میں ممنو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر میں کبھی بیمار پڑ جاؤں تو کیا لیکن میرا ذہن سوچنے سے قاصر رہتا ہے۔
اور ایک دن ایسا ہی ہوا رات کو شدید سردی لگ چڑھ آیا۔ بخار کی تکلیف اپنی جگہ لیکن یہ فکر کھائے تھی کہ صبح بچوں کو دیر نہ ہو جائے اگر صاحب کو میری طب معلوم ہو جائے تو وہ چھوڑ تو آئیں گے بلکہ آفس چھوڑ کر بھی لے آئیں گے لیکن اس بات کا ان کو پتہ نہیں چلنے وہ بھی تو سارا دن دفتر میں کام کرتے ہیں پھر بچوں کی بھی اٹھائیں۔ نہیں نہیں۔ یہ ان کے ساتھ بہت زیادتی تھی صاحب بہت مضبوط ہونے کے باوجود نہ معلوم کیو کمزور لگتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کی اور

بات یوں ان کے آفس کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹا دیا کروں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے کئی مرتبہ صاحب سے بھی کہ کچھ آفس کا کام بھی میرے سپرد کر دیجئے تو انہوں نے یہی جواب دیا تم پر پہلے ہی تمہاری بساط سے زیادہ ذمہ داریاں ہیں اور کاموں کے لئے تمہارے پاس کہاں وقت ہے۔ اللہ تمہیں ہمت دے۔

صبح یاد بھی نہیں رہا کہ رات مجھے بخار تھا۔ فرض مقدم تھا۔ اور مقررہ وقت پر کام ہوتے رہے پھر وہی شام کی مصروفیات شروع ہو گئیں وہی وقت کے چکر چلتے رہتے زندگی مسلسل گردش میں رہتی۔

ایک دن بہت تیز بارش تھی اور بچیوں کو لانے کا وقت ہو گیا بارش رکنے کا انتظار کرنا بیکار ہے بچے کالج میں انتظار کریں یہ مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا ابھی آدھا راستہ بھی طے نہ ہوا تھا کہ اولے پڑنے لگے اور اولے بھی اتنے زیادہ اور اتنے بڑے کہ ونڈ شیلڈ ٹوٹنے کا اندیشہ ہونے لگا مجبوراً گاڑی کسی کوٹھی میں کھڑی کر کے اولے رکنے کا انتظار کرنا پڑا۔ یہ طوفان تھوڑا کم ہوا تو پھر گاڑی بھیگی ہوئی سڑکوں کو طے کرنے لگی۔ اُف۔ یہ کیا ہوا کچھ دور جا کر بگڑ گئی۔ اب کیا ہوگا۔ بارش تو کچھ کم تھی لیکن جل تھل ہو رہا تھا سڑکوں پر دور دور کوئی نظر نہ آتا تھا۔ ایسے میں دھکا کون لگاتا اور اکیلے میں اسٹارٹ کیسے کروں اپنی سی ساری کوششیں کر لیں اسی طرح کافی دیر ہو گئی پھر کچھ لوگ ملے گاڑی ٹھیک ہوئی بچیاں اپنے اپنے کالج میں منتظر کھڑی تھیں چہروں پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں سخت پریشان تھیں مجھے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ صاحب پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں یہ سب باتیں ہمیشہ میری زندگی کے ساتھ چلتی رہیں۔

ایک دن سخت گرمی تھی دھوپ دو بجے دوپہر کا وقت اور ٹائر پنکچر ہو گیا بھئی واہ — ٹائر نے بھی پنکچر ہونے کا کیا وقت چنا اور بات پھر وہی تھی مجھے صحیح وقت پر مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ لیکن یہ بات کوئی ٹائر کو کیسے سمجھاتا کچھ راہ گیروں نے مدد کی اور کسی دکھی ماں کی طرح ٹائر تبدیل ہو گیا گاڑی کچھ دور ہی گئی تھی کہ ایک سپاہی صاحب کو مجھ میں ایسی نہ معلوم کیا بات محسوس ہوئی کہ گاڑی روک لی اور لگے سوال جواب کرنے گاڑی کے کاغذات کہاں ہیں لائسنس کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں پسینے میں شرابور ان کو بہت یقین دلانے کی کوشش کی کہ لائسنس کاغذات سب مکمل ہیں اس وقت مجھے جانے دو کالج پہنچنے میں دیر ہو جائے گی پھول سی بچیاں گرمی میں کملا جائیں گی مگر وہ بھی ٹس سے مس ہونے والا نہ تھا وہ تو اتفاق کہئے یا میری قسمت صاحب کے ایک ملنے والے ادھر سے گزرے مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر کر آئے اور معاملہ رفع دفع کرایا مگر ان دنوں پولیس والوں کو بھی نہ معلوم کیوں مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا جب چاہتے گاڑی روک کر چالان کرنے کے در پے ہو جاتے تھے اور پھر ستم یہ کہ میری کچھ سنتے نہ تھے۔ ایک دفعہ صاحب کو لینے ایئرپورٹ جانا تھا صاحب رات نو بجے کی فلائٹ سے آ رہے تھے پہلے تو فلائٹ لیٹ تھی پھر صاحب بھی نہیں آئے طبیعت مکدر ہو گئی تھی اوپر سے چالان ہو گیا لائسنس ضبط ہو گیا سوچا اب کچھ دن آرام مل جائے گا نہ لائسنس ہوگا نہ گاڑی چلانی پڑے گی۔ مگر نہیں۔ اس گھر کا کاروبار میرے بغیر نہیں چل سکتا تھا چارہ ناچار کچھ دن بغیر لائسنس گاڑی چلانی پڑی۔

اور پھر یہ ہوا کہ تبسم کی شادی طے ہو گئی ان دنوں سڑکیں ناپتے ناپتے صبح سے شام ہو جاتی۔ شلوار کے پائنچے بننے کو دینے ہیں۔ دوپٹے رنگریز سے لانا۔ گوٹہ لانا ہے۔ ساڑی کا بارڈر رہ گیا۔ غرارے میں کپڑا کم ہو گیا۔ بیچ بیچ میں اسکول کالج کا بھی چکر لگا لیا۔ دن تھے کہ بھاگتے چلے جا رہے تھے پریس جانا ہے کارڈ چھپنے ہیں ٹینٹ میں شامیانے والے کے پاس جانا ہے کرسیوں کا حساب پوچھنا ہے کھانے کا انتظام کرنا ہے صبح سے رات ہو جاتی گاڑی سیکڑوں میل چلتی بارہ بجے رات کو بھی کام ختم نہ ہوتا۔ صبح پھر نئی مصروفیتیں لے کر آ جاتی۔

تبسم بیٹی کو اس کا دولہا ہاتھ تھام کر دلہن لے گیا

وہ چلی گئی ذمہ داری میں کچھ کمی ہوئی ایک کالج کا چکر بچ گیا لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں اکثر غیر ارادی طور پر گاڑی مقررہ وقت پر اس کے کالج کے باہر جاکر کھڑی ہو جاتی جب کچھ دیر تک مسلم نظر نہ آتی تو خیال آتا وہ تو اس وقت اپنے گھر میں بیٹھی اپنے دولہا کا کھانے پر انتظار کر رہی ہوگی میری آنکھ میں آنسو آجاتے یہ ذمہ داریاں میرے فرائض ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا کہ میری ذمہ داریاں کم کرنے کے لئے وہ یوں اپنا گھر چھوڑ کر چلی جائے لیکن یہ قانونِ قدرت ہے اور رفتہ رفتہ میں نے اپنے آپ کو اس راستے پر نہ جانے کا عادی بنا دیا لیکن پھر بھی وہ راہ بھولے سے سامنے آجاتی ذہن کو ایک جھٹکا سا لگتا کہیں دور ذہن کے گوشوں میں ایک جگنو سا چمکتا اور گاڑی کالی سڑکوں پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں دوڑنے لگتی۔ فاصلہ قدرے سمٹ گیا تھا اور پھر وہ فاصلہ بھی اردگرد لپٹ گیا رات کو لیٹ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف سڑکوں کے جال سے بنے ہوئے ہیں اور کہیں کہیں پڑاؤ ہیں جہاں روشنیاں ہو رہی ہیں اور اس جال سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے میں نے کبھی یہاں سے نکلنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ یہی میری زندگی ہے اور میری زندگی بھی انہی کے دم سے ہے۔

دیکھتے دیکھتے بچیاں قدم بہ قدم سیڑھی بہ سیڑھی آگے بڑھتی گئیں اور ایک دن آیا کہ دوسری بیٹی بھی پیا کے گھر سدھاری راستے تو بالکل ہی مختصر ہو گئے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی کام ہی نہ رہ گیا ہو۔ صرف دو کالجوں میں جانا اور آنا یا صاحب کو آفس چھوڑنا اور لینا اور بیچ میں کوئی اپنا کام بھی کر لینا یا کہیں بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کر لینا۔ زندگی میں کچھ خالی پن کا احساس رہتا تھا بے مقصد سی معلوم ہوتی تھی۔ گو کہ مصروفیات کم ہونے کے باوجود بھی اتنی ہی تھیں اچانک صاحب بتاتے مہمان آرہے ہیں دو دن ٹھہر کر جائیں گے ان کو اسٹیشن سے لانا ان کی بکنگ کرانا ان کو اسٹیشن چھوڑنا یا کسی کو ایئر پورٹ سے لے کر اس کے گھر تک پہنچانا۔ کسی کی شادی میں گاڑیوں کی کمی ہے تو میری خدمات ان کے لئے ہوتیں کبھی گھر سے دفتر صاحب کی فائلیں لے جانا کبھی لانا یہ سب کچھ میرے ہی فرائض میں داخل تھا بڑی بچیوں کی بڑی ضروریات ہوتی ہیں کبھی ملنے پہ سلنے

کو دینا ہے کبھی کالج میں پارٹی ہے وہ کہتیں ابھی نہیں دو گھنٹے بعد گھر جاؤ گی کبھی شام کی پارٹی ہے وہاں چھوڑنا اور دو تین گھنٹے کہیں کھڑے ہو کر انتظار کرنا یا اس دوران کوئی کام کر لینا کالج اسکولوں پر انتظار کرنے کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ گاڑی میں ڈھیروں رسالے کتابیں ہوتے جو بہت جلد پڑھ لئے جاتے کیونکہ خالی کھڑے ہو کر انتظار کرنا بہت مشکل ہوتا بلکہ اکثر یہ رسالے صاحب ہی دیا کرتے تھے۔

مگر اب تھکن پہلے کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہونے لگتی تھی عمر کا تقاضا جو تھا کبھی انتظار کرتے کرتے نیند کا جھونکا بھی آجاتا۔ زندگی ان سڑکوں اور کالجوں پر بنے بندھے اصولوں کے تحت گزر رہی تھی ایک کالج پر جا کر پہچان کے لئے تین تین مرتبہ ترنم سے ہارن دینا ہوتا تھا دوسرے کالج پر ہلکے ہارن کی ضرورت تھی اور وہ ہارن بھی مخصوص طریقے سے رک رک کر بجانا جیسے گلا خراب ہو۔ ہارن دینے کا یہ اسٹائل بچیوں نے خود پسند کر کے بتایا تھا۔ پھر صاحب کے دفتر پر ایک ہارن دینا میکانکی انداز میں گاڑی کی سیٹ پیچھے کرنا کشن ہٹانا کیونکہ مجھے کشن رکھ کر سیٹ آگے کر کے گاڑی چلانے کی عادت ہے۔ صاحب جب میرے ساتھ ہوتے تو گاڑی ہمیشہ خود چلاتے مجھے کبھی تکلیف نہ دیتے اور میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے گاڑی سے اتر کر سیٹ چھوڑ دی اور صاحب نے بے خیالی میں اپنا بریف کیس اور اخبار مجھ کو پکڑا دیئے مجھے جھٹکا سا لگا کیونکہ صاحب کبھی ایسا نہ کرتے تھے اپنی چیزیں خود ہی رکھتے تھے مجھ سے بہت دوستانہ برتاؤ کرتے تھے لیکن آج مجھے احساس ہوا جیسے وہ مجھے صرف ڈرائیور سمجھ رہے ہوں انہیں اپنی اس نادانستہ غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور انہوں نے مجھ سے معذرت کر لی تھی اب مجھے کبھی بھی ناگوار نہ ہوتا یہ تو روز کا معمول تھا رسالہ پڑھنا، یا ادھر ادھر دیکھتے رہنا کبھی کسی سوچ میں ڈوب جانا، کبھی خالی الذہن ہو کر خلا میں گھورتے رہنا کبھی آتے جاتے لوگوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھنا یہ سب کچھ میری زندگی کی جزئیات میں شامل تھا، یہی

میرا سب کچھ تھا ان سب کے بغیر میری زندگی بیکار تھی یہی میری تفریح تھی یہی میری خوشی تھی۔ یہی میرا سکون تھا۔

ایک مرتبہ صاحب کے آفس پر انتظار کرتے کرتے اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر آنکھ لگ گئی خواب میں دیکھا کہ بہت چوڑی چوڑی خوبصورت سڑکیں ہیں ان پر جھلمل جھلمل کرتی روشنیاں ہیں لیکن روشنیاں میں نے پیچھے چھوڑ دی ہیں اور میرے چاروں طرف ایک لمبا سا میدان ہے میں تنہا ہوں پیچھے وہ روشنیاں مجھے نظر آ رہی ہیں مگر میں وہاں واپس نہیں جا سکتا۔ میدان میں تنہائی ہے سناٹا ہے کانوں میں صرف ہوا کی شائیں شائیں سنائی دے رہی ہے اداسی میری رگ رگ میں پیوست ہوتی جا رہی ہے میں بہت اداس ہوں کہ اچانک صاحب میرے پاس آ جاتے ہیں ہواؤں کی شائیں شائیں ختم ہو جاتی ہے، تنہائی کا احساس مٹ جاتا ہے اور صاحب مجھے پکارتے ہیں میری آنکھ کھل جاتی ہے صاحب مجھے جگا رہے تھے صاحب شرمندہ ہو کر کہنے لگے آج مجھے بہت دیر ہو گئی تمہیں بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔

نہ معلوم کیوں اس خواب نے میرے دل و دماغ میں ایک خوف سا بٹھا دیا اور انتہائی کوشش کے بعد بھی اس سے چھٹکارا پانا مجھے اپنے بس میں نہ معلوم ہوا سوتے جاگتے چلتے پھرتے یہ خواب میرے سر پر مسلط رہنے لگا مجھے کھویا کھویا دیکھ کر کئی مرتبہ صاحب نے مجھ سے میری اداسی کی وجہ پوچھی لے دے کے ایک صاحب ہی تو تھے جو مجھ سے پوچھ سکتے تھے مگر میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا میری اداسی بھی اور گہری ہوتی جاتی تھی خواب تو کبھی بھی مدتوں ذہن میں نہیں رہتے لیکن اس خواب نے تو میری زندگی ہی بدل دی تھی ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا ہر وقت ایک خوف سا ستاتا رہتا تھا۔ یہ احساس رہتا تھا کہ ایک وقت ایسا ضرور آ جائے گا جب میرے چاروں طرف تنہائی ہی تنہائی ہو گی۔ اللہ نہ کرے۔ میرے منہ سے نکلتا۔ اور پھر ایک ذمہ داریوں کا خول میرے چاروں طرف چڑھ جاتا۔

زندگی یوں ہی رواں دواں گزرتی رہی نہ مجھے کبھی یکسانیت تنگ کرتی نہ تھکن دور کرتی وقت کا کارواں خراماں خراماں گزرتا چلا جا رہا تھا ماضی سے نظریں چرائے مستقبل سے بے خبر اپنے حال میں گم، مگن اور ایسے ہی چپکے چپکے کتنے سال بیت گئے گاڑیوں کے رنگ ڈیزائن اور ماڈل بدلتے رہے میری زندگی بھی رنگ ڈیزائن کی تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ ایک ہی راستے پر چلتی رہی۔

پھر شور اٹھا کہ صاحب کی شادی ہے، ہنگامے، رونقیں، قہقہے، سب ہی کچھ تھا جو سمٹ آیا تھا ہر طرف رنگ برنگے لہریئے تھے، قہقہے تھے جھلملاتی روشنیاں تھیں ہر سو آنچل تھے، خوشبوؤں کے سیلاب تھے رنگا رنگی ہی رنگا رنگی تھی، ہر طرف کھلے ہوئے چہرے، کھلکھلاتے مسکراتے لوگ تھے اور اس میں ایک میرا دل ڈوبا ڈوبا، اداس اداس جتنی روشنیاں سامنے آتی جاتیں اتنا ہی اندھیرا دل میں ہوتا جاتا جیسے جیسے لوگ آتے ویسے ہی ویسے تنہائی رگ رگ میں اترتی جوں جوں شور بڑھتا کانوں میں سناٹے کی سائیں سائیں بڑھتی جاتی، دل کی تاریکیاں دور ہونے میں نہ آتیں، دیئے جلانے کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی یہ کیسی رونقیں ہیں؟ یہ کیسے ہنگامے ہیں؟ یہ کیسی روشنیاں ہیں جو دل کی ویرانیاں بڑھاتی چلی جا رہی ہیں، کیا یہ سب جھوٹا ہے؟ نہیں — یہ ایک اٹل حقیقت میری نظروں کے سامنے ہے، لیکن یہ رنگ بے رنگ کیوں ہیں؟ روشنیاں تاریکی کیوں بکھیر رہی ہیں؟ یہ قہقہے کھوکھلے کیوں ہیں؟ خوشبوئیں بے بو کیوں ہیں؟ یہ دماغ میں سحر کیوں نہیں گھولتیں؟ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ کیوں نہیں ہے؟

اور آخر صاحب سے چھوٹی بیٹی مانی بھی رخصت ہوئیں خوشبوؤں کے طوفان اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی ہنگامے ختم ہوئے ڈھولک کی تھاپ ٹھہر گئی چاروں طرف ہُو کا عالم ہے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہاں کوئی متنفس نہیں ہے کسی کے سانس کی بھی آواز نہیں ہے اور جیسے صدیوں سے یہاں کوئی بھٹکا ہو ہمیشہ سے سناٹا ہی سناٹا ہو پرانی رونقیں خواب و خیال ہو گئیں اور اب کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا ہے تنہائی ہے اداسی ہے اور سفر ابھی باقی ہے۔

سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اب میرے سامنے بالکل وہی لق ودق میدان ہے میں تنہا ہوں چاروں طرف سناٹا ہے صرف ہوا کی سائیں سائیں کانوں میں آرہی ہے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے جھلمل کرتی رنگ برنگی روشنیاں نظر آتی ہیں جو اپنے اندر ان گنت کہانیاں اور گیت سموئے ہوئے ہیں جہاں قہقہے ہیں لہریئے ہیں خوشیاں ہیں مسرتیں ہیں چھوٹے بڑے لاتعداد اور خوبصورت واقعات ہیں سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے بہت پیچھے جس کو پکڑنا ناممکن ہے وہ میری گرفت سے نکل چکا ہے وہاں تک آواز بھی نہیں پہنچ سکتی۔ سب کچھ بہت دور جا چکا ہے اب میں ہوں، تنہائی ہے سناٹا ہے اور آگے ...... سیدھا سپاٹ چٹیل میدان ہے جس میں نہ روشنی ہے نہ پیچ وخم ہیں۔

سیڑھیاں بہت ٹھنڈی ہیں۔ سردی لگ جائے گی

صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا

اور بند ٹوٹ کر بہہ نکلا

"میری نوکری ختم ہوگئی ہے"

"تمہیں اب آرام کی ضرورت ہے"

"نہیں نہیں۔ مجھے آرام نہیں چاہیئے مجھے وہی نوکری چاہیئے وہی تو میرا سہارا تھی۔"

میرے آنسوؤں سے صاحب کی ٹائی بھیگتی رہی، سسکیاں ان کے دامن میں جذب ہوتی رہیں۔

تم نے اپنے آپ کو صرف ایک ڈرائیور کیوں سمجھا۔ تم ایک ماں ہو۔ تم نے اپنی ذمہ داریاں بہت خوش اسلوبی سے نبھائی ہیں تمہاری بیٹیاں اپنے گھروں کو شہ ماریں تمہیں اطمینان کا سانس لینا چاہیئے اور ان کی خوشیوں کے لیے دعا کرنی چاہیئے۔ اولاد کا سہارا بہت کمزور ہوتا ہے وہ تمہارا سہارا نہیں ذمہ داری تھی فرائض تھے تم ان کا سہارا ہو تمہیں مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ زندگی کا بقیہ سفر بھی میں اور تم مل کر طے کریں گے تمہارا سہارا تو میں ہوں۔

تمہارا سہارا تو میں ہوں ...... تمہارا سہارا تو میں ہوں۔

• • • • • •

(صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی اور صبا افغانی ایک ایسی تثلیث تھی جو احباب اور ملنے جلنے والوں سے خطرناک حد تک مذاق کرنے میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ بمبئی میں ایک مشاعرہ تھا اور راقم بمبئی میں ہی موجود تھا۔ شکیل صاحب کہنے لگے کہ تین دن بعد ایک مشاعرہ ہے بھابی (روحی دہلوی) کو اگر تار دے کر بمبئی بلا لو تو اچھا رہے گا مشاعرہ والوں نے کہا ہے کہ روحی صاحبہ کو مدعو کرا دیجئے۔ میں نے معذوری ظاہر کی کہ گھر اور دفتر اکٹھا ہے اس لئے ہم دونوں میں سے ایک کا دہلی رہنا ضروری ہے۔ میری عدم موجودگی میں روحی صاحبہ کا بمبئی آنا ممکن نہیں ہے۔ شکیل صاحب اس وقت تو خاموش رہے مگر گھر جا کر میری بیوی کو دہلی ٹرنک کال کی (اس وقت ایس۔ ٹی۔ سی سسٹم نہیں تھا) کہ بھابی بات اپنے تک رکھنا میں تو محض ہمدردی میں آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ سرور صاحب ردی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ سرور صاحب کہتے ہیں کہ یہ لڑکی اُن کی رشتہ دار ہے اور اسے علاج کے لئے بمبئی لائے ہیں۔ تیسرے دن رات کو میں اور میرے دوست کوشل صاحب ردی ہوٹل میں میرے کمرے میں کاجو کی شراب پی رہے تھے (اُن دنوں میں شراب پیتا تھا) کہ اچانک میری بیوی آدھمکیں میں اور کوشل حیران کہ یہ کیسے آگئیں۔ دریافت کرنے پر عدم تعاون اور منہ پھولا ہوا۔ پانچ منٹ بعد شکیل صاحب کا فون آیا فرما رہے تھے سرور صاحب بھابی سے میری طرف سے معافی مانگ لینا کہ میں اسٹیشن پر دیر سے پہنچا اور گاڑی آچکی تھی اس لئے میں انہیں اسٹیشن پر نہ مل سکا ورنہ میں خود ہی انہیں ردی ہوٹل لے کر آتا۔ شکیل صاحب کے فون سے معاملہ ذرا سلجھتا ہوا نظر آیا تو روحی صاحبہ نے سارا واقعہ بتایا اور میں نے انہیں صرف یہی کہا کہ شکیل بنا گئے نہ آپ کو اُلّو۔

• • • • • • • •

رامپور سے کراچی تک

دواکر راہی

کئی سال پہلے آنجہانی حضرت شمیم کرہانی نے مجھے بتایا تھا کہ مجتہد العصر مولانا ترابی صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے کراچی میں منعقدہ ایک عظیم الشان مجلس عزا کے اپنے خطبہ کی آخری سطور میں یہ کہتے ہوئے کہ یہ دواکر راہی رامپوری غیر مسلم کا شعر ہے جس میں کربلا کی حقیقی تاریخ سمو دی گئی ہے۔

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم ٭ یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہارا ہے

اس کے بعد تقریباً ۳-۴ سال ہوئے محترم دوست ڈی۔ پی۔ حملی نے مجھے بتایا کہ دہلی دی پر محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ کا ایک بے مثل انٹرویو جو انہوں نے پاکستان کے دورہ کے بعد واپس آکر دیا تھا ٹیلی کاسٹ [illegible] کیا گیا ہے اور اس میں انہوں نے دو ہندوستانی اردو شعرا کے نام یہ کہہ کر لئے ہیں کہ ان شعرا کو پاکستان میں کافی مقبولیت حاصل ہے اور ان میں خاکسار کا نام شامل ہے بہت ہی معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع ملی تھی پھر کچھ ہی ماہ بعد بلند شہر کے آل انڈیا مشاعرے میں جناب بشیر بدر صاحب نے جو اس مشاعرے کی نظامت فرما رہے تھے مجھے پکارتے ہوئے محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ والے بیان کا ذکر کرتے ہوئے میرا تعارف کرایا اور اس طرح اس خبر کی گویا مزید تصدیق ہو گئی۔ پھر اس کے بعد پاکستان کے متعدد ادبی دوستوں نے مجھے پاکستان بلانے کی ترغیب دی اور بالآخر میرے مجموعہ کلام "چراغِ منزل" جیسے پاکستان بھیجا جا چکا تھا، پڑھنے کے بعد پاکستان کے نامور ادیب، شاعر اور صحافی محترم رئیس امروہوی نے اپنے خط مورخہ ۲۴ رفروری ۱۹۸۳ء میں مجھے لکھا "میں بہت مدت سے آپ کے کلام کا شہرہ سن رہا ہوں مختلف موضوعات پر اپنے احباب سے آپ کے اشعار اکثر سنتا رہا ہوں، واقعی آپ صاحب طرز شاعر ہیں" پھر اپنے ۱۱ رمئی ۱۹۸۳ء کے خط میں جناب رئیس امروہوی صاحب نے مزید لکھا۔ "ہم سب آپ کے منتظر ہیں واقعی کراچی دیکھنے کا شہر ہے پاکستان میں اگر کسی کو گنگا جمنی تہذیب دیکھنی ہو تو کراچی کا سفر ضرور کرے۔ یہاں آپ کے مداحوں کی کمی نہیں، آپ کے بہت سے چاہنے والے یہاں ہیں" ادھر جناب فیصل شفائی نے بھی اسی طرح کا ایک بہت ہی حوصلہ افزا خط بھیجا جو میجر حمید اللہ خان رامپوری جناب خسروی (کنور اعظم علی خان) وغیرہ متعدد اصحاب نے جو کراچی میں گشت پاکستان قیام پذیر ہیں میرے کلام سے متاثر ہو کر مجھے ایسے خط لکھے جنہیں دعوت نامہ کہا جا سکتا ہے۔ حسنِ اتفاق کہ اسی دوران حضرت رئیس امروہوی صاحب رامپور تشریف لائے اور مجھے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو ان کا استقبال کرنے اور ان کے اعزاز میں ایک نشست منعقد کرنے کا موقع ملا۔ حضرت رئیس صاحب اور ان کے رفیق کار جناب بزم انصاری نے اس موقع پر

[illegible] امریکہ [illegible] پاکستان [illegible]

ان سب واقعات میں جنہوں نے پاکستان جانے کی [illegible] خواہش کو کافی تقویت دی اور [illegible] سعید کی [illegible] چاہا یہ بھی کہ خود پاکستان کا اہتمام کب اور کیسے کیا جائے تھی وہاں ۲۴ مارچ ۱۹۸۳ء کو مجھے جناب نجم الانصار کا خط ملا کہ مجھے مسٹر زبیر رضوی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے ہمراہ کراچی پہنچوں تاکہ ۱۶ اپریل کو انجمن سادات امروہہ کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعرے میں شرکت ہو جائے کراچی میں سیاسی کشیدگی کی وجہ سے یہ تاریخ ملتوی کی گئی اور پھر ۱۴ مئی ۱۹۸۳ء تاریخ طے کی گئی پھر وہ بھی ملتوی ہو گئی اور ۱۹ مئی ۱۹۸۳ء طے کی گئی اور بالآخر یہ تاریخ بھی ملتوی کی گئی اور ۲ جون ۱۹۸۳ء کو انڈوپاک مشاعرہ منعقد کرنے کا آخری فیصلہ کیا گیا۔ مجھے پاکستان انٹرنیشنل ایرویز (P.I.A) نئی دہلی [illegible] کی طرف سے ہوائی جہاز کے ذریعے کراچی اور کراچی سے دہلی کے واپسی ٹکٹ [illegible] ویزا حاصل کرنے میں [illegible]۔ خدا کا شکر [illegible] سفر طے کرتا ہوا ۲ جون ۱۹۸۳ء کو پالم ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ وہاں جناب جگن ناتھ [illegible] ساغر اعظمی، [illegible] محمود سعید [illegible] نازش پرتاپگڑھی، زبیر رضوی، [illegible] امروہوی [illegible] امروہوی اور [illegible] مسعودیات کے ساتھ [illegible] شام کو ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر ۴۰۔۸ بجے شب (پاکستانی ٹائم کے حساب سے ۱۰۔۱ بجے شب) کراچی پہنچا۔ وہاں کراچی ہوائی اڈہ پر ہم سب لوگوں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا [illegible] ہاں [illegible] کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ ہم لوگوں کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل (Five Star Hotel) [illegible] ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔

وہاں پہنچنے پر روزنامہ جنگ نے جو لندن، کراچی لاہور، پشاور اور راولپنڈی سے بیک وقت ۲۰ لاکھ کی تعداد میں شائع ہوتا ہے مندرجہ ذیل مضمون شائع کر کے مجھے اہل پاکستان سے متعارف کرا دیا۔

جناب [illegible] راہی کا مجموعہ [illegible] اور

[illegible]

[illegible] جگنو [illegible]

چراغ منزل جلا کے [illegible] کسی پہ احسان [illegible]

[illegible] راہی کا انکسار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اردو غزل کی محفل میں "چراغ منزل" روشن کر کے [illegible] پر احسان کیا ہے۔ وہ اکثر آپ کے بہت سے شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں، سنتے ہی سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ "چراغ منزل" غزلوں، متفرق رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ اب تک راہی صاحب کے پانچ منظوم مجموعے شائع ہو کر ہر کوچک و بزرگ سخن شناس حضرات سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، وہ ہیں [illegible] نقش قدم (منتخب اشعار) منزل کی طرف (مجموعہ کلام) نقوش راہ (منتخب اشعار) [illegible] تغزل (منتخب اشعار) یہ سب مجموعے پھول کی خوش رنگ پتیوں کی حیثیت رکھتے ہیں البتہ چراغ منزل (مجموعہ کلام) کو گلدستہ سدا بہار [illegible] غزل کا مجموعہ [illegible] سمجھا جانا چاہئے۔ راہی کو غزل کے طرز بیان اور زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کی مثال ان کے معاصرین میں [illegible] بہت ہی کم مل سکتی ہے۔ [illegible] تخیل کی بلند پروازی اور [illegible] نفسیاتی [illegible] اور زندگی کے عمیق تجربات کی [illegible] فکر و نظر اور جذبۂ احساس کی [illegible] ہے جو اس مجموعے کی صورت میں قاری کو گرویدہ کر دیتی ہے آخر میں اس امر کا اظہار [illegible] کہ جناب [illegible] راہی کا مولد امروہہ ہے [illegible] اس طرح ان کے کلام [illegible] سخن کی نزاکت و نفاست اور [illegible] غزل کی خوبی اور [illegible] بیک وقت پائی جاتی ہے [illegible] انجمن سادات امروہہ کراچی کے [illegible] مشاعرے میں شرکت کی [illegible] راہی کا قیام جناب [illegible] خان صاحب [illegible] کالونی میں ہے اور فون نمبر 67962 [illegible]

[illegible] رامپور کے
ایک فرزند [illegible] یوسف علی خاں یوسف
کے چھوٹے بھائی [illegible] اعلیٰ عہدہ پر
فائز تھے اور [illegible] عالم تھے۔ خلف اکبر ان
میں پہلے ہی متعارف ہو چکا تھا جب وہ گزشتہ اپریل سنہ
میں رامپور آئے ہوئے تھے اسی وقت ملاقات کے دوران
[illegible] کہا کہ عنقریب میں کراچی جانے والا ہوں تو انہوں نے
دعوت دی کہ میں انہیں کے یہاں قیام کروں اور میں نے وعدہ
کر لیا۔ لیکن یہ قیاس بھی نہیں کر سکتا تھا کہ محمد علی خاں صاحب
کی [illegible] کا اتنی شدت اور سرعت سے احساس ہوگا کہ
[illegible] اسی وجہ سے کہ میں کراچی پہنچنے والا ہوں اپنی اہلیہ
محترمہ کے ہمراہ جہاں ان کے دونوں لڑکے تعلیم حاصل کر رہے
ہیں امریکہ چلے گئے اور لندن میں مرزا مہدی صاحب سے برابر ٹیلی
فون پر انہوں نے میرا پروگرام جاننے کے لئے رابطہ قائم
رکھا جناب محمد علی خاں صاحب کی کوشش یہ تھی کہ انہیں کراچی پہنچنے
کے پروگرام کی اطلاع پہلے نہیں مل سکی اس لئے وہ ہوائی اڈہ
پر نہیں پہنچ سکے۔ حالانکہ میں نے ٹیلی فون بھجوانے کا اہتمام
کیا تھا لیکن جن صاحب نے وعدہ کیا تھا وہ اس کی تکمیل نہیں
کر سکے۔ بہرحال جب میں ہوٹل میں جہاں دیگر شعراء کرام کے
ساتھ قیام پذیر تھا تشریف لائے اور مجھے مع میرے سامان
کے اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ ایک ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں
ٹھہرایا۔ جس خلوص اور محبت سے میزبانی کی گئی اس کے لئے
میرے پاس الفاظ نہیں ہیں انہوں نے میرے استعمال کے
لئے اپنی ایک کار مخصوص کر دی جس کی وجہ سے بیحد سہولت
ہو گئی۔ کراچی ایک بہت بڑا پھیلا ہوا شہر ہے جہاں ایک جگہ
سے دوسری جگہ کے فاصلے بہت زیادہ ۱۸-۱۸-۲۰-۲۰ میل
کے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد علی خاں صاحب نے بڑے اخلاص
کے ساتھ قیمتی تحائف سے بھی مجھے نوازا۔ یہی نہیں، انہوں نے
[illegible] کراچی آؤں تو انہیں کے یہاں قیام
کروں [illegible] پیش آئے اسے میں
[illegible] ان کے حسن اخلاق اور رواداری

اور حسن اخلاق کا مشاہدہ اتنی شدت سے مجھے نصیب ہوا وہ
میرے لئے ایک سرمایہ سے کم نہیں ہے۔
یاد رہے کہ اب اپنے پرانے دوست [illegible]
خاں افغانی اور ان کے اہل و عیال کا ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتا
ہوں۔ میں مقیم تو جناب محمد علی خاں صاحب کے یہاں تھا مگر
بہت کافی وقت کامریڈ افغانی کے یہاں گزرتا تھا۔ وہ
پاکستان جانے سے قبل میرے سیاسی رفیق کار رہے
اور فوڈ ایجی ٹیشن (Food Agitation) کے سلسلہ
میں ہم دونوں نے ڈسٹرکٹ جیل رامپور میں بھی کئی ماہ
ساتھ گزارے۔ ان کے ساتھ شطرنج کھیلنا، کھانا پینا
نصف شب گزرنا اور پرانی یادوں کو تازہ کرنا معمول رہا۔
ان کی اہلیہ محترمہ اور گھر کے سبھی چھوٹے بڑے بچوں نے
جس اخلاص اور رواداری کا ثبوت دیا اور خصوصاً ان کے
گرامی منش عزیز احمد خاں افغانی سلمہ نے جس خلوص و ایثار
اور دلی لگاؤ کے ساتھ قدم بہ قدم مجھے تعاون دیا اور
ساتھ نبھایا اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ بیش قیمت
تحائف سے بھی مجھے نوازا گیا۔ عزیزم ظفر خاں ایک
صحافی ہیں ان کے قلم میں طاقت ہے اور سیاسی طور پر
وہ اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔
یہاں اپنے پرانے ساتھی اور دوست جناب [illegible]
خاں صاحب کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ پاکستان جانے
کے بعد آپ نے کئی خطوط میں مجھے پاکستان کا سفر کرنے
اصرار کیا۔ ۸ جون کی صبح کو جیسی ہوٹل میں تشریف لائے
اور ہم ایک دوسرے سے نہایت گرم جوشی سے ملے اور
رامپور کے متعدد احباب۔ بار ایسوسی ایشن کے اور کچہری
کچہری کا ماحول۔ رامپور کی ادبی فضا غرضیکہ کتنے ہی موضوع
پر ان سے تفصیلی اور بے تکلف بات چیت ہوئی۔ پھر تو
کئی بار ملاقات ہوئی۔ واقعی جس خلوص اور اپنائیت
اسلم خاں صاحب پیش آئے اسے فراموش نہیں کر
سکتا۔ [illegible] کے ساتھ ان کا وقت رخصت یہ کہنا
میرا جسم گو یہاں میں رہتا ہے لیکن میری روح رامپور

تی ہے وہ بار بار یاد آتا ہے۔
یہاں الحاج جناب ذاکر علی خاں صاحب رامپوری کا ذکر ناگزیر ہے۔ آپ وہاں بحیثیت چیرمین واٹر مینجمنٹ (Water Management Commettee) کمیٹی کے اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ خان بہادر باقر علی خاں صاحب ایس پی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی ایمان داری دیانتداری فرض شناسی پر اہل کراچی اور خصوصاً رامپور سے وہاں جا کر بسے ہوئے لوگ آن کے مداح ہیں۔ جناب عبدالہادی خاں صاحب رامپوری بھی وہاں اہل رامپور کی بے لوث مخلصانہ خدمت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں انہوں نے مجھے کافی وقت دیا۔ میرے ساتھ کئی جگہ تشریف لے گئے۔ افسوس ہے کہ ان حضرات کے ساتھ میں زیادہ وقت نہیں گزار سکا۔ خیر زندگی نے وفا کی تو آئندہ سہی۔

ایک اور صاحب جناب لطف اللہ خاں صاحب کا تذکرہ کئے بغیر بھی کام نہیں چلے گا۔ یہ صاحب ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں۔ آپ ۳۷ سال سے ادبا، شعراء موسیقی کار و دیگر فنکاروں کی آوازیں ریکارڈ کر کے باقاعدہ ان کے کیسٹ (cassettes) بناتے اور رکھتے ہیں۔ فنکاروں کے فوٹو بھی آپ لیتے ہیں شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ادیب یا موسیقی کار ایسا ہوگا جس کی آواز ان کے کسی نہ کسی کیسٹ میں بند نہ ہو۔ مجھے اپنی رہائش گاہ پر لانے کے بجائے خود میری قیام گاہ (محمد علی خاں کی کوٹھی) اپنی کار سے تشریف لائے۔ مجھے لے گئے۔ میری آواز ریکارڈ کی میرے کئی فوٹو لئے اور پھر خود مع اپنی اہلیہ محترمہ مجھے اپنی کار سے ہی جناب اسلم خاں کے مکان پر لے گئے۔ اسلم خاں صاحب یہ جانتے ہی کہ مجھے لیکر خود لطف اللہ خاں صاحب آئے ہیں پھولے نہ سمائے کیوں کہ وہ کافی دنوں سے لطف اللہ خاں سے ملاقات کرنے کے لئے بے چین تھے۔ بہر حال میرے توسل سے یہ دونوں حضرات ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور اس سے مجھے دلی مسرت ہوئی۔
جہاں تک جناب کمال امروہوی صاحب جو وہاں

کراچی میں ہم کمال صاحب کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائی ملکیں امروہوی صاحب کے یہاں مقیم تھے) کی ذات تعارف کی محتاج نہیں ہے ان سے شرف ملاقات کا یہ دوسرا موقع مجھے کراچی میں ملا۔ کمال صاحب ہر قسم کی نمائش اور تمکنت سے پاک ہیں۔ ان کی سادگی، سادہ دلی اور روشن خیالی نے مجھے کافی متاثر کیا۔ اپنی نئی فلم رضیہ سلطان (رضیہ سلطانہ نہیں کیونکہ رضیہ سلطان کے نام سے ہی حکومت کرتی تھی اور اسی نام کا سکہ رائج تھا) کے سلسلے میں انہوں نے بہت تحقیق بلکہ جدو جہد کی ہے اور وہ اس نتیجے پر آئے ہیں کہ رضیہ سلطانہ کی قبر ملتان میں ہے۔ اس تحقیق کی پوری داستان انہوں نے سنائی کئی تقاریب کی صدارت بھی کمال صاحب نے کی ہر مرحلے پر نمایاں طور پر انہوں نے مجھے داد سے نوازا۔ آخری ملاقات میں ان کا یہ جملہ کہ راہی صاحب آپ کے اشعار سے ابھی طبیعت نہیں بھری ہے کس قدر حوصلہ افزا ہے۔

امروہہ کے معروف بزرگ مزاحیہ شاعر جناب شہباز صدیقی پہلے سے ہی کراچی پہنچ چکے تھے اور ان کے مجموعہ کلام کی رسم اجرا بھی وہاں ہو چکی تھی۔ غالب اکیڈمی دہلی کے مہتمم جناب ذہین نقوی صاحب بھی پہلے سے ہی کراچی میں مقیم تھے کئی تقاریب کی نظامت کے فرائض آپ نے خوبصورتی کے ساتھ انجام دئے اور ہندوستان کے شاعروں کی خاطر مدارات کی، ان کی دیگر سہولیات کی طرف آپ خاص طور پر متوجہ رہے۔
اب سوال رہ جاتا ہے اپنے ساتھی شاعروں اور منعقدہ مشاعروں کے ذکر خیر کا۔ واقعی میرے لئے یہ بہت نازک مسئلہ ہے کیونکہ اس تذکرے کی بنا پر خواہ میں کتنی ہی غیر جانبداری اور دیانت داری سے دانستہ طور پر اور محتاط رہ کر کام لوں پھر بھی معاصرانہ چشمک یا حسد، خود نمائی یا خود ستائی وغیرہ کے الزامات مجھ پر عائد کئے جا سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ مجھے بخشا نہیں جائے گا۔ پھر بھی اس اندیشہ یا خطرے کے باوجود میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں بھی اپنے مشاہدات اور تاثرات قلمبند کروں لیکن قبل اس کے کہ میں تفصیلات میں جاؤں پہلے یہ عرض

کردوں کہ کراچی میں کسی مشاعرے یا نشست کا آغاز نعت
شریف سے نہیں کیا گیا۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ ادھر خصوصاً
رامپور قرب و جوار کے شہروں و قصبوں میں ایسی ہر تقریب
کا آغاز نعت سے کرنے کا رواج ہے بلکہ شاید اسے لازمی
سمجھا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی صاحب سے جب میں نے اس
بابت دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے مشاعروں میں
جس طرح شعرائے کرام عشق بازی سے ہوس کاری تک آجاتے
ہیں اور کبھی کبھی کوئی شاعر کافی نیچی سطح تک اتر جاتا ہے
اسے دیکھتے ہوئے نعت شریف سے مشاعرے کا آغاز کرنا
نعت شریف کی توہین ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خواہ کچھ
مسلمان کچھ بھی دعویٰ کریں، اردو ہندوؤں اور مسلمانوں
کی مشترکہ زبان ہے اس لئے نعت شریف سے مشاعرے کا
آغاز کرنا اردو کی سیکولر حیثیت کو مجروح کرتا ہے۔ بہرحال
یہ بات اہلِ قابلِ ذکر تھا اس لئے تذکرہ کیا گیا ہے تاکہ اردو
مشاعرے منعقد کرنے والے حضرات اس بارے میں سنجیدگی
سے غور کریں۔

چینی ہوٹل میں اپنے شعرائے کرام کے ساتھ کچھ وقت
گزارنے کا موقع ملا۔ مشاعروں اور دعوتوں میں بھی اکثر
ملاقات ہوتی رہتی۔ انڈیا ارنج میں کافی دیر تک ملنے اور
تبادلۂ خیالات کا موقع فراہم ہوا۔ خمار صاحب کی مہمان نوازی
ناقابلِ فراموش ہیں۔ ساغر اعظمی صاحب اور جگن ناتھ آزاد
صاحب نے بھی کافی حد تک خلوص قائم رکھا۔ امروہہ کے
حکیم امروہوی اور رئیس نجمی صاحب سے اور شہباز صاحب
سے بھی پرانی ملاقات تھی۔ آل انڈیا ریڈیو رامپور کے
رکنِ اعلیٰ جناب نصیر رضوی کا سے بھی پہلے سے ہی واقف ہو
چکا تھا۔ دیگر شعرائے کرام سے رابطہ کم رہا پھر بھی ہر ایک
شاعر کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا مجھے کافی موقع
ملا اور اس سلسلے میں کچھ تلخ مشاہدات اور تجربات بھی
ہوئے جن کا تذکرہ نہ کرنا قارئین کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔
کراچی میں ۲۲ روزہ قیام کے ہند و پاک مشاعرے کے بعد تقریباً
روز ہی کہیں نہ کہیں مشاعرے و نشستیں ہوتی رہیں، کیونکہ
ہندوستانی شعراء کی آمد سے ہر ادبی انجمن فائدہ اٹھانا
چاہتی تھی کئی انجمنوں اور حضرات کو مایوسی بھی ہوئی۔
چار تقاریب قابلِ ذکر ہیں ۲۲ روزہ کے مشاعرے کے بعد
سب سے اہم مشاعرہ ہندوستانی سفارت خانے میں
کونسل جنرل جناب پارتھ سارتھی کے زیرِ اہتمام ہوا۔
مشاعرے سے قبل نہایت پُرتکلف عشائیہ دیا گیا اس
موقع پر جناب پارتھ سارتھی اور اس مشاعرے کے صدر
جناب غوث علی شاہ وزیرِ تعلیم پاکستان نے حال ہی میں
منعقدہ انڈو پاک مشترکہ کمیشن کے اجلاس میں ہوئے
فیصلوں کی روشنی میں ہند اور پاک کی دوستی کے بارے
میں پُرامید اور حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ مشاعرہ
بہت کامیاب رہا۔ اس مشاعرے کے علاوہ آرٹ کونسل
پاکستان کے زیرِ اہتمام پاکستان کے مقبول شاعر بزم انصاری
کے مجموعۂ کلام "آب جو" کی رسمِ اجرا منعقد ہوئی جس میں
جناب غوث علی شاہ وزیرِ تعلیم پاکستان نے بحیثیت مہمان
خصوصی رسمِ اجرا ادا کی اور اس کے بعد جناب کمال
امروہوی کی صدارت میں بزمِ شعر و سخن منعقد ہوئی۔
ان دونوں تقاریب کی ویڈیو فلم بھی تیار کی گئی علاوہ
ازیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
(Old boys association) کے زیرِ اہتمام
نہایت کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا۔ دانشوروں کی اس
جماعت کے صدر جناب ذاکر علی خاں صاحب و دیگر اراکین
نے نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے اس بزمِ مشاعرہ
کا اہتمام کیا اس میں پاکستانی شعراء کے علاوہ، ہندوستانی
شعراء میں جناب علی سردار جعفری۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد
وسیم بریلوی۔ ساغر اعظمی۔ خمار بارہ بنکوی اور دیگر نے
شرکت کی۔ اس مشاعرے سے قبل جناب حلیم صاحب بیرسٹر
ایٹ لا کی طرف سے پُرتکلف عشائیہ دیا گیا۔ پاک ہند
پریم سبھا کے زیرِ اہتمام بھی ایک نشست ہوئی جناب
محمد احمد صاحب ابڑو بادی نے پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام
کیا اور یا بینی کی قیام گاہ پر پاک ہند پریم سبھا کے

صدر جناب عبد الخالق اللہ والا کی صدارت میں بزمِ شعر و سخن منعقد ہوئی اس موقع پر صدر جناب اللہ والا نے فرمایا کہ بڑا خوش آئند بات ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کے ذریعہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں اور مراسم میں خوشگوار اضافہ ہو رہا ہے۔ اس موقع پر بھارتی سفارت خانے کے کونسل جنرل جناب پارتھو سارتھی نے یہ اعتراف کیا کہ پاک ہند پریم سبھا ہند پاک کی دوستی کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔

عام طور سے میں مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا ہوں لیکن راولپنڈی میں منعقد مشاعروں نیز چند بیرونی مشاعروں میں کئی شاعروں کو جس میں نامور شعرا بھی شامل ہیں وہی کچھ خاص شعر اور غزلیں پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں جنہیں یہ لوگ سالوں سے پڑھتے آئے ہیں گویا ان کے پاس اور غزلیں یا اشعار نہ ہوں۔ کراچی میں بھی جہاں خواہ کئی مشاعرے ہوئے میں نے یہی دیکھا کہ ہر مشاعرے میں وہی اشعار اور وہی غزل یا غزلیں پڑھی جا رہی ہیں کئی شعرائے کرام نے نئی نئی غزلیں اور نظمیں بھی پڑھیں۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ پاکستان میں ترنم یا گلے بازی کے بل بوتے پر کوئی شاعر مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا وہاں شعر کی معنویت کو سراہا جاتا ہے اس کی ادائیگی کے انداز کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ خاص طور پر مشاعروں میں گلے بازی کو پسند نہیں کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ کچھ شعرا جو یہاں ہندوستان میں ترنم کے بل بوتے پر داد پانے اور مشاعرے لوٹنے کے عادی تھے وہاں انہیں مایوس ہونا پڑا۔

شراب نوشی کے معاملہ میں ہندوستانی شعرا نے جو ادا کیا اسے پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا، شراب پینا معیوب ہے یا نہیں ہے تو کس حد تک ہے میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن اعتدال پسندی اصحابِ ذوق کا دامن چھوڑ کر آدابِ محفل سے گریز اور خود کو ایک تماشا بنا لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔ جس کا مظاہرہ مشاعرہ گاہ میں دو صاحبان ہاتھوں سے سہارا دے کر لائے گئے اور اسٹیج پر بھی رندی و مستی کا بھونڈا مظاہرہ کیا جانے یہ قطعاً قابلِ اعتراض ہے ——— ۲ر جون کے انڈو پاک مشاعرے میں تقریباً ۱۵ ہزار سامعین تھے اور سبھی ۱۰۰ روپیوں سے ۲۰ روپیہ تک کے ٹکٹ خرید کر شریک ہوئے تھے اس سے کراچی میں عوام کے ذوقِ سماعت کا پتا لگتا ہے۔ اس مشاعرے کی صدارت جناب میر ظفر اللہ جمالی، لیڈر وزیرِ دفاع پاکستان نے فرمائی اس مشاعرے کا اہتمام نہایت عمدہ طریقہ پر کیا گیا۔ ہندوستانی شعرائے کرام کے علاوہ پاکستانی شعرا و شاعرات نے بھی شرکت کی ان سے کچھ منتخب اشعار ذیل میں اس نظریہ سے دے رہا ہوں کہ پاکستان میں اردو کس منزل میں ہے اس کا اندازہ کیا جا سکے۔

سیدؔ علی سید

نہ ظہورِ حسن ہوتا جو بہاس برگِ گل میں
تو وہ موجِ رنگ بن کر کہیں آشکار ہوتا

لطف احمد نقوی

میں اکثر پوچھتا ہوں اہلِ دل سے اہلِ ایماں سے
اب زندگی میں زہر کی مقدار کتنی ہے

اشفاق حسین

سمندر نے گھیر لیا ہے اگرچہ کشتی کو
بکھیرا نہ ہو تا ہے مچھلیاں تو جال میں ہیں

حسن رضوی (لاہور)

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے حرفِ سلام لکھنا

ساجی احمد ہودی

کم اپنے مقدر کا اندھیرا نہیں ہوتا
سورج تو نکلتا ہے سویرا نہیں ہوتا

حسن عابد

[illegible] کے وقت کے ساتھ ڈھل گئے
[illegible] بہت بدل گئے

[illegible]

پھر کسی کے ملامت آ گیا ہوں

اب آگے کا راستہ ہموار ہوگا

جون ایلیا

فردوسِ جنت و دستاں کا زمانہ ہے

نشاطِ رنگ و بساطِ ہنر ہوا [illegible]

خداوندانِ زمانہ پہ حرف گیر ہو کون

یہ ہیں مالک اور شہرِ جنتِ شداد

سحاب قزلباش

کفر کی بات ہے نہ دیں کی ہے

بات جو کچھ ہے وہ یقیں کی ہے

اُمید فاضلی

آسمانوں سے فرشتے جو اُتارے جائیں

وہ بھی اس دَور میں سچ بولیں تو مارے جائیں

جو کبھی راس آتی ہے ہم سے ہی لہو مانگتی ہے

ہم کہاں تک تری دنیا کو سنوارے جائیں

زہرہ نگاہ ترمنو عروا

شدتِ دار و رسن اور زیادہ کردو

زندگانی کے طلب گار ابھی باقی ہیں

حبیب جالب

ظلمت کو جو فروغ ہے دیدہ وروں سے ہے

یہ کاروبارِ شب یہیں سوداگروں سے ہے

قتیل شفائی

کوئی تو گلا کاٹ نہ ڈالے اپنا

یہ زبانیں ہیں کہ چلتی ہوئی شمشیریں ہیں

مندرجہ بالا شعراء و شاعرات کے علاوہ جناب نگاش

کاملی، پیرزادہ قاسم، ماہتاب تشنہ، رضی احمد شوقی،

پروین فنا سید، کشور ناہید، محسن بھوپالی، ماہر

خانی، کوثر نیازی، سعیدہ صبا اختر، منیر جعفری وغیرہ

جیسے پاکستانی شعراء و شاعرات کے اشعار بھی درج نہیں

کر سکا اس لئے ان سے معذرت خواہ ہوں۔

اب ہندوستانی شعراء کرام کے بھی کچھ منتخب اشعار

ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے کراچی کے مشاعروں میں پڑھے۔

علی سردار جعفری

دکھا ہیں منتظر ہیں ایک خورشید تمنا کی

ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے

خمار بارہ بنکوی

دوسروں پہ اگر تبصرہ کیجئے

سامنے آئینہ رکھ لیا کیجئے

نازش پرتاپ گڑھی

میرے سینے کی حرارت میری رگ رگ کا لہو

مجھ سے لے لے اور میرے ولولوں کو بخش دے

وسیم بریلوی

یوں لگے تیرے تذکرے سے اگر

نام تیرا ہٹا دیا جائے . . . .

جیسے ایک پھول کی کہانی سے

ذکرِ خوشبو اڑا دیا جائے

گلزار دہلوی

گر ذرا ان سے دُور گئے ہوتے

زندگی ختم کر گئے ہوتے

عظیم حیدر امروہوی

گزرتا ہوا حیات کا منظر تو دیکھئے

چھوڑ آئے تھے جسے کبھی وہ گھر تو دیکھئے

مسعود حیات

معجزہ ہو گئی کیا آہ میری تشنہ لبی

ایک قطرے تلے کتنے سمندر نکلے

رئیس نجمی

غم دوراں نے تری یادوں کا

یوں دیا ہے چراغ بے مایہ

جیسے صحرا میں جیسے مل جائے

اک مسافر کو پیڑ کا سایہ

محمود سعیدی

تیرے ماضی کی ہر الجھن ترا اپنا سایہ
اپنے ہی سایہ سے کترا کے نکلتا کیوں ہے
پیکرِ خواب ان آنکھوں میں ٹھہر جا دم بھر
گرمیِ لمس نظر پا کے پگھلتا کیوں ہے
جگتے ناتھ آزاد

ضیائے شمس و قمر سے پہلے تجلیِ کہکشاں سے پہلے
دل اپنے جلوے لٹا رہا تھا فروغِ بزمِ جہاں سے پہلے
دواکر راہی

اگر اے ناخدا! طوفان سے لڑنے کا دم خم ہے
ادھر کشتی کو مت لانا یہاں پانی بہت کم ہے
اگر موجیں ڈبو دیتیں تو کچھ تسکین ہو جاتی
کناروں نے ڈبویا ہے مجھے اس بات کا غم ہے

اب ایک دلچسپ تذکرہ بے محل نہ ہوگا کراچی میں یوں تو اتر پردیش کے بہت سے شہروں کے لوگ بس گئے ہیں لیکن امروہہ اور رامپور کے لوگ بہت کافی تعداد میں ہیں اور انکی انجمنیں بھی کافی سرگرم ہیں۔ امروہہ والے بضد تھے کہ مجھے امروہوی کہا جائے کیونکہ میں امروہہ میں پیدا ہوا ہوں وہیں میری نشو و نما اور تعلیم ہوئی ہے۔ رامپور والے مجھے رامپوری کہہ رہے تھے اور ان کا کہنا حق بجانب بھی تھا کیونکہ رامپور میں ۳۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے بسلسلہ وکالت مستقل طور پر رہتا ہوں اور وہاں سکونت اختیار کر لی ہے اور یہاں کی سماجی، سیاسی اور ادبی زندگی میں گھل مل گیا ہوں۔ اس ذیل میں میرا یہ قطعہ رامپور سے میرے لگاؤ کی عکاسی کرتا ہے ؎

ٹھیک ہے اپنے وطن کی مدح خوانی۔ ہاں مگر
کون سی "مدحت" ہے جس میں مدح خوانِ رامپور
مجھ سے پوچھو کس لئے اپنے چمن کو چھوڑ کر
بن گیا ہوں عندلیبِ گلستانِ رامپور

اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی والے مشاعرے کی نظامت جناب [illegible] خاں [illegible] رامپوری جیسے شاعر فرما رہے تھے اور بڑی خوبی سے یہ کام انجام دے رہے تھے [illegible]

استعمال کرتے تھے اور اس پہ مصر تھے میں نے امروہہ، رامپور کے دوستوں سے کہا کہ دونوں نسبتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن اس معرکہ کا حل بہت ہی آسان ہے وہ یہ کہ دو اگر امروہوی ہے اور راہی رامپوری ہے کیونکہ بحیثیت شاعر میرا جنم رامپور میں ہی ہوا ہے یہاں کے ماحول اور صحبتوں نے مجھے شاعر بنایا اور اصل میں بحیثیت شاعر ہی میرا تعارف اہم ہے ؎

اور جو کچھ ہے بہت غیر اہم ہے۔ راہی
اک یہی اصل تعارف ہے کہ میں شاعر ہوں

غرضکہ دبستانِ امروہہ اور دبستانِ رامپور دونوں سے میری وابستگی ہے اور یوں تو ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اس ملک کے چپے چپے سے میں وابستہ ہوں اور اس پر مجھے فخر ہے۔

کراچی سے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے میں اپنے پرانے ساتھی جناب سجاد خاں سے جو کافی عرصے تک یہاں ڈی۔ جی۔ سی (سرکاری وکیل فوجداری) کے عہدے پر فائز رہے، ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ ان کے خلف اکبر ساجد خاں جو اب وہاں ضلع جج کے گریڈ تک آ گئے ہیں مجھ سے اولڈ بوائز علی گڑھ کے مشاعرے کے دوران اسٹیج پر آ کر مجھ سے پہلے ہی مل چکے تھے۔ سجاد خاں صاحب لقوے کے عارضہ میں مبتلا ہیں داہنا ہاتھ شل پڑ گیا ہے اور زبان میں لکنت آ گئی ہے وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملے اس وقت ان کی آنکھیں نم تھیں میرے ساتھ ظفر خاں افغانی گئے تھے ان کے دوست اور سجاد صاحب کے ایک صاحبزادے جناب واسط صاحب نے اپنی کار سے مجھے کلفٹن روڈ کے جہاں سمندر کے کنارے ہر جمعہ کو شاندار میلہ لگتا ہے اور ویسے بھی کافی چہل پہل رہتی ہے کیونکہ پکنک کے لئے یہ بہت ہی عمدہ اور موزوں مقام ہے پورے علاقے کی سیر کرائی اور بڑے بڑے ہوٹلوں سے متعارف کرایا۔ اسی دن عزیزم ظفر خاں مجھے اپنے خسر جناب امام صادق سے (ایرانی) جو نامور صحافی اور ادیب

ہیں ملانے لے گئے ان کے ساتھ کچھ وقت گزار کر دلی مسرت ہوئی۔ بہت ہی روشن خیال اور با احساس شخصیت کے آپ مالک ہیں۔ برادرِ محترم جناب رئیس امروہوی کے بھائی جناب جون ایلیا صاحب اور محمد تقی صاحب سے بھی کراچی سے روانہ ہونے سے قبل ملاقات کی اور ان صاحبان سے تبادلہ خیالات کرکے بہت خوشی ہوئی۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر اور کیا جائے یہ ضروری ہے جس دن میں کراچی سے روانہ ہونے والا تھا اور کامریڈ ظہیر خاں کے یہاں کھانا کھا رہا تھا میرے لئے ایک ٹیلی فون آیا۔ ایک صاحب جہانگیر خاں منیجر مسلم کمرشیل بینک نے ٹیلی فون پر مجھ سے خطاب کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ وہ ملاقات کے لئے آنا چاہتے ہیں اور میں نے ان سے درخواست کی کہ جلد تشریف لے آئیں وہ آئے اور انہوں نے مختلف مشاعروں ونشستوں میں لئے گئے میرے سادے اور رنگین فوٹو پیش کئے اور اپنا وزٹنگ کارڈ (Visiting Card) پیش کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ آئندہ جب بھی میں کراچی آؤں تو ایک شام ان کے ہاں عشائیہ اور نشست میں شرکت کر دوں۔ ان صاحب کے اخلاص اور اپنائیت کے جذبے سے میں کافی متاثر ہوا۔

کراچی سے روانہ ہونے کے ایک دن قبل روزنامہ "امن" کراچی کے خصوصی نمائندے نے میرا انٹرویو لیا جس میں میری شاعری، ہندوستان میں اردو کی ترقی، پاکستان کے ادبی ماحول وغیرہ مختلف موضوعات پر سوال وجواب کا سلسلہ کافی دیر رہا۔ غالباً وہ انٹرویو شائع ہوگیا ہوگا یا ہونے والا ہوگا۔ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ میرے ذہن پر کراچی شہر کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہاں آکر مجھے یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ کسی دوسرے ملک میں آگیا ہوں کیوں کہ ویسے ہی لوگ ہیں ویسی ہی سڑکیں ہیں وہی بات ہے وہ اخلاق وآداب کے طریقے ہیں ویسی ہی صفائی ہے اور ویسی ہی گندگی بھی ہے مستورات کو بھی وہی آزادی ہے کاریں چلاتی ہیں خطبے پڑھتی ہیں دفتروں اسکولوں اور کالجوں میں کام کرتی ہیں مختلف تقاریب کے اہتمام میں بھی پیش پیش رہتی ہیں پردے کا کہیں نام ونشان نہیں ہے اس لئے مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کسی اور ملک میں آگیا ہوں لیکن جب مجھ سے اصرار کیا کہ جو فرق محسوس ہوا ہو وہ بھی بتائیے تو میں نے عرض کیا کہ فرق یہی ہے کہ ہندوستان میں ہر جگہ دیش کے آدمی ملتے ہیں۔ دیش کی ہی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں اور ہر طرف نظر آتی ہیں اور وہیں کی آب وہوا ملتی ہے۔ لیکن کراچی میں ہر چیز امپورٹیڈ (Imported) ہے یا غیر ملکی ہے یہاں آدمی سب امپورٹیڈ ہیں کاریں اور دیگر اشیاء بھی امپورٹیڈ ہیں اور حد یہ ہے کہ یہاں کی آب وہوا بھی امپورٹیڈ ہے یوں کہ کبھی یہاں کوئٹہ کی ہوا چلتی ہے تو کبھی کھاڑی کی ہوا چلتی ہے اور اب تو موسم بھی بدل گئے ہیں کیونکہ یہاں بارش بھی ہونے لگی ہے شاید اس لئے جناب رئیس امروہوی صاحب نے فرمایا تھا ؎

ہم جو ہندوستان سے آئے ہیں
اپنا موسم بھی ساتھ لائے ہیں

آخر میں یہ کہے بغیر میں نہیں رہ سکتا کہ کراچی کے اس سفر سے مجھے دلی مسرت ہوئی ہے نہ صرف اس لئے کہ وہاں سے کامیاب واپس آیا ہوں بلکہ اس لئے بھی کہ میرا حلقۂ احباب اب اور زیادہ وسیع ہوگیا ہے اور پاک ہندوستی کے مشن میں بھی کچھ رول ادا کر سکا ہوں شاید میں قطعہ سے میرے احساس کی ترجمانی ہوتی ہے ؎

کچھ جلا کر چراغِ شعر وادب
ہم کراچی سے لوٹ آئے ہیں
اور وہاں سے ادب نوازی کا
ہدیۂ پُرخلوص لائے ہیں

اب اجازت دیجئے
ڈاکٹر راہی

(صفحہ ۱۴ کا بقیہ)

توڑ دیا اور آج طاہر کیفی یک و تنہا اندھیروں میں بھٹکتا پھرتا ہے
آپ غالباً جناب عبدالحکیم شاہد رتلامی سے واقف ہیں
اُن سے معلوم کیجئے کہ طاہر کیفی اور ان کی مرحومہ بیوی فردوس
کیا تھے۔ طاہر کیفی صاحب فردوس کے ساتھ اپنی شاعری اور
اپنی ادبی اُپج کو کراچی میں دفن کر کے کویت آچکے ہیں مگر
اب وہ ایک زندہ لاش ہے۔ پاکستان کے مشاہیر شعراء
مثلاً رئیس امروہوی۔ فراست رضوی۔ راغب مرادآبادی۔
ڈاکٹر یاور عباس دہلوی اور کویت میں اُستاد قائم
امروہوی۔ فیض کوثر وغیرہ نے مرحومہ پر نظمیں لکھیں
تاریخ وفات نکالیں، مضامین لکھے۔ فیض کوثر صاحب کا
مضمون جو "آہ فردوس" کے عنوان سے روزنامہ عرب
ٹائمز میں چھپا تھا ہمرشتہ ہٰذا ارسال ہے۔

پاکستان و کویت کے ادبی ثقافتی اور سماجی حلقوں
میں آج بھی روزِ اوّل جیسی سوگواری ہے، ہر دل اداس
اور ہر محفل سونی۔ طاہر کیفی ایک بُت کی طرح خاموش ہے
اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو کے ہر قطرہ کی تپش
پتھر کو پگھلا دیتی ہے۔ مزار کے کتبہ کے لئے بدقت تمام
ان ہی سے شعر کہلوا لئے گئے۔

کویت، تو نے یہ کیسا سلوک مجھ سے کیا
مسافرت میں غریب الوطن کو لوٹ لیا
مجھے گلہ ہے کہ مجھ سے چھڑا کے ہاتھ اپنا
میرے ہی سامنے دستِ قضا کو تھام لیا

مختصر یہ کہ مرحومہ کے لگائے ہوئے ادب کے پودے مرجھا
رہے ہیں اور طاہر کیفی مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

بڑے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ ہوا ہے کہ مرحومہ کی
برسی پر ان کی ادبی سرپرستی اور خدمات کو خراجِ عقیدت
پیش کرنے کے لئے ایک بروشر نکالا جائے جس میں پاک
ہند و کویت کے شعراء کرام اور ادباء عظام کی عقیدت کے لئے
نظمیں، قطعات۔ تاریخ وفات۔ مضامین و پیغامات
شائع کئے جائیں ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ اردو ادب
اور صحافت کے وہ ستون ہیں جن پر کاشانۂ اردو قائم
ہے۔ آپ ایک بااثر اور معتبر صحافی ہیں۔ کیا آپ اس
سلسلہ میں ہماری مدد کر سکتے ہیں یعنی مرحومہ کے لئے
جتنی بھی ہو سکیں نظمیں، قطعات۔ تاریخ وفات۔
مضامین اور پیغامات ہمیں فراہم کر سکتے ہیں تاکہ وہ
اس بروشر میں شامل کر دئے جائیں۔ آپ کے جواب
کا ہمیں بے چینی سے انتظار رہے۔ مرحومہ کے کوائف
حاضر ہیں۔

مرحومہ کے کوائف

نام: فردوس نگہت۔ شوہر کا نام: طاہر کیفی۔
مقام پیدائش: دہلی ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء۔ مقام وفات
کویت۔ تاریخ وفات: ۱۴ جون سنہ ۱۹۸۳ء مطابق
۲ رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۳ھ۔ مدفن: کراچی۔
تاریخ دفن: ۱۷ جون سنہ ۱۹۸۳ء مطابق ۵ رمضان المبارک
سنہ ۱۴۰۳ھ۔ تاریخ نکاح: ۱۷ اگست سنہ ۱۹۶۲ء
طاہر کیفی نگی کہہ کر پکارتے تھے۔ پسماندگان میں دو بیٹے سہیل طاہر
و ریحان طاہر اور شوہر طاہر کیفی

خصوصیات

ہنس مکھ۔ مسکراتا چہرہ۔ اس کی ذات خود ایک
انجمن تھی۔

ادب۔ آرٹ اور موسیقی سے والہانہ لگاؤ تھا۔
شاعرہ تھی مگر شاعر گر تھی۔ طاہر کیفی کی شاعری آپ کی
مرہونِ منت ہے۔ سخن فہم و سخن سنج۔ اساتذہ کی
عزت و احترام اور مبتدی کی ہمت افزائی کرتی تھیں۔
بڑی سوجھ بوجھ کی مالک تھی۔ انتہائی خلیق، ملنسار۔
لہجہ میں نرمی۔ گفتگو میں شوخی۔ خوش مذاق و خوش
اخلاق۔ خوش وضع۔ سلیقہ شعار۔ بلا کی صفائی پسند۔
جفاکش۔ منکسر المزاج۔ متواضع۔ خلق و مروت کا پیکر۔
وفا اور خلوص کا شاہکار۔ حیا کی تصویر۔ مونس و غم خوار۔
جود و سخا کا نقشِ دوام۔ امن پسند۔ لڑائی جھگڑوں
سے دُور بھاگتی تھیں۔ اگر انہیں یہ علم ہو جاتا کہ فلاں فلاں

ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر ہیں تو جب تک ان کا میل نہ کرا دیتیں چین سے نہ بیٹھتیں۔ متواضع ایسی کہ بدسے بدترین حالات میں بھی کسی کو بغیر تواضع کئے گھر سے نہ جانے دیا۔ جو ایک دفعہ مل لیتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ شیریں زبان ایسی کہ دشمن دوست بن جاتے۔ مونس و غم خوار ایسی کہ اپنے دیے ائے سب اپنا درد انہیں سنانے آتے اور وہ سب کا درد اپنا لیتیں۔ تسلیاں دیتیں۔ دلجوئی کرتیں اور روتا ہوا آنے والا اُن کے پاس سے ہنستا ہوا جاتا۔ غرضیکہ وہ ایک دیوی تھی جو اپنے تمام تقدس کے ساتھ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

وہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئی مگر بھید بھاؤ سے نفرت تھی۔ وہ مسلمان۔ ہندو۔ سکھ یا عیسائی سے زیادہ انسانیت کو ترجیح دیتی تھیں اور اُن کا سلوک سب کے ساتھ مساویانہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی نماز جنازہ میں جو کویت میں ہوئی تھی اس میں مسلمان۔ ہندو۔ سکھ۔ عیسائی۔ بدھ اور عرب اتنی تعداد میں صف بستہ تھے کہ آج تک کویت میں اتنی بڑی نماز جنازہ کسی غیر عرب عورت یا مرد کی نہیں ہوئی۔ جنازہ کو بھی ہر مذہب اور ملت کے فرد نے کندھا دیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر دل نالہ کناں تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا وہ کسی کی ماں۔ کسی کی بہن۔ کسی کی بیٹی کسی کی دوست اور طاہر کیفی کی بیوی تھی۔

ضوابط کی تکمیل کی وجہ سے میت تین دن تک کویت میں رہی۔ طاہر کیفی کا وہ گھر جہاں کبھی قہقہے گونجتے تھے ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور آج بھی در و دیوار سے سوگواری ٹپک رہی ہے۔ کویت ائر پورٹ پر اتنا کثیر مجمع تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ اس سے زیادہ مجمع کراچی ائر پورٹ پر تھا۔ اور جب کراچی میں میت تابوت سے نکال کر آخری دیدار کے لئے گہوارہ میں رکھی گئی تو کسی کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ تین دن کی رکھی ہوئی میت ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک حور محوِ خواب ہے۔ چہرہ تر و تازہ۔ مُردنی کا نام نہیں۔ لب پر وہی تبسم۔ بدبو نام کو بھی نہیں۔ یہ ایک سہاگن کا آخری سفر تھا۔ مرحومہ شب و روز یہی دعا کرتی تھیں کہ سہاگن مروں اور شوہر کے ہاتھوں میں دم نکلے اور ایسا ہی ہوا۔

اس طرح بقائے دوام کا تاج پہنے سب کے دلوں پر اپنی حکمرانی چھوڑ کر خوش خوش جنت الفردوس میں کو سدھاریں کہ وہ طاہرہ و اطہر تھیں اور ہر طاہر کا مقام فردوس ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والی میں" آمین

براہ کرم شعرائے کرام اپنی تخلیقات اس پتہ پر بھجوائیں یا دفتر شان ہند میں بھجوائیں۔

طاہر خاں پوسٹ بکس 41
صفات۔ کویت

آپ کا اپنا
عبدالمجید نجم کویت

غزل

اختر
شاہجہاں پوری

آکاش کے تارے بھی آجاتے ہیں دھرتی پر
نازاں نہ کبھی ہونا تم اونچی حویلی پر
اے خشک زمینو تم امید رکھو تا
عفت نہیں کرتے ہیں جاتی ہوئی بدلی
اس سال تو لگنی ہے کچھ ہاتھوں میں مہندی بھی
آئے نہ بلا کوئی اس گاؤں کی کھیتی پر
کب عشق بھلا سوچو چھپتا ہے چھپانے سے
ناراض ہوئے دجہ تم اپنی سہیلی پر
ہم بوجھ نہیں پائے قسمت یہ ہماری تھی
کیا کیا نہ ہمیں دیتا وہ ایک پہیلی پر
اک عمر میں ہوتا ہے حاصل یہ مقام اختر
کیوں سرسوں جاتے ہو تم اپنی ہتھیلی پر

ملک و قوم کی شاندار ترقی کے لئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

کے

جدید ۲۰ نکاتی پروگرام

کی کامیابی اور اسے عملی جامہ پہنانے میں

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

پوری طرح مستعد ہے اور اپنی تمام تر خدمات وقف کرتا ہے

بینک نے موجودہ قرضہ جات کی رقم کا ۸۰ فیصد سے زائد سرمایہ اسی پروگرام کے تحت پسماندہ طبقوں کو فراہم کیا ہے

ہیڈ آفس
۷۸ - محمد علی روڈ
بمبئی - ۴۰۰۰۰۳
فون: - ۶۵ - ۱۲۵۱۶۱

دہلی برانچ
۳۶۵۵ نیتا جی سبھاش مارگ
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون: - ۲۶۴۳۷۴ - ۲۶۸۲۶۶

مَن کہ مکتوب الیہ

ڈی - ۵۰ - گل مہر پارک نئی دہلی ۴۹

پیارے سرور تونسوی

آپ نہیں جانتے کہ "شانِ ہند" پڑھنے کے لئے میں کتنا بے قرار رہتا ہوں مگر آپ صرف میرے تقاضے کبھی کبھی کوئی شمارہ بھیج دیتے ہیں، یہ بے نیازی بُری نہیں، مگر پُرانے احباب سے بے نیازی ؟

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھے معزز مفت خوروں میں شمار کر لیں اور ہر شمارہ بھیج دیا کریں۔ حساب کتاب تو روزِ حشر پر بھی ہو سکتا ہے۔

سنتا ہوں، یوسف ناظم کے ایک مضمون پر آپ نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے مگر میں اسے پڑھنے سے محروم ہوں۔ کیا یہ سلسلہ میں پڑھ سکتا ہوں۔

میری پرابلم یہ ہے کہ میں اب گھر سے نکلتا ہی نہیں مگر شوخیٔ ذوق تو ابھی زندہ ہے۔

فکر تونسوی

گوال منڈی - لاہور (پاکستان) ۲ر اگست ۱۹۸۳ء

جناب ودیا پرکاش صاحب

آداب

یہاں کے متعدد اخبارات نے عرشی زادہ طریقۂ تدریس اُردو کے بارے میں آپ کا بیان نمایاں طور پر شائع کیا ہے شاید ہندوستانی اخباروں سے نقل کیا گیا ہوگا۔ آپ کے بیان کے ایک ایک حرف سے اُردو زبان کے لئے دردمندی اور دل سوزی جھلکتی پڑتی ہے اگر خود مسلمانوں میں مرزا ظاہر دار بیگ قسم کے لوگوں کی جگہ آپ جیسے ہلالِ اُردو زبان ہوتے تو آج حالات مختلف ہوتے۔ سچ یہ ہے کہ اُردو کے پودے کو پنجاب کے غیر مسلموں نے بھی اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے تو پھر ان کو اُردو کے فنا ہونے کا دُکھ کیوں نہ ہو اور وہ کیوں نہ کہیں کہ خواہ اسے مسلمان پڑھیں مگر پڑھیں تو سہی۔

آپ کا بیان پڑھ کر ایک تو عرشی زادہ طریقۂ تدریس کی افادیت کا علم ہوا دوسرے یہ سوچ کر دل بھر آیا کہ سرحد پار بھی کیسے کیسے اُردو کے شیدائی موجود ہیں جو بے تعصبی کے ساتھ اُردو کی ترقی کے لیے آواز بلند کرتے ہیں اگرچہ وہ بے بس ہیں اور اُردو کے گندم نما جَو فروش مسلمان حامیوں کی طرح محض اس نام پر تجارت نہیں کرتے نہ سیاسی دُکان چمکاتے ہیں۔

جب آپ نے پاکستانیوں کو عرشی زادہ طریقۂ تعلیم کی افادیت کا احساس دلایا ہے تو پھر اس کے بارے میں مفصّل تعارف بھی آپ ہی پاکستانی اخبارات کو بھجوائیں تا کہ لوگ یاد رکھیں کہ ایک غیر مسلم قرآن کے حوالے اور ذریعے سے کس طرح اُردو کو پھیلانا چاہتا ہے۔

شورش مرحوم کے زمانے میں چٹان کے دفتر جانا ہوتا تھا تو آپ کا رسالہ پڑھنے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ اب مدت سے محروم ہوں۔

اُردو کے لیے آپ کے جذبۂ محبت کو میرا سلام پہنچے

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

نیاز کیش

اے - رحیم

چنڈی گڑھ ۱۶ر اگست ۸۳ء

مکرمی و محترمی سرور صاحب

جے ہند!

اس بار آپ سے جی بھر کے باتیں ہوئیں جس سے طبیعت بہت شاد ہوئی۔ آپ کا دربار گویا ایک مردِ قلندر اور درویش کا دربار ہے لیکن اس میں چھوٹے بڑے شیخ و برہمن، امیر و غریب سب محبت اور عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں اور یہ سب آپ کی انسان دوستی کا نتیجہ ہے۔ کاش خدا نے ہر آدمی کو آپ جیسا دل اور آپ جیسا ذہن عطا کیا ہوتا تو اس دنیا میں نفرت اور حقارت کہیں نظر نہ آتی۔

اس مرتبہ آپ کو بہت اچھی صحت میں دیکھا اور یہ بھی محسوس ہوا کہ آپ کا کتابوں کا کاروبار ترقی پذیر ہے۔ آپ کی محنت رائیگاں نہیں گئی، علمی و ادبی جلسوں میں آپ کے پُر زور اداریوں کا ذکر ہوتا ہے اور "شانِ ہند" کا نام لیا جاتا ہے۔ مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ "شانِ ہند" کی گولڈن جوبلی آپ کی توقعات کے مطابق منائی جائے گی۔

مجھے اپنے علم کی کم مائیگی کا اعتراف ہے جب میں آپ کے یا اختر صاحب کے روبرو حاضر ہوتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ کمزور انسان ہوں اس لئے زمین پر ہی رہنا چاہتا ہوں آسمان پر پرواز نہیں کرنا چاہتا آپ کی نیک خواہشات اور دعائیں میرے ساتھ ہیں تو پھر کسی چیز کی حاجت نہیں مرشد کی دعائے خیر سے جو روحانی سکون ملتا ہے اسے احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔

احقر وشوا ناتھ طاؤس

سہارنپور ۱۱ر جولائی ۸۳ء

عزیزم سرور سلمہٗ

آپ کی عنایاتِ بیکراں اور نوازشاتِ بے پایاں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ الفاظ کہاں سے لاؤں اور وہ زبان کہاں سے مہیا کروں کہ جن کے ذریعہ آپ کا مکمل شکریہ ادا کر سکوں۔ میرا رُواں رُواں آپ کو زندگی بھر دعائیں دے گا۔ خدا آپ کو اور روحی بیٹی کو رہتی دنیا تک سلامت اور خوش رکھے۔ آمین!

میرا صرف ایک کام باقی رہ گیا ہے اور وہ آپ کو معلوم ہے بس وہ میری زندگی کی آخری حسرت ہے۔

فقط۔ دُعا گو

آرزو سہارنپوری

اقبال منزل لکھنؤ

جنابِ عمِ محترم و مکرم

سلام و نیاز

خدا کرے آپ رُو بہ صحت ہوں آپ کے گزشتہ خط نے آپ کی علالت کی تفصیلات معلوم کر کے بہت تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم پر تادمِ زیست آپ کے سایۂ عاطفت کو قائم رکھے۔ ادبی نقطۂ نظر سے ایک زبردست واہم ذمہ داری آپ نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا دارو مدار بہت کچھ وہاں کے ساکنین کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات کی رفعت پر ہوتا ہے اور یہ رفعت انسانی ذہن کے ارتقاء پر منحصر ہے اور یہ ذہن وہاں کے ادب اور ادبی صحافت کے علمبرداروں سے کافی حد تک متاثر ہوتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ آپ لوگ اپنی پُر خلوص و بے غرض کاوشوں کے ذریعہ ان محدود ذہنوں کو ایک وسیع و عریض دنیا سے روشناس کرا رہے ہیں۔ اس ضمن میں "شانِ ہند" میں "بلبل چہ گفت؟ گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟" اور "بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر" کے عنوانات کے تحت جو خاکے لکھے جاتے ہیں وہ بہت اثر انگیز و سود مند ہوتے ہیں۔

جولائی ۸۳ء کے شمارہ میں اپنی غزل دیکھی آپ کی بے حد مشکور و ممنون ہوں کہ میری ادنیٰ تخلیقات پر بھی آپ توجہ مبذول فرماتے ہیں۔ گو مجھے اچھی طرح اس بات کا احساس ہے کہ اپنی تخلیقات میں میں ابھی تک کوئی خاص تاثر پیش نہیں کر پاتی لیکن آپ لوگوں کی کرم فرمائی اور عزت افزائیوں سے مجھے پوری امید ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ نہ کچھ پختگی آ ہی جائے گی جولائی کے شمارہ میں

جو غزل شائع ہوئی ہے اس میں مطلع کا پہلا مصرعہ غلط چھپ گیا ہے اس میں لفظ "آئے گی" کے بجائے صرف "آئے" ہے یعنی ؎ موت کب آئے خبر کچھ بھی نہیں۔
ربّ العزت آپ کو صحتِ کلّی سے نوازے اور طاقت وہمت عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین۔ اب اجازت چاہوں گی۔ آپا جی کی طبیعت عید کے بعد سے کافی خراب چل رہی ہے۔ خدا آپ سب کو تندرست رکھے۔

والسلام مع الاکرام
طالبِ دعا۔ آپ کی مخلص بیٹی
رُخسانہ نکہت لاری

سخن سفارت
احمد پور شرقیہ (بہاولپور) پاکستان

شانِ ہند کا جولائی ۸۳ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ہندوستان میں کچھ مفاد پرست لوگ اُردو کو فقط مسلمانوں کی "جاگیر" سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جیساکہ جنابِ سرور تونسوی نے کہا ہے گلشنِ اُردو کی آبیاری میں بلاتخصیصِ مذہب تمام اہلِ ہند ادیبوں اور شاعروں کا خونِ جگر شامل ہے۔ جناب مآز لائل پوری کے بارے میں جناب توصیف علوی عاصی صاحب کا مضمون بہت اچھا تھا مگر معلوم نہیں کہ راز صاحب کے متعلق خود عاصی صاحب کے قطعہ کا آخری مصرعہ بے وزن ہی تھا یا کاتب کی مہربانی ہوئی ہے؟ جناب زار علامی اور ڈاکٹر شمیم قدوائی کی غزلیں بہت ہی اچھی ہیں۔ غزلیں تو باقی بھی اچھی ہیں مگر اختر شاہجہاں پوری کی غزل کے چھٹے شعر کا مصرعۂ اولیٰ اور راہی آنی کے مطلع کا مصرعۂ اولیٰ زائد از وزن ہیں عبدالرّب نشتر کے مقطع کا مصرعۂ اولیٰ، اصل بحر سے کم وزن میں ہے۔ یوسف ثانی نے اپنی غزل کے پانچویں شعر کے مصرعۂ ثانی میں پیالا کو پالا کے وزن پہ باندھا ہے جبکہ "انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں" .... ؟ ذاکر کے۔ کے ریشی کی غزل کے تیسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں تاہے "زیادہ ہے" ـــــ مسلم یوتھ کارز پالی کے مشاعرے کی رپورٹ پڑھی۔ یوسف ثانی پالوی کی غزل کا دوسرا شعر خارج از وزن ہی نہیں قافیہ بھی ندارد۔ ہر شعر یوں بھی کمزور ہے۔ پھر دوسری غزل کی ردیف میں "لوگ" زبردستی گھسیڑے گئے ہیں گو الفاظ دبا کر پڑھنے سے وزن پورا ہوجاتا ہے مگر خواہ مخواہ لفظ کیوں دبنا چاہئے۔ اگر "لوگ" نکال دئے جائیں تو وزن صحیح ہوجائے گا۔ ثانی صاحب ہی کے ایک اور شعر میں "ہنس بول رہا ہے" کو کاتب نے "نہیں بول رہا ہے" لکھ دیا ہے۔ سردار پالوی کے قطعہ کے بعد رفعت سروش کو جو شعر یاد آیا اس کے مصرعۂ اولیٰ کے آخر میں "کہی" کی بجائے "کہدی" ہونا چاہئے تھا۔ سردار پالوی کی غزل کا یہ مصرعہ "اب زیست کا ہر لمحہ لگتا ہے پرایا، آخر میں "سا" چاہتا ہے۔ عثمان غنی کے مقطع کا مصرعۂ ثانی گرہ بڑا کا شکار ہے شاید صحیح یوں ہوتا "رہیں جیسے میں غنی تیں گل سمن کی طرح" ساحر القادری کے تیسرے شعر میں "گاؤں" کو "گانوں" لکھا گیا ہے۔ ش۔ ک۔ نظام کی دونوں غزلیں بہت اچھی ہیں مگر پہلی غزل کا مطلع ثانی کچھ بے تاثر سا ہے۔ افتخار امام کے قطعہ کا دوسرا مصرعہ خارج از وزن ہے۔ اگلے شعر میں کیا جانے کی جگہ کیا جانئے ہونا چاہئے تھا۔ نیر صاحبہ کی دوسری غزل کے پہلے دو اشعار کے مصرعہ ہائے ثانی خارج از وزن ہیں۔ رفعت سروش کی نظمیں "میراث" اور "نوحہ" دونوں اچھی ہیں۔ مگر غزل کے تیسرے شعر میں "ان" کے تعلق کے ساتھ "تمہیں" لانا شتر گربہ کی مثال ہے۔ یوں مجھے یقین ہے کہ مشاعرہ بے حد کامیاب رہا ہوگا۔
اب کچھ مشاعرۂ جشنِ فطرت انصاری سکندرآبادی کی رپورٹ کے بارے میں۔
جمیل تاباں کی غزل کے تیسرے شعر کا مصرعۂ اولیٰ خارج از وزن ہے۔ شہباز ندیم کے مطلع کا مصرعۂ اولیٰ دوسرا شعر پورا کا پورا اور تیسرے شعر کا مصرعۂ اولیٰ

خارج از وزن ہیں۔ سعید رامش کا مطلع کچھ بے معنی سا ہے " مدتوں " کا استعمال اُبھرنے کے حوالے سے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سراج متین کے مطلع کا مصرعۂ ثانی زائد از وزن ہے۔ حبیب عاصم دہلوی کا مطلع بے جان ہے " ایسی شرافتیں " کی وضاحتیں نہیں ہوئیں۔ انہی کے آخری شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں شہر کو غلط وزن میں باندھا گیا ہے جبکہ مصرعۂ ثانی میں " کچھ " زائد ہے۔ مختار عثمانی کے دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ خارج از وزن ہے " سحر سے پہلے " یہ " ہونا چاہیئے تھا۔ کاتب صاحب شاید میری یا میرے کو مری یا مرے لکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں جیسے افضل کر تپوری کے مطلع میں میری کی جگہ مری؛ اور آذر سیانوی کے دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں میرے کی جگہ مرے لکھ گئے ہیں۔ آذر سیانوی کی دوسری غزل کا دوسرا شعر نا ئداز وزن ہے (بلا قصورِ کاتب) میکش رایونی کے اشعار خوبصورت ہیں مگر کاش وہ " وہی اک اداس آنکھیں " کی بجائے " وہی دو اداس آنکھیں " کہتے تو شعر کا حسن دوبالا ہوجاتا۔ حامد القادری رام پوری کے پہلے دو اشعار خارج از وزن ہیں اگر " اس " اور " اندھیرا " کی جگہ " اسی " اور " اندھیارا " کہا جائے تو وزن درست ہوجائے گا۔ اظہر کمال بدایونی اگر پہلے شعر میں " فقط " کی جگہ " بس " لاتے تو زیادہ بہتر تھا " رستے " اور " دھنستے " کا ہم قافیہ ہونا کیسا ہے؟ ہم کیا جانیں؟ ضیاء الرحمٰن صاحب کے دوسرے شعر کا مصرعۂ اولیٰ۔ سبحان اللہ۔ کچھ کہنے کا یارا نہیں۔ باقی شعراء کا کلام نہایت خوبصورت اور دل نشیں ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ انتخابِ شعر کے لحاظ سے سب سے کامیاب مشاعرہ جون پور چودسنڈ کا مشاعرہ ہے کہ تمام شرکاء کا نمونۂ کلام ان کی فنی گرفت اور لطافتِ خیال کی عکاسی کرتا ہے فقط عشرت صدیقی کے شعر کا مصرعۂ ثانی رہ گیا۔ اور " تو " کے درمیان " ہے " کے اضافہ کا محتاج ہے۔

باقی دو سطریں کر تپور کے مشاعرہ کے متعلق۔ رنگین مرادآبادی کا مصرعۂ اولیٰ زائد از وزن ہے راشد عارفی کے مطلع میں کاتب نے انتساب کو انکشاف لکھا ہے۔ راحت اندوری کا پہلا مصرعہ خارج از وزن اور دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ زائد از وزن ہیں۔ باقی کلام عمدہ ہے۔ یوں یہ مشاعرہ بھی ایک نہایت کامیاب مشاعرہ تھا۔ افسانہ کفارہ ایک درمیانہ سطح کا افسانہ ہے۔

انجم لاشاری

کویت　۱۰ راگست ۱۹۸۳ء

مکرمی و محترمی جناب سرور تونسوی صاحب

تسلیمات

مزاج گرامی۔

ماہنامہ " شان ہند " اسم بامسمیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت کے تمام بیباکانہ پہلو لئے ہمیں مل رہا ہے۔ ہمارا یہ احساس تقویت پکڑتا جارہا ہے کہ شمعِ اردو بادِ مخالف کے تند و تیز تھپیڑوں کے باوجود ابھی روشن ہے اور ہر جھونکا اس کی لَو کو اور اُبھار دیتا ہے۔ طاہر کیفی صاحب تو آپ کے ماہنامہ کو " سفیر اردو " کہتے ہیں اور بہت ہی ٹھوس دلائل کے ساتھ آپ کے مستقل عنوانات کے اقتباسات پڑھ پڑھ کر گھنٹوں بولتے تھے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ " تھے " کیوں استعمال کیا گیا آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہند کا " بہار اکبرآبادی " اور پاکستان و کویت کا " طاہر کیفی " زندہ ہونے کے باوجود مر چکا ہے۔ اس کی شریکِ حیات ۱۴ جون ۸۳ء کو اس کا ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔ اگرچہ مرحومہ پچھلے کئی ماہ سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھیں اور ایسے نازک لمحات سے بھی گزر گئیں کہ بچنے کی تمام امیدیں معدوم ہوچکی تھیں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا اور جب ڈاکٹروں نے یہ کہا کہ اب یہ بالکل صحت مند ہیں اور خطرہ ٹل چکا ہے تو چلتے پھرتے ہنستے بولتے اپنے شوہر کی بانہوں میں دم

([illegible])

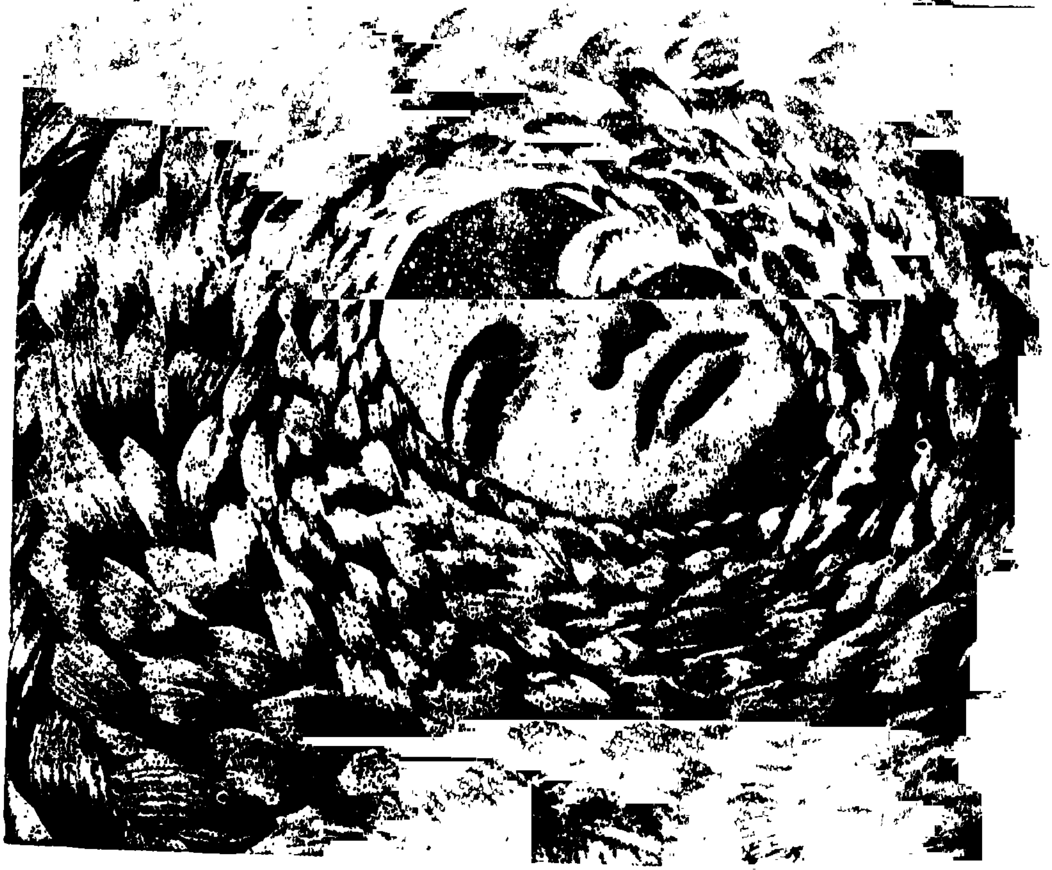


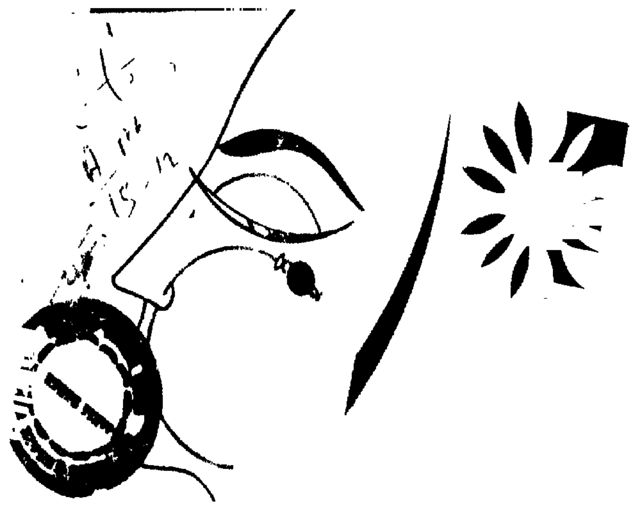
چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے یا گرمی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جلد جل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور پھر آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

مشرع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

قیمت: چھ روپے

... MONTHLY NEW DELHI-1100..
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





ٹیلی فون نمبر ۲۷۵۶۰۲ رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۲۷

ہند و پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ
شان ہند نئی دہلی

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ایڈیٹر
سرور تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپے
زرِ سالانہ ۲۴/- روپے

جلد نمبر ۴۴	نومبر ۱۹۸۳ء	شمارہ نمبر ۱۱

غزلیں

احمد حسین شمس

غم کیا ہے رات اندھیری اگر ہے
خود برق ہی شریکِ سفر ہے
عالم تمام دیدۂ حیراں
ہر ذرہ کا حیات دست نگر ہے
طوفاں بدوشِ دشتِ تمنا
زد میں بس ایک خشک شجر ہے
اے منظرِ جمیل سنبھل بھی
نازک بہت ہی تارِ نظر ہے
اپنا وجود سر بگریباں
امکاں کی بزم زیر و زبر ہے
اک آہ کا یہ محسن کرشمہ
ہر رہگزر پہ رقصِ شرر ہے
ہر سمت شمس گرم ہوائیں
اندر کی آگ کا یہ اثر ہے

کیا سورج آ گیا ہے گہن میں
کمھلا گئی ہے دھوپ پون میں
میرے قدم کی چاپ سے اب تک
اک سنسنی ہے کوہ و دمن میں
جب منہ چڑھائے عکس ہی اپنا
کیوں پھر لگے نہ آگ بدن میں
دھرتی کہ ہم کو کھ سوکھ چلی ہے
کانٹے بنے ہیں پھول چمن میں
شاید ہوس کی آگ بجھانے
ٹپکی نئی اوس گل کے دہن میں
اک ناگ ڈس رہا ہے زمیں کو
اک چیل اڑ رہی ہے گگن میں
اے شمس غم نہ کر کہ ہوائیں
رخ موڑتی ہیں چشم زدن میں

دریا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ ۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔


بیس نکات کا یہ مقصود
کنبہ ہو سب کا محدود
davp 88/342

بُلبُل چہ گفت و گُل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے عہدہ داران کے لئے ایک لمحۂ فکریہ

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ ہر سال اُردو کتابوں کے مُصنّفین کو ایک معقول رقم بطورِ انعام دیتی ہے۔ ہندوستان بھر سے اُردو کتابیں اکاڈمی میں انعامی مقابلہ میں شریک ہونے کے لئے موصول ہوتی ہیں اور اکاڈمی کے عہدہ داران اور ممبران میں سے کچھ دانشوروں کی ایک انعامی کمیٹی بنادی جاتی ہے جو سات ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ انعام میں شامل ہونے والی کتابوں کی اکاڈمی آٹھ آٹھ جلدیں طلب کرتی ہے ایک ایک جلد دفتر میں ریکارڈ کے لئے اور سات سات جلدیں انعامی کمیٹی کے سات ممبران کے لئے یعنی ہر کتاب کی ایک ایک جلد انعامی کمیٹی کے ہر ممبر کو دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنا اپنا فیصلہ صادر کریں اور پھر ایک خاص میٹنگ میں جن کتابوں کے بارے میں اکثریت کی رائے ہوتی ہے انہیں درجہ دار انعام کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ (ایسا کہا جاتا ہے) انعام میں شریک ہونے والی کتابیں ۱۵ر جنوری تک اکاڈمی کے دفتر میں موصول ہوجانی چاہئیں گزشتہ ۱۶ر جنوری کو ایڈیٹر شانِ ہند اُردو اکاڈمی لکھنؤ کے دفتر میں موجود تھا اور سینکڑوں کتابوں کے بنڈل (جو کہ انعامی مقابلہ کے لئے موصول ہوئی تھیں) انعامی کمیٹی کے ممبران کے ہاں بھجوائے جا رہے تھے۔ انعامات کا اعلان ۳۱ر مارچ تک کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۳۱ر مارچ سے پہلے ہی آخری میٹنگ منعقد ہوگی۔ پچھلے سال غالباً ۳۲۱ کتابیں انعامی مقابلہ کے لئے اکاڈمی کو موصول ہوئی تھیں۔ دو ماہ میں ۱۳۲ کتابوں کا مطالعہ اور اس نظریہ کے ساتھ کہ یہ کتابیں انعامی مقابلہ کے لئے آئی ہیں قطعاً ناممکنات میں سے ہے۔ لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ متعلقہ ممبران سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کن کن مُصنّفین کی تصنیفات ان کے سامنے ہیں اور کون کون سا مصنف ان کا دوست، عزیز یا رشتہ دار ہے اور کس کس مُصنّف نے ممبرِ موصوف تک سفارشوں کا تانتا لگا رکھا ہے لہٰذا ایسی کتابیں الگ کرلی جاتی ہیں اور باقی کتابوں میں سے اگر کوئی ایسی کتاب نظر پڑ گئی جسے درگزر کرنا ممبرِ موصوف کے بس کی بات نہ ہو تو اسے بھی زیرِ غور رکھ لیا جاتا ہے رہی سہی کسر پوری ہوجاتی ہے کہ متعلقہ ممبران ایک دوسرے سے سودا کرتے ہیں کہ تم میرے فلاں فلاں منظورِ نظر مُصنّفین کی تصانیف کو انعام کے لئے چُن لو میں آپ کے چہیتے مُصنّفین کی تصانیف کو منتخب کر لیتا ہوں لہٰذا اس طرح ماں بیٹیوں میں ...... کے مصداق معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی بہترین کتابیں جنہیں دُنیا کی کوئی بھی طاقت انعامی قرار دینے سے نہیں روک سکتی وہ ان ممبروں کی سازش کے باعث انعام حاصل نہیں کرسکتیں اور ایسی ایسی کتابیں انعام یافتہ ہوجاتی ہیں جو سوا روپیہ کلو کے حساب سے کباڑی بھی خریدتے ہوئے سو بار سوچتا ہے۔

پچھلے سال دفتر شانِ ہند سے ابوالبلاغت پنڈت ولارام صاحب رتن پنڈوروی کی ایک مایۂ ناز تصنیف "ہندی کے مسلمان شعراء" شائع کی گئی۔ اس کتاب کے لئے مصنف نے اپنی عمرِ عزیز کے پچاس سال گنوانے کے ساتھ ساتھ اپنا مکان تک فروخت کردیا اور اس کتاب کے لئے مواد جمع کرنے کے لئے دن رات مطالعہ کے باعث اپنی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے روگی بنا لیا۔ لنڈن کی انڈیا لائبریری سے مختلف کتابوں سے مواد حاصل کرنے کے لئے ہزار ہا روپیہ خرچ کیا گیا اور یہ ایک متفقہ فیصلہ ہے کہ مُصنّف نے ہندوستان

مسلمانوں کا سر ہندی کی آبیاری کے سلسلے میں اپنے ہم وطنوں میں اونچا کر دیا۔

یہ کتاب اُتر پردیش اُردو اکاڈمی۔ مغربی بنگال اُردو اکاڈمی اور بہار اُردو اکاڈمی کو انعامی مقابلے کے لئے بھجوائی گئی۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی انعامی کمیٹی کے کچھ مسلمان ممبران نے اس کتاب کے خلاف جو بکواس کی وہ اس امر کا واضح اعلان تھا کہ اس کتاب کو محض اس لئے نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ اسے "شان ہند" نے شائع کیا ہے۔

شان ہند کے مخالف ایک ممبر نے ملگجوتین مسلمان ممبران کو محض مذہبی تعصب کے زیر اثر اپنا ہم نوا بنا کر اس کتاب کی مخالفت کی۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک شیعہ ممبر بھی اس سنی ممبر کے ہم نوائی میں محض مذہبی تعصب کے زیر اثر کتاب کو بغیر پڑھے مخالفت کرتا رہا کیوں کہ ان مخالف ممبروں نے اس کتاب کی مخالفت میں جو دلائل دیئے وہ اس قدر بودے اور کمزور تھے کہ ان پر معیان دنیا بھی دانشوری کی تذلیل تھی۔ اور یہ محض اس لئے کہ شان ہند اور ایڈیٹر شان ہند اس ممبر کو محض ایک گنوار دیہاتی ہی سمجھتا ہے جو اُردو ادب کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا ہے اور جبراً اپنے آپ کو نقاد اور محقق منوانا چاہتا ہے۔

"ہندی کے مسلمان شعراء" میں ضرور خامیاں ہوں گی۔ کون سی ایسی کتاب ہے جو کسی بشر نے لکھی ہو اور اس میں خامیاں نہ ہوں۔ خود ان مخالف ممبران کی اپنی تصانیف میں ہزاروں خامیاں ہیں اور کچھ تصانیف تو محض رطب و یابس کا پلندہ ہیں اور چوں کہ یہ طائفہ یونیورسٹیوں سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہے اور ان کی تصانیف محض تعلقات کی بنا پر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے محض اس لئے شائع ہو جاتی ہیں کہ یونیورسٹیوں میں جہاں ہزاروں بے کار کتابیں خریدی جاتی ہیں وہاں یہ بھی خرید لی جائیں گی۔

انہی حضرات نے ان کتابوں پر انعام دینا تجویز کیا جن کی نسبت ان کا فرمان تھا کہ فلاں فلاں کتاب کے مصنف سے وہ خود واقف ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں مگر ان کتابوں پر انعام دیا گیا۔ ایک کتاب میں چوں کہ ایک شر پسند ممبر کا لکھا ہوا تعارف یا دیباچہ شامل تھا اس لئے اسے بھی انعام کا مستحق سمجھ لیا گیا۔ مگر "ہندی کے مسلمان شعراء" کو یکدم انعامی مقابلہ سے خارج کر دیا گیا۔ اس ناانصافی یا بددیانتی پر خاموش رہنا پڑا۔ اگر اس کتاب کا مصنف ایڈیٹر شان ہند خود ہوتا تو ہائی کورٹ میں اس ناانصافی کے خلاف باقاعدہ رٹ دائر کی جاتی۔ انعام کی رقم ایسے فنڈ سے دی جاتی ہے جو عوام کا قومی روپیہ ہے اور قومی روپیہ کے استعمال کے لئے یہ شرط روپیہ تقسیم کرنے والا عائد کرنے کا مجاز نہیں کہ اس کے فیصلہ پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں عدالتی رولنگ موجود ہے مگر ایڈیٹر شان ہند مجبوراً خاموش رہا۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کی طرف سے "ہندی کے مسلمان شعراء" پر دو ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی انعامی کمیٹی کے ارکان کا منہ چڑانے لگا اور پڑھا لکھا طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے "ہندی کے مسلمان شعراء" کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مگر اس وقت تک پچھلی کمیٹی ختم ہو چکی تھی۔ اور نئی کمیٹی تشکیل پا چکی تھی۔ خدا کے کرم سے پچھلی انعامی کمیٹی کے ایک دو ارکان اپنا کالا منہ لئے اس بار انعامی کمیٹی تو کیا عام ممبروں کی صف میں بھی نہ آسکے۔

ابھی اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی سابقہ انعامی کمیٹی کے ان ناانصاف اور مذہبی تعصب میں اندھے ارکان پر دانشور اور اُردو کے بہی خواہ لعنت بھیج رہے تھے کہ اتنے میں بہار اُردو اکاڈمی کی طرف سے "ہندی کے مسلمان شعراء" پر اوّل انعام تین ہزار روپیہ کا اعلان کر دیا گیا یعنی دوسرے لفظوں میں اس کتاب کے ان مخالفین کے منہ پر خود انصاف اور مذہبی رواداری نے تھوک دیا۔ اور اُردو داں طبقہ نے بنگال اُردو اکاڈمی اور بہار اُردو اکاڈمی کی انعامی کمیٹیوں کے ممبران کی انصاف پسندی اور انعام کے اصل حق دار کو اس کا حق دینے کی تعریف کی اور اتر پردیش اُردو اکاڈمی کی سابقہ انعامی کمیٹی کی ناانصافی پر نہ صرف اظہارِ افسوس کیا بلکہ اس پر لعنت بھی بھیجی۔

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی روایت رہی ہے کہ

اس نے انعامی کُتب کے سلسلہ میں اکثر انصاف سے کام نہیں لیا لہذا جناب مالک رام صاحب کو بھی اس سلسلے میں شکایت ہوئی اور انہوں نے انعام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسی مثالیں اور بھی موجود ہیں اور یہ روایت نہ تو قابلِ تعریف ہے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہیئے۔

اب اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی نئی کمیٹی اور نئے عُہدہ داروں کا تعیّن ہو چکا ہے۔ پریذیڈنٹ ایک ایسی معزز خاتون ہیں جن سے کسی قسم کی ناانصافی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ چیرمین اور نائب چیرمین بھی اپنی انصاف پسندی اور مذہبی رواداری کے لئے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اتر پردیش اُردو اکاڈمی اپنی سابقہ روایات میں سُدھار کرے گی۔ اور اب جبکہ پھر کتابوں پر انعام دینے کا وقت قریب آ رہا ہے تو امید رکھنی چاہیئے کہ اس بار یہ کمیٹی اپنا فرض انصاف اور دیانت داری سے نبھائے گی۔ ہم جناب عمار رضوی صاحب کی خدمت میں مودبانہ گزارش کریں گے کہ ان کے عہد میں "ہندی کے مسلمان شعراء" کے ساتھ جو ناانصافی اور بد دیانتی روا رکھی گئی ہے اس کا ازالہ انہیں اس طرح کرنا چاہیئے کہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی جن لائبریریوں کو مالی مدد دیتی ہے یہ کتاب ان تمام لائبریریوں میں اکاڈمی کی طرف سے خرید کر بھجوائی جائے۔ کیوں کہ یہ کتاب اس قدر بہترین اور قابلِ ستائش ہے کہ صدیوں تک ہندی کے مسلمانوں کا سر بلند رکھے گی۔ امید ہے کہ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کے عہدہ داران اس ناانصافی کا ازالہ کرنے کے لئے کوئی معقول راستہ اختیار کریں گے۔

••

ص

غلط بخشی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ مَیں خود اس افلاس و مفلسی میں بُری طرح جکڑ گیا ہوں۔

•• •• ••

(ص۸ کا بقیہ)

خیر و شر

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین حسبِ معمول تسبیح ہاتھ میں لئے مہاراجہ کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ مہاراجہ بھی اس وقت مالا جپ رہے تھے (ہندو مالا کے دانے باہر سے اندر کی طرف کھینچتے ہیں اور تسبیح کے دانے اندر سے باہر کی طرف پھینکے جاتے ہیں) مہاراجہ نے پوچھا۔ مالا کے دانوں کا اندر سے باہر کی طرف پھینکنا بہتر ہے یا باہر سے اندر کی طرف۔ وزیر موصوف نے ایک لمحہ کے لئے تأمل کئے بغیر جواب دیا حصولِ خیر کے لئے باہر سے اندر کی طرف اور رفعِ شر کے لئے اندر سے باہر کی طرف دانے پھینکنا بہتر ہے۔

داد

ایک شاعر نے مولانا جامی کو اپنی غزل سُنائی اور کہا کہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اسے شہر کے دروازے پر لٹکا دوں تاکہ لوگ پڑھیں اور اس کی شہرت ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ ان لوگوں کو یہ کیوں کر معلوم ہوگا کہ یہ تمہاری غزل ہے اس لئے مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو بھی اس کے ساتھ لٹکا دیں تاکہ لوگ غزل پڑھیں اور تم کو داد دیتے ہوئے چلے جائیں۔

خالِ ہندوش

جب امیر تیمور شیراز آئے تو حافظ شیرازی کو بُلا کر پوچھا کہ میں نے تمام دُنیا کو فتح کرنے کا عزم صرف اس لئے کیا ہے کہ اپنے شہر سمرقند کو سنواروں اور تم اپنے ایک دوست کے خال کے بدلے دے ڈالتے ہو چنانچہ تمہارا یہ شعر ہے ؎

اگر آں تُرک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حافظ نے فرمایا کہ حضور اسی سخاوت اور

ص

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

گوشتہ پچیس سالوں میں مُطالعہ کے دوران اکثر دلچسپ اور دل و دماغ کو جھنجھوڑنے والی تحریریں نظر سے گزریں۔ ان "حاصلِ مطالعہ" شہ پاروں میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ——— سرور تونسوی

عزت کی روٹی

ایک فلم ساز اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اُس بازار کے ایک کوٹھے پر جا نکلا۔ تین بہنیں تھیں، تینوں نقش تیکھے تھے ادھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ فلم ساز نے بائیوں کے والد سے کہا۔

"مجھے اپنی نئی فلم کے لئے ایک ہیروئن اور دو سائڈ ہیروئن کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں بہنیں اپنی شکل و صورت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ بہترین اداکارہ بن سکیں انہیں کل صبح اسٹوڈیو میں لے آیئے۔ اتنے ہزار روپے میں کنٹریکٹ ہو جائے گا۔"

بڈھے کنجر نے پہلے فلم ساز کا جائزہ لیا، پھر اس کے ساتھیوں پر چھپلتی ہوئی نظر ڈالی۔ آخر میں اپنی بیٹیوں کے چہرے سے کچھ سمیٹتے ہوئے کہا۔ "شیخ صاحب، آپ کا شکریہ، اُس کنجر خانے میں کیا پڑا ہے۔ اللہ ہمیں عزت کی روٹی دے رہا ہے بڑے آرام سے گزر بسر ہو رہی ہے۔"

قیامت کی نشانیاں

ٹیڈی بوائز دودھیل گائے کی طرح آہستہ خرام بلکہ مخرام کے انداز میں شاہی محلہ (لاہور کا کنجر بازار) کی پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیوں کو لتاڑتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ ایک ٹکیائی نے دوسری ٹکیائی سے کہا۔

"ان کے ہوتے ہوئے گاہک کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اب تو دن بہ دن مندا ہی رہے گا۔"

دوسری نے پہلی سے کہا۔

"تو پھر بیٹا یہ ڈربہ خالی کر دینے چاہئیں۔ پانچ روپیہ روز کرایہ ہے۔ یہ کہاں سے نکلے گا۔ کمائیں کہاں سے اور پہنیں کیا؟"

"قیامت کی یہی نشانیاں ہیں۔"

مولانا نہیں بائی

یاد نہیں آ رہا کلکتہ کا واقعہ ہے یا دہلی کا یا حیدرآباد کا مولانا حالی۔ مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی کے ہاں تشریف لے گئے۔ سلیم وہ مکان چھوڑ چکے تھے اور اب وہاں ایک مغنیہ طوائف رہ رہی تھی۔ حالی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو بڑی طویل دستک کے بعد اندر سے ایک فربہ تن و توش کی کالی کلوٹی نائکہ نکلی دیکھا کر بر ایں ریشِ دراز حضرت مولانا ہیں۔ کہنے لگی۔ کیا چاہتے ہو؟ مولانا حالی نے کہا "مولانا وحیدالدین سے ملنا ہے۔"

نائکہ نے کریہہ ہنسی کے ساتھ کواڑ بند کر لئے اور کہا جایئے یہاں کوئی مولانا ولانا نہیں رہتے یہ منی جان کا مکان ہے آپ کہاں صبح سویرے چلے آئے۔ اللہ خیر کرے دن چڑھے کیا شکل نظر پڑی ہے۔

اوپن ایئر میں

اوپن ایئر تھیٹر میں اُس بازار کی تین نامور رقاصائیں

ایک سابقہ وزیر کی داشتہ، دوسری ریلوے کے بہت بڑے ریٹائرڈ آفیسر کی رکھیل اور تیسری ایک سیاسی لیڈر کی منوعہ) موسیقی کی ایک رات کا لطف اٹھا رہی تھیں ــــ اخبار نویس اور موخرالذکر میں جو گفتگو ہوئی مندرجہ ذیل ہے۔

اخبار نویس : السلام علیکم

رقاصہ : وعلیکم السلام

اخبار نویس : آپ بھی اس تماشہ کو دیکھنے آئی ہیں ؟

رقاصہ : جی ہاں! تماشہ دیکھنے ہی کی چیز ہوتی ہے۔

اخبار نویس : کہئے آپ کا کیا خیال ہے ؟

رقاصہ : کس بارے میں ؟

اخبار نویس : اس تماشے کے بارے میں۔

رقاصہ : یہاں ہو رہا ہے اور خوب ہے۔

اخبار نویس : مطلب ؟

رقاصہ : (مسکرا کر) مطلب وطلب کچھ نہیں ہمارے ہاں یہی چیز عیاشی سمجھی جاتی ہے اور گناہ کہلاتی ہے اب چونکہ یہاں ہے لہٰذا آرٹ ہے" فن ہے"۔ عورت یہ بھی ہے مگر یہاں بیٹی ہے اور ہمارے یہاں "بائی" بن جاتی ہے۔

اخبار نویس : جی ہاں یہ شریف زادیوں کا رقص ہے۔

رقاصہ : شریف زادیوں ؟ (طنز کے ساتھ) اور ہم کنجن زادیاں ہیں ؟۔

اخبار نویس : افسوس ہے کہ ــــ ؎

کتنا غلط یہ حرف تھا مشہور ہو گیا

رقاصہ : جی کنجن کوئی ذات نہیں؟ بہ قول وارث شاہ۔ کنجراو جو غیرتوں باہر ہووے (ترجمہ، جو غیرت سے خالی ہو وہ کنجن ہوتا ہے)

اخبار نویس : بالکل ٹھیک۔

رقاصہ : ہم تو بالاخانوں کے کواڑ بند کر کے ناچتی ہیں لیکن یہ تو "اوپن ایئر" میں کولہے مٹکاتی، بھاؤ بتاتی اور بول اٹھاتی ہیں اور فن کارہ ہیں۔

دوزخ وجنت

ایک بائی اپنے آشنا اور اس کے دوستوں کی محفل میں ناز و بدل بدل کر ناچ رہی تھی معاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا آشنا توجہ نہیں کر رہا بلکہ کسی اور خیال میں گم ہے بائی نے مخاطب ہو کر کہا۔ کس خیال میں گم ہیں آپ ؟

"یونہی سوچ رہا ہوں"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ !"

"سوچ یہ رہا ہوں کہ تم ایسی پیکرِ حسن وجمال کو محض آواز وجسم کی فروخت کے جرم میں قیامت کے روز دوزخ میں ڈالا جائے گا"

"آپ فکر نہ کریں" بائی نے اپنے آشنا سے مخاطب ہو کر کہا جو قرآن مجید کا بہت بڑا پبلشر تھا۔ اگر قرآن فروش جنت میں چلے جائیں گے، تو جسم یا آواز فروش بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔ انشاءاللہ ــــ آپ سے دوزخ یا جنت دونوں جگہ ملاقات ہوگی۔"

غرورِ نسب

ایک بائی کے ہاں چند نوجوان کسی قومی مقصد کے لئے چندہ لینے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ بائی نے نوجوانوں کی بات سن کر پچاس روپے لکھوا دئے۔ نوجوان نے رسید کاٹ کر حوالے کی۔ بائی نے کہا صبح آ کر روپے لے جائیے گا۔ نوجوان منہ تکنے لگا۔ بائی نے کہا۔ گھبرائیے نہیں۔ یہ رقم آپ کو مل جائے گی۔ ہم خاندانی کنجر ہیں، بازاری لوفر نہیں، وعدہ کیا اور مکر گئے۔

یا اللہ خیر

بوڑھے استاد نے بائی کی بیٹھک پر نظر دوڑائی۔ چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ گل دان طاق پر رکھے تھے۔ گاؤ تکیے دیوانوں سے آنکھ مچولی کر رہے تھے اور پیک دان بائی کی آمد کا منتظر تھا۔ استاد نے طبلہ پر تھاپ کا رخ سنوارتے ہوئے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے اور دعا کی "الٰہ العالمین! کسی نیک کے ماتھے لگانا اور نیک سے رزق دلوانا ــــ یا اللہ خیر۔"

ایک نادر کتاب

ترکوں کے شیخ چلی نصیر الدین ایک تقریب میں شریک ہوئے، ہجوم میں انہیں اپنی جوتی کھو جانے کا اندیشہ تھا چنانچہ انہوں نے جوتی اپنے ریشمی رومال میں باندھ کر بغل میں دبالی اور محفل میں لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کے پاس کوئی بہت قیمتی کتاب ہے جو آپ نے بغل میں دبا رکھی ہے تاکہ کہیں کھو نہ جائے۔"

انہوں نے جواب دیا" جی ہاں بہت عمدہ اور نادر کتاب ہے"

"کس فن کے بارے میں ہے یہ کتاب ؟"

"سیاسیات کے متعلق ہے"

"اچھا۔ تو یہ کتاب آپ نے کسی کتب فروش سے خریدی ہے؟"

"کتب فروش سے نہیں، ایک موچی سے خریدی ہے"
نصیر الدین نے برجستہ جواب دیا۔

صحیح عمر

انگلستان کی ایک نہایت امیر اور اونچے طبقے کی خاتون جارج برناڈ شا سے ملنے گئی۔ باتوں باتوں میں اس نے پوچھا۔ مسٹر شا یہ تو بتایئے آپ کے خیال میں میری عمر کیا ہوگی؟ یہی کوئی چودہ برس۔ مسٹر شا نے جواب دیا۔ اس پر خاتون نے کہا۔ آپ تو مذاق کر رہے ہیں ٹھیک سے بتایئے مسٹر شا نے کہا چودہ نہیں تو یہی کوئی اٹھارہ برس ہوگی خاتون نے اس جواب کو بھی مذاق سمجھا اور کہا۔ آپ سچ سچ کیوں نہیں بتاتے مسٹر شا نے کہا آپ کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی۔ خاتون نے پھر بھی اصرار کیا کہ صحیح عمر بتائی جائے۔ اس پر مسٹر شا کہنے لگے۔ محترمہ میرے بتائے ہوئے تینوں اعداد جمع کر لیجئے آپ کی صحیح عمر نکل آئے گی۔

دلیل

کسی علاقے کے دہقان امیر المومنین خلیفہ مامون کے پاس ایک بدخو حاکم کی شکایت لائے اور اس کے تبادلے کا مطالبہ کیا۔ خلیفہ نے کہا وہ شخص تو عادل اور متقی ہے۔ شاکیوں نے کہا اس کے عدل و تقویٰ سے تمام خلق کو مستفیض ہونا چاہئے۔ یہ ناانصافی ہے کہ ہم اس کے عدل سے بہرہ ور ہوں اور باقی لوگ محروم رہیں۔

تارک الدنیا

ایک کم ہمت نے متواتر محنت اور جفاکشی سے تنگ آکر تارک الدنیا ہونے کا ارادہ کر لیا۔ بیوی کو بے بسی کے عالم میں چھوڑ کر کسی فقیر کا چیلہ بن گیا گلے میں کفنی اور بالوں میں راکھ ڈال لی اور کاسہ گدائی لے کر بھیک منگا بن گیا۔ ایک دن پھرتا پھراتا اسی گاؤں میں جا نکلا جہاں بیوی رہتی تھی۔ فقیر نے معمول کے مطابق صدا دی "اللہ بھلا کرے مائی" بیوی آواز پہچان کر اٹھی جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف ہیں اس نے حسب توفیق آٹا دے کر کہا" سائیں جی! ہمارا میاں بیوی کا رشتہ تو قطع ہو چکا لاؤ تمہاری روٹی پکا دوں" فقیر جھٹ راضی ہو گیا۔ اس پہ مائی نے کہا کہ دال، نمک اور مرچ اور لکڑی کی بھی ضرورت ہے۔ فقیر نے کہا یہ سب چیزیں میری جھولی میں موجود ہیں۔ مائی نے یہ سن کر ایک دو ہتڑ جمائی اور کہا کم بخت دنیا کی ساری چیزیں جھولی میں لئے پھرتا ہے کیا بیوی ہی دنیا تھی جسے چھوڑ کر فقیر بنا ہے۔

انا ربکم الاعلیٰ

خلیفہ مامون رشید کا زمانہ تھا۔ مصر میں ایک شخص نے موسیٰ عمران ہونے کا دعویٰ کیا۔ لوگ اسے پکڑ کر خلیفہ کے سامنے لائے۔ خلیفہ نے پوچھا موسیٰ عمران کے پاس عصا اور ید بیضا وغیرہ معجزات تھے، تیرے پاس کون سا معجزہ ہے۔ اس نے کہا" موسیٰ نے معجزے اس وقت دکھائے تھے جب فرعون نے انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا۔ تو بھی کہہ تاکہ میں اپنے معجزات دکھاؤں۔

(بقیہ ص ۵ کالم ۲ پر)

بیس سال پہلے انڈو پاک مشاعرہ کرنال — سرور تونسوی

یہ مشاعرہ ۲۲/جون ۱۹۶۳ء کی رات کو منعقد ہونا تھا مگر بارش ہونے کے باعث... تمام انتظامات درہم برہم ہو کر رہ گئے لہٰذا ۲۳/جون ۱۹۶۳ء اتوار کی صبح کو ۸½ بجے یہ مشاعرہ رام لیلا بھون میں منعقد کیا گیا۔

آج ۲۳/جون ۱۹۶۳ء اتوار ہے صبح کے ۸½ بجے ہیں شری کیدار ناتھ ساہنی ایڈووکیٹ کی کوٹھی سے تمام شعرائے کرام کو رام لیلا بھون میں لایا گیا ہے۔ مشاعرہ گاہ کی سجاوٹ کو گزشتہ رات کی بارش نے تہس نہس کر دیا تھا تاہم منتظمین نے پنجاب کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مشاعرہ گاہ کو اچھے انداز سے سجا دیا ہے۔ سٹیج بہت ہی آراستہ ہے۔ اتنا آراستہ سٹیج کسی دوسرے مشاعرے میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ شعرائے کرام کے ساتھ ساتھ عالی جناب ٹکا جگجیت سنگھ بیدی جج پنجاب ہائی کورٹ اور عالی جناب وی شنکر آئی سی ایس بھی سٹیج پر تشریف لے آئے ہیں۔ سامعین کی صف اوّل میں مسز وی شنکر کنور رانی صاحبہ، شری ایم آر ویدا ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر، رائے صاحب پرتاپ سنگھ شجاع آبادی، شری کیدار ناتھ ساہنی ایڈووکیٹ معہ اہلیہ محترمہ، شری مہربان سنگھ دسوپیا آنریری مجسٹریٹ دہلی، سردار شیر سنگھ سندھو مجسٹریٹ درجہ اوّل دہلی اور دیگر افسران ضلع و معززین شہر تشریف فرما ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی آئی اے ایس ڈپٹی کمشنر کرنال نے مائک سنبھالتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ رات بارش کی وجہ سے ہم مجبور تھے کہ مشاعرہ ملتوی کیا جائے۔ اور آج بے وقت مشاعرہ کیا جا رہا ہے۔ کنور صاحب نے نادر شاہ کے دربار کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ٹکا صاحب اور وی شنکر صاحب کی موجودگی میں میرے لیے یہ انتخاب مشکل ہو رہا ہے کہ کس ہستی سے کونسا احسان لوں۔ تاہم اپنے بڑے بھائی عالی جناب ٹکا جگجیت سنگھ جج ہائیکورٹ سے مودبانہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس مشاعرہ کا افتتاح فرمائیں۔ اور عالی جناب وی شنکر صاحب سے مودبانہ التماس ہے کہ اعلان کے مطابق اس مشاعرہ کی مسند صدارت کو زینت بخشیں۔

ٹکا صاحب نے نہایت منجھے تلے الفاظ میں مشاعرہ کا افتتاح فرمایا ہے چونکہ ٹکا صاحب کرنال میں سیشن جج رہ چکے ہیں اس لیے اہل کرنال ذاتی طور پر انھیں جانتے ہیں اور سامعین کے چہروں اور آنکھوں سے عقیدت کے جذبات صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ کیونکہ بیدی برادران جہاں بھی رہتے ہیں وہاں کے رہنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ جناب وی شنکر صاحب مسند صدارت پر تشریف لائے تو تالیوں کی جھنکار میں کنور صاحب نے انھیں طلائی ہار پہنایا۔ صاحب صدر نے مائک سنبھالتے ہوئے صدارتی تقریر شروع کی ہے۔ تقریر کیا ہے ہندوستان کے عروج و زوال کی ایک داستاں ہے۔ صاحب صدر نے ہندوستان اور پاکستان تعلقات پر بھی چند کلمات میں روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ملک چاہے دو ہوں مگر انسانیت میں فرق نہیں آئے گا۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی سے متعلق صاحب صدر نے نہایت اچھے الفاظ میں ذکر فرماتے ہوئے کنور مہندر سنگھ بیدی سے مشاعرہ شروع کرانے کی خواہش فرمائی۔ پُر جوش تالیوں کی جھنکار میں وی شنکر صاحب نے تقریر ختم کی۔ کنور صاحب نے شعرائے کرام کے اسمائے گرامی سنانے کے بعد عزیز وارثی کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ سنیئے عزیز صاحب فرما رہے ہیں ؎

عشق میں ایسا اک عالم بھی گزر جاتا ہے
ذہن و ادراک کا احساس بھی مر جاتا ہے
بعض اوقات تو ہوتی ہے کچھ ایسی حالت
چاندنی رات میں دل پھولوں سے ڈر جاتا ہے

اس کے بعد غزل شروع کی ہے ؎

آنکھ مشتاقِ صنم ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو بھی ایک یہی غم ہو تو غزل ہوتی ہے
بے تکلف کسی رستے میں رخِ زیبا پر
زلف اس شوخ کی خم ہو تو غزل ہوتی ہے

آپ اس بات کو تسلیم کریں یا نہ کریں
آپ کا خاص کرم ہو تو غزل ہوتی ہے

عزیز وارثی مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے سلیم کیف تونوی سے کلام سنانے کو کہا ہے سنیئے سلیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

ترا دستِ نہاں ہے اور میں ہوں
متاعِ دو جہاں ہے اور میں ہوں
شبِ غم زردرخ فرسا ظلمتوں میں!
تصور ضوفشاں ہے اور میں ہوں
پئے سرکوبیٔ طوفانِ باطل
مرا عزمِ جواں ہے اور میں ہوں

سلیم صاحب غزل سنانے اور موزوں داد پانے کے بعد مائیک سے ہٹے تو نہایت اچھے الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے کنور صاحب نے نریش کمار شاد سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ شاد صاحب نے اپنے تازہ مجموعہ کلام سے چند قطعات سنائے ہیں اور بے انتہا داد پائی ہے افسوس ہے کہ راقم الحروف یہ قطعات نقل نہ کر سکا اور شاد صاحب نے وعدہ کے باوجود قطعات کی نقل مہیا نہیں فرمائی۔

لیجئے اب محشر امروہوی مائک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی ایک پرانی غزل سنا رہے ہیں وہ مطلع آپ بھی سن لیجئے ؎

یوں رات بسر کرتا ہوں یوں رات بسر ہو جاتی ہے
جب اُن کا تصور کرتا ہوں ہر بار سحر ہو جاتی ہے
بھرپور جوانی میں جس دم تیار نظر ہو جاتی ہے
پھر شیخ و برہمن کوئی ہو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہے

اس مطلع کے پہلے مصرعہ نے سامعین کو ہنسی ہنسی میں محشر صاحب کی عمر اور سفید ڈاڑھی کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ محشر صاحب کو اتنی داد ملی ہے کہ مشاعرہ پر میدانِ حشر کا دھوکا ہو رہا تھا۔

لیجئے کنور صاحب جناب بسمل سعیدی ٹونکی سے کلام سنانے کی استدعا کر رہے ہیں۔ بسمل صاحب مائک پر تشریف لائے اور انھوں نے سامعین کی خواہش پر تین غزلوں کے تین تین شعر سنائے۔ ایک غزل کا مطلع اور ایک شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

رُتبہ یہ ترے در کو میرے سر سے ملا ہے
حالانکہ مجھے سر بھی ترے در سے ملا ہے
ملتا ہے ترے در سے مقدر سے زیادہ
حالانکہ مقدر بھی تیرے در سے ملا ہے

بسمل صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے بہت ہی اچھے تعارف کے ساتھ جناب دلاور فگار سے کلام سنانے کی گذارش کی ہے۔ دلاور فگار صاحب مائک پر تشریف لائے تو قطعات پر اتنی داد پائی کہ اس مشاعرہ میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ قطعات کے بعد فگار صاحب نے اپنی ایک مشہور نظم "عشق کا پرچہ" سنائی اور بے انتہا داد پائی چونکہ اس نظم کا تعلق بھی سرزمینِ پنجاب سے تھا اس لیے یہ نظم اور بھی لطف دے گئی۔ فگار صاحب مائک سے ہٹنے لگے تو کنور صاحب نے فرمائش کی کہ فگار صاحب اپنی تازہ ترین نظم "آج کی تازہ خبر" سنائیں۔ سنیئے فگار صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ایک عاشق کی مرمت ہوئی چوراہے پر
حملہ آور تھا کوئی شوخ جبیت دخود سر
پیٹنے والا تھا مگر صبر و رضا کا پیکر !
پٹتے وقت اُس کی زباں پر نہ الحمد تھا مگر
آج کی تازہ خبر

حسبِ دستورِ قدیم آج سرِ راہ گذر
دو بسوں میں ہوا اک غیر ارادی ٹکر
حادثہ سخت تھا لیکن نہ مرا کوئی بشر
کچھ مسافر تھے کہ جو کر گئے دُنیا سے سفر
آج کی تازہ خبر

راہزن بھیس بدل لیتے ہیں اب لیلیٰ کا
چاندنی چوک میں کل رات پڑا ایک ڈاکا
اک حسینہ نے کسی شخص کے دل کو تاکا

لے کے دل بھاگ گئی ہے نہ خدا جانے کدھر
آج کی تازہ خبر

اس حسینہ کو پکڑنے میں ہے پولیس ناکام
عام شہرت ہے کہ وہ بھاگ گئی ہے نیلام
نہ کہیں اس کا وطن ہے نہ کوئی جائے قیام
لطف تو یہ ہے کہ اس کے نہ دہن ہے نہ کمر
آج کی تازہ خبر

قوم پر آج ہوا اک نئی آفت کا نزول!
ایک صاحب کو یہ دعویٰ ہے کہ میں بھی ہوں رسول
لیکن اس حکم کو کرتا ہی نہیں کوئی قبول!
اپنی امت میں ہے اب صرف وہی پیغمبر
آج کی تازہ خبر

ایک زردار نے ایران میں پالا ہے گدھا
ناشتہ چائے سے کرتا ہے نرالا ہے گدھا
ہم غریبوں سے بہت برتر و بالا ہے گدھا
ہند والوں سے بہت اچھے ہیں ایران کے خر
آج کی تازہ خبر

آج اک بوڑھے جواں مرد کے اولاد ہوئی
روحِ مضطر یہ خبر سن کے بہت شاد ہوئی
کوٹھری دل کی تمناؤں سے آباد ہوئی
آ گیا سوکھی ہوئی شاخِ تمنا ... ثمر
آج کی تازہ خبر

آج کچھ بیٹوں نے اک باپ کو فرمادیا عاق!
واقعی باپ ہوتے بھی ہیں بڑے بد اخلاق
نوجِ اولاد بڑھانے کو سمجھتے ہیں مذاق
ہر نئے سال اُگا دیتے ہیں ایک لختِ جگر
آج کی تازہ خبر

آج دہلی سے الیکشن کی خبر آئی ہے
پہلوانانِ سیاست میں صف آرائی ہے
ممبری فلم ہے اور قوم تماشائی ہے
فلم اچھی ہے، اداکار ہیں اونچے لیڈر

آج کی تازہ خبر

کل عدالت میں ہوا پیش وہ مجذوب فقیر
جرمِ اغوائے طوائف میں ہوا تھا جو اسیر
کورٹ میں وقتِ بیاں جج سے یہ کہتا تھا پیر
خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر!
آج کی تازہ خبر

ایک صاحب جو صورت سے تھے کچھ حسین و جمیل
چاہتے تھے کہ کریں جنس کو بالکل تبدیل
یہ تمنا نہ پہونچ پائی پہ تکمیل!
اب یہ صورت ہے کہ موصوف نہ مادہ ہیں نہ نر
آج کی تازہ خبر

کٹ گیا ریل کے نیچے کوئی آشفتہ نصیب
مرنے والے کو خدا بخشے کہ شاعر تھا غریب
اس کی صورت بھی چڑیل تھی طبیعت بھی عجیب
رہنے والا تھا جبادل کا تخلص تھا قمر
آج کی تازہ خبر

ہم نے ایک شخص کو کل لکھا تھا مرحوم ہوا!
ابھی زندہ ہیں وہ مرحوم یہ معلوم ہوا
غلطی پرچہ کی تھی جس کا یہ مفہوم ہوا
کل کے پرچہ میں جو خبریں تھیں غلط ہیں یکسر
آج کی تازہ خبر

دلاور فگار آج کی تازہ خبر سنا کر اور داد یہ محبوبیاں بٹور کر اپنی جگہ پر واپس آئے تو کنور صاحب نے محترمہ شبنم اٹاوی سے کلام سنانے کو کہا ہے دلاور فگار کے فوراً بعد کسی دوسرے شاعر کا کامیاب ہونا مشکل نظر آتا تھا مگر کنور صاحب نے شبنم اٹاوی سے کلام سنانے کا اعلان فرما کر اس خدشہ کو کسی حد تک دور کر دیا۔ محترمہ شبنم فرما رہی ہیں ؎

تنگ آ کے ناخدا سے یہ کہنا پڑا مجھے
غیرت دلا رہا ہے مرا حوصلہ مجھے
ہر سمت ایک سلسلۂ دلفریب ہے
گمراہ کر رہے ہیں ترے نقشِ پا مجھے

کچھ تو مائک کا سلسلہ ٹھیک نہیں دوسرے شبنم صاحبہ نہایت دھیمی آواز میں کلام سنا رہی ہیں اور تیسرے ابھی تک سامعین کے دل و دماغ پر دلاور فگار چھائے ہوئے ہیں اس لیے شبنم صاحبہ کو داد نہیں مل رہی سنیئے شبنم نغمہ سرا ہیں ۔

کچھ ناخداؤں سے مجھ کو شکایت نہیں مگر
رہزن سے ہر قدم پہ ملا آسرا مجھے
ساحل کی زندگی تو کوئی زندگی نہیں
یہ راز موجِ عشق نے سمجھا دیا مجھے!

ہر شعر پہ مناسب داد مل رہی ہے شبنم مقطع فرما رہی ہیں ۔

اب شبنم کہاں کا ہوش کہاں کی شکایتیں
پہلے ہی اس نگاہ نے تڑپا دیا مجھے

شبنم (آداب) اپنی جگہ پر تشریف لے گئیں تو کنور صاحب فرمانے لگے اب آپ میرے برادرِ خورد [illegible] میں بڑے جناب ساحر ہوشیار پوری سے ان کا کلام سنیئے ساحر صاحب مسکراتے ہوئے مائک پر تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں ۔

جنونِ عشق ٹل جائے تو جانیں
[illegible] کا دھارا چل جائے تو جانیں
بدلنا کتنی ہیں تقدیریں یہ مانا
ہمارا دل بدل جائے تو جانیں

زمانے بھر کی [illegible] بھرتے ہوئے [illegible] صاحب [illegible] رہے ہیں ۔

گرد سر سبز صحرائے محبت — مقدر میں [illegible] نکلی
مجھے تدبیر سے اتنا گلہ ہے — کہ یہ بھی حامیِ تقدیر نکلی

اس کے بعد [illegible] شروع کی ہے فرماتے ہیں

[illegible] کے مارے [illegible] کیا بھروسہ ہے — بیکراں [illegible] کا کیا بھروسہ ہے
انتظاروں کا [illegible] شب بھر — ان خماروں کا کیا بھروسہ ہے
[illegible] کی نمو پرستی ہے — ریگزاروں کا کیا بھروسہ ہے
[illegible] تاب نام و نسب — ان سہاروں کا کیا بھروسہ ہے
پھول کھلنے [illegible] کا تکیہ ہے — ان بہاروں کا کیا بھروسہ ہے
خود جو طوفاں کی زد میں ہیں ساحر — ان کناروں کا کیا بھروسہ ہے

جناب ساحر ہوشیار پوری خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو جناب سوہن لال ساحر صاحب کپور تھلوی مائک پر تشریف لائے صبح کے وقت مشاعرہ ہونے کا یہ فائدہ ساحر صاحب کو دیکھ کر منظرِ عام پر آگیا کہ اگر مشاعرے دن کے وقت ہوں تو شاعروں کا یہ عذرِ لنگ اپنے آپ بیکار ہو کر رہ جائے گا کہ شراب پینے کے بعد شعراء اچھا پڑھتے ہیں اس وقت کوئی بھی شاعر شراب پیئے ہوئے نہیں ہے۔ اور مشاعرہ اتنے نظم و نسق اور کامیابی سے چل رہا ہے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کنور صاحب دل ہی دل میں سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ آئندہ مشاعرے دن کے وقت منعقد کیے جائیں۔ عام طور پر ساحر کپور تھلوی مشاعروں میں شرکتِ شراب نوشی کے باعث بغیر کلام سنائے ہی تشریف لے جایا کرتے ہیں اور اگر ان کے دل و دماغ کی ستم ظریفی سے کسی موقعہ پر ان میں کچھ سکت باقی رہ گئی تو لڑکھڑاتی زبان سے یوں اشعار سناتے ہیں کہ سننے والوں کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ مگر آج چونکہ یہ شراب پیئے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لیے نہایت شُستگی اور روانی کے ساتھ اشعار سنا رہے ہیں۔ اور بہت اچھی داد پا رہے ہیں۔ ساحر کپور تھلوی اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے جناب عرش ملسیانی سے کلام عطا فرمانے کو کہا ہے۔ سنیئے عرش قطعات فرما رہے ہیں۔

عشق ہرگز نہیں ہوس کا نام
عشق دل کا پیام ہوتا ہے
حسن صورت پہ یہ نہیں موقوف
حسن تو اک مزاج ہوتا ہے

[illegible] عشق سے جو میرا ہے
اس غزل کی لطافت کہتے ہیں
[illegible] ہوتی ہے وقتی میں
لوگ اس کو شریف کہتے ہیں

کنور صاحب فرما رہے ہیں عرش صاحب ہم تو آپ کو بڑا شریف سمجھتے ہیں عرش نے بے ساختہ فرمایا آپ سے زیادہ شریف یہاں کوئی نہیں ہے۔ اسپر ایک طویل قہقہہ لگا ہے

سنیئے عرشؔ صاحب غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کبھی اس مکاں سے گزر گیا کبھی اُس مکاں سے گزر گیا
ترے آستاں کی تلاش میں میں ہر آستاں سے گزر گیا
ابھی آدمی ہے فضاؤں میں ابھی آدمی ہے خلاؤں میں
یہ نہ جانے پہنچے گا کس جگہ اگر آسماں سے گزر گیا
یہ میرا کمالِ گناہ سہی مگر اس کو دیکھ مرے خدا
مجھے تو نے رہنے کا جہاں جہاں میں وہاں وہاں سے گزر گیا
جسے لوگ کہتے ہیں زندگی وہ حادثوں کا ہجوم ہے
وہ تو مجھ پہ ہی کام تھا کہ میں درمیاں سے گزر گیا

جناب عرشؔ کی غزل پر اچھی داد پا کر مائک سے ہٹے تو کنور صاحب نے جناب قیسؔ جالندھری سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے قبلہ فرما رہے ہیں ؎

ضبط سے عشق کے حالات کہاں تک پہنچے
لب پہ آجائے تو پھر بات کہاں تک پہنچے
لامکاں میں بھی ترا نقشِ کفِ پا نہ ملا!
اور اب شوقِ ملاقات کہاں تک پہنچے
آج ساقی نے ادھر پھر کوئی چھینٹا تو دیا!
دیکھئے اب یہ شرابات کہاں تک پہنچے
اٹھ کے میخانے سے پڑھنے گئے مسجد میں نماز
دیکھئے اہلِ خرابات کہاں تک پہنچے
جتنی کشتی ہے کچھ اس سے بھی سوا بڑھتی ہے!
کیا خبر تیرگیِ رات کہاں تک پہنچے

قیسؔ صاحب ہر شعر پر بہت اچھی داد پاتے آتے فرما رہے ہیں ؎

چپ رہا میں تری محفل میں تو کچھ بات نہ تھی
اب خدا جانے یہ بات کہاں تک پہنچے!
بیخودی میں بھی ترا نام مرے منہ سے نکلا
تیری الفت کے خیالات کہاں تک پہنچے!
کیا نہیں کوئی جو سمجھائے کہے یہ کوئی!
جو کوئی سُن لے تو یہ بات کہاں تک پہنچے

اس شعر پر داد نے شورِ قیامت کا روپ دھار لیا کر لیا ہے اور قیسؔ صاحب کو یہ شعر چار مرتبہ پڑھنا پڑا۔ مقطع فرماتے ہیں

اپنے مطلب سے تراشے گئے معنی کیا کیا
قیسؔ قرآں کے بھی آیات کہاں تک پہنچے

قبلہ قیسؔ صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے علامہ انور صابری سے گزارش کی ہے کہ مائک پر تشریف لائیں سنیئے علامہ فرما رہے ہیں ؎

جبینِ شام روشن کر رہا ہوں
چراغِ جام روشن کر رہا ہوں
بجھا کر اپنی شمعِ زندگانی!
تمہارا نام روشن کر رہا ہوں

بظاہر اندھیرے بباطن اُجالے — لباسِ رفیقِ سفر میں لٹیرے
خدا کے لیے ان سے بچ کر گزر جا — یہ اہلِ سیاست نہ تیرے نہ میرے

داد کا شور کچھ کم ہوا تو مضطرؔ صاحب فرمانے لگے علامہ کیا کسی وزیر سے روپیہ نہیں ملا جو یہ قطعہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پر شعراء کا قہقہوں سے برا حال ہو رہا ہے۔ سنا تو علامہ غزل ارشاد فرما رہے تھے۔

نظر نظر کو میکدہ بنا کے پی گیا — کسی حسیں نگاہ سے ملا کے پی گیا
بڑھی جو دل کی تشنگی تو دورِ اضطراب میں — چھلک چھلک رہا تھا جو اٹھا کے پی گیا
یہ کارِ خیر دیکھئے جب آئے شیخ سامنے — یہ جام شرع سے نظر بچا کے پی گیا

ندامتوں پہ ڈٹ گئے آفتاب جام کے درود پر
گناہ کو ثواب کی حدود میں لا کے پی گیا

علامہ غزل پر اچھی داد پا کر اپنی جگہ پر تشریف لائے تو شری رام کشن مضطرؔ نے پھر لقمہ دیا اور پوچھا علامہ یہ دوسرا قطعہ آپ نے کس ناراضگی میں فرمایا؟ فرمانے لگے میرا وظیفہ حکومت نے بند کر دیا۔ علامہ صاحب جناب مضطرؔ ایڈیٹر فریاد سے کہنے لگے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیئے۔ مضطرؔ فرمانے لگے۔ علامہ میرا قلم آپ دونوں کے لیے وقف ہو جائے گا۔ دیکھا تو شری رام کشن مضطرؔ آفندی صاحب ارشاد فرما رہے تھے ؎

آج پھر اُس نے اک نظر دیکھ لیا — رنجِ دل دیکھ لیا زخمِ جگر دیکھ لیا
مسکرا کر جو ادیدۂ تر دیکھ لیا — اپنے انداز تغافل کا اثر دیکھ لیا
آہ کیا بیت گئی جان پہ ہنگام وداع — اُس نے جب مڑ کے مجھے ایک نظر دیکھ لیا

مضطر صاحب ہر شعر پہ مناسب داد پاتے ہوئے نغمہ سرا ہیں ؎

دیدہ و دل میں سمٹ آئے ہزاروں جلوے — جلتے جلتے جو یونہی جانب در دیکھ لیا
جس طرح برق چمکتی ہوئی چھپ جاتی ہے — یوں اُٹھا اُنھیں سرِ رہ گذر دیکھ لیا
کوئی اشکوں کی زباں جاننے والا نہ رہا — تیرا انجام بھی اے شمعِ سحر دیکھ لیا

داد و ستائش کی آوازوں میں مقطع فرما رہے ہیں ؎

بڑھ گئی اور بھی بیتابیٔ دل اے مضطر
اُس نے جب میری طرف بارِ دگر دیکھ لیا

جناب مضطر صاحب غزل سنا کر اپنی جگہ پہ تشریف لے آئے تو کنور صاحب نے جناب کشمیری لال ذاکر سے کلام سنانے کو کہا لیجئے ذاکر صاحب مائک پہ تشریف لے آئے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

رقص جام و سبو سے ڈرتے ہیں — عشرتِ رنگ و بو سے ڈرتے ہیں
لوگ اب موت سے نہیں ڈرتے — زیست کی جستجو سے ڈرتے ہیں

تم گناہوں کا اہتمام کرو! — اذنِ جام شراب ہم دیں گے
تم گناہوں کا لطف تو لے لو — حشر کے دن حساب ہم دیں گے

تم گناہوں سے ڈر کے جیتے ہو!
ہم اُنھیں ساتھ لے کے چلتے ہیں
یہ وہ رہبر ہیں جن کے ہاتھوں سے
جنتوں کے چراغ جلتے ہیں

آ کہ بزمِ طرب سجائیں ہم — آ کہ عشرت کا گیت گائیں ہم
زندگی عمر بھر کا رونا ہے — آ کہ پل بھر تو مسکرائیں ہم

ذاکر صاحب قطعات پہ بہت اچھی داد پا کر اپنی جگہ پہ تشریف لے آئے تو جناب ظفر ادیب نے مائک سنبھالا ہے ارشاد ہوا ہے ؎

ہمارا کیا ہے نہ آئے کہ آ کے بیٹھ گئے
وہ اپنے طور تو ہم کو بھلا کے بیٹھ گئے
سمجھ لیا تھا کہ جانبر نہ ہو سکیں گے ہم
سحر ہوئی تو وہ سر جھکا کے بیٹھ گئے

اس شعر نے مشاعرہ میں نئے سرے سے جان پیدا کر دی ارشاد ہوا ہے ؎

ستم کہ زندہ رہے اور زندگی نہ ملی
فغاں کہ موت سے آنکھیں چرا کے بیٹھ گئے
چراغ بجھ گئے تو ہم جلائیں گے دل کو
وہ اور تھے جو دل کو بجھا کے بیٹھ گئے

داد و ستائش سے بے نیاز ظفر صاحب مقطع ارشاد فرماتے ہیں ؎

ظفر خلوص کے مارے پنپ نہیں سکتے
یہ روگ جان کو تم کیا لگا کے بیٹھ گئے

ظفر صاحب مائک سے ہٹے تو جناب تبسم دہلوی نغمہ سرا ہوئے فرماتے ہیں ؎

جب دستِ جنوں جیب و گریباں سے چلا ہے
رُخ ہم نے رگِ جاں کی طرف موڑ دیا ہے
اے دل یہ کوئی کھیل نہیں راہِ وفا میں
سو نقش مٹے ہیں تو کہیں ایک بنا ہے
تم کیوں مجھے آرام سے مرنے نہیں دیتے
اے چارہ گرو رحم کرو وقت دُعا ہے

تبسم صاحب نے شاعرانہ ترنم کو موسیقی کی گہرائیوں میں لاپتہ کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مشاعرے کے ماحول میں حقیقی داد نہیں پا رہی۔ افسوس کہ تبسم صاحب اپنی اچھی غزل کو موسیقی کی نذر کر دیا۔ کنور صاحب شگفتہ الفاظ میں جناب شعری بھوپالی سے کلام عطا فرمانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ شعری نغمہ سرا ہیں ؎

مرے دیوانگی سے لوگ اُنھیں پہچان جاتے ہیں
نہ اُن کا ذکر ہوتا ہے نہ اُن کا نام ہوتا ہے
جھڑک دو مجھے کشورِ امن سے انگارے تعصب کے
کہ ان باتوں سے سارا میکدہ بدنام ہوتا ہے
وہ پاکیزہ طلب وہ جذبۂ صادق سہی پھر بھی
محبت کرنے والا ایک دن بدنام ہوتا ہے
قیامت ہے یہ کہہ کر اس نے لوٹایا ہے قاصد کو

کر ان کا لو ہر اک خط آخری پیغام ہوتا ہے

...صاحب غزل سُنانے اور اچھی داد پانے کے بعد مائک سے
...گئے تو سامعین نے اصرار کیا کہ ایک غزل اور سنا دیجئے۔ شوقی
...فرما رہے ہیں ؎

تیری لُٹی دیدہ نگاہوں کو دُعا دیتے ہیں
جتنا چھپتے ہیں یہ تیرا اتنا مزہ دیتے ہیں
مسکراتے ہوئے پیغام وفا دیتے ہیں
دل کے انکاروں کو کیوں آپ ہوا دیتے ہیں
اپنی بربادی پہ خوش ہوں یہ تماشا ہے عجب
وہ جسے اپنا سمجھتے ہیں مٹا دیتے ہیں!

اس شعر نے مشاعرہ میں نئی روح پھونک دی ہے اور
...ری صاحب فرما رہے ہیں ؎

ایسا اک وقت کبھی آتا ہے محبت میں کہ جب
خود وہ گھبرا کے حجابات اُٹھا دیتے ہیں
اپنے دامن کو ذرا آپ بچائے رکھئے
سرد آہوں سے بھی ہم آگ لگا دیتے ہیں

شوقی صاحب بہت اچھی داد پا کر مائک سے ہٹے
...کنور صاحب نے اعلان فرمایا کہ اب فیض احمد فیضؔ صاحب
...ام بلاغت نظام سے محظوظ فرمائیں گے۔ فیض احمد فیضؔ کا نام
...نا تو سامعین کی گردنیں اونچی ہو گئیں۔ چونکہ سامعین کا ذہن
...رنل فیض احمد فیضؔ کی طرف چلا گیا تھا۔ جب فیضؔ جھنجھانوی
...ائک پر تشریف لائے تو کرنل فیض اور فیض کے پرستاروں
...و مایوسی ہوئی۔ سنئے فیض صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

ماہِ نو حلقۂ زنجیر بنا کر دیکھو
قوسِ ابرو خمِ شمشیر بنا کر دیکھو
دل سے کس طرح لگایا ہے بتا دو ہم کو
برگِ گل پہ کوئی تصویر بنا کر دیکھو

واقفِ غم تا اُل حالِ پریشاں کر دیا
سرِ بزم اُن کو سر در گریباں کر دیا
اب میں کیا اس سے ثابت کروں ثبوتِ جذبِ دل

اپنا آنسو اُن کی آنکھوں سے نمایاں کر دیا

فیضؔ جھنجھانوی کا کلام یقینی طور پر کرنل فیض کے کلام سے بہتر ہے لہٰذا انھیں داد بھی خوب ملی فیضؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

ساغرِ بادۂ سرجوش ہوا جاتا ہے
دیدۂ شاہدِ مے نوش ہوا جاتا ہے
وہی شوخی وہی مستی وہی خوشبو وہی رنگ
پھول کھل کر تری آغوش ہوا جاتا ہے

تجلیاتِ شرارہ پا کو اسیرِ دامِ نگاہ کیجیے
پناہ لے آفتابِ محشر فضا میں اتنی سیاہ کیجیے
غریقِ موجِ شراب بھی ہے خیالِ روزِ حساب بھی ہے
گناہ کیجیے تو صدقِ دل سے کوئی مکمل گناہ کیجیے

فیض صاحب بہت اچھی داد پا کر تشریف لے گئے تو کنور صاحب نے جناب گوپال متلؔ ایڈیٹر تحریک سے کلام سُنانے کی گذارش کی وقار اور سنجیدگی کا پیکر گوپال متلؔ رطب اللساں ہے ؎

شعر کہنے کا مزہ ہے اب تو   دل کا ہر زخم ہرا ہے اب تو
اتنا بے صرفہ نہ تھا دل کا لہو   داغ دامن پہ کھلا ہے اب تو
زندگی زندگی ہوتی تھی کبھی   مر نہ جانے کی سزا ہے اب تو
تھا کوئی شخص مرا محرمِ دل   وہ مجھے بھول چکا ہے اب تو
دل کا یہ حال ہمیشہ تو نہ تھا   جانے کیا مجھ کو ہوا ہے اب تو
خوگرِ شہر ہوئے دیوانے   جیب دامن بھی سیا ہے اب تو

مشکل زمین کی اس پُر وقار غزل پر پُر وقار داد پانے کے بعد جناب متلؔ صاحب اپنی جگہ تشریف لے آئے تو کنور صاحب نے دل لکھنوی کو دعوتِ نغمہ سرائی دی کنور صاحب کی فرمائش پر دل لکھنوی نے چند رباعی قطعات سنا کر سامعین سے خوب داد پائی۔ اور غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

چین بن دیکھے اُن کو نہ آئے   اور دیکھوں تو دیکھا نہ جائے
ہے عجب چیز رازِ محبت   جتنا سمجھو سمجھ میں نہ آئے
اشکِ غم تجھ کو لانے نہ پائے   آ گئے تو ہم پھولوں کے سائے

بیچ زُلفوں میں وہ روئے روشن — جیسے گنگا میں سورج نہائے

سادوستائش کے ریلے میں جناب دل صاحب فرما رہے ہیں ؎

اے صبا تجھ کو بندِ زلفوں کو ان کی — یہ بلا میرے سر پہ نہ جائے
دیکھ کر شیخ کو رند بولے — خیریت کیسے تشریف لائے

پنجاب کو قربات سے ہمیشہ لگاؤ رہا چنانچہ دل صاحب کے یہ اشعار خوب داد پا رہے ہیں۔ دل صاحب غزل سنانے کے بعد مائک سے ہٹنے لگے تو سامعین نے اصرار فرمایا کہ ایک غزل اور سنائی جائے۔ چنانچہ دل صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

زندگی کچھ بھی نہ تھی عشق و وفا سے پہلے
راہرو نیند میں تھے بانگِ درا سے پہلے
ہم کو دیکھیں گے کہ ایماں کی حقیقت کیا ہے
توبہ توڑے تو سہی ساون کی گھٹا سے پہلے

اس غزل پر بھی دل صاحب نے خوب خوب داد پائی ہے۔ لیجیے اب جناب نظر بارہ بنکوی مائک پر تشریف لائے ہیں اور نغمہ سرا ہیں ؎

کئی بار اس نے رُلایا ہنسی میں — کئی حشر آئے مری زندگی میں
مجھے مار ڈالا ہنسی ہی ہنسی میں — مزا موت کا آ گیا زندگی میں
مصیبت پڑی تو خدا یاد آیا — بڑا فرق نکلا خوشی اور غمی میں
خفا ہو چکے اب ذرا مسکرا دو — قیامت بھی ہم دیکھ لیں زندگی میں
نظر آؤ ساقی سے نظریں ملا کر — اندھیرے سے ہم آ گئے روشنی میں

نظر صاحب غزل سنا کر اور بہت اچھی داد پا کر مائک سے ہٹے تو کنور صاحب نے جناب بیکل اُتساہی سے التماس کیا ہے کہ وہ مائک پر آئیں اور سامعین کو محظوظ فرمائیں۔ بیکل صاحب نے ایک گیت ہمارے نوں کے بعد سنایا اور خوب داد پائی آپ بھی یہ گیت سنیے ؎

اے مری فکر! مری تابِ نظر!
پہلے جلووں کو نظاروں میں بکھر جانے دے۔
پھر کوئی گیت لکھوں

غنچہ و گل ہیں ابھی حسنِ تبسم پہ نثار
ہے ابھی چاند ستاروں کی لگن وقفِ سحر
سرزمین زار کی مسکان ابھی پابندِ بہار

منزلیں بھی تکتی ہے منزل کا ہر اک راہ گذر
وقت کے سر سے یہ جادو تو اُتر جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں

نازکی سوزِ نہفتہ کے دیدہ نگاہی کی ادا
آئینہ ٹوٹ گیا تھک بھی گئی انگڑائی
بانہہ پھیلائے ہوئے ہے یہ ہم کی طرف کالی گھٹا
ناگ بل کھاتے ہیں مر مر پہ چلی پُروائی
حسن کا یوں بھی تو انداز سنور جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں

دیکھ وہ اٹھتا ہے کہسار کے دامن سے دھواں
وہ اُبھر آئی ہے ماحول کے ماتھے پہ شکن
وہ سُلگتا ہوا تعمیر و ترقی کا نشاں
وہ جھُلستا ہوا تہذیب و تمدن کا بدن
ٹھہر یہ قافلۂ برق و شرر جانے دے۔ پھر کوئی گیت لکھوں
اے مری فکر!!

گیت سنانے اور داد پانے کے بعد بیکل صاحب اپنی جگہ پر آنے لگے تو کنور صاحب نے فرمائش کی کہ بیکل صاحب اپنے دو مشہور گیت "تلقین" اور "مشورے" سنائیں۔ چنانچہ بیکل صاحب نے یہ دونوں گیت سُنا کر اہلِ کرنال سے خوب خوب داد پائی۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ اب ایک واجب التعظیم شاعر حضرت قبلہ مولانا... تو کلام عطا فرمائیں گے۔ قبلہ صولت صاحب نہ صرف بلحاظ شاعری اُستادانہ مقام رکھتے ہیں بلکہ روحانیت میں بھی ان کا ایک خاص مقام ہے لیجئے قبلہ صولت صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں زبانِ مبارک سے عطا ہوا ہے ؎

بام و در مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
اُن کے آنے سے آثار نظر آتے ہیں

مطلعِ انوار ہے۔ شعرا اور سامعین نے دل کھول کر داد دی ہے۔ قبلہ فرما رہے ہیں ؎

صرف انوار ہی انوار نظر آتے ہیں
خود کہاں وہ دمِ دیدار نظر آتے ہیں

اس شعر نے مشاعرے میں ایک نئی روح پھونک دی قبلہ جوش ملیح آبادی اور صاحب صدر نے مطلعِ ثانی کو تین بار پڑھوایا۔ سنیے صولت صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

لغزش

ڈاکٹر اودے سرن ارمان
(بلاری)

شادی کے بعد نو برس کے طویل عرصہ میں بھی میری گود ہری نہ ہو سکی تو میرے شوہر کو اپنے خاندان کا چراغ بجھتا ہوا سا نظر آنے لگا۔ چنانچہ گاؤں سے ساس سسر نے آکر اپنے بیٹے کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرے، اور کہا انہوں نے ایک لڑکی بھی دیکھ لی ہے۔ ساس سسر مجھے بانجھ قرار دے چکے تھے اور انتہائی نفرت کا سلوک کرنے لگے تھے۔ میری انتہائی خوبصورتی کے باعث میرے شوہر دل کے ہاتھوں مجبور تھے اور چاہتے تھے کہ اگر بھگوان میری گود ہری کر دے تو سب کا منہ بند ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے والدین کو یقین دلایا کہ وہ ایک بار اور میرا علاج کرا کے دیکھ لیں اگر قدرت نے یاوری نہ کی تو وہ دوسری شادی سے انکار نہیں کریں گے۔ اس فیصلے کے بعد میرے سسر اور ساس اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ جو اولاد عام طور پر دُکھ زیادہ اور سکھ کم دیتی ہے انسان اس کے لئے دیوانگی کی حد تک متمنی ہوتا ہے۔ سسر ال اور شوہر کے فیصلے نے میرے لئے بھی لمحاتِ فکریہ کی بنیاد ڈال دی تھی۔ چنانچہ شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر سبھروال سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے تین ماہ تک علاج جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ ہندوستان میں بچہ پیدا نہ کرنے کا عورت کو ہی خطا وار سمجھا جاتا ہے لہٰذا لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے تین ماہ تک میرا علاج کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مجھ میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے لہٰذا انہوں نے میرے شوہر سے کہا کہ آپ اپنا مادہ منویہ ٹیسٹ کرائیے اور رپورٹ مجھے دکھائیے۔ پہلے تو میرے شوہر نے ایسا کرنے سے پہلو تہی کی مگر میرے تقاضے کے باعث مجبوراً ایسا کرنے پر تیار ہوئے۔ رپورٹ دیکھنے پر ڈاکٹر سبھروال مسکراتی ہوئی کہنے لگیں کہ شرما جی تھوڑی سی کمی آپ میں ہے مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں کچھ دنوں تک آپ اس دوا کا استعمال جاری رکھیں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے نسخہ لکھ کر میرے شوہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ دوائیں خریدنے کے بعد مجھے دکھا دیجئے گا اور رپورٹ میز کی دراز میں رکھ لی۔

میرے شوہر ایک پرائیویٹ براس ویئر فرم میں سیل ایجنٹ تھے لہٰذا ہر مہینے دس پندرہ دنوں کے لئے انہیں باہر رہنا پڑتا تھا۔ ہم مکان کے نچلے حصہ میں کرایہ دار تھے جو ایک بڑے صحن کے چاروں طرف بنے ہوئے کمروں پر مشتمل تھا۔ دوسرے کمروں میں بھی کرایہ دار بسے ہوئے تھے۔ مارواڑی مالک مکان کلکتہ میں رہتا تھا اور گاہے بہ گاہے آکر کرایہ وصول کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ ہمارے سامنے والے کمرے میں کیلاش نامی کرایہ دار رہتا تھا جس کی حسین و جمیل بیوی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ موٹر سائیکل ٹمپو ایکسیڈنٹ میں بھگوان کو پیاری ہو گئی تھی۔ کیلاش جب دفتر سے واپس آتا تو خود ہی کھانا پکاتا اور برتن صاف کرتا۔ ترس آتا کہ دن بھر کے تھکے ہارے مرد کو گھر آکر کھانا بھی خود بنانا پڑتا ہے۔ کئی بار خیال آیا کہ میں جب دو پلیٹوں کے لئے کھانا بناتی ہوں اگر ایک پڑوسی کے لئے بھی پکا دیا کروں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ مگر اس کے آتے ہی میرا دل کانپ جاتا اور میں دل مسوس کر رہ جاتی کیونکہ کسی عورت کے لئے کسی غیر مرد کے لئے ہمدردی بدنامی کا باعث ہو سکتی ہے۔ مرد کی فطرت ہے کہ وہ عورت کی کسی غیر مرد کے ساتھ صدق دلانہ ہمدردی کو بھی شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا میں نے اس ہمدردی کو اپنے تک ہی محدود رکھا۔ مگر اسے میری اخ

کمزوری کہئے یا کچھ اور۔ میں ایک دن کیلاش کی قابلِ رحم حالت پر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ مجھے خاموش بیٹھے دیکھ کر میرے شوہر کہنے لگے۔ چنتا مت کرو بہت جلد ہم دو سے تین ہونے والے ہیں۔ اس پر میں نے کہا۔ میں یہ نہیں سوچ رہی تھی اس پر وہ اور تقاضے سے پوچھنے لگے کہ کیا سوچ رہی تھی ذرا ہم بھی تو سنیں۔ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا

سے خوشی کے بعد غم کا سامنا ہونا قیامت ہے
جو حاصل بعد غم کے ہو وہ البتہ خوشی اچھی

یہ سن کر وہ چونکے اور کہنے لگے کس پلیٹ فارم سے بول رہی ہو، آج تو بڑی گمبھیر معلوم ہو رہی ہو۔ میں نے کہا دیکھو کیلاش نے اپنی پتنی کا کس قدر دکھ اٹھایا اور آج ایشور نے اسے نرک میں جھونک دیا ہے، دن بھر کام کرنے کے بعد جب اسے آرام چاہئے تو وہ گھر آنے کے بعد کھانا بناتا ہے، برتن صاف کرتا ہے۔ میری بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ بات کاٹتے ہوئے کہنے لگے تم ٹھیک کہتی ہو میں نے خود کئی بار اس کی اس تکلیف کے بارے میں سوچا ہے۔ مگر میں تمہاری پریشانیاں بڑھانا نہیں چاہتا ورنہ جہاں دو پیٹوں کا کھانا بنتا ہے ایک پیٹ اور سہی۔ اس سے ایک مہینہ کا راشن لے لیا کریں اور کھانا کھلا دیا کریں پڑوسی کو پڑوسی کی مدد کرنا بھی چاہئے اس طرح وہ ہمارا ہمدرد بھی بن جائے گا اور وقت بے وقت کام آئے گا اور اس طرح وہ شرمائے گا بھی نہیں"۔ میں خوش ہو کر بولی "آپ ٹھیک کہتے ہیں سو گوتی ایک پڑوسی برابر ہوتے ہیں آپ کا حکم ہو تو میں اس کا بھی کھانا بنا دیا کروں گی پریشانی کیا ہو گی اگر کسی کو ہماری ذات سے سکھ ملے اور اس کی پریشانیاں کم ہوں تو وہ اپنی پریشانی بھی راحت بخش ہوتی ہے"، میرے شوہر نہ جانے اس احساس کو جس کے لئے میں دل ہی دل میں بے چین تھی کب سے چھپائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کیلاش کو بلایا اور اپنا ارادہ اس کے سامنے رکھا وہ کچھ تکلف کے بعد راضی ہو گیا اور دونوں وقت ہمارے یہاں آ کر کھانا کھانے لگا۔ کیلاش بہت نیک اور سمجھ دار تھا۔ گھر میں جو کچھ پکتا وہ خوشی اور خدا کا شکر کرتے ہوئے کھا لیتا تھا۔ اس کا راشن تو ایک بہانہ تھا۔ جب میرے شوہر باہر جاتے تو وہ ضرورت کی تمام چیزیں خود ہی بازار سے لا کر دے دیا کرتا تھا اور کہتا تھا "بھابی جی، راشن کی لائن میں لگنا اور بازار میں دوکان دوکان جا کر سامان خریدنا آپ کو شوبھا نہیں دیتا میں کاہے کے لئے ہوں۔ اب آپ کوئی چیز خریدنے بازار نہیں جائیں گی۔" بڈھی مریں، بھرتی پریں، تشکی ترمیں، اور استری گھر میں اچھی لگتی ہے۔ کیلاش کی باتیں بہت معنی خیز اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ اچھے لوگوں سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے وہ مجھے بھی ہوئی، ہوتے ہوتے وہ ہمارے بہت ہی قریب آ گیا مگر اس نے آگے پیچھے اندھیرے اُجیارے کسی بھی وقت ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جس کا مجھے کبھی کبھی خوف پیدا ہو جاتا تھا۔ میں اُس کے اس شریفانہ رویہ سے بہت ہی خوش تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی بھی تھی کہ مردوں میں جو ذاتی کمزوریاں ہوتی ہیں کیلاش میں وہ رونما کیوں نہیں ہوتیں کیا واقعی یہ مہا پُرش ہے؟ ایک دن میں باتھ روم میں تھی وہ میرے پیچھے روزمرہ کی طرح بے تکلف آیا اور سامان رکھ کر چلا گیا۔ میرا فوٹو جو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا اب موجود نہیں تھا کئی دن تک تو میرا اُدھر دھیان ہی نہیں گیا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کیلاش فوٹو چرا سکتا ہے کیوں کہ جس شخص نے کبھی ایک سوئی تک کو نہیں چھوا ہو وہ میرا فوٹو کیوں کر لے جائے گا پھر اس کے کام کا بھی تو نہیں ہے ہو سکتا ہے میں نے ہی صفائی کے وقت کہیں رکھ دیا ہو؟ مگر یہ دلیل بھی دل و دماغ کو نہیں جچی کیوں کہ میں نے فوٹو کبھی بھی ڈریسنگ ٹیبل سے اُٹھا کر کہیں اور نہیں رکھا تھا! تو پھر کہاں گیا؟ میں نے اپنے دل سے سوال کیا اور سوچنے لگی کہ چور مال چراتا ہے فوٹو نہیں اس قسم کی چوری صرف وہ ہی کر سکتا ہے جو کسی سے محبت کرتا ہے یا اُنسیت رکھتا ہے چنانچہ میرے دل نے گواہی دی کہ

کہ یہ کارستانی سوائے کیلاش کے اور کسی کی نہیں۔ مگر میں نے کیلاش سے اس سلسلے میں پوچھ تاچھ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر میں اس ٹوہ میں رہی کہ فوٹو کی گم شدگی کا راز مل سکے۔ کچھ ہی دن بعد میں نے دیکھا کہ رات کے گیارہ بجے بھی کیلاش کے کمرہ میں روشنی ہو رہی ہے جب کہ سب کرایہ دار میٹھی نیند سو رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور ننگے پاؤں پنجوں کے بل کیلاش کے کمرے کی کھڑکی کے قریب جا کر اُچک کر دیکھا تو وہ خاموش بیٹھا میرے فوٹو کو سامنے رکھے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ میں چپ چاپ لوٹ آئی "یہ مجھ سے پیار کرنے لگا ہے" میں نے اپنے دل سے کہا" پیار کرنا تو کوئی بری بات نہیں ہے پیار تو زندگی کی سنجیونی ہے۔ میرے اندر کی عورت نے جواب دیا اور اس کے بعد کیلاش کے بارے میں کبھی نفرت اور کبھی پیار کے ملے جلے جذبات میرے من میں آنے لگے ہر عورت دوسرے کو متاثر کرنے میں فخر سمجھتی ہے مگر جب کوئی اس کے سامنے اس کے حسن کی تعریف کرنے لگتا ہے تو وہ اُلٹے سیدھے سوال کرنے لگتی ہے یہ ایک عام بات ہے۔ کئی دن تک میں نے کیلاش کی چال ڈھال پر گہری نظر رکھی۔ ایک دن میرا پیٹ خراب ہو گیا میں کئی بار لیٹرین گئی رات کے بارہ بجے جب لیٹرین سے واپس آئی اور لائٹ آف کر کے پلنگ پر لیٹی تو میرے پلنگ کے نیچے سے نکل کر کسی نے لائٹ آن کر دی کوئی اندھیرے سے ڈرتا ہے میں اُجالے سے ڈر گئی میری چیخ نکلنے ہی والی تھی کہ کیلاش کا چہرہ دیکھ کر سنبھل گئی اور میری زبان سے مشکل سے نکلا تم،، دھیرے سے بولو بھابی کوئی پڑوسی سن لے گا؟ میں تمام صورتِ حال کی تہہ تک پہنچتے ہوئے بولی" تم نے ایسا کیوں کیا؟،، "بھابی تم کو کئی دست آ گئے ہیں تمہارے جسم میں درد ہو رہا ہوگا۔ تمہیں پانی کی ضرورت ہوگی کمزوری ہوگی کسی کی مدد کی ضرورت ہوگی میں یہ سیوا نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟ کیلاش نے نیچی نظریں کئے ہوئے ساڑی کے اوپر سے میری ٹانگیں دباتے ہوئے کہا۔ میں

اس کا منہ دیکھ رہی تھی اور اس نے نظریں نیچی کئے ٹانگیں دبانی جاری رکھیں۔ مجھے واقعی بہت راحت مل رہی تھی لہٰذا میں نے ٹانگیں سکوڑیں نہیں اور خاموشی سے پڑی رہی اور حالات کا جائزہ لیتی رہی میرا دل دھڑک رہا تھا، مگر وہ رات بھر میری خدمت کرتا رہا اور پانی پلاتا رہا،، میری ٹٹیاں بند ہو گئی تھیں ہاضمے کی خرابی سے دست تھے۔ کیلاش تڑکے ہی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ "یہ تو سچ مچ دیوتا ہے" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ تین چار دن بیت گئے وہ کھانا کھاتے ہی اپنے کمرہ میں چلا جاتا تھا آج نہیں گیا۔ میں اگر خود اسے کہتی کہ اب اپنے کمرے میں جاؤ تو یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کرتا رہا اور رات کے گیارہ بج گئے میں نے اسے اشارۃً جانے کے لئے یہ کہا کہ کیا آج نیند نہیں آ رہی ہے جو اتنی دیر تک باتیں کر رہے ہو؟ وہ بے تکلفی سے کہنے لگا بھابی آپ کو نیند آ رہی ہے تو آپ سو جائیے میں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے تو اب نیند آ رہی ہے، یہ سُن کر کیلاش اُٹھا اور دروازہ بند کر دیا اور خود ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اس کا چہرہ تمتما رہا تھا جس سے مجھے دال میں کچھ کالا معلوم پڑ رہا تھا مگر میں گھبرائی نہیں کیوں کہ میری نظروں میں وہ کھرا ثابت ہو چکا تھا۔ میں نے سمجھا ہو سکتا ہے آج کسی خاص مسئلہ کے سلجھانے کے لئے ایکانت میں بیٹھنا چاہتا ہے "کیلاش یہ کیا کیا تم نے؟" وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہنے لگا "پیار کی بھیک" یہ سُنتے ہی میں نے سمجھا کہ آج کیلاش ڈگمگا رہا ہے۔ دیوتا بھی یہاں آ کر ڈگمگا جاتے ہیں۔ میرے دماغ میں کئی ایسے واقعات گھومنے لگے اور میں نے حوصلہ کرتے ہوئے کہا کیلاش پہلے تم نے چوری کر کے میرا فوٹو چرایا اور اب پیار کے بھکاری۔ مگر انسان بننے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ مگر میں خود اس ملاح کی طرح بے بس ہو رہی تھی جو تیز زور لہروں میں ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ڈوبنے سے بچاتے بچاتے خود نڈھال ہو چکا

Phone : 273602
THE [illegible] MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57



سرمارٹیمر ویلر اور قلندر

امر جلیل
ترجمہ: محمد رمضان

(سندھی کہانی)

سرمارٹیمر ویلر آثارِ قدیمہ کا مشہور ماہر زمانہ ماہر ہوٹل کی انتظار گاہ میں داخل ہوا۔ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا ”معاف کرنا میں اصل میں ابھی موئن جوداڑو سے حیدرآباد پہونچا ہوں۔“

انتظار گاہ میں صحافی، پریس فوٹو گرافر، ریڈیو پاکستان کے نمائندے، شاگرد اور سرکاری افسر موجود تھے۔ ایک صحافی نے سرمارٹیمر ویلر سے پوچھا۔

”موئن جوداڑو کو کب سے سیم کھا رہا ہے۔“

سرمارٹیمر ویلر نے فوراً جواب دیا ”یہ سوال سیاسی نوعیت کا ہے، میں جواب نہیں دوں گا۔“

”موئن جوداڑو سندھ کی علامت ہے“ یونیورسٹی کے ایک شاگرد نے سرمارٹیمر ویلر سے پوچھا۔

”موئن جوداڑو کو بچانے کے لئے آپ کون کون سی تدبیریں کر رہے ہیں“، سرمارٹیمر ویلر نے سرکاری افسروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سوال آپ اپنی حکومت سے پوچھیں۔“

ایک چھوٹے قد کا گنجا اور نہایت بدشکل شخص شاگردوں، صحافیوں اور پریس فوٹو گرافروں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اور انگریزوں کی روحوں کو عذاب میں مبتلا کرنے والی انگریزی میں سرمارٹیمر سے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔

”میں پنجابی فلموں کا سب سے مشہور اور امیر پروڈیوسر ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے مسٹر پروڈیوسر“، سرمارٹیمر ویلر نے جواب دیا، ”ہم نے حکومت کو تاکید کی ہے کہ کسی کو بھی موئن جوداڑو کی شوٹنگ کرنے کی اجازت نہ دیں۔“

”ہمیں موئن جوداڑو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے“ بدشکل گنجے نے آسی لہجے میں کہا ”مجھے اپنے پیسے حرام نہیں کرنے کہ میں کھنڈروں کی فلم بناؤں۔“ ”تو پھر“ سرمارٹیمر ویلر نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ سال پہلے مصر میں فرعون کی قدیم عبادت گاہوں کو پانی سے بچانے کے لئے بنیادوں سمیت اصل جگہوں سے ہٹا کر محفوظ جگہوں تک پہنچایا گیا تھا۔“

بدشکل پروڈیوسر نے کہا ”ہم کو بھی ایسا ہی ایک کام کروانا ہے۔“

سرمارٹیمر نے تعجب سے پوچھا۔ ”آپ کیا اٹھوائیں گے؟“

”ہر سال پنجاب کے سب فلم اسٹار اور ہیرا منڈی کے ہیرے تکلیفیں برداشت کر کے قلندر شہباز کے میلے میں سیہون شریف آتے ہیں۔“ گنجے اور ٹھگنے پروڈیوسر نے کہا ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم قلندر لعل شہباز کی پوری درگاہ بنیادوں سمیت اکھڑوا کر پنجاب لے جائیں۔ اس سلسلے میں آپ ہماری کون سی مدد کر سکیں گے۔“ ••

دوست لڑکی کے لئے دعا

جلیل ہاشمی

یہی مری ایک التجا ہے
یہ پہلی اور آخری دعا ہے
کہ تم ہمیشہ مہکتے موسم میں چاندنی بن کے گیت گاؤ
کہ تم ہمیشہ حسین دنوں اور سہانی راتوں میں مسکراؤ
تمہاری شاداب زندگی میں نہ کوئی لمحہ اداس گزرے
تمہیں نہ ہو دکھ کبھی کسی کا نہ کوئی احساسِ یاس گزرے
خدا تمہیں زیست کے اندھیروں میں جگمگانے کا گُر سکھا دے
خدا تمہاری حسین آنکھوں کو نور کی مشعلیں بنا دے
خدا تمہیں اپنے فیصلوں پر یقین کرنے کا حوصلہ دے
وہ ہجر ہو یا کہ وصل میرا جو تم کو اچھا لگے خدا دے
یہی مری ایک التجا ہے
یہ پہلی اور آخری دعا ہے

محمود درویش کے لئے خط

ذیشان ساحل

میرے پیارے سوگوار
مجھے معلوم ہوا ہے کہ
تمہارے لوگوں سے زندہ رہنے کی جگہ
اور حق چھینے جانے کے باعث
تمہارا دل خیریت سے نہیں رہا ہے،
یہ معلوم ہوا ہے
تمہارے بہادروں کو دھوپ سے بچانے والی ٹوپیاں
ان کے خون سے سرخ
اور تمہاری صابر عورتوں کے چہرے
غم کی شدت سے سیاہ ہو چکے ہیں
میرے بھائی
زیتون کے درختوں پر لگے پھول
اور تمہارے پھولوں جیسے بچوں سے اُمڈنے والی
خوشبو بارود اور دھوئیں کی بُو میں بدل چکی ہے
اور میرے دوست
سنا ہے تمہارے سر پہ ہاتھ رکھنے والے
اب انہی ہاتھوں سے
تمہارے پیروں کے نیچے کی زمین کھینچ رہے ہیں
ابھی اس خط کو لکھتے ہوئے ایسا لگا
جیسے کوئی دروازے پر ہے
میں نے دروازہ کھولا
تو باہر دُور دُور تک کچھ نہ تھا
نہ کوئی عمارت نہ کوئی گھر
نہ کوئی موسم نہ کوئی دن
نہ کوئی شخص نہ کوئی سایہ
نہ کوئی غم نہ کوئی آنسو
صرف سناٹا اور خاموشی
میں نے اپنے دل کا دروازہ بند کر لیا
اور واپس آگیا،
یہاں تمام لوگ موم کے سپاہی ہیں
اور آنسو
زہریلی مسکراہٹوں میں تبدیل ہو گئے ہیں
محمود درویش
تمہیں تسلی دینے
اور تمہارے لوگوں کی حمایت میں کہنے کے لئے
میرے پاس سوائے ایک نمناک خاموشی
کے کچھ نہیں
یا کچھ اور لوگ جو میری طرح
اپنی میزوں کی بند درازوں کے سامنے بیٹھے
اُن کے خود بخود کھلنے
یا کسی اور نہ ہونے والے
معجزے کے منتظر ہیں

فکرِ مسلسل

توصیف علوی عاصی کیرانوی

کچھ نئے فکر و خیالات لکھوں یا نہ لکھوں
وقت کے رمز و کنایات لکھوں یا نہ لکھوں

بھول جاؤں میں خزاؤں کے ستم تو لیکن
فصلِ گل کی بھی عنایات لکھوں یا نہ لکھوں

دعویٰ پھولوں ہی کا تعمیرِ گلستاں ہی سہی
ہاں مگر خاروں کی خدمات لکھوں یا نہ لکھوں

جن پہ خاموش ہیں اس دَور کے اربابِ خرد
زندگی کے وہ سوالات لکھوں یا نہ لکھوں

ذکر کیا اب "شبِ ظلمات" کا یہ تو بیج ہے
"صبحِ نو" کی بھی کوئی بات لکھوں یا نہ لکھوں

قافلے آکے جہاں بار ہا لٹتے دیکھے
منزلوں کے وہ نشانات لکھوں یا نہ لکھوں

جن سے طوفانوں نے پائے ہیں سہارے اکثر
وہ کناروں کے اشارات لکھوں یا نہ لکھوں

رہزنوں کا تو چلو ذکر ہی بیکار سہی
رہبروں کی بھی "کرامات" لکھوں یا نہ لکھوں

بات ساقی کی بھی رکھنی ہے، یہ تسلیم، مگر
میکدہ کی بھی روایات لکھوں یا نہ لکھوں

جبکہ صیاد بھی خود رہ گئے سر کو دھنکر
پاسبانوں کی وہ خدمات لکھوں یا نہ لکھوں

جس سے اس دَور کے شاید کہ بدل جائیں نقوش
موسِ تلاطم کی علامات لکھوں یا نہ لکھوں

جب بہاروں کے بھی دامن سے اُٹھے ہیں شعلے
ایسے سنگین سے لمحات لکھوں یا نہ لکھوں

جن سے تاریخ کے اوراق رہیں گے بوجھل
قلبِ دَوراں کے وہ صدمات لکھوں یا نہ لکھوں

برقِ سوزاں کی "نوازش" کے فسانے چھوڑو
"شاخِ گل" کی بھی کرامات لکھوں یا نہ لکھوں

"مایۂ ناز" ہے جو اہلِ چمن کی خاطر!
فصلِ گلشن کی وہ سوغات لکھوں یا نہ لکھوں

جو ہیں عاصیؔ کے نئے فکر و تخیّل کے خطوط
دَورِ نو کے وہ اشارات لکھوں یا نہ لکھوں

اُدھار

کلام حیدری

میں اُس بلڈنگ کی تیسری منزل کے ایک ایسے کمرے میں رہتا جس سے منسلک ایک بالکونی بھی تھی جسے میں نے اپنا باورچی خانہ بنا لیا تھا۔ طالب علمی کا زمانہ تھا گھر کی معقول آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے میں نے نائٹ کلاس میں داخلہ لے رکھا تھا اور دن میں کام کرتا تھا۔ خود ہی صبح کو انگیٹھی سلگاتا اور مختصر سا ناشتہ تیار کر کے کھا لیتا، پھر دو پراٹھے اور کچھ سالن بنا کر ناشتہ دان میں رکھ کر آفس چل دیتا۔

میرے کمرے کے سامنے اوپری منزل کے ایک کمرے کے دروازے پر ایک NAME PLATE لگی رہتی تھی، نام کچھ عجیب تھا۔ ایچ۔ اے۔ ٹرنر! میں نے اُسے دو چار بار یوں ہی دیکھا تھا کیونکہ میری اس کی رنگین میل نہیں کھاتی تھی۔

میرے کمرے کے بازو والے کمرے میں یٰسین گھڑی ساز تھا جو کبھی کبھی میرے پاس آ بیٹھتا تھا اور اِدھر اُدھر کی گپیں کرتا۔ اُس کی گھڑی مرمت کی دکان تانتی بگان کی کسی گلی میں تھی۔ ایک دن وہ آیا تو میں نے ایچ۔ اے۔ ٹرنر کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، یہ کون ہے تو یٰسین نے بتایا کہ وہ شخص بڑا پیسے والا ہے، برما میں اس کی تجارت تھی، جنگ میں وہ جیسے تیسے بھاگ کر کلکتہ چلا آیا۔ اس کے پاس دو چار لاکھ روپے سے کم ابھی بھی نہیں ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ ایسا آدمی اس بلڈنگ میں کیوں رہتا ہے جہاں کے لوگوں کی آبادی مجھ جیسے لوگوں پر مشتمل تھی۔

کئی روز تک ایچ۔ اے۔ ٹرنر کے دو چار لاکھ روپے میرے ذہن میں جھنجھناتے اور پھڑپھڑاتے رہے اور یہ اشتیاق بھی ہوا کہ اس شخص سے ملاقات ہو جائے۔

اُس دن بڑے غضب کی گرمی تھی، بنگال کی اُمس والی گرمی۔ میں بلڈنگ کی چھت پر چلا گیا۔ چھت کی ریلنگ سے لگا ہوا ایچ۔ اے۔ ٹرنر کھڑا ہوا سڑک کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسی کھلی چھت پر میری اُس کی ملاقات ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے دیکھا اندر اُس نے بڑی نفاست سے دیواروں پر رنگ چڑھوائے تھے اور ہلکے پھلکے خوبصورت فرنیچر سے کمرہ آراستہ تھا۔ اُس نے پنکھا کھول دیا۔ اس بیہودہ گرمی میں اس کے پنکھے نے مجھے بے حد آرام دیا۔

وہ الیکٹرک کے چولھے پر پانی گرم کرنے لگا۔

"کافی یا چائے۔!"

"کافی ــــ!"

کافی پیتے ہوئے میں نے دیکھا اُس نے اپنے اگلے اوپر کے دو دانتوں پر سونا لگوا رکھا تھا۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد ایسا اکثر ہوتا کہ میں کالج سے واپس آتا تو اُسے منتظر پاتا، مجھے اپنے کمرے میں لے جاتا اور خاموشی کے ساتھ ایک ایک پگ وہسکی بنا کر ٹیبل پر رکھ دیتا اور ہم خاموشی کے ساتھ دو گھونٹ پیتے رہتے۔ حالانکہ مجھے پوچھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی مگر میں نے ایک دن پوچھا۔

تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ بے شغلی سے تمہارا جی نہیں اُکتاتا؟

"کوئی اور بات کرو ــــ"

"تو تمہارے پاس ایسا قارون کا خزانہ کہاں سے آ گیا ہے کہ زندگی بھر وہسکی پیتے رہو اور ــــ" میں نے سوال اس لیے کیا تھا کہ یٰسین گھڑی ساز کی بتائی ہوئی اُس

اُس بات کا اندازہ لگ سکے۔

"دیکھو آگے کیا ہوتا ہے!"

وہ پُراسرار بنا رہا۔

ایک دن صبح میں جب کہ میں آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا، بلڈنگ میں کچھ شور ہوا، کمرے سے باہر آیا تو دیکھا ایچ۔ اے ٹرنر کو دو تین کابلی گھیرے ہوئے ہیں اور بلند آواز میں گفتگو میں مصروف ہیں۔ "یہ پٹھان پیسے تھا محمد خان کابلی نے آواز لگائی۔ دیکھو تم، ہمارا سود دی نہیں دیتا، وعدہ کیا، اب ٹالتا ہے۔"

اس واقعے کے بعد مجھ پر واضح ہو گیا کہ لیپین کی بات محض گپ تھی۔

میں نے سوچا تھا، وہ کابلی والے واقعے کے بعد مجھ سے احتراز کرے گا۔ اُسے شرمندگی سے بچانے کے لیے میں سو رہی ملاقات نہیں ملا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں شرمندگی تلاش کی، مگر کہاں؟ وہ تو بالکل نارمل تھا۔

"بلو تم کمرے پر آئے نہیں۔؟"

"میں ـــــ ذرا امتحان کا چکر ہے ـ!"

"خیر، آج کھانا میرے کمرے پر کھاؤ، پروگرام دلچسپ ہے!" کھانے کی دعوت تو نئی نہیں تھی مگر یہ ٹکڑا نیا تھا "پروگرام دلچسپ ہے!"

کھانا تو مزے کا تھا ہی، پروگرام بھی واقعی دل دلچسپ تھا۔ میرے علاوہ اُس کا کوئی ایک دوست اور بھی تھا جس کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ فل مون کا ... بزنس ... انچارج کے سلسلے کی جو بات اُس نے کہی تھی وہ ان تین لڑکیوں کی شمولیت تھی جن کے متعلق اُس نے بتایا کہ فل مون کلب کی سنگر ڈانسر ہیں۔

دو بجے رات میں جب اُس کا دوست ان لڑکیوں کے چلا گیا تو میں یہ سوچتا ہوا اپنے کمرے میں سو گیا کہ یہ لگژری ٹرنر کو اُس کے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ جب کہ قرض بھی ادا کر نہیں کر سکتا ـــــــ

صبح جب میں جاگا تو میرے ساتھ وہ پارسائی بھی جاگی جس کا تعلق عزت ... سے بہت قریبی ہوتا ہے۔ میری پارسائی شاید اس خوف سے پیدا ہوئی تھی، اگر میں ایچ۔ اے ٹرنر کی راہ پر لگ گیا تو جب وہ نہ ہو گا تو میری غریبی اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ لیکن ایسا سوچنے والا لمحہ بے حد مختصر تھا اور پھر میں نے اپنی پارسائی کے غرور کے سائے میں خود کو بڑا انسان محسوس کیا، ایچ۔ اے ٹرنر سے بڑا ـــــ میں نے اُس سے ملنے میں احتیاط برتنی شروع کر دی۔ اُس نے یہ بات محسوس کی یا نہیں مگر مجھ سے اس نے شکایت کبھی نہیں کی۔ وہ خود ہی جب مجھے کمرے پر دیکھتا تو چلا آتا۔

اور میں نے خود کو بڑا آدمی سمجھنے کے باوجود جب اپنے اندر جھانکا تو ـــــ پھر میں فوراً اپنے اُس خول میں گھس گیا جہاں اپنے آپ میں ہزاروں صفات دیکھتا اور مطمئن ہو کر اپنے آپ میں بند ہو گیا۔

ایچ۔ اے۔ ٹرنر اب اس بلڈنگ میں ایک مشہور آدمی ہو گیا تھا، بلڈنگ کا ہر باشی اُسے جانتا تھا۔ کوئی اس سے ڈرتا تھا، کوئی اس سے جلتا تھا، کوئی اُس سے دوستی کرنے کی دھن میں تھا، کوئی اُسے اوباش سمجھ کر کنارہ کشی اختیار کرتا، حالانکہ ایچ۔ اے۔ ٹرنر کے لیے پوری بلڈنگ کوئی معنی نہیں رکھتی تھی وہ تھا اور اس کا کمرہ۔ جہاں روزانہ دلچسپ پروگرام ہوا کرتے تھے۔

پھر اچانک وہ کمرہ اُجاڑ اُجاڑ سا رہنے لگا۔

اور ایک روز ایچ۔ اے۔ ٹرنر نے بے حد ہچکچاتے ہوئے لاچاری کے ساتھ مجھ سے درخواست کی کہ میں اُسے پچاس روپے اُدھار دے دوں۔

میرے پاس پچاس کیا، اس سے زیادہ روپیہ بھی تھا جو میں چاہتا تو دے سکتا تھا۔ مگر مجھے ان کی واپسی کا یقین نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بہانہ کر دیا۔

میں نے اُس کے جانے کے بعد اپنے اس سلوک پر سوچا تو مجھے ایک بار تو ایسا لگا جیسے میں نے غلط کام کیا۔ جب منطقی طور پر غور کیا تو میں مطمئن ہو گیا کہ میں نے ٹھیک کیا۔ کیونکہ ایچ۔ اے۔ ٹرنر سے میں روپے کی ادائیگی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

مہینوں گزر گئے، میرا کالج اور آفس دونوں تعطیل میں بند ہونے والے تھے اس تعطیل میں میری بہن کی شادی تھی میں نے بڑی مشکلوں سے چار سو روپے جمع کیے تھے، میں نے گھر خط لکھا تھا کہ جو چیزیں وہاں دستیاب نہ ہو سکیں اُن کے لیے مجھے لکھیں

شام کو میں کمرے سے نکل رہا تھا کہ ایچ۔اے۔ ٹرنر آ گیا اور ہم دونوں ساتھ ہی بلڈنگ سے باہر نیچے ریستوراں میں چائے پینے نکلے۔ سیڑھیوں پر پوسٹ مین سے ملاقات ہو گئی تو اُس نے ایک لفافہ مجھے دیا۔

ایچ۔اے۔ ٹرنر نے دو کپ چائے کا آرڈر دیا اور میں لفافہ کھول کر پڑھنے لگا۔

یہ ایک طویل خط تھا، جس میں سامان کی ایک لمبی فہرست تھی اور لکھا تھا کہ کم از کم ایک ہزار روپے گھر بھیج دوں اور سب سامان لے کر آفس بند ہوتے ہی گھر پہنچ جاؤں میں نے اندازہ لگایا تو سامان ڈیڑھ دو ہزار سے کم کا نہ تھا میرے پاس اتنے روپے کہاں؟ پہلے تو مجھے اپنے ابّا جان پر غصہ آیا پھر مجھے اپنے حالِ زار پر رونا آیا پھر مجھے کھسیاہٹ لگی اور پھر میں پژمردہ سا ہو کر نڈھال ہو گیا۔

چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" ٹرنر کی یہ آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی معلوم پڑی۔

میں نے بے حسی کے ساتھ پیالی اُٹھائی اور دور خلا میں گھورنے لگا۔

"کیا بات ہے —— ؟ کیا سوچ رہے ہو؟!"

میں نے غور سے ایچ۔اے۔ ٹرنر کو دیکھا اور پھر اُسے پورا خط پڑھ کر سُنا دیا۔

"تو سمجھے مسٹر ایچ۔اے۔ ٹرنر! زندگی نہ ہنسی کی چٹکی نہیں ہے، زندگی بسر کرنے کو پتھر کا جگر چاہیے —— چلیے اُٹھیے اب! کیونکہ دُنیا بہت پھیلی ہوئی ہے اور اوقات بے حد سمٹی ہوئی ہے"

ایچ۔اے۔ ٹرنر تھوڑا سا مُسکرایا۔ ہم دونوں الگ الگ سمتوں میں چل دیئے ——

تین چار دنوں تک میں چھوٹی موٹی چیزیں خریدتا رہا اور گھر جانے کی تیاری کرتا رہا۔

اُس وقت میں سو کر ہی اُٹھا تھا کہ ایچ۔اے۔ ٹرنر میرے کمرے میں داخل ہوا ——۔

"کیوں خیریت؟ یہ اتنے سویرے کیسے اُٹھ گئے؟"

"بس یوں ہی! ہاں، یہ رکھو، ڈھائی ہزار روپے ہیں اور مجھے بتاؤ تم کب جا رہے ہو —— ؟"

"یعنی ..... آگے میری زبان بند تھی!

میں اس کا رسمی شکریہ بھی نہیں ادا کر سکا۔ میری زبان کو تالا لگ گیا ہو جیسے ——

ایک ماہ بعد جب میں لوٹا تو ایچ۔اے۔ ٹرنر کے کمرے میں کوئی اور رہنے لگا تھا۔ کوئی بھی نہ بتا سکا کہ وہ کہاں گیا۔

ڈاک سے خط لے کر میں نے پتے پر نظر ڈالی تو فرام ایچ اے۔ ٹرنر دیکھ کر جلدی سے لفافہ کھولا۔

ڈیر،

اُمید کہ تم اپنی بہن کی شادی کر کے واپس آ چکے ہو گے۔ اس خط کے ساتھ تین ہزار کا ڈرافٹ تمہارے نام ہے اسے کیش کرا لو اور محمد خاں بانی کو دے دو اور کہہ دو میرا اس کا حساب صاف ہو گیا۔ تمہارے جانے کے سولہویں دن مجھے یہ خوشخبری ملی کہ میری دس لاکھ کی رقم جو زمانۂ جنگ میں بینک میں تھی۔ مجھے واپس مل جائے گی۔

تمہاری بلڈنگ مجھے ہمیشہ یاد رہے گی

تمہارا — ٹرنر ●●

ممتاز مفتی

ساری بات

نہیں یہ ڈاکٹر نہیں سمجھے گا۔ بات کرتی ہوں تو بڑا بیٹھا میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بار بار کہتی ہوں ڈاکٹر مجھ پہ خوف طاری ہے، کوئی ایسی دوا دیجئے کہ دور ہو جائے۔ یا اس کی ٹینشن میں کمی آجائے۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتا ادھر میرے خوف کی طنابیں تو کستی ہی جا رہی ہیں۔ روز بروز اک ٹینشن ہے جکڑن جو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر پوچھتا ہے کوئی اریشنل فیر ہے کیا۔ تو وہ تو لازماً اریشنل ہوگا۔ ریشنل ہو تو کوئی بات نہ ہو سانپ کو دیکھ کر ڈر جاؤں تو ٹھیک ہے ڈرنا ہی چاہئے۔ لیکن کو دیکھ کر ڈر دوں تو ظاہر ہے کوئی گھنڈی ہے کہیں گرہ لگی ہے۔ کوئی گم پھوڑا ہے۔ جبھی تو مشورے کے لیے آتی ہوں۔

مجھ سے پوچھتا ہے کس بات کا خوف ہے۔ کہتی ہوں اس بات کا کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ اس پر وہ پوچھتا ہے کیا بھول نہ جاؤ۔ کہتی ہوں یہ بھول نہ جاؤں کہ میں کون ہوں۔ گھر میں میری کیا حیثیت ہے۔ کیا مقام ہے۔ اس پہ وہ بالکل ہی کنفیوز ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر چپ رہتا ہے۔ پھر کہتا ہے ساری بات بتایئے بیگم صاحبہ!

اب میں اسے ساری بات کیسے بتاؤں۔ چاہوں گی تو نہیں بتا سکتی ساری بات بھلا کسی نے بتائی ہے۔ کبھی ماں باپ نہیں بتاتے۔ باپ تو خیر بالکل نہیں بتاتا۔ ماں بھی آدھی بتاتی ہے۔ سہیلیاں کب ساری بتاتی ہیں۔ پھر وہ ساری نہیں ہوتی۔ بتاتے ہوئے دو ایک گھنڈیاں بند کر لیتی ہیں۔ دوسروں سے کہہ دینے کی بات چھوڑیئے ساری بات تو ہم خود سے بھی نہیں کرتے۔ پھر میں کیسے بتاؤں ڈاکٹر کو ساری بات۔

حیران ہوں کہ ڈاکٹروں کے پاس خوف کی دوا بھی نہیں

آج کل تو ساری بیماریاں ذہنی ہوتی ہیں۔ خوف میں الگزائیٹی ہے بے چینی ہے، کم خوابی ہے۔ امی کو ڈیوڈینل السر ہوا تھا۔ ڈاکٹر کہتا تھا اینگزائیٹی کی وجہ سے ہے۔ پھر اس نے علاج السر کا کیا، اینگزائیٹی کا نہیں۔ وہی بات ہوئی پیٹ میں درد ہو آنکھ میں سلائی لگا دی۔

میرا یہ خوف جو ستوبان روح ہو رہا ہے۔ حال ہی کی پیداوار ہے۔ شادی ہوئے دو سال تو ہوئے ہیں۔ شادی سے پہلے کوئی خوف نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ شادی کے بعد خوف نے مجھے کیوں آ جکڑا۔

ڈاکٹر کہتا ہے یہ ماحول کی وجہ ہے۔

شادی کے بعد تو میرا ماحول بالکل ہی کشادہ ہو گیا ہے۔ کوئی فکر نہیں، پریشانی نہیں، تنگی نہیں، ترشی نہیں۔ اتنا تو آرام مجھے کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہ رہی ہوں۔ میاں جان چھڑکتے ہیں۔ دیکھے بغیر دم نکلتا ہے۔ ہر وقت میرے پھیرے لیتے رہتے ہیں جو مانگوں حاضر جو چاہوں موجود میں تو یوں زندگی گزار رہی ہوں جیسے شیشے کے مرتبان میں اُگا ہوا کنول ہو۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں جو چاہوں کروں جیسے چاہوں جیوں۔ سر پہ نہ ساس ہے نہ سسر نہ بڑا نہ بزرگ، گھر میں بس نوکر ہیں۔ مالی ہے چوکیدار ہے خانساماں ہے۔ میڈ ہے یا ہم چاروں میں ملک فارغ ہیں۔ میں ہوں۔ اماں ہیں۔ جہاں آرام ہے۔ اب آپ ہی بتایئے اتنے کیر فری ماحول میں ڈر خوف کی گنجائش ہے کیا۔ شادی سے پہلے البتہ کچھ کچھ اینگزائیٹی تھی۔ امی کو زیادہ مجھے کم کم۔ میں تو جب سے جوان ہوئی تھی بے فکری میں ہی گزری۔ امی ابا کے یہاں میری حیثیت پھول مالا کی تھی۔ ہر دم تازہ وقت امی ایک ایک پھول بڑی توجہ اور محنت سے

پڑ رہی تھی۔ بڑے خیال سے پانی کے چھینٹے لگاتی تاکہ تازگی میں فرق نہ آئے۔

امّی کی بس ایک خواہش تھی۔ ایک ہی فکر میں گھلی جاتی ہے کہ کب کوئی سر نوائے اور پھول مالا اس کی گردن میں ڈال دے نہیں کوئی سامنے نہیں ——— ایسا مرد جس پر پہلے سے ہی دولت یا شخصیت کا تاج دھرا ہو۔ کسی ایک مرد کی بات ہو تو اتنا لمبا چکر نہ پڑتا۔ پتہ نہیں ان حالات میں کیا ہوتا بہرحال یہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔

صدی بھر مجھے سجی سجی پلیٹ بن کر رہنا پڑا۔ امّی کا یہی مطالبہ تھا کہ ہر وقت بنی سجی پلیٹ بن کر رہنا اور ہو تو آنے پر اس کے اشارے کی منتظر رہوں۔ جونہی وہ اشارہ کرے میں خود کو پیش کر دوں۔ امّی ہر وقت مجھے بناتی سجاتی رہتی۔ پلیٹ پر پستے بادام لگاتی رہتی۔ چاندی کے ورق سجاتی رہتی۔ میری ہر بات پر کڑی نظر رکھتی۔ یہ پہنو، وہ نہ پہنو۔ یوں پہنو وہ یوں نہیں یوں اٹھو، یوں بیٹھو یوں مسکراؤ۔ یوں بات کرو۔ یوں ڈرنکس سرو کرو۔ یوں چائے بناؤ یوں پان پیش کرو۔ یوں دیکھو یوں مسکاؤ۔

ہم دو بہنیں تھیں۔ میں اور رمنا۔ میں بڑی تھی لہٰذا ساری توجہ مجھ پر مرکوز تھی۔ دقت یہ تھی کہ ہم دونوں بہنوں میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ نظروں پر چڑھ جاتی، چونکاتی یا توجہ طلب کرتی۔ عام سے خدوخال، عام سا رنگ، عام سے جسم، جوانی آئی تو وہ بھی مدّھم مدّھم پتہ ہی نہ چلا کہ آئی ہے۔

جوانی کا بھی کسی نے بھید نہیں پایا۔ کسی کو باہر آتی ہے۔ کسی کو اندر۔ وہ میری سہیلی آمنہ تھی، سوکھی چمرمکھ یوں جوانی ٹوٹ کر آئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میلا لگ گیا۔ انگ انگ پھول پتیاں اُبلیں کہ بوٹے سے چمن بن گئی۔ ساری جوانی باہر ہی ڈھیر ہو گئی۔ ایسی گھنٹیاں بجیں کہ دُور سے پتہ لگتا تھا کہ جوانی آئی ہے۔

پھر وہ نادرہ تھی۔ باہر کچھ بھی نہ ہوا۔ اندر ایسی چکریاں چلیں کہ ٹک کر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ اک بے چینی تھی کہ جینے نہیں دیتی تھی۔ بے چاری کو قرار نہیں آتا تھا کچھ ایسی بھی ہیں جن کا اندر باہر دونوں رنگے جاتے ہیں۔ باہر پھول کھل جاتے ہیں اندر پھوٹتے ہیں ——

مجھے تو کچھ بھی نہ ہوا نہ باہر پھول کھلے نہ اندر پھوٹے

اندر پھوار سی ضرور پڑتی تھی۔ باہر سوکھی کی سوکھی رہی۔ اس پہ بے چاری امّی کو اکسر کیوں نہ ہوتا۔ ایگزابیشن کی چکری کیوں نہ چلتی ہر مصلحت جو منصوبے امّی ابّا بنائے ہوتے تھے۔ ان میں ذرا بھی تو بڑھاوا نہ ملا۔ میرے ابّا بڑے باخبر تھے۔ پتہ رکھتے تھے کہ اپنے حلقوں میں کون آیا کون گیا۔ شرط یہ تھی کہ بیس سے اوپر کا ہو، پڑھا لکھا ہو یا کاروباری ہو۔ ہر نئے آنے والے کے کوائف کا انھیں علم ہوتا تھا۔ خصوصاً جن کے گھر نوجوان بیٹے ہوں وہ بڑے اہتمام سے ہر نو وارد کے گھر سوشل وزٹ کرنے۔ پہلی مرتبہ اکیلے جاتے، دوسری بار مجھے ساتھ لے جاتے حالات سازگار ہوتے تو کسی نہ کسی بہانے نوجوان بیٹے کو اپنے ہاں بلاتے۔ اس روز امّی کی خاص توجہ مجھ پہ مرکوز ہوتی۔ پلیٹ پر نئے پستے بادام لگائے جاتے۔

کچھ دیر تو ڈرائنگ روم میں ہنس ہنس کر باتیں ہوتیں پھر دفعتاً امّی ابّو کو ایک ضروری کام یاد آ جاتا۔ مجھ سے کہا جاتا اچھا ہم ابھی آتے۔ تم ذرا آصف کے ساتھ کیرم بورڈ لگاؤ۔ بیٹی آصف کا دل لگائے رکھنا جب تک ہم لوٹیں۔

مجھے یاد ہے سب سے پہلے پیرزادہ کے گھر کنڈلی ڈال کر مسلسل ایک سال بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ان کا بیٹا امجد اس قدر کتابی تھا کہ کھیل کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ جیتی جاگتی کتاب کاغذی کتاب سے زیادہ جاذب ہوتی ہے پھر امجد کی ماں کے رشتے داروں میں بہت سی لڑکیاں تھیں۔ چند بہت ہی منظورِ نظر۔

پھر خان صاحب سے رسم و راہ بڑھائی۔ ان کا بیٹا سعید چل نکلا، بڑا ملنسار تھا۔ امّی کی امیدیں بندھ گئیں لیکن جلد ہی والدین چوکنے ہو گئے۔ بیٹے کو لگام ڈال دی۔ بات واضح ہو گئی کہ وہ اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔

پھر بٹ صاحب کو آزمایا۔ جلد ہی پتہ چل گیا کہ ان کا بیٹا منسوب ہے اور شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

کنڈلی ڈالنے کی جگہیں بار بار بدلی گئیں۔ طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ ڈرائنگ روم میں ان ڈور گیمز کی بازیاں لگیں، کتابوں پہ تبصرے کیے گئے، [illegible] چلے۔ چائے کے پیالے چلے۔ پاپ میوزک کی پلیٹ لگا کے پردے [illegible] گئے۔

یا کچھ نہ ہوا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ بات جہاں دھری تھی وہیں دھری رہی۔ صرف وقت ہاتھ سے نکلتا گیا۔ عمر گذرتی گئی۔ امی کی ایگزائٹی بڑھتی گئی اسرا بکھرتا گیا۔ یوں چھ سال گزر گئے۔ گھر پر مایوسی کی فضا مسلط ہوتی گئی۔ پھر دفعتاً اندھیرے میں ایک نئی کرن پھوٹی۔ ملک فاروق سے تعارف ہو گیا۔ وہ خود ہمارے ہاں آ گئے۔

ملک فاروق بہت ہی خوش مزاج آدمی تھے۔ اونچے لمبے گورے چٹے۔ ملنسار۔ اگرچہ پچاس سال کے ہوں گے۔ لیکن طبیعت ایسی رنگین جیسے تیس کے ہوں۔ گھر کا ماحول بھی بہت سازگار تھا۔ بیوی فوت ہو چکی تھی۔ بڑا بیٹا امان انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اس کی چھوٹی بہن جہاں آرا بی اے تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا میل ملاپ اس قدر بڑھا کہ چھٹی کا دن یا تو ملک فیملی ہمارے ہاں گزارا یا ہم ان کے ہاں چلے جاتے یا پکنک کے لیے کہیں باہر جا ڈیرہ لگاتے۔

ملک صاحب کا بیٹا امان بہت ہی پیارا ساتھی تھا۔ اونچا لمبا خوش شکل۔ اس کی ہر بات میں مردانہ جھلک تھی۔ اک عجب شانِ بے نیازی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرے آئیڈیل میں جان پڑ گئی ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ امان کو دیکھ میرے تو پیر بھیگ گئے امی کے اشاروں پر میں نے کئی ایک نوجوانوں سے رابطہ پیدا کیا تھا لیکن خود کبھی انوالو نہیں ہوئی تھی۔ گنڈی ضرور ڈالی تھی لیکن خود کیچوا نہ بنی تھی۔

امان بیک وقت بے تکلفی بھی تھی بے نیازی بھی۔ وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بحثیں کرتا، گیم کھیلتا، پاپ میوزک سنتا، چائے پیتا لیکن اسے کبھی احساس نہ ہوا تھا کہ پاس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ یہ بات مجھے بہت کھلتی تھی۔

اس کے برعکس بڑے ملک صاحب بڑے ہی رنگیلے تھے۔ مجھ سے بہت مانوس تھے زبردستی پاس بیٹھا لیتے۔ اپنے پرانے قصے سناتے ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ آنکھوں میں چمک لہراتی۔ بڑی زوردار۔ بڑی متکلم میں تو گھبرا جاتی۔

ملک فیملی سے میل جول کے بعد امی کی نگاہ میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ ان کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ ان میں منت تھی۔ بے بسی بھری منت۔ التجا۔ اسنا اب اس کشتی

کی تو ہی کھیون ہار ہے۔ پتوار تیرے ہاتھ میں ہے؟

امی کی نگاہوں میں التجا تھی کہ میں نے وہ قدم اٹھا لیا۔ جو شاید کبھی نہ اٹھاتی۔ اس رات ہم امان کے بیڈ روم میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ امان، جہاں آرا اور میں۔ گھڑی نے نو بجا دیئے میں چونکی۔ بہت دیر ہو گئی امی انتظار کر رہی ہوں گی۔ جہاں آرا ذرا امی کو فون تو کر دے کہ ڈرائیور کو بھیج دیں۔ جہاں آرا اٹھ کر چلی گئی۔ میں اور امان اکیلے رہ گئے۔ اور میں نے وہ قدم اٹھا لیا۔ بھرپور انگڑائی لی۔ ہے میں تو تھک گئی کہہ کر اپنا سر امان کی گود میں رکھ دیا۔

اس نے میرا سر پیچھے جھٹک دیا۔ تڑپ کر اٹھا۔ میں کیا سمجھا تھا ہوں اس کی آواز میں غصہ تھا۔ پھر وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ "آئینہ دیکھا ہے کبھی!"

اس کے اس فقرے نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا۔ جیسے میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اندر پھوڑوں کا ایک چھتہ چھڑ گیا۔ دیوانہ وار میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ فون کی طرف بھاگی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ توڑ پھوڑ کر رکھ دوں، انتقام، انتقام۔ دفعتاً میں رک گئی سامنے بڑے ملک فاروق کا بیڈ روم تھا میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔

نہیں ڈاکٹر میری بات نہیں سمجھے گا۔

پوچھتا ہے کیسا خوف؟ کہتی ہوں اس بات کا کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں کہ میں کون ہوں۔ گھر میں میری کیا حیثیت ہے۔ کیا مقام ہے۔ اس پر وہ کنفیوز ہو جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے بیگم فاروق ساری بات بتائیے۔ اب میں اسے ساری بات کیسے بتاؤں؟

ادارہ شانِ ہند نئی دہلی کا عظیم رعایتی اعلان

ہمیں یقین ہے کہ

قارئین شانِ ہند اور ارباب ذوق اس رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم ترویج زبان و ادب میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں۔

اس اعلان سے جہاں ہمارا مقصد زبان و ادب کے شیدائیوں کے لیے معیاری ادب رعایتی قیمت پر فراہم کرنا ہے وہاں ایک بڑا پہلو یہ بھی ہے کہ نیا سال ۱۹۸۴ء شروع ہونے سے قبل قدیم اسٹاک ختم کر دیا جائے۔

یہ اعلان صرف ۳۱/دسمبر ۱۹۸۳ء تک کے لیے ہے۔

- کم از کم بیس روپیہ قیمت کی کتب پر ۲۰٪ خصوصی رعایت
- بیس روپیہ سے زائد مگر چالیس روپیہ کی کتب پر ۲۵٪ خصوصی رعایت
- چالیس روپیہ سے زائد مگر پچاس روپیہ کی کتب پر ۳۰٪ خصوصی رعایت
- پچاس روپیہ سے زائد کی کتب کی خرید پر ۳۳⅓٪ خصوصی رعایت

محصول ڈاک بذریعہ خریدار

آپ اس اعلان کے تحت مندرجہ ذیل کتب رعایتی قیمت پر منگوا سکتے ہیں

عکسِ دل (شعری مجموعہ) عامر سورتی۔	۲۵/-
اسرار اقبال (منظوم ترجمہ اسرار خودی) حسین مہدی	۲۵/-
عکسِ تمنا (شعری مجموعہ) کمال جعفری	۱۵/-
آدھا آدمی (طنز و مزاح) فکر تونسوی	〃
آخری کتاب (طنز و مزاح) 〃	〃
اندازِ نظر (شعری مجموعہ) رتن پنڈوروی	۱۰/-
آئینے (شعری مجموعہ) ارمان ادیبی	۱۰/-
ارمغان تاشقند (نظمیں) مختلف نامور شعراء	۲/۵۰
عرضِ نیاز (غزلیات) اختر زیدی شعور	۵/-
ادھورے خاکے (شعری مجموعہ) شرف کمالی	۵/-
برکھا (غزلیں) امیر الضیاء بیگم	۸/-
سلطان کیرلا ایس ایم سرور	۱/۲۵
بے سمن (شعری مجموعہ) مسعودہ حیات	۲۰/-
دہ معانی (〃) صوفی باکوٹی	۱۸/-
باقیات اسلم حضرت اسلم لکھنوی	۲۰/-

برف کی آگ (شعری مجموعہ) عارف جلال	۵/-
بزم در رزم فطرت (نظمیں) شمس عظیم آبادی	۱۲/-
بادہ و جام (شعری مجموعہ) شارق میرٹھی	۳/۵۰
بحرِ بیکراں (〃) اختر بستوی	۵/-
جرأت معنی (فارسی غزلیں) معہ اردو ترجمہ رئیس نعمانی	۴/-
بہارستان (تذکرہ شعراء مع کلام) ساحر سنائی	۳/-
بال و پر (طنز و مزاح) کنہیا لال کپور	۱۲/-
باقیات چاق (شعری مجموعہ) محمد عبد الباقی	۱/۵۰
چراغِ منزل (شعری مجموعہ) دواکر راہی	۲۵/-
چراغِ فکر (〃) ابر سیمابی	۱۵/-
چراغ کے زخم (افسانے) ہرچرن چاولہ	۱۵/-
چاند کا زخم (ناولٹ) شمس فرخ آبادی	۲/-
دربدر (شعری مجموعہ) پردین کمار اشک	۱۲/-
درپن (قطعات) مہیش چندر نقش	۱۰/-
فکریات (طنز و مزاح) فکر تونسوی	۱۷/-

چمن (مضامین) ڈی۔ اے۔ بیرسین ۵/-
ملے (شعری مجموعہ) مدہوش بلگرامی ۲/۵۰
گلدستہ (پانچ کل ہند مشاعرے) انجمن عروج ادب دہلی ۱۲/-
صد رنگ (بھرتری ہری کا ترجمہ) ۳/-
لب کی باتیں شمس بن گرامی ۱/۵۰
گردشِ رنگ (شعری مجموعہ) مختار ہاشمی ۱۰/-
شام کوچے کی صدا (شعری مجموعہ) شعیب راہی ۱۶/-
لمرنگ (شعری مجموعہ) جمال قاسمی ۱۲/-
کلیاتِ میر ظل عباس عباسی ۵۲/-
قدیم ہندوستان کی تاریخ راما شنکر تریپاٹھی ۲۷/۷۵
کلیاتِ سراج سراج اورنگ آبادی ۴۴/-
ہماری غذا ایم این پوری ۱۲/-
ہوا اور پانی ایم این پوری ۶/-
ہمارا آئین صالح محمد نائب ۷/۵۰
بدن کی گل اے این طیش ۱۲/-
ہمارے سائنسداں اندر جیت ۲۰/-
ہمارے قومی ہیرو " ۱۵/-
نغمہ روح (مختلف شعرا کی غزلیات) ۲۰/-
حسن عرفان منتظر تماپوری ۲/-
آج کا ہندوستان اور حمید اللہ خاں ۱/۵۰
انتخاب کرشن موہن کرشن موہن ۱۰/-
ابتدائی اردو حکم چند نیّر ۳/-
اقبال اور سید سلیمان ندوی طاہر تونسوی ۲۰/-
امکان (شعری مجموعہ) ساجدہ بیگم ۱۶/-
اسلام اور عصرِ جدید عبدالحلیم ندوی ۴/-
جلتے خیموں کی چیخ احمد حسین شمس ۵/-
اسلام میں وطن کی اہمیت نشاط امروہوی ۶/-
شاہنامہ ہند سریہ کابری ۲۵/-
جلوہ صد رنگ (مثنوی) عبدالمجید شمس ۵/-

لمسِ اوّل (شعری مجموعہ) علیم صبا نویدی ۵/۸۵
لہو رنگ (") جلیل الہ آبادی ۵/-
لالہ زار (") بدری پرشاد مشتاق ۱۵/-
لختِ جگر (") جگر جالندھری ۱۰/۲۵
کمل کا منکے (") کرشن موہن ۲۰/-
کالی دھرتی کی غزلیں (") آر صدیقی ۵/-
خوشبو کا کرب (") نکہت خاں ۵/-
کلامِ شوق (") لالہ چندر بھان ۱/-
کرن (") راجہ کرن پرشاد ۱/-
کلیاتِ اقبال (مکمل اردو ایڈیشن) اقبال (عکسی) ۲۰/-
کلیاتِ اعظم اعظم جلال آبادی ۳۰/-
خلش خار دہلوی ۲۵/-
خود کلامی اظہر عنایتی ۱۵/-
کاوش کاشف اندوری ۱۲/-
کارواں خیالوں کے نو بہار صابر ۴/-
ادبی تاثرات (مضامین) ل۔ احمد اکبرآبادی ۱۸/۷۵
صبح و شام (افسانے) " ۱۲/۵۰
زندگی کے کھیل (") " ۱۲/۵۰
ملاحظاتِ تعسی (") " ۷/۵۰
باقیاتِ شہباز (طنزیہ نظمیں) عبدالغفور شہباز ۲۵/-
ساگر راجندر بہادر موج ۲۵/-
تجلیاتِ قمر جمال احمد صدیقی ۱۵/-
تذکرہ شعرائے ہریانہ ڈاکٹر رانا گنوری ۴۰/-
منظر بہ منظر منتظر تماپوری ۱۵/-
سنگ بر آب اقبال فہیم ۲۵/-
ہماچل کے آنچل سے کرم چند مہاجن ۱۵/-
حالاتِ مشائخ " ۱۴/-
قصرِ جوش جوشش ادیب ۱۰/-
حرفِ زریں اکرام کاوش ۱۰/-

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۱۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

ڈاکٹر ناز علامی

زعمِ غلط انداز در رُباعی اور زحاف عرج

برادرم سرور صاحب تسلیم

اگست ۱۹۸۳ء کے 'آج کل' میں شری جے رام داس فلک کا ایک مضمون بعنوان "رُباعی کے اوزان میں اضافہ زحاف عرج کی روشنی میں" شائع ہوا تھا۔

اس مضمون سے متعلق ایڈیٹر آج کل شری ... سے اُن کے دفتر میں بات ہوئی تھی اور اُنھوں نے وعدہ کیا تھا اس مضمون کے سلسلہ میں جو بھی جواب موصول ہوگا وہ ضرور شائع ہوگا۔ لہٰذا مضمون لکھ کر اُن کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ اب اُنھوں نے یہ مضمون یہ ریمارک دے کر واپس کیا ہے۔

"مضمون ملا۔ کرم فرمائی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ اس بحث کو ہم "آج کل" میں شروع نہ کر پائیں گے۔ مضمون واپس ارسال خدمت ہے"

ایڈیٹر "آج کل" کو ہرگز ایسا نہیں چاہیے تھے۔ جب اُنھوں نے ایک مضمون شائع کیا ہے تو اُس سے متعلق جواب شائع کرنے سے احتراز کیوں؟ ایماندارانہ صحافت کا یہی تقاضا ہے کہ کسی مضمون کے سلسلہ میں اگر کوئی جواب آتا ہے تو اُس کو ضرور شائع کیا جائے تاکہ قارئین اس نتیجہ پر پہنچ سکیں کہ دُرست کیا ہے۔ ایڈیٹر "آج کل" چونکہ عروض سے ناواقف ہیں لہٰذا مضمون صحیح ہونے یا نہ ہونے میں اُن کی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اندریں حالات آپ سے گزارش ہے کہ مضمون شائع فرما کر ممنون فرمائیں اور اس کی ایک کاپی ایڈیٹر "آج کل" کو بھی روانہ فرمادیں تاکہ وہ فلک صاحب کو اُن کے مضمون کا جواب پڑھوا دیں۔ ناز علامی

'آج کل' بابت ماہ اگست ۱۹۸۳ء میں محترمی جے رام داس فلک کا ایک مضمون بعنوان "رُباعی کے اوزان میں اضافہ زحاف عرج کی روشنی میں" شائع ہوا ہے۔

ہمارے مہربان نے اپنے مضمون میں رباعی کے مشہور ۲۴ اوزان کے علاوہ اُن بارہ اوزان کا ذکر بھی کیا ہے جو حضرتِ علام عشق آبادی ..... آنجہانی کے ایجاد کردہ ہیں۔ یہ اوزان ہمارے مضمون "مزید اوزانِ رُباعی سبب بہ سبب، سبب وتد بہ وتد ... کی روشنی میں" (جو آج کل بابت ماہ جنوری ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے) یا ہماری تصنیف 'کلید عروض' سے حاصل کیے ہیں۔ مگر موصوف نے حوالہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ خیر چھوڑیے۔

فلک صاحب نے ہماری پیروی کرتے ہوئے شجرۂ اخرب اور شجرۂ اخرم کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جو اوزان مفعولُ سے شروع ہوتے ہیں اُن کو "مفعولُ سے شروع ہونے والے اوزان" اور 'مفعولن' سے شروع ہونے والے اوزان کو "مفعولن سے شروع ہونے والے اوزان" کے عنوان کے تحت لکھا ہے اور یہ عروض پر اُن کا کرم ہے ورنہ ہمارے مضمون اور کلید عروض کی اشاعت سے پہلے ہر عروضی قطان کا یہ شیوا تھا اور شجرۂ اخرب و شجرۂ اخرم کا ذکر کرتا آرہا تھا۔

موصوف نے ہمارے مضمون اور ہماری تصنیف سے کچھ اور اصطلاحات مثلاً سبب وقف، وتد وقف، وتد اضافی وغیرہ ہم بھی اپنائی ہیں۔ ان اصطلاحات کے ذکر علام کے مضامین اور کلید عروض کی اشاعت سے پہلے کہیں بھی نہیں

تھا۔ اس کیلئے ہم فلک صاحب کو ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہیں
۔ انھوں نے ہماری بات کو سمجھا۔

ہمارے کرم فرمانے اپنے مضمون میں کچھ غیر ضروری بحث بھی چھیڑا ہے۔ جن کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً "فعل" کے ساتھ "فعول" کے استعمال کی اجازت اس لیے دینا پڑی کیوں کہ بحرِ متقارب میں یہ پہلے ہی مستعمل اور مروج ہے۔

جب موضوعِ مضمون محض رُباعی تھا تو صرف بحرِ رُباعی یعنی بحرِ ہزج ہی کی بات ہونا چاہیئے تھی۔ موصوف کو چاہیئے تھا کہ وہ بحرِ ہزج میں وہ وجہ تلاش کرتے جس کی وجہ سے "فعل اور فعول" کا اجتماع جائز ہے۔ مگر نہ معلوم کیوں اس سے چشم پوشی کی گئی ہے اور خواہ مخواہ بحرِ متقارب کو درمیان میں گھسیٹ لیا۔

موصوف فرماتے ہیں کہ "سالم ارکان کی تشکیل سببِ خفیف وتدِ مجموع، وتدِ مفروق اور فاصلۂ صغریٰ کے اجتماع سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور مزاحف ارکان کی تشکیل زحافات کی مرہونِ منت ہے۔ سببِ ثقیل بھی اس لیے قابلِ قبول نہیں کیونکہ ارکان کی تشکیل میں کوئی حصہ نہیں"

ہم اس مقام پر فلک صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنا موقف ہماری دلائل کی روشنی میں تبدیل کر دیا ورنہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء کے "پیغام سونی پت" میں انھوں نے سببِ ثقیل کے حق میں بہت کچھ لکھا تھا۔ جس کا جواب ہماری طرف سے ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ء کے "پیغام" میں دیا گیا تھا۔

موصوف نے اپنے اس مضمون میں ایک زحاف بھی "زحاف تغیرِ سبب" تراشا تھا۔ جس کی رو سے وہ سببِ خفیف کو سببِ ثقیل میں اور سببِ ثقیل کو سببِ خفیف میں بدلنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ہم نے اس جدید زحاف سے پیدا ہونے والی قباحتوں کی طرف ان کی توجہ دلائی تو انھوں نے اس کو بھی ترک کر دیا۔

اب ہمارے دوست نے زحافِ عَرَبِج کا سہارا لے کر رُباعی کے اوزان میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ اجتہاد کسی حد تک کامیاب ہے کہ نہیں اس بحث سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اقوال پر ایک نظر ڈالی جائے جو انھوں نے موضوعِ گفتگو شروع کرنے سے پہلے فرمائے ہیں۔

ا۔ "اجزائے اوّلیہ الفاظ کو مدِ نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں چونکہ الفاظ بلا تخصیص ہر مقام پر واقع ہو سکتے ہیں اس لیے یہ اجزا بھی ہر مقام پر واقع ہوں گے۔ ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگ سکتی۔ اس اصول کے پیشِ نظر جب وتدِ مفروق ارکان کے شروع یا وسط اور مصرعہ کے صدر وابتدا یا ... میں واقع ہوگا تو یہ وتدِ مفروق کی شکل اختیار کرے گا"

ب۔ "فاث (ع متحرک) کو سببِ اضافی کہنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے وتدِ مفروق کا نام پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ اس کو سببِ اضافی کہا جائے یا وتد کا نام دیا جائے"

آیئے موصوف کے ان اقوال کی حقیقت پر ایک نظر ڈالیں۔

ا۔ موصوف کا یہ کہنا کہ اجزائے اوّلیہ الفاظ کو مدِ نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں سراسر بے معنی ہے۔ اجزائے اوّلیہ الفاظ کو نہیں بلکہ اصوات کو مدِ نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ اسی لیے ان کو صوتی اکائیاں بھی کہا گیا ہے آج تک کسی عروضی نے ان کو لفظی اکائیاں نہیں کہا۔ انھیں صوتی اکائیوں کے اجتماع سے ارکان تشکیل پاتے ہیں۔

ہر صوتی اکائی کی اپنی حیثیت ہے اور صوتی اکائیوں کے پیشِ نظر ہی ان پر زحافات کا عمل ہے۔ اصوات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی زحافات تراشے گئے ہیں اور جس اکائی کی اصوات میں جس قسم کے تنوع کا امکان تھا اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس ارکان سے زحافات کی تخصیص کی گئی ہے۔ الفاظ حروف کے تابع ہوتے ہیں اور اجزائے اوّلیہ اصوات کے تابع ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب اجزائے اوّلیہ کی تشکیل الفاظ سے ہی نہیں تو صوتی اکائیوں میں الفاظ کی بحث چھیڑنا کہاں تک صحیح ہے اس کا فیصلہ فلک صاحب خود فرمالیں۔ اصوات کی بحث میں صرف ... ہی کا ذکر ہونا چاہیئے اور الفاظ کی بحث میں صرف ... ہی کا ذکر ہونا چاہیئے۔

اس مقام پر ہم اس امر کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی بھی جزوِ اوّلی کی ہیئت اس وقت تک تبدیل نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر زحافات کا عمل نہیں ہوتا اور

اور کسی بھی اکائی کا ساکن حرف کسی بھی زحاف کے عمل سے متحرک نہیں ہوتا۔

ب۔ جب موصوف خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فاع (یعنی متحرک) [illegible] نام وتد مفروق پہلے سے ہی موجود ہے تو اس کے لیے ایک نئی اصطلاح گھڑنا اچھی معنی [illegible] اور جب اس صورت کے لیے ہمارے پاس صوتی اکائی پہلے ہی سے موجود ہے تو اس کو [illegible] کہیں گے اور یہی فیصلہ ہے۔

ان اقوال کے بعد موصوف زحاف عرج سے بحث کرتے ہیں۔

"عرج کی تعریف" اور "عرج کے اطلاق" کے عنوانات کے تحت موصوف نے "رکن کے آخر سے ...... (۱) رکن کے آخری وتد مجموع پر وارد ہوگا" تک جو عبارت لکھی ہے وہ تمام درست ہے اور ہمیں اس سے کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ لیکن یہاں ہمارا اختلاف ہے وہ مقامات یہ ہیں اور ان کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ [illegible] ایک جدید تالیف [illegible] [illegible] منصب کی تقسیم [illegible] [illegible] زحافات کو بھی [illegible] چاہیئے یہ اس قسم کی باتیں ہیں کہ ان کے الگ سے عنوانات قائم کیے جائیں اور ان عنوانات کے تحت ہی الگ سے بحث ہونا چاہیئے۔ لہٰذا فلک صاحب اگر ان کا جواب چاہتے ہیں اور [illegible] معلوم کرنا چاہتے ہیں تو الگ سے عنوانات قائم فرما کر بحث کریں۔ [illegible] بات کو چھیڑا جائے [illegible] ہو۔ ادھر ادھر کی باتیں درمیان میں نہ آنا چاہیں۔ کیونکہ ادھر ادھر کی باتوں سے مضمون الجھتا ہے اور کسی قسم کے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ فلک صاحب اپنا جو بھی موقف قائم کریں صرف اسی تک محدود رہیں تاکہ اس کا جواب دیا جا سکے۔ ایک بحث میں ہزار قسم کی مباحث چھیڑنا اچھا نہیں لگتا اور نہ اس سے خاطر خواہ نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس قسم کی [illegible] میں کئی مسائل چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ایک کھچڑی بحث بن جاتی ہے۔

آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں کہ "عروض میں اوزان کا دارومدار الفاظ پر ہے اس لیے موقوف الآخر [illegible]

ارکان کو بھی عروض و ضرب سے مخصوص رکھنا معقولیت پر مبنی نہیں ہے"

اس ضمن میں ہم اپنے کرم فرما کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اوزان کا دارومدار الفاظ پر نہیں بلکہ اصوات پر ہے۔ لفظ "خفتہ" کو دیکھیے۔ جب اس کے حروف کی اصوات مختلف ہو جاتی ہیں تو ایک مقام پر اس کا وزن "فعل" اور دوسرے مقام پر "فاع" ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب "گلستان" کے حروف کی اصوات مختلف ہو جاتی ہیں تو ایک مقام پر اس کا وزن "فاعلن" اور دوسرے مقام پر "فعولن" ہو جاتا ہے۔

سحَر (بتحریک حاء) اور سحر (بسکون حاء) دونوں الفاظ بہ وجوہ نوع اور تعداد اور ترتیب حروف میں یکساں ہیں۔ صرف حروف کی حرکات و سکنات میں مخالفت ہونے کے سبب وزن میں فرق پڑ گیا۔ [illegible] ایک جانب "فعَل" کے وزن پر ہے، دوسرا [illegible] "فاع" کے وزن پر ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اوزان کا دارومدار اصوات پر ہے نہ کہ الفاظ پر۔

موقوف الآخر ارکان کو عروض و ضرب سے مخصوص کرنا کیوں معقولیت پر مبنی ہے۔ اس بحث سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حرف موقوف کو سمجھ لیا جائے۔

عروضی اصطلاح میں کسی حرف ساکن کے بعد آنے والے حرف ساکن کو موقوف کہا جاتا ہے جو بذریعہ زحاف وقف عمل میں آتا ہے۔ اور اس کا عمل وتد مفروق پر ہوتا ہے۔ [illegible] زحاف کی رو سے وتد مفروق کا متحرک دوم ساکن کر دیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ رکن کے آخر میں واقع ہو۔ یعنی وتد مفروق "لات" فاع کے آخری حرف متحرک کو ساکن کر دیا جاتا ہے اور اس زحاف کو عروض و ضرب سے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

یہ حرف موقوف ضروری نہیں کہ تقطیع میں شمار کیا جائے [illegible] گرایا بھی جا سکتا ہے اور اس کے گرانے کا صحیح مقام عروض و ضرب کے علاوہ دوسرا نہیں لہٰذا موقوف الآخر ارکان کا عروض و ضرب سے مخصوص کرنا حقیقت پر مبنی ہے [illegible] نہیں ہوتے [illegible] تقطیع و زحاف کی مدد سے نیا رکن تراش لیتے ہیں۔

اب آیئے الفاظ کی طرف۔ جن الفاظ کے آخری [illegible]

کو موقوف کہا جاتا ہے اس کے معانی یہ ہیں کہ یہ حروف موقوف اصل میں متحرک حروف تھے جن کو ضرورتِ شعری یا ضرورت مہیا کے سبب موقوف ٹھہرا لیا گیا۔ چونکہ یہ حروف اصلاً متحرک ہوتے ہیں اس لیے صدر و ابتدا اور حشویں میں متحرک ہو کر آتے ہیں موقوف ہونا عروض و ضرب میں اس لیے آتے ہیں کہ شاعر کو اختیار ہوتا ہے [illegible] ضرورتِ شعری کے تحت ان حروفِ موقوف کو گرا دے یا ان کے لیے نیا رکن تلاش لے۔ اسی لیے موقوف الآخر الفاظ یا ارکان کو عروض و ضرب ہی میں لانا مناسب ہے۔

زحاف عرج کے ذریعہ وتد مجموع کے دوسرے حرف متحرک کو ساکن کیا جاتا ہے چونکہ وتد مجموع میں تیسرا لفظ ساکن ہوتا ہے لہٰذا وتد مجموع کا دوسرا حرف ساکن ہو جانے کے سبب تیسرا حرف ساکن جو پہلے ساکن تھا از خود موقوف ہو جاتا ہے (چونکہ ایک ساکن کے بعد آنے والا ساکن ہمیشہ موقوف ہوتا ہے) اور موقوف الآخر ارکان کا صحیح مقام استعمال جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں عروض و ضرب ہی ہے۔

لہٰذا زحاف عرج کی روشنی میں تراشے ہوئے تمام اوزان جو فلک صاحب نے گھڑے ہیں غلط اور بے بنیاد ہیں۔ فلک صاحب اگر اس قسم کے منطقی مضامین سے احتراز فرمائیں گے تو عروض پر کرم ہوگا۔ انھیں عروض کا مزاج سمجھنا چاہیے۔

صفحہ ۴۰ کا بقیہ

میں ہر دو اطراف کے شعراء کرام کی غزلیات کے اشعار کا انتخاب بہت خوب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے یہاں کے شعراء نے پڑوسی ملک میں اپنی بلانوشی کی دھاک بھی جمادی ہے اور مخصوص کالم "مسن کی مکتوب" کے تحت مطبوعہ مکاتیب میں انجم الانصاری کا مکتوب راقم کی عروض دانی سخن فہمی اور غزل کا لوہا منوانے کے ساتھ ان کی خوشخیالی کا مظہر ہے۔ آپ نے میری ایک غزل کے پانچویں شعر کے مصرعۂ ثانی میں 'پیالہ' کو پالا کے وزن باندھے جانے کی طرف احتجاجی اشارہ کیا ہے۔

اس ضمن میں اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ بظاہر لفظ 'پیالہ' نارسو، نوا ہے تاہم لفظ 'پیالہ' کی ہندی حیثیت بھی پوری آب و تاب کے ساتھ بحال ہے۔ اور اس ہندی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے لفظ 'پیالہ' کو فعولن نہ باندھ کر بروزن فعلن استعمال کیا گیا ہے۔ قدماء کے حوالے یقیناً ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں تاہم تجربات شاہد ہیں کہ کئی ایک مقامات پر حالات نے ہم عصروں کو روایات سے بچ نکلنے کی ترغیب و ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ مذکورہ مشاعرہ میں ایک ایسا شاعر بھی مدعو تھا جس کا نام تو محمد اسمٰعیل اور تخلص یوسف تھا جس نے مشاعرہ میں محض چند دو شعر اور ایک غزل پڑھ کر اپنی جگہ کو جا لیا تھا۔ اسی یوسف بالوتا کو مشاعرہ کی رپورٹ میں کاتب صاحب نے یوسف ثانی لکھ دیا ہے۔ اسی غزل کا ایک شعر خارج از وزن ہونے کے ساتھ قافیہ سے علمی متعلق تھا اسی کو انجم الانصاری یوسف ثانی کا سمجھے ہوئے ہیں۔ میرے دو شعروں کو غزل تصور کرتے ہوئے انجم الانصاری نے تحریر فرمایا کہ دوسری غزل کی ردیف میں 'لوگ' زبردستی ٹھونسے گئے ہیں جو الفاظ کو دبا کر پڑھنے سے وزن پورا ہو جاتا ہے مگر خواہ مخواہ لفظ کیوں دبنا چاہیے اگر 'لوگ' نکال دیے جائیں تو وزن صحیح ہو جائے گا۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ 'لوگ' ٹھونسے نہیں گئے ہیں بلکہ لوگ ہی مذکورہ غزل کی اصل اساس ہے۔ لگے ہاتھ وہ دونوں شعر بھی ملاحظہ فرمالیں تو بہتر ہوگا۔

دفعتاً میرے [illegible] آئے گی   جب ہوا میں [illegible] جائیں گے لوگ
اس قدر خوش ہیں گھر سے باہر سب   اب کبھی بیٹے گھر نہ جائیں گے لوگ

دونوں اشعار کے متعلق عرض ہے کہ ان کی ردیف 'لوگ' نکال کر باہر کر دی تو پھر لطف ہی کیا رہے گا۔ منشا اور مفہوم دونوں ہی نکل جائے گے سمجھے!

آخر میں انجم الانصاری صاحب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ تنقید برائے تنقید سود مند نہیں بلکہ تنقید برائے زندگی ہو تو بہت ہی کارآمد ہے اکثر رسائل میں دیکھا گیا ہے کہ تخلیق کار یا کاتب حضرات کی عجلت پسندی یا کسی اور وجہ سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں یا رہ جاتی ہیں کہ بس۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تخلیق کار فن سے نابلد ہے اور یہ بھی تو کیا آج کا بے علم کل کا عالم و فاضل نہیں بن سکتا یا نہیں ہو سکتا۔

حضرت صولت کے مطلع کے دوسرے مصرعہ میں کاتب اور پروف ریڈر کی تساہلی کے باعث ایک لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے یہ مطلع دراصل یوں ہے ؎

بام و در مطلعِ انوار نظر آتے ہیں
ان کے آنے کے سے آثار نظر آتے ہیں

خادم یوسف ثانی

گلہائے رنگ رنگ

اختر شاہجہاں پوری

اِسی سبب تو ہر اک شخص دلفگار سا تھا
جو بھیک مانگ رہا تھا وہ شرمسار سا تھا

نہ جانے کون سا مقتل میں حادثہ گزرا
فضا اداس تھی قاتل بھی سوگوار سا تھا

یہیں سے جرأتِ تقلیدِ دوستاں نہ ہوئی
ہر ایک چہرہ وہاں یوں تو اشتہار سا تھا

سکوتِ سطحِ سمندر بتا رہا تھا از بہت
کوئی تو پھینک دے پتھر یہ انتظار سا تھا

ترے خیال میں گم تھا کہ میں سائل میں
تو آ گیا تو لگا تیرا انتظار سا تھا

وہ ایک شخص کہ اختر جسے کہیں لوگو
خدا گواہ وہی شخص باوقار سا تھا

اخلاق سہسوانی

وہ تھے اور التفات، ابھی کل کی بات ہے
رقصاں تھی کائنات، ابھی کل کی بات ہے

مجھ سے بھی تھی نجات، ابھی کل کی بات ہے
کیوں اے غمِ حیات! ابھی کل کی بات ہے

تم نے کیا تھا عہدِ وفا، بھول بھی گئے
اتنی ذرا سی بات! ابھی کل کی بات ہے

اک جنبشِ نظر تھی کہ حل کر گئی سبھی
دل کے معاملات، ابھی کل کی بات ہے

کس طرح بھول جاؤں وہ منظر تمہیں کہو
وہ میں، وہ تم، وہ رات ابھی کل کی بات ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ مدت گزر گئی
ان سے ہوئی تھی بات ابھی کل کی بات ہے

اخلاق جب وہ آئے تھے بنکر بہارِ حسن
کتنی حسین تھی رات ابھی کل کی بات ہے

امِّ ہانی ۔ لکھنؤ

تھا یہ گمان تجھ پہ سبھی کچھ فدا کیا
ہوش و خرد وجود سے اپنے جدا کیا

زلفِ زمانہ ہم تو سنوارا کئے مگر
دنیا نے پائمال ہمیں کو سدا کیا

ہم کو فقط تھی چند گلوں سے یہاں غرض
خاروں نے پہلے بڑھ کے حق اپنا ادا کیا

میں نے سرِ نیاز کو قدموں میں رکھ دیا
مجھ کو تری وفاؤں نے آخر گدا کیا

جاں دے کے بھی ہیں بارِ کرم سے دبی ہوئی
حالانکہ میں نے قرض بہت کچھ ادا کیا

ہانی گناہگار سہی سر سے پا تلک
پھر بھی تو عاجزی کو کبھی پر فدا کیا

یسف ثانی سُلیمانی (رپالی)

ساتھ ہیں ان کے گنگنا یئں گے لوگ
بتا میرے جہاں بھی گا یئں گے لوگ

اس قدر خوش ہیں گھر سے باہر سب
اب کبھی جیسے گھر نہ جایئں گے لوگ

سکراہٹ بکھیرتے چلیے ....
رتوں تک نہ بھول پایئں گے لوگ

دیکھ پرواز و جستجو اپنی ....
خواہشوں کے پرند اڑایئں گے لوگ

فریبِ منزل میں بھول جانا نہیں
رہ میں دیوار بھی اٹھایئں گے لوگ

رونقیں روز منھ پہ منڈھتا ہوں
یہ مکھوٹے کہاں سے لایئں گے لوگ

بخت، کتنے ہی ہوں) نئے اور نصیب
میری تقدیریوں بنایئں گے لوگ

دفعتاً میری یاد آئے گی ....
جب ہوا میں دیا جلایئں گے لوگ

بعد میرے تو دیکھنا ثانی ......
سو رنگ اپنوں کا جو رجایئں لوگ

عبدالستار عاصی دہوری (کویت)

دعا کے لفظ ہمیشہ زبان پر رکھنا
اُٹھائے ہاتھ نظر آسمان پہ رکھنا

جہاں جہاں نئی تہذیب کا اندھیرا ہے
چراغ جلتا ہوا اُس مکان پر رکھنا

یہ اور بات کہ پتھر کدھر سے آئیگا
نگاہ اپنی کفِ مہربان پر رکھنا

جو چاہتے ہو کہ حالات میں چمک آئے
حیات اپنی حوادث کی سان پر رکھنا

پہنچ بھی ہوگی ستاروں کے جال سے آگے
خیالِ فکر کو اونچی اُڑان پہ رکھنا

اٹھے اُس کا آخری ہچکی پہ نام ہو عاصی
یہ فرض کس لئے اب اپنی جان پہ رکھنا

عرفان پربھنی

دریچہ کھلتا ہے کوئی اور نہ دریچہ کوئی
ایسا لگتا ہے نہیں شہر میں اپنا کوئی

زندگی ایسی ہے، دریا کے کنارے جیسے
ریت پر اُنگلی سے کھینچا ہو انقشہ کوئی

آپ کو چوٹ لگے اور مجھے درد نہ ہو
کیا میرا آپکے دل سے نہیں رشتہ کوئی

اُس کو بھی چہرے کی پڑتی ہے ضرورت ہر بار
جسکا اپنا نہیں اے دوستو چہرہ کوئی

تم جو دشمن ہو تو آجائے نظر وہ چہرہ
غم کی دہلیز پہ عرفان ہے ٹھہرا کوئی

اختر سعیدی (رانچی)

پھر رہا ہوں کہاں کہاں تنہا
زندگی ہے عذابِ جاں تنہا

ہر کلی پر سرور چھایا تھا
غم میں ڈوبا تھا باغباں تنہا

قصۂ درد سب سناؤں گا
دیکھ لوں گا تمہیں جہاں تنہا

تیرے کوچے میں گھر بناؤنگا
میں پھروں اب کہاں کہاں تنہا

آج وہ بھی نہیں ملا اختر
روز ملتا تھا جو یہاں تنہا

مَن کہ مکتوبُ الیہ

بمبئی - ۲۱/ نومبر ۱۹۸۳ء

برادرم مسعود صاحب - پریم نمستے

اکتوبر ۱۹۸۳ء کا شمارہ نظر نواز ہوا - میرے مضمون اور خط کی اشاعت کے لیے شکریہ - اسی شمارے میں شبلی صاحب کا بھی ایک خط شائع ہوا ہے - جس میں انھوں نے کمار پاشی صاحب کے ایک پرانے انٹرویو کو لے کر اردو کے ہندو ادیبوں کو نشانۂ ملامت بنانے کی کوشش کی ہے - اردو کے بارے میں پاکستان کے ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی صاحب کے تازہ ترین خیالات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں -

" میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اردو سے قطعاً واقفیت نہ تھی - جب لکھا تو چاروں اطراف سے آوازیں آئیں تمہیں زبان نہیں آتی میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے زبان نہیں آتی — دراصل اردو کا محاورہ مجھے اور میں محاورے کو قبول نہیں کرتا - مختلف زبانوں کے چھوٹے چھوٹے لفظ استعمال کرتا ہوں - اردو زبان دو بازاری زبان ہے - مجبوری ہے جس میں پیچ نہیں سماتا - آپ جب یہ زبان استعمال کریں گے تو ملمع سازی کریں گے ...."

(ممتاز مفتی سے انٹرویو — بیسویں صدی - اپریل ۱۹۸۳ء - صفحہ نمبر ۱۹ - کالم نمبر ۲)

اردو کا مسلمان ادیب اگر اردو کے خلاف جو چاہے بات درپردہ اس کی جڑیں کاٹے تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی - لیکن اردو کا کوئی ہندو ادیب اپنے دل کی بھڑاس نکالے تو اردو کے سارے کے سارے ... قابلِ گردن زدنی قرار پاتے جاتے ہیں -

اردو کے کون سے ہندو ادیب اور دانشور اردو کیمپ میں ففتھ کالمسٹ کی حیثیت سے آئے اور فائدہ اٹھا کر ہندی کی گود میں چلے گئے ؟ شبلی صاحب میں ہمت ہو تو ان ادیبوں کے نام گنائیں -

اشک صاحب شروع سے اردو اور ہندی میں لکھتے آئے ہیں - چند ماہ پہلے ایک واقعہ کہیں پڑھا تھا کہ کسی میٹنگ یا کانفرنس میں لوگ اردو کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے - اردو کے مسلمان ادیبوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑی چنانچہ اوپندر ناتھ اشک صاحب نے اٹھ کر اردو کے خلاف بولنے والوں کی ایسی تیسی کی -

چند سال پیشتر ... مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مشہور مرثیہ گو شاعر چھنو لال دلگیر کو مسلمان شاعر ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے تھے - تو کالی داس گپتا رضا صاحب نے اپنی تحقیق کے آئینے میں یہ ثابت کر دیا کہ چھنو لال دلگیر نہ کبھی مسلمان تھے اور نہ ہی بعد میں مسلمان بنے - ڈاکٹر صفدر آہ صاحب نے گپتا رضا صاحب کی حمایت میں لکھا تو رضوی ادیب صاحب ڈاکٹر صفدر آہ صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کل کے لونڈے کی حمایت میں میرے خلاف لکھ رہے ہیں - وغیرہ وغیرہ - ڈاکٹر صاحب نے یہ خط گپتا رضا صاحب کو دکھا کر پھاڑ دیا تھا ورنہ ثبوت پیش کیا جا سکتا تھا -

اسی طرح جب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو جامعہ ملیہ میں اُردو کا ہیڈ بنایا گیا تھا تو اُس وقت بھی ایک زبردست ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر نارنگ کی اُردو کے تئیں وفاداری کبھی بھی مشکوک نہیں رہی۔ قصور صرف یہی تھا کہ وہ ہندو تھے۔ مطلب براری اور ابن الوقتی کسی خاص فرقے یا مذہب تک ہی محدود نہیں۔ یہ ہر کسی کی ذاتی اُپج پر منحصر ہے۔ بہتی گنگا میں اگر کچھ ہندو ادیب ہاتھ دھو رہے ہیں تو بہت سے مسلم ادیب اس میں نہا بھی رہے ہیں۔

جس زمانے میں آنند نرائن مُلاّ صاحب یوپی کی اُردو اکادمی کے چیرمین تھے۔ اُسی زمانے میں کمار پاشی صاحب کی کتاب "ولاس یاترا" پر۔ اگر ان کو انعام مل گیا تو کیا یہ مُلاّ صاحب کا قصور تھا.... کیا مُلاّ صاحب نے اس کتاب کو انعام دلوانے کے لیے ذاتی کوشش کی تھی؟ مُلاّ صاحب کے زمانے ہی میں بہت سے مسلم ادیبوں (کہ جن کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا) کو ان کی نہایت بے تکی اور گھٹیا تخلیقوں پر بھی تو انعام ملے تھے۔ شبلی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مختلف موضوعات کے لیے سلیکٹ کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہی کمیٹیاں انعام کیلیے کتابوں کو چُنتی ہیں۔ ان کمیٹیوں نے کتابوں کے چُننے میں اگر گھٹیا پن کا مظاہرہ کیا ہے تو یہ بھی آنند نرائن مُلاّ کا قصور ہے! غالباً مُلاّ صاحب کے دور میں ہی راجندر سنگھ بیدی کی کتاب REJECT کر دی گئی تھی کہ اس میں ایک افسانہ فحش تھا۔ حالانکہ اس کمیٹی کے ممبروں کو فحاشیت کا حدود اربعہ بھی معلوم نہ ہوگا۔

مالک رام صاحب کی مخالفت بھی کسی سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت کی جا رہی ہے۔ غالباً اُن کی تحریروں سے بھی اُردو کی بُو ری آ رہی ہے۔ شروع شروع میں اُن پر الزام یہ لگایا گیا تھا کہ انھوں نے ساہتیہ اکادمی کا ممبر ہوتے ہوئے بھی کسی اُردو کتاب پر انعام کیوں نہیں دلوایا۔ اور اگر وہ کسی ہندو ادیب کی کسی کتاب پر انعام دلوا دیتے تو کہا جاتا کہ انھوں نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ مالک رام صاحب اس لیے اُردو دشمن ہو گئے کہ انھوں نے اُردو کی کسی کتاب کو انعام نہیں دلوایا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اُس سال ایسی SUB STANDARD اُردو کتابیں پیش کی گئی ہوں کہ اُن کتابوں کو انعام دلوانا اُردو کے ساتھ دُشمنی کے مترادف ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ شاہد پرویز کی آڑ میں کوئی اور شخص یا شخصیتیں مالک رام صاحب کی مخالفت فرما رہی ہیں ورنہ "بیسویں صدی" شاہد پرویز کی خاطر اپنا چہرہ سیاہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اُڑتی چڑیا یہ خبر لائی ہے کہ اس مخالفت کے پیچھے دہلی کے ایک مفسدپرداز مسلمان اُردو دانشور کا ہاتھ ہے!

اصل معاملہ یہ ہے کہ رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، چکبست، اور پریم چند جیسے جغادریوں کے بُتوں کو توڑنے کا کام اُردو کے بالشتیے ادیب سرانجام دے رہے ہیں۔ افسوس کہ ان میں ابھی کوئی محمود غزنوی پیدا نہیں ہو سکا۔

خلوص کار

مانک ٹالا

محترمی سرور صاحب!

آداب!!

ماہنامہ شانِ ہند ستمبر کا شمارہ ہمدست ہو کر تسکین افزا ہوا۔ آپ نے "یہ کوچے یار یہ انداز محرمانہ گزر..." میں مرحوم شکیل بدایونی کی شخصیت سے وابستہ مخفی گوشے بہ اندازِ نمایاں کھلائے ہیں۔ "رامپور سے کراچی تک" کی رپورٹ میں جناب وفا کراچی کا تعارف خود ان کی زبانی بہت خوب لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے یہاں ایک مشہور عام غلط حوالے کا بھی ازالہ ہو گیا ہے۔ وہ یوں کہ یہاں پر مشہور ہے کہ یہ شعر

وقارِ خونِ شہیدانِ کربلا کی قسم
یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہارا ہے

جگن ناتھ آزاد کی تخلیق ہے مگر میں نے حلقۂ احباب میں کبھی یہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ مذکورہ شمارہ میں خالق اور تخلیق دونوں کے بارے میں سچائی جان کر میرے موقف کو بے حد تقویت ملی ہے کراچی میں ہوئے ہند و پاک شاعر

بقیہ صفحہ ۳۶ پر

Regd.
THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002
Regd. wi the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57





بالوں کا انداز چاہے کوئی بھی ہو لیکن اگر بالوں کی
یہ گھٹائیں ہمیشہ قائم رکھنا چاہیں، انہیں دراز، ملائم اور کالا دیکھنا چاہیں تو زلفی ہیر
ٹانک ہی استعمال کیجئے۔ یہ گرتے بالوں کو روکتا ہے، خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کی جڑوں کے نیچے تک
پہنچ کر بالوں کی بیماریوں کو ختم کر دیتا ہے۔ زلفی ہیر ٹانک تیل نہیں بالوں کی غذا ہے۔ سر پر نئے
بال اگانے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے بال صابن سے نہ دھوئیے۔ یہ بالوں کی جڑوں کو جلا دیتا ہے۔ سر دھونے
کے لئے زلفی پاؤڈر استعمال کیجئے جو بالوں کو صاف رکھتا ہے؛ ان کو ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔



قیمت زلفی ہیر ٹانک: بارہ روپے ● شمع (یونانی اینڈ ایوروید) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ● زلفی پاؤڈر: چھ روپے

عرب ممالک میں زلفی حاصل کرنے کے لئے رجوع فرمائیں!
جدہ اور مکہ معظمہ میں
ایم۔ ایم۔ ملیباری
باب شریف، عرب بلڈنگ، جدہ

متحدہ عرب امارات میں
ملک بیوٹی ایجنسی:
● دبئی (فون نمبر: ۲۲۵۶۵۲، ۴۳۶۵۰)
● سنتوہ (فون نمبر: ۳۳۳۴۸۳)

● دیرہ (فون نمبر: ۲۲۴۴۳۹)
● شارجہ ● ابوظہبی
دیگر ممالک کیلئے
ایجنسی حاصل کرنے کیلئے لکھئے



سرور تونسوی

فون نمبر ۲۶۲۰۵۴ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز فار انڈیا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۴۴۴ — رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

ہر ذرّہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہیں
فیاض گوالیاری

شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

فی پرچہ ۲/۵۰ روپیہ
زرِ سالانہ ۲۴/= روپے

جلد نمبر ۴۴ — دسمبر ۱۹۸۳ء — شمارہ نمبر ۱۲

نازِ فطرت

رحمتِ دو عالم — توصیف علوی عاصی کیرانوی

نازِ فطرت کو ہے جس پر وہ حقیقت تم ہو
جس کا سایہ ہے دو عالم پہ وہ رحمت تم ہو

دینِ حق تم نے دکھایا ہے مکمل کر کے
تم ہی ہو ختمِ رسل، شانِ نبوت تم ہو

سامنے جسکے فرشتوں کی جبینیں خم ہیں
بزمِ امکاں میں وہ انساں کی عظمت تم ہو

ایک ہی صف میں جہاں ملتے ہیں محمود و ایاز
بزمِ کونین میں وہ شانِ عدالت تم ہو

سر بلند پرچمِ توحید کیا ہے تم نے
تم ہو وحدت کے امیں سرِ حقیقت تم ہو

تم پہ ہی ختم ہوئی منزلِ عظمت ہر اک
دونوں عالم کے لیے فخرِ امامت تم ہو

ذکرِ طوفان ہی کیا۔ فکرِ تلاطم ہو کسے
جبکہ ہر کشتی کے ساحل کی ضمانت تم ہو

جس نے ہر گوشۂ ظلمت کو اجالے بخشے
ہر دو عالم کیلئے خورشیدِ صداقت تم ہو

روحِ انساں کیلئے تم ہی ہو تسکین و قرار
قلبِ انسان کا سرمایۂ راحت تم ہو

جس کا کونین میں ہر سمت ہے سکہ جاری
وہ ہو سلطان دو عالم کی حکومت تم ہو

تم سے ہی گلشنِ ہستی میں ہے ہر دورِ بہار
ہر گل و غنچہ کے کھلنے کی ضمانت تم ہو

خالی ہاتھوں سے لٹاتا ہے جو ہر دولتِ حق
اس بھری دنیا میں وہ صاحبِ ثروت تم ہو

جس کی آمد سے مٹی ہر شبِ غم کی ظلمت
دو جہاں کیلئے وہ صبحِ مسرت تم ہو

تم نے بخشا ہے زمانے کو جو آئینِ حیات
اس کے ہر گوشۂ معنی کی حقیقت تم ہو

جرم و عصیاں کا بھلا ذکر ہی پھر کیا یعنی
جبکہ عاصی کیلئے سایۂ رحمت تم ہو

مالک و ناشر سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے ... کے صفحات خواجہ پریس ... جامع مسجد دہلی اور ... پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند ... نئی دہلی ۔ ۱۱ سے شائع کیا۔

اُردو کے مشہور افسانہ نگار رام لعل
کے سفرِ یورپ کی دلچسپ داستان

خواب خواب سفر

رام لعل نے ۲۶/جولائی ۱۹۷۸ء سے یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء تک ناروے لندن ڈنمارک اور سویڈن کا سفر کیا۔ واپسی میں وہ چند گھنٹوں کے لیے ماسکو میں بھی رکے۔ زیادہ تر ان کا قیام ناروے میں رہا۔ کیونکہ دراصل یہ سفر انھوں نے اپنے عزیز......... افسانہ نگار دوست جناب ہرچرن چاولہ کی دعوت پر کیا تھا جس کا ذکر جگہ جگہ موجود ہے اس طرح ہمیں ایک اور افسانہ نگار کے بارے میں وافر معلومات مہیا کی گئی ہیں لندن میں وہ صرف ایک ہفتہ رہے۔ لندن کے حالات پر ایک طویل باب میں الگ سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے یہ رام لعل جیسے تند اور افسانہ نگار کا سفرنامہ بہت ہی خوشنما اور مفید کارنامہ ہے جو ہمیں مختلف ملکوں کی رنگا رنگ دلچسپیوں تہذیب و تمدن رسم و رواج طرزِ معاشرت طریقِ زندگی اور زندگی کی گوناگونی اور ہمہ جہتی سے روشناس کراتا ہے۔

چار صد صفحات پر پھیلی ہوئی یہ عظیم و ضخیم ادبی دستاویز ہر صاحب ذوق کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے کتابت طباعت عمدہ بڑا سائز ●● قیمت پچاس روپے

اردو ... اور تکنیک کے لحاظ سے اپنے انداز میں اچھوتی اور منفرد تخلیق
خدیجہ مستور کا ناول

آنگن

تمام تر آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے اس ناول کی کہانی گھر کے آنگن سے شروع ہو کر اس دائرے میں داخل ہو جاتی ہے جو

سماج اور سیاست کا دائرہ ہے۔

اپنے دلکش اسلوب منفرد اندازِ نگارش دلچسپ قصہ گوئی اور رعنائی خیال کے باوصف یہ ناول اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ آپ کے افسانوی ذوق کی سیری کا ضامن ہے ابتدا میں ۱۶ صفحات پر محیط ڈاکٹر اسلم آزاد کا پُر مغز اور بصیرت افروز مقدمہ عمدہ کتابت بہترین طباعت مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ ●● قیمت صرف ۳۰/=

طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ

عصرِ حاضر کے مزاح نگاروں میں خواجہ عبدالغفور کا نام ایک بلند امتیازی شان کا حامل ہے انھوں نے طنز و مزاح نگاری کو تنقید اور اصلاح دونوں کے لیے برتا ہے ان کا طنز تو بھرپور و تیکھا اور جاندار ہوتا ہی ہے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی وہ کسی سے کم نہیں۔ اس کا منہ بولتا ثبوت انکی تازہ ترین تحقیقی کاوش ہے جسے انھوں نے

"طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ"

کے نام سے شائع کیا ہے۔ جس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ اردو میں اپنے موضوع پر پہلی بھرپور جامع اور سیر حاصل تحقیقی کاوش ہے اور اس لیے بھی کہ یہ ریسرچ اسکالرز کے لیے ایک گائڈ بک کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ اس میں انشائے لطیف، بذلہ سنجی، طنز، اردو کی اندازِ بیان اور دوسری زبانوں سے مزاح غرضیکہ طنز و مزاح کی جملہ انواع و اقسام اصناف و امثال حتیٰ کہ زیر لب تبسم، ہنسی اور قہقہے کے محرکات اور موجبات کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔

بڑا سائز ڈھائی صد صفحات عمدہ کتابت روشن طباعت مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ قیمت -/۵۰

(پتہ)

دفتر ماہنامہ شاعر بمبئی ... افسانوی ... مکتبہ ...

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

ساغر نظامی

ساغر نظامی کا اُردو شاعری خصوصاً حُب الوطنی کی اُردو شاعری میں ایک انفرادی مقام ہے۔ ہم نے ایک غلط روایت قائم کر رکھی ہے کہ جب بھی قوم پرستی یا وطن پرستی کا ذکر آتا ہے تو ہم بڑے بڑے لیڈروں کے اسمائے گرامی تو گنواتے ہیں مگر اُن ادیبوں شاعروں اور قلم کاروں کو بالکل بھول جاتے ہیں جنھوں نے اپنی انقلابی تحریروں اور نظموں سے عوام کو بیدار کیا اور عوام کے دلوں میں قوم پرستی اور وطن کی محبت کے جذبات پیدا کئے۔ جناب آنند نارائن صاحب مُلّا کا فرمان سو فیصد صحیح ہے کہ انقلابی شاعروں اور قلم کاروں کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند کسی بھی ایسے شہید کے خون سے کم اہمیت نہیں رکھتی جس نے مُلک کی آزادی حاصل کرنے میں جان دی ہو۔

ساغر نظامی ایک وطن پرست اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے جوش ملیح آبادی ایسے انقلاب پرست شاعر سے کہیں آگے ہیں کہ انھوں نے ترکِ وطن نہیں کیا حالانکہ جوش صاحب کو جو سہولیات اور مُلک کی کشتی کے ناخداؤں تک جو رسائی حاصل تھی ساغر صاحب کو یہ سعادتیں کم حاصل تھیں۔ ساغر صاحب نے "شکنتلا" اور "انارکلی" منظوم ڈراموں میں جہاں اپنی قوم پرستی کا ثبوت دیا ہے وہاں "ہزدہ نامہ" اور "مشعلِ آزادی" ان کی جن پرستی کی ایسی روشن مثالیں ہیں جو ان کے دُشمنوں سے بھی خراج وصول کر لیتی ہیں۔

ساغر نظامی کو ایڈیٹر شانِ ہند نے خود کانگریس کے جلسوں میں (انگریز کے زمانے میں) وطن پرستانہ اشعار پڑھتے سُنا ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انگریزی حکومت کے خلاف کچھ کہنا بڑے دل گُردے کا کام تھا۔ آج کل کے ہمارے اپنے بھائی بند جو حکومت کی کُرسیوں پر براجمان ہیں وہ اپنے ہم وطنوں کی زبان سے اپنے خلاف ایک لفظ بھی سُننے کی سکت نہیں رکھتے اندازہ کیجیے کہ غیر مُلکی انگریزی حکومت کسی ہندوستانی کی زبان سے باغیانہ تقریر یا نظم کیسے برداشت کر سکتی تھی۔

ساغر نظامی نے زندگی میں ہر قسم کے نشیب و فراز دیکھے، مالی بحران بھی اُن پر قیامت بن کر ٹوٹے اور خدا کے فضل و کرم سے خوشحالی نے بھی انھیں اپنے جلوے میں خوب خوب بہاریں دکھائیں۔ ساغر صاحب نے اپنے بھائیوں کی دیکھ ریکھ بڑے بھائی کی نسبت ایک شفیق باپ کی طرح کی اور اپنے گھر کو ہمیشہ ایسا صاف ستھرا اور عجیب ڈھنگ سے رکھا کہ ہر دیکھنے والا خود بخود شاعری کے سحر میں کھو جاتے۔

ایڈیٹر شانِ ہند واشگاف عرض کرتا ہے کہ اس کی کسی سے دشمنی نہیں اور اگر کوئی شاعر یا ادیب اسے اپنا دشمن سمجھتا ہے تو وہ اپنے دل میں اس حقیقت کو ضرور محسوس کرتا ہے کہ اس کے نادان دوستوں کی نسبت ایڈیٹر شانِ ہند کی منصفانہ دشمنی بہتر ہے۔ کیونکہ ایڈیٹر شانِ ہند نے جب بھی کسی شاعر یا ادیب کی بابت کچھ لکھا تو نہایت ایمانداری کے ساتھ۔ مثلاً شاہد ہے کہ ایڈیٹر فلاں

کے دل میں کسی کے خلاف کسی قسم کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اگر سچائی حقیقت بیانی اور کسی کی کمزوریوں یا ... وطن دشمن سرگرمیوں کا دیانت داری کے ساتھ ذکر کرنا دشمنی قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر ایڈیٹر شانِ ہند اس سلسلے میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شانِ ہند میں ایڈیٹر شانِ ہند نے ساغر نظامی صاحب کی بابت بہت کچھ لکھا یار لوگوں نے اسے ساغر صاحب کی مخالفت سمجھ کر خوشیاں بھی منائیں مگر آفرین ہے ساغر صاحب کو کہ انھوں نے اس سلسلے میں کبھی شکایت نہ فرمائی۔ ایک بار ساغر صاحب اور اُن کی بیوی محترمہ ذکیہ سلطانہ صاحبہ اور ایڈیٹر شانِ ہند معہ اپنی اہلیہ کے ہم سفر تھے تو راستہ میں ساغر صاحب نے ایڈیٹر شانِ ہند کی بیوی سے اتنا ضرور کہا کہ سرور صاحب سے کہیے کہ میرے بارے میں لکھنے سے پہلے مجھ سے دریافت کر لیا کریں تو ان کی تحریر میں حقیقت کا عنصر اور بھی بڑھ جائیگا۔ تقریباً پچیس تیس سال ہوتے ہونگے متھرا میں ایک مشاعرہ تھا۔ منتظمین مشاعرہ ایڈیٹر شانِ ہند سے اس لیے خائف تھے کہ اگر ساغر صاحب کو مشاعرہ کا صدر بنایا گیا تو شاید ایڈیٹر شانِ ہند اسے اچھا نہ سمجھیں اس مشاعرہ میں خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد، فنا کانپوری اور دیگر متعدد نامور شعرا موجود تھے منتظمین مشاعرہ نے اعلان کیا کہ اب ایڈیٹر شانِ ہند مشاعرہ کی صدارت کے لیے تجویز رکھیں گے۔ ایڈیٹر شانِ ہند کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ یہ فرض اُسے سونپا جائے گا۔ یار لوگ باور کیے ہوئے تھے کہ شانِ ہند میں ساغر صاحب کے بارے میں لکھا جا رہا ہے۔ اس لیے ایڈیٹر شانِ ہند ساغر صاحب کا نام صدارت کے لیے ہرگز پیش نہیں کریگا مگر راقم الحروف نے مائیک پہ آتے ہی یہ گزارش کی کہ اس کے خیال میں اس وقت ہندوستان میں ساغر نظامی سے بہتر قومی اور وطن سے محبت رکھنے والا شاعر دوسرا کوئی نہیں ہے ... لہٰذا اس مشاعرہ کی صدارت قبلہ ساغر نظامی ہی کو زیب دیتی ہے۔ بس پھر کیا تھا اس تجویز کی تائید طویل تالیوں سے کی گئی اور منتظمین مشاعرہ کا یہ شک دور ہو گیا کہ سرور تونسوی اور ساغر نظامی صاحب میں کوئی مخالفت ہے۔

ایڈیٹر شانِ ہند نے جوش ملیح آبادی، جوش ملسیانی فراق گورکھپوری، اکبر احسنی گنوری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، تلوک چند صاحب محروم اور دیگر متعدد اُستاتذہ محترم اور شعرائے کرام کے بارے میں بارہا لکھا اور اس انداز سے لکھا کہ بظاہر وہ مخالفانہ تھا۔ مگر مجلسی اور سماجی طور پہ ایڈیٹر شانِ ہند نے ان بزرگوں کی ہمیشہ عزت کی اور کئی مشاعروں میں ان کے قدم چھوئے۔ اس طرح ساغر صاحب سے ایڈیٹر شانِ ہند کا کئی مرتبہ اختلافِ رائے ہوا اور شانِ ہند میں کافی سخت الفاظ میں ساغر صاحب کے بارے میں لکھا گیا۔ مگر کیا مجال کہ مجلسی طور پہ ایڈیٹر شانِ ہند اور ساغر صاحب کے تعلقات میں کبھی فرق آیا ہو۔ کئی سال ہوئے ساغر صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا اور آپ اس وقت کے ولنگڈن اور آج کل کے رام منوہر لوہیا ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں داخل تھے۔ ایڈیٹر شانِ ہند ان کی مزاج پرسی کو گیا اور وہیں دل میں طے کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو ساغر صاحب کے بارے میں ایک لفظ بھی شانِ ہند میں ایسا نہیں چھپے گا جس سے انھیں شکایت ہو خدا انھیں عمرِ طویل دے۔ اور ایڈیٹر شانِ ہند آج تک اپنے وعدے پر قائم ہے۔

جب ساغر صاحب ریڈیو میں پروڈیوسر تھے تو یار لوگ ایڈیٹر شانِ ہند سے کئی بہانوں سے کہتے تھے کہ دیکھیے ساغر صاحب نے آپ کو ریڈیو پہ کبھی موقع نہیں دیا۔ ان بہکانے والوں کو اس کا علم ہی نہ تھا کہ ساغر صاحب نے دو بار ایڈیٹر شانِ ہند سے کہا کہ جن مشاعروں کی روداد آپ نے لکھی ہے اُن کے خاص خاص ٹکڑوں کو مرتب کر کے ریڈیو پہ نشر کیجیے مگر ایڈیٹر شانِ ہند نے اسے مناسب نہ سمجھا اور نہ اور دور درشن کے پروگرام حاصل کرنے کے لیے جارہے

ادیب اور شاعر کیا کیا پاپڑ نہیں بیلتے ۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ایڈیٹر شانِ ہند نے آج تک اس سلسلے میں کبھی کوشش تو در کنار ریڈیو سٹیشن اور دُوردرشن کے احاطے میں قدم تک نہیں رکھا ۔ ہاں خود دُوردرشن والوں کی درخواست پر اور بار بار فون کرنے پر ایک انٹرویو ایڈیٹر شانِ ہند نے ضرور لیا ۔ ورنہ ہمیشہ ریڈیو اور دُوردرشن کے پروگراموں‌ کے لیے کوشش تو درکنار بلکہ لعنت بھیجی ۔

ساغر نظامی ستمبر سے علیل ہیں ۔ پچھلے دنوں چیف ایگزیکیٹو کونسلر جناب جگ پرویش نے اپنی قیام گاہ پر ایک ایٹ ہوم دیا تو وہاں رفعت سروش صاحب نے بتایا کہ ساغر صاحب بیمار ہیں لہٰذا تقریب ختم ہونے کے بعد راقم الحروف اور ساحر ہوشیارپوری صاحب ساغر صاحب کی مزاج پرسی کے لیے گئے تو دیکھا واقعی ساغر صاحب کئی دنوں سے علیل ہیں ساغر صاحب کی بیگم صاحبہ نے بتایا کہ پہلے تو ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ انھیں علاج کے لیے بمبئی لے جایا جائے ۔ مگر بعد میں ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ یہ علاج دہلی میں ہو سکتا ہے وہ آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ابھی ممبر ہیں لہٰذا انھیں وہاں دکھایا گیا اور اب ڈاکٹر صاحب انھیں گھر پر ہی دیکھنے آتے ہیں ۔

آج کل بارہ لوگوں نے ایک نیا طریقہ بے غیرتی کا ایجاد کیا ہے اور وہ یہ کہ اردو کے کسی نام نہاد ادیب یا شاعر کو اگر کھانسی کی بھی شکایت ہو جاتی ہے تو وہ خود اور ان کے حواری اخبارات میں روزانہ اُن کی تشویشناک علالت کی خبریں شائع کراتے ہیں اور حکومت خصوصاً وزیرِ اعظم محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ کی توجہ خاص مبذول کرائی جاتی ہے کہ سرکاری امداد دی جائے ۔ مگر ساغر نظامی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے ساغر صاحب کی اس طویل علالت کی اخبارات کو خبر بھی نہیں بھجوائی ہے ۔ حالانکہ خدا کے فضل سے ساغر صاحب اور بیگم ساغر اگر چاہتیں تو وزیرِ اعظم صاحبہ بہ نفسِ نفیس ساغر صاحب کے علاج کے لیے ہر ممکن انتظام فرما دیں ۔ مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ساغر صاحب نے علالت کو ذریعۂ جلبِ زر نہیں بنایا ۔

خدا کے فضل سے ساغر نظامی ۷۸ برس کے ہو گئے ہیں خدا انھیں طویل زندگی دے ۔ اس سلسلے میں ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (رجسٹرڈ) کے اراکین کی طرف سے پدم بھوشن حضرت ساغر نظامی کی ۷۸ ویں سالگرہ کی تقریب ۲۱/دسمبر ۸۳ء کو ساغر صاحب کے دولتکدہ ۵۹-۳۵ بنڈارا پلیس ہمایوں روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳ پر منعقد کی گئی ۔ کیونکہ بوجہ علالت ساغر صاحب کا کسی دوسری جگہ تشریف لے جانا مناسب نہ تھا ۔ ایڈیٹر شانِ ہند نے متعدد احباب کی تقاریبِ سالگرہ میں شرکت کی ہے مگر جس اچھے ڈھنگ سے ساغر صاحب کی ۷۸ ویں سالگرہ منائی گئی وہ اپنی نظیر آپ تھی ۔ بدقسمتی سے دہلی میں اردو ادیبوں اور شاعروں کے کئی گروہ ہیں اور ہر گروہ کا سربراہ کوئی نہ کوئی شاطر قسم کا گنجا اردو دانشور ہے اور اس پر مزید بدقسمتی یہ ہے کہ کسی تقریب میں اگر ایک گروہ کی شرکت متوقع ہوتی ہے تو دوسرا گروہ اس کا بائیکاٹ کرتا ہے ۔ مگر ساغر صاحب کی سالگرہ کے موقع پر یہ کمینہ تخصیص ختم ہو گئی اور ہر گروہ کے سربراہ اور ان کے پیرو اس تقریب میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ساغر صاحب کو نہ صرف مبارک باد دی بلکہ ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا فرمائی ۔ کاش یہ باہمی تعاون آئندہ بھی جاری و ساری رہے ۔ جناب مالک رام صاحب نے اس تقریب کی صدارت فرمائی چونکہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا وہ جلد ہی تشریف لے گئے اور ان کے چلے جانے کے بعد جناب حیات اللہ انصاری صاحب نے صدارت جاری رکھی ۔ کئی حضرات نے انتہائی مختصر طور پر ساغر صاحب کی ملی ، ادبی ، سیاسی اور ان کی قوم پرستی نیز ریڈیائی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ۔ اس ضمن میں مالک رام صاحب ، حیات اللہ انصاری صاحب گوپال متل ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب رفعت سروش صاحب اور دیگر کئی حضرات کی تقاریر خوب تھیں ۔ مگر گلزار دہلوی نے جس خوش و خشوع سے ساغر

صاحب کی خدمات کو سراہا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا وہ بے حد تعریف کے قابل تھے ۔ دہلی کا کوئی بھی ایسا بلند پایہ ادیب شاعر ایسا نہ تھا جسے اردو کی دنیا میں کچھ بھی مقام حاصل ہو اور وہ اس تقریب میں شریک نہ ہو ۔ سیکڑوں حضرات کی طرف سے ساغر صاحب کی گلپوشی کی گئی بلکہ یوں کہا جائے کہ ساغر صاحب کو کئی بار پھولوں سے لاد دیا گیا اس ضمن میں ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (رجسٹرڈ) کے اراکین ڈاکٹر خلیق انجم ، گلزار دہلوی ۔ ڈاکٹر تنویر علوی جناب عظیم شمیم ادیب ۔ ڈاکٹر اسلم پرویز ۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ ۔ ذہین نقوی ، واجد سحری ، ایم ۔ پی مغل سلیم احمد ۔ ایم ۔ ایم ۔ گپتا ۔ مدن لال گلاٹی ۔ مناظر مرادآبادی یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے ساغر صاحب کی سالگرہ ان کی رہائش گاہ پر منانے کی بنیاد ڈالی ہے ۔ ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ممبران نے از خود تمام اخراجاتِ تقریب برداشت کرنے کے علاوہ اس مبارک موقع پہ مبلغ گیارہ صد روپیہ کا چیک بھی ساغر صاحب کی خدمت میں بطور اعزازیہ پیش کیا ۔

تقریب کے آخر میں ساغر صاحب نے علالت کے باوجود اپنی بابت کئی باتیں بتائیں اور چند اشعار بھی سنائے اور کئی حضرات کے سوالات کے جوابات بھی دیئے ۔ جناب رحمٰن نیر ایڈیٹر جمہوریت صدی اور رنگین نے ساغر صاحب کی شریکِ حیات محترمہ کے بارے میں سوال کیا تو ساغر صاحب نے [illegible] انہیں کبھی [illegible] سمجھا ہی نہیں بلکہ انہیں ہمیشہ مرشد سمجھا ہے [illegible] صاحبہ نیر نے جب ساغر صاحب کی زبان سے اپنے بارے میں یہ کلمات سنے تو ان کا چہرہ خوشی اور ایک اطاعت گزار نیز خدمت گزار شریکِ حیات کی حیثیت سے دمک اٹھا ۔

ادارہ شانِ ہند بھی تہِ دل سے حضرت ساغر نظامی کی صحت کے لیے اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہے اور ذوق دہلوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اراکین کو مبارک باد پیش کرتا ہے کہ انھوں نے یہ قدم اٹھا کر بہت ہی اچھا کیا ہے ۔

ساغر نظامی کا ذکر ان کی شریکِ حیات محترمہ زکیہ سلطانہ نیر کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ۔ چنانچہ اس تقریب میں ہر مقرر نے ساغر صاحب کی شریکِ حیات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا اور بے لوث عقیدت ہے کہ گزشتہ چالیس سال میں ساغر صاحب نے ترقی ، شہرت ، مقبولیت اور سماجی و علمی طور پر جو بھی پیش قدمی کی ہے اس میں بھابی کا عظیم بھابی زکیہ سلطانہ نیر کا تعاون انھیں قدم قدم پر حاصل رہا ۔ بلکہ بعض مقامات پر تو زکیہ بھابی نے ساغر صاحب کی رہنمائی کی ہے اس وقت بھی ساغر صاحب کی علالت کے دوران زکیہ صاحبہ [illegible] رہی ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور ساغر صاحب یقیناً خوش نصیب ہیں کہ انھیں ایسی جاں نثار خدمت گزار ، اطاعت گزار ، صلاح کار اور شوہر کی ہر ادا پر قربان ہونے والی بیوی ملی ۔

اندرا گاندھی اور ہندی کے ناداں دوست

پچھلے دنوں نئی دہلی میں عالمی ہندی کانفرنس بڑی ہی کروفر سے منعقد ہوئی (یہ دلچسپ بات ہے کہ اکثر ہندو بھی کانفرنس کے منتظمین کی بدسلوکی کے شاکی تھے) اس کانفرنس کے صفِ اول کے کرتا دھرتا جناب گوپال پانڈے نے وزیراعظم صاحبہ کے استقبال میں کی جانے والی تقریر میں یعنی اندرا گاندھی صاحبہ کی خوشامد میں یہ بکواس کی کہ ہندی ایک ایسی زبان تھی جس کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت تھی ہی نہیں یہ تو اندرا جی کا احسان ہے کہ جنھوں نے ہندی کو یہ بلندی دی ہے ۔

اگر یہی بات تھی تو آپ نے ہندی کی عالمی کانفرنس کرنے کی جھک کیوں ماری ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے ملک ہندوستان میں ہی کروڑوں ہندوستانی ہندی سے نابلد ہیں چہ جائیکہ اس کی عالمی حیثیت کے بارے میں جھوٹے دعوے کیے جائیں ۔ پاکستان سے مندوبین ... اس کانفرنس میں تشریف لانے والے وہ حضرات تھے جو تقسیمِ ملک سے پہلے گجرات ، راجستھان اور بندیل کھنڈ کے علاقوں سے پاکستان چلے گئے تھے چونکہ پاکستان جانے سے پہلے یہ حضرات ہندی ہی بولتے اور لکھتے پڑھتے تھے اس لیے انھیں ہندی کی شد بد تھی ورنہ پاکستان میں ہندی کی حمایت میں کچھ کہنا یا اس کی درس و تدریس کی کوشش کرنا پاکستان سے بغاوت کرنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے

اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ ہماری وزیراعظم صاحبہ ہمارے ملک کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہیں مگر ان کی خوشامد میں یہاں تک چلے جانا کہ جس کا کوئی سر پیر ہی نہ ہو کہاں تک مناسب معلوم دیتا ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ کچھ حضرات نے سرِ محفل گوپال پانڈے صاحب کو اس [illegible] پر ٹوکا کہ [illegible] اچھا ہو تا کہ وزیراعظم صاحبہ ہی گوپال پانڈے صاحب [illegible]

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

راقم الحروف علیل ہے اس لیے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق قطعاً بے کار ہے۔ "بہ کوئے یار ——" کا کالم اس دفعہ راجہ مہدی علی خان (مرحوم) کا رہینِ منت ہے۔ برادرِ محترم جناب ساحر ہوشیار پوری پر سینکڑوں مضامین لکھے گئے مگر راجہ مہدی علی خان کا یہ خاکہ اپنی نظیر آپ ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ (سرورؔ تونسوی)

ساحرؔ ہوشیار پوری

ایک جوتشی کے پاس تین آوارہ لڑکے آئے۔ انھوں نے جوتشی کو اپنا اپنا ہاتھ دکھا کر پوچھا "مہاراج ہماری قسمت کا حال بتائیے اور کوئی مشورہ دیجیے۔" پہلے نوجوان کا ہاتھ دیکھ کر جوتشی نے کہا۔ "تو کچھ رتھلہ سے آیا ہے۔ تو شاعری کیا کرے گا۔ کھائے گا پیے گا۔ کھلائے گا۔ پلائے گا وغیرہ وغیرہ —— کچھ عرصہ تک ادبی محفلوں میں تو اپنا کلام چہک چہک کر سناتا رہے گا۔ اس کے بعد ایک دن یکایک ادبی محفلوں سے چہرہ دل جگر کو ذی کی طرح روپوش ہو جائیگا اور جنگل میں ...، کپورے تل کر ڈاکوؤں کے ہاتھ بیچا کریگا" لڑکے نے پوچھا۔ "اپنے آپ کو شاعر بنا لینے کے بعد یا اس سے پہلے اپنا تخلص کیا رکھوں؟"

جوتشی نے کہا۔ "ساحرؔ کپور تھلاوی۔" نوجوان نے سب باتیں نوٹ کیں اور جوتشی کا بٹوا اٹھا کر بھاگ گیا۔ اب دُبلا پتلا دوسرا نوجوان آگے بڑھا۔ کہا "میں لدھیانے سے آیا ہوں" اور ہاتھ جھکا کر بولا "میری تقدیر کے مالک میرا کچھ فیصلہ کر دے"۔ جوتشی لڑکے کا ہاتھ دیکھ کر بولا —— "تو بھی شاعری بیچا کرے گا۔ میں تیری تقدیر کا کیا فیصلہ کروں تیری تقدیر میں تاج محل کے ہاتھ میں ہے" لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا "پنڈت جی! میں آپکا مطلب نہیں سمجھا"۔ پنڈت جی آہ بھر کے بولے۔ "شاہجہاں اور ممتاز محل کی بے حرمتی کرنے کے صلے میں تیرے ملک کے اندھے تجھے آنکھوں سے لگا لینگے۔ جو پیسہ تُو برسائیگا —" لڑکے نے پوچھا "میں اب بھی آپ کی بات نہیں سمجھا" جوتشی نے کہا "بات کچھ عرصے کے بعد خود ہی تیری سمجھ میں آجائے گی۔ جا بھاگ جا۔ تیرا پہلا دوست میرا بٹوا اٹھا لے گیا ہے تو میری الماری میں رکھا ہوا تاج محل اٹھا کر بھاگ جائے گا ورنہ بیچ ڈالے گا —" لڑکے نے کہا "اچھا حضور! میرے لیے کوئی تخلص تو تجویز فرما دیجیے۔" جوتشی نے جواب دیا۔ "جا! ساحر لدھیانوی لکھا کر اپنے آپ کو۔ جلدی میں مجھے کچھ اور نہیں سوجھ رہا —" لڑکے نے تاج محل پر نظر ڈالی۔ پاکٹ بک میں کچھ نوٹ کیا اور جوتشی کا جوتا پہن کر وہاں سے سرپٹ بھاگ گیا —— اب تیسرا نوجوان پنڈت جی کے پاس آیا اور بولا۔ "حضور وہ دونوں بدمعاش تھے میں ایسا نہیں ہوں۔ میں ہوشیار پور سے آیا ہوں —" جوتشی اس نوجوان کا ہاتھ دیکھ کر بولا۔ "تو تو پیدائشی شاعر ہے۔ کوئی تخلص رکھا؟" نوجوان بولا۔ "نہیں حضور —" جوتشی نے جواب دیا۔ "تو اپنے آپ کو ساحرؔ ہوشیار پوری لکھا کر"۔

ہوشیار پوری نے جواب دیا "حضور آپ نے میرے دو اور دوستوں کا بھی یہی تخلص تجویز فرمایا ہے —" پنڈت جی بولے "اس وقت کوئی تخلص میرے اسٹاک میں نہیں ہے۔ یہ ملک بڑا جاہل ہے۔ شاعر شاعری تو کر لیتے ہیں۔ تخلص مجھ سے تجویز کراتے ہیں نالائق کہیں کے۔ اپنے آپ کو بلا جھجک ساحرؔ ہوشیار پوری لکھا کر۔ ایک دن میں تم تینوں شاعروں کی کشتی کروا دوں گا۔ تو چونکہ بڑا ہوشیار اور ہونہار معلوم ہو رہا ہے اس لیے میں تجھے "ساحرِ اعظم" کا خطاب دیتا ہوں۔" شکریہ ادا کرنے کے بعد نوجوان نے پھر جوتشی کے

آگے اپنا ہاتھ بڑھایا جوتشی جی بولے۔ تو ایک دن بہت بڑا شاعر کہلائے گا۔ بڑے بڑے شاعر تیرا کلام چھپایا کریں گے۔ نوجوان حیرت سے بولا۔ کون شاعر چھپایا کریں گے میرا کلام! ۔ جوتشی جی بولے" جن شاعروں کا نام مہدی ہوگا یا جن شاعروں کے نام کا ایک جزو مہدی ہوگا۔ وہ تیرا کلام چھپایا کریں گے۔ مثلاً راجہ مہدی عالیجاں مہدی پرتاپ گڑھی وغیرہ بہت ممکن ہے آئندہ چل کر بانز: ہد؟) یا مہدی یار جنگ بھی تیرا کلام چھپائیں اب جا بھاگ جا۔ ساحر ہوشیار پوری بہت ہوشیار تھا۔ بولا حضور میں ابھی مطمئن نہیں ہوا۔ کچھ اور باتیں بھی بتایئے۔ ساحر ہوشیار پوری نے دس روپے کا ایک ہرا پتہ جوتشی کی جیب میں ڈال دیا۔ جوتشی جی خوش ہوکر بولے "دُنیا کے جس مُلک میں بھی کوئی مشاعرہ ہوا کرے گا۔ لوگ ہاتھ جوڑ کر تجھے وہاں لیجایا کریں گے تو شاعروں کو لوٹ لیا کریگا۔ تیرا کلام بہت سے شاعروں کے دل توڑا کرے گا۔ تیرے بڑھ تنے سے گھٹنوں کا بھلا ہوگا۔ کوکا کولا پیا کرے گا۔ لوگ کہیں گے کہ تو شرابی ہے۔ لیکن تو شراب نہیں پیا کرے گا۔ دوسروں کو پلا کر اُن کا تماشہ دیکھا کریگا۔ تو نماز پڑھنے جایا کرے گا تو لوگ سمجھا کریں گے کہ مُجرا سننے گیا ہے تو بے شمار عشق کرے گا۔ تجھے ایک حسینہ سے شدید قسم کا عشق ہو جائے گا۔ وہ تیری باتوں کے جال میں نہیں آئے گی تو اُسے دھمکیاں دیگا۔ اس پر تعویذ گنڈے کرائے گا وہ پھر بھی تجھے ٹھکرائے گی ایک دن تو رو رو کر اُس کے قدموں میں گر جائے گا۔ بیہوش ہو جانے کے بعد جب تیری آنکھ کھُلے گی تو چاروں طرف شہنائیاں بج رہی ہوں گی تو نشے کی حالت میں سہرا باندھے ایک گھوڑے پر سوار ہوگا۔ براتیوں کو یہ حکم دے گا کہ میرے گھوڑے کو بھی شراب پلاؤ۔ براتی تیرے گھوڑے کو شراب کی پانچ بوتلیں سوڈا اور برف ملا کر پلائیں گے براتی بھی شراب کے نشے میں غرق ہوں گے تو گھوڑے کو ایڑ لگائے گا تو گھوڑا تجھ سے کہے گا ؎

چابک نہ مجھ کو دُم پہ لگا میں نشے میں ہوں
اے دوست مجھ پر ظلم نہ ڈھا میں نشے میں ہوں
کیوں ڈولتا ہے پیٹھ پہ میری اِدھر اُدھر
گرنے سے اپنا آپ بچا میں نشے میں ہوں
گالی کرنہ اپنا "پائیہ" کچھ دیر تو سنبھل
کہتا ہوں پھر مجھے نہ بھگا میں تھکا ہوں
گھوڑا نشے میں لڑکھڑا جائے گا رُک جائیگا اور اتیوں سے چلا چلا کر کہے گا ؏

"ساحر کو میری پیٹھ سے لینا گِرا میں" پھر تو گھوڑے کی پیٹھ سے گر کر زخمی ہو جائیگا۔ بیہوش ہو جائے گا۔ آخر ایک خوابگاہ میں پھولوں کی سیج پر آنکھ کھولے گا۔ جس حسینہ سے تجھے محبت ہوگی وہ تیرے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہوگی تو اُسکے قدموں پہ گر جائیگا اور کہے گا ؎

قدموں میں جگہ دیتے ہو جس سر کو قسم ہے
اُس سر کو پسِ عرش کے پہنچائے ہوئے ہو

حسینہ مسکرا کر اور اپنا مرمریں ہاتھ بڑھا کر تجھے اپنے قدموں سے اُٹھائے گی اور کہے گی "من ترا قبول کردم" تیری محبت کے ستارے تیرے حق میں ہوں گے اور تو سچ مچ اپنی محبوبہ کو حاصل کر لیگا اور اس سے شادی کریگا اور شادی کے بعد بیوقوفوں کیطرح اسی سے اُسی مجنونانہ انداز میں عشق کرتا رہے گا یہی تیری زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہوگا۔ اس کے بعد جوتشی نے ساحر ہوشیار پوری کو خود اپنا لکھا ہوا ایک بہت پیارا شعر سنایا شعر کا دوسرا مصرع بے وزن تھا مگر بے موقع نہیں تھا۔ شعر یہ تھا

کوشش کرنے سے غم کرنے سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو جنم پتری میں لکھا ہوتا ہے

شعر سُنانے کے بعد جوتشی نے ساحر صاحب کی پیٹھ پر زور سے ایک گھونسا مارا اور کہا یہ چھو کرے بھاگ جا میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں یہ سُنا ہے جوتشی کی ہر بات صحیح نکلی اور اُس کی دُعائیں درگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئیں یہ سب کہانی سننے کے بعد راجہ مہدی علی خاں نے ساحر ہوشیار پوری کو ایک لفافہ بھیجا۔ اُس لفافے میں کچھ پھول تھے اور ایک پرزے پر ایک شعر لکھ کر ساحرِ اعظم سے درخواست کی تھی کہ ہر نماز کے بعد وظیفے میں یہ شعر ۱۱۱ مرتبہ تسبیح پر پڑھ لیا کریں پھول ساحر صاحب کے پاس ہے شعر مجھے یاد ہے جو یہ ہے۔ ساحر بامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے جس نے دیا ہے درد دل اُس کا خُدا بھلا کرے (راجہ مہدی علی خاں)

گوشۂ عقیل صدیقی

سرور تونسوی

کل ہند مشاعرہ اودے پور اردو سمپوزیم ۱۹۶۶ء

آج ۲۸/مارچ ۱۹۶۶ء سوموار ہے۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے ہیں۔ بھارتیہ لوک کلا مندر میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں آس پاس کے مکانوں کی چھتیں بھی شائقین مشاعرہ سے اٹی پڑی ہیں۔ صاحبِ صدر حضرت اعجاز صدیقی مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ "شاعر" مسندِ صدارت سنبھال چکے ہیں سامعین بار بار تالیوں سے یاد دہانی کر رہے ہیں کہ وقت ہو چکا مشاعرہ شروع کرائیے۔

لیجیے صدر صاحب نے صدارتی تقریر شروع کر دی ہے جو انتہائی مختصر ہے تاکہ سامعین اور شاعروں کے درمیان وہ زیادہ حائل نہ رہیں۔ اناؤنسر کے فرائض جناب ندا فاضلی نے سنبھالتے ہوئے سب سے پہلے اودے پور کے ایک اچھے شاعر جناب محمد حسین صغیر کو کلام سنانے کے لیے پکارا ہے۔ صغیر صاحب فرما رہے ہیں ؎

کبوتر ایک بھی اب تک نہ ان کے زیرِ دام آیا
صبح سے دیکھتے ہونے کو آخر وقتِ شام آیا
پکڑ کر کان دونوں ہاتھ سے میرے لگے کہنے
بڑی مشکل سے قابو میں یہ اسپِ بے لگام آیا

صغیر صاحب نے مزاحیہ کلام سنا کر مناسب داد پائی ہے۔ ندا صاحب نے بہت اچھے انداز میں صغیر صاحب کو داد دیتے ہوئے جناب عبداللطیف صاحب لطیف سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے سنیے لطیف صاحب فرما رہے ہیں ؎

تجاہل ان کا ہے عارفانہ نہ تھی ضرورت کچھ امتحاں کی
وہ مجھ کو پہچانتے ہوئے بھی وفا میری آزما رہے ہیں
جمال ان کا شباب ان کا نہیں خدائی ہیں کوئی ان سا
کسی کی قسمت بنا رہے ہیں کسی کی دنیا مٹا رہے ہیں

لطیف معنی الگ الگ ہیں سمجھنے والے ذرا انکو سمجھیں
میں ہنس رہا ہوں غلط نہیں ہے یہ پھر بھی وہ مسکرا رہے ہیں

لطیف صاحب اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو ندا صاحب نے اودے پور کے ہی ایک اور اچھے شاعر جناب محمد حسین صاحب اختر کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے اختر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

چشمۂ کوثر ہے ساقی تیرے پیمانے کا نام
قصرِ فردوسِ بریں ہے تیرے میخانے کا نام
چشمِ عرفان و بصیرت میں ہے تو جلوہ نما
سجدہ گاہِ قدسیاں ہے تیرے کاشانے کا نام
ایک ہی جلوے میں تو نے کھو دیئے ہوش و حواس
اب نہ لینا طور پہ موسے کبھی جلنے کا نام

اختر صاحب نے اس غزل کے بعد ایک غزل اور سنائی ہے۔ ع :۔ تمام مست تیرے خیال میں غمِ دو جہاں سے گزر گیا

اور مناسب داد پا کر اپنی جگہ چلے گئے ہیں جناب زیشی کمار شاد کی حالت کو دیکھتے ہوئے ندا فاضلی نے ابھی ابھی کیا کہ شاد صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے زیشی کمار شاد کھڑے ہو کر مائیک پر فرمانے لگے کہ سب سے پہلے میری شناد دیکھیے تاکہ میں بیٹھ کر پڑھ سکوں۔ کیونکہ میری.... طبیعت واقعی خراب ہے۔ کچھ تو ہے ہی اور کچھ بگڑنے کی ہوئی ہے۔ انکی صاف گوئی اور صورت میں حالت "مجرس" پر خاصے قہقہے لگے ہیں۔ سنیئے شاد صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی	پتی پتی گلاب ہو جاتی ہے
تو نے ڈالی نہ مے فشاں نظریں	ورنہ شبنم شراب ہو جاتی !

داد پانے کے بعد قطعہ ارشاد فرمایا ہے ؎

بت پوچھا گیا تپتے سے — حسن جلوے میں یا نگاہ میں ہے
شمع کو دیکھتے رہنے بولا — غالباً سوزِ بے پناہ میں ہے

شادؔ فرما رہے ہیں کہ ہمارے لیے ایک بات مشہور ہے کہ شراب پی کر شاعری کرتے ہیں، مگر واقعتاً یہ بات نہیں ہے۔ سنیئے ؎

شعر کو کیا شراب سے نسبت — مے کشی محض میری عادت ہے
لیکن اے دوست شاعری میری — میرے احساس کی عبادت ہے

جناب نریش کمار صاحب شادؔ آج کلام سنانے کے موڈ میں ہیں۔ لیجئے آپ بھی کچھ سن لیجئے ؎

زہرِ آلام کی ضرورت کیا — سرخوشی کی نجات کافی ہے
ایک شاعر کی جان لینے کو — ایک عورت کی ذات کافی ہے

*

داورِ حشر دیکھنا کیا ہے — میں وہی رندِ لا ابالی ہوں
اس سے پہلے کہ تو سوال کرے — میں خود اک جام کا سوالی ہوں

*

میرے شعروں کا ماجرا مت پوچھ — یہ ندی دو دھاروں سے بہتی ہے
ایک سے ہوش شعر لکھتا ہے — ایک سے شراب لکھتی ہے

داد تو ان قطعات کا حق ہے۔ لہٰذا داد کا شور روزِ قیامت کے شور کو بھی مات کر رہا ہے اور جناب شادؔ اب ایک غزل سنا رہے ہیں فرماتے ہیں ؎

لوٹ جائے غمِ دوراں سے یہ امکاں تو نہیں
میرا دل ہے کسی معشوق کا پیماں تو نہیں

شاعری خونِ جگر کا ہے لبالب ساغر
کسی کم ظرف کی تفریح کا ساماں تو نہیں

زندگی تیرا بہر حال ارادہ کیا ہے
تو مری جان مری جان کی خواہاں تو نہیں

صدر فرما رہے ہیں کتنی اچھی طرح بنایا ہے شعر کو۔ شادؔ بے ساختہ فرما رہے ہیں بن ہی گیا ہے۔ صاحب۔ اس پر ایک قہقہہ لگا ہے۔ شادؔ فرما رہے ہیں ہمارے صدر بہت بڑے شاعر ہیں اللہ خود بھی شاعر نکالتے ہیں۔ اسکے بعد قطعہ ارشاد فرمایا ہے۔

تیری وحشت کو یہاں سنا ہم کوئی کیا سمجھے
چاک ہے دل ہی مگر چاکِ گریباں تو نہیں

عرض پرداز ہونے کے بعد شادؔ صاحب کہنے لگے کہ آپ تھوڑی سی گستاخی برداشت کر لیں تو ایک چھوٹی سی نظم سناؤں۔ ہوا یوں کہ میرے محلے کے سامنے سے ایک لڑکی اغوا ہو گئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لڑکیاں بھی ہوتی ہیں اور لڑکیاں اغوا بھی ہوتی ہیں۔ مگر میری بیوی کی اُس سے دوستی تھی تو اس نے کہا کہ بڑے شاعر بنے پھرتے ہو۔ اس لڑکی پر نظم کہو۔ تو سنیئے "ایک عام سی لڑکی"

وہ ایک عام سی لڑکی ہے دیکھ کر جس کو
نہ جانے کیوں مجھے ایسا خیال آتا ہے
کہ اُس کے ہنسنے کا انداز یہ بتاتا ہے
کوئی نہیں ہے غمِ دل سے رسم و راہ ابھی
پڑی نہیں ہے کوئی چوٹ ابھی رگِ جاں پر
کسی نگاہ سے الجھی نہیں نگاہ ابھی
وہ ایک عام سی لڑکی ہے جیسے چھائی ہوئی
مرے جوان خیالوں پہ بے خودی کی طرح
خیال آتا ہے کہ پھول بننے والی ہے
وہ کم سنی جو منہ بند ہے اک کلی کی طرح
وہ بوسے گل تو پھوٹے گی روشنی کی طرح

نظم کے بعد فرمانے لگے کہ میں سردار تونسوی سے بہت ڈرتا ہوں۔ مگر انکی دوستی کی نذر ایک قطعہ کرتا ہوں ؎

بے غرض دوستوں کی ہمدردی — کس قدر پُر خلوص و سادہ ہے
یہ وہ انمول پھول ہیں جن میں — رنگ کم ہے مہک زیادہ ہے

اسکے بعد فرماتے ہیں ؎

بادہ پیمائیوں میں رات کٹی — نغمہ آرائیوں میں رات کٹی
صبح جاگے تو یہ ہوا محسوس — کتنی تنہائیوں میں رات کٹی

*

طنز یہ سب نمائشی تو نہیں — طنز کی تہہ میں تیرگی تو نہیں
تو شرافت جسے سمجھتا ہے — وہ کہیں تیری بزدلی تو نہیں

اس کے بعد شادؔ صاحب نے کسی کی فرمائش پر ایک نظم سنائی ہے اور داد سے لت پت ہو کر فرما رہے ہیں کہ اب اجازت دیجئے اگر جواس بجا رہے تو پھر تعریف لاؤں گا۔ لہٰذا قہقہوں کی آواز میں شادؔ صاحب تشریف لے جا رہے ہیں۔ اور

اناؤنسر نے بہت ہی اچھے تعارف سے جناب منگل سکسینہ سکریٹری ساہتیہ اکاڈمی کو ہندی کویتا سنانے کی درخواست کی ہے منگل سکسینہ نے بہت اچھی کویتا سُنا کر خُوب خُوب داد پائی ہے۔ راقم نے کنور مہندر سنگھ بیدی۔ صاحبزادہ منظور احمد نیز کی اناؤنسرز کی اناؤنسنگ مشاعروں میں سُنی ہے اور تو اور اس مدبر فاضل کو اہمیت دلانے کے موجد کی بھی اناؤنسنگ سُنی ہے مگر جس انداز سے آج نداؔ فاضلی اناؤنسر کے فرائض ادا کر رہے ہیں اس کی نوعیت ہی نرالی گانہ ہے مختصر اور با معنی اور اس قدر دلپذیر کہ سامعین شاعر اور کلام شاعر سے کماحقہٗ طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔ اچھے مشاعروں کے منتظمین اگر نداؔ فاضلی کی خدمات اناؤنسر کے لیے حاصل کریں تو یقیناً وہ محسوس کریں گے کہ ان کے مشاعرے کی اہمیت دوبالا ہو گئی ہے۔ لیجیے اب فراز حامدی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور قطعات سنا کر غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ارباب خرد دیر و حرم دیکھ رہے ہیں
دیوانے ترا نقش قدم دیکھ رہے ہیں

گمراہ ہوئے جاتے ہیں یہ کیسا ستم ہے
حالانکہ ترا نقش قدم دیکھ رہے ہیں

تقدیر کے بل نکلیں تو کس مشکل سے نکلیں
مُدت سے تری زلفوں کے خم دیکھ رہے ہیں

راجستھان کا یہ نوعمر شاعر قطعات اور غزل پر خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ پر گیا تو اناؤنسر نے ساحر رتن پوری سے کلام سُنانے کو کہا ہے۔ ساحر صاحب نے معمولی نوعیت کے قطعات اور غزل سُنائی ہے۔ داد کو دالوں پڑھتے ہیں۔ لطیف صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ صاحب تو نوں گُند ہیں۔ ساحر صاحب اپنے سحر سے سامعین کو مسحور نہ کر سکے تو محمود صاحب بیتاب ہیرہ کو سامعین پر چھا جانے کیلیے بلایا گیا مگر کچھ توقع وہی خاص طاری ہے چنانچہ جوں ہی انھوں نے مطلع ؎

حیرانی نہیں جاتی پریشانی نہیں جاتی
الجھی ہوئی زلفوں کی نگہبانی نہیں جاتی

[illegible] ہو گیا مگر آفریں ہے نداؔ صاحب پر کہ انھوں نے پوری غزل سُنا کر ہی دم لیا۔ نداؔ صاحب نے بھی سامعین کی پریشانی کو محسوس کر لیا ہے لہٰذا انھوں نے نہایت ہی مناسب اور بچے تُلے الفاظ میں رُوحی صاحبہ دہلوی کو کلام عطا فرمانے کی درخواست کی ہے جناب شفا گوالیاری نے اپنی بھابھی سے کسی غزل کی فرمائش کی ہے۔ لہٰذا وہی غزل عطا ہو رہی ہے ؎

ہم اپنے دل کے مقامات سے ہیں بیگانے
اسی میں ورنہ حرم ہے اسی میں بُت خانے

اس مطلع انوار پر جو داد دی گئی ہے، وہ اس مطلع کا حق ہے۔ داد کا شور تھما تو ارشاد ہوا ہے ؎

کہیں کہیں سے ہیں بدلے ہوئے سے کچھ عنوان
حقیقتاً ہیں یہی زندگی کے افسانے

بقدر ہوش ہر اک دل کو رنج ملتا ہے
یہاں سکون سے رہتے ہیں صرف دیوانے

داد نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ صاحبِ صدر اس شعر کو مکرر پڑھنے کا فرما رہے ہیں۔ سُنیئے رُوحی صاحبہ نغمہ سرا ہیں ؎

یہ غم کے مارے ہوئے آدمی کدھر جاتے
اگر جہان میں ہوتے نہ آج مینا نے

داد ہے کہ یہ شعر اپنا حق وصول کر رہا ہے۔ داد دستانے ذرا کم ہوئی تو مقطع ارشاد ہوا ؎

یہی تو چند سہارے ہیں زیست کے رُوحی
ستارے، پھول، شگوفے حسین پیمانے

معاف فرمایئے مجھ سے بھول ہوئی اور وہ یہ کہ شاعرے کے شروع میں صغیر صاحب کے بعد جناب صالح محمد نایب اُڑد پور نے ایک نظم سُنائی تھی جس کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے ؎

چمن کے ماہ و سال سے　　چمن کی ڈال ڈال سے
چمن کی کائنات سے　　قسم خدا کی پیار سے
چمن کی کائنات ہے　　نہ آنچ آنے دیں گے ہم

نظم خاص طویل تھی اور حُب الوطنی کے جذبات سے لبریز تھی جن پہ نایب صاحب کو خُوب خُوب داد ملی۔

رودتی صاحب کے بعد اناؤنسر نے جناب محمد علی صاحب اثرؔ جودھپوری کو کلام سُنانے کے لیے کہا ہے۔ اثرؔ صاحب نے ایک قطعہ سُنانے کے بعد غزل ارشاد فرمائی ہے ؎

رہِ زندگی جو بتا گیا اُسی راہبر کی تلاش ہے
وہ نظر جو مل کے بچھڑ گئی مجھے اُس نظر کی تلاش ہے
میرے غم کو اپنا بنا لیا مرا درد جس نے سمجھ لیا
مرے حال پہ جو ہے نوحہ گر اُسی چشمِ تر کی تلاش ہے

اثرؔ صاحب کو مناسب داد ملی ہے مگر ان کی نظریں سامعین سے شکوہ سنج ہیں کہ بیرونی شاعروں کی نسبت راجستھان کے شعراء کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا رہا۔ اب جناب ممتاز شکیبؔ تشریف لائے ہیں۔ اچھا قطعہ سنانے کے بعد نہایت ہی اچھے ترنم سے یوں غزل چھیڑی ہے

جگر کے خوں سے اندھیروں میں زندگی کے لیے
ہر ایک دَور میں روشن چراغ ہم نے کیے
جو تجھ پہ آئی کبھی بات تو خدا کی قسم
بہ شانِ ضبطِ خودی مسکرا کے اشک پیے
تجھے خبر نہیں اے زندگی تری خاطر
ہزار بار مرے اور ہزار بار جیے
کریں گے فیصلہ اک روز خود چمن والے
دیا ہے کس نے لہو اپنا فصلِ گل کے لیے
جلا رہے ہیں رہِ زندگی میں دل کو شکیبؔ
یہ سوچ کر کہ اندھیرا نہ ہو کسی کے لیے

شکیبؔ صاحب کو پوری غزل پر بہت اچھی داد ملی ہے۔ اور اب رازؔ جودھپوری۔ اسٹیج پر تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

رازؔ کیا یہ انقلاب آیا ظلمتیں لے کے آفتاب آیا
آپ جسے کہتے ہیں نام کو خوشیاں غم جو آیا تو بے حساب آیا

اس کے بعد رازؔ صاحب نے غزل سُنا کر بہت خوب داد پائی ہے۔ مطلع آپ بھی سُن لیجیے ؎

سُنا رہا ہوں تمھیں اپنے دل کے افسانے

ندؔا صاحب اعلان فرما رہے ہیں کہ اب جناب ساغرؔ اجمیری کلام سُنا رہے ہیں۔ سنیئے جناب ساغرؔ پرانی شراب پیش کر رہے ہیں ؎

جنھیں چشمِ ساقی پہ ناز تھا وہی میکشی کو ترس گئے
جنھیں میکدہ پہ غرور تھا وہ تو جام ہی کو ترس گئے
تھے جہاں اندھیرے حیات کے انھیں آج روشنی مل گئی
جہاں روشنی تھی حیات کی وہیں روشنی کو ترس گئے

پُرانی شراب زیادہ نشہ آور ہوتی ہے لہذا ساغرؔ صاحب کے ان دو اشعار پر ہی اکتفا کیجیے۔ اب جناب ظفرؔ غوری مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ ایک نظم جو معمولی نوعیت کی ہے سُنائی ہے اور اس کے بعد غزل سُنا رہے ہیں۔ مطلع آپ بھی سُن لیجیے جو دو شعروں کے برابر ہے ؎

وقت آتا نہیں ہے کبھی لوٹ کر روز تازہ ستم ڈھاؤ دشمنو
پھول بن بن کے مہکیں گے گُل ہر طرف دل کے جلتے ہوئے گھاؤ اے دشمنو

اب ندؔا صاحب نے نہایت مناسب انداز میں راجستھان کے مشہور شاعر حضرت عارفؔ نقشبندی بیکانیری کو کلام سُنانے کی تکلیف دی ہے۔ سنیئے عارفؔ صاحب پہلے قطعات سُنا رہے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ فرمایئے ؎

زندگی کے نگار خانوں میں جھلکتا ہے پری جمالوں کا
بجلیاں کوندتی ہیں چاروں طرف حوصلہ دیکھیے جینے والوں کا

اس قطعہ کے بعد غزل عطا ہوئی ہے ؎

کیا تعلق ہے انھیں گردشِ ایام کے ساتھ
سایۂ زلف میں سوتے ہیں جو آرام کے ساتھ
تجھ کو ہو جائے گی معلوم حقیقت اے دوست
دو قدم چل تو سہی گردشِ ایام کے ساتھ
تیرے انفاسِ معطر کا ہے اب تک احساس
تیری زلفوں کی مہک آتی ہے ہر شام کے ساتھ
اشک برساتی ہے شبنم مرے حالِ غم پر
پھول کھلتے ہیں گلستاں میں ترے نام کے ساتھ
خود بخود پاؤں اٹھا کرتے تھے منزل کی طرف
اب تو جی بیٹھتا جاتا ہے ہر اک گام کے ساتھ

ساتھ چھوٹا ہے رہِ عشق میں جب سے تیرا
زندگی آنکھ دکھاتی ہے ہر اک گام کے ساتھ
کس کی آمد کی خوشی میں یہ چراغاں عارف
صبح کا نور سمٹ آیا تری شام کے ساتھ

عارف صاحب کو پوری غزل پر مناسب داد دی گئی ۔ ان کی غزل زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ عارف صاحب راجستھان کے نمائندہ شاعر ہیں ۔ اب ندا صاحب نے راجستھان کے ایک اور قابلِ ذکر اور بہت ہی اچھے شاعر کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے یہ ہیں جناب سالک عزیزی صاحب جونہی آپ مائیک پر تشریف لائے تو ان کی مولویانہ داڑھی پر سامعین ہنسنے لگے جس پر اناؤنسر نے بے ساختہ کہا کہ انور صابری کہا کرتے ہیں کہ ؎

میرے چہرے پہ تو داڑھی کے اضافہ پہ نہ جا
خط کے مضمون کو پڑھ خط کے لفافہ پہ نہ جا

قہقہوں کی آوازیں تھمیں تو سالک صاحب نغمہ سرا ہوئے ؎

دل وہ تڑپا کہ آہ کر بیٹھے   ہوش میں کیا گناہ کر بیٹھے
عشق کرنے کا یہ صلہ پایا   دل کی دنیا تباہ کر بیٹھے
برق تو مفت میں ہوئی بدنام   ایک دن ہم ہی آہ کر بیٹھے
برق تو مفت میں ہوئی بدنام   ایک ہم ہی آہ کر بیٹھے

داد تو ان اشعار کا حق ہے ہی۔ اہلِ راجستھان سوچیں کہ سرزمینِ راجستھان پر کس قدر اچھے شاعر موجود ہیں جو راجستھان کی بے اعتنائیوں کا شکار ہیں۔ ہاں تو سنیئے سالک صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

جس کو دشوار ہو زندگی اپنی   آپ سے رسم و راہ کر بیٹھے
رازِ بے ہوشیٔ کلیم یہ تھا   اعتبارِ نگاہ کر بیٹھے
چوٹ کھائی تھی کلی قسمت میں   اُن کی جانب نگاہ کر بیٹھے

(واہ واہ سالک صاحب: اللہ کرے زورِ سخن اور زیادہ

ایڈیٹر)

جرم یہ ہے کہ اپنے دل کو ہم   حسن کی جلوہ گاہ کر بیٹھے
حضرتِ دل یہ کس جفاجو سے   آپ امید نباہ کر بیٹھے
ہم ہیں وہ اہلِ دل جو اب کی تک   جادۂ غم میں چاہ کر بیٹھے

سالک عزیزی واہ اور آہ کی آوازوں میں ...
پاتے اپنی جگہ تشریف لے آئے تو ندا صاحب نے راجستھان کے ایک اور اچھے شاعر جناب آزاد سیکری سے کلام سنانے کی درخواست کی ہے۔ سنیئے آزاد صاحب فرما رہے ہیں ؎

خرد آمادۂ تخریب جہاں ہے   جنونِ عشق تیرا امتحاں ہے
جلانے پر تلی ہے برقِ سوزاں   مجھے فکر بقائے آشیاں ہے
کھٹکتا ہوں شرابِ رنگ و بو میں   خداوندا مری منزل کہاں ہے
ہوس کی زندگی ہے چند روزہ   حیاتِ عشق لیکن جاوداں ہے
کوئی کچھ بھی کہے آزاد لیکن   زبانِ ہند تو اردو زباں ہے

آزاد صاحب مناسب داد و ستائش کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں اور ندا صاحب نے راجستھان کے ایک اور نوجوان شاعر صاحبزادہ حامد رشید خاں صاحب ٹونکی سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ حامد رشید صاحب فرما رہے ہیں ؎

ذوقِ نظر کی داد تجھے اے گلچیں یاد دینے آئے ہیں
غنچے کر یاں، پھول فسردہ، اپنے باغ لگائے ہیں
آئی نہ خوشی گر راس ہمیں حیرت کی کچھ بات نہیں
حیرت تو یہ ہے اکثر غم بھی راس نہ آئے ہیں
تیرۂ شب سے ڈرنے والو ساتھ ہمیں کیوں لیتے جاؤ
ان ہی اندھیروں میں ہم نے فوانیس جلائے ہیں

حامد رشید خاں صاحب مناسب داد پاکر مائیک سے ہٹے تو ندا صاحب نے مناسب تعارف کے ساتھ صاحبزادہ فضل المتین صاحب اجمیری سے کلام سنانے کی التجا کی ہے۔ سنیئے متین صاحب کیا راز افشا فرما رہے ہیں ؎

رازِ محبت افشا ہوگا   محفل محفل چرچا ہوگا
تم جو یونہی خاموش رہوگے   بات بڑھے گی چرچا ہوگا
ترکِ تعلق کا ہے ارادہ   آج تو اُن کو آنا ہوگا
دیکھیں گے ہم شہروں شہروں   کوئی تو آخر تم سا ہوگا
کیسی آہٹ کوئی نہیں   بس کھٹا پتہ کھڑکا ہوگا
ساحل پہ خاموشی کیسی   کوئی سفینہ ڈوبا ہوگا

اب جناب شہاب جعفری نے اعلان فرمایا کہ جناب

ندا فاضلی کلام عطا فرما رہے ہیں۔ سنیے ظالم کیا داخلی شاعری کر رہا ہے ؎

بالوں کا لہرانا ہو یا رخساروں کے چاند
روپ وحشی میں ہر دم کوئی تیر کماں رہتا ہے
بات تمہاری اور ہے لیکن اس میں جھوٹ نہیں
ہر عورت کے دل میں کوئی مرد چھپا رہتا ہے
مہندی لگے ہاتھوں میں نوٹ کی کالج ۔ آنکھوں کی ہرن قید میں گھبراتے ہیں
روتے ہوئے بچے پہ نظر پڑتے ہی چولہے کی تانگے اُدھڑ جاتے ہیں

داد ہے کہ ریلوے اسٹیشن تک شور سنائی دے رہا ہوگا۔

اب ندا صاحب ایک نظم پگھلتا خواب سنا رہے ہیں۔ آپ بھی سنیے

سنا ہے میں نے
کئی دن سے تم پریشاں ہو — کسی خیال میں ہر وقت کھوئی رہتی ہو
گلی کے موڑ تک جاتی ہو لوٹ آتی ہو — کہیں کی چیز کہیں رکھ کے بھول جاتی ہو
کچن میں روز کوئی پیالی توڑ دیتی ہو — مسالے پیس کے سل پہ یونہی چھوڑ دیتی ہو
نصیحتوں سے خفا مشوروں سے اَن بن سی — [illegible]
یقین ہے تو بہت دور نہیں وہ گھڑی — ہر اک فسانہ کا عنوان بدل چکا ہوگا
مرے پلنگ کی چرچراہٹ گھٹ چکی ہوگی — تمہارے جسم کا سورج بکھر چکا ہوگا
سنا ہے میں نے کئی دن سے تم پریشاں ہو

اس نظم پر خوب داد دی گئی ہے اور اصرار کیا جا رہا ہے کہ ندا صاحب ایک نظم اور سنائیں۔ لیجیے وہ نظم پیش کر رہے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

وہ شوخ شوخ نظر سانولی سی اک لڑکی
جو روز میری گلی سے گزر کے جاتی ہے
سنا ہے وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کے تلاشِ بہار کرتی ہے
نہ کوئی میل، نہ کوئی لگاؤ ہے ۔ لیکن
نہ جانے کیوں بس اُسی وقت جب وہ آتی ہے
کچھ انتظار کی عادت سی ہو گئی ہے مجھے
اک اجنبی کی ضرورت سی ہو گئی ہے مجھے
مرے ورانڈے کے آگے یہ پھوس کا چھپر
گلی کے موڑ پہ کھڑا ہوا سا اک پتھر

یہ ایک جھکتی ہوئی بدنما سی نیم کی شاخ
اور اس پہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے کا نشاں
یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں
مرے الم میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں
میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یونہی گزرتی رہے
ادا و ناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

ندا صاحب داد و ستائش میں نہائے ہوئے خلیل تنویر صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ اب آپ اپنا کلام سنایئے۔ خلیل تنویر صاحب نے ایک نظم "پاگل" سنائی ہے۔ جس پر انھیں اچھی داد ملی ہے۔ اب انھوں نے "احساسِ جمال" کے عنوان سے دوسری نظم سنائی ہے اور اس پہ مناسب داد پائی ہے۔ اب اعلان ہوا ہے کہ جناب وحید اللہ خاں صاحب وحید چودھری کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ وحید صاحب کا مطلع سماعت فرمایئے

بندۂ عشق ہوں میں بندۂ بے دام نہ کر
جوہرِ ذاتیِ انساں کو بدنام نہ کر

ندا فاضلی نے بڑے اچھے الفاظ کے ساتھ جناب شفا گوالیاری سے درخواست کی ہے کہ اب وہ کلام سے شاد کام کریں۔ سنیے شفا صاحب اپنے مخصوص تحت اللفظ میں فرما رہے ہیں ؎

یاد اُن کی زندگیٔ مختصر کے ساتھ ہے
مرحبا منزل ہماری رہگزر کے ساتھ ہے
رہروِ گم کردہ منزل کا نہیں اتنا ملال
خیر اس کی مانگیے جو راہبر کے ساتھ ہے

داد و ستائش کی آوازوں میں ہی شفا صاحب فرما رہے ہیں ؎

خوفِ تشہیر، احترامِ حسن، خودداریٔ عشق
کشمکش کی ایک دنیا چشمِ تر کے ساتھ ہے
قافلے والے خبر تو لو کہ اپنا قافلہ
راہزن کے ساتھ ہے یا راہبر کے ساتھ ہے

داد ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے اور شفا صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؎ ہے زوالِ انسان کو [illegible]
[illegible]

شفا صاحب مائیک سے ہٹے تو قہقہوں کی چھاؤں تلے پروفیسر غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی صاحب مائیک پر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور نظم "بچوں کی پیدائش" سُنا کر وہ داد پائی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔ خدا خدا کر کے سامعین نے فرقت صاحب کو مائیک سے ہٹنے دیا تو ندا صاحب نے جناب ہاشم علی خاں راز جے پوری سے کلام سُنانے کی گزارش کی ہے۔ سنیئے راز صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جس کو دیکھو کہہ رہا ہے زندگی ناکام ہے
زندگی صحرا کی اک ڈھلتی ہوئی سی شام ہے
زندگی خود تو نہیں بنتی بگڑتی دوستو
زندگی پر کس لیے اتنا بڑا الزام ہے

یادِ ماضی کو کیا کہوں ہمدم بھولی بسری سی اک کہانی ہے
کل کی باتوں کو راز رہنے دو کل تو بچپن تھا اب جوانی ہے

راز صاحب قطعات پر اچھی طرح داد پا کر اپنی جگہ گئے تو امجد جودھ پوری کو مائیک پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے مائیک چھوڑا تو ندا صاحب نے حامد سعید خاں صاحب ساحل ٹونکی کو کلام سُنانے کی زحمت دی ہے۔ سنیئے ساحل صاحب کس قدر بہترین غزل عطا فرما رہے ہیں ؎

اس تیرگئ شامِ الم سے مفر تو ہو
وہ چاہے صبحِ نَو نہ ہو لیکن سحر تو ہو
منزل تو اتنی دُور نہیں راہرو۔ مگر
دل میں خلوصِ نیت عزمِ سفر تو ہو
اے ذوقِ سجدہ یہ تری غیرت کو کیا ہوا
سر جس جگہ جھکے وہ کوئی سنگِ در تو ہو
ہر چند لا علاج نہیں ہے مریضِ غم
لیکن مرض شناس کوئی چارہ گر تو ہو
ہر شب کے بعد ہوتی ہے رسماً سحر تو کیا
کوئی سحر ہماری برنگِ سحر تو ہو
ہر چند سازگار زمانہ نہ ہو مگر
ساحل گرہ میں اپنی متاعِ ہنر تو ہو

ساحل صاحب کے بعد پروفیسر شہاب جعفری کو نہایت اچھے ڈھنگ سے متعارف کرانے کے بعد ندا صاحب نے کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ شہاب صاحب نے ایک اچھی غزل سُنانے کے بعد اپنی مشہور نظم "سورج کا شہر" سنا کر خاصی داد پائی ہے۔ افسوس ہے کہ شہاب صاحب نے بارہا وعدہ فرمانے کے باوجود نظم اور غزل کی نقل مہیا نہیں کی۔ اب نقیب الشعراء یہ نویدِ جانفزا دے رہا ہے کہ صدرِ مشاعرہ حضرت اعجاز صدیقی کلامِ بلاغت نظام عطا فرما رہے ہیں۔ سنیئے ؎

لوگ کس ذرا تھوڑی دور یوں چل کر، ساتھ رہ جاتے ہیں!
ہم تو خود ہی رہبر تھے، خود ہی اپنی منزل تھے، جب قدم اُٹھائے ہیں
مے کشو ابھی تک تو بات صرف پہنچی ہے، رقصِ جام و مینا تک
اُن کا ذکر بھی چھیڑو، جو بمستِ نظر دل نے، میکدے بنائے ہیں
جذبہ و شوق کے مارے خلوتِ محبت تک، جب رواں دواں پہنچے
دھڑکنیں بڑھیں دل کی، سانس تیز تیز آئی، پاؤں لڑکھڑائے ہیں
ہم نقیبِ بیداری، جاگتے رہے ہشیار، نیند آ ہی جاتی ہے
عارضوں کی رنگت ہے، انکھڑیوں کا جادو ہے، گیسوؤں کے سائے ہیں
میکدہ جب اُنکا ہے، وضعِ مستی ان کی، احتیاط کیا جانے
جام خوب چھلکائے، مستیاں بکھیری ہیں، تم پہ خم لنڈھائے ہیں
ہم سے آنسوؤں میں بھی، دلکشی نہیں پیدا، روشنی نہیں پیدا
مسکرانے والے تو، دار کی بلندی پر جا کے مسکرائے ہیں
جو لبِ محبت پر آئے، اُس کو آنے دیں، احتیاط رہنے دیں
دل کی وارداتوں میں، آپ لفظ و معنی کی قید کیوں لگائے ہیں
دیکھنا فقط یہ ہے، ان میں اپنی رنگت ہے، ان میں اپنی خوشبو ہے
موسمِ بہاراں نے، پھول یوں تو کتنے ہی، باغ میں کھلائے ہیں
روشنی کے شیدائی، ہم بھی اور تم بھی ہو، فرق صرف اتنا ہے
تیرہ رہگذاروں میں، تم دیئے جلاتے ہو، ہم نے دل جلائے ہیں
ہر نفس ہے لرزیدہ، زندگی سے ہیں بیزار، مضطرب ہیں اعجاز
آج کل کی دُنیا میں، آدمی نہیں شاید، آدمی کے سائے ہیں!

صاحبِ صدر کو ہر شعر پہ داد جھولیاں بھر کر دی گئی ہے۔ اب دورِ اوّل تو ختم ہو چکا ہے اور سامعین ویسے ہی بیٹھے رہنا چاہتے ہیں کہ ابھی مشاعرہ جاری رہے۔ لہٰذا دیکھئے استاد صاحب

اپنے ہوش و حواس سنبھالے از خود ہی مائیک پر آکر بیٹھ گئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا نام اب نہیں پکارا جائے گا اور اپنا حال یہ ہے کہ شعر سُنانے کا موڈ ہی اب آیا ہے۔ اس کے بعد شاد صاحب نے دو دو شعر سُنائے ہیں کہ اہلِ ادب پورے مُدتوں یاد رکھیں گے اور ایمانداری کی بات بھی یہ ہے کہ شاد آج شعر سُنانے کے موڈ میں ہیں۔ پون گھنٹہ تک شاد صاحب کلام سُناتے رہے۔

اس کے بعد صاحبِ صدر نے مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان فرمادیا۔ ●●

غزل

۔ کُندن لال گرد ھر (بروالہ منڈی)

خام ہے ہر سجدہ تیرا، آستانِ یار پر
خم نہ ہو جب تک جبیں تیری صلیب و دار پر
شیخ اگر بخشے گئے، میکش بھی بخشے جائیں گے
فیضِ باراں تو ہے یکساں گلخن و گلزار پر
جس کی اک پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
پھول وہ اکثر کھلا کرتے ہیں شاخِ دار پر
کیا خبر تھی یوں بدل جائے گا آئینِ چمن
باغباں سے بڑھ کے حق گلچیں کا ہو گلزار پر
پیار کا مندر بھی اک، ان سے بنا سکتے ہیں ہم
جتنی اینٹیں چُن گئے۔ نفرت کی اس دیوار پر
بھر گئے تھے جس کی بُنیادوں میں وہ بارود کل
آج پرچمِ امن کا گاڑیں گے اس مینار پر
کل تھے مجرم کفر کے۔ ابلاغِ حق کے آج ہیں
ہر زماں میں حق رہا اپنا صلیب و دار پر
ترکِ اُلفت پر بھی دل میں یوں ہے کچھ یاد کی لو
جھلملائے جیسے دیپ اک موڑ کی دیوار پر
بندشیں ہیں خام خام۔ الفاظ بھی ہیں عام عام
داد کی اُمید گرد ھر۔ اور ان اشعار پر!

غزلیں

ڈاکٹر جے۔ سی۔ دریا ساگر قمر (ریواڑی)

خارزاروں کا مزا صحنِ گلستاں میں نہیں
لذتِ دردِ میسّر کبھی درماں میں نہیں
میری فطرت کسی بندش کی روادار نہیں
وحشت کا عیش مجھے ایواں میں نہیں
جلوۂ مہر تو پہلے ہی مقدّر میں نہ تھا
تابشِ شمع بھی اب شامِ غریباں میں نہیں
کاٹ کر پھینک دیے صدیوں کے غلامی کے نشاں
زور اتنا ابھی بازوئے دہقاں میں نہیں
بیٹھنا مل کے گوارا بھی نہیں آج ہمیں
بات حیوان میں باقی ہے جو انساں میں نہیں
جستجو تجھ کو ہے جس بابِ سکونِ دل کی
وہ غمِ زیست کے اوراقِ پریشاں میں نہیں
ہے جنوں خیز قمر آج زمانے کی ہوا
کون ہے چاک یہاں جس کے گریباں میں نہیں

•۔ قمر الیولوی۔ بی۔ اے۔ ۔ ۔ پال گھر

زہرِ غم روز پیے ہم نے بھی کوثر جیسے
رند مے شوق سے پی لیتے ہیں ہنس کر جیسے
عزم کی ضو سے چھٹے غم کے اندھیرے یارو!
صبح ہوتے ہی گئے رات کے منظر جیسے
بقعۂ نور بنا اپنی ضیا سے عالم
علم کی کان سے ہم نکلے ہیں گوہر جیسے
ہم بھی آلامِ جہاں ایسے اُٹھا لیتے ہیں
بوجھ ایوانوں کا بنیاد کے پتھر جیسے
جن میں احساسِ عمل کی نہیں تابش لوگو
لگتے ہیں وہ تو غریبوں کا مُقدر جیسے
رُوپ اپنا بھی بدلتا ہے قمر ایسے ہی
روز و شب اپنی بدلتے رہے چادر جیسے

دوسرا راستہ

(ڈاکٹر اُدے سرن ارمان بلاڑوی)

مُلّا رمضانی اور پنڈت درگا داس دونوں ہی اپنے اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق خدا کی عبادت کرتے تھے۔ مُلّا جی ہر روز نمازِ فجر سے پہلے ہی ٹائم پیس کے الارم کی آواز سنتے ہی بستر چھوڑ دیتے اور حاجاتِ ضروری سے فارغ ہو کر وضو کرتے اور اذان دیتے۔ اُدھر پنڈت جی بھور کا تارا دیکھ کر سنکھ پھونکتے اور مندر کی گھنٹیاں بجانے لگتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اذان اور مندر کے گھنٹے کی آوازیں گڈمڈ ہو جاتیں مگر مُلّا جی اور پنڈت جی دونوں نے خدائے واحد کے وجود کہہ اس اعلانِ حق کو ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کو کبھی بھی بُرا نہ مانا و لیے وہ اپنے طور پہ از خود یہ خیال رکھتے تھے کہ اذان یا مندر کے سنکھ یا گھنٹے کی آوازوں میں تھوڑا سا وقفہ رہے۔ مُلّا جی اور پنڈت درگا داس دونوں ہی سماجی طور پہ ایک دوسرے سے بہترین تعلقات رکھتے تھے یوں کہئے کہ ایک دوسرے کے لیے قربان ہوتے تھے۔ مگر آج حسبِ معمول مُلّا جی کی نیند نہ تو ٹائم پیس کے الارم سے کھلی اور نہ پنڈت جی کے سنکھ نے انھیں جگایا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ نے کانوں میں رس گھولا تو مُلّا جی گھبرا کے اُٹھے اور آنکھیں ملتے ہوئے ٹائم پیس کی طرف دیکھا تو اذان کا وقت نکل چکا تھا۔ انھیں یاد آیا کہ رات کو وہ الارم کی چابی بھرنا بھول گئے تھے۔

مُلّا جی وضو کے لیے پانی کا لوٹا ڈھونڈ رہے تھے کہ تبھی ایک کی بھیانک آواز فضا میں گونجی مُلّا جی یا اللہ خیر کہتے ہوئے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اور پانی کے لوٹے کی تلاش بھی دم سادھے ہوئے ’’ڈھائیں‘‘ کی آواز کی اہمیت پہ غور کرنے لگے۔ اُنھوں نے کھڑکی کے باہر جھانکا تو ساری بستی کے لوگ جاگ چکے تھے اور اس دہشت ناک آواز پر چہ میگوئیوں کی مختلف آوازیں انھیں سنائی دیں۔ کوئی اسے ٹائر کے بسٹ ہونے کی آواز بتا رہا تھا اور کوئی گولی چلنے کی بات کہہ رہا تھا۔

ابھی بستی کے لوگ یہ چہ میگوئیاں کر ہی رہے تھے کہ مندر سے کسی کی چیختے ہوئے آواز سنائی دی رتن میں مارا گیا۔ رتن اپنے باپ درگا داس کی آواز پہچانتے ہوئے۔ مندر کی طرف بھاگا اور جونہی وہ مندر کے اندر گیا ’’اُس کا باپ اس جہان سے جا چکا تھا۔ رتن نے روتے ہوئے کہا

’’میرے باپ کو ساونتی نے مارا ہے‘‘ تمام لوگ مندر میں جمع ہونے لگے تھے مُلّا جی بھی اپنے دوست کی موت کی خبر سُن کر اذان دینا بھول گئے اور وہیں پہنچ گئے۔

’’کیا تم نے ساونتی کو دیکھا ہے‘‘ ایک آدمی رتن سے سوال کر رہا تھا۔

’’آنکھوں سے تو نہیں دیکھا ہے پھر بھی میں سچ کہہ رہا ہوں یہ اُسی ظالم کا کام ہے‘‘ خود اعتمادی کے ساتھ رتن کہہ رہا تھا۔

’’تم کس بنا پر اُس کا نام لے رہے ہو‘‘ اس شخص نے پھر سوال کیا مُلّا جی بھی کھڑے چُپ چاپ یہ سب باتیں سُن رہے تھے۔ رتن کی ماں لاش پہ سر پٹک پٹک کر رو رہی تھی اور رتن کہہ رہا تھا ’’ساونتی بدمعاش ہے‘‘ جس دن وہ مُلّا جی کی بھینس کھول کر لیجا رہا تھا تو میرے پتا جی مندر کو جا رہے تھے۔ وہ ساونتی کو بھینس لیجاتے دیکھ کر ٹھٹھکے اور اُنھوں نے ساونتی کو مُنہ چھپائے ہوئے پہچان لیا تھا۔ اور کہا کہ ساونتی کسی کی بھینس لیجا رہے ہو ارے سانپ ہر جگہ ٹیڑھا چلتا ہے مگر اپنے بل میں تو سیدھا جاتا ہے ایسے کام کہیں باہر ہی کر لیا کرو کم سے کم بستی والوں کو تو بخش دیا کرو‘‘ پتا جی سیدھے سبھاؤ کے تھے نہ معلوم کیا کیا کہہ گئے

سادنتی نے بھینس تو چھوڑ دی مگر یہ کہتا ہوا چلا گیا " مجھے ٹوکنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا ہے پنڈت " اور آج تین ہی دن بیتے ہیں کہ اس نے اپنا کہا پورا کر دیا ۔ اس بستی میں میرے پتا جی کا کوئی دشمن نہیں ہے ۔ یہ خون اسی نے کیا ہے" رتن نے روتے ہوئے پورے وثوق سے کہا

" رتن تم صحیح کہتے ہو" ملا جی نے رتن کی حامی بھرتے ہوئے کہا " پنڈت جی کا قاتل سادنتی ہی ہے ہم اسکا پتہ لگانے میں پوری کوشش کریں گے اور اسے قانون کے حوالے ۔ بیٹے کر دیں گے

ملا چاچا اس کا پتہ تو پولیس بھی نہیں لگا سکتی ہے ۔ ایسے کہاں ڈھونڈیں گے وہ تو کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوگا ۔ رتن نے بدستور روتے ہوئے کہا

" ملا جی نے آہ بھرتے ہوئے کہا بیٹے نہ پاپ چھپتا ہے اور نہ پاپی ۔ ہر قاتل چور اور ڈاکو واردات کرتے ہوئے بدحواسی کے عالم میں کوئی نہ کوئی نشان ایسا چھوڑ جاتا ہے جس سے اس کی گرفتاری میں مدد ملتی ہے ۔

" ملا جی بستی والوں کو ساتھ لے کر مندر روانہ ہوئے ۔ ۔ ۔ بستی کے باہر وہاں سے ہر سبزہ کی طرف آئے اور دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے ۔ ۔ ۔ بھوسے ہر منڈیر پر ادھر سے نزدیک ۔ ۔ ۔ گھاس پر کسی جانے والے کے نقش پا صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں جو غمازی کر رہے ہیں کہ قاتل اس راستے سے گیا ہے ۔ تم لوگ اسی طرف جاؤ اور دیکھو کہ یہ نشان کہاں تک جاتے ہیں اور میں اس کے آنے کا راستہ تلاش کرتا ہوں ۔ یقین ہے کہ قاتل کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے یہ نشان ہماری بھرپور مدد کریں گے ۔ یہ کہتے ہوئے ملا جی دوسری طرف چلے گئے ابھی تک کوئی بھی کسان گاؤں سے باہر نکل کر اپنے کھیتوں پر نہیں گیا تھا ۔ مندر سے دوسری طرف ۔ ۔ ۔ سادنتی کے گاؤں کو جانے والے راستے پر آتے ہوئے قدموں کے نشان بھی صاف ۔ ۔ ۔ نظر آنے لگے تھے وہ اسی راستے سے آیا تھا وہ ظالم ملا جی ۔ ۔ ۔ دوسری طرف ۔ ۔ ۔ لوگ بھی پیروں کے نشانات دیکھتے دیکھتے ۔ ۔ ۔ تک پہنچ گئے ۔ ۔ ۔ ملا جی بھی کچھ ساتھیوں کو ۔ ۔ ۔ لوگ ۔ ۔ ۔ قریب ۔ ۔ ۔ سادنتی ۔ ۔ ۔

ہوا سب لوگوں کو اپنے طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ لوگ اس کی تلاش میں آئے ہیں ۔ جس سے اسے کچھ خطرہ دکھائی دیا اور وہ گھبرایا کہ اگر ان لوگوں نے قتل کے شک و شبہ میں اس کے گھر پر کچھ گڑبڑ کر دی تو مصیبت ہوگی مشتعل لوگ دماغی سوچ سمجھ کی بجائے وقتی جوش کے تحت ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی قانون کی پرواہ نہیں کرتے ۔ لہٰذا سادنتی نے فوراً ایک پانی کا لوٹا لیا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ رفع حاجت کے لیے جنگل کی طرف جا رہا ہے پناہ گاہ سے باہر نکلا اور سامنے ملا جی کو آتا دیکھ کر حیرت اور بھولے پن سے پوچھنے لگا ۔ ملا جی کیا بات ہے جو دن نکلتے ہی سب لوگ کہیں جا رہے ہیں ۔

" تم نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی" ؟ ملا جی نے کافی سختی سے کہا ۔

گولی ۔۔۔ کہاں چلی ؟"

" جہاں تم نے چلائی "

" کیا مطلب ؟"

" سادنتی تم پنڈت درگا داس پجاری کا قتل کر کے آئے ہو اور انجان بن رہے ہو اپنا چہرہ آئینے میں دیکھو کیا لکھا ہے یوں بھولا بننے سے کوئی بے گناہ نہیں بن جاتا ہے بھیڑ کی کھال میں چھپے بھیڑیئے " ملا جی نے اکڑ کر کہا

" ملا جی میں تو ابھی سو کر اٹھا ہوں اور جنگل پانی کو جا رہا ہوں اور آپ ہیں کہ بندر کی بلا طویلے کے سر منڈھ رہے ہو ایسا مذاق ٹھیک نہیں ہوتا "

تو اگر سونے سے اٹھ کر آ رہا ہے تو تیرے پاجامے کے پائنچے ۔ ۔ ۔ تر کیسے ہیں ؟

یہ سنتے اس نے پائنچوں کو ایسے دیکھا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو اور فوراً کہنے لگا ..... بیلوں کیلئے رات گھوٹا تھا اور بالٹی میں پانی بھرتے ہوئے پاجامے کے پائنچے بھیگ گئے ہیں "

" ٹھیک ہے اور کرتے پر سرسوں کے پیلے پھولوں کے نشان کہاں سے آ گئے کیا یہ نشان یہ ظاہر نہیں کرتے ۔ تم

کھیتوں کی منڈیروں پر بھاگتے ہو اور اوس سے بوجھل پھول پھل رہے ہو۔ اِدھر اُدھر سے منڈیروں پر جھکے ہوئے سرسوں کے پودے تمہارے دامن پر بار بار ٹکراتے رہے جس سے یہ نشان بنے ہیں اور پائنچے بھیگے ہیں" ملا جی کی بات سن کر ساونتی نے دامن کو بغور دیکھا اور جلدی سے صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "یہ تو کل شام کے نشان ہیں جب میرے بیل کھیتوں میں گھس گئے اور میں ان کے پیچھے بھاگتا رہا اور انھیں سرسوں کے کھیتوں سے باہر نکال کر اپنے گھر لایا" ساونتی کی یہ من گھڑت باتیں گاؤں والوں کو جھانسا نہ دے سکیں اور انھوں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے لوٹا چھین کر پھینک دیا اور اس کو پکڑ کر رتن کے پاس لے آئے "رتن یہ ہے تمھارے باپ کا قاتل" ملا جی نے ساونتی کو رتن کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ رتن کی ماں نے سورج مکھی کے مرجھائے ہوئے پھول کی طرح نظر اٹھا کر دیکھا۔ پل بھر کو اس نے دانتوں کو پیستے ہوئے اپنے شوہر کے [illegible] قاتل کو دیکھا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا مگر آن کی آن میں وہ ان طوفانی جذبات پر قابو پا گئی اور ہوش سے کام لیتے ہوئے اس نے سوچا کہ ساونتی سے اس کے خاوند کی جان چلی گئی اور اگر اب اس نے بدلے کی بھاونا سے قاتل کو قانون کے حوالے کر دیا تو ساونتی کے ساتھی اس کے اکلوتے بیٹے کی جان کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ وہ [illegible] سسک سسک کر رو دیتے ہوئے خاموش تھی۔ بستی کے لوگ رتن کی ماں کا رد عمل دیکھ رہے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ وہ کیا کہتی ہے۔ رتن کی ماں جب کچھ نہ بولی تو سب نے فرداً فرداً کہنا شروع کیا کہ اسے پولیس کے سپرد کر دیا جائے کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں" تاکہ آئندہ یہ ایسا بڑا کام کر ہی نہ سکے کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کی ایسی پٹائی کی جائے کہ مہینوں پڑا رہے۔ [illegible] اس کا منہ کالا کر کے اور گدھے پر بٹھا کر بستی میں گھمانے کی تجویز پیش کر رہا تھا کیونکہ بے عزتی سے بڑی کوئی سزا نہیں ہوتی۔

"نہیں نہیں [illegible] کوئی عزت نہ ہو اس کو تب [illegible] جائے گی اس کا [illegible]

"بالکل ٹھیک کہتے ہو" طیش میں سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ ساونتی کانپ رہا تھا اس کو ہر طرف موت دکھائی دے رہی تھی دل ہی دل میں اس نے بھگوان کے سامنے قسم کھائی کہ اب بڑا کام کبھی نہیں کرونگا۔ اگر ایشور نے آج اس کی جان بچا دی تو وہ زندگی کا دوسرا راستہ چن لے گا۔ سخت سردی کے باوجود وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ایکایک رتن کی ماں نے روتے ہوئے کہا "تم سب پاگل ہو" یہ سنتے ہی سب کے سب خاموش ہو گئے۔ رتن کی ماں [illegible] کی طرف دیکھنے [illegible] کر کے کیا مل جائے گا [illegible] کی طرح کوئی [illegible] اس کو بھی پولیس اسٹیشن سے جا کر چھڑا لائے گا۔ پولیس والے بھی ایسے لوگوں سے [illegible] جان تو ان کو بھی پیاری ہوتی ہے۔ [illegible] سے چھوٹ کر تم لوگوں کو چین سے نہیں رہنے دیگا اس کا قتل کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے اس کے مرنے کے بعد [illegible] بچوں کی بربادی ہو جائے گی اور اس کے چیلے چانٹے ہم سب کو تنگ کریں گے۔ بعد کو پولیس تم کو [illegible] کر کھا جائے گی۔ تمھاری کوئی سفارش بھی نہیں کرے گا اور نہ کوئی گواہی دینا چاہے گا [illegible] تم چھوٹ سکو [illegible] دنیا میں کوئی انصاف نہیں دیتا ہے اس لیے [illegible] اپنے اپنے گھر چلے جاؤ اور اسے [illegible] سزا دینے کی بجائے اس کا فیصلہ ایشور پر چھوڑ دو۔

ایشور خود اس کا [illegible] انسان [illegible] سب سے بڑی سزا تو وہ [illegible] اسکے [illegible] اپنے ہی دل میں اسکو دھتکار [illegible] لہذا اسے بھگوان کے نام پر چھوڑ دو [illegible] دشمنی [illegible] ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ دشمنی کے جذبات [illegible] دشمنی ختم ہوتی ہے لہذا اسے اس عدالت کے [illegible] سے بڑی عدالت ہے [illegible] خاموش نہیں [illegible] رتن کی ماں نے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے ساونتی سے نفرت کے لہجے میں کہا [illegible] بھگوان ہی ہمارا [illegible]

بستی کے لوگوں نے ہاتھ میں آئے ہوئے شکار کو بے دلی سے جانے دیا۔ کوئی غصّے میں کہہ رہا تھا کہ برہمن رحم دل ہوتے ہیں کسی کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نے کہا بے وقوف کہیں کے باپ کے قاتل کو یوں ہی چھوڑ دیا ارے جانڈے کو ہاتھ نہیں لگا سکے وہ باپ کے قاتل کو کیا ماریں گے۔ کچھ سمجھدار یہ کہہ رہے تھے کہ رتن کی ماں نے بڑی عقل مندی اور دور اندیشی سے کام لیا اور آئندہ کے لیے بدلہ در بدلہ کی بھاونا کو ختم کر کے رکھ دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ کسی دوسری قوم کا ہوتا تو اپنے باپ کی موت کا بدلہ فوراً لیتا بعد میں چاہے کچھ بھی ہوتا رہتا۔

رتن لوٹ آیا ہے۔ ایک بزرگ کہنے لگے — "تم نہیں جانتے ہو انھوں نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا ہے کسی کی جان لینے سے اسکو بخش دینا بہت بڑی بات ہے اس طرح وہ ان کا ہمدرد بن سکتا ہے۔" "محمد غوری کی کتنی بار جان بخشی کی تھی پرتھوی راج چوہان نے۔ محمد غوری نے کونسی ہمدردی کی تھی ان کے ساتھ۔" "مگر یہ ساونتی ہمدردی کرے گا رتن اور اس کی ماں کے ساتھ۔ میرے بھائی کیا دنیا میں سب محمد غوری ہی ہیں۔ والمیک بھی تو بدمعاش تھے لیکن دیکھو کیسے رشی منی بنے کوئی احسان فراموش نہ ہو تو مہربانی انسان کو انسان بنا دیتی ہے اور انسانیت کے جذبات جگا دیتی ہے۔"

اس طرح سب لوگ اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ ساونتی بھی روانہ ہو گیا لیکن وہ اپنے گھر کی بجائے سیدھا مندر میں گیا۔ ساونتی کو قتل کر کے اب کیا یہ خود پجاری بنے گا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ساونتی اب دوسرے راستے پر گامزن ہو گیا ہے اس کے بھگوان نے جس شرط پہ اس کی جان بخشی تھی اور اس کی موت ٹل گئی تھی، وہ اپنی قسم کو نبھانے کے لیے کمربستہ ہو گیا تھا۔ ساونتی کے دل میں اتنا وشواش ہو گیا کہ اس نے سارنگ پور کی اپنی ساری جائیداد فروخت کر دی اور سہارن پور میں جا بسا۔

ڈاکٹر [illegible] کے ہاں علاج کرانے کے بعد واپس آکر بستی کے [illegible] مریضوں نے بتایا کہ ساونتی نے ایک کھپریل کے

پاس ایک کنٹین چلا رکھی ہے جس کا نام ہے درگا کنٹین اور بورڈ پر دیوی درگا کی تصویر بنی ہوئی ہے اور وہ اپنے قول و فعل سے اپنی بدلی ہوئی زندگی کو درگا داس کا مرہونِ منت سمجھتا ہے۔ ●●

بقیہ صفحہ ۲۴ کا "ہاتھی کے دانت"

بہن نے سمجھا وہ مجھ سے مذاق کر رہی ہے۔

"نہیں بہن! میں سچ کہہ رہی ہوں یہ مرد بڑے ظالم ہیں وہ دوسروں کی بیویوں کو تو سوسائٹی میں تتلیوں کی طرح نئے نئے فیشنوں میں دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن اپنی بیوی کو سیدھی سادھی، سُگھڑ اور لاجونتی ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔۔۔ یہ لوگ تو ہاتھی کے دانت ہیں، کھانے کے اور، دکھانے کے اور!"

ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کرونا نے کہا۔

غزل

عبدالمالک محبوب گنگٹرا
ہزاری باغوی

وہ غمِ ہجر کی مانا کہ سزا دیتے ہیں
ایسے عالم میں بھی ہم اُن کو دعا دیتے ہیں
جب بھی رسوائی اُلفت کا کہیں ذکر چھڑا
جانے کیوں لوگ مرا نام بتا دیتے ہیں
اُن سے ملنے کی توقع ہے نہ اُمیدِ وصال
اور ہم فرقت میں خونِ دل کا بہا دیتے ہیں
محفلِ غیر میں ہم خون کے آنسو پی کر
اُن کی آمد پہ کوئی گیت سنا دیتے ہیں
اک تبسم پہ ہے موقوف میرے دل کا سکوں
یہ الگ بات تصور میں ہنسا دیتے ہیں
دل تو کیا چیز ہے محبوبؔ اب اُنکی خاطر
اُنکی ہر بات پہ ہم جان لٹا دیتے ہیں

ہاتھی کے دانت

داسو دیو ایم۔ اے

ہوسٹل میں داخل ہونے پر سب سے پہلے کروناہی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہماری وارڈن مس دھاآلے مجھے کرونا کے کمرہ میں لے گئی تھی۔

"مس کرونا! آج سے یہ تمہارے ساتھ رہیں گی"

مس دھاآلے نے اپنی عینک ناک پر ٹھیک کرتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

"یس میڈم!"

کرونا نے مس دھاآلے سے کہا۔

"دیکھو نو استقبال" مس دھاآلے نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میڈم! اب ہم نے یہ کام چھوڑ دیا ہے" کرونا نے مس دھاآلے کو یقین دلایا۔

مس دھاآلے چلی گئی۔ میرا سامان کرونا کے کمرے میں آ گیا۔ سامان ٹھیک ٹھاک کر کے میں چارپائی پر گر پڑی۔ گاڑی کے سفر کی تکان نے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ اس لیے میں تھوڑی دیر کے لیے سستانا چاہتی تھی۔ جب تک میں سامان ٹھیک کرتی رہی۔ کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ نیند مجھ پر غالب ہونا ہی چاہتی تھی کہ کرونا مجھ سے پہلی بار مخاطب ہوئی:

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شکنتلا ابرول!"

"کہاں سے آئی ہو ...؟"

"دلی سے!"

"دلی سے"؟ کیا وہاں بی۔ ٹی کا کوئی کالج نہیں ہے؟"

"نہیں، وہاں بی ایڈ کا ایک ہی کالج ہے۔ مجھے وہاں داخلہ نہیں مل سکا"

"کیا دلی میں ٹیچرز ٹریننگ کا ایک ہی کالج ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں تو ایسے کئی کالج ہیں"

کرونا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اسی لیے تو میں نے یہاں داخلہ لیا ہے" میں نے بات چیت کو طول نہیں دینا چاہا کیونکہ میں سو کر سفر کی تھکان دور کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے چپ چاپ، آنکھیں بند کر کے سو گئی ..... میں کتنی دیر تک سوتی رہی، یہ تو مجھے معلوم نہیں ... ! لیکن جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ میری چارپائی ہل رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو سب کچھ عیاں ہو گیا۔ لڑکیاں میری چارپائی کو اٹھائے ہوئے تھیں اور وہ زور زور سے چلا رہی تھیں:

"رام نام ست ہے!!"

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ایک لڑکی کی چوٹی زور سے پکڑ کر جھنجھوڑ دی۔

"ارے یہ تو زندہ ہو گئی!"

اس لڑکی نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ لڑکی کی بات سن کر دوسری لڑکیوں نے چارپائی کو زمین پر پٹک دیا اور میں دھڑام سے زمین پر آ گری۔

"ہم تو سمجھی تھیں کہ تم مر گئی ہو"

یہ کرونا کی آواز تھی۔

تبھی مجھے مس دھاآلے کے وہ الفاظ "نو استقبال" یاد آ گئے۔ اب میں سمجھی، ہوسٹل کی لڑکیاں میرا استقبال کر رہی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ کالجوں اور ہوسٹلوں میں نئے داخل ہونے والے لڑکوں اور لڑکیوں کا اس طرح سواگت ہوتا ہے۔ اگر میں ان پر حاوی نہ ہوئی تو یہ لڑکیاں میرا جلوس نکال دیں گی۔ اس لیے۔ میں نے ... کرتے ہوئے کرونا سے کہا۔

"ابھی تو میں زندہ ہوں"

"اچھا تو جلدی مرو......!" کرونا نے اسی شرارت آمیز انداز سے کہا۔

"ہاں اب مجھے مرنا ہی ہوگا میری جان!" اور یہ کہہ کر میں نے کرونا کا گال اس زور سے کاٹا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

"ارے میں مر گئی!" کرونا نے چیخ کر کہا۔

"تم کیوں مر رہی ہو میری جان! مر تو میں رہی ہوں!" میں نے ہنستے ہنستے کہا۔

کرونا کے حسین گال پر میرے کاٹنے سے جو کالا نشان پڑ گیا تھا اسے دیکھ کر دوسری لڑکیاں وہاں سے بھاگ گئیں جب میں اور کرونا وہاں رہ گئیں تو میں نے کرونا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:

"چلو پیاری، اب چلیں!"

میری بات سن کر کرونا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کے ساتھ اس کی آنکھوں سے [illegible] آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا کاٹنا [illegible] گیا ہے۔ اس کے گال کا داغ نشان بہت دنوں تک اسے میرے اس "مرنے" کی یاد دلاتا رہا۔

ایک ہی کلاس اور ایک ہی کمرے میں رہنے سے جلد ہی ہم دونوں میں بہناپا سا ہو گیا۔ کرونا کی دوستی پر میں خود حیران تھی۔ ہم دونوں کی عادات میں [illegible] تضاد تھا... میں آرام پسند اور خاموش طبع لڑکی تھی۔ میں آرام سے ایک کتاب لے کر اپنے کمرے میں بند ہو کر تمام دن گزارنے کو پسند کرتی تھی۔ اس کے برعکس کرونا کا کمرے میں بیٹھے رہنے سے دم گھٹ جاتا تھا وہ ایک منٹ بھی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

اس کی بوٹی بوٹی پارے کی طرح تھرکتی رہتی تھی۔ ہاں جس وقت وہ پڑھنے میں مشغول ہوتی تھی، بس اسی وقت وہ خاموش بیٹھتی تھی۔ لیکن جیسے ہی پڑھنے کا وقت ختم ہوا، اس کی چوکڑیاں شروع ہو گئیں۔ ہڈل کے ہر کمرے میں گھس جاتی تھی اور لڑکیوں سے ہنسی مذاق شروع کر دیتی۔

کرونا بہت نڈر اور بے باک لڑکی تھی۔ کالج کی ہر ایک سوسائٹی میں وہ شامل رہتی۔ وہ کلچرل سوسائٹی کی رکن تھی بحث مباحثہ سوسائٹی کی سیکریٹری تھی۔ کالج پارلیمنٹ کی وائس پریذیڈنٹ تھی۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ وہ پڑھائی میں بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ میرے لیے یہ دبلی پتلی سی حسین ناک نقشے والی لڑکی اس دنیا میں چلتا پھرتا عجوبہ تھی۔

ایک دن ہماری کلاس کی پکنک تھی۔ شہر سے کوئی دس، بارہ میل کے فاصلے پر ایک تاریخی جھرنا تھا۔ وہاں پر ہم سب لڑکے لڑکیاں اکٹھے ہوئے تھے۔

دوپہر کو پہنچ کے بعد ہم لڑکے لڑکیاں جھرنے کے ارد گرد کے تاریخی مقام دیکھنے گئے۔ جھرنے سے کچھ فاصلے پر ایک اونچا ٹیلا تھا۔ اسے منیر صاحب کا ٹیلا کہتے تھے۔ منیر صاحب نام کے ایک پہلوان تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اس ٹیلے پر ایک ہی سانس میں کم از کم پچاس بار چڑھتے اترتے تھے اور ایک ہزار ڈنڈ بیٹھک نکالتے تھے۔ یہ سب کچھ ہمیں ہمارے پروفیسر صاحب سنا رہے تھے۔ پروفیسر صاحب کی بات سن کر ایک لڑکا بولا:

"یہ تو بالکل گپ ہے!"

اس لڑکے کی بات سن کر پروفیسر صاحب بولے۔

"واقعی آپ ٹھیک کہتے ہیں، جو لڑکے سر کے بال بنانے اور منہ پر کریم پوڈر لگانے میں گھنٹوں صرف کر دیں اور کالج کی سیڑھیاں چڑھتے وقت ان کے کلیجے دھڑکنے لگیں، ان کے لیے یہ گپ نہیں، الف لیلہٰ کا قصہ ہے!"

پروفیسر صاحب کی باتیں سن کر کرونا بولی:

"واہ پروفیسر صاحب! آپ نے تو آج کل کے لڑکوں کی پول کھول کر رکھ دی ہے!"

کرونا کی بات سن کر لڑکیوں کے جھگڑے میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ لڑکیاں بھی تو لڑکوں کا ہر بات کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ آپ ہی ذرا اس ٹیلے پر ایک سانس میں چڑھ اتر کر دکھا دیں تو میں آپ کو چالیس روپے انعام دوں گا۔"

"منظور ہے!"

کرونا نے ٹیلے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"شرط یہ ہے کہ آپ کو ایک منٹ کے لیے بھی چوٹی پر رکنا نہیں ہوگا۔ بس ہاتھ لگا کر ایک دم واپس آنا ہوگا۔"

"ہاں یہ بھی منظور ہے۔"

یہ کہہ کر کرونا نے اپنے دوپٹے کو کمر سے باندھا اور ٹیلے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔

ہم سب کا خیال تھا کہ کرونا کو منہ کی کھانا پڑے گی، کرونا ٹیلے پر چڑھ رہی تھی اور اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں کو پاؤں کی ٹھوکروں سے نیچے کی طرف دھکیلتی جا رہی تھی۔ چوٹی پر پہونچ کر وہ مڑی اور اپنے دائیں ہاتھ کو وہ ہماری طرف ہلاتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔ جس وقت وہ نیچے پہنچی لڑکیوں نے آگے بڑھ کر اُسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ پروفیسر صاحب نے آگے بڑھ کر کرونا کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تم جیسی باہمت اور نڈر شاگرد پر ہمیشہ ناز رہے گا۔"

لڑکوں نے جب ایک لڑکی کو میدان مارتے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرے بڑی طرح لٹک گئے۔ لیکن کالج کے سالانہ کھیلوں کے دنوں میں تو کرونا نے کمال ہی کر دیا۔ وہ لڑکیوں کی طرف سے رسہ کشی کے مقابلے میں آنے کے لیے چیلنج دے آئی۔

جب لڑکیوں کو پتہ چلا تو سب سٹپٹا گئیں۔

لڑکیاں چاہے زندگی کے ہر ایک شعبے میں لڑکوں سے آگے نکل جائیں، لیکن جسمانی لحاظ سے وہ لڑکوں سے کمزور ہی رہیں گی۔ پھر لڑکوں سے رسہ کشی میں کیسے جیت سکتی ہیں۔ جہاں سارا دار و مدار ہی جسمانی طاقت پر منحصر تھا۔ رسہ کشی میں لڑکوں کو مات دینا ہمیں ٹیڑھی کھیر نظر آتی ایک کرونا ہی ایسی لڑکی تھی، جسے اپنی فتح پر یقین تھا

"تم گھبراؤ مت! ہمت دکھاؤ گی تو دیکھو گی کہ یہ لڑکے تمہارے قدموں میں پڑے لوٹ رہے ہوں گے" وہ ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہتی۔

لڑکیوں نے لڑکوں کو رسہ کشی میں چیلنج کیا ہے۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح دوسرے کالجوں میں پھیل گئی۔ مقابلے کے دن کھیل کے میدان میں تل رکھنے کو جگہ نہیں تھی چاروں طرف کالجوں کے لڑکے اور لڑکیوں سے میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب لڑکوں کی ٹیم میدان میں آئی تو لڑکوں نے خوب زور سے تالیاں بجائیں۔ جب ہماری ٹیم میدان میں آئی تو لڑکیوں نے ہپ ہپ ہُرے کے نعروں سے ہمارا استقبال کیا۔

مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کرونا ایک ایک لڑکی کے پاس جا کر کہنے لگی:

"ان لڑکوں کو دکھا دو کہ ہم لڑکیاں کسی طرح بھی ان سے کم نہیں ہیں۔"

مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں طرف سے زور آزمائی ہونے لگی، کبھی لڑکوں کا پلہ بھاری ہو جاتا اور کبھی لڑکیوں کا۔ کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد کرونا نے لڑکیوں کو للکارا اور آخری زور لگانے کو کہا ...... اور ایک جھٹکے میں لڑکیوں نے میدان مار لیا۔

چاروں طرف سے لڑکوں پر [illegible] لگنے لگے۔ کرونا کی گردن [illegible] فخر سے اٹھ [illegible]۔

——•——

سالانہ امتحان ختم ہونے اور [illegible] دن ختم آگیا [illegible] کو بچھڑنا پڑا۔ میں [illegible] آئی اور کرونا اپنے ماں باپ کے پاس بمبئی چلی گئی۔ بچھڑنے کے بعد ہماری خط و کتابت جاری رہی [illegible] آتے ہی مجھے ایک اسکول میں نوکری مل گئی، لیکن کرونا نوکری نہ کر سکی [illegible] کو ایک حادثہ پیش آگیا تھا [illegible] وہ ایک لمبے عرصے کے لیے بستر پر پڑ گئی تھیں۔ مجھے ابھی مشکل سے پانچ چھ مہینے نوکری کرتے ہوئے گزرے تھے۔ کہ پتا جی کی تبدیلی [illegible] ہو گئی [illegible] کی طرف سے ہم پوری پرائیویٹ کے منیجر [illegible] جا رہے تھے نوکری چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ تو بہت ہوا، لیکن میری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا...... کرونا سے میرا ملاپ [illegible] ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میں پھولے نہیں سما رہی تھی۔ میں نے پتا جی کی تبدیلی کے بارے میں کرونا کو کوئی خط نہیں لکھا، کیونکہ میں بمبئی پہونچ کر اچانک ہی کرونا کے سامنے آنا چاہتی تھی۔

بکرم پور پہونچ کر اپنے گھر کا سامان وغیرہ ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد ایک دن میں کرونا کے گھر جا پہنچی سب سے پہلے اس کی ماتا جی سے ملاقات ہوگئی۔ حادثے کے بعد اب ان کی صحت ٹھیک ہو رہی تھی۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

"کرونا اندر کے کمرے میں ہے ابھی بلاتی ہوں" کرونا کی ماتا جی نے کہا۔

"کرونا...... کرونا بیٹے ....! ذرا ادھر تو آؤ...... دیکھو کون آئی ہے۔۔۔" کرونا کی ماتا جی نے پکارا۔

کچھ دیر کے بعد کرونا کی جھلک دکھائی دی ..... وہ ساڑھی کے پلو سے سر کو ڈھانپے، آنکھیں نیچی کیے، چھوئی موئی لاجونتی سی بنی ہوئی اپنے تلے قدموں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"کرونا......"

میں نے پکارا

اس نے میری آواز سن کر آہستہ سے پلو کو اوپر اٹھایا "ارے شکنتلا تم ہو!"

یہ کہہ کر وہ ساڑھی کے پلو کو ایک طرف پھینک کر اور ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آکر مجھ سے لپٹ گئی۔

"تم ..... تم ...... یہاں! ...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں" اس نے خوش ہوتے ہوئے اور جوشِ مسرت سے مجھے بھینچتے ہوئے کہا۔

"پتا جی کا تبادلہ یہاں ہوگیا ہے، اب میں یہاں آگئی ہوں" میں نے بتایا۔

کرونا کی ماتا جی تھوڑی دیر تو ہمارے ساتھ باتیں کرتی رہیں پھر چائے وغیرہ کا انتظام کرنے اندر چلی گئیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کرونا سے پوچھا

"کرونا! ایک بات بتاؤ، جب تمہاری ماتا جی نے تمہیں پکارا تھا تو تم سر پہ ساڑھی کا پلو رکھے، نیچی نگاہ کیے بڑے پیے تلے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی تھیں... کیا تمہارے ماں باپ تم پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں....."

میری یہ بات سن کر کرونا ہنس پڑی۔

"یہ بات نہیں ہے شکنتلا! تم جانتی ہو کہ میری ماتا جی کی طبیعت پچھلے کئی مہینوں سے خراب چلی آرہی ہے اب انہیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ زیادہ دنوں زندہ نہیں رہیں گی اس لیے اب وہ اس فکر میں ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے میرے ہاتھ پیلے کردیں۔ شام کو مجھے کچھ لوگ دیکھنے آرہے تھے میں سمجھی تھی کہ وہ لوگ جلدی ہی آگئے ہیں"

"پھر اس طرح آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم تو اچھی پڑھی لکھی آزاد خیالات اور سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ جاننے والی لڑکی ہو..... پھر یہ چھوئی موئی بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہی اچھی باتیں تو میرے لیے عیب بن گئی ہیں۔... میری شکنتلا! میں اچھی پڑھی لکھی ہوں۔ آزاد خیالات کی ہوں، سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے، گھومنے پھرنے کا سلیقہ ہے کالج میں کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہوں۔ بحث مباحثوں میں کامیاب ہوتی رہی ہوں..... یہ سب خراب باتیں ہیں"

"کیا کہہ رہی ہو، جس آدمی کو ایسی خوبیوں کی لڑکی مل جائے، اسے اور کیا چاہیے؟"

میں نے حیران ہو کر کہا۔

"دو جگہوں پر میری بات بنتے بنتے اسی وجہ سے ختم ہوگئی ہے۔ انھیں جب پتہ چلا کہ میں آزاد خیالات کی لڑکی ہوں، سوسائٹی میں گھوم پھر سکتی ہوں، تو انھوں نے سمجھا کہ میں نئی تہذیب کی تتلی۔ پالتو مینا بن کر ان کا نام کیسے رٹ سکتی ہوں۔ وہ ڈر گئے کہ جب میں کالج کے کھیلوں میں حصہ لیتی رہی ہوں تو کہیں ان کے گھر کو کھیل کا میدان نہ بنا دوں۔... کالج میں جو لڑکی بحث مباحثوں میں انعام حاصل کر چکی ہو۔ کیا وہ اپنے شوہر سے بحث مباحثہ نہ کرے گی...۔ تم ہی بتاؤ، کون آدمی ایسی بیوی پسند کرے گا؟"

"چل چھوڑو ئی کہیں کی!"

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

ساجدہ فرحت

چکن کارن سوپ

وسطِ دسمبر کی ایک رات تھی۔

چاندنی کے طلسم نے لمحوں کو ساکت کر دیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ستاروں کا عکس تھا۔

زلفوں میں چمپا کی مہک۔

پروفیسر واسطی کی قربت اور دلکش آواز اس سحر آفریں ماحول کو اور بھی خوابناک بنا رہی تھی۔

وہ اپنی بیماری کی اذیت اور زندگی کے تمام تلخ حقائق کو وقتی طور پر فراموش کر چکی تھی۔

اچانک پروفیسر نے نہ جانے کیا کہہ دیا تھا۔

وہ چونک اُٹھی.... وہ شاید جنم جنم کے لیے اس کا ساتھ طلب کر رہا تھا.... دل کے پُرسکون دریا میں طغیانی آ گئی تھی حقیقت کا وہ سنگین آسیب جس سے وہ فرار حاصل کرنا چاہتی تھی، اپنی تمام تر ہیبت سمیت اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

نہیں... ! یہ خوشیاں، یہ شگفتگی، یہ لُطف.... یہ ماحول اس کے لیے نہیں تھا۔

محبت کی نرم آغوش کتنی پُرسکون تھی.... اور اُس کا رستہ کتنا پتھریلا تھا!

وہ پروفیسر کا ہاتھ جھٹک کر اندر ہال میں چلی آئی۔

―――〈:〉―――

اس نے تکلیف کی شدت سے ہونٹ بھینچ لیے اور بیزاری سے ٹیلی فون اٹھایا۔

پروفیسر واسطی گمبھیر آواز میں اُسے دفتر کے اوقات کے بعد ایک ساتھ کافی پینے کی دعوت دے رہا تھا۔

ڈوبتے ہوئے دل کو پروفیسر کی آواز کسی تنکے کی طرح سہارا دے گئی۔

اُسے نہ جانے کیا خیال آیا، فیصلہ کن انداز میں بولی،

"ہاں پروفیسر! میں تمہارے ساتھ آج کافی ضرور پیوں گی میں تمہیں پیرا ماؤنٹ بک شاپ کے باہر ملوں گی!"

"چار بجے....؟"

"ساڑھے چار، مجھے کچھ خریداری کرنی ہے!"

―――〈:〉―――

چیز سینڈوچ اور کافی سے لُطف اندوز ہونے کے بعد وہ گاڑی میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔

یہ اس کے دل میں اُسے کس فریب کی راہ پر ڈال دیا تھا... وہ خود سے بہت شرمندہ تھی۔

پروفیسر نے ایک نرسری کے قریب گاڑی روک دی سامنے ننھی ننھی بھوری چڑیاں گلاب کی شاخ پر جھول رہی تھیں۔ سرما کی ہلکی دھوپ میں تتلیاں رنگ رنگ کے پھولوں کو چومتی، اُڑتی پھر رہی تھیں۔

"سنو! انسان اگر صحت مند ہو اور ہر طرح کے فکر سے آزاد ہو تو چڑیوں کی چہچہاہٹ کتنی بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے۔"

سائرہ نے خالی خالی نظروں سے سامنے گاتی چہکتی چڑیوں کو دیکھا اور فوراً سر جھکا لیا۔

کاش! وہ بھی ایسا ہی ہلکا پھلکا وجود لیے گا سکتی، چہک سکتی ..... بقول پروفیسر... غم سے آزاد ہوتی...!

تب اس نے سوچا، کیوں نہ پروفیسر کو تمام حالات سے آگاہ کر دے.. اُسے یقین تھا کہ وہ اس کے لیے پُرخلوص جذبات رکھتا ہے۔

صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے اس مرد آہن نے اپنی دیانتداری ایمان داری، سچائی، حق گوئی اور بے باکی پر کسی طور بھی آنچ نہیں آنے دی اور اگر ڈاکٹر حکم چند نیر اکاڈمی سے علٰحدگی اختیار کر لیتے ہیں تو یہ اُتر پردیش اردو اکاڈمی کی یقیناً بدقسمتی ہوگی اور ہمیں ڈاکٹر عمار رضوی صاحب کی دُور رس نظروں میں صاف دکھائی دے رہا ہے کہ وہ اکاڈمی کی نگہبانی کے لئے ڈاکٹر محمود الٰہی اور ڈاکٹر حکم چند نیر جیسے باخبر نگہبانوں کی خدمات یقیناً حاصل کریں گے۔ ہم ڈاکٹر عمار رضوی سے یہ بھی گزارش کریں گے کہ وہ انتظامی کمیٹی کے ممبران کا انتخاب کرتے وقت بھی بیدار مغزی سے کام لیں گے۔ رشید حسن خاں اور صباح الدین عمر ایسے اردو کے حق میں تخریبی نظریہ رکھنے والے حضرات کو کسی ایسے ادارے کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دینا چاہئے جس کا تعلق اردو کی بقا و حیات سے ہو۔

اکاڈمی کے موجودہ سکریٹری جناب سرنواستو کو باخبر کرنے میں ہم کوئی برائی نہیں سمجھتے کہ انہیں انتہائی طور پر چوکنا اور چاق و چوبند رہنا ہوگا۔ اُتر پردیش اردو اکاڈمی کی یہ روایت ہمیشہ رہی ہے کہ عوام کے خط کا جواب قطعاً نہ دیا جائے یہاں تک کہ کاروباری اداروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اس اکاڈمی کی کتابوں کی فروختگی دس گُنا زیادہ بڑھ سکتی تھی اگر اکاڈمی کے ذمہ دار لوگوں نے کُتب فروش اور لائبریریوں کے خطوط کا جواب جلد دیا ہوتا اور کُتب کے آرڈرز کی سپلائی فوری طور پر عمل میں آتی۔ خانصاحب نے کسی حد تک اس روایت کو توڑا تھا مگر ان کے جاتے ہی پھر وہی معاملہ شروع ہو گیا ہے۔ دیا غضب ہے کہ ایک ماہ سے دیا گیا کتابوں کا آرڈر سپلائی نہ کیا جائے جب کہ کئی مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی گئی ہو اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ کسی خط کا جواب تک دیا جاتا۔ امید ہے کہ سرنواستو صاحب اس طرف ضروری توجہ دیں گے کہ خطوط کے جوابات متعلقہ شعبوں سے ہر روز دیئے جانے چاہئیں۔

مہاراشٹر اردو اکاڈمی کا چکبست سیمنار

اکثر اردو اکاڈمیاں عوامی روپیہ برباد کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی سیمنار کراتی رہتی ہیں جن کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ دوستوں کو مالی فائدہ پہنچایا جا سکے پچھلے دنوں مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے "چکبست سیمنار" کرایا تاکہ وہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک سکے کہ اردو اکاڈمی چکبست (ایک غیر مسلم) کی اردو خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے سیمنار کرا رہی ہے یہ سیمنار رشید حسن خاں صاحب کی صدارت میں ہوا اور رشید حسن خانصاحب کے متعلق اکثر اردو دانش وروں کا کہنا ہے کہ اگر انہیں اپنے والد محترم پر مقالہ پڑھنے کو کہا جائے تو بھی یہ اپنے والد صاحب کی خامیاں تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے کیوں کہ ان کا نظریہ ہمیشہ تخریبی رہا ہے لہذا انہوں نے حسب امید چکبست کی خامیوں کی قطار لگا دی اور یہاں تک فرمایا کہ جس طرح محمد حسین آزاد نے آب حیات میں جھوٹ و افترا کو اپنا طرۂ امتیاز بنایا ہے اسی طرح چکبست بھی جھوٹا تھا۔ چکبست کو حیات ثانیہ بخشنے والے ہیں جناب کالیداس گپتا رضا مگر انہیں اس سیمنار میں مدعو نہیں کیا گیا جبکہ وہ بمبئی میں ہی رہتے ہیں اور بُلایا گیا ان لوگوں کو جنہیں یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ چکبست کا سن پیدائش کیا ہے اور ان کا انتقال کس سن میں ہوا تھا آج چکبست پر کچھ کہنا جناب کالی داس گپتا رضا کی تصانیف و تالیفات متعلقہ چکبست کا مطالعہ کئے بغیر ناممکن ہے مگر مومنوں کے اجتماعات میں کسی کافر کو کیسے بلایا جا سکتا ہے خواجہ عبدالغفور صاحب سکریٹری مہاراشٹر اردو اکاڈمی سے اس قسم کے رویہ کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خواجہ عبدالغفور صاحب بھی یہ جانتے ہیں کہ اگر رضا صاحب اس سیمنار میں موجود ہوتے تو رشید حسن خاں کی چکبست مرحوم کے بارے میں بکواس محض کا منہ توڑ جواب دیتے۔

مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی

مدھیہ پردیش کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کے خطوط دفتر شان ہند میں موصول ہوتے رہتے ہیں کہ اکاڈمی ایسے ادیبوں کی تصانیف اور شعرا کے مجموعے شائع کرتی رہتی ہے جنہیں کوئی خریدتا ہی نہیں کیوں کہ اکاڈمی جن ادیبوں اور شعراء کی تخلیقات کو شائع کرنے کے لئے انتخاب کرتی ہے وہ انتخاب کرنے والوں

(بقیہ صفحہ ۳۶ پر)

رہے تھے۔ اس وقت کھلونے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے پر ایسی بھرپور توجہ حاصل تھی کہ وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ بچے ہر کام کس قدر انہماک سے کرتے ہیں۔ ارد گرد کے ماحول سے بے فکر ہو کر، پوری توجہ کے ساتھ یعنی بچے موجود لمحے کو بھرپور انصاف کے ساتھ برتتے ہیں۔ اور یہی تو بچپن کا حسن ہے، سحر ہے :

بچے صرف اس مقام کو جانتے ہیں، جس پر وہ کھڑے ہیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کی دہلیز کو پہچاننا نہیں جانتے۔

پھر اُسے یاد آیا، جب وہ اٹھارہ برس کی تھی تو "مستقبل" کسی حسین پیغام کا نام معلوم ہوتا تھا۔ کسی خواب کی طرح لگتا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے، لفظ وہی رہتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مفہوم بدلتا رہتا ہے۔

آج یہی لفظ اس کے لیے کس قدر بھیانک تھا، کتنی غیر یقینی کی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ اس کے کندھوں پر دو بچوں کا بوجھ تھا.... دو معصوم لاپرواہ بچوں کا بوجھ، جو نہیں جانتے تھے کہ جس دیوار کے سہارے وہ بیٹھے ہیں، وہ محض چند لمحوں کا آسرا ہے۔

—— :: ——

اس زمانہ غضنفر اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں لڈو دینے آیا تو وہ لب کھولتے کھولتے رہ گئی۔

"کیا بات ہے سائرہ! تم کچھ پریشان سی لگتی ہو؟" اُسے بار بار پہلو بدلتے دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"نہیں، کچھ نہیں.... تم چائے پیو نا، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" وہ آخر کیا کہتی اس سے۔

یہ بات نہیں تھی کہ وہ اپنی اَنا کے مجروح ہو جانے کے خیال سے خاموش ہو گئی ہو.... نہیں، ایسا تو نہیں تھا۔ یہ اَنا کیا چیز ہے، ماں تو سو بار اپنی جان بھی بچوں پر سے قربان کر سکتی ہے۔

در اصل سائرہ ان مجبوریوں سے واقف تھی جو اچھے سے اچھے انسان کے پیروں کی بیڑیاں بن جایا کرتی ہیں۔ اور بے چارے انسانوں کو خود اپنے معیاروں پر بھی پورا نہیں اترنے دیتیں۔

وہ خود چار بچوں کا باپ تھا۔ وہ کیوں کر اس سے کہتی کہ غضنفر تمہیں اس ایک آس کا واسطہ جو کبھی تم نے مجھ سے وابستہ کی تھی.... میرے دو پھول بھی اپنے گلشن کے پھولوں میں شامل کر لو.... آخر یہ پھول ہی تو ہیں، تمہارے معمول میں حائل تو نہیں ہوں گے، تمہارے گلستاں ہی کو مہکائیں گے نا؟"

اور ان سب باتوں سے حاصل بھی کیا ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ ایک بند مٹھی اور کھل جاتی۔ یہ دنیا بھی واستی کی طرح۔ جس کے جذبات کو سچا جان کر اس نے اپنے دل کا درد اس کے ساتھ بانٹنا چاہا تھا....!

اور جب غضنفر اٹھ کر چلا گیا تو اُسے یوں لگا، جیسے اُس نے آخری موقع بھی کھو دیا ہو....!

اُس رات وہ دل ہی دل میں رضوان سے خوب لڑی اُسے آخر کیا حق پہنچتا تھا کہ یوں عجلت میں اس کے ساتھ چھوڑ جائے۔ وہ بھی آخر کیوں اُٹھا۔ یہ اس کی ذمہ داری نہیں اُٹھے گا۔ اس سے رضوان کے فرائض کا بوجھ....!

اُسے اب محسوس ہوا کہ اس نے اتنے برس محض اپنی قوتِ ارادی کے سہارے گزار دیئے، ورنہ وہ تو اسی رات ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر گئی ہوتی، جس رات رضوان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہاں وہ اب محض اپنا سایہ ہی تو تھی۔

جب زندگی اور موت کا سنگم حدِ نگاہ میں آ جاتا ہے احساسات اور خیالات میں کتنی واضح تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

چیزوں کے مفہوم بدل جاتے ہیں...... جو چیزیں کبھی بہت اہم لگتی ہوں، وہ کس قدر بے معنی نظر آنے لگتی ہیں کہ جن باتوں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا، وہ بڑی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہیں۔

کل تک وہ کوڑی کوڑی جوڑ کر رکھتی تھی، زندگی کا سامان مہیا کرنے کے لیے .... اور آج ....!

اُس نے لمحہ بھر کے لیے فیصلہ کر لیا...... آج وہ اپنے بچوں کو شہر کے سب سے مشہور اور مہنگے ہوٹل میں کھانے کے لیے لے جائے گی۔ آج وہ ان کی بہت بڑی اور پرانی خواہش پوری کر دے گی، جو بظاہر کتنی معمولی سی تھی لیکن اُن کے لیے بہت اہم تھی...... اور جسے وہ آج تک ٹالتی رہی تھی۔

ٹینا کو مدت سے خواہش تھی کہ کسی ہوٹل میں جا کر چکن کارن سوپ کھایا جائے۔ منا بھی اس کی دیکھا دیکھی اکثر ضد کیا کرتا۔

گھر جاتے ہوئے اُس کی نگاہ اسی اسکول پر پڑی جس میں اُس نے کبھی ٹینا اور منے کو تعلیم دلوانے کا خواب دیکھا تھا۔

"کیا وہ اپنے بچوں کو بے سہارا چھوڑ کر چلی جائے گی؟" وہ سرتاپا لرز اٹھی۔

آئندہ ہفتے کے لیے سبزی اور گوشت خریدتے ہوئے اُس کے خیالات نہ جانے کہاں بھٹکنے لگے۔

"باجی! یہ کھیرے دیکھیں، کس قدر تازہ اور صحت مند ہیں، دو ہفتے تک ان کا کچھ نہیں بگڑے گا.... کفتر بڑے اور ٹلے لیں، مجھے پتہ ہے آپ کو بہت پسند ہیں اور یہ آلو..... !"

"نہیں بھیا! بس رہنے دو....!" وہ سوچنے لگی اتنا سب کچھ لے کر اُسے کیا کرنا ہے۔ نہ جانے آئندہ ہفتے تک گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ بچے ساتھ والے گھر میں ٹی وی دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔

مسز پروین رفیق کا مشفق چہرہ اُس کی نظروں میں گھوم گیا، وہ ہمیشہ بچوں کا بہت خیال رکھتی تھیں بچے اُسے بھی بڑی شفقت سے سمجھا یا کرتی تھیں۔ اُن کا وجود اُن کے لیے بہت غنیمت تھا.... مگر....!

پل دو پل کسی سے ہمدردی کرنے اور زندگی بھر کے لیے کسی کا سہارا بن جانے میں کتنا فرق تھا۔

وہ جانتی تھی... !

بچے اپنے سامنے بھاپ دیتے ہوئے چکن کارن سوپ کے پیالے رکھے کھی کھی کرتے ہوئے...... سوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے..... شرارتیں کر رہے تھے..... سوپ کی بوٹیاں چبا رہے تھے..... مسکرا رہے تھے.... چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے..... ارادہ تو ساجدہ کا بھی یہی تھا کہ آج کی شام وہ بچوں کیساتھ پُر مسرت انداز میں بسر کرے گی۔ کسی غم کو اپنے پاس نہ آنے دے گی... لیکن نہ جانے کیوں... سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش، جس کے سرہانے دو معصوم بچے کھڑے سسک رہے تھے، بار بار اُس کی آنکھوں میں دھند سمیٹ لاتی۔ اس نے سوچا، شاید دفتر سے کچھ لوگ افسوس کرنے آئیں... شاید مسز پروین رفیق کی آنکھوں میں آنسو آجائیں۔

"کیا کچھ بیمار تھی مرنے والی؟" کوئی پوچھ رہا ہوگا۔

"ابھی بیمار کہاں... اچھی بھلی، ہٹی کٹی تھی... روزانہ بن سنور کے دفتر جایا کرتی تھی" کہیں سے تیز سرگوشی ابھرے گی۔ (وہ زمانے کے تیور خوب جانتی تھی)۔ شاید کوئی اور بھنویں سکیڑ کر کہے:

"ابھی کل ہی تو میں نے اِسے رات گئے مال کے ایک مشہور ہوٹل سے بچوں سے نکلتے دیکھا ہے"

بچوں کی شوخ ہنسی اور معصوم حرکتوں نے اسے ایک بار پھر متوجہ کر لیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ ہوٹل کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور آتے جاتے ہوئے معزز لوگوں کی آن بان سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہیں تھے۔

بچپن کی اس انوکھی شان پر وہ رشک کیے بغیر نہ رہ سکی۔

وہ دونوں آس پاس کے ماحول قطعاً بے نیاز تھے۔ اُن کے پیشِ نظر فی الحال چکن کارن سوپ کے یہ بڑے بڑے پیالے ختم کرنے کے سوا کوئی اور مسئلہ نہ تھا۔ اُن کے لیے سوپ کے اس پیالے کے آگے سب کچھ بے رنگ تھا اور ہیچ بھی....! ●●

ادارہ شانِ ہند نئی دہلی کا عظیم رعایتی اعلان

ہمیں یقین ہے کہ

قارئین شانِ ہند اور اربابِ ذوق اس رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم ترویج زبان و ادب میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں ۔

اس اعلان سے جہاں ہمارا مقصد زبان و ادب کے شیدائیوں کے لیے معیاری ادب رعایتی قیمت پر فراہم کرنا ہے ۔ وہاں ایک بڑا پہلو یہ بھی ہے کہ نیا سال ۱۹۸۴ء شروع ہونے سے قبل قدیم اسٹاک ختم کر دیا جائے ۔

یہ اعلان صرف ۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء تک کے لیے ہے

- کم از کم بیس روپیہ قیمت کی کتب پر ۲۰٪ خصوصی رعایت
- بیس روپیہ سے زائد مگر چالیس روپیہ کی کتب پر ۲۵٪ خصوصی رعایت
- چالیس روپیہ سے زائد مگر پچاس روپیہ کی کتب پر ۳۰٪ خصوصی رعایت
- پچاس روپیہ سے زائد کی کتب کی خرید پر ۳۳ ۱/۳٪ خصوصی رعایت

محصول ڈاک بذمہ خریدار

آپ اس اعلان کے تحت مندرجہ ذیل کتب رعایتی قیمت پر منگوا سکتے ہیں

لمسِ دل (شعری مجموعہ) عامر سورتی ۔	۲۵/-
اسرارِ اقبال (منظوم ترجمہ اسرارِ خودی) حسین مہدی	۲۵/-
لمسِ تمنا (شعری مجموعہ) کمال جعفری	۱۵/-
آدھا آدمی (طنز و مزاح) فکر تونسوی	//
آخری کتاب (طنز و مزاح) //	//
اندازِ نظر (شعری مجموعہ) رتن پنڈوروی	۱۰/-
آئینہ (شعری مجموعہ) ارمان ادیبی	۱۰/-
ارمغانِ تاشقند (نظمیں) مختلف نامور شعراء	۴/۵۰
عرضِ نیازمند (غزلیات) اختر ذی شعور	۹/-
ادھورے خاکے (شعری مجموعہ) شرف کمال	۵/-
عنبریں (غزلیں) امیر الضیاء بیگم	۸/-
ارمغانِ کیرلا ایس ایم سرور	۱۶/۲۵
بوئے سمن (شعری مجموعہ) مسعودہ حیات	۲۰/-
بادۂ صافی (//) صوفی بانکوٹی	۱۵/-
باقیات اسلم حضرت اسلم لکھنوی	۲۰/-
برف کی آگ (شعری مجموعہ) عارف جمال	۵/-
بزم و رزم فطرت (نظمیں) شمس عظیم آبادی	۱۲/-

بادہ و جام (شعری مجموعہ) شارق میرٹھی	۳/۵۰
بکھر بکھیراں (//) اختر بستوی	۵/-
جراتِ معنی (فارسی غزلیں) معہ اردو ترجمہ رئیس نعمانی	۳/-
بہارستان (تذکرہ شعراء مع کلام) ساحر شائی	۳/-
بال و پر (طنز و مزاح) کنہیا لال کپور	۱۲/-
باقیات چاق (شعری مجموعہ) محمد عبد الباقی	۱/۵۰
چراغِ منزل (شعری مجموعہ) دواکر راہی	۲۵/-
چراغِ فکر (//) ابد سیمابی	۱۵/-
چراغ کے زخم (افسانے) ہرچرن چاولہ	۲۵/-
چاند کا زخم (ناول) شمس فرخ آبادی	۲/-
در بدر (شعری مجموعہ) پردین کمار اشک	۱۲/-
درپن (قطعات) مہیش چندر نقش	۱۰/-
فکریات (طنز و مزاح) فکر تونسوی	۱۷/-
فکرِ حسین (مضامین) ڈی ۔ اے ۔ ہرسین	۵/-
فاصلے (شعری مجموعہ) مدہوش بلگرامی	۲/۵۰
گلدستہ (پانچ کل ہند مشاعرے) انجمن فروغ ادب دہلی	۱۲/-
گل صد رنگ (بھرتری ہری کا ترجمہ)	۳/-

غالب کی باتیں		۱/۵۰
گردشِ رنگ (شعری مجموعہ)	ممتاز ہاشمی	۱۰/-
گمنام کوچے کی صدا (شعری مجموعہ)	شعیب راہی	۱۰/-
گلرنگ (شعری مجموعہ)	جمال قاسمی	۱۲/-
کلیات میر	ظل عباس عباسی	۵۲/-
قدیم ہندوستان کی تاریخ	رام شنکر ترپاٹھی	۲۷/۷۵
کلیات سراج	سراج اورنگ آبادی	۴۴/-
ہماری غذا	ایم۔ این۔ پوری	۱۲/-
ہوا اور پانی	ایم این پوری	۶/-
ہمارا آئین	صالح محمد نائب	۷/۵۰
بجلی کی کل	اے این طیش	۱۲/-
ہمارے سائنسداں	اندرجیت	۲۰/-
ہمارے قومی ہیرو	//	۱۵/-
نغمۂ روح (مختلف شعرا کی غزلیات)		۳۰/-
حسن عرفان	منظر تماپوری	۲/-
آج کا ہندوستان اور	حمید اللہ خاں	۱/۵۰
انتخاب کرشن موہن	کرشن موہن	۱۰/-
ابتدائی اردو	حکم چند نیر	۳/-
اقبال اور سید سلیمان ندوی	طاہر تونسوی	۲۰/-
امکان (شعری مجموعہ)	ساحرہ بیگم	۱۰/-
اسلام اور عصر جدید	عبدالحکیم ندوی	۴/-
جلتے قمقموں کی چیخ	احمد حسین شمس	۵/-
اسلام میں وطن کی اہمیت	نشاط احمد ندوی	۶/-
شاہنامہ ہند	سریہ کابری	۲۵/-
جلوۂ صد رنگ (مثنوی)	عبدالمجید شمس	۵/-
لمسِ اول (شعری مجموعہ)	علیم صبا نویدی	۵/۸۵
لہو رنگ (//)	جلیل الہ آبادی	۵/-
لالہ زار (//)	بدری پرشاد شنگلو	۱۵/-
اک چاند جھلکتا ہے (افسانے)	حسنیٰ اکبر	۱۲/-
ایک رات کا مہمان (افسانے)	جاوید رنگا	۱۰/
مسدس حالی	سریہ کابری	۱۰/
لختِ جگر (//)	جگر جالندھری	۱۰/۲۵
کمل کا مان کے (//)	کرشن موہن	۲۰/-
کالی دھرتی کی غزلیں (//)	آر صدیقی	۵/-
خوشبو کا کرب (//)	نکہت خاں	۵/-
کلام شوق (//)	لالہ چندر بھان	۱/-
کرن (//)	راجہ کرشن لال پرشاد	۱/-
کلیات اقبال (مکمل اردو ایڈیشن)	اقبال (عکسی)	۲۰/-
کلیات اعظم	اعظم جلال آبادی	۳۰/-
خلش	خاور دہلوی	۲۵/-
خود کلامی	اظہر عنایتی	۵/-
کاوش	کاشف اندوری	۱۲/-
کارواں خیالوں کے	نوبہار صابر	۶/-
ادبی تاثرات (مضامین)	ل۔ احمد اکبر آبادی	۱۸/۷۵
صبح و شام (افسانے)	//	۱۲/۵۰
زندگی کے کھیل (//)	//	۱۲/۵۰
ملاحظات نقی (//)	//	۷/۵۰
باقیات شہباز (طنزیہ نظمیں)	عبدالغفور شہباز	۲۵/-
ساگر	راجندر بہادر موج	۲۵/-
تجلیات قمر	جمال احمد صدیقی	۱۵/-
تذکرہ شعرائے ہریانہ	ڈاکٹر رانا گنوری	۴۰/-
منظر بہ منظر	منظر تماپوری	۱۵/-
سنگ بر آب	اقبال فہیم	۲۵/-
ہماچل کے آنچل سے	کرم چند مہاجن	۱۵/-
حالات شائع	//	۱۴/-
قصر جوش	جوش ادیب	۱۰/-
حرف زریں	اکرام کاوش	۱۰/-
زور سخن	زور آفاقی	۱۲/-
شب و روز	خاور نوری	۷/-
معراج حزن	معراج طارق	۱۰/-
بہار سیرت (حضور اکرم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی حیات طیبہ)	شاہ نواز اشرف	۲۵/-

رعنائیِ خیال	لانا گنوری	۱۵/-
گرداب	نسیم مظفر پوری	۱۲/-
قردعبیل	ابوالحبیب انصاری	۱۵/-
قلم کی کاشت	محمد عثمان عارف	۳۰/-
آتشِ گفتار	خورشید لکھنوی	۱۵/-
شرحِ آرزو	ہارون شامی	۲۰/-
جہانِ ادب (تذکرہ شعراء)	منزل لوہاکٹیری	۱۰/-
زاویہ ہائے نگاہ	ضیا فرخ آبادی	۲۰/-
نشیب و فراز	غمگین قریشی	۵/-
نوائے شوق	ناز مانکپوری	۱۵/-
نذرِ اقبال	آتش بہاولپوری	۱۰/-
لذ رسانہ	شمس بن گرامی	۲/۵۰
نغمۂ جمہور	کریمی الاحسانی	۸/-
نقار خانے میں	محمد عبد القادر ادیب	۱۵/-
نگار خانۂ سخن	عمر حیات	۱۰/-
رحیات	ریاست علی تاج	۱۰/-
رو نکہت	حیات وارثی	۴/-
م رنشاں	عظیم حیدر آبادی	۱۲/-
ج منظر	نظر برنی	۳/-
یاہدات عالم	راجے بریلوی	۷/-
لائف اینڈ ورک (اردو)	ہنری فورڈ	۱۰/-
اتیب احسن	ڈاکٹر عنوان چشتی	۲۰/-
اب تمنا	فطرت انصاری	۲۰/-
وزن خواب	حفیظ نعیمی	۱۰/-
نگوں کا صحرا	شبیر کانپوری	۵/-
رشنی	رشی پٹیالوی	۱۰/-
یاضِ نسیم	//	۸/-
اج محل (ڈرامہ)	اظہر علی فاروق	۲/۵۰

رنگِ حیات	مصور	۵/-
ساز و نیاز	ارمان ادیبی	۵/-
قلم کا سفر	دانش علیگڑھی	۵/-
پھول ان کی مسکانوں کے	رشی پٹیالوی	۱۰/-
پہلی دستک	شاغل نعمانی	۲/-
پیمانے کے چھلکے (طنز و مزاح)	نمر تونسوی	۱۵/-
پرتو جمہور	رشی پٹیالوی	۸/-
پیغام حیات	... لکھنوی	۳/-
پیکرِ خیال	اختر بستوی	۲/-
رضیہ کا شانہ) دستر خوان	رضیہ حسن دہلوی	۱۰/-
سحر و نغمہ	ساحر ہوشیار پوری	۲۰/-
تبصرے	کریمی الاحسانی	۲۰/-
اردو کا پہلا ڈرامہ	ڈاکٹر اخلاق اثر	۸/-
انتخاب تیر و نشتر	خوشتر گرامی	۱۸/-
شیشے کی چٹان	سراج انور	۳۰/-
کس نام سے پکاروں (ناول)	ہمدم	۲۰/-
انقلاب فرانس	متھاپن	۲۵/۵۰
آریہ سماج کی تاریخ	کشور سلطان	۱۰/۵۰
تاریخ جہانگیر	بینی پرشاد	۱۸/۷۵
تاریخ شاہجہاں	بنارسی پرشاد	۱۴/-
جنوبی ہند کی تاریخ	آر کے بھٹناگر	۲۲/-
حیدر علی	افتدار حسین صدیقی	۱۲/-
خلجی خاندان	کے ایس لال	۱۴/۵۰
کتاب کی تاریخ	شایاں قدوائی	۱۳/۵۰
تاریخ تحریک آزادی ہند	تارا چند	۲۰/۵۰
شیر شاہ اور اسکا عہد	کالکارنجن	۳۴/-
تاریخ فلسفہ اسلام	سید عابد حسین	۵/۵۰
شریمد بھگوت گیتا	حسن الدین احمد	۴/۷۵

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ ۱۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

(بلا انتخاب)

رشوت

ضمیر الدین ضمیر سالکی ادیبی بلاری

رنج و غم کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا مضمحل
جب نظر اٹھی کھڑی تھی اک حسینہ رُو برُو
غم نہ کر ہر غم ترے دل سے جُدا ہو جائے گا
میں نے جب پوچھا کہ اے دیوی بتا تو کون ہے
ہنس کے بولی کیا کہا مجھ کو نہیں پہچانتا
میرا چرچہ ہر جگہ ہر لب پہ میرا نام ہے
محکمہ تعلیم کا ہو یا حفاظت کا جناب
غیر سرکاری ہو یا سرکاری آفس ہو کوئی
ہیں مری جانب لگا ہیں آج خاص و عام کی
کام جائز ہو کہ ناجائز اگر ہے مجھ سے بیر
غیر ممکن بات کو ممکن بنا دیتی ہوں میں
مجھ کو اپنا کر بڑے آرام سے رہتے ہیں لوگ
نوّے فیصد آدمی میرے طلبگاروں میں ہیں
جن کو ہے مجھ سے محبت آج وہ خوشحال ہیں
ہر سحر ان کی سحر ہے شام اُن کی شام ہے
جو مخالف ہیں یہ انکا حال ہے ہر ماہ کا
میرے دم سے دوستوں کے گلستاں میں ہے بہار

جانے کیا کیا مجھ سے کہتا تھا مرا بیتاب دل
کہہ رہی تھی کیا ہوا بیٹھا ہے کیوں خاموش تو
مجھ سے سمجھوتہ اگر کر لے ہوا ہو جائے گا
میں نے پہچانا نہیں تجھ کو بھلا تو کون ہے
اس زمانہ میں بھی کیا مجھ کو نہیں پہچانتا
ارتقا کے دَور میں مرغوبِ خاص و عام ہے
شعبہ صحت کا ہو کوئی یا زراعت کا جناب
مختصر یہ ہے زمانے پہ ہوں میں چھائی ہوئی
پُوجا ہوتی ہے ہر اک دفتر میں میرے نام کی
مرحلہ طے ہو نہیں سکتا کوئی میرے بغیر
جرم نا کردہ کی بھی اکثر سزا دیتی ہوں میں
جو ہیں مجھ سے منحرف ناکام سے رہتے ہیں لوگ
باقی دس میں سے بھی کچھ میرے طرفداروں میں ہیں
جو مرے سائے میں ہیں دُنیا میں مالا مال ہیں
مختصر یہ ہے انھیں آرام ہی آرام ہے
ذکر کرتے جا بہ جا ملتے ہیں وہ تنخواہ کا
اب سمجھ میں آ گیا ہوگا مرا عزو وقار

دہر پہ چھایا ہوا رنگِ حقیقت ہے مرا
میں تعیش کی کلی ہوں نام رشوت ہے مرا

سچ کہا دیوی ہر اک دفتر پہ تیرا زور ہے
خوش ہیں وہ جتنے دلوں پہ رنگ تیرا جم گیا
کچھ سہی لیکن سکونِ قلب انھیں حاصل نہیں
لعنت ان پہ بھیجتا ہے ہر گھڑی ان کا ضمیر
یہ بھی سچ ہے وہ پریشاں ہیں جو ہیں تیرے خلاف
کس مپرسی ہے مگر حاصل سکونِ قلب ہے
جب سکوں انساں کو دے سکتا نہیں تیرا سرور
آ گیا میری سمجھ میں آ گیا تیرا وقار
نام رشوت ہے تیرا ہے خون تو مجبور کا
تیری ہستی کیا ہے دھبہ پستیِ کردار ہے

ماتحت پر زور ہے افسر پہ تیرا زور ہے
اب انھیں تنخواہ کی پرواہ نہ غمِ مہنگائی کا
یہ مرا دعویٰ ہے یہ دعویٰ مرا باطل نہیں
مطمئن ہونے نہیں دیتا کبھی ان کا ضمیر
زر سے خالی انکے داماں ہیں جو ہیں تیرے خلاف
مطمئن ہے ہر نظر حاصل سکونِ قلب ہے
پھر بھی تجھ کو اپنی بدمستی پہ ہے اتنا غرور
شہ رگِ انسانیت پر تو ہے تیغِ آبدار
وہ درندہ ہے جو پیتا ہے لہو مجبور کا
در حقیقت تو دلِ انسانیت پر بار ہے

نام ہے تیرا چلن لیکن بہت رُسوا ہے تو
یہ ... تو

اہمیتِ تسکین و تخنیق اور زحافاتِ صدر و ابتدا

ایس کے کوکب تلمیذ
سید القلم ناظم العروض حضرت علامہ سحر عشق آبادی (مرحوم)

شاعری کے لیے علمِ عروض سے واقفیت اس لیے ضروری ہے کہ اس سے وزنِ شعر کا تعین ہوتا ہے، حقیقی وزن اور تصرفات پسندیدہ و ناپسندیدہ کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علم کی بنیاد اصوات پر رکھی گئی اور اصوات کے مطابق ارکان وضع کیے گئے۔ ارکان سے بحور کی تشکیل کی گئی اور اصوات کے تنوع کے پیشِ نظر زحافات تراشے گئے۔ کچھ زحافات عام ٹھہرائے گئے جو بیت میں بلا تکلف ہر جگہ وارد ہو سکتے ہیں۔ کچھ زحافات بیت کے صدر و ابتدا اور کچھ عروض و ضرب سے مختص کر دیئے گئے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زحافات کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے، ان میں آسانی سے تخفیف ہو سکتی ہے لیکن اس شرط پر کہ ترک کیے جانے والے زحاف کی یا تو ضرورت ہی نہ ہو یا اس کا متبادل زحاف صفِ زحافات میں دستیاب ہو جو ترک کیے جانے والے زحاف سے پیدا ہونے والی کمی کو پورا کر سکے۔ اگر تخفیف اس شرط پر ہوتی ہے تو درست ہے ورنہ عروض کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہمارا عروض دنیا بھر کی زبانوں کے عروض سے اس لیے معتبر، وسیع اور جامع ہے کہ یہ طرح طرح کے زحافات سے آراستہ ہے جس کے سبب اس میں انتہائی وسعت آگئی ہے۔

ارکان سے متعلقہ زحافات کی وجہِ تخصیص یہ ہے کہ ان زحافات کا نام آتے ہی ذہن فوراً اس رکن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس سے یہ مخصوص ہیں۔ زحافات کی تخصیص بیت کے اجزا سے کیوں کی گئی ہے، اس بات پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ زحافاتِ تسکین و تخنیق کو سمجھ لیا جائے۔

تسکین: لغوی معنی ساکن کرنا۔ تعریف یہ ہے کہ سہ حرکاتِ متوالی سے درمیان کی حرکت کو ساکن کرنا۔ اس زحاف کے استعمال کی شرط یہ ہے کہ تینوں متوالی حرکات ایک ہی رکن میں واقع ہوں جیسے فَعِلُن، ف ع ل یہ تینوں حروف متحرک ہیں۔ زحافِ تسکین کے ذریعہ درمیان کی حرکت کو ساکن کر دیا جاتا ہے جب ع کو ساکن کیا تو فَعِلُن کی صورت فَعْلُن (بسکونِ عین) ہو گئی۔

تخنیق: لغوی معنی گلا گھونٹنا۔ تعریف یہ ہے کہ وتدِ مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ماقبل رکن کے حرفِ آخر متحرک سے پیوست کرنا جیسے مفعولُ مفاعلن میں وتدِ مجموع کے پہلے حرفِ متحرک یعنی مفا کے میم کو ساکن کیا اور ماقبل رکن کے آخری حرفِ متحرک سے پیوست کیا جس سے یہ صورت پیدا ہوئی مفعولم فاعلن جسے دستور کے مطابق مفعولن فاعلن میں تبدیل کر دیا۔

جیسا کہ تعریف سے ظاہر ہے دونوں زحافات کے عمل میں مماثلت ہوتے ہوئے بھی فرق ہے۔ اس لیے یہ دونوں زحافات الگ الگ بحروں سے مخصوص ہو گئے۔ دونوں زحافات چونکہ عروض میں وسعت لانے کے موجب ہیں لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی عروض سے نکالا نہیں جا سکتا۔

صدر و ابتدا سے زحافات کا مخصوص کرنا معقول وجوہ پر مبنی ہے۔ اگر صدر و ابتدا کے زحافات عام کر دیئے جائیں تو تخنیق کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے اور تخنیق ختم ہونے سے یہ اعتراض قائم رہتا ہے کہ جب ایک رکن میں واقع ہونے والے تین متحرکِ متوالی پر "تسکین" کا عمل ہو سکتا ہے تو دو ارکان میں واقع

بننے والے تین متحرک متوالی پر اس کا عمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تسکین اور تخنیق کے عمل میں فرق نہیں تو ایک طرح کے دو زحافات کا ہونا کیوں ضروری سمجھا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تخنیق سے یہ سہولت ہو گئی کہ تخنیق کا نام آتے ہی ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ عمل دو ارکان کے متحرک متوالی پر ہوا ہے جس میں پہلے رکن کا آخری حرف متحرک اور دوسرے رکن کا پہلا جزو وتد مجموع ہے۔ اس کے علاوہ یہ سہولت بھی ہو گئی کہ اظہار میں ایک رکن کا نام لینا ہی کافی ہو گیا۔

مثلاً فعولُ مفاعیلُن کو بذریعۂ زحاف تخنیق فعولُن مفعولُن بنا لینے پر مفعولُن کو سالم مخنق کہیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مفاعیلُن سے پہلے وارد ہونے والا رکن لازماً متحرک الآخر واقع ہوا ہے۔ تسکین میں ان دونوں ارکان کے نام لینے ضروری ہو جاتے ہیں یعنی فعولُن مفعولُن کو مقبوض و سالم مسکن کہنا پڑے گا۔

اس کے علاوہ ایک فرق اور ہے کہ صدر و ابتدا کے رکن پر تخنیق کا عمل نہیں ہوتا لیکن تسکین کا عمل صدر و ابتدا کے رکن پر ہوتا ہے۔

تسکین و تخنیق کی اہمیت بیان کرنے کے بعد ہم اُن زحافات کا ذکر کرتے ہیں جو صدر و ابتدا سے مخصوص ہیں۔

زحافات مفرد و مرکب مخصوص بہ صدر و ابتدا

خرم۔ یہ زحاف مفاعیلُن سے مخصوص ہے اس کے ذریعہ صدر و ابتدا میں وتد مجموع کی میم کو ساقط کر دیا جاتا ہے۔ جب مفا کا میم ساقط کیا تو فاعیلُن باقی رہا جسے اس کے متبادل ہم وزن رکن مفعولُن سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

ثلم۔ یہ زحاف فعولُن سے مخصوص ہے اس کے ذریعہ صدر و ابتدا میں وتد مجموع کی میم کو ساقط کر دیا جاتا ہے اور عولُن کو اس کے متبادل ہم وزن رکن فعلُن سے بدل دیا جاتا ہے۔

عضب۔ یہ زحاف مفاعلَتُن میں وارد ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ صدر و ابتدا میں وتد مجموع کا میم ساقط کر دیا جاتا ہے۔ فاعلَتُن کی جگہ اس کا متبادل ہم وزن رکن مفتعلُن رکھ دیا جاتا ہے۔

شتر۔ یہ زحاف قبض اور خرم کا مرکب ہے۔ زحاف قبض کے ذریعہ صدر و ابتدا میں مفاعیلُن کا پانچواں حرف یائے جو سبب خفیف کا ساکن ہے، ساقط کر دیا جاتا ہے، خرم کے ذریعہ وتد مجموع کے میم کو ساقط کر دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے فاعلُن حاصل ہوتا ہے۔

خرب۔ یہ زحاف کف و خرم کا مرکب ہے۔ کف کے ذریعہ مفاعیلُن کا ساتواں حرف نون جو سبب خفیف کا ساکن ہے، ساقط کر دیا جاتا ہے۔ نون کے سقوط کے بعد مفاعیلُ باقی رہا اس کا میم خرم کے ذریعہ ساقط کر دیا جاتا ہے۔ فاعیلُ باقی رہا جسے اس کے ہم وزن رکن مفعولُ سے بدل دیا جاتا ہے۔

ثرم۔ یہ زحاف قبض اور ثلم کا مرکب ہے۔ قبض کے ذریعہ فعولُن کا پانچواں حرف نون جو سبب خفیف کا ساکن ہے، ساقط کر دیا جاتا ہے۔ فعولُ رہا ثلم کے ذریعہ اس سے فا ساقط کر دی جاتی ہے۔ عولُ رہا جسے اس کے ہم وزن رکن فعلُ سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

چونکہ بحر وافر کا سالم رکن مفاعلَتُن معصوب ہونے پر مفاعیلُن بن جاتا ہے لہٰذا اس کو بحث میں شامل نہیں کیا جاتا۔ باقی صدر و ابتدا سے مخصوص زحافات پانچ رہ جاتے ہیں۔

زحافات خرم، خرب، شتر کا عمل بحر ہزج، بحر مضارع، بحر قریب، بحر مشاکل پر ہوتا ہے اور زحافات ثلم و ثرم کا عمل بحر متقارب اور بحر طویل پر ہوتا ہے۔

بعض عروضی کہتے ہیں کہ صدر و ابتدا سے مخصوص زحافات کو اگر عام کر دیا جائے تو عروض میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

ان لوگوں کا فرمان اگر مان بھی لیا جائے تو زحاف تخنیق بے کار ہو جاتا ہے اور تخنیق کے باعث جو وسعت و جامعیت عروض کو میسر ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔

ہم پہلے تخنیق کی خصوصیت اور اہمیت کو بیان کرتے ہیں اس کے بعد صدر و ابتدا سے مخصوص زحافات سے بحث کریں گے۔

ذیل میں بحر ہزج کا یہ وزن دیکھئے۔

بحرِ ہزج مکفوف مکفوف مکفوف محذوف۔

مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن
مکفوف مکفوف مکفوف محذوف

اِس مزاحف وزن کو جب بذریعۂ زحاف تخنیق پھیلایا جاتا ہے تو ہمارے سامنے مندرجہ ذیل صورتیں آتی ہیں۔

۱ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن (اصلی وزن)
۲ مفاعیلُ مفاعیلن مفعولن فعلن
۳ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیلن فعلن
۴ مفاعیلن مفعولن مفعولن فعلن
۵ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلُ فعولن
۶ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن فعلن
۷ مفاعیلُ مفاعیلن مفعولُ فعولن
۸ مفاعیلن مفعولن مفعولُ فعولن

اُن لوگوں کے قول کے مطابق جو تسبیغ کو عام کرنے کے حق میں ہیں۔ وزن نمبر ۳ دیکھئے۔
اِس وزن سے کوئی رباعی وزن اخذ نہیں ہو سکتا۔
رباعی کا یہ وزن دیکھئے۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع
اِس وزن سے بھی کوئی رباعی وزن حاصل نہیں ہوتا۔

بحرِ طویل کے اِس وزن کو دیکھئے۔
بحرِ طویل مثمن اثرم مکفوف مقبوض سالم۔

فعلُ مفاعیلُ فعولُ مفاعیلن
اثرم مکفوف مقبوض سالم

زحاف تخنیق کے عمل سے اِس وزن سے مندرجہ ذیل صورتیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ فعلُ مفاعیلُ فعولُ مفاعیلن (اصلی وزن)
۲۔ فعلن مفعولُ فعولُ مفاعیلن
۳۔ فعلن مفعولن فعلُ مفاعیلن
۴۔ فعلن مفعولن فعلن مفعولن
۵ فعلُ مفاعیلُ فعولن مفعولن
۶ فعلُ مفاعیلن فعلُ مفاعیلن
۷ فعلُ مفاعیلن فعلن مفعولن
۸۔ فعلن مفعولُ فعولن مفعولن

اُن لوگوں کے قول کے مطابق جو صدر و ابتدا کے زحافات کو عام کرنا چاہتے ہیں۔
وزن نمبر ۴۔ فعلن مفعولن فعلن مفعولن کو دیکھئے۔
اِس وزن سے کوئی رباعی وزن نہیں نکلتا۔ صدر و ابتدا سے مخصوص زحافات عام کرنے کی صورت میں عروض سمٹ کر رہ جاتا ہے۔

اب ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ کیوں صدر و ابتدا کے زحافات عام ہونے کی صورت میں بھی مختلف صورتوں کی سی صورتیں پیدا نہیں کرتے۔

بحرِ ہزج کا یہ وزن دیکھئے۔
بحرِ ہزج مثمن اخرب مکفوف مکفوف مجبوب۔

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعَل
اخرب مکفوف مکفوف مجبوب

خانہ نمبر ۱ میں اصلی وزن اور تخنیق کے ذریعہ نکلنے والی سات صورتوں میں سے دو رباعی صورتیں اور خانہ نمبر ۲ میں ایسی صورتیں جو زحافات مخصوص صدر و ابتدا کو فرضی طور پر عام کرنے کے بعد رقم کی جاتی ہیں۔

خانہ نمبر ۱۔ تخنیق کے عمل سے	خانہ نمبر ۲۔ فرضی زحافات کے عمل سے
۱۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعَل	۱۔ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعَل
اخرب مکفوف مکفوف مجبوب	اخرب مکفوف مکفوف مجبوب
۲۔ مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعَل	۲۔ مفعولن مفعولُ مفاعیلن فعَل
اخرب مکفوف مخنق مکفوف مجبوب	اخرم اخرب مکفوف مجبوب
۳۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع	۳۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع
اخرب مکفوف مخنق مکفوف مخنق مجبوب مخنق	اخرم اخرم اخرم مجبوب و مقطوع یا مجبوب و ازالہ

خانہ نمبر ۱ میں پہلا وزن اصل وزن ہے۔ دوسرا اور تیسرا رباعی ہے۔ تصدیق یہ ہے کہ صدر و ابتدا کی تینوں صورتیں اخرب حشو اوّل کی تینوں صورتیں مکفوف، حشو دوم کی تینوں صورتیں مکفوف اور عروض و ضرب کی تینوں صورتیں مجبوب ہیں مختصر یہ کہ زحافات کے اعتبار و لحاظ سے تینوں صورتیں یکساں ہیں۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے تو اصلی وزن اور مختلف ہونے کی صورت

[illegible] مکتوب الیہ

لندن ۲۸/نومبر ۱۹۸۳ء

محترم جناب سرور صاحب۔ آداب

ماہ جولائی کے شمارہ شانِ ہند میں (صفحہ ۸) کالم [illegible] کے آخری پیراگراف میں لکھا تھا۔

کہ جو شخص ناجائز روپیہ اور ناجائز بچہ [illegible] ہو وہ کوٹھی، کار اور پریس کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟

ناجائز روپیہ کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہونگا۔ ہاں ناجائز اولاد کے متعلق انسانیت کا احساس ضرور جاگ [illegible] ہے۔

میرا خیال ہے طوائف زادہ اور ناجائز اولاد [illegible] چیز ہے۔ اس موضوع پر میں اپنے سفرنامہ [illegible] میں تفصیلاً لکھ چکا ہوں۔ مختصراً عرض ہے کہ [illegible] میں ناجائز اولاد کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔

ان کو سوسائٹی میں اچھا مقام حاصل ہے [illegible] شریف زادے کسے۔

ناجائز اولاد یا طوائف زادے بے شمار [illegible] شخصیتوں میں سے ہیں۔ مثلاً [illegible] آزادی کے ساتھ ساتھ کچھ اچھی [illegible] ہیں۔

یہاں کے معاشرے میں کسی کو اس [illegible] ہے کہ آپ کون ہیں؟ یا کیسے پیدا ہوئے؟

دلچسپی اس میں ہے کہ آپ معاشرے کے [illegible] ہیں اور کیا کیا کام انجام دیئے؟ آپ کیا [illegible] ہیں جس سے معاشرے نے کچھ اچھائیاں یا نیکیاں [illegible] لیں۔ یا قوم و ملک کو کیا فائدہ پہنچایا؟

اب سوال یہ ہے۔ جائز اولادوں نے جو ناجائز کام کیے اور ناجائز اولادوں نے جو جائز کام کیے۔ [illegible]

کیا نہیں [illegible]

ان کے یہ کام اور عمل [illegible] جیتے ہیں یا دلوں کو [illegible] جائز کام اور عمل [illegible] کو نقصان پہنچائے۔ ناجائز اولادوں سے تو آپ اچھے اور نیک عمل کی توقع ہی نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ پہلے ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر یہ اکثر کام [illegible]

[illegible] شخصیتوں میں [illegible] ناجائز [illegible]

MR. [illegible]

MR. [illegible]

ABRAHAM LINCOLN

[illegible] F [illegible] ZA [illegible]

MR. [illegible] (۱۸۹۲) [illegible]

[illegible] SCANDY

[illegible] T [illegible]

[illegible]

[illegible]

LAWRANCE [illegible]

[illegible] نام [illegible]

[illegible]

معلوم ہونا چاہیے کہ تخنیق کا عمل حشویں اور عروض و ضرب
ے ارکان پر ہوتا ہے اور صدر و ابتدا کے رکن پر نہیں ہوتا
یہ جاننے کے لیے کہ صدر و ابتدا میں مفعولُن اخرب ہے
اخرم ہے، صدر و ابتدا کے زحافات کو صدر و ابتدا سے
مخصوص کر دیا گیا تاکہ یہ زحافات حشویں میں وارد ہونے
والے ارکان کو متاثر نہ کریں۔ اگر صدر و ابتدا کے زحافات
شو اول کے رکن پر اثر انداز ہوتے تو تمیز تخنیق و خرم ہو
ہی نہیں سکتی تھی۔

غزل

یوسف ثانی (پالی)

گھر میں اُن کے جو آئینہ ہوتا
آئینہ آپ کھو چکا ہوتا
ویسے ہی ٹوٹ کر ملے ہوتے
پھر سے دھوکے میں آگیا ہوتا
چاہتے دل سے چاہنے کی طرح
مارے خوشیوں کے مرگیا ہوتا
وار سیدھا جو تا تلو کرتے!
قتل آسان ہو گیا ہوتا
اُو اندھیروں میں جو بجھنے والو!
اک دیا تو جلا دیا ہوتا!
آپ کا کیا خیال ہے اس میں
سامنے اپنے آئینہ ہوتا
کوئی ثانی بھی آپ کا ہے یہاں
کاش کہ آپ کو پتا ہوتا

رباعیات

کامل آفریدی۔ بھٹہ بکھر

اُردو تیرے گیسو نہ بکھرنے دیں گے
آلام سے تجھ کو نہ گزرنے دیں گے
سامانِ ہلاکت ہیں بہر گام مگر
تجھ کو ترے عشاق نہ مرنے دیں گے

*

دل عزم کے پیکر سے سجا کر دیکھو
منزل کیلئے ٹھوکریں کھا کر دیکھو
قسمت کے اندھیروں میں بھٹکنے والو
تدبیر کی مشعل تو جلا کر دیکھو

*

سامانِ سکوں تو نہ کہیں پائے گا
ہر گام پہ اک مرحلہ پیش آئے گا
غیروں سے تو ممکن ہے کہ تو بچ جائے
اپنوں سے مگر بچ کے کہاں جائے گا

*

انسان کو ڈھونڈا تو وہ سایا نکلا
اپنا جسے سمجھا تھا پرایا نکلا
الفاظ بہت سب کی زباں پر آئے
مفہوم کو دیکھا تو کنایا نکلا

*

حق بات پہ انسان کبھی لب نہ سیے
تاریک فضا میں کبھی جلائے دیئے
ہر حال میں آنا ہے قضا کا برحق
جینا جو ہو منظور تو عزت سے جیے

بات نہیں ہے۔ یہی ان کی شخصی آزادی کا تباہ کن موڑ ہے۔

لیکن کہنا یہ ہے کہ انھیں معاشرے میں وہی مقام حاصل ہے جو عام آدمی کو ہے۔ اسکا نفسیاتی پہلو دیکھیے۔ بچے کا کیا قصور ؟۔

شیطان کے گھر میں اولیاؔ اور اولیاء کے گھر میں شیطان کیوں جنم لیتے ہیں۔؟ کیا مشرقی معاشرہ اس پر روشنی ڈال سکتا ہے ؟۔

ڈاکٹر اوڈمسے سن صاحب پتہ رکھتے ہوئے بھی لاپتہ رہے اور شرفِ ملاقات سے محروم رکھا۔ ان کو میرا سلام کہہ دیں۔

آپ کا ناچیز
ایس ایم عابد نقوی لندن

بمبئی یکم دسمبر ۸۳ء

محبِ محترم ۔ آپکے دو خط ملے تھے۔ آپ اس اثنا میں بیمار ہوکر صحت یاب بھی ہو گئے، اور میں دعائے صحت یابی کے لیے ہاتھ اُٹھاتا ہی رہ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کی بقائی پڑتال کو مرذش ہوتی ہے وہ ہماری مزاج پرسی کے بغیر بھی صحت یاب ہی رہتا ہے۔

خیال تھا کہ دسمبر میں مقالہ پڑھنے کے لیے (غالب انسٹیٹیوٹ) حاضر ہوں گا مگر اب نہیں آسکوں گا۔ معذرت۔

(کالی داس گپتا رضا)

غزل

اختر سعیدی ڈورنڈا۔ رانچی

یہی قسمت ملی یارو خُدا سے
سمندر سامنے اور ہم ہیں پیاسے
وفا کا وہ سبق دینے چلا ہے
جو خود واقف نہیں حرفِ وفا سے
دیئے چرکے پہ چرکے دوستوں نے
سبھی ہیں آشنا، نا آشنا سے
ابھی تو ابتدا اختؔر ہوئی ہے
ملوگے ایک دن تم انتہا سے

غزلیں

ڈی اے پرشین
قربان سہارنپور

عید ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۔

آئے تھے آپ عظمتِ اُلفت لیے ہوئے
قربانیوں کی عزت و حرمت لیے ہوئے
شیریں صدا و سازِ محبت لیے ہوئے
آئے تھے آپ اک نئی جنت لیے ہوئے
آئے ہمیں بچانے جہنم کی آگ سے
چرنی[1] میں ایک چشمۂ رحمت لیے ہوئے
ہم بیکسوں کا کرنے مداوائے بیکسی
ایمان کی وہ آگئے دولت لیے ہوئے
سب کی حیاتِ تیرہ کو پُر نور کر دیا
آئے تھے آپ شمعِ ہدایت لیے ہوئے
آئے وہ جس کو بادۂ عرفاں کی ہو طلب
سولی پہ ہے کوئی مئے وحدت لیے ہوئے
قربان یہ بھی ہو مگر یہ لطف ہے ناصری[2]
آیا ہے وہ بھی دید کی حسرت لیے ہوئے

۱۔ جانوروں کے چرنے کی ناند۔ جہاں حضرت مسیح کو بعدِ ولادت رکھا لیا۔

۲۔ حضرت مسیح کا لقب

● احمد رضا جمشید پوری

دیکھ نہ پائے کوئی چھپ کے تنہائی میں رو لیں گے
لیکن دل کا بھید نہ ہرگز اپنا کسی پہ کھولیں گے
تم یادوں سے چاہت کی کیوں آس لگائے بیٹھے ہو
یہ تو دولت کے میزانوں پہ پہلے چاہت کو تولیں گے
پھولوں کے بستر پہ سونا تم کو مبارک ہو لیکن
ہم تو کانٹوں کے بستر پہ آرام سے سو لیں گے
ہم بھی دیکھیں گے کب تک حق کو دبائیں گے جھوٹے
امرت کے پیالوں میں کب تک زہر یلا پل گھولیں گے

رباعی اوزان ہونے کی تصدیق ہوتی ہے ورنہ نہیں۔

خانہ نمبر ۱ دیکھئے۔ پہلے وزن کے صدر و ابتدا میں رکن اخرب آیا، دوسرے اور تیسرے وزن کے صدر و ابتدا میں ارکان اخرم ہوکر آئے۔ اسی طرح پہلے وزن کے حشو اول میں رکن مکفوف دوسرے کے حشو اول میں رکن اخرب اور تیسرے وزن کے حشو اول میں رکن اخرم ہوکر آیا۔ اسی طرح پہلے وزن کے حشو دوم میں رکن مکفوف، دوسرے وزن کے حشو دوم میں رکن مکفوف تیسرے وزن کے حشو دوم میں رکن اخرم ہوکر آیا۔

مختصر یہ کہ تینوں صورتیں زحافات کے اعتبار سے یکساں نہیں۔ لہٰذا اس تصرف کے باعث نہ پہلا وزن اصل وزن ہے نہ بعد کے اوزان رباعی ہیں۔

خانہ نمبر ۱ کے دوسرے وزن کو دیکھئے۔ حشو اول میں جو مفعولُ ہے وہ دراصل مفاعیلُ مکفوف ہے جس نے اپنا میم مخنق ہونے کے باعث ماقبل رکن مفعولُ کو دینے کے بعد اُسے مفعولُ سے مفعولن بنا دیا لیکن اُس کی اصل اخرب ہی ہے اور خود مفاعیلُ سے مفعولُ ہوا یعنی اخرب کی شکل تو اختیار کر لی لیکن اصل میں اخرب نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ارکان حشو و صدر و ابتدا نے تخنیق کے باعث صورتیں تو تبدیل کر لیں لیکن اصلیت تبدیل نہیں کی۔

یہ نازک ـــــ ہے غور کیجیے۔

اگر یہ مفاعیلُ مکفوف تخنیق کے باعث اپنا میم ماقبل رکن مفعولُ، خرب بشکل مفعولن کو نہ دیتا اور اسے گرا دیتا (جیسے برعکس خانہ نمبر ۲ وزن نمبر ۲ کے صدر و ابتدا و حشو اول میں ہوا) تو اس مفاعیلُ کا ماقبل رکن مفعولُ سے مفعولن نہ ہوتا جیسے آپ کے سامنے ہے۔ یہاں التزام یہ ہے کہ حشو کے وتد مجموع سے میم اُسی صورت میں ماقبل رکن سے شرکت کرنے گا جب ماقبل رکن کا آخری حرف متحرک ہوگا ورنہ نہیں۔ یہ کمالِ تخنیق ہے کہ اس عمل سے مخنق رکن اور ماقبل رکن کی صورتیں بظاہر تو تبدیل ہو جاتی ہیں لیکن مجموعی طور پر توازنِ وزن اور وسعت بحر قائم رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے رباعی اوزان تشکیل پاتے ہیں۔

خانہ نمبر ۲ وزن نمبر ۲ دیکھئے۔ حشو اول میں مفعولُ اخرب ہے اور ماقبل رکن مفعولن اخرم ہے۔ یہاں وہ پابندی نہیں کہ حشو اول میں جب مفعولُ ہوگا تو ماقبل رکن لازماً مفعولن ہوگا اور جب حشو اول میں مفاعیلُ ہوگا تو ماقبل رکن مفعولُ ہوگا۔ جب یہ التزام، جو برعکس خانہ ۲ وزن میں تخنیق کے باعث ہے، یہاں نہیں تو حشو اول میں مفاعیلُ اور صدر و ابتدا میں مفعولن، حشو دوم میں مفاعیلن اور عروض و ضرب میں فعلٌ، حشو دوم میں مفعولن اور حشو اول میں مفعولُ لائے جا سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ زحاف ارکان کو متاثر کرنے میں آزاد ہیں اور کسی قاعدہ کے تحت وارد نہیں ہوتے تو ان حالات میں نہ تو توازنِ اوزان برقرار رہ سکتا ہے اور نہ باہمی مطابقت قائم رہتی ہے یہی وجوہ ہیں کہ فرضی زحافات سے تخنیق تخنیق نہیں ہوتی اور رباعی اوزان تشکیل نہیں پاتے۔

خانہ نمبر ۱ وزن نمبر ۳ دیکھئے۔ زحاف تخنیق ... کے باعث حشو میں اور عروض و ضرب کے ارکان مفاعیلُ مفاعیلُ فعلُ نے اپنے اوتاد کے پہلے حروف ترتیب کے ساتھ ماقبل ارکان کو سونپ دیے نتیجے کے طور پر صدر و ابتدا اور حشو میں کے ارکان مفعولن ہوگئے۔ عروض و ضرب میں فعلُ مجبوب فع ہو ف، ماقبل رکن کو دینے کے بعد فع کی شکل اختیار کر لی یعنی تمام ارکان زحاف تخنیق سے مزاحف ہونے کے بعد بھی اصل وزن کی زد میں داخل رہے۔

خانہ نمبر ۲ وزن نمبر ۳ دیکھئے۔ پہلے تینوں ارکان اخرم آئے اور آخری رکن میں چونکہ زحاف جب کا عمل رکن کے آخری حصہ پر ہوا اور خرم یا قطع کا عمل رکن کے پہلے حصہ پر ہوا جس کے باعث اصل رکن مفاعیلن مزاحف ہوکر فع کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں برعکس صورت کی سی صورت ہی نہیں لہٰذا رباعی اوزان تشکیل نہیں پاتے نہ ہی رباعی کے اوزان نکلنے کی صورت نکلتی ہے۔

یہ ہے تخنیق اور فرضی زحافات کی خصوصیت میں فرق جو بیان کیا گیا اسی لیے صدر و ابتدا سے مخصوص زحافات کی تخصیص برحق ہے۔

لیکن اس کا دماغ اُسے ہٹ دھری سے یہی مشورہ دیتا رہا کہ وہ اِس ڈرامے کو جاری رکھے۔ اس کی پیش کش کو قبول کرلے .... پروفیسر کو سب کچھ بتا کر اپنی پیشکش سے پھرنے کا موقع ہرگز نہ دے ۔ اُسے اُس کے بچّوں کو اس سے بہتر سہارا نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو وہ آخر کب تک آندھیوں سے بچا سکتی تھی۔ لیکن اس طرح اس کے بچوں کا کوئی ٹھکانہ تو ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ اُس کی محبت بھری باتوں کے جواب میں اس پر مسکراہٹیں نچھاور کرتی رہی۔ غم کے طوفاں کو دبائے، درد اور اذیت کو سینے میں بھینچے .... اخلاص کے جواب میں فریب سے کام لیتی رہی ۔

وہ دفتر سے آئی۔ تھکن اور اضمحلال سے بُرا حال تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے، چہرہ زرد تھا، سانس اُکھڑی ہوئی تھی۔ بچوں کو بلایا باری باری دونوں کو گلے لگایا۔ وہ حیرت سے اُسے تکنے لگا۔

”شنو ٹینا! جب میں نہیں ہوتی .... تو .... تو تم کیا کرتی ہو ....؟“

”گڈے سے کھیلتی ہوں، آنٹی پروین کے گھر ٹی وی دیکھتی ہوں۔“

”اور اگر .... اگر آنٹی پروین بھی نہ ہوں .... اگر .... اگر .... کوئی بھی نہ ہو .... ٹی وی بھی نہ ہو .... گھر بھی نہ ہو .... تم دونوں کیا کروگے .... کہاں جاؤ گے؟“ وہ دونوں کو بانہوں میں لیے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی ۔

”سائرہ چلو آج کہیں باہر چل کر کھانا کھائیں۔“ عاطف نے دفتر سے اُٹھتے ہوئے فراخدلی سے پیش کش کی۔

”نہیں، عاطف! میں معافی چاہتی ہوں۔ میں نہ جا سکوں گی۔ مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔“

انکار کی تلخی نے عاطف کے دل میں نفرت کی آگ بھر دی۔ اُس کی نظریں بے ساختہ کہہ اٹھیں!

”ہاں، ہاں! مجھے معلوم ہے، تم جیسی عورتوں کے ضروری کام کیا ہوا کرتے ہیں۔“

اس خاموش طنز پر اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ فائلیں قرینے سے الماری میں رکھ کر، پنسلیں اور قلم وغیرہ دراز میں بند کرکے چابی بیگ میں ڈالتی ہوئی باہر چلی آئی .....

تھکے تھکے قدم، ٹوٹتا ہوا جسم، نظر جھکائے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی کہ سامنے سے آتی ہوئی ٹینا کی ایک اُستانی نے اُسے سلام کرکے چونکا دیا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے دریافت کیا۔

”اچھی ہوں .... کیسی مسز رضوان! ٹینا اتنی پیاری بچی ہے کہ میں آپ سے کیا کہوں، کسی بچے کو آگے نکلنے ہی نہیں دیتی۔ اور ہمیشہ اس قدر صاف ستھری اور سمارٹ نظر آتی ہے۔ آپ کا بیٹا بھی تو کتنا پیارا ہے۔“

اُستانی رشک بھری آنکھوں سے سائرہ کے رسیلے ہونٹوں، اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھوں، اس کے حسین جسم اور سلیقے سے سلے ہوئے لباس کو دیکھنے لگی۔ وہ سلام کرکے آگے بڑھ گئی، لیکن اُسے اب بھی یوں لگ رہا تھا جیسے اُستانی کی نگاہیں حسرت سے کہہ رہی ہوں:

”تم کتنی خوش قسمت ہو!“

سائرہ ڈاکٹر انصاری کے کلینک سے لوٹی تو اُمید کا آخری دیا بھی گل ہو چکا تھا۔ دل اور نگاہوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

اُسے کچھ عرصہ سے چھاتی کا کینسر تھا اور اب یہ موذی مرض اپنی جڑیں اس قدر پھیلا چکا تھا کہ اس کی روک تھام کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یہ ایک ایسا ناسور تھا، جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”ہونہہ!“ اس نے بیزاری سے سوچا۔

”کیا چھاتی میں پلنے والا یہ ناسور میرے دل کے ناسور سے بھی زیادہ بڑا ہے؟“

بچے اس کے سامنے قالین پر بیٹھے ٹرین سے کھیل

"کیا کسی سے پیار کرنا انسان بننے کی کوشش نہیں ہوتی ہے؟" کیلاش نے کہا۔ میں نے اُسے سمجھایا "انسان وہی ہوتا ہے جو دھرم کو نبھاتا ہے کیلاش اور دھرم اسے کہتے ہیں جہاں انسان کے اعمال میں شرم، تکلف اور جھوٹ نہ ہو۔"
یہ سُنتے ہی اس نے میرے پاؤں پر سر جھکا دیا اور ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے کہنے لگا "تم مجھے اندھا اور بے دین ہی سمجھ لو"۔ میں چاہتی تو اس کو دھکے دے کر کمرے سے باہر نکال سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ میں سمجھ گئی تھی کہ کیلاش نے تمام تکلفات اور سارے ادب کو ختم کر دیا ہے اور ایسے میں آدمی اکثر پاگل ہو جاتا ہے اور پاگل سب کچھ کر سکتا ہے اس لئے میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور شور مچانا یا احتجاج کرنا مناسب نہ سمجھا اور سماج اور پڑوسیوں میں بدنام ہو کر جینے سے خود کو بچا لیا یہاں ایک ضرب المثل نے میرا ساتھ دیا کہ بھگوان کے مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اس کے سچے پیار ہمدردی اور عشق نے میرا دل جیت لیا مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ عورت پیار سے جیتی جا سکتی ہے۔
کیلاش رات بھر شمع پر پروانہ وار قربان ہوتا رہا اور صبح ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پہلی بار رشوت لینے والے آفیسر کی طرح دن بھر جھجکی جھینپی گھر کا کام کاج کرتی رہی دو چار دنوں میں ہی میری جھینپ جھجک ختم ہو گئی اور میں کیلاش کے بہت زیادہ قریب ہوتی گئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد میں حاملہ ہو گئی اور نو ماہ بعد میں ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔ زچہ پن میں کیلاش نے میری اتنی خدمت کی کہ کیا کوئی ساس ننند کرے گی۔ احسان کتنا بھاری ہوتا ہے یہ مجھے اب پتہ چلا۔ کچھ لوگ ہم دونوں کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے مگر میرے شوہر کو کیلاش کی طرف سے کوئی شک و شبہ نہیں تھا جس کی وجہ سے مجھے سماج کا کوئی خوف نہیں تھا اس طرح مجھے چار سال میں تین لڑکے پیدا ہوتے۔ ایک دن میں نے کیلاش سے کہا کہ "تم اپنا بیاہ کروا لو ایسے کب تک چلے گا"، تو اس نے جواب دیا، "جب تک تم یہاں ہو تب تک یوں ہی چلتا رہے گا۔ شادی کرنے سے مجھے کچھ سُکھ ضرور ملے گا لیکن دُکھ زیادہ ہوگا اس لئے کچھ دن اور سُکھ شانتی کا لُطف اٹھا لینے دو"، کیلاش کے ان الفاظ کی حقیقت کو ہر شادی شدہ سمجھ سکتا ہے ایک دن اچانک میرا بڑا لڑکا بیمار پڑ گیا اور میں اسے لیڈی ڈاکٹر سبھر وال کے پاس لے گئی ڈاکٹر۔ وکیل اور بدمعاش کی نظر اور عقل بہت تیز ہوتی ہے انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
"یہ تمہارا بچہ ہے؟"
"جی ہاں یہ میرا ہی بچہ ہے آپ کی مہربانی ہے"۔ میں نے کہا۔ اس پر ڈاکٹر سبھر وال طنزیہ مسکرا دی۔ "کوئی اور بھی ہے؟" میں نے کہا کہ "دو اور ہیں"۔ یہ سُن کر وہ اُٹھی اور مجھے تنہائی میں لے گئی اور پوچھنے لگی "یہ بچے کیسے ہوئے، تمہارے پتی تو بچہ پیدا کرنے کے لائق ہی نہیں"، میں نے اس کی بات سُن کر کچھ ترش لہجے میں کہا "جب ایسی بات تھی تو آپ نے تین مہینہ تک ہمارا علاج کیوں کیا تھا؟"، "اس لئے کہ تم اور تمہارے شوہر ناامید نہ ہوں اور گھریلو زندگی خوش خوش بتا سکو۔ اس لئے کہ اگر تم کہیں بہک جاؤ تو اس لغزش کو سدھارنے کی گنجائش نکل آئے اور تم پر کیچڑ نہ اُچھل سکے۔ اسی لئے تمہارے پتی کی رپورٹ میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی تاکہ تم کسی اور ڈاکٹر کو نہ دکھا سکو اگر کوئی تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دیتا تو سوچو آج کیا ہوتا، میں عورت کی مجبوریوں اور پریشانیوں کو سمجھتی ہوں اب احتیاط سے کام لو راز راز ہی بنا رہے"، یہ کہہ کر ڈاکٹر سبھر وال اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور میں نے بہت جلد مکان بدل لیا تاکہ کیلاش اپنا بیاہ کر سکے اور یہ راز راز ہی رہے۔ ●●